ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

آسان تفسیر القرآن

تفسیرِ ربانی

تالیف و ترتیب

حضرت مولانا مفتی اصغر علی ربانی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ
اُستاذ و مفتی دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی

جلد چہارم

سورۃ الاعراف تا سورۃ التوبۃ

مکتبہ ربانیہ کراچی
Islamic Studies Publishers
Karachi-Pakistan

مکتبہ ربانیہ کراچی

ISLAMIC STUDIES PUBLISHERS

۴

آسان تفسیر القرآن

جملہ حقوق بحق مکتبۃ ربانیۃ محفوظ ہیں۔

Islamic Studies Publishers
Karachi-Pakistan

باہتمام : عبیدالرحمٰن ربانی
جلدچہارم: سُوْرَةُ الْاَعْرَاف تا سُوْرَةُ التَّوْبَة
طبع اوّل : ذی الحج ۱۴۳۹ھ بمطابق اگست 2018ء
ناشر : مکتبۃ ربانیۃ کراچی
فون : 0314-6107967
0302-2426288
(92-21) 35031011
ای میل
rabbaniglobal@yahoo.com
ibnerabbani@gmail.com

عرض ناشر

الحمدللہ!! اگرچہ مکتبۃ ربانیۃ نے

آسان تفسیر القرآن

کی تصحیح وطباعت میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا ہے، لیکن کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلدسازی میں غلطی ہوجاتی ہے، اگر کسی صاحب کو ایسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم مطلع فرماکر ممنون فرمائیں۔

(ادارہ)

ضروری انتباہ!!

اس کتاب کے جملہ حقوق کاپی رائٹ آفس میں رجسٹرڈ ہیں۔اس کتاب کی کتابت، تدوین وترتیب اور کسی بھی طریقے سے کاپی کرنا'' کاپی رائٹ ایکٹ 1962ء'' کے تحت قابل تعزیر جرم ہے اور اس کی خلاف ورزی پر بطور رجسٹرڈ کاپی رائٹ مالک (Owner) قانونی کارروائی کی جائے گی۔

(ادارہ)

ملنے کا پتہ

مکتبۃ ربانیۃ کراچی
131/30 سیکٹر 36/A ذبل روم کے ایریا کورنگی کراچی
نزد جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

- ادارۃ المعارف، جامعہ دارالعلوم کراچی
- بیت القرآن، اردو بازار کراچی
- دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
- مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دارالعلوم کراچی
- ادارہ اسلامیات، اردو بازار کراچی
- مکتبہ فہم دین (جامع مسجد بیت السلام ڈیفنس)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

آسان تفسیر القرآن

تفسیرِ ربانی

تالیف وترتیب

حضرت مولانا مفتی اصغر علی ربانی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
اُستاذ و مفتی دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

جلد چہارم

سورۃ الاعراف تا سورۃ التوبۃ

مکتبہ ربانیہ کراچی
131/30 سیکٹر 36/A ڈبل روم کے ایریا کورنگی کراچی
نزد جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست آسان تفسیر القرآن (جلد چہارم)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	سورۃ الأعراف	
۱	اللہ تعالیٰ کی کتاب	۳۱
۲	نافرمانوں پر عذاب	۳۶
۳	عملوں کا وزن	۳۸
۴	زندگی کا سامان	۴۴
۵	انسان کا مرتبہ	۴۷
۶	احکام و مسائل	۴۸
۷	ابلیس کو دُھتکار	۴۹
۸	ابلیس نے بہکانے کی ٹھان لی	۵۰
۹	ابلیس نکالا گیا	۵۳
۱۰	شیطان کا فریب	۵۵
۱۱	فریب کا نتیجہ	۵۶
۱۲	زمین پر آ گئے	۵۸
۱۳	پرہیزگاری کا لباس	۶۰
۱۴	لباس کے چند حکم	۶۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۵	شیطان سے ہوشیار رہیں	۶۴
۱۶	بے حیائی	۶۶
۱۷	گناہ کو گناہ سمجھو	۶۷
۱۸	احکام ومسائل	۷۰
۱۹	کھانے پینے میں زیادتی	۷۰
۲۰	کپڑے پہن کر نماز پڑھنا	۷۱
۲۱	کھانے پینے میں ”اسراف“ جائز نہیں	۷۲
۲۲	احکام ومسائل	۷۳
۲۳	خود کوئی چیز حرام مت کرو	۷۴
۲۴	عمدہ لباس اور لذیذ کھانے سے پرہیز اسلام کی تعلیم نہیں	۷۶
۲۵	خوراک اور لباس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت	۷۷
۲۶	زینت کے حکم	۷۹
۲۷	حرام باتیں	۷۹
۲۸	گناہوں کے اثرات	۸۲
۲۹	مقررہ مدّت	۸۲
۳۰	نجات کا طریقہ	۸۴
۳۱	اقراری مجرم	۸۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۳۲	دوزخیوں کا جھگڑا	۸۷
۳۳	جھگڑا فضول ہے	۸۹
۳۴	نافرمانوں کا فیصلہ	۹۱
۳۵	نیکوں کی جزا	۹۵
۳۶	اللہ تعالیٰ کا شکر	۹۷
۳۷	گفتگو	۹۹
۳۸	غیبی آواز	۱۰۲
۳۹	اعراف	۱۰۴
۴۰	اعراف کی مزید تشریح	۱۰۷
۴۱	"سلام" کا سنت لفظ	۱۰۸
۴۲	"سلام" کے احکام و مسائل	۱۰۹
۴۳	"سلام" کرنے کے چند اصول و آداب	۱۱۰
۴۴	اعراف والے	۱۱۱
۴۵	دوزخیوں کی پکار	۱۱۲
۴۶	غفلت کا نتیجہ	۱۱۴
۴۷	بے موقعہ ایمان	۱۱۶
۴۸	حقیقی پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں	۱۱۷

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۴۹	اہل علم کیلئے "یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّهَارَ" کی تحقیق	۱۲۰
۵۰	خالق اور حاکم	۱۲۱
۵۱	دُعا کے آداب	۱۲۳
۵۲	احکام و مسائل	۱۲۵
۵۳	زمین میں فساد مت مچاؤ	۱۲۵
۵۴	زمین کی ظاہری اور باطنی اصلاح اور فساد کا تفصیلی بیان	۱۲۶
۵۵	دُعا کے آداب	۱۲۸
۵۶	زمین کا نظام	۱۲۹
۵۷	سب کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتے ہیں	۱۳۱
۵۸	پیداوار کی صلاحیت	۱۳۱
۵۹	حضرت نوح علیہ السلام	۱۳۳
۶۰	حضرت نوح علیہ السلام کا جواب	۱۳۶
۶۱	پیغمبر بھی انسان ہیں	۱۳۸
۶۲	جھٹلانے والوں کا انجام	۱۳۹
۶۳	حضرت ہود علیہ السلام	۱۴۱
۶۴	حضرت ہود علیہ السلام کا جواب	۱۴۵
۶۵	حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے سبق	۱۴۷

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۶۶	حضرت ہود علیہ السلام کا آخری جواب	۱۴۸
۶۷	نافرمان تباہ ہو گئے	۱۵۰
۶۸	ثمود کا حال	۱۵۲
۶۹	فساد مت کرو	۱۵۵
۷۰	احکام ومسائل	۱۵۶
۷۱	بڑوں کی چھوٹوں سے گفتگو	۱۵۷
۷۲	نافرمان بہک گئے	۱۵۸
۷۳	حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا حال	۱۶۱
۷۴	ایک بالکل نیا گناہ	۱۶۲
۷۵	"مردوں سے بدکاری" کی شرعی سزا	۱۶۳
۷۶	حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا جواب	۱۶۵
۷۷	پاکیزگی کو جرم ٹھہرالیا	۱۶۵
۷۸	آخر کار تباہ ہوئے	۱۶۶
۷۹	مجرموں پر پتھر برسے	۱۶۸
۸۰	مدین والوں کا قصّہ	۱۶۹
۸۱	مدین والوں کی برائیاں	۱۷۱
۸۲	احکام ومسائل	۱۷۳

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۸۳	دوسروں کو سیدھی راہ سے روکنا	۱۷۳
۸۴	بُروں کے انجام سے سبق لو	۱۷۵
۸۵	اختلاف کا فیصلہ	۱۷۶
۸۶	قوم کا جواب	۱۷۸
۸۷	معاملہ دوٹوک ہوگیا	۱۸۱
۸۸	اللہ تعالیٰ پر توکل	۱۸۴
۸۹	آخر وہی ہوا جو ہونا تھا	۱۸۴
۹۰	احکام و مسائل	۱۸۶
۹۱	تباہ کرنے سے پہلے مہلت	۱۸۷
۹۲	ایمان اور تقویٰ	۱۹۰
۹۳	"برکت" کا مفہوم	۱۹۲
۹۴	عذاب اچانک آ سکتا ہے	۱۹۴
۹۵	احکام و مسائل	۱۹۶
۹۶	پہلوں کی حالتوں سے پچھلے سبق سیکھیں	۱۹۷
۹۷	فرعون کا حال	۲۰۰
۹۸	حضرت موسیٰ علیہ السلام	۲۰۳
۹۹	بنی اسرائیل قبطیوں کے پنجے میں کیسے آ گئے تھے؟	۲۰۴

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۰۰	حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے	۲۰۵
۱۰۱	جادوگر	۲۰۸
۱۰۲	پیغمبروں کو کس مناسبت سے کون کون سے معجزے دیئے گئے؟	۲۱۱
۱۰۳	جادوگر آ دھمکے	۲۱۱
۱۰۴	جادو کا پول کھل گیا	۲۱۴
۱۰۵	فرعون کے جادوگروں کے جادو کی حقیقت	۲۱۵
۱۰۶	جادوگر اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے	۲۱۶
۱۰۷	اس مقابلے کا اثر	۲۱۸
۱۰۸	صبر کی دُعا	۲۱۹
۱۰۹	احکام ومسائل	۲۲۱
۱۱۰	ایمان والوں کو دبانے کی تدبیر	۲۲۲
۱۱۱	اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو	۲۲۵
۱۱۲	بے چینی	۲۲۷
۱۱۳	مزید تنبیہ!	۲۲۸
۱۱۴	نشانیوں کو بہکانے کا ذریعہ ٹھہرایا	۲۳۲
۱۱۵	تفسیر: فرعونیوں کی ڈھٹائی دیکھئے!	۲۳۲
۱۱۶	فرعون والوں کی ضد	۲۳۵

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۱۷	"رجز" کا مفہوم	۲۳۷
۱۱۸	کرتوتوں کا وبال	۲۳۸
۱۱۹	صبر کا پھل	۲۴۲
۱۲۰	احکام ومسائل	۲۴۴
۱۲۱	غلامی رنگ لائی	۲۴۴
۱۲۲	معبود صرف اللہ تعالیٰ ہیں	۲۴۷
۱۲۳	قانون کی طلب	۲۵۰
۱۲۴	چلّہ کی اہمیت	۲۵۲
۱۲۵	احکام ومسائل	۲۵۳
۱۲۶	اللہ تعالیٰ کا دیدار	۲۵۴
۱۲۷	تجلّی کا اثر	۲۵۶
۱۲۸	حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تسکین	۲۵۷
۱۲۹	متکبر ٹیڑھے چلتے ہیں	۲۶۰
۱۳۰	کام کئے بغیر مزدوری کیسی؟	۲۶۲
۱۳۱	آخر بچھڑا بنا ہی لیا	۲۶۳
۱۳۲	احکام ومسائل	۲۶۶
۱۳۳	حضرت موسیٰ علیہ السلام غضب ناک ہوئے	۲۶۷
۱۳۴	حضرت ہارون علیہ السلام بے قصور تھے	۲۶۹

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۳۵	احکام و مسائل	۲۷۱
۱۳۶	گناہ کا علاج توبہ	۲۷۱
۱۳۷	بعض گناہوں کی کچھ سزا دنیا میں بھی ملتی ہے	۲۷۴
۱۳۸	دیدار کی طلب	۲۷۵
۱۳۹	ستر (۷۰) آدمیوں کا انتخاب	۲۷۷
۱۴۰	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا	۲۸۰
۱۴۱	نیک بخت کون ہیں؟	۲۸۲
۱۴۲	باقی شرطیں	۲۸۶
۱۴۳	"تورات" کی گواہی	۲۸۹
۱۴۴	پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۲۹۶
۱۴۵	پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صرف پیروی کافی نہیں، ادب واحترام اور محبت بھی فرض ہے	۲۸۹
۱۴۶	پیغمبری سب کی طرف	۲۹۹
۱۴۷	پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبری تمام جہان کیلئے قیامت تک ہے؛ اسی لئے آپ پر پیغمبری ختم ہے	۳۰۲
۱۴۸	پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند اہم خصوصیات	۳۰۳
۱۴۹	بنی اسرائیل کے قبیلے	۳۰۵
۱۵۰	جنگل میں آرام	۳۰۷
۱۵۱	شہر میں بسنے کی اجازت	۳۰۸
۱۵۲	ظالم پھر بھی نہ چوکے	۳۱۰

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۵۳	ایک اور واقعہ	۳۱۲
۱۵۴	پچھلے قصے کا بقیہ	۳۱۵
۱۵۵	نافرمانوں کی سزا	۳۱۶
۱۵۶	ایک اور سزا	۳۱۸
۱۵۷	یہودی تتّر بتّر ہو گئے	۳۲۱
۱۵۸	آگے کیا ہوا	۳۲۳
۱۵۹	کتاب کی کھلم کھلا مخالفت	۳۲۵
۱۶۰	بنی اسرائیل کا عہد	۳۲۷
۱۶۱	دین میں زبردستی نہیں کا صحیح مطلب	۳۲۹
۱۶۲	عہدِ الست	۳۳۰
۱۶۳	بیعت لینے کی حقیقت	۳۳۲
۱۶۴	باپ دادوں کا مشرک ہونا شرک کے جائز ہونے کی دلیل نہیں	۳۳۳
۱۶۵	شیطان کی پیروی	۳۳۵
۱۶۶	اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے نکلنے کا مطلب	۳۳۸
۱۶۷	دنیا کا لالچ	۳۳۹
۱۶۸	گمراہوں کی مثال	۳۴۱
۱۶۹	اللہ ہی بچانے والا ہے	۳۴۲
۱۷۰	ایک نصیحت	۳۴۴

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۷۱	بہت سے جہنم ہی کیلئے بنے ہیں	۳۴۴
۱۷۲	اہل کیلئے خصوصی مضمون	۳۴۵
۱۷۳	جسم کے تین اعضاء کے ذکر کرنے کا نکتہ	۳۴۶
۱۷۴	غفلت کا علاج	۳۴۷
۱۷۵	آیت سے سبق	۳۵۰
۱۷۶	احکام ومسائل	۳۵۰
۱۷۷	ہم منکروں کو ڈھیل دیں گے	۳۵۱
۱۷۸	فکر کی دعوت	۳۵۲
۱۷۹	قرآن کریم آخری پیغام ہے	۳۵۴
۱۸۰	ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے	۳۵۵
۱۸۱	قیامت کب آئے گی؟	۳۵۷
۱۸۲	غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے	۳۶۰
۱۸۳	انسان کی نسل	۳۶۲
۱۸۴	شرک کی آفت	۳۶۴
۱۸۵	احکام ومسائل	۳۶۵
۱۸۶	بت تمہاری نہیں سنتے	۳۶۶
۱۸۷	بت کچھ نہیں کرسکتے	۳۶۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۸۸	ایمانی قوت	۳۷۰
۱۸۹	ہٹ دھرموں کیساتھ سلوک	۳۷۳
۱۹۰	شیطان کے پھندے	۳۷۶
۱۹۱	پیغمبر کا صحیح تصوّر	۳۷۸
۱۹۲	قرآنِ کریم رحمت کا ذریعہ کیسے ہوتا ہے؟	۳۸۱
۱۹۳	احکام ومسائل	۳۸۳
۱۹۴	اللہ تعالیٰ کو دل سے یاد کرو	۳۸۴
۱۹۵	مقرب فرشتوں کا حال	۳۸۶
۱۹۶	سورۂ فاتحہ سے اعراف تک کی سورتوں کا اجمالی خاکہ	۳۸۹
۱۹۷	احکام ومسائل	۳۹۲
	سورۃ الانفال	
۱	غنیمت کی تقسیم کا قانون	۳۹۲
۲	سورۃ الانفال	۳۹۴
۳	لوگوں کے آپس کے اتحاد واتفاق کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے	۳۹۶
۴	مؤمنوں کی نشانیاں	۳۹۷
۵	سچّے مؤمنوں کا انعام	۴۰۰
۶	لڑائی کیسے ہوئی	۴۰۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۷	تجارتی قافلے کے بدلے لشکر ملا	۴۰۷
۸	جنگِ بدر کی غرض	۴۰۹
۹	خوشی اور اطمینان	۴۱۱
۱۰	مدد کی صورتیں	۴۱۴
۱۱	فرشتوں کی مدد	۴۱۷
۱۲	فسادیوں کی یہی سزا ہے	۴۱۸
۱۳	میدان سے مت بھاگو	۴۲۰
۱۴	جنگ سے پیٹھ پھیرنا کب جائز ہے؟	۴۲۲
۱۵	جو کیا اللہ نے کیا	۴۲۳
۱۶	اللہ تعالیٰ مؤمنوں کے ساتھ ہیں	۴۲۵
۱۷	اللہ اور پیغمبر کی اطاعت	۴۲۷
۱۸	بدترین مخلوق	۴۲۹
۱۹	زندگی کا انعام	۴۳۰
۲۰	آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہونے کا مطلب	۴۳۲
۲۱	کریں تھوڑے بھریں سب	۴۳۲
۲۲	اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو	۴۳۴
۲۳	خیانت مت کرو	۴۳۵
۲۴	تمام مشکلات کا حل	۴۳۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۲۵	ضد کی انتہا	۴۴۱
۲۶	عذاب نہ آنے کی وجہ	۴۴۲
۲۷	احکام ومسائل	۴۴۵
۲۸	مال کا غلط خرچ	۴۴۶
۲۹	احکام ومسائل	۴۴۸
۳۰	اچھے کو بُرے سے الگ کرنا	۴۴۸
۳۱	اللہ تعالیٰ کا دستور	۴۴۹
۳۲	احکام ومسائل	۴۵۲
۳۳	غنیمت کی تقسیم	۴۵۲
۳۴	احکام ومسائل	۴۵۷
۳۵	ذوی القربیٰ سے کون لوگ مراد ہیں	۴۵۸
۳۶	بدر کی جنگ کو "یوم الفرقان" فرمایا گیا	۴۵۸
۳۷	بدر کی جنگ اللہ تعالیٰ کو منظور تھی	۴۵۹
۳۸	لڑائی کے سامان	۴۶۱
۳۹	وقت پر تدبیر	۴۶۳
۴۰	کامیابی کا راستہ	۴۶۵
۴۱	کافروں کا چھچھوراپن	۴۶۷

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۴۲	شیطان کی شیطانی	۴۷۲
۴۳	شیطانی فریب اور اس سے بچنے کا طریقہ	۴۷۵
۴۴	دین دھوکا نہیں ہے	۴۷۶
۴۵	کافروں کی بری گت	۴۷۸
۴۶	کافروں کی پٹائی	۴۸۰
۴۷	شریر پہلے بھی تھے	۴۸۱
۴۸	مکہ کے کافر بھی فرعونیوں کی طرح ہیں	۴۸۳
۴۹	مکے والوں نے اللہ کی نعمتوں کو کیسے بدلا؟	۴۸۴
۵۰	پچھلوں کی تباہی	۴۸۶
۵۱	بدترین خلائق	۴۸۸
۵۲	ایک نکتہ	۴۹۱
۵۳	عہد توڑنے والوں کی سزا	۴۹۳
۵۴	صلح کے معاہدے کو ختم کرنے کی صورت	۴۹۴
۵۵	عہد پورا کرنے کا ایک عجیب واقعہ	۴۹۵
۵۶	وہ ہم سے بھاگ نہیں سکتے	۴۹۶
۵۷	احکام و مسائل	۴۹۷
۵۸	اپنی قوت بڑھاؤ	۴۹۷
۵۹	جہاد کے لیے اسلحہ اور جنگ کے سامان کی تیاری فرض ہے	۵۰۳

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۶۰	صلح کا حکم	۵۰۴
۶۱	دھوکے بازوں کا علاج	۵۰۶
۶۲	یہ ملاپ کس نے کرایا	۵۰۸
۶۳	نا سمجھ ٹھہر نہیں سکتے	۵۱۰
۶۴	دو گنوں سے لڑو	۵۱۳
۶۵	پہلے دھاک بٹھاؤ	۵۱۵
۶۶	تنبیہ!	۵۱۸
۶۷	مال کی حرص باعث عذاب ہے	۵۱۹
۶۸	مغفرت کا وعدہ	۵۲۱
۶۹	احکام و مسائل	۵۲۳
۷۰	اسلامی برادری	۵۲۶
۷۱	جنھوں نے ہجرت نہ کی	۵۲۸
۷۲	فساد کو دباؤ	۵۳۱
۷۳	سچے ایماندار	۵۳۲
۷۴	بعد کے مہاجر	۵۳۶
	سورة التوبة	
۱	عہد کے خاتمہ کا اعلان	۵۳۹
۲	سورۂ توبہ کا تعارف	۵۴۰

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۳	اس سورت کو "توبہ" اور "براءت" کا نام کیوں دیا گیا؟	۵۴۱
۴	اس سورت کے شروع میں "بسم اللہ" نہ لکھنے کی وجہ	۵۴۲
۵	بیزاری کے اعلان کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کیوں بھیجا؟	۵۴۵
۶	احکام ومسائل	۵۴۶
۷	اعلانِ عام	۵۴۷
۸	تفسیر: ایک غلط فہمی کا ازالہ	۵۴۸
۹	کچھ لوگ ابھی بچ رہیں گے	۵۴۹
۱۰	باقی لوگوں سے سلوک	۵۵۱
۱۱	ان پانچ آیتوں سے متعلق چند مسئلے اور فائدے	۵۵۴
۱۲	کافروں کو معاف کر کے ان کے مکر سے غافل نہیں ہونا چاہیے	۵۵۵
۱۳	مزید رعایت	۵۵۷
۱۴	احکام ومسائل	۵۵۹
۱۵	عہد کی کوئی صورت ہی نہیں	۵۵۹
۱۶	صلح کیسے ہو؟	۵۶۲
۱۷	مل کر رہنا نہیں جانتے	۵۶۴
۱۸	اسلامی برادری میں داخل ہونے کی تین شرطیں	۵۶۶
۱۹	عہد توڑنے والوں سے لڑو	۵۶۶
۲۰	احکام ومسائل	۵۶۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۲۱	لڑائی کن سے ہے	۵۶۸
۲۲	اُن سے جنگ کرو	۵۷۰
۲۳	کام ایک جانچ ہے	۵۷۲
۲۴	مسجدوں کی آبادی	۵۷۴
۲۵	احکام ومسائل	۵۷۵
۲۶	مسجد کے متولّی	۵۷۵
۲۷	آیت میں پیغمبر پر ایمان لانے کے ذکر نہ کرنے کی وجہ	۵۷۷
۲۸	احکام ومسائل	۵۷۸
۲۹	مسجدوں کی ظاہری چہل پہل	۵۷۹
۳۰	احکام ومسائل	۵۸۳
۳۱	کامیابی کی راہ	۵۸۳
۳۲	احکام ومسائل	۵۸۵
۳۳	ایمان والوں کی صفت	۵۸۶
۳۴	احکام ومسائل	۵۸۸
۳۵	زبردست دھمکی	۵۸۸
۳۶	احکام ومسائل	۵۹۱
۳۷	اللہ تعالیٰ کی مدد	۵۹۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۳۸	حنین کا پس منظر	۵۹۴
۳۹	جنگ کے میدان کی حالت	۵۹۸
۴۰	دل کا اطمینان	۵۹۹
۴۱	حنین کی جنگ	۶۰۲
۴۲	حقوق کے معاملے میں انتہائی احتیاط کرنی چاہیے	۶۰۳
۴۳	احکام و مسائل	۶۰۴
۴۴	پاکیزگی ایمان ہے	۶۰۶
۴۵	مسجدِ حرام کا مطلب	۶۰۸
۴۶	اس سال سے کون سا سال مراد ہے؟	۶۰۹
۴۷	مشرکوں کے لئے خاص مسجد حرام میں داخلہ منع ہے یا سب مسجدوں میں؟	۶۰۹
۴۸	اسلام کے دوسرے مخالفین	۶۱۲
۴۹	احکام و مسائل	۶۱۴
۵۰	سچے دین کے خلاف باتیں	۶۱۶
۵۱	”رب“ صرف اللہ تعالیٰ ہیں	۶۱۸
۵۲	پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا	۶۲۱
۵۳	اللہ تعالیٰ کی تدبیر	۶۲۳
۵۴	اہل کتاب کے علماء اور درویش	۶۲۵

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۵۵	مال جمع کرنے کی سزا	٦٢٧
۵٦	اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کا مطلب	٦٢٩
۵۷	مال کو وبال	٦٢٩
۵۸	زمانے کی تقسیم	٦٣١
۵۹	بارہ مہینوں کو ادل بدل کرنے کی پوری تفصیل	٦٣٧
٦٠	حکم توڑنا	٦۴٠
٦١	احکام ومسائل	٦۴٣
٦٢	ایک حسابی نکتہ	٦۴۴
٦٣	وقت پر کاہلی بُری ہے	٦۴۴
٦۴	غزوۂ تبوک کا پس منظر	٦۴٦
٦۵	تبوک کی جنگ کی وجہ	٦۴۹
٦٦	تم نہیں تو اور	٦۵١
٦۷	اللہ تعالیٰ کی مدد	٦۵۴
٦۸	اطمینان وسکون	٦۵۹
٦۹	عام تیاری کا حکم	٦٦٠
۷٠	احکام ومسائل	٦٦٣
۷١	منافقوں کے حیلے بہانے	٦٦۴
۷٢	منافقوں کا پول	٦٦٦

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۷۳	ایمان والوں کا رویہ	٦٦٧
۷۴	بہانے بازوں کو کھوٹ	٦٧٠
۷۵	نفاق کا ثبوت	٦٧١
۷۶	معقول اور غیر معقول میں فرق	٦٧٣
۷۷	پرانے فتنہ باز	٦٧٥
۷۸	نہ کرنے کے سو بہانے	٦٧٦
۷۹	دوست نما دشمن	٦٧٨
۸۰	اللہ تعالیٰ پر بھروسہ	٦٨٠
۸۱	تدبیر کرے اور تقدیر پر یقین کرے	٦٨٢
۸۲	پھر دیکھو کیا ہوتا ہے؟	٦٨٢
۸۳	منافقوں کی صدقے کے بے وقعتی	٦٨٥
۸۴	ان کے مال اور اولاد قابل رشک نہیں	٦٨٧
۸۵	لالچی	٦٨٩
۸۶	صدقوں کے حق دار	٦٩١
۸۷	ایک عظیم فائدہ	٦٩٥
۸۸	تنبیہ!	٦٩٧
۸۹	کلمہ ''اِنَّمَا'' ذکر کرنے کا ایک علمی نکتہ	٧٠٠

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۹۰	احکام ومسائل	۷۰۰
۹۱	ایک علمی نکتہ: "لِلْفُقَرَآءِ" میں لام تملیک کے لئے ہے۔	۷۰۱
۹۲	احکام ومسائل	۷۰۲
۹۳	مخالفت کا نتیجہ	۷۰۵
۹۴	منافقوں کی چال	۷۰۷
۹۵	منافقوں کی پریشانی	۷۱۰
۹۶	منافقوں کا عذر لنگ	۷۱۲
۹۷	احکام ومسائل	۷۱۳
۹۸	نفاق کی علامتیں	۷۱۴
۹۹	کافروں اور منافقوں کی سزا	۷۱۶
۱۰۰	پہلی قوموں سے عبرت	۷۱۷
۱۰۱	تنبیہ!	۷۱۹
۱۰۲	پہلوں کی خبریں	۷۱۹
۱۰۳	مؤمنوں کی خصوصیتیں	۷۲۱
۱۰۴	مؤمنوں کا انعام	۷۲۳
۱۰۵	جہاد کی ضرورت	۷۲۵
۱۰۶	ناشکری کی سزا	۷۲۸
۱۰۷	نفاق کی جڑ کنجوسی	۷۳۰

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۰۸	احکام ومسائل	۷۳۳
۱۰۹	نفاق کی علامت	۷۳۴
۱۱۰	بخشش کے لئے ایمان شرط ہے	۷۳۷
۱۱۱	منافقوں کی پرکھ جہاد ہے	۷۳۹
۱۱۲	دوزخ کی آگ بہت سخت اور تیز ہے	۷۴۱
۱۱۳	منافقوں سے قطع تعلق	۷۴۳
۱۱۴	فاسقوں کا علاج	۷۴۵
۱۱۵	ایک شبہ اور اس کا جواب	۷۴۶
۱۱۶	احکام ومسائل	۷۴۷
۱۱۷	ان کی خوشحالی جنجال ہے	۷۴۸
۱۱۸	ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں	۷۴۹
۱۱۹	تندرست ہو کر اپاہج بنتے ہو	۷۵۱
۱۲۰	مؤمنوں کی شان	۷۵۲
۱۲۱	آخرت کا بدلہ	۷۵۴
۱۲۲	دیہاتیوں کا حال	۷۵۵
۱۲۳	قابلِ قبول عذر	۷۵۷
۱۲۴	سواری نہ ہونا عذر ہے	۷۵۹

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۲۵	پکڑ کن کی ہے؟	۷۶۰
۱۲۶	واپسی پر پھر اپنا رونا روئیں گے	۷۶۱
۱۲۷	کافر دیہاتیوں کا حال	۷۶۴
۱۲۸	دو قسم کے دیہاتی	۷۶۵
۱۲۹	اسلام لانے میں پہل کرنے والوں کا انعام	۷۶۷
۱۳۰	احکام و مسائل رضی اللہ الخ صحابہ کرام کے ساتھ خاص ہے	۷۶۹
۱۳۱	"السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" (سابقین اولین کون ہیں؟)	۷۷۰
۱۳۲	صحابہ کرام سب کے سب بغیر استثناء جنتی ہیں	۷۷۱
۱۳۳	تنبیہ!	۷۷۲
۱۳۴	اردگرد کے لوگوں کا حال	۷۷۲
۱۳۵	خطا کار مسلمان	۷۷۴
۱۳۶	نیک کاموں کی ترغیب	۷۷۷
۱۳۷	"خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" کا شان نزول	۷۷۸
۱۳۸	احکام و مسائل ایک شبہ کا ازالہ	۷۸۰
۱۳۹	صلوٰۃ کے لفظ سے دُعا کا حکم؟	۷۸۱
۱۴۰	اللہ تعالیٰ سب کے کام دیکھ رہا ہے	۷۸۲
۱۴۱	دو اور گروہ	۷۸۴
۱۴۲	ان آیتوں کا پس منظر	۷۸۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۴۳	احکام ومسائل	۷۸۸
۱۴۴	نیک نیتی اصل چیز ہے	۷۸۹
۱۴۵	احکام ومسائل	۷۹۰
۱۴۶	تقویٰ مضبوط بنیاد ہے	۷۹۰
۱۴۷	نفع کا سودا	۷۹۲
۱۴۸	احکام ومسائل	۷۹۳
۱۴۹	شانِ نزول	۷۹۳
۱۵۰	جہاد کی سب سے پہلی آیت	۷۹۵
۱۵۱	اس سودے کے نفع بخش ہونے کی خوبصورت تشریح	۷۹۵
۱۵۲	مسلمانوں کے کام	۷۹۶
۱۵۳	مشرکوں سے دینی بے تعلقی	۷۹۹
۱۵۴	شانِ نزول	۸۰۱
۱۵۵	جان کر نہ ماننا گمراہی ہے	۸۰۳
۲۵۶	ایثار کا بدلہ	۸۰۴
۱۵۷	ایمان والوں کو معافی	۸۰۶
۱۵۸	ان تینوں انصاری صحابہ کرام کے واقعہ کی تفصیل	۸۰۸
۱۵۹	احکام ومسائل حضرت کعب رضی اللہ عنہ والی حدیث کے فائدے!	۸۱۵
۱۶۰	سچائی کی قدر	۸۱۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۶۱	مشقت کا اجر	۸۲۰
۱۶۲	قومی کام کرنے کا طریقہ	۸۲۲
۱۶۳	احکام و مسائل جہاد کے فرض عین اور فرض کفایہ ہونے کی تفصیل	۸۲۴
۱۶۴	دینی تعلیم کی اہمیت وفضیلت	۸۲۵
۱۶۵	علم کے فرض عین اور فرض کفایہ ہونے کی تفصیل	۸۲۶
۱۶۶	حفاظت کا طریقہ	۸۲۷
۱۶۷	وحی کے بارے میں منافقوں کا طرز عمل	۸۲۸
۱۶۸	نفاق کی نحوست	۸۳۰
۱۶۹	آفتوں سے سبق نہیں سیکھتے	۸۳۱
۱۷۰	منافقوں کی بدنصیبی	۸۳۲
۱۷۱	پیغمبر کی نشانیاں	۸۳۳
۱۷۲	پیغمبر کی تسلی	۸۳۴
۱۷۳	"سورۂ توبہ" کے مضمونوں کا خلاصہ	۸۳۵
۱۷۴	آخری دو آیتیں	۸۳۶

آیاتھا - ۲۰۶ سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتھا - ۲۴

سورۃ الاعراف مکی ہے، اس میں دو سو چھ آیتیں اور چوبیس رکوع ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓصٓ ① كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ

الٓمّٓصٓ (۱) کتاب اتاری گئی طرف آپکی پس نہ ہو میں سینے آپ کے تنگی سے اس

لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ② اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ

تاکہ ڈرائیں آپ ساتھ اسکے اور یاددہانی ہے لئے مؤمنوں کے (۲) تابعداری کرو جو اتارا گیا طرف آپکی

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ③

طرف سے رب تمہارے کے اور نہ پیروی کرو سے سوا اس کے ساتھیوں کی بہت کم جو نصیحت قبول کرتے ہو (۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ الٓمّٓصٓ۔(۱) یہ کتاب آپ پر اتاری گئی ہے، سو چاہیئے کہ اس کے پہنچانے سے آپ کا جی تنگ نہ ہو تاکہ آپ اس سے ڈرائے اور ایمان والوں کو نصیحت ہو۔(۲) چلو اس پر جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے اترا اور اس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے نہ چلو تم بہت ہی کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔(۳)

تفسیر

اس سورۃ کا نام "سورۃ الاعراف" ہے اور یہ سورۃ مکی ہے اس کے اترنے کا زمانہ قریب قریب پہلی سورۃ

المحلل الرابع

کے ساتھ ہی ہے، بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ سورۃ "سورۃ ص" کے بعد اتری، اس میں ۲۰۶ آیتیں ہیں یہ سورۃ طوال (سات لمبی سورتوں)، یعنی: لمبی سورتوں میں شمار ہوتی ہے، "سورۃ فاتحہ" کو چھوڑ کو اب تک آنے والی ساری سورتیں سبع طوال میں شامل ہیں اس کے بعد "سورۂ نحل" تک کو مثانی کہا جاتا ہے، یہ طوال کے بعد دوسرے نمبر پر آنے والی سورتیں ہیں، پھر ایک سو تک آیتوں والی سورتیں ہیں جن کو مِئِین (سو آیتوں والی) کہا جاتا ہے اس کے بعد سب سے چھوٹی سورتیں مفصلات ہیں جو قرآن کریم کے آخر تک چلتی ہیں، "اعراف" ایک مقام کا نام ہے، چونکہ اس سورۃ میں "اعراف" کا تفصیلی ذکر آیا ہے اس لئے اس سورۃ کا نام "سورۃ الاعراف" ہے، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اس سورۃ میں مختلف مضمون ہیں، اور اس میں دین اسلام کے کم وبیش تمام اصولی مضمونوں کو دوبارہ ذکر کیا گیا ہے، دوسری سورتوں کی طرح توحید کا بیان اور شرک کی تردید اس سورۃ میں بھی آئی ہے، قیامت اور حساب کتاب کے ذکر کے ساتھ ساتھ عمل کے بارے میں بیان بھی ہے، پچھلی سورۃ میں اٹھارہ پیغمبروں کا ذکر کر کے ان کے طریقے کی وضاحت کی گئی تھی اس سورۃ میں رسالت کی مزید تفصیلات آئیں گی، اس سورۃ میں رسالت کا خصوصی ذکر ہے کہ مختلف پیغمبروں نے دین کی تبلیغ کیلئے کون کون سا طریقہ اختیار کیا اور انسانوں کو ہدایت کا سامان کس طرح پہنچایا، چنانچہ اس ضمن میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا تفصیل کے ساتھ ذکر آئے گا، اس کے علاوہ بعض دوسرے مسئلے بھی اس سورۃ میں بیان ہوئے ہیں جن کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی، اس سورۃ مبارکہ میں تمام جہان والوں کی اصلاح کو پیش نظر رکھا گیا ہے، یعنی: اس میں تمام قوموں اور مذہب والوں کو خطاب کیا گیا ہے، چنانچہ اس میں ایمان والوں سے لے کر یہودی، عیسائی، مجوسی، اور صابی قوموں تک کا ذکر ہے، "سورۂ حج" میں اس کی اور تفصیل بھی آئیں گی۔

"سورۃ انعام" کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا تھا کہ کیا میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور

رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا پروردگار ہے اور اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی رہنمائی کیلئے سامان مہیا کرے چنانچہ، اس سورۃ مبارکہ کی ابتداء اللہ تعالیٰ نے "کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْكَ" سے کی ہے، یعنی: یہ ایسی کتاب ہے جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے گویا اس نے اپنی آخری کتاب قرآن مجید اتار کر ہدایت کا سامان مہیا کر دیا ہے اور پھر ساتھ یہ حکم بھی دیا ہے جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر اتارا گیا ہے اس کی پیروی بھی کرو اس کے حکموں پر خود عمل کرتے رہو اور دوسروں کو تربیت بھی کرو۔

الٓمّٓصٓ: یہ ایک لفظ نہیں ہے بلکہ الگ الگ چار حرف ہیں اور ان کو الگ الگ اس طرح پڑھنا چاہئے الف، لام، میم، صاد، قرآن مجید کی بعض سورتوں کے شروع میں چند حرف دیئے گئے ہیں جن کے معنیٰ نہیں بتائے گئے مگر وہ پڑھنے میں آتے ہیں ان کو "حروف مقطعات" (وہ حروف جو ایک دوسرے سے کاٹ کر یعنی الگ الگ کر کے پڑھے جاتے ہیں) کہتے ہیں۔

سورۃ کے شروع ہی سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں سیدھی راہ سے روکنے والوں کا بیان ہوگا، دنیا اس قاعدہ پر بنی ہے کہ اس میں سچی بات کہنے والوں کی بات ماننے والے کم ہوتے ہیں اور اکثر لوگ شروع میں کھلم کھلا مخالف ہو جاتے ہیں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ظاہر میں ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں اور دل میں مخالف ہوتے ہیں ان تینوں قسموں کا ذکر "سورۃ البقرۃ" کے شروع میں کر دیا گیا ہے، پچھلی قسم کے دونوں طرح کے لوگ سچے لوگوں کو بہت ستانے والے اور تکلیف پہچانے والے ثابت ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو ایسے لوگوں نے بہت دکھ پہنچائے ہیں، چونکہ مکہ میں منافق نہ تھے کھلے دشمن تھے اس سورۃ میں سچائی کے کھلے دشمنوں کا ذکر آئے گا اس لئے شروع ہی میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سمجھاتے ہیں کہ یہ کتاب جو ہم نے آپ کو دی ہے وہ اس لئے ہے کہ اس کے ذریعے مخالفوں اور دشمنوں کو ڈرایا جائے اور ماننے والوں کو ان کے کام کی باتیں بتا دی جائیں اگر لوگ آپ کی نہ سنیں اور نہ مانیں تو آپ کا دل تنگ نہ ہونا چاہئے اور نہ قرآن کریم کے سنانے سے دل میں جھجک پیدا ہونی چاہئے، آپ پورے یقین کے ساتھ انہیں ان کے کفر اور برے کاموں کی سزا سے قرآن کریم کی آیتیں

بے دھڑک سناسنا کر ڈار یئے اور کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہ کیجئے، اسی کتاب کی آیتوں میں ماننے والوں کیلئے ان کے کام کی باتیں ہیں انہیں ان سے بہت فائدہ پہنچے گا، سب سے کہہ دیجئے کہ! ادھر آؤ یہ کتاب کسی آدمی کی گھڑی ہوئی نہیں ہے اس میں ایک بھی بناوٹی بات نہیں ہے یہ تمہارے رب نے تمہاری طرف بھیجی ہے یہ جو تم نے اپنے ساتھی، دوست، رفیق بنا رکھے ہیں ان میں سے کسی کی مت سنو، تمہارا رب تمہارا سب سے بڑھ کر رفیق اور ساتھی ہے اس کا کہنا مانو اور کسی کا کہنا نہ مانو وہی تمہیں تمہاری ضرورت کی ساری چیزیں دیتے ہیں، لیکن افسوس ہے! تم لوگ دھیان کم کرتے ہو ذرا بھی غور کرو اور اس کے انعاموں کو گنو تو پھر یقیناً تم اس کے سوا کسی کہ نہ سنو اور نہ مانو، سورۃ کے اترنے کے زمانے میں یہ مکہ والوں سے کہا جارہا ہے لیکن یہ دراصل ساری دنیا والوں سے خطاب ہے اور ہر زمانے میں سارے انسانوں اور سمجھ داروں کیلئے یہی حکم ہے۔

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ: یہ ایک کتاب ہے جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے پس آپ کے سینے میں اس کی وجہ سے تنگی نہیں ہونی چاہئے، ظاہر ہے کہ جب پیغمبر ﷺ نے اسلام کی دعوت پیش کی تو لوگوں نے ضد کرتے ہوئے اس کی مخالفت کی جس کی وجہ سے آپ کے دل میں گھٹن پیدا ہوتی تھی اور آپ کو تنگی محسوس ہوتی تھی، آپ اکثر خیال فرماتے کہ لوگ ہماری دعوت کی طرف توجہ نہیں دیتے کیا یہ ہماری بات سن کر سمجھ بھی سکتے ہیں یا نہیں اور پھر اسے کس حد تک قبول کرتے ہیں، عربوں کی طرف سے پیغمبر ﷺ کو بڑی تکلیفیں پہنچیں آپ سوچتے رہتے تھے کہ گھر کے لوگ ہی نہیں مانتے تو باقی لوگوں کا کیا بنے گا؟ اس طرح آپ کے دل میں گھٹن پیدا ہوتی تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ آپ تنگی محسوس نہ کریں بلکہ آپ اپنا کام جاری رکھیں خدا تعالیٰ اپنے دین کو ضرور ہی ضرور کامیاب کریں گے اسی طرح کی تسلی "سورۃ انشراح" میں بھی ہے کہ کیا ہم نے آپ کے سینہ مبارک کو کھول نہیں دیا اور آپ کے بوجھ کو ہلکا نہیں کر دیا؟

بعض مفسرین تنگی سے شک اور تردد مراد لیتے ہیں، یعنی: یہ قرآن کریم جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے یہ بالکل برحق ہے اس کی کامیابی میں کسی قسم کا شک یا تردد نہیں ہونا چاہئے، دوسرے مقام پر موجود ہے کہ آپ شک نہ

کریں، یہ سو فیصد برحق ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انسان کو ہدایت دینا چاہتے ہیں۔

کتاب اتارنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس کے ذریعے کفر، شرک اور گناہ کرنے والوں کو ڈرائیں جس قدر برائیوں کی بہتات ہے اسی قدر ڈراوے کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے، سب پیغمبر خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے ہوتے ہیں، یعنی: وہ ہر ایمان والے نیک کام کرنے والے کو کامیابی کی خوشخبری سناتے ہیں اور غلط کام کرنے والے کو اس کے برے انجام سے ڈراتے ہیں اسی ضرورت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر ڈرانے کو پہلے ذکر کیا ہے کہ آپ اس قرآن کریم کے ذریعے لوگوں کو ڈرائیں اور کتاب کی دوسری غرض یہ ہے کہ یہ کتاب ایمان والوں کیلئے نصیحت بن جائے، گویا اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے دو مقصد بیان فرمائے ہیں، ایک نافرمانوں کو ڈرانا اور دوسرا اطاعت گزاروں کیلئے نصیحت کا باعث ہونا۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ: اے انسانو! اس چیز کی پیروی کرو جو ہدایت تمہارے رب کی طرف سے تمہاری کامیابی کیلئے تمہاری طرف اتاری گئی ہے جو دین، شریعت، قانون اور دستور اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو، دوسرے مقام پر فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا دین ہے اس کے علاوہ سارے دین باطل ہیں، اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی کتاب کے سوا کسی دوسری چیز سے رہنمائی حاصل کرے گا وہ گمراہ ہو جائے گا اور جو اس کتاب کے مقابلے میں اکڑ دکھائے گا اللہ تعالیٰ اس کی گردن توڑ دیں گے۔

قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ: بہر حال اس چیز کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے اتاری گئی ہے اس کے سوا کسی اور کی پیروری نہ کرو، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان واضح حکم کے باوجود بہت کم لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دن بدن قرآن کریم سے دوری ہوتی جا رہی ہے۔

نافرمانوں پر عذاب

وَ كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ
اور بہت سے بستیوں ہلاک کیا ہم نے اسکو پس آیا ان پر عذاب ہمارا رات کو یا وہ

قَآئِلُوْنَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا
جب دوپہر کو سوتے تھے (۴) پس نہیں تھی پکار ان کی جب آیا ان پر عذاب ہمارا مگر یہ کہ کہا انہوں نے

اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْئَلَنَّ
بیشک ہم تھے ہم ظالم (۵) پس ضرور پوچھیں گے ہم ان سے کہ پیغمبر بھیجے گئے طرف جن کی اور ضرور پوچھیں گے ہم

الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّ مَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ﴿۷﴾
بھیجے ہوؤں سے (۶) پس ضرور بتائیں گے ہم ان کو ساتھ علم کے اور نہ تھے غیر حاضر (۷)

بامحاورہ ترجمہ: اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کردیں کہ ان پر ہمارا عذاب پہنچا راتوں رات یا دوپہر کو سوتے ہوئے۔(۴) جس وقت کہ ان پر ہمارا عذاب پہنچا، پھر ان کی پکار یہی تھی کہ کہنے لگے بیشک ہم ہی ظالم تھے۔(۵) سو ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے اور ہم پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے۔(۶) پھر ہم ان کو اپنے علم سے احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے۔(۷)

تفسیر

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے لوگوں کی غفلت اور نافرمانی کی وجہ سے ان کی بہت سی بستیوں کو تباہ و برباد کردیا ہے، کیونکہ ان کے درست ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی وہ بے فکری سے اپنے کھیل میں مصروف رہتے تھے اور چین سے سوتے تھے ان میں سے بعض کو رات کے وقت بے خبری میں عذاب نے آ پکڑا اور بعض کو دوپہر

کے وقت سوتے میں آ دبوچا اس وقت چیخ و پکار مچی، ہائے واویلا کا شور ہوا، ہر ایک کی زبان سے سوائے اس کے کچھ نہ نکلتا تھا کہ افسوس! ہم نے بڑا ظلم کیا، غفلت اور گناہوں میں پھنسے رہے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا انجام یہ ہونا ہے، لیکن اس وقت پچھتانا کچھ کام نہ آیا اس سے پہلے ان کے غفلت میں پھنسے رہنے اور گناہوں میں مبتلا رہنے کی کوئی وجہ نہ تھی ان کو سیدھا راستہ بتا دیا گیا تھا، پیغمبر ان کے پاس آ چکے تھے اس کے بارے میں ہم ان سب سے ضرور سوال کریں گے، ان مجرموں سے یہ پوچھیں گے کہ بتاؤ! تم نے ہمارے پیغمبروں کا کہنا کیوں نہ مانا اور پیغمبر اور پیغمبروں سے سوال کریں گے کہ تم نے ہمارا پیغام انہیں پہنچایا تھا یا نہیں؟ اس کے بعد ہم ان کو صاف صاف بتا دیں گے کہ ہمیں تمہاری ہٹ دھرمی بھی معلوم ہے اور پیغمبروں کا حال بھی معلوم ہے، تم کوئی ہماری آنکھ سے اوجھل نہ تھے اور نہ ہم کبھی تمہارے پاس سے غائب تھے، لو یہ تمہارے گناہوں کا ثبوت موجود ہے اب ان کی سزا بھگتو۔

قیامت کے دن انسانوں سے سوال کیا جائے گا کہ ہم نے تمہارے پاس اپنے پیغمبر اور کتابیں بھیجی تھیں تم نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا، اور پیغمبروں سے پوچھا جائے گا کہ یہ پیغمبری کا پیغام اور اللہ تعالیٰ کے حکم دے کر ہم نے آپ کو بھیجا تھا وہ آپ حضرات نے اپنی اپنی امتوں کو پہنچا دیئے یا نہیں، اور "صحیح مسلم" میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں لوگوں سے سوال کیا کہ قیامت کے روز تم لوگوں سے میرے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ میں نے تم کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا یا نہیں؟ یعنی: اس وقت تم اس کے جواب میں کیا کہو گے؟ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ہم کہیں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا اور اللہ تعالیٰ کی امانت کا حق ادا کر دیا اور امت کے ساتھ خیر اخواہی کا معاملہ کیا یہ سن کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ"، "یعنی: اے اللہ! آپ گواہ رہیں"۔

"مسند احمد" کی روایت میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مجھ سے دریافت فرمائیں گے کہ کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام بندوں کو پہنچا دیا اور میں جواب میں عرض کروں گا کہ میں نے پہنچا

دیا ہے؛ اس لئے اب تم سب اس کا اہتمام کرو کہ جو لوگ حاضر ہیں وہ غائبوں تک میرا پیغام پہنچادیں، غائبوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس زمانہ میں موجود تھے مگر اس مجلس میں حاضر نہ تھے اور وہ نسلیں بھی جو بعد میں پیدا ہوں گی ان تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر زمانے کے لوگ آنے والی نسل کو اس پیغام کے پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھیں تاکہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کو یہ پیغام پہنچ جائے۔

عملوں کا وزن

وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

اور وزن اس دن حق ہے پس جس کے بھاری ہوئے عمل ان کے پس وہ لوگ ہی

الْمُفْلِحُوْنَ ۞ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا

کامیاب ہیں (۸) اور جس کے ہلکے ہوئے عمل ان کے پس وہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے نقصان کیا

اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۞

اپنے آپ کا اس وجہ سے کہ تھے وہ ساتھ آیتوں ہماری کے ظلم کرتے (۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اس دن کا وزن حق ہے جس کے وزن بھاری ہوئے، سو وہی نجات پانے والے ہیں۔(۸) اور جن کے وزن ہلکے ہوئے، سو وہی ہیں جنہوں نے اپنا نقصان کیا اس وجہ سے کہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔(۹)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اس دن وزن بالکل جچا تلا ہوگا جس کے کام وزنی ہوں گے ان کو کامیابی اور نجات حاصل ہوگی، اور جس کے کام ہلکے ہوں گے ان کو ناکامی اور مصیبت سے پالا پڑے گا؛ اس لئے کہ انہوں نے دنیا میں ہماری ہدایت کے مطابق کام نہیں کیا۔

اس آیت میں یہ بات سمجھانا مقصود ہے کہ دنیا میں آدمی جو کام بھی کرتا ہے اس کی قدر و قیمت کا اسے کچھ اندازہ نہیں ہوتا، حالانکہ کرنے سے پہلے اسے ہر کام کو ان قاعدوں کے مطابق پرکھ لینا چاہئے جو قرآن کریم کی آیتوں میں درج ہیں اور جن کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کافی طور پر واضح کر دیا ہے اور جو ان آیتوں میں مقرر کئے ہوئے معیار سے کاموں کو دنیا میں نہیں جانچتا بلکہ جو جی چاہتا ہے کرتا ہے اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا حساب لیا جائے گا اور انہی آیتوں میں مقرر کئے ہوئے معیار کے مطابق اس کے عملوں کی ناپ تول کی جائے گی، دنیا میں یہ معیار ان آیتوں میں پوشیدہ ہے اس کی کسوٹی پر تمہیں ہر کام کو پرکھ کر دیکھنا چاہئے تھا لیکن تم نے نہیں پرکھا قیامت کے دن یہ سب آیتیں جو عملوں کے جانچنے کے ذریعہ ترازو کی شکل میں ظاہر ہوں گی اور ہر ایک شخص کھلم کھلا دیکھ لے گا کہ اس کے کاموں کا وزن کیا ہے اور اس کی کیا قیمت ہے۔

وَ الْوَزْنُ يَوْمَىٕذِ ِالْحَقُّ : حشر کے دن عملوں کا تولا جانا برحق ہے، البتہ عملوں کے وزن کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی عملوں کی شکل وصورت نہیں ہوتی، جیسے: کسی نے نماز پڑھی یا روزہ رکھا، درود پاک پڑھا، ذکر و اذکار کیا یہ ایسے عمل ہیں جو انسان اپنے اعضاء کے ساتھ انجام دیتا ہے تو ان کا وزن کیسے ہوگا؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ عمل کی شکل وصورت اور پھر ان کا وزن حدیثوں سے ثابت ہے اس زمانے میں سائنس نے بعض ایسی چیزوں کا وزن بھی ثابت کر دیا ہے جو بظاہر بے وزن چیز معلوم ہوتی ہیں، مثلاً: ہوا کا دباؤ یا وزن آلات کے ذریعہ معلوم کیا جاتا ہے، انسانی جسم کی حرارت کو ناپنے کیلئے تھرمامیٹر موجود ہے اسی طرح خون کا دباؤ معلوم کرنے کے آلے بھی موجود ہیں، اور اگر پھر بھی عملوں کے وزن کی حقیقت کسی کے ذہن میں نہ آسکے تو جن رجسٹروں پر عمل لکھے ہوں گے وہ رجسٹر تو تولے جاسکتے ہیں اس کا ذکر بھی حدیث شریف میں موجود ہے، بہر حال عملوں کے وزن کے متعلق اسی طرح ایمان ہونا چاہئے جس طرح باقی چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب کوئی مؤمن الحمد للہ کہتا ہے تو یہ کلمہ میزان کو بھر دیتا ہے بہر حال ان چیزوں کو بھی تولا جاسکے گا البتہ عملوں کا وزن اللہ تعالیٰ اس واسطے نہیں کریں گے کہ وہ ان سے بے خبر ہے بلکہ وہ تو

ان کی حقیقت سے شروع ہی سے واقف ہیں، اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں اس نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے، تاہم عملوں کا وزن انسانی ذہن کے مطابق کیا جائے گا تا کہ کوئی آدمی عذر نہ کر سکے اور اسے اپنے اچھے اور برے عملوں کی حقیقت معلوم ہو جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسانی عملوں کی حفاظت کیلئے کئی انتظام کئے ہیں فرشتے ہر شخص کے عملوں کو نوٹ کرتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی محفوظ ہیں، لوح محفوظ میں بھی درج ہیں، خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی تمام چیزیں اور اس کی طبیعت اور مزاج میں بھی عمل محفوظ ہیں بلکہ خود انسان کے اپنے حافظے میں بھی محفوظ رہتے ہیں، "سورۃ انبیاء" میں ہے کہ: قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھ دیئے جائیں گے اور کسی شخص سے زیادتی نہیں کی جائے گی بلکہ پورا پورا حساب کیا جائے گا۔

عملوں میں وزن اور پاکیزگی ایمان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے انسان کا ایمان جس قدر درست ہوگا اور عمل میں اخلاص ہوگا اسی قدر ان کا وزن بڑھ جائے گا، اس کے برخلاف ریاکاری کی وجہ سے عمل کا وزن ہلکا ہو جاتا ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے دین، یعنی: نیت میں اخلاص پیدا کرلو تو تھوڑا عمل بھی تمہیں کافی ہو جائے گا، "ترمذی شریف" اور بعض دوسری کتابوں میں یہ مشہور حدیث ہے جسے آپ سنتے رہتے ہیں کہ قیامت والے دن ایک شخص پیش ہوگا جس کے عملوں کے ننانوے رجسٹر ہوں گے اور ہر رجسٹر اتنا لمبا چوڑا ہوگا کہ جہاں تک نظر جا سکے، یہ رجسٹر برائیوں سے بھرے ہوئے ہوں گے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے بندے! یہ تیرے عمل ہیں؟ عرض کرے گا ہاں باری تعالیٰ، یہ سب میرے ہی عمل ہیں یہ سارے برے عمل میں نے ہی کئے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ایک چھوٹا سا پرچہ (چٹ) حاضر کرنے کا حکم دیں گے، بندہ عرض کرے گا، مولا کریم! میرے ان بڑے بڑے سیاہ رجسٹروں کے مقابلے میں اس چھوٹے سے پرزے کی کیا حیثیت ہے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اپنے میزان کے وقت حاضر ہو تیرا رب کسی پر زیادتی نہیں کرتا اس کاغذ پر کلمہ توحید "لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ" لکھا ہوا ہوگا، جب وہ پلڑے میں ڈالا جائے گا تو ننانوے رجسٹروں سے بھی وزنی نکلے گا جس سے وہ بندہ تعجب میں پڑ جائے گا، محدثین کرام فرماتے ہیں کہ یہ ایسے شخص کا معاملہ ہے جو ساری عمر،

کفر، شرک اور بدعتوں میں رہا مگر آخری وقت خلوص دل کے ساتھ کلمہ پڑھ لیا اس کے بعد اسے مزید نیکیاں کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، لہٰذا یہی کلمہ اس کی نجات کیلئے کافی ہو جائے گا۔

حدیث شریف میں ایک دوسرے شخص کا واقعہ بھی آتا ہے کہ کفر و اسلام کی جنگ جاری تھی اس دوران ایک کافر شخص نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، اے پیغمبر! اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو کیا مجھے جنت مل جائے گی، فرمایا: ہاں! چنانچہ اس شخص نے کلمہ پڑھ لیا اور جہاد میں شریک ہو گیا، پھر وہ لڑتے لڑتے شہید ہو گیا، حالانکہ ابھی تک نہ اس نے کوئی نماز پڑھی تھی، نہ روزہ رکھا تھا اور نہ کوئی دوسرا عمل کیا تھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا: اس شخص نے عمل تو تھوڑا کیا مگر اسے اجر بہت زیادہ مل گیا، ایسے ہی لوگوں کے چھوٹے چھوٹے عمل بڑے بڑے گناہوں کا کفارہ بن جائیں گے اور وزن میں بھاری ہو جائیں گے۔

حدیثوں میں ہے کہ حشر کے میدان میں انسان کے نیک عمل اس کی سواری بن جائیں گے اور برے عمل بوجھ بن کر اس کے سر پر سوار ہو جائیں گے، ایک صحیح حدیث میں ہے کہ قرآن کریم کی "سورۂ بقرہ" اور "سورۂ آل عمران" حشر کے میدان میں دو گھرے بادلوں کی شکل میں آ کر ان لوگوں پر سایہ کریں گی جو ان سورتوں کے پڑھنے والے تھے، قرآن مجید کے بھی بہت سے ارشادات سے اس کی تائید ہوتی ہے، ارشاد ہے کہ لوگوں نے دنیا میں جو کچھ عمل کیا تھا اس کو وہاں حاضر و موجود پائیں گے، ایک آیت میں فرمایا: جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھی کوئی نیکی کرے گا تو قیامت میں اس کو دیکھے گا، اور ایک ذرہ کے برابر بھی برائی کرے گا تو قیامت میں اس کو بھی دیکھے گا، ظاہراً ان حالات سے یہی ہے کہ انسان کا عمل اس کے سامنے آئے گا، گویا عملوں کے بدلے کو موجود پائے گا اور دیکھے گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: جب حضرت نوح علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو اپنے لڑکوں کو جمع کر کے فرمایا کہ: میں تمہیں کلمۂ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ اگر ساتوں آسمان اور زمین ایک پلڑے میں اور کلمۂ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو کلمہ

توحید کا پلڑا ہی بھاری رہے گا، اسی مضمون کی روایتیں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے حدیث کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے، "بخاری و مسلم" میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: قیامت کے روز بعض موٹے آدمی آئیں گے جن کا وزن اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگا اور اس کی گواہی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی، یعنی: قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قرار نہ دیں گے۔

مؤمن مسلمان کا پلہ کبھی بھاری کبھی ہلکا ہوگا، اس لئے بعض علماء تفسیر نے فرمایا کہ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حشر کے میدان میں وزن دو مرتبہ ہوگا، اول: کفر وایمان کا وزن ہوگا جس کے ذریعہ مؤمن، کافر کا فرق کیا جائے گا، اس وزن میں جس کے نامۂ اعمال میں صرف کلمۂ ایمان بھی ہوگا تو اس کا پلہ بھاری ہوجائے گا اور وہ کافروں کے گروہ سے الگ کردیا جائے گا، پھر دوسرا وزن: نیک وبرے عمل کا ہوگا اس میں کسی مسلمان کی نیکیاں کسی کی برائیاں بھاری ہوں گی اور اسی کے مطابق اس کو جزاء وسزا ملے گی اس طرح تمام آیتوں اور حدیثوں کا مضمون اپنی اپنی جگہ درست ہوجاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جس پر امام بخاری نے اپنی کتاب کو ختم کیا ہے اس میں یہ ہے کہ دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر بہت ہلکے ہیں مگر عمل کے ترازو میں بہت بھاری ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہیں اور وہ دو کلمے یہ ہیں "سُبْحَانَ اللهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ" اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "سبحان اللہ" کہنے سے میزان کا آدھا پلڑا بھر جاتا ہے، اور "الحمدللہ" سے باقی آدھا پورا ہوجاتا ہے، اور "ابوداؤد، ترمذی، ابن حبان" نے حضرت ابوالدرداء سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: عمل کے ترازو میں اچھے اخلاق کے برابر کوئی عمل وزنی نہیں ہوگا اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: تمہیں ایسے دو کام بتاتا ہوں جن پر عمل کرنا انسان کیلئے کچھ بھاری نہیں اور عمل کے ترازو میں وہ سب سے زیادہ بھاری ہوں گے ایک اچھا اخلاق، دوسرے زیادہ خاموش رہنا، یعنی: بلا

ضرورت بات نہ کرنا۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے تو وہاں کوئی شخص خدا تعالیٰ کے خوف سے رورہا تھا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ: انسان کے تمام عملوں کا تو وزن ہوگا، مگر خدا وآخرت کے خوف سے رونا ایسا عمل ہے جس کو تولا نہ جائے گا بلکہ ایک آنسو بھی جہنم کی بڑی سے بڑی آگ کو بجھا دے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ حشر کے میدان میں ایک شخص حاضر ہوگا جب اس کا نامۂ اعمال سامنے آئے گا تو وہ اپنے نیک عمل کو کم پا کر گھبرائے گا کہ اچانک ایک چیز بادل کی طرح اٹھ کر آئے گی اور اس کے نیک عمل کے پلڑے میں گر جائے گی اور اس کو بتلایا جائے گا کہ یہ تیرے اس عمل کا پھل ہے جو تو دنیا میں لوگوں کو دین کی باتیں اور دین کے مسائل بتلاتا اور سکھاتا تھا اور یہ تیری تعلیم کا سلسلہ آگے چلا تو جس جس شخص نے اس پر عمل کیا ان سب کے عمل میں تیرا حصہ بھی لگایا گیا۔

طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: جو شخص جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جائے اس کی میزان عمل میں دو قیراط رکھ دی جائیں گی، اور دوسری روایات میں ہے کہ اس قیراط کا وزن احد پہاڑ کے برابر ہوگا، طبرانی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: انسان کے عمل کے ترازو میں سب سے پہلے جو عمل رکھا جائے گا وہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے اور ان کی ضرورتیں پوری کرنے کا نیک عمل ہے، اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: قیامت کے دن علماء کی روشنائی جس سے انہوں نے علم دین اور احکام دین لکھے ہیں اور شہیدوں کے خون کو تولا جائے گا تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون کے وزن سے بڑھ جائے گا۔

قیامت کے دن عملوں کے وزن کے سلسلہ میں بہت ساری حدیثیں ہیں، یہاں چند کو اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان سے خاص خاص عملوں کی فضیلت اور قدر وقیمت کا اندازہ ہوتا ہے، ان تمام حدیثوں سے عملوں کے

وزن کی کیفیت مختلف معلوم ہوتی ہے، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل کرنے والے انسان تولے جائیں گے وہ اپنے اپنے عمل کے اعتبار سے ہلکے بھاری ہوں گے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نامۂ اعمال تولے جائیں گے اور بعض سے ثابت ہوتا ہے کی خود عملوں ہی کو تولا جائے گا، امام تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سب نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ: یہ ہوسکتا ہے کہ وزن مختلف صورتوں سے کئی مرتبہ کیا جائے، اور ظاہر ہے کہ پوری حقیقت ان معاملوں کی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں اور عمل کرنے کیلئے اس حقیقت کا جاننا ضروری بھی نہیں صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ہمارے عملوں کا وزن ہوگا، نیک عملوں کا پلڑا ہلکا رہا تو عذاب کے مستحق ہوں گے، یہ دوسری بات ہے کہ حق تعالیٰ کسی کو خود اپنے فضل وکرم سے یا کسی کی شفاعت سے معاف فرمادیں اور عذاب سے نجات ہوجائے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: قبر وحشر میں انسان کے عمل خاص خاص شکلوں اور صورتوں میں آئیں گے، قبر میں انسان کے نیک عمل ایک حسین صورت میں اس کا دل بہلائیں گے، اور برے عمل سانپ بچھو بن کر لپٹیں گے، حدیث میں ہے کہ جس شخص نے مال کی زکوٰۃ نہیں ادا کی وہ مال ایک زہریلے سانپ کی شکل میں اس کی قبر میں پہنچ کر اس کو ڈسے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں، اسی طرح دوسری حدیثوں میں ہے کہ حشر کے میدان میں انسان کے نیک عمل اس کی سواری بن جائیں گے اور برے عمل بوجھ بن کر اس پر سوار ہوجائیں گے۔

زندگی کا سامان

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ

اور البتہ جگہ دی ہم نے تم کو میں زمین اور کردیئے ہم نے لئے تمہارے میں اس زندگی کے سامان

قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۧ﴿۱۰﴾ ع ۱ / ۸

بہت تھوڑا سا شکر کرتے ہو تم (۱۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے تم کو زمین میں جگہ دی اور اس میں تمہارے لئے روزیاں مقرر کردیں تم بہت کم شکر کرتے ہو۔(۱۰)

تفسیر

ارشاد ہے کہ تم غور کرو کہ زمین میں تم کو اتنی طاقت دے کر کس نے بسایا، صرف اللہ تعالیٰ نے جس کے آگے ہر چیز جھک جاتی ہے، اگر اس کے خلاف کسی کا دعویٰ ہے تو اسے پیش کرو تا کہ وہ اپنا دعویٰ ثابت کرے، لیکن اول تو کسی کو ایسا دعویٰ کرنے کی مجال نہیں، اور اگر نادانی سے کر بھی بیٹھا تو منہ کی کھائے گا، کیونکہ وہ اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا، سنو! تمہیں زمین میں ہم نے جگہ دی ہے اور تمہارے فائدے کی بہت سی چیزیں پیدا کر دی ہیں اور تمہیں ان کا مالک بنا دیا ان سے تمہاری ساری زندگی کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، یہ سب ساز و سامان دے کر ہم نے تمہیں دنیا میں بسایا ہے تمہارا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے ایسے انعام کرنے والے، احسان کرنے والے کا شکر ادا کرو، لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ تم اکثر ناشکری کرتے ہو اور اگر کبھی شکر ادا بھی کیا تو تھوڑا سا برائے نام۔

مقصود یہ ہے کہ انسان کو دنیا میں اپنے مرتبے کو دیکھ کر سب سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ یہ سب کس نے دیا، یہ اس کی عقل کا کام ہے اور اس کیلئے اتنی ہی عقل کافی ہے جو بعض جانوروں کو بھی ملی ہے، جانور اس شخص کو جو انہیں کھانے پینے کی چیزیں دے اور ان کی خبر گیری کرے پہچانتے ہیں اور اپنے طور پر اس کی خدمت کرتے ہیں ان کے بہت سے کاموں اور اشاروں سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اپنے مالک کو پہچانتے ہیں اور اس کا احسان مانتے ہیں، آدمی اس معمولی عقل میں بھی ان سے زیادہ ہے اسے ہرگز زیب نہیں دیتا کہ احسان کرنے والے کے پہچاننے اور اس کا شکر ادا کرنے میں جانوروں سے بھی گیا گزرا ہو اور اتنا بھی نہ سمجھے کہ مجھے اپنے احسان کرنے والے کا شکر ہر طرح سے ادا کرنا چاہئے اور اس کا ہر حکم بجالانا چاہئے۔

یوں تو انسانوں میں بڑے بڑے عقل والے ہیں جو اپنے خالق مالک اور رب کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں، لیکن اتنی عقل ہر ایک کو ملی ہے جس سے وہ اتنی بات اچھی طرح جان سکتا ہے کہ میرا پیدا کرنے والا اور مجھ کو یہ سب طاقت اور قوت دینے والا اور میرے لئے زندگی کی ساری ضرورتیں مہیا کرنے والا دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا، ضرور کوئی ہستی ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور یہ سب کچھ دیا ہے اسی کا مجھے شکر گزار ہونا چاہئے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے احسان کے طور پر ایک بات یاد دلائی ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں جگہ دی ہے، یعنی: قبضہ دے دیا ہے، جما دیا ہے تمہیں زمین میں تسلط دے دیا ہے اسے جس طرح چاہو استعمال کرو، چنانچہ کوئی نہریں کھودتے ہیں، کوئی کانیں نکالتے ہیں، کوئی عمارتیں بناتے ہیں، زمین کو ایسی حالت پر بنایا ہے کہ وہ تمہاری خدمت کیلئے ہر وقت تیار رہتی ہے اس میں ہل چلاؤ، اناج پیدا کرو، طرح طرح کی سبزیاں اور پھل حاصل کرو تمہیں زمین پر اختیار دیدیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس زمین میں تمہارے لئے روزی کے سامان پیدا کر دیئے ہیں زمین سے متعلقہ مختلف قسم کے روزی کے وسائل مہیا کر دیئے ہیں تا کہ تم کماؤ اور کھاؤ پیو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نعمتوں کا ذکر فرما کر حق کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی ترغیب اس طرح دی ہے کہ ہم نے تم کو زمین پر پوری قدرت دی، اور پھر اس میں تمہارے لئے زندگی گزارنے کی ہزاروں چیزیں عطا کر دیں، گویا اللہ تعالیٰ نے زمین کو انسان کی تمام ضرورتوں سے لے کر تفریحی سامان تک عظیم الشان گودام بنا دیا ہے اور تمام انسانی ضرورتوں کو اس کے اندر پیدا فرما دیا ہے اب انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ اس گودام سے اپنی ضرورت کی چیزوں کو نکالنے اور ان کے استعمال کرنے کے طریقوں کو سیکھ لے، انسان کے ہر علم وفن اور سائنس کی نئی سے نئی ایجاد کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ خالق کائنات کی پیدا کی ہوئی چیزیں جو زمین کے گودام میں محفوظ ہیں ان کو سلیقہ کے ساتھ نکالے اور صحیح طریقہ سے استعمال کرے، بیوقوف اور بدسلیقہ آدمی جو اس گودام سے نکالنے کا طریقہ نہیں جانتا یا پھر نکال کر اس کے استعمال کا طریقہ نہیں سمجھتا وہ ان کے فائدوں سے محروم رہتا ہے، سمجھدار انسان دونوں چیزوں کو سمجھ کر ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی ساری ضرورتوں کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں رکھ دیا ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر کرے مگر وہ غفلت میں پڑ کر اپنے خالق و مالک کے احسانوں کو بھول جاتا ہے اور انہی چیزوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے؛ اسی لئے آیت کے آخر میں شکایت کے طور پر ارشاد فرمایا کہ: تم لوگ بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

انسان کا مرتبہ

وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا
اور البتہ پیدا کیا ہم نے تم کو پھر صورت دی ہم نے تم کو پھر کہا ہم نے فرشتوں کو سجدہ کرو

لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ⑪
آدم کو پس سجدہ کیا انہوں نے مگر ابلیس نہ تھا وہ میں سے سجدہ کرنے والوں (۱۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں، پھر فرشتوں کو حکم کیا آدم کو سجدہ کرو پس سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس (نے سجدہ نہ کیا) وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ ہوا۔ (۱۱)

تفسیر

ہم نے آدم کو پیدا کرنے کے بعد فرشتوں سے کہا کہ دیکھو! یہ آدم ہیں اور تمام انسانوں کے باپ ہیں ان کو سجدہ کرو، یہ سن کر سب فرشتے سجدہ میں گر پڑے، لیکن ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا اور اس کے اس عمل نے اسے مردود کروا دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر اس سے پہلے "سورۃ البقرۃ" کے تیسرے رکوع میں گزر چکا ہے وہاں کہا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے سے ان کی اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی خلیفہ ہوئی، اس کا ذکر اس سے پہلی سورۃ، یعنی: "سورۃ الانعام" کی آخری آیت میں ہے اور اس کی تشریح اس آیت کی تفسیر میں کردی گئی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انسانوں کو ابلیس کی دشمنی سے پورے طور پر آگاہ کردیا جائے اور اچھی طرح خبردار کردیا جائے کہ دنیا میں تم سب سے قوت والے ہو تم اپنی اندرونی قوتوں کی بدولت جس طرح چاہو دنیا کی چیزوں کو کام میں لاسکتے ہو دنیا کی ساری بیرونی قوتیں تمہاری فرمانبردار ہیں لیکن

ایک قوت نے تمہارا فرمانبردار ہونے سے انکار کردیا ہے اس کی وجہ سے یہ ضروری ہوگیا کہ تمہیں اس سے خبردار رہنے کی ہدایت کی جائے تاکہ تم سمجھ لو کہ جب تم اپنی قوتیں اپنی بہتری کا سامان حاصل کرنے کیلئے صرف کروگے تو ایک قوت ایسی بھی ہے جو تمہاری انہی قوتوں کو مکر وفریب کے ذریعے چاپلوسی سے دھمکی دے کر یا دھوکہ دے کر جس طرح سے ہوسکے گا اس طرح صرف کرنے کیلئے کہے گی جس سے تمہیں بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہوگا؛ اس لئے تمہیں آگاہ کیا جاتا ہے کہ تم اپنی قوتیں ابلیس کے کہنے کے مطابق صرف نہ کرنا یہ تمہارا دشمن ہے تمہیں برباد کرکے چھوڑے گا، ہم تمہیں ان کے صرف کرنے کا طریقہ بتادیں گے اس طرح صرف کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی ابتداء اس طرح کی کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، آپ کی پیدائش مٹی سے ہوئی، اللہ تعالیٰ نے مٹی سے حضرت آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ بنایا، پھر اس میں روح ڈالی اور اس طرح انسانی نسل کی ابتداء فرمائی، اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا اسے شکل وصورت بخشی اور اسے ساری مخلوق پر عظمت عطا کی انسانی عظمت کو ظاہر کرنے کیلئے اسی نے اپنے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ہر شریعت میں عبادت کا سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کیلئے جائز رہا ہے اور اس کے علاوہ کسی کے سامنے یہ سجدہ نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ نے جس سجدے کا حکم فرشتوں کو دیا وہ سجدہ تعظیم کیلئے بھی تھا جو بعض شریعتوں میں جائز تھا مگر ہماری شریعت میں تعظیم کیلئے بھی سجدہ جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے، بہرحال یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت کو ظاہر کرنے کیلئے کرایا گیا تھا۔

بہرحال اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کیلئے فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ نہیں کیا اور مردود قرار پایا۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... سجدہ خواہ عبادت کیلئے ہو یا تعظیم کیلئے شریعت محمدی میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کیلئے کرنا جائز نہیں ہے۔

ابلیس کو دھتکار

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ
کہا کس چیز نے منع کیا تجھ کو کہ نہ سجدہ کرے تو جب حکم کیا میں نے تجھ کو بولا میں بہتر ہوں سے اس
خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا
بنایا تو نے مجھے سے آگ اور بنایا تو نے اس کو سے مٹی (۱۲) کہا پس اتر تو سے جگہ اس پس نہیں
يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾
ہے لئے تیرے یہ کہ بڑائی مارے تو میں اس پس نکل جا تو بیشک تو ہے میں سے ذلیلوں (۱۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ کہا! تجھ کو کس چیز نے منع کیا تھا کہ جب میں نے حکم دیا تو نے سجدہ نہ کیا، بولا: میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے بنایا اور اس کو مٹی سے بنایا۔(۱۲) کہا! اتر تو یہاں سے تو اس لائق نہیں کہ یہاں تکبر کرے، پس باہر نکل تو ذلیلوں میں سے ہے۔(۱۳)

تفسیر

اللہ تعالیٰ نے شیطان سے پوچھا کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو تو نے سجدہ کیوں نہ کیا، یعنی: کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے منع کیا تو شیطان نے کہا میں آدم سے بہتر ہوں، لہٰذا میں اس کے سامنے کیسے جھک سکتا ہوں، شیطان نے اپنی برتری کیلئے یہ دلیل پیش کی کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے جبکہ آدم کو مٹی سے، لہٰذا میں افضل ہوں۔

یہاں پر ایک اور اشکال کی وضاحت بھی ہو جانی چاہئے کہ "وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ: جب ہم نے فرشتوں سے کہا" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سجدہ کا حکم صرف فرشتوں کیلئے تھا، "سورۂ بقرہ" میں بھی اسی قسم کے الفاظ آتے

ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حکم صرف فرشتوں کو تھا تو پھر ابلیس نے سجدہ نہ کر کے کون سی حکم کی نافرمانی کی؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت کے الفاظ "اِذْ اَمَرْتُكَ" سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتوں کے علاوہ ابلیس کو بھی سجدہ کرنے کا الگ سے مستقل حکم دیا گیا تھا۔

ابلیس نے اپنی برتری کی جو وجہ بیان کی وہ یہ تھی کہ آگ کو مٹی پر فوقیت حاصل ہے، آگ میں روشنی، چمک اور بلندی پائی جاتی ہے جب کہ مٹی ایک حقیر چیز ہے جو پاؤں تلے روندھی جاتی ہے یہ شیطان کی سوچ تھی، حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے، البتہ کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں مگر یہ شیطان کی بدقسمتی ہے کہ وہ فضیلت کے اصلی راز کو نہ سمجھ سکا، جب ابلیس نے اللہ تعالیٰ کا حکم نہ مانا اور اپنی بڑائی جتلائی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا جنت سے نکل جاؤ یہ تیرے لائق نہیں تھا کہ تو یہاں غرور و تکبر کرتا، تجھے تو عاجزی کرنی چاہئے اور حکم کو پورا کرنا چاہئے تھا، تو یہاں سے نکل جا، تو ذلیلوں میں سے ہے غرور کی وجہ سے شیطان پر ذلت کا ٹھپہ لگ گیا جو بھی غرور کرے گا ذلیل و خوار ہوگا اس کے برخلاف جو عاجزی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو بلند کریں گے، یہ گفتگو اگلی آیت میں بھی چل رہی ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں شیطان سے گفتگو کے ضمن میں بہت سی باتیں سمجھائی گئی ہیں جن میں ہمارے لئے بڑی تعلیم ہے۔

ابلیس نے بہکانے کی ٹھان لی

قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ⑭ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ⑮

بولا مہلت دے مجھ کو تک اس دن کہ اٹھائے جائیں گے (۱۴) فرمایا بیشک تو ہے میں سے مہلت دیئے ہوؤں (۱۵)

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑯

کہا پس جس طرح گمراہ کیا تو نے مجھ کو ضرور بیٹھوں گا میں لئے انکے پر راستے تیرے سیدھے (۱۶)

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ

پھر آؤں گا میں ان تک میں سے بیچ ہاتھوں انکے کے اور سے پیچھے ان کے اور سے

اَیْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ ﴿۱۷﴾

دائیں ان کے اور سے بائیں ان کے اور نہ پائے گا تو اکثر ان کے کو شکر کرنے والے (۱۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بولا مجھے اس دن تک مہلت دے جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ (۱۴) فرمایا: تجھ کو مہلت دی گئی۔ (۱۵) بولا، جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی ان کی تاک میں تیری سیدھی راہ پر ضرور بیٹھوں گا۔ (۱۶) پھر ان پر آؤں گا ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور دائیں سے اور بائیں سے اور تو ان میں سے اکثروں کو شکرگزار نہ پائے گا۔ (۱۷)

تفسیر

جب ابلیس کو جنت سے نکال دیا گیا تو بڑی بات ہوئی آخر آگ کا بنا ہوا تھا جھنجھلا اٹھا یہ بھی دل میں جانتا تھا کہ میرے اپنے آپ کو بڑا سمجھنے سے بنے بنائے گا کچھ نہیں کیونکہ اصل قوت اور عزت تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے وہی دے تو ملے ورنہ کوئی صورت نہیں دھتکار تو مجھ پر پڑ ہی چکی، اچھا بن کر تو اب کچھ کرنے سے رہا صورت یہی ہے کہ آدم کو خراب کرنے کی طاقت اللہ سے مانگ لوں اور وہ طاقت ایسی ہو کہ جب تک آدم کی نسل کا ایک فرد بھی دنیا میں ہے اس کے بہکانے میں اسے استعمال کرسکوں، ایسا کچھ منصوبہ بنا کر اور سب طرف سے مایوس ہو کر چلایا کہ مجھے قیامت قائم ہونے تک برقرار رکھا جائے اس وقت تک مجھے اختیار دیا جائے کہ میں جو چاہے کروں مجھ سے پوچھ گچھ نہ کی جائے، یہاں پر وقت سے مراد حساب کتاب کا وقت نہیں بلکہ پہلی دفعہ صور پھونکے جانے کا وقت ہے، یعنی: اس وقت تک تجھے لوگوں کو ورغلانے کی اجازت ہے، شیطان نے مزید یہ کہا کہ قیامت کے دن آپ کو اختیار ہے جو چاہے مجھے سزا دیں بارگاہ الٰہی میں دیر کا کیا کام ہے جو جس کے قابل ہے مانگنے سے اسے ملے گا اور یہ معلوم تھا کہ یہ چاہے جو کچھ کرے جہان کے نظام کو نہیں بگاڑ سکتا، چلو اسے بھی اپنی کوشش کر لینے دو، حکم ہوا کہ جا تجھے مہلت دی گئی بس پھر کیا تھا ابلیس کی دلی مراد پوری ہوئی وہ حضرت آدم علیہ السلام

سے بدلہ لینے کے جوش میں اندھا ہو رہا تھا مارے خوشی کے ناچنے لگا اگر اس کے خوشی میں پاگل ہو جانے کا کچھ اندازہ لگانا ہے تو عدالت میں فوجداری میں جا کر اس شخص کی حالت دیکھئے جس کو اپیل میں موت کی سزا سے عمر بھر کیلئے بچا دیا گیا ہو ایسا شخص خوشی کے جوش میں سچ مچ پاگل ہو جاتا ہے اسی طرح ابلیس دندناتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہتا ہے میں بھی اپنی سی کر کے دکھادوں گا میں اس کے گرد چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر بیٹھ جاؤں گا فریب اور چال بازی کا جال بچھاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ اکثر لوگ میرے جال میں پھنس کر آپے سے باہر ہو جائیں گے اور آپ کا کچھ خیال نہ کریں گے اور اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جا تجھے چھٹی ہے اپنی سی کر دیکھ اس کا انجام تیرے سامنے آجائے گا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آدمی جہاد کیلئے جاتا ہے تو راستے میں شیطان ملتا ہے اور اس کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ جہاد میں جا رہے ہو مارے جاؤ گے تمہاری بیوی بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں گے اس کام سے باز آجاؤ، اس طرح جو آدمی زکوٰۃ کا مال لے کر نکلتا ہے اس کے دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ اتنی رقم دے کر تم غریب ہو جاؤ گے، "سورۂ بقرہ" میں آتا ہے کہ شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا ہے کہ مال خرچ نہ کر بیٹھنا خود کنگال ہو جاؤ گے، نمازی جب نماز کیلئے نکلتا ہے تو شیطان پھر حملہ آور ہوتا ہے کہ کوئی کام کی بات کر و جس سے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کا فائدہ ہو محض ٹکریں مارنے سے کیا فائدہ (نعوذ باللہ)، غرضیکہ شیطان ہر طریقے سے انسان کو نیکی کے کام سے روکنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ اس نے چیلنج کر رکھا ہے کہ میں تیرے سیدھے راستے میں بیٹھوں گا اور اس پر چلنے والے ہر انسان کو ورغلانے کی کوشش کروں گا کہ وہ اس راستے سے ہٹ کر میرے گروہ میں شامل ہو جائے۔

شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا سیدھے راستے پر بیٹھ جاؤں گا پھر اس راستے پر چلنے والوں کے پاس آگے سے بھی آؤں گا اور ان کے پیچھے سے بھی آؤں گا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کی تفسیر یوں بیان فرماتے ہیں کہ آگے سے مراد آخرت ہے انسان اپنی آخری منزل کی طرف ہی رواں دواں ہے اور مطلب یہ ہے کہ شیطان نے کہا کہ میں انسان کو آخرت کے معاملہ میں گمراہ کروں گا کہ قیامت، یعنی: آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے

نہ کوئی حساب کتاب کی منزل آئے گی نہ دوزخ جنت کوئی چیز ہے یہ سب بنائی ہوئی کہانیاں ہیں، لہٰذا تم آگے کا کچھ فکر نہ کرو غرضیکہ شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسان کا آخرت پر عقیدہ کمزور کردے تاکہ وہ حساب کتاب کی فکر سے آزاد ہو کر من مانی کرتا پھرے، اور اس طرح بالآخر دوزخ میں پہنچ جائے، اور پیچھے سے مراد یہ دنیا ہے، یعنی: میں دنیا کے راستے سے بھی آکر لوگوں کو گمراہ کروں گا اور اس کی صورت یہ ہے کہ میں اس دنیا کی چیزوں کو لوگوں کو مزین کر کے دکھاؤں گا میں دنیا کو لوگوں کے سامنے اس خوبصورت انداز میں پیش کروں گا کہ وہ اس کے عاشق ہو کر رہ جائیں گے۔

شیطان نے یہ بھی کہا کہ میں تیرے بندوں کے پاس آؤں گا ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق دائیں سے مراد نیکی ہے جبکہ بائیں سے مراد برائی ہے نیکی میں گمراہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو نیکی کرنے ہی نہ دی جائے یا یہ کہ نیکی کرنے کے باوجود اس کا کوئی فائدہ نہ ہو اس معاملے میں بھی شیطان وسوسہ ڈالتا ہے نیکی سے روکنے کی صورت تو یہ ہے کہ وسوسہ ڈالنے کے ذریعے کسی کو نماز، زکوٰۃ، حج، جہاد سے روک دے یا کسی غریب کی مدد نہ کرنے دے اور اگر نیکی کا کام انجام دینے کے باوجود اس میں ریاکاری شامل ہو جائے تو وہ کی ہوئی نیکی بھی ضائع ہو گئی یا نیکی کے ضائع ہونے کی یہ صورت بھی ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف ہو، اور بائیں طرف، یعنی: برائی سے مراد یہ ہے شیطان انسان کو برائی کے کاموں کی ترغیب دے اس نے اعلان کیا کہ میں برائیوں کو خوبصورت کر کے دکھاؤں گا اور لوگوں کو گمراہ کروں گا، "سورۂ بقرہ" میں ہے کہ شیطان تمہیں برائی اور بے حیائی کی ترغیب دیتا ہے ایسا وسوسہ ڈالتا ہے اور ایسی حکمت بیان کرتا ہے کہ انسان برائی پر کے کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

ابلیس نکالا گیا

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ

کہا | نکل تو | میں سے اس | ذلیل | خوار | البتہ جو | پیچھے چلا تیرے | میں سے ان

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٨﴾ وَ يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ

ضرور بھر دوں گا دوزخ کو سے تم سب سے (۱۸) اور اے آدم! رہو تو اور

زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ

بیوی آپ کی جنت میں پس کھاؤ سے جہاں چاہو تم اور نہ قریب جانا اس

الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾

درخت کے پس ہو جاؤ گے آپ دونوں میں سے ظالموں (۱۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ کہا، نکل یہاں سے برے حال سے مردود ہو کر، جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں دوزخ کو تم سب سے بھر دوں گا۔ (۱۸) اور اے آدم! آپ اور آپکی بیوی جنت میں رہو، پس جہاں سے چاہو کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ جاؤ ورنہ آپ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ (۱۹)

تفسیر

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کی بات سن کر فرمایا: تو ذلیل وخوار مردود ٹھہرایا گیا ہے، چل یہاں سے نکل ہمیں اس کی پروا نہیں کہ تو آدم کی اولاد کو بہکا کر غلط راستے پر چلائے گا اس میں ہمارا کیا جائے گا ہم تجھ کو اور تیرا کہنا ماننے والوں کو اکٹھا دوزخ میں جھونک دیں گے، پھر حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ آپ اپنی بیوی سمیت جنت میں رہو آپ دونوں کو یہاں ہر قسم کی آزادی ہے مگر ہاں! اس درخت کے پاس مت جانا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ "سورۂ بقرہ" میں گزر چکا ہے، وہاں کہا گیا ہے کہ آدم کی پیدائش سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہہ دیا تھا کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ بناؤں گا اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ اس کو خاص قوتیں دے کر اس کے ذمہ کچھ کام ڈالا جائے گا اور اس طرح اس کا امتحان لیا جائے گا کہ یہ وہ کام ٹھیک طور پر کرتا ہے یا نہیں، "سورۂ انعام" کی آخری آیت میں سب انسانوں سے صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ تم سب کو اللہ تعالیٰ

نے زمین پر خلیفہ بنایا ہے اور اس سے تمہارا امتحان مقصود ہے اس سورۃ میں حضرت آدم علیہ السلام کو اسی امتحان کیلئے تیار کرنے کا ذکر ہے انہیں جنت میں رکھا گیا جس سے یہ سمجھانا مقصود تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اور ان کی اولاد کی اصل جگہ یہ ہے پابندی اس لئے لگائی گئی کہ دنیا میں جا کر اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدوں میں رہنا یہیں سیکھ جائے اور گناہ کا مطلب اور اس کے معاف کرانے کا طریقہ بھی اسے معلوم ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کیلئے چار چیزوں کا ذکر فرمایا ہے کہ آپ جنت میں رہو وہاں آپ کے لئے یہ آسائشیں ہوں گی کہ وہاں آپ کو نہ بھوک لگے گی اور نہ پیاس، نہ آپ ننگے رہو گے اور نہ دھوپ لگے گی، دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی بنیادی ضرورتوں کھانے پینے، لباس اور رہائش کا انتظام کر دیا۔

شیطان کا فریب

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ

پس خیال ڈالا لئے ان دونوں کے شیطان نے تا کہ ظاہر کر دے لئے اسکے وہ جو چھپائی گئی تھی لئے ان دونوں سے

سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ

شرم گاہوں ان کی اور کہا نہیں منع کیا تھا تم کو نے رب آپ دونوں سے اس درخت مگر یہ کہ

تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَ قَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ

ہو جاؤ گے آپ دونوں دو فرشتے یا ہو جاؤ گے آپ دونوں میں سے ہمیشہ رہنے والو (۲۰) اور قسم کھا گیا ان دونوں سے بیشک میں

لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢١﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ

لئے آپ دونوں کے میں سے ہوں البتہ خیر خواہوں (۲۱) پس مائل کیا ان دونوں کو دھوکے سے

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر ان کو شیطان نے بہکایا تا کہ ان پر ان کی شرم گاہوں سے وہ چیز کھول دے جو کہ ان کی نظر سے پوشیدہ تھی، اور بولا کہ آپ کو آپکے رب نے اس درخت سے اس لئے روکا ہے کہ کہیں آپ دونوں دو

فرشتے نہ ہو جاؤ یا ہمیشہ رہنے والے نہ ہو جاؤ۔(۲۰) اور ان کے آگے قسم کھائی کہ میں یقیناً آپ دونوں کا دوست ہوں۔(۲۱) پس ان کو فریب سے مائل کر لیا۔

تفسیر

شیطان کو جو یہ معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں ایک خاص درخت سے منع کیا گیا ہے تو اس نے سمجھ لیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو نقصان پہنچانے کا یہی طریقہ ہے کہ کسی طرح انہیں اس درخت تک پہنچایا جائے، شیطان نے کیا چال چلی کہ ان کے دل میں یہ کہہ کر شبہ پیدا کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ درخت آپ پر حرام نہیں کیا ہے بلکہ یونہی روک دیا ہے، مثلاً: یہ کہ اس کے کھانے سے تم دونوں فرشتے بن جاؤ گے یا ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لو گے یہ شیطان کی پرانی چال ہے کہ وہ انسان کے دل میں کسی ترکیب سے اللہ کے حکم کی اہمیت باقی نہیں چھوڑتا اور کہتا ہے کہ یہ حکم ضروری نہیں ہے یونہی دے دیا گیا ہے اگر توڑنے میں تمہارا فائدہ ہو تو توڑ سکتے ہو اس کے بعد ظالم دونوں کے آگے جھوٹی قسم کھا گیا کہ میں تمہاری خیر خواہی کی بات کہتا ہوں جھوٹ نہیں بولتا، یہ سن کر وہ دونوں دھوکا کھا گئے اس چالبازی سے شیطان نے اپنی بات منوالی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے جنت کے لباس غائب ہو گئے اور انہیں جسم کے وہ حصے بھی نظر آنے لگے جن کا دیکھنا برا لگتا ہے۔

فریب کا نتیجہ

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ

پس جب چکھا دونوں نے درخت کھل گئیں ان کے شرم گاہیں ان کی اور لگے جوڑ جوڑ کر رکھنے

عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ

اوپر اپنے سے پتوں جنت کے اور پکارا دونوں کو نے رب ان دونوں کے کیا نہ منع کیا تھا تم دونوں کو سے

تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾

اس درخت اور کیا نہیں کہہ دیا تھا تم سے کہ شیطان تم دونوں کا دشمن ہے کھلا (۲۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر جب دونوں نے چکھا درخت سے تو ان پر ان کی شرم گاہیں کھل گئیں اور اپنے اوپر جنت کے پتے جوڑنے لگے اور ان کو ان کے رب نے پکارا، کیا میں نے تم کو اس درخت سے منع نہ کیا تھا اور تمہیں نہ کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔(۲۲)

تفسیر

حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی نے شیطان کے قسم کھانے سے دھوکا کھایا اور اس درخت سے کچھ تھوڑا سا پھل چکھ لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جنت کا لباس ان کے بدن سے نیچے گر گیا اور وہ ایک دوسرے کے سامنے برہنہ (ننگے) ہو گئے اور شرم کے مارے جنت کے درختوں کے پتے ایک دوسرے سے ملا ملا کر اپنا اپنا بدن ڈھانپنے لگے، پہلی سی حالت ہی نہ رہی احساسات بدل کر کچھ کے کچھ ہو گئے، ضرور خیال آیا ہو گا کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے ایسی حالت میں شرم اور حیرت کا دلوں پر اکٹھے حملہ ہوا ہو گا، اتنے میں ان کے رب کی طرف سے آواز آئی کیا میں نے تمہیں اس درخت کے پاس جانے سے منع نہیں کر دیا تھا اور صاف نہیں کہہ دیا تھا کہ یہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے یہ کبھی تمہارا خیر خواہ نہیں ہو سکتا، یہ تمہارے پاس نئی نئی شکلوں میں آئے گا لیکن اس کی غرض ہمیشہ یہ ہو گی کہ مکر و فریب سے اپنی بات تم سے منوا لے۔

آدم و حوا کو جب بنایا گیا تو وہ دونوں شیطان کے فریب جعلسازی دھوکے بازی سے ناواقف تھے اگر شیطان ان کو سجدہ کرنے سے انکار نہ کر دیتا تو ہمیشہ ایسے ہی بھولے بھالے پاک صاف بے گناہ انسان رہتے اور ہمیشہ جنت کی فضا میں وہاں کا لباس پہنے سیر کرتے کھاتے پیتے پھرا کرتے، ظاہر بات ہے کہ جب کوئی خود پاک صاف دل کا کھرا ہو تو دوسرے کو خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، استاد دھوکے باز، فریبی، دل کا کھوٹا نہیں سمجھ سکتا، شیطان

پہلے دھوکے باز، بے ایمان نہ تھا اس کے غرور نے اسے مردود کر دیا اور پھر اس نے دشمنی کی ٹھان لی اور دشمنی ایسی بری بلا ہے کہ دشمن کو نقصان پہنچانے کیلئے سب کچھ سکھا دیتی ہے ایسی حالت میں حضرت آدم اور ان کی بیوی کا اس کی بات اور قسم کا اعتبار کرنا فطری بات تھی، یہاں سے سمجھ لینا چاہئے کہ انسان خود بھولا بھالا اور ایماندار ہے بگڑتا ہے تو کسی کے بہکانے سے بگڑتا ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رہنمائی کا محتاج ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: پختہ ایمان والے مؤمن وہ ہوتے ہیں جو معمولی غلطی اور صغیرہ گناہ کو بھی بڑا گناہ خیال کر کے ڈر جاتے ہیں کہ کہیں پکڑ نہ ہو جائے، اس کے برخلاف منافق کی حالت یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے گناہ کو بھی ایسا ہی سمجھتا ہے، جیسے: ناک پر مکھی بیٹھ جائے تو آدمی آسانی سے اڑا دیتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام چونکہ بڑی شان والے تھے اس لئے اس غلطی پر فوراً پریشان ہو گئے اور یہی مٹی کی خاصیت ہے کہ اس میں عاجزی، انکساری، تواضع، حلم بردباری پائی جاتی ہے، چنانچہ اس غلطی پر حضرت آدم علیہ السلام فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ جنت سے نکلنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام تین سو سال تک اپنی لغزش پر روتے رہے اور اس کے بعد جیسا کہ "سورۂ بقرہ" میں آتا ہے حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے جن کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتے تھے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

زمین پر آگئے

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا

کہا ان دونوں نے اے رب ہمارے! ظلم کیا ہم نے اپنے آپ پر اور اگر نہ بخشا آپ نے ہم کو اور رحم (نہ) کیا ہم پر

لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ

تو ضرور ہو جائینگے ہم سے خسارہ پانے والوں میں (۲۳) فرمایا اترو تم بعض تمہارے لئے بعض کے دشمن

وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا

اور لئے تمہارے میں زمین ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا ہے تک ایک مدت (۲۴) فرمایا میں اسی

تَحْيَوْنَ وَ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُوْنَ﴿۲۵﴾

جیوگے تم اور میں سے اسی مروگے تم اور سے اسی تم نکالے جاؤ گے (۲۵)

ع ۱۵ ۲ ۹

بامحاورہ ترجمہ:۔ وہ دونوں بولے، اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر آپ ہم کو نہ بخشیں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو ہم ضرور تباہ ہو جائیں گے۔(۲۳) فرمایا: تم اترو! تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اور تمہارے لئے ایک وقت تک زمین میں ٹھکانا اور نفع اٹھانا ہے۔(۲۴) فرمایا: اسی میں تم زندہ ہو گے اور اسی میں تم مرو گے اور اسی سے تم نکالے جاؤ گے۔(۲۵)

تفسیر

انسان میں فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی پہچان کی قوت موجود ہے، وہ اس کا فرمانبردار ہے اس کے حکم کے سمجھنے کی عقل موجود ہے، چونکہ فطرتاً خود نیک ہے اس لئے کسی کو بغیر معاملہ پڑے بدمعاملہ، فریبی اور دھوکے باز ماننے کیلئے تیار نہیں، اس کے اندر بات کے بھول جانے کا عیب بھی موجود ہے اس سے قصور اور کوتاہی ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں، پھر یہ بھی اس کی فطرت میں داخل ہے کہ قصور ہو جائے تو اس پر شرمندہ ہوتا ہے اور پچھتاتا ہے اور اگر کوئی اس کو یقین دلا دے کہ تو نے میرے حق میں کوتاہی کی ہے تو اس سے معافی مانگنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے ان سب باتوں کو دھیان میں رکھ کر دیکھئے تو حضرت آدم اور ان کی بیوی سے جو کچھ ہوا وہ سب ان کی فطرت کا تقاضہ ہے، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس درخت کے پاس نہ جانا وہ اللہ عزوجل کو اپنا رب جانتے تھے، انہوں نے اس حکم کو پورا کیا ان سے کہا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے وہ اس کو سمجھ گئے لیکن خود نیک ہونے کی وجہ سے شیطان کی چالبازی کا انہیں خیال بھی نہیں آسکتا تھا، اس نے قسم کھائی وہ اسے سچ کے سوا کچھ سمجھ نہیں سکتے تھے اس لئے اس کی باتوں کو سچ جانا اور اللہ کے حکم کا مطلب اس کے کہنے کے مطابق سمجھ لیا جب پھل کھا لیا قصور کا احساس ہوا اور

شرمندگی شروع ہوئی، پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ بات یاد دلائی جو وہ بھول گئے تھے، یعنی: ابلیس ان کا دشمن ہے اس پر انہیں احساس ہوا کہ یہ تو "نعوذ باللہ" ایک طرح سے اللہ کی نافرمانی ہوئی، فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے لگے اور کہا جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے کہ دونوں اپنے رب کے آگے جھک گئے اور عرض کی اے اللہ! ہم نے بڑی زیادتی کی آپ تو ہمارے رب ہیں اگر آپ نے یہ ہمارا گناہ معاف نہ کیا تو سوا نقصان کے ہمیں کچھ نصیب نہ ہوگا، وہاں سے حکم ہوا اب تمہاری سمجھ میں آیا کہ دشمن کیسا ہوتا ہے اب تم سب یہاں سے زمین پر جاؤ اور اپنی اپنی قوتیں ایک دوسرے کے مقابلے میں آزماؤ، اب تمہیں ایک مقررہ مدت تک زمین میں رہنا ہوگا کیونکہ جنت دشمنی اور اکھاڑ پچھاڑ کی جگہ نہیں؛ اس لئے تم سب زمین پر جاؤ۔

فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ: انسانوں کیلئے عام قانون یہی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں ہابیل اور قابیل سے لے کر آج تک زمین میں ہی دفن ہوتے آرہے ہیں اگر کوئی شخص سمندر کی لہروں کی نذر ہوگیا یا جلا دیا گیا یا کسی درندے کے پیٹ میں چلا گیا پھر بھی اس کے اجزاء بالآخر زمین ہی کا حصہ بنتے ہیں اور اس قسم کے واقعات بہت کم ہوتے ہیں، بہر حال انسان کا تعلق کسی نہ کسی طرح زمین سے قائم رہتا ہے۔

پرہیزگاری کا لباس

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ

اے اولاد آدم کی! تحقیق اتارا ہم نے پر تم ایسا لباس جو ڈھانکے شرم گاہیں تمہاری اور

رِيْشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ

بڑھیا کپڑے اور لباس پرہیزگاری کا وہ ہے سب سے اچھا یہ ہے سے نشانیوں اللہ کی

لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

تا کہ وہ غور کریں (۲۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے آدم کی اولاد! ہم نے تم ایسا لباس اتارا جو تمہاری شرم گاہیں ڈھانکے اور

آرائش کیلئے کپڑے اتارے اور پرہیز گاری کا لباس وہ سب سے بہتر ہے یہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں تاکہ وہ لوگ غور کریں۔(۲٦)

لفظی تحقیق: تَقْوٰی: پرہیز گاری۔ یہ لفظ بہت جگہ آیا ہے یہاں اس سے مراد حیا اور شرم ہے جو بری اور بیہودہ باتوں سے بچاتی ہے، انسان کا اصل لباس یہی ہے، حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی کو اچھی طرح اونچ نیچ سمجھا کر جنت سے دنیا میں بھیج دیا گیا اب ان کی اولاد کو نصیحت کی جاتی، پہلی نصیحت اس آیت میں ہے۔

تفسیر

ارشاد ہے اے آدم کی اولاد! ہم نے دنیا میں زمین سے ایسی چیزیں اُگائی جن سے تم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں سے کام لے کر اپنا لباس تیار کر سکتے ہو اور ان سے اپنے بدنوں کے ان حصوں کو ڈھانک سکتے ہو جن کا کھولنا شرم کا باعث ہے، اس کے علاوہ لباس تمہارے بدن کی سجاوٹ اور اس کے گرم رکھنے کا بھی ذریعہ ہے، اصل میں یہ لباس تمہارے حیا و شرم کا مددگار ہے اصل چیز جس سے تمہارے بدن اور روح کی حفاظت ہو سکتی ہے وہ تقویٰ ہے جس کا بڑا حصہ حیا و شرم ہے، یہ حیا و شرم اور خدا کا خوف ہی ہے جو تمہیں بے حیائی، بری باتوں اور گندگیوں سے بچائے گا، اگر تقویٰ نہ ہو تو لباس گناہوں سے روکنے کیلئے کافی نہیں، لباس تو اللہ تعالیٰ کی ظاہری نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جس پر غور کرنے سے تم سمجھ سکتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں پاک اور صاف ستھرا رکھنا چاہتے ہیں اگر تم لباس سے اتنی بات نہ سمجھے کہ یہ دل کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے تو تم نے غور و فکر سے وہ کام نہیں لیا جو عاقل بالغ ہونے کی حیثیت سے تمہیں لینا چاہئے جب تقویٰ اصل چیز ہے تو لباس بھی شرع کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

سَوْاٰتِكُمْ: جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپاتا ہے، شرمگاہ کا کھل جانا پوری مہذب دنیا میں برا سمجھا جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے لباس کا پہلا فائدہ یہ بتایا کہ یہ تمہارے ننگے جسم کو چھپاتا ہے، "ترمذی شریف" کی روایت

میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، اے پیغمبر! ہم جسم کا کتنا حصہ کھول سکتے ہیں اور کتنا حصہ چھپا کر رکھیں یا دوسروں کا کتنا حصہ دیکھ سکتے ہیں، آپ نے فرمایا: شرمگاہوں کو چھپاؤ اور کھلا نہ چھوڑو، سوائے اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے، صحابہ نے پھر عرض کیا، اگر ہم تنہا ہوں تو پھر کیا حکم ہے، فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ کا حق زیادہ ہے کہ انسان اس سے حیا کرے، مقصد یہ ہے کہ بلا مقصد تنہائی میں بھی شرمگاہ کو نہ کھولے، پھر پردے کا یہ بھی حکم ہے کہ مردوں کیلئے بھی جائز نہیں کہ ایک دوسرے کی شرمگاہوں کو دیکھیں اور نہ عورتوں کیلئے جائز ہے کہ وہ ایک دوسری کے سامنے شرمگاہیں کھولیں، ایک روایت میں اس طرح آتا ہے کہ وہ شخص ملعون ہے جو کسی کے ستر پر نظر ڈالتا ہے، یہاں تک کہ ان کی حفاظت کا بھی حکم دیا گیا ہے، "ترمذی شریف" کی روایت میں آتا ہے ران کا بھی پردہ ہے؛ اس لئے محدثین اور فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ ناف سے لے کر گھٹنے تک کے حصے کو ڈھانپنا ضروری ہے۔

قرآن وحدیث میں لباس کے متعلق بہت سے حکم آئے، محدثین نے اپنی کتابوں میں ان چیزوں کو ذکر کیا ہے، جن میں لباس کے متعلق حکم آئے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو میلے کچیلے کپڑے پہنے دیکھا، فرمایا: کیا تیرے پاس مال ہے، عرض کیا ہاں، میرے پاس بھیڑ، بکریاں، گائے، بیل، اونٹ اور لونڈی غلام سب کچھ ہیں، تو آپ نے ارشاد فرمایا: تو پھر اللہ تعالیٰ کے انعام واحسان اور اس کے فضل وکرم کا اثر تم پر نظر آنا چاہئے، پھٹا پرانا لباس تو مجبور آدمی پہنتا ہے تو اچھا لباس پہنا کرو، "بخاری شریف" کی روایت میں آتا ہے جو جی چاہے کھاؤ اور پہنو جب تک کہ دو چیزیں نہ ہوں، یعنی: اسراف اور تکبر، یہ دونوں چیزیں مکروہ ہیں، کھانا پینا اور پہننا مباح ہے مگر ان دو شرطوں کے ساتھ۔

لباس کے چند حکم

مرد ریشمی لباس نہ پہنیں، ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانا مکروہ تحریمی ہے، شلوار، تہبند، پتلون یا چادر ہو مرد کیلئے ٹخنے ننگے ہونے چاہئیں ورنہ نماز بھی مکروہ ہوگی، البتہ عورت کو اجازت ہے "صحیحین (بخاری ومسلم)" کی روایت

میں ہے کہ جو کوئی فخر کے طور پر اپنا کپڑا نیچے کرے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورت کو باریک کپڑا پہننے سے بھی منع فرمایا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اسماء کو باریک ڈوپٹہ پہنے ہوئے دیکھا جس سے چھن کر بال نظر آرہے تھے آپ ناراض ہوگئے، اور فرمایا: جب عورت بالغ ہوجاتی ہے تو اس کے چہرے اور ہاتھوں کے سوا جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آنا چاہئے اور جوان عورت بلا وجہ چہرہ بھی نہ کھولے تاہم یہ ستر میں داخل نہیں ضرورت کے وقت چہرہ کھول سکتی ہے، ایسی وضع قطع کا لباس پہننا جس سے جسم کے بعض حصے نظر آئیں یہ بھی بے حیائی کی بات ہے۔

"لِبَاسُ التَّقْوٰى" سے مراد حضرت ابن عباس اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کی تفسیر کے مطابق نیک عمل اور اللہ تعالیٰ کا خوف ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح ظاہری لباس انسان کے شرم والے اعضاء کیلئے پردہ اور سردی گرمی سے بچنے اور زینت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے، اسی طرح ایک معنوی لباس نیک عمل اور اللہ تعالیٰ کا خوف ہے، جو انسان کے عیبوں اور اخلاقی کمزوریوں کا پردہ ہے اور ہمیشہ کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے نجات کا ذریعہ ہے اسی لئے وہ سب سے بہتر لباس ہے، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایک بدکار آدمی جس میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہو اور وہ نیک عمل نہ کرتا ہو وہ کتنے ہی پردوں میں چھپے آخر کار رسوا اور ذلیل ہو کر رہتا ہے، جیسا کہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: قسم ہے! اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، جو شخص کوئی بھی عمل لوگوں کی نظروں سے چھپا کر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس عمل کی چادر اوڑھا کر اعلان کر دیتے ہیں نیک عمل ہو تو نیکی کا اور برا عمل ہو تو برائی کا، چادر اڑھانے سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح بدن پر اوڑھی ہوئی چادر سب کے سامنے ہوتی ہے انسان کا عمل کتنا ہی پوشیدہ ہو اس کا اس کے چہرے اور بدن پر اللہ تعالیٰ ظاہر کر دیتے ہیں اور اس ارشاد کی سند میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: "وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ"۔

"لِبَاسُ التَّقْوٰی" کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ ظاہری لباس خوبصورتی اور بدن ڈھانپنے کا کام کرتا ہے سب کا اصل مقصد پرہیز گاری اور اللہ تعالیٰ کا خوف ہے، یہ چیزیں اس کے لباس میں بھی اس طرح ہونی چاہئے کہ اس میں پورا ستر ڈھنپا ہوا ہو کہ شرم والے اعضاء کا پورا پردہ ہو، وہ ننگے بھی نہ رہیں اور لباس بدن پر ایسا چست بھی نہ ہو جس سے یہ اعضاء ننگے کی طرح نظر آئیں، نیز: اس لباس میں فخر وغرور کا انداز بھی نہ ہو بلکہ تواضع وانکساری کے آثار ہوں، بے جا اسراف بھی نہ ہو، ضرورت کے موافق کپڑا استعمال کیا جائے، عورتوں کیلئے مردانہ اور مردوں کیلئے زنانہ لباس بھی نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، لباس میں کسی دوسری قوم کی نقالی بھی نہ ہو جو اپنی قوم وملت سے غداری اور منہ موڑنے کی علامت ہے اس کے ساتھ ہی اخلاق و عملوں کی درستی بھی ہو جو لباس کا اصل مقصد ہے۔

شیطان سے ہوشیار رہیں

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ

اے اولاد آدم کی! نہ بہکانے پائے تم کو شیطان جیسا کہ نکالا اس نے ماں باپ تمہارے کو سے

الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ

جنت اتروا کر سے ان لباس ان کے تا کہ دکھائے ان کو شرم گاہیں ان کی بیشک وہ دیکھتا ہے تم کو

هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ

وہ اور قوم اسکی سے جہاں کہ نہیں دیکھتے تم ان کو بیشک ہم کیا ہم نے شیطان کو

اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

دوست لئے ان لوگوں کے نہیں ایمان لاتے (۲۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے آدم کی اولاد! تم کو شیطان نہ بہکائے جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکالا، ان سے ان کے کپڑے اتروائے تا کہ ان کو ان کی شرم گاہیں دکھائے وہ اور اس کی قوم تم کو دیکھتے ہیں

جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے، ہم نے شیطان کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا جو ایمان نہیں لاتے۔ (۲۷)

تفسیر

حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو یہ دوسری نصیحت ہے اس میں صاف طور پر شیطان کے ہتھکنڈوں سے خبردار رہنے کیلئے کہا گیا ہے اور آگے کی آیتوں میں سمجھایا گیا ہے کہ شیطان تم سے کیا کام لینا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کون سے کاموں کا حکم دیا ہے ان دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہئے، ارشاد ہے کہ اے آدم کی اولاد! دیکھو تم شیطان کے پھندے میں کبھی نہ پھنسنا، تمہارے سامنے تمہارے ماں باپ آدم وحوا کا قصہ اسی لئے کھول کر رکھ دیا ہے کہ تم شیطان کی چالوں سے واقف ہو جاؤ، اس قصہ سے تمہیں پتہ چل جائے گا کہ اس نے کس طرح فریب اور دھوکے کی باتیں ان کے ساتھ کیں اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے انہیں کیسا ورغلایا آخر وہ اس کی چال میں آگئے اور اس کی وجہ سے انہیں جنت سے نکلنا پڑا اور ان کا لباس ان سے چھین لیا گیا یہاں تک کہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھل گئیں، آخر اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی مانگی اور ان کا قصور معاف کیا اور دنیا میں رہنے کی جگہ ملی جہاں عمر بھر ان کی اولاد کو شیطان سے واسطہ پڑے گا وہ تمہارا بڑا خطرناک دشمن ہے اکثر چھپ کر تمہاری گھات میں بیٹھتا ہے جہاں سے وہ تو تمہیں دیکھتا ہے مگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے؛ اس لئے ہر وقت اللہ تعالیٰ سے حفاظت مانگو کیونکہ شیطان ہر وقت اس کی نگاہ میں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے ماننے والوں کو اس کے کھلے اور چھپے دونوں طرح کے حملوں سے بچا سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خبردار کیا ہے کہ شیطان بہت مکار دشمن ہے اس سے ہوشیار رہنا، اس کو یہ سہولت بھی حاصل ہے کہ وہ اور اس کا قبیلہ تو تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتا ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے، شیطان عام طور پر انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں اور بعض حالات میں ظاہر بھی ہو جاتے ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنوں کو چھ مرتبہ وعظ وتبلیغ کی، آپ نے انہیں قرآن کریم پڑھایا اس کے علاوہ بھی کبھی کبھار نظر آ جاتے ہیں مگر عموماً نظروں سے اوجھل رہتے ہیں، بیشک ہم نے شیطان کو ان لوگوں کا ساتھی بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے شیطان ایسے لوگوں

پر مسلط ہو کر انہیں بہکاتے ہیں تا کہ اس کے پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ ہو اور وہ سب کو لے کر جہنم میں جائیں تو فرمایا شیطان چونکہ خطرناک دشمن ہے جو نظر بھی نہیں آتا، لہٰذا اس سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

بے حیائی

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ

اور جب کرتے ہیں براکام کہتے ہیں پایا ہم نے پر اس باپ دادا اپنے کو اور اللہ نے

اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى

حکم دیا ہمیں کا اس آپ کہہ دیجئے بیشک اللہ نہیں حکم دیتا بُرے کام کا کیا کہتے ہو اوپر

اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

اللہ کے وہ جو نہیں جانتے تم (۲۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کو اسی طرح کرتے پایا اور اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے، آپ کہہ دیں کہ! اللہ برے کام کا حکم نہیں کرتا اللہ کے ذمے وہ باتیں کیوں لگاتے ہو جو تمہیں معلوم نہیں۔ (۲۸)

تفسیر

اس آیت کے اترنے کے زمانے میں مکہ والوں میں اور ان کی دیکھا دیکھی سب میں یہ عام رسم رائج تھی کہ مرد و عورت بالکل ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے۔

جب باہر کے لوگ حج کیلئے آتے تھے تو وہ اپنے روزمرہ کے لباس میں طواف کرنا درست خیال نہیں کرتے تھے بلکہ قریش سے مانگنے کے طور پر لباس لے کر اس میں طواف کرتے تھے اس کی تاویل انہوں نے یہ کر رکھی تھی کہ جس لباس میں ہم گناہ کرتے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ کے پاک گھر کا طواف نہیں کر سکتے، پھر قریش کے

خاندان بعض حاجیوں کو اپنے تعلقات یا وسعت کی بناء پر لباس مہیا کر دیتے تھے اور جو لوگ لباس کے حاصل کرنے میں ناکام رہتے وہ ننگی حالت میں طواف کرتے اس میں مرد اور عورتیں سب شامل ہوتے، البتہ مرد دن کے وقت اور عورتیں رات کے وقت طواف کرتیں، "مسلم شریف" کی روایت میں آتا ہے کہ طواف کرتے وقت عورتیں اپنی زبان سے یہ بھی کہتیں، یعنی: آج ستر کا بعض حصہ یا پورا حصہ کھل جائے گا مگر آج کے دن ہم ان کپڑوں کے ساتھ طواف کرنے کو جائز قرار نہیں دیتیں، اس طرح وہ ننگے طواف کرتے۔

جب ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے دو وجہ بتائیں ایک یہ کہ ہمارے باپ دادا ایسا ہی کرتے چلے آئے ہیں ہم بھی ان کے مطابق عمل کرتے ہیں، دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے، اس آیت میں ان کے اس کام کو بے حیائی کا کام کہا ہے اور ان کی بتائی ہوئی وجہوں کا رد کیا ہے، ایک بات وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے کہ ننگے طواف کرو، اے پیغمبر! اس کے جواب میں ان سے کہہ دیجئے کہ! اللہ تعالیٰ بے حیائی اور بری باتوں کا حکم نہیں دیا کرتے اس کی دلیل تمہارے پاس کیا ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے ننگے ہو کر طواف کرنے کو کہا ہے اس نے تو تمہارے لئے لباس بنانے کا سامان دنیا میں پیدا کر دیا ہے، پھر ننگے کیوں رہتے ہو؟ تم ایسی باتیں اللہ تعالیٰ کے سر مت لگاؤ جو اس نے تمہیں نہ بتائیں نہ سکھائیں۔

اس آیت میں تمام فحش باتوں، بے حیائی اور برے کاموں سے ہمیشہ کیلئے روک دیا گیا ہے جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے۔

گناہ کو گناہ سمجھو

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۗ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ

آپ کہہ دیجئے حکم کیا رب میرے نے انصاف کا اور سیدھے کرو چہروں اپنے کو وقت ہر عبادت کے

وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۬ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ؕ۝۲۹

اور پکارو اس کو خالص کر کے لئے اس کے تابعداری جیسا پہلے پیدا کیا تم کو لوٹائے جاؤ گے (۲۹)

فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا

ایک گروہ کو ہدایت کی اور ایک گروہ ثابت ہوئی پر ان گمراہی بیشک انہوں نے بنالیا

الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۳۰

شیطانوں کو دوست سے سوا اللہ کے اور گمان کرتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہدایت پانے والے ہیں (۳۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ کہہ دیں! میرے رب نے سیدھے راستے پر چلنے کا حکم دیا، اور اپنے منہ ہر نماز کے وقت (قبلہ کی طرف) سیدھے کرو اور خالص اس کے فرمانبردار ہو کر پکارو، جیسے تم کو پہلے پیدا کیا دوسری بار بھی پیدا ہو گے۔ (۲۹) ایک فرقے کو ہدایت کی اور ایک فرقے پر گمراہی مقرر ہو چکی، انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو دوست بنالیا اور سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ (۳۰)

تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ! اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ انصاف کا حکم دیا کرتے ہیں اور اس جگہ انصاف سے مراد ایسا عمل ہے جو کمی اور زیادتی سے خالی ہو، یہاں لوگوں کی بے راہ روی کی مناسبت سے دو حکم دیئے گئے ہیں ایک " اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" اور دوسرا "وَ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" پہلا حکم انسان کے ظاہری عملوں کے متعلق ہے اور دوسرا اس کے دل سے تعلق رکھتا ہے، پہلے حکم میں لفظ مسجد اکثر مفسرین کے نزدیک سجدہ وعبادت کے معنٰی میں آیا ہے، اور معنٰی یہ ہیں کہ ہر عبادت و نماز کے وقت اپنا رُخ سیدھا رکھا کرو، اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ نماز کے وقت اپنا رُخ سیدھا ٹھیک قبلہ کی طرف کرنے کا اہتمام کرو اور رُخ سیدھا کرنے کے یہ معنٰی بھی ہوسکتے ہیں کہ اپنے ہر قول و فعل اور ہر عمل میں اپنا رُخ اپنے رب کے حکم کے مطابق رکھو اس سے اِدھر

اُدھر نہ ہونے پائے، اس معنیٰ کے لحاظ سے یہ حکم صرف نماز کیلئے خاص نہیں بلکہ تمام عبادتوں معاملوں پر حاوی ہے، اور دوسرے حکم کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس طرح پکارو کہ عبادت خالص اسی کی ہو اس میں کسی دوسرے کی شرکت کسی حیثیت سے نہ ہو یہاں تک کہ ریا کاری وغیرہ سے بھی پاک ہو۔

ان دونوں حکموں کو ساتھ ذکر کرنے سے اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ انسان پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر و باطن دونوں کو شریعت کے حکم کے مطابق درست کرے نہ صرف ظاہری اطاعت بغیر اخلاص کے کافی ہے اور نہ صرف اخلاص صحیح عمل کے بغیر کافی ہوسکتا ہے، بلکہ ہر شخص پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر کو بھی شریعت کے مطابق درست کرے اور باطن کو بھی صرف اللہ تعالیٰ کیلئے خالص رکھے، آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمہیں پہلی مرتبہ پیدا فرمایا تھا اسی طرح قیامت کے روز دوبارہ تمہیں زندہ کر کے کھڑا کر دیں گے اس کی قدرت کے آگے یہ کوئی مشکل چیز نہیں، اس جملہ کو اس جگہ لانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ شرعی حکموں پر پوری طرح قائم رہنا انسان کیلئے آسان ہو جائے کیونکہ آخرت اور قیامت اور اس میں اچھے اور برے عملوں کا بدلہ ملنے کا عقیدہ ہی وہ چیز ہے جو انسان کیلئے ہر مشکل کو آسان اور ہر تکلیف کو راحت بنا سکتی ہے اور تجربہ گواہ ہے کہ جب تک انسان پر یہ خوف نہ ہو کوئی وعظ و نصیحت اس کو سیدھا نہیں کر سکتی اور نہ کسی قانون کی پابندی اس کو جرم سے روک سکتی ہے۔

بعض لوگوں کو تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے اور بعض کو گمراہ کیا، کیونکہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا دوست بنالیا اور یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ سیدھی راہ پر ہیں، مراد یہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت عام تھی مگر ان لوگوں نے اس ہدایت سے منہ موڑا اور شیطانوں کی پیروی کرنے لگے اور یہ کہ یہ اپنی بیماری ہی کو صحت اور گمراہی کو ہدایت خیال کرنے لگے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شرعی حکموں کی پیروی سے جہالت کوئی عذر نہیں ایک شخص اگر غلط راستہ کو صحیح سمجھ کر پورے اخلاص کے ساتھ اختیار کرلے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معذور نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو ہوش و حواس اور عقل اسی لئے دی ہے کہ وہ اس سے کام لے کر کھرے کھوٹے اور غلط صحیح کو پہچانے، پھر اس کو

صرف اس کی عقل پر نہیں چھوڑا اپنے پیغمبر بھیجے، کتابیں اتاریں جن کے ذریعے صحیح و غلط اور حق و باطل کو خوب کھول کر واضح کر دیا۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... کوئی شخص کسی جنگل یا ویرانے میں ہو اور قبلہ کے بارے میں کوئی بتانے والا بھی نہ ہو ایسی صورت میں نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ نماز میں قبلہ کی طرف رُخ نہیں تھا تو اگر بغیر تحری (دل سے غور وفکر کرنا کہ قبلہ اس طرف ہوگا) کے نماز پڑھی تھی تو نماز دوبارہ ادا کرنی ہوگی اور اگر تحری کر کے نماز ادا کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ قبلہ دوسری طرف تھا تو نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ (تحری کا معنٰی ہے کہ صرف اپنے دل سے غور وفکر کر کے قبلہ کی سمت متعین کرنا)۔

مسئلہ (۲):.... اگر نماز کے دوران قبلہ کی صحیح سمت کا علم ہو جائے تو نماز ہی کی حالت میں اسی طرف رُخ کر لے تو نماز ہو جائے گی۔

کھانے پینے میں زیادتی

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا

اے اولاد آدم کی! پہن لو زینت اپنی (لباس اپنا) وقت ہر نماز کے اور کھاؤ اور پیو

وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ ع ۳ ۱۰

اور مت خرچ کرو فضول بیشک وہ نہیں پسند کرتا فضول خرچوں کو (۳۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے آدم کی اولاد! اپنی زینت (لباس) لے لو ہر نماز کے وقت اور کھاؤ اور پیو اور بے جا خرچ نہ کرو، بیشک اللہ فضول خرچوں کو پسند نہیں کرتے۔ (۳۱)

تفسیر

اے آدم کی اولاد! تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو اور کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ نکلو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے، جاہلیت کے عرب جیسا کہ بیت اللہ کا طواف ننگے ہو کر کرنے کو صحیح عبادت اور بیت اللہ کا احترام سمجھتے تھے اسی طرح ان میں یہ رسم بھی تھی کہ حج کے دنوں میں کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے صرف اتنا کھاتے تھے جس سے سانس چلتا رہے، خصوصاً گھی، دودھ، اور پاکیزہ غذاؤں سے بالکل پرہیز کرتے تھے۔

ان کے اس بیہودہ طریقۂ کار کے خلاف یہ آیت اتری جس نے بتلایا کہ ننگے ہو کر طواف کرنا بے حیائی اور سخت بے ادبی ہے اس سے بچیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی پاکیزہ اور لذیذ غذاؤں کو بلاوجہ چھوڑنا بھی کوئی دین کی بات نہیں بلکہ اس کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر حرام ٹھہرانا گستاخی اور عبادت میں حد سے تجاوز کرنا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے؛ اس لئے حج کے دنوں میں خوب کھاؤ پیو، ہاں! فضول خرچی نہ کرو، حلال غذاؤں کو بلاوجہ چھوڑنا بھی گناہ میں داخل ہے اور حج کے اصل مقصد اور ذکر اللہ سے غافل ہو کر کھانے پینے ہی میں مشغول رہنا بھی اسراف میں داخل ہے۔

کپڑے پہن کر نماز پڑھنا

اس آیت سے اکثر صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین نے کئی حکم نکالے ہیں کہ اس میں جس طرح ننگے طواف کو منع کیا گیا ہے اسی طرح ننگے نماز پڑھنا بھی ناجائز ہے۔

اس آیت میں یہ ہے کہ لباس کو لفظ زینت سے تعبیر کر کے اس طرف بھی اشارہ فرمادیا گیا ہے کہ نماز میں افضل واولیٰ یہ ہے کہ صرف بدن ڈھانپنے پر کفایت نہ کی جائے بلکہ اپنی وسعت کے مطابق زینت اختیار کیا جائے

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ نماز کے وقت اپنا سب سے بہتر لباس پہنتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ خوبصورتی کو پسند فرماتے ہیں؛ اس لئے میں اپنے رب کیلئے زینت وخوبصورتی کو اختیار کرتا ہوں، معلوم ہوا کہ اس آیت سے جیسا کہ نماز میں بدن ڈھانپنے کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے اسی طرح وسعت کے مطابق صاف ستھرا اچھا لباس اختیار کرنے کی فضیلت بھی ثابت ہوتی ہے، ستر کا چھپانا انسان پر ہر حال میں اور خصوصاً نماز وطواف میں فرض ہے اس کی حد کیا ہے؟ قرآن کریم نے ستر چھپانے کا حکم مختصر طور پر دیا ہے اور اس کی تفصیل کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ کسی بالغ عورت کی نماز بغیر دوپٹے کے جائز نہیں۔

کھانے پینے میں "اسراف" جائز نہیں

آیت کے آخری جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی تو اجازت ہے بلکہ حکم ہے مگر ساتھ ہی "اسراف" سے منع کیا گیا ہے، "اسراف" کے معنیٰ ہیں حد سے تجاوز کرنا، پھر حد سے تجاوز کرنے کی کئی صورتیں ہیں ایک یہ کہ حلال سے تجاوز کرکے حرام تک پہنچ جائے اور حرام چیزوں کو کھانے، پینے اور برتنے لگے اس کا حرام ہونا ظاہر ہے، دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو بغیر کسی شرعی وجہ کے حرام سمجھ کر چھوڑ دے جس طرح حرام کا استعمال جرم وگناہ ہے اسی طرح حلال کو حرام سمجھنا بھی اللہ تعالیٰ کے قانون کی مخالفت اور سخت گناہ ہے، اسی طرح یہ بھی "اسراف" ہے کہ بھوک اور ضرورت سے زیادہ کھائے پیئے؛ اسی لیے فقہاء نے پیٹ بھرنے سے زائد کھانے کو ناجائز لکھا ہے اسی طرح یہ بھی "اسراف" کے حکم میں ہے کہ باوجود قدرت واختیار کے ضرورت سے اتنا کم کھائے جس سے کمزور ہو کر واجبات کی ادئیگی کی قدرت نہ رہے، ان دونوں قسم کے "اسراف" کو منع کرنے کیلئے قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہے کہ "فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں"۔

"تفسیر روح المعانی اور مظہری" وغیرہ میں ہے کہ امیر المؤمنین ہارون رشید کے پاس ایک نصرانی طبیب (عیسائی) علاج کیلئے رہتا تھا اس نے علی بن حسین بن واقد سے کہا کہ تمہاری کتاب، یعنی: قرآن میں علم

طب کا کوئی حصہ نہیں حالانکہ دنیا میں دو ہی علم علم ہیں ایک: علمِ ادیان (دین کا علم)، دوسرا: علمِ ابدان (بدن کا علم) جس کا نام طب ہے، علی بن حسین نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے طبّ وحکمت کے سارے علم وفن کو قرآن کریم کی آدھی آیت میں جمع کر دیا ہے وہ یہ کہ ارشاد فرمایا "كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا" اور "تفسیر ابن کثیر" میں یہ قول بعض بزرگوں کے حوالہ سے بھی نقل کیا ہے، پھر اس نے کہا کہ اچھا تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام میں بھی طبّ کے متعلق کچھ ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند کلمات میں طبّ کے سارے فن کو جمع کر دیا ہے آپ نے فرمایا کہ: معدہ بیماری کا گھر ہے، اور مضر چیزوں سے پرہیز ہر دوا کی اصل ہے اور ہر بدن کو وہ چیز دو جس کا وہ عادی ہے، نصرانی طبیب نے یہ سن کر کہا کہ تمہاری کتاب اور تمہارے پیغمبر نے جالینوس کیلئے کوئی طبّ نہیں چھوڑی۔

"بیہقی" نے "شعب الایمان" میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: معدہ بدن کی حوض ہے سارے بدن کی رگیں اسی حوض سے سیراب ہوتی ہیں اگر معدہ درست ہے تو ساری رگیں یہاں سے صحت مند غذا لے کر لوٹیں گی اور وہ خراب ہے تو ساری رگیں بیماری لے کر بدن میں پھیلیں گی، محدثین نے ان حدیثوں کے الفاظ کے بارے میں کچھ اعتراض کیا ہے لیکن کم کھانے اور احتیاط برتتے رہنے کی تاکیدیں جو بیشمار حدیثوں میں موجود ہیں ان پر سب کا اتفاق ہے۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... ضرورت کے مطابق کھانا پینا فرض ہے۔

مسئلہ (۲):.... جب تک کسی چیز کا حرام ہونا شرعی دلیل سے ثابت نہ ہو جائے ہر چیز حلال ہے۔

مسئلہ (۳):.... جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کر دیا ان کا استعمال ناجائز ہے۔

مسئلہ (۴):.... جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حلال کی ہیں ان کو حرام سمجھنا بھی اسراف اور سخت گناہ ہے۔

مسئلہ (۵):..... پیٹ بھر جانے کے بعد زیادہ کھانا ناجائز ہے۔

مسئلہ (۶):..... اتنا کم کھانا جس سے کمزور ہو کر واجبات کی ادائیگی کی قدرت نہ رہے حرام ہے۔

مسئلہ (۷):..... ہر وقت کھانے پینے کی فکر میں رہنا بھی اسراف ہے۔

مسئلہ (۸):..... کھانا پینا عام حالات میں مباح ہے مگر بعض حالات میں فرض ہو جاتا ہے، مثلاً: اگر کوئی شخص بھوک کی وجہ سے مرنے کے قریب ہے مگر کھانا نہیں کھاتا تو وہ مردار موت مرے گا ایسی حالت میں اس کے لئے کھانا فرض ہو جاتا ہے۔

مسئلہ (۹):..... اسراف یہ ہے کہ کوئی شخص حلال مال کو حرام کاموں میں خرچ کرے یا ضرورت سے زیادہ خرچ کرے۔

خود کوئی چیز حرام مت کرو

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ

آپ کہہ دیجئے کس نے حرام کی زینت اللہ کی جو نکالی اس نے لئے اپنے بندوں کے اور صاف ستھری چیزیں سے

الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً

کھانے کی آپ کہہ دیجئے یہ لئے انکے ہیں جو ایمان لائے میں زندگی دنیا کی خالص انہی کیلئے

يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

دن قیامت کے اسی طرح کھولتے ہیں ہم آیتوں کو واسطے اس قوم کے جو جانتی ہے (۳۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ کہہ دیں! اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے واسطے پیدا کی اور کھانے کی صاف ستھری چیزوں کو کس نے حرام کیا؟ کہہ دیں! یہ نعمتیں دنیا کی زندگی میں اصل میں ایمان والوں کیلئے ہیں، قیامت کے دن خالص انہی کیلئے ہوں گی اسی طرح ہم آیتوں کو ایسے لوگوں کیلئے کھول کر بیان کرتے ہیں جو

سمجھتے ہیں۔ (۳۲)

تفسیر

ارشاد ہے کہ یہ طواف کے وقت کپڑے اتار کر الگ رکھ دینا کس نے بتایا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تو کپڑے کو انسان کی زینت بنایا ہے تا کہ اپنے جسم کو چھپا کر رکھے ایسے ہی کھانے کی صاف ستھری چیزیں تمہارے لئے ہر وقت حلال ہیں یہ کس نے کہا کہ حج کے دنوں میں فاقہ کشی کرو اور اسے عبادت کی طرح سمجھو، اصل بات جو تمہیں سمجھ لینی چاہئے وہ یہ ہے کہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور ان کے استعمال کا طریقہ بتا دیا ہے اس طریقہ سے انہیں استعمال کرو جو چیزیں اس نے حرام کردی ہیں وہ صاف طور پر بتا دی گئی ہیں انہیں چھوڑ دو جس وقت اس نے اچھی چیزوں کے بھی چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے، مثلاً: روزے میں کھانا پینا چھوڑ دو، اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کو یہ بھی سمجھا دیں کہ یہ چیزیں، یعنی: لباس، خوراک وغیرہ دنیا میں ایمان والوں کیلئے بنی ہیں اور جو ایمان والے نہیں ہیں وہ بھی ان چیزوں سے ایمان والوں کے طفیل فائدہ اٹھا رہے ہیں اور آخرت میں یہ چیزیں صرف ایمان والوں کو ملیں گی۔

آیت کے اس حصہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو یہ نعمتیں بغیر مشقت کے حاصل نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو ہمیشہ کیلئے نہیں ہوتیں ان کے چھن جانے کا ہر لمحہ امکان ہوتا ہے اور کچھ نہیں تو انسان کی اپنی موت تو ہر وقت سر پر سوار رہتی ہے جونہی موت کا بگل بج گیا سب کچھ ختم ہو گیا، لہٰذا دنیا میں یہ نعمتیں بالکل عارضی ہیں اس کے برخلاف آخرت کی نعمتیں ہمیشہ کیلئے ہوں گی اور بغیر کسی مشقت کے حاصل ہوں گی ان کے چھن جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

عمدہ لباس اور لذیذ کھانے سے پرہیز اسلام کی تعلیم نہیں

کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا صرف اس ذات پاک کا حق ہے جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے کسی دوسرے کی اس میں مداخلت جائز نہیں؛ اس لئے وہ لوگ عذاب کے قابل ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حلال کئے ہوئے بہترین لباس یا پاکیزہ اور لذیذ خوراک کو حرام سمجھیں، وسعت ہوتے ہوئے گندے اور کٹے پھٹے لباس میں رہنا نہ کوئی اسلام کی تعلیم ہے نہ کوئی اسلام میں پسندیدہ چیز ہے، جیسا کہ بہت سے جاہل خیال کرتے ہیں۔

بزرگوں میں بہت سے بزرگ جن کو اللہ تعالیٰ نے مالی وسعت عطا فرمائی تھی اکثر عمدہ اور قیمتی لباس استعمال فرماتے تھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی جب وسعت ہوئی تو عمدہ سے عمدہ لباس بھی پہنا ہے، ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدن مبارک پر ایسی چادر تھی جس کی قیمت ایک ہزار درہم تھی، امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ چارسوگنّی (سونے کی اشرفی) کی قیمت کی چادر استعمال فرمائی اسی طرح حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ عمدہ لباس استعمال فرماتے تھے ان کیلئے تو کسی صاحب نے سال بھر کیلئے تین سو ساٹھ جوڑوں کا سالانہ انتظام اپنے ذمہ لیا ہوتا اور جو جوڑا امام کے بدن پر ایک مرتبہ پہنتا تھا دوبارہ استعمال نہ ہوتا تھا کیونکہ صرف ایک روز استعمال کرکے کسی غریب کو دے دیتے تھے۔

وجہ یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو اپنی نعمت اور وسعت عطا فرما دیں تو اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے ہیں کہ اس کی نعمت کا اثر اس کے لباس وغیرہ میں دیکھا جائے اس لئے نعمت کا اظہار بھی ایک قسم کا شکر ہے اس کے بالمقابل وسعت ہوتے ہوئے پھٹے پرانے یا میلے کچیلے کپڑے استعمال کرنا ناشکری ہے، ہاں! ضروری بات یہ ہے کہ دو چیزوں سے بچے ایک دکھانے اور دوسرے بڑائی ظاہر کرنے، یعنی: صرف لوگوں کو دکھلانے اور اپنی بڑائی ظاہر کرنے کیلئے فخریہ لباس استعمال نہ کرے اور ظاہر ہے کہ بزرگ حضرات ان دونوں چیزوں سے لاتعلق تھے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، بعض دوسرے صحابہ اور بزرگان دین سے جو عام حالات میں معمولی قسم کا یا پیوند لگے ہوئے کپڑے استعمال کرنے کا ذکر ہے اس کی دو وجہ تھیں ایک تو یہ کہ اکثر جو کچھ مال آتا وہ غریبوں اور مسکینوں اور دینی کاموں میں خرچ کر ڈالتے تھے اپنے لئے باقی ہی نہ رہتا تھا جس سے عمدہ لباس آسکے، دوسرے یہ کہ آپ لوگوں کے رہنما تھے اس سادہ اور سستے لباس کے رکھنے سے دوسرے حاکموں کو اس کی تلقین کرنا تھا تا کہ عام لوگوں پر ان کی مالی حیثیت کا رُعب نہ پڑے، اسی طرح صوفیائے کرام جو اپنے نفس کی اصلاح کی ابتداء کرنے والوں کو عمدہ لباس اور لذیذ کھانوں سے روکتے ہیں اس کا مقصد بھی یہ نہیں کہ ان چیزوں کو ہمیشہ کیلئے چھوڑنا کوئی ثواب کا کام ہے بلکہ نفس کی خواہشوں پر قابو پانے کیلئے شروع میں ایسی محنتیں کراتے تھے اور جب وہ اس درجہ پر پہنچ جائے کہ نفسانی خواہشوں پر قابو پالیں کہ ان کا نفس اس کو حرام و ناجائز کی طرف نہ کھینچ سکے تو اس وقت تمام صوفیائے کرام ان کو عمدہ لباس اور لذیذ کھانوں کو استعمال کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں اور اس وقت یہ پاکیزہ رزق ان کیلئے اللہ تعالیٰ کی پہچان میں رکاوٹ کے بجائے اضافہ اور قرب کا ذریعہ بنتے ہیں۔

خوراک اور لباس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت

خوراک اور لباس کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم کا طریقہ یہ ہے کہ ان چیزوں کو حاصل کرنے میں زیادہ کوشش نہ کرے، جیسا: لباس و خوراک آسانی سے ملے اس کو شکر کے ساتھ استعمال کرے موٹا کپڑا، خشک غذا ملے تو یہ کوشش نہ کرے کہ کسی نہ کسی طرح اچھا ہی حاصل کرے، خواہ قرض لینا پڑے یا اس کی فکر میں اپنے آپ کو کسی دوسری مشکل میں مبتلا کرنے کی نوبت آئے، اسی طرح عمدہ نفیس لباس یا لذیذ کھانا میسر آئے تو یہ کوشش نہ کرے کہ اس کو جان بوجھ کر خراب کرلے یا اس کے استعمال سے پرہیز کرے جس طرح بڑھیا لباس اور غذا حاصل کرنے میں زیادہ کوشش غلط ہے اسی طرح بڑھیا کو خراب کرنا یا اس کو چھوڑ کر گھٹیا استعمال کرنا بھی شریعت کے خلاف ہے۔

آیت کے اگلے جملہ میں اس کی ایک خاص حکمت یہ بتلائی گئی کہ دنیا کی تمام نعمتیں نفیس اور عمدہ لباس، پاکیزہ اور لذیذ غذائیں دراصل اطاعت گزار مسلمانوں ہی کیلئے پیدا کی گئی ہیں دوسرے لوگ ان کے طفیل کھا پی رہے ہیں کیونکہ اس دنیا میں آدمی صرف عمل کرسکتا ہے بدلہ ملنے کی جگہ دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے، یہاں کھرے کھوٹے اور اچھے برے کا فرق دنیا کی نعمتوں سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یہ عام دسترخوان یہاں سب کیلئے ایک جیسا کھلا ہوا ہے بلکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ اگر مؤمن وفرمانبردار بندوں سے اطاعت گزاری میں کچھ کمی ہوجاتی ہے تو دوسرے لوگ ان پر غالب آکر دنیاوی نعمتوں کے خزانوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور یہ فقر وفاقہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں مگر یہ قانون صرف اسی دنیا کے اندر ہے اور آخرت میں ساری نعمتیں اور راحتیں صرف اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اطاعت گزار بندوں کیلئے مخصوص ہوں گی، آیت کے یہی معنیٰ ہیں کہ آپ کہہ دیجئے کہ! دنیا کی سب نعمتیں دنیا میں بھی دراصل مسلمانوں ہی کا حق ہیں اور قیامت کے دن تو خالص انہی کے ساتھ مخصوص ہوں گی، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ دنیا کی ساری نعمتیں اور راحتیں اس خاص کیفیت کے ساتھ کہ وہ آخرت میں وبال جان نہ بنیں صرف فرمانبرداروں کا حصہ ہیں، بخلاف کافروں اور گناہ گاروں کے، گو دنیا میں نعمتیں ان کو بھی ملتی ہیں بلکہ زیادہ ملتی ہیں مگر ان کی یہ نعمتیں آخرت میں وبال جان اور ہمیشہ کا عذاب بننے والی ہیں؛ اس لئے نتیجہ کے اعتبار سے ان کیلئے یہ کوئی عزت وراحت کی چیز نہ ہوئی اور بعض حضرات مفسرین نے اس کے یہ معنیٰ قرار دیئے کہ دنیا میں ساری نعمتوں اور راحتوں کے ساتھ محنت ومشقت اور پھر زوال کا خطرہ اور پھر طرح طرح کے رنج وغم لگے ہوئے ہیں خالص نعمت اور خالص راحت کا یہاں وجود ہی نہیں، البتہ قیامت میں جس کو یہ نعمتیں ملیں گی وہ خالص ہوکر ملیں گی نہ ان کے ساتھ کوئی محنت ومشقت ہوگی اور نہ ان کے زوال یا نقصان کا کوئی خطرہ اور نہ ان کے بعد کوئی رنج ومصیبت تینوں مفہوم آیت کے اس جملہ میں مراد ہوسکتے ہیں اور اسی لئے مفسرین صحابہ وتابعین نے ان کو اختیار کیا ہے۔

زینت کے حکم

مسئلہ (۱):..... زینت کی اوّلین چیز انسان کا لباس ہوتا ہے، نہانا دھونا، میل کچیل صاف کرنا، دھلا ہوا صاف ستھرا لباس پہننا، خوشبو لگانا، تیل استعمال کرنا، سرمہ لگانا، عورتوں کا مہندی لگانا، یہ سب زینت کی چیزیں ہیں۔

مسئلہ (۲):..... عورتیں اپنے بال لمبے ظاہر کرنے کیلئے دوسری عورتوں کے بال استعمال کریں تو یہ حرام ہے۔

مسئلہ (۳):..... دانت صاف کرنے کیلئے مسواک یا کوئی دوسری چیز استعمال کرنا درست ہے، عورتوں کیلئے مسی (ایک خاص قسم کا عورتوں کا منجن) کا استعمال درست ہے۔

مسئلہ (۴):..... غیر موزوں قدرتی دانتوں کو رگڑ واکر درست کرنا یا ان کی جگہ خوبصورت دانت لگوانا دانتوں پر سونے چاندی کا خول چڑھانا بناوٹی زینت میں شمار ہوتا ہے جو کہ اچھا نہیں۔

مسئلہ (۱):..... عام حالات میں اگر دانت ضائع ہوجائیں تو ان کی جگہ نئے دانت لگوائے جاسکتے ہیں مگر صرف زینت کی خاطر دانتوں کے درمیان فاصلہ قائم کرنا، ابروؤں کو باریک کرنا، جسم کے کسی حصے پر داغ کے ذریعے پھول بوٹے بنوانا درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جائز طریقے سے زیب و زینت اختیار کرنے کی اجازت دی ہے۔

حرام باتیں

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ

آپ کہہ دیجئے کچھ نہیں　حرام کیا رب میرے نے　فحش باتوں کو　جو کھلی ہیں　میں سے ان　اور جو　چھپی ہیں　اور

مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ

جو چھپی ہے　اور　گناہ　اور　زیادتی　بغیر　حق　اور یہ کہ　شریک کرو تم　ساتھ اللہ کے

مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

وہ جو نہیں اتاری اس نے　ساتھ اسکے　کوئی دلیل　اور یہ کہ　کہو　اوپر　اللہ کے　وہ جو نہیں　جانتے تم (۳۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔آپ کہہ دیں! میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام کیا ہے جو ان میں کھلی ہوئی ہیں اور چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور اس بات کو کہ اللہ کا شریک کرو ایسی چیز کو کہ جس کی دلیل اس نے نہیں اتاری اور اس بات کو کہ اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جو تم کو معلوم نہیں۔ (۳۳)

تفسیر

اس آیت میں وہ باتیں بتائی گئی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔

(۱)....اس نے فحش اور بے حیائی کے کاموں کو حرام کیا ہے، یہ باتیں اور یہ کام کھلے عام کئے جائیں یا چھپ کر ہر حالت میں حرام ہیں، عورتوں سے بدکاری یا مردوں سے بدکاری، ننگا ہونا، آدھا ننگا ہونا، گالی گلوچ، بخل، بداخلاقی اور فحش گانے وغیرہ سب شامل ہیں، ان چیزوں سے انسان کا اخلاق برباد ہوتا ہے، بہرحال ہر فحش بات حرام ہے۔

(۲)....اس نے ہر گناہ کو حرام کیا ہے، جیسے: حلال چیزوں کو بلا وجہ اپنے اوپر حرام کر لینا، نماز، روزہ وغیرہ بدنی عبادتوں میں سستی اور اسی قسم کی باتیں، مثلاً: شراب پینا، نشہ کی چیزوں کی عادت، جوا، زہروں کا استعمال، اپنے ہاتھ پاؤں وغیرہ سکھالینا، جیسے: بعض جوگی کرتے ہیں۔

(۳)....دوسرے پر بلاوجہ زیادتی کرنا، کسی کو ستانا، دکھ پہنچانا، اس میں قتل، ڈکیتی، چوری اور سب باتیں آگئیں جس میں کسی کا نقصان ہو خواہ تھوڑا سا ہی ہو یہ سب حرام اور "بَغْیِ" میں داخل ہیں۔

(۴)....اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی پوجا پاٹ کرنا یا حاجت روائی مشکل کشائی میں کسی دوسرے کا دخل سمجھنا، جیسے: عرب کے مشرک کہا کرتے تھے کہ ہم تو بتوں کی اس لئے تعظیم کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے آگے ہمارے سفارشی ہیں اور کہتے تھے کہ اللہ نے خود ان کو ہمارے اور اپنے درمیان واسطہ بنایا ہے ہمارا جو کام ہوتا ہے انہی کے ذریعہ ہوتا ہے ان باتوں کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، اللہ نے ایسی کوئی آیت نہیں اتاری جس سے

ثابت ہوتا ہو کہ اس نے اپنے بندوں کی حاجت روائی کسی اور کے سپرد کردی ہے۔

(۵)..... اللہ تعالیٰ کے نام اٹکل پچو باتیں لگانا، ظاہر بات ہے کہ اللہ عزوجل کے بارے میں ہمیں اتنا ہی علم ہے جتنا قرآن مجید نے ہمیں بتایا ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھایا ہے ان کی بتائی اور سمجھائی ہوئی باتوں کے سوا اللہ تعالیٰ کے بارے میں اور کچھ اپنی طرف سے کہنے کے یہ معنیٰ ہوئے کہ ہم ایسی بات کہہ رہے ہیں جو ہمیں بتائی نہیں گئی، جیسے: مکہ والے کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ننگے طواف کرنے کا حکم دیا ہے، یہاں سے سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ننگے ہونے کو فحش کہا ہے اور فحش کو حرام کہا ہے۔

وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا: یہ بھی حرام ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراؤ جن کے بارے میں اس نے کوئی دلیل نہیں اُتاری، شرک بھی مکمل طور پر حرام اور کبیرہ گناہوں میں شامل ہے، مشرک لوگ بہت سی باتوں کو اللہ تعالیٰ کے ذمے لگادیتے تھے کہ اس نے ہمیں ایسا حکم دیا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وہ بعض جانوروں کو خود حرام قرار دے کر اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی حکم دیا ہے، اور یہ بھی حرام ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہو جو تم نہیں جانتے، مثلاً: خدا کیلئے بیوی اور اولاد کا ہونا ثابت کرنا یا ایسی چیزوں کا حلال یا حرام ہونا اللہ تعالیٰ کے ذمے لگانا جو حقیقت میں اس نے نہ کی ہو اور نہ کہی ہو۔

اس آیت میں کچھ ان چیزوں کا بیان ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے چھوڑ دینے ہی سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے، اور اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ دوہری جہالت میں مبتلا ہیں ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی عمدہ اور نفیس چیزوں کو اپنے اوپر بلا وجہ حرام کر کے ان نعمتوں سے محروم ہو گئے اور دوسری طرف جو چیزیں حقیقتاً حرام تھیں اور جن کے استعمال سے اللہ تعالیٰ کا غضب اور آخرت کا عذاب نتیجہ میں آنے والا ہے ان کے استعمال میں مبتلا ہو کر آخرت کا وبال خرید لیا اور اس طرح دنیا و آخرت دونوں جگہ نعمتوں سے محروم ہو کر دنیا اور آخرت میں خسارے میں رہے۔

گناہوں کے اثرات

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مختلف گناہوں کے اثرات اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں، مثلاً: بدکاری کی وجہ سے نسب میں خرابی پیدا ہوتی ہے؛ اسی لئے بدکاری کو فحش قرار دیا گیا ہے، شراب پینے سے انسان کی عقل خراب ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے گالیاں بکتا ہے اور قتل و غارت گری کرتا ہے، شراب کے علاوہ بھنگ، چرس، ہیروئین وغیرہ تمام نشہ آور چیزیں ہیں جو دماغ میں فتور پیدا کرتی ہیں۔

سرکشی، جیسے: گناہوں کی وجہ سے انسان کی عزت و آبرو خراب ہو جاتی ہے جب کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کرتا ہے کسی کا مال چھینتا ہے کسی کو قتل کرتا ہے، گالی دیتا ہے تو یہ چیزیں اسے بے آبرو کر کے رکھ دیتی ہیں، شرک کرنے سے انسان کی روح ناپاک ہو جاتی ہے بیشک شرک کرنے والے ناپاک ہیں وہ اگرچہ بظاہر صاف ستھرے ہوں مگر ان کی روحیں ناپاک ہوتی ہیں یہ مختلف قسم کے گناہ ہیں اور حرام کام ہیں ان سے بچنا چاہئے، البتہ اچھا لباس پہنو، پاکیزہ اور صاف ستھرا کھانا کھاؤ، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کا شکریہ ادا کرو۔

اس خاص تفصیل کا ذکر اس لئے بھی کیا گیا کہ اس میں تقریباً ہر طرح کی حرام چیزوں اور گناہوں کا ذکر آ گیا، خواہ عقیدے کے گناہ ہوں یا عمل کے اور پھر ذاتی عمل کے گناہ ہوں یا لوگوں کے حقوق سے متعلق ہوں اور اس لئے بھی کہ یہ عرب کے کافر ان سب جرموں میں مبتلا تھے اس طرح ان کی دوسری جہالت کو کھولا گیا کہ حلال چیزوں سے پرہیز کرتے اور حرام کے استعمال سے نہیں جھجکتے تھے۔

مقررہ مدّت

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً

اور واسطے ہر ایک امت کے وقت مقرر ہے پس جب آئے گا وقت ان کا نہ پیچھے ہٹ سکیں گے ایک گھڑی

وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٣٤﴾

اور نہ وہ آگے بڑھ سکیں گے (۳۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہر ایک امت کے واسطے ایک وقت مقرر ہے، پھر جب ان کا وقت آ پہنچے گا نہ ایک گھڑی پیچھے سرک سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ (۳۴)

تفسیر

ارشاد ہے کہ ہر امت کو زندگی کے کام کاج کیلئے ایک مدت دی گئی ہے اس مدت کے ختم ہونے کا وقت مقرر ہے اور جب یہ وقت آ جائے گا تو وہ ایک منٹ نہ اِدھر ہٹ سکیں گے نہ اُدھر، اس آیت پر غور کرنے سے دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں:

(۱)....کوئی شخص دنیا میں تنہا نہیں رہتا بلکہ اس کا کسی خاص جماعت، فرقے، شہر، ملک اور تمام انسانوں سے تعلق ہوتا ہے۔

اس آیت کے اترنے سے پہلے لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ تم کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے عذاب آتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی گناہ کرتا ہے اور اس کا کچھ نہیں بگڑتا، اس آیت میں اسے جو جواب دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اے شخص تو اس لئے کچھ دن کے لئے بچا ہوا ہے کہ تیری قوم کو مہلت ملی ہوئی ہے لیکن یہ قوم ایک دن فنا ہوگی اور پھر اس شخص کو کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔

ہر امت کے ایک وعدے کا وقت ہے جب ان کے وعدے کا وقت آجاتا ہے تو نہ پیچھے ہٹتے ہیں اور نہ آگے ہوتے ہیں بلکہ عین وقت پر ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے، مقصد یہ ہے کہ جب کسی قوم کی اجتماعی زندگی کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو پھر اسے مزید مہلت نہیں دی جاتی اور وہ ختم ہو جاتی ہے وقت سے پہلے واقعہ ہونے کی بات ضمناً کہی گئی ہے، اصل بات یہی ہے کہ تاخیر نہیں ہوتی، یعنی: دیر نہیں لگتی یہ بالکل ایسے ہی ہے، جیسے: کسی دکاندار سے چیز

کا بھاؤ پوچھ کر کہا جاتا ہے کہ کچھ کمی زیادتی کر دو اس سے مراد کمی ہی ہوتا ہے زیادتی کبھی بھی مراد نہیں ہوتی اسی طرح یہاں بھی فرمایا گیا ہے کہ وقت مقررہ سے آگے پیچھے نہیں ہوتا، یعنی: مقررہ وقت میں تاخیر نہیں کی جاتی بلکہ عین وقت پر کام تمام ہو جاتا ہے۔

(۲)....امت کو مہلت ملنا دنیا کی بناوٹ میں داخل ہے تا کہ وہ اپنے افراد کو سیدھے راستے پر چلائے جب وہ اس قابل نہ رہے گی تو ختم ہو جائے گی جن کا مطلب یہ ہے کہ اس کی عزت نیک نامی برباد ہو جائے گی اور وہ ذلیلوں کی طرح زندگی بسر کرے گی اس کا وقار اور دبدبہ جاتا رہے گا۔

کافر و گناہ گار ہر طرح کی سرکشی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں پل رہے ہیں اور دنیا میں ظاہر میں ان پر کوئی عذاب آتا نظر نہیں آتا وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے غافل نہ رہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو اپنی رحمت سے ڈھیل دیتے رہتے ہیں کہ کسی طرح یہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں اس ڈھیل اور مہلت کا ایک وقت معین ہوتا ہے جب وہ وقت آ پہنچتا ہے تو ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہوتا اور یہ عذاب میں پکڑ لئے جاتے ہیں، کبھی دنیا ہی میں کوئی عذاب آ جاتا ہے اور اگر دنیا میں عذاب نہ آیا تو مرتے ہی عذاب میں داخل ہو جاتے ہیں۔

نجات کا طریقہ

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ

اے اولاد آدم کی! اگر آئیں پاس تمہارے پیغمبر میں سے تم کہ بیان کریں پر تم آیتیں میری

فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۵

پس جو ڈرے اور نیک بنے پس نہیں خوف پر ان اور نہ وہ غمگین ہوں گے (۳۵)

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

اور جنہوں نے جھوٹا کہا آیتوں ہماری کو اور تکبر کیا سے ان وہ لوگ ساتھی ہیں

النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٦﴾
آگ کے وہ میں اسی ہمیشہ رہیں گے (۳۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے آدم کی اولاد! اگر تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر آئیں کہ تم کو میری آیتیں سنائیں تو جو ڈرے اور نیک بنے تو ان پر خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(۳۵) اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور تکبر کیا تو دوزخ میں رہنے والے وہی ہیں وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔(۳۶)

تفسیر

ارشاد ہے کہ اے آدم کی اولاد! میں نے تمہاری ہدایت کا دنیا میں بندوبست کردیا ہے اس کام کیلئے میرے پیغمبر جو تمہارے جیسے آدمی ہوں گے تمہارے پاس آئیں گے ان کی تابعداری کرنا وہ تمہیں دو چیزوں کی ہدایت کریں گے، ایک بری باتوں سے بچنا اس کا نام تقویٰ ہے، دوسرے نیک کام کرنا اس کا نام اصلاح ہے، وہ تم کو میری آیتیں سنائیں گے جو پیغمبروں کا کہنا مانیں گے وہ ساری آفتوں سے خود بھی بچیں گے اور امت کو بھی ذلت اور رسوائی سے بچالیں گے، لیکن جو ان کا کہنا نہ مانیں گے آخرت میں ان کا ٹھکانہ دوزخ کی آگ ہوگی۔

جنت میں پہنچنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ بیان فرمایا ہے کہ اے آدم کی اولاد! جب تمہارے پاس ہمارے پیغمبر آئیں جو تم ہی میں سے ہوں گے وہ تم پر میری آیتیں بیان کریں گے، یعنی: میرے حکم، دلیلیں، معجزے، اصول اور قوانین تمہارے سامنے پیش کریں گے اس وقت جو شخص بچ گیا جس نے کفر، شرک، نفاق گناہ اور غلط عقیدے سے اپنے آپ کو بچالیا ظاہر ہے جو شخص پرہیزگار ہوگا وہ صغیرہ گناہوں کے علاوہ مشکوک چیزوں سے بھی بچے گا اور اس ضمن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: متقی وہ ہے جو مشکوک چیزوں سے بچ گیا اور اس نے اپنے دین کو صاف ستھرا کرلیا، جو شرک میں ملوث ہوگیا وہ متقی نہیں ہوسکتا، متقی ہونے کیلئے کفر، شرک اور بدعقیدگی سے پاک ہونا ضروری ہے جس نے یہ چیزیں نہ چھوڑیں وہ تو خود ناپاک ہوگا اس کا دل اور روح بھی پلید ہوگا۔

جنت کی نعمتیں اس شخص کیلئے ہیں جو کفر اور شرک سے بچ گیا اور اپنی اصلاح کر لی اپنے آپ کو سنوار لیا برے کاموں کو چھوڑ کر نیکی کی طرف آ گیا اپنا اور مخلوق کا حق ادا کیا اپنے خالق کا حق پہچانا، وہی مومن، متقی اور اپنے عملوں کو درست کرے گا ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے، خوف کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے کہیں آنے والے زمانے میں کوئی ناگوار معاملہ پیش نہ آ جائے مگر پختہ ایمان والے لوگوں کے متعلق فرمایا: بڑی گھبراہٹ، یعنی: قیامت کے دن بھی ان کے دل مطمئن ہوں گے اور فرشتے تسلی دیں گے کہ گھبراؤ نہیں، اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بہتری کریں گے اسی طرح غم کا تعلق ماضی کے کاموں سے ہوتا ہے، مجرموں کو احساس ہو جائے گا کہ انہوں نے دنیا کی زندگی میں وقت ضائع کر دیا اپنے مال کو تباہ اور صحت کو برباد کیا، کفر، شرک اور بدعتوں میں ملوث رہے ان کے یہی کام انہیں غم میں مبتلا رکھیں گے مگر سچے مومن جنہوں نے ٹھیک کام انجام دیئے پیغمبروں کی دعوت پر ایمان لائے، کفر و شرک سے بچتے رہے اور اپنی اصلاح کی وہ نہ تو مستقبل کی فکر سے خوفزدہ ہوں گے اور نہ ماضی کے کاموں پر غمگین ہوں گے۔

اقراری مجرم

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ

پس کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو باندھے پر اللہ جھوٹ یا جھٹلائے آیتوں اسکی کو وہی ہیں

يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا

ملے گا ان کو حصہ ان کا سے کتاب یہاں تک کہ جب آئیں گے پاس انکے بھیجے ہوئے ہمارے

يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا

جان نکالنے ان کی پوچھیں گے کہاں ہیں وہ جنکو تھے تم پکارا کرتے سے سوا اللہ کے وہ کہیں گے

ضَلُّوْا عَنَّا وَ شَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝۳۷

گم ہو گئے وہ سے ہم اور اقرار کریں گے اوپر جانوں اپنی کے کہ وہ تھے کافر (۳۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر اس سے زیادہ کون ظالم ہے جو اللہ پر بہتان باندھے یا اس کے حکموں کو جھٹلائے یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کو ان کے نصیب کا لکھا ملتا ہی رہے گا یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی جان لینے کو پہنچیں گے تو کہیں گے کہاں گئے وہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے تھے، بولیں گے وہ ہم سے کھو گئے اور اپنے اوپر اقرار کرلیں گے کہ وہ بیشک کافر تھے۔(۳۷)

تفسیر

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ ان لوگوں سے بڑھ کر گھاٹے میں کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو ہنسی مذاق اور کھیل کود سمجھتے ہیں؟ ارشاد ہے کہ: جو یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہی اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے، حالانکہ ان کا کہنا غلط اور جھوٹ ہے یا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو انسان کا بنایا ہوا کلام سمجھتے ہیں حقیقت میں وہ غلط سمجھتے ہیں، یہ لوگ اپنا ستیاناس کر رہے ہیں جو کچھ آرام یا دکھ ان کیلئے لکھا ہے وہ انہیں پہنچے گا، پھر جب موت کا وقت آئے گا اور ہمارے فرشتے ان کی جان نکالنے آئیں گے تو ان کے ہوش گم ہو جائیں گے اور ہمیشہ کا دُکھ اور عذاب ان کی آنکھوں کے سامنے آجائے گا، فرشتے ان سے کہیں گے کیوں آج وہ لوگ یا تمہارے وہ بت یا تمہارے واہی تباہی شغل کہاں ہیں جن میں تم پھنسے رہتے تھے، اس وقت وہ ہکا بکا ہو کر جواب دیں گے کہ ہمارے یاروں اور مددگاروں میں سے تو سچ مچ کوئی نظر نہیں آتا اور نہ ہمیں وہ دل بہلاوے اور کھیل کود جس سے ہم اپنی مصیبتوں اور رنج و غم کا علاج کیا کرتے تھے اس وقت یاد آتے ہیں اس وقت انہیں یقین آجائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی مددگار تھا اور نہ ہو سکتا ہے اور وہ لوگ واقعی غلط راستے پر تھے۔

دوزخیوں کا جھگڑا

قَالَ ادۡخُلُوۡا فِيۡۤ اُمَمٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ مِّنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے داخل ہو جاؤ درمیان ان امتوں کے جو گزریں سے پہلے تم میں میں سے جنوں اور انسانوں

فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا

میں آگ جب داخل ہوگی ایک امت لعنت کریگی ساتھیوں اپنے کو یہاں تک کہ جب مل جائیں گے

فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا

میں اس سب کہیں گے ان کے پچھلے اپنے پہلوں کو اے رب ہمارے! یہی ہیں وہ جنہوں نے بھٹکایا ہم کو

فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬

پس دے ان کو عذاب دُگنا میں سے آگ

بامحاورہ ترجمہ:۔ فرمائے گا جنوں اور انسانوں کی جو جماعتیں گزر چکی ہیں تم بھی ان کے ساتھ دوزخ میں داخل ہو جاؤ، ایک امت جب داخل ہوگی تو دوسری کو لعنت کرے گی، یہاں تک کہ جب اس میں سب گر چکیں گے تو ان کے پچھلے پہلوں کو کہیں گے اے ہمارے رب! انہوں نے ہم کو گمراہ کیا سو تو ان کو آگ کا دُگنا عذاب دے۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا اب تم جنوں اور انسانوں کی ان تمام قوموں کے ساتھ جو تم سے پہلے اپنے کفر کی آفت میں مبتلا تھیں مل کر دوزخ میں جاؤ کیونکہ کفر کی یہی سزا ہے، ہم نے تم سب کو دنیا میں اپنی کتابیں اور پیغمبر بھیج کر بتا دیا تھا اگر تم دنیا میں اس کو سمجھ جاتے تو آج آگ کے عذاب سے بچ جاتے لیکن تم نہیں مانے تو اب اس کا عذاب چکھو، چنانچہ وہ سب دوزخ میں داخل ہوتے جائیں گے اور ایک دوسرے کو کوستے جائیں گے جب لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرتے سب کے سب دوزخ میں جا کر جمع ہو جائیں گے تو پچھلے لوگ اگلوں کو دیکھ کر اپنی بھڑاس اس طرح نکالیں گے کہ وہ ان کیلئے بددعا کرنی شروع کر دیں گے کہیں گے، اے ہمارے رب! ان کم بختوں نے ہمیں گمراہ کیا ان کو ہم سب سے دُگنا عذاب دے۔

عجیب بات ہے کہ ایسے بے لاگ اور صاف ڈراوے کے بعد آدمی دنیا میں وہی باتیں کرتا ہے جن کے انجام سے اسے ڈرایا گیا ہے برے کام کرنے والے دوسروں کو برا کام کرتے دیکھ کر ہی تو برا کام کرتے ہیں، آج وہ دوست نظر آتے ہیں کل وہی انہی کو اللہ تعالیٰ سے دُگنا عذاب دینے کی خود درخواست کریں گے۔

جھگڑا فضول ہے

قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ قَالَتْ اُوْلٰىهُمْ

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے لئے ہر ایک کے دُگنا ہے اور لیکن تم نہیں جانتے (۳۸) اور کہیں گے پہلے ان کے

لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ

پچھلوں اپنے کو پس نہ ہوئی لئے تمہارے اوپر ہمارے سے کچھ فضیلت پس چکھو عذاب

۴ ع ۸ ۱۱ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾

بدلے اس کے جو تھے تم کماتے (۳۹)

بامحاورہ ترجمہ: فرمائے گا کہ: دونوں کیلئے دُگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔(۳۸) ان کے پہلے پچھلوں کو کہیں گے پس تم کو ہم پر کوئی بڑائی حاصل نہیں دنیا میں جو تم گناہ کماتے تھے اب اس کے بدلے عذاب چکھو۔(۳۹)

تفسیر

پچھلی آیت میں بیان ہوا کہ جب دنیا میں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو پیٹھ پیچھے پھینکنے والے جان نکلنے کے وقت فرشتوں کی صورتیں دیکھ کر اور ان کا سوال سن کر لاجواب ہو جائیں گے اور صاف سمجھ جائیں گے کہ واقعی ہم کافر ہیں ہمیں اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے دنیا میں لاکھ سمجھایا کہ کفر نہ کرو ورنہ مرنے کے بعد

سزا ملے گی مگر اس وقت ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا اس وقت ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا اور پیغمبر نے سمجھایا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا، قیامت کے دن انہیں حکم ہوگا کہ اپنے جیسے اور لوگوں کے ساتھ مل کر جہنم میں جاؤ، چنانچہ وہ لوگ آگے پیچھے اس میں داخل ہوں گے اور ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرتے جائیں گے داخل ہونے کے بعد پچھلے لوگ اپنے رب سے درخواست کریں گے کہ ان سے پہلے لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا اس لئے ان کو ہم سے دُگنا عذاب ملنا چاہئے اس درخواست کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

ارشاد ہے کہ اچھی بات ہے چونکہ وہ خود بھی بہکے اور تم کو بھی بہکایا؛ اس لئے انہوں نے دو جرم کئے اس حساب سے تم ٹھیک کہتے ہو کہ ان کو دوہرا عذاب ملنا چاہئے، چنانچہ ان کو دوہرا عذاب ملے گا لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ خود تمہارے اوپر بھی دو جرم عائد ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ تم نے برے کام کیے، دوسرا یہ کہ اپنی سمجھ سے کام نہ لیا، قرآن کریم میں تمہیں بتایا گیا کہ دیکھو تم سے پہلے لوگوں نے برے کام کیے اور ان کو ان کی سزا دنیا میں دی گئی یہ بتانے کیلئے کہ برائی کا پھل برا ہے لیکن تم نے ایک نہ سنی اس لئے تم بھی دوہرے مجرم ہو اور تمہیں بھی دوہری سزا ملے گی، اس بنا پر فیصلہ یہ ہے کہ اگلوں پچھلوں دونوں کو دوہری سزا ملے گی، یہ فیصلہ سن کر پہلے لوگ پچھلوں کو چڑائیں گے کہ تم ہمارے لئے دُگنی سزا دیئے جانے کی درخواست کرنے اٹھے تھے کیا ہاتھ آیا الٹی منہ کی کھائی تم ہم سے کون سا اچھے تھے جو تم کو کم سزا ملتی مجرم مجرم سب برابر کیونکہ ان کے گناہ برابر اس لئے اپنے اپنے کئے ہوئے کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا اور ہمیں بھی اور تمہیں بھی اپنے اپنے کرتوتوں کی سزا میں یہ عذاب بھگتنا ہے اور ہم پر بھی اللہ ہی اپنا رحم کرے ورنہ اس سے جان چھوٹتی نظر نہیں آتی، کاش! اس بات کو ہم لوگ دنیا ہی میں سمجھ لیں کہ ایک روز مرنا ہے اور جو کیا ہے وہ بھرنا ہے۔

انسان نے جو اچھا عمل کیا ہے اس کا اجر بھی اسی کو ملے گا اور جو برائی کی ہے اس کا وبال بھی اسی پر پڑے گا، ہر شخص کو اپنے ہی عملوں کا بدلہ ملے گا کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اٹھائے گا کیونکہ قرآن کریم میں ایک جگہ یہ بھی ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا تو یہاں بھی یہی فرمایا کہ اپنی کارکردگی

کے عذاب کا مزہ چکھو، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے یہ تیرے ہی ہاتھوں کا آگے بھیجا ہوا بدلہ ہے اسے وصول کرو اور پھر اللہ تعالیٰ نے "سورۃ ق" میں یہ بھی فیصلہ فرمایا ہے کہ میں اپنے بندوں پر ذرہ بھر بھی زیادتی نہیں کرتا بلکہ وہ ہر شخص کو اس کے عملوں ہی کا بدلہ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں نے تمہیں دنیا کی زندگی دی تھی، عقل دی تھی، کام کرنے کی مہلت دی تھی، تمہاری ہدایت کیلئے پیغمبر بھیجے تھے، کتابیں اتاریں مگر تم نے اس ہدایت سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا، لہٰذا اب سزا کا مزہ چکھو یہ تمہارے ہی ہاتھوں کی کمائی کا نتیجہ ہے۔

نافرمانوں کا فیصلہ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ

بیشک جنہوں نے جھٹلایا آیتوں ہماری کو اور تکبر کیا سے ان نہ کھولے جائینگے لئے انکے

اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ

دروازے آسمانوں کے اور نہ داخل ہوں گے وہ جنت میں یہاں تک کہ داخل ہوجائے اونٹ میں

سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ

ناکے سوئی کے اور اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ہم مجرموں کو (۴۰) لئے انکے کا دوزخ

مِهَادٌ وَّ مِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

بچھونا ہے اور سے اوپران کے اوڑھنا اور اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ہم ظالموں کو (۴۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بیشک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے مقابلہ میں تکبر کیا ان کیلئے آسمانوں کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہوجائے، اور یوں ہم گناہگاروں کو بدلہ دیتے ہیں۔(۴۰) ان کیلئے دوزخ کا بچھونا اور اوپر سے اوڑھنا ہوگا اور ہم ظالموں کو یوں بدلہ دیتے ہیں۔(۴۱)

لفظی تحقیق: غَوَاشٍ: اوڑھنا۔ اصل میں ''غَوَاشِيْ'' ہے اور ''غَاشِيَةٌ'' کی جمع ہے، جو ''غَشْيٌ'' سے بنا ہے، ''غَشْيٌ'' کے معنی ہیں ڈھانک لینا، ''غَاشِيَةٌ'' ڈھانکنے والی چیز۔

تفسیر

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نافرمانوں کی غفلت، پیغمبر کے بتائے ہوئے زندگی گزارنے کے طریقوں کی مخالفت، گناہوں اور جرموں پر ڈٹے رہنا، یہ سب باتیں مرنے کے بعد دوزخ کی آگ کی صورت میں ظاہر ہوں گی اور جیسے وہ یہاں برے کاموں سے چپٹے ہوئے تھے وہاں ان سے یہ آگ چمٹی رہے گی ان کیلئے ان کے عملوں کے باعث جنت میں جانے کی کوئی صورت نہیں۔

ارشاد ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو دنیا میں گھڑی ہوئی اور جھوٹی باتیں بتایا اور اپنے غلط فیصلوں کے سامنے ان آیتوں کے فیصلوں اور انعام اور عذاب کے وعدوں اور دھمکیوں کو حقارت سے ٹھکرایا ان کیلئے جنت میں کوئی جگہ نہ ہوگی، دنیا میں یہ کہا کرتے تھے کہ جنت اور دوزخ بہلانے اور ڈرانے کیلئے فرضی نام گھڑے ہوئے ہیں، اب انہیں مرنے کے بعد جنت میں جانے کا کوئی حق نہیں وہ تکبر میں مبتلا ہیں اور اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں اور جنت کے بارے میں جو کچھ قرآن کریم کی آیتوں میں کہا گیا ہے ان کو چھوٹے درجے کی باتیں سمجھتے ہیں جو ان کی شان سے بالکل گری ہوئی ہیں۔

آسمانوں کے دروازے نہ کھلنے کا مطلب یہ ہے کہ کافروں اور مشرکوں کے عمل نہ تو اوپر آسمان کی طرف جائیں گے اور نہ قبول ہوں گے، یا یہ مطلب ہے کہ ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی، اس آیت کی تشریح میں وہ حدیثیں بھی موجود ہیں جن میں روحوں کا ذکر کیا گیا ہے، جب کوئی مومن آدمی فوت ہوجاتا ہے تو اس کی روح کو لے کر فرشتے آسمان کی طرف جاتے ہیں، فرشتے اس کیلئے آسمانوں کے دروازے کھول دیتے ہیں اور اسے مرحبا (خوش آمدید) کہتے ہیں، پھر اس روح کو آسمانوں سے گزار کر ''علیین'' کے مقام پر لے جاتے ہیں اس کے برخلاف

جب کافر، مشرک یا منافق کی روح کو لے کر فرشتے آسمانوں کی طرف جاتے ہیں تو فرشتے اس کے لئے آسمانوں کا دروازہ نہیں کھولتے اور حکم ہوتا ہے کہ اسے "سجین" میں لے جاؤ، چنانچہ اسے نہایت ذلت کے ساتھ واپس کر دیا جاتا ہے، آسمان کے دروازے نہ کھلنے کا یہی مطلب ہے کہ ان کیلئے بخشش کے دروازے بند ہو جائیں گے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کسی انصاری صحابی کے جنازہ میں تشریف لے گئے ابھی قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی تو ایک جگہ بیٹھ گئے اور صحابہ کرام آپ کے گرد خاموش بیٹھ گئے آپ نے سر مبارک اٹھا کر فرمایا کہ: مؤمن بندہ کیلئے جب موت کا وقت آتا ہے تو آسمان سے سفید چمکتے ہوئے چہروں والے فرشتے آتے ہیں جن کے ساتھ جنت کا کفن اور خوشبو ہوتی ہے اور وہ مرنے والے کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں، پھر موت کا فرشتہ حضرت عزرائیل علیہ السلام آتے ہیں اور اس کی روح کو خطاب کرتے ہیں کہ اے مطمئن نفس! رب کی مغفرت اور خوشنودی کیلئے نکلو اس وقت اس کی روح بدن سے آسانی سے نکل جاتی ہے، جیسے: کسی مشکیزہ کا منہ کھول دیا جائے تو اس کا پانی نکل جاتا ہے اس کی روح کو موت کا فرشتہ اپنے ہاتھ میں لے کر ان فرشتوں کے حوالہ کر دیتا ہے یہ فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں جہاں ان کو کوئی فرشتوں کا گروہ ملتا ہے وہ پوچھتے ہیں یہ پاک روح کس کی ہے یہ حضرات اس کا وہ نام و لقب لیتے ہیں جو عزت و احترام کیلئے اس کے واسطے دنیا میں استعمال کیا جاتا تھا اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں بن فلاں ہے یہاں تک کہ یہ فرشتے روح کو لے کر پہلے آسمان پر پہنچتے ہیں اور دروازہ کھلواتے ہیں یہاں تک کہ دروازہ کھولا جاتا ہے، یہاں سے اور فرشتے بھی ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہنچتے ہیں اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کا اعمال نامہ "علیین" میں لکھو اور اس کو واپس کر دو، یہ روح پھر لوٹ کر قبر میں آتی ہے اور قبر میں حساب لینے والے فرشتے آ کر اس کو بٹھاتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور دین اسلام ہے، پھر سوال ہوتا ہے کہ یہ بزرگ جو تمہارے لئے بھیجے گئے ہیں کون ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اس وقت ایک آسمانی آواز آتی ہے کہ میرا بندہ سچا ہے اس کیلئے جنت کا فرش بچھا دو اور جنت کا لباس پہنا دو اور جنت کی طرف اس کا دروازہ کھول دو اس دروازہ سے اس کو جنت کی

خوشبوئیں اور ہوائیں آنے لگتی ہیں اور اس کا نیک عمل ایک حسین صورت میں اس کے پاس اس کو مانوس کرنے کیلئے آجاتا ہے۔

جب منافق کی موت کا وقت آتا ہے تو آسمان سے سیاہ رنگ، خوفناک شکل وصورت کے فرشتے خراب قسم کا ٹاٹ لے کر آتے ہیں اور سامنے بیٹھ جاتے ہیں پھر موت کا فرشتہ اس کی روح اس طرح نکالتا ہے جیسے کوئی خاردار شاخ گیلی اون میں لپٹی ہوئی ہو تو اور وہ اس میں سے کھینچی جائے، یہ تو اس طرح روح نکلتی ہے تو اس کی بدبو مردار جانور کی بدبو سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے، فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں راہ میں جو دوسرے فرشتے ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ یہ کس کی بدبودار روح ہے، یہ حضرات اس وقت اس کا وہ برے سے برا نام ولقب ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا کہ یہ فلاں بن فلاں ہے یہاں تک کہ سب سے پہلے آسمان پر پہنچ کر دروازہ کھولنے کیلئے کہتے ہیں تو اس کیلئے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا بلکہ حکم یہ ہوتا ہے کہ اس بندہ کا اعمال نامہ "سجین" میں رکھو، جہاں نافرمان بندوں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں اور اس روح کو پھینک دیا جاتا ہے وہ بدن میں دوبارہ آتی ہے فرشتے اس کو بٹھا کر اس سے بھی وہی سوال کرتے ہیں جو مؤمن بندہ سے کئے تھے ان سب کا جواب وہ گھبرا کر یہ دیتا ہے کہ "ھَاہْ ھَاہْ لَا اَدْرِیْ" یعنی: میں کچھ نہیں جانتا، اس کیلئے دوزخ کا فرش، دوزخ کا لباس دیدیا جاتا ہے اور دوزخ کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اس کو دوزخ کی آنچ اور گرمی پہنچتی رہتی ہے اور اس کی قبر اس پر تنگ کر دی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ آمین

خلاصہ یہ کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کافروں اور منافقوں کی روحیں آسمان تک لے جائی جاتی ہیں آسمان کا دروازہ ان کیلئے نہیں کھلتا تو وہیں سے پھینک دی جاتی ہے۔

یہاں اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونے کی مثال جو دی گئی ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا محال ہے اسی طرح ان مجرموں کا جنت میں داخل ہونا محال ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا اوڑھنا بچھونا سب دوزخ کا ہوگا اور پہلی آیت جس میں جنت سے

محرومی کا ذکر تھا اس کے ختم پر "كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ" فرمایا، اور دوسری آیت جس میں دوزخ کے عذاب کا ذکر ہے اس کے ختم پر "كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ" فرمایا کیونکہ یہ اس سے زیادہ سخت ہے۔

نیکوں کی جزا

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ

اور جو لوگ ایمان لائے اور کام کیے نیک نہیں بوجھ ڈالتے ہم کسی جان پر مگر طاقت کے مطابق اسکی

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَنَزَعْنَا مَا

وہ لوگ ہیں جو رہنے والے ہیں جنت کے وہ میں اس ہمیشہ رہیں گے (۴۲) اور کھینچ لیا ہم نے جو تھا

فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ

میں سینوں ان کے میں سے کینہ بہتی ہوں گی سے نیچے ان کے نہریں

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جو ایمان لائے اور نیکیاں کیں ہم کسی پر بوجھ نہیں ڈالتے مگر اس کی طاقت کے موافق وہی جنت میں رہنے والے ہیں وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۴۲) اور جو کچھ ان کے دلوں میں ناراضگی تھی ہم اسے نکال لیں گے ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

لفظی تحقیق: غِلٍّ: کینہ، ناراضگی اور خفگی کو کہتے ہیں۔

تفسیر

لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ: جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالتے جو اس کی طاقت سے باہر ہو، مقصود یہ ہے کہ تمام نیک عمل جن کو جنت میں داخل ہونے کیلئے شرط کہا گیا ہے وہ کوئی بہت مشکل کام نہیں جو انسان نہ کر سکے بلکہ اللہ تعالیٰ نے شریعت کے حکموں کو آسان کر دیا ہے، بیماری، کمزوری، سفر اور دوسری انسانی ضرورتوں کا ہر حکم میں لحاظ رکھ کر آسانیاں دی گئی ہیں۔

"تفسیر بحر محیط" میں ہے کہ جب انسان کو نیک عملوں کا حکم دیا گیا تو یہ احتمال تھا کہ اس کو یہ حکم اس لئے بھاری معلوم ہو کہ تمام نیک عمل ہر جگہ ہر حال میں پورا کرنا تو انسان کے بس میں نہیں؛ اس لئے اس شبہ کو ان الفاظ سے دور کر دیا گیا کہ ہم تمام انسانی زندگی کے مختلف دور اور حالات کا جائزہ لے کر ہر حال میں اور ہر وقت اور ہر جگہ کیلئے مناسب حکم دیتے ہیں جن پر عمل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اس آیت میں جنت والوں کے خاص حال بیان کئے گئے ایک یہ کہ ان کے دلوں سے آپس کی رنجشیں نکال دی جائیں گی اور یہ لوگ ایک دوسرے سے بالکل خوش بھائی بھائی ہو کر جنت میں جائیں گے اور بسیں گے، "صحیح بخاری" میں ہے کہ مؤمنین جب پل صراط سے گزر کر دوزخ سے نجات حاصل کرلیں گے تو ان کو جنت و دوزخ کے درمیان ایک پل کے اوپر روک لیا جائے گا اور ان کے آپس میں اگر کسی سے کسی کو رنجش تھی یا کسی پر کسی کا حق تھا تو یہاں پہنچ کر ایک دوسرے سے بدلہ لے کر معاملوں کو صاف کرلیں گے اور اس طرح حسد، بغض، کینہ وغیرہ سے پاک صاف ہو کر جنت میں داخل ہوں گے، "تفسیر مظہری" میں ہے کہ یہ پل صراط کا آخری حصہ ہوگا جو جنت سے ملا ہوا ہے۔

اس مقام پر جو حقوق کے مطالبے ہوں گے ان کی ادئیگی ظاہر ہے کہ روپیہ پیسہ سے نہ ہو سکے گی کیونکہ وہ وہاں کسی کے پاس نہ ہوگا بلکہ "بخاری و مسلم" کی ایک حدیث کے مطابق یہ ادائیگی عملوں سے ہوگی، حقوق کے بدلہ میں اس کے عمل حق والے کو دیدیئے جائیں گے اور اگر اس کے عمل اس طرح سب ختم ہو گئے اور لوگوں کے حقوق ابھی باقی رہے تو پھر حق والے کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے اور پھر اسے دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے شخص کو بڑا مفلس قرار دیا ہے جس نے دنیا میں نیک عمل کیے لیکن لوگوں کے حقوق کی پرواہ نہ کی اس کے نتیجہ میں تمام عمل سے خالی **مفلس** ہو کر رہ جائے گا، اس حدیث میں حقوق کی ادئیگی اور بدلہ لینے کا عام ضابطہ بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ سب کو یہی صورت پیش آئے بلکہ "ابن کثیر" اور "تفسیر مظہری" کی روایت کے مطابق وہاں یہ صورت بھی ممکن ہوگی کہ بغیر بدلہ لئے آپس کی کدورتیں دور ہو جائیں جیسا

کہ بعض روایتوں میں ہے کہ یہ لوگ جب پل صراط سے گزر جائیں گے تو پانی کے ایک چشمہ پر پہنچیں گے اور اس کا پانی پئیں گے اس پانی کی خاصیت یہ ہوگی کہ سب کے دلوں سے آپس کا کینہ وکدورت دھل جائے گی۔

دوسرا حال جنت والوں کا اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنت میں پہنچ کر یہ لوگ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے کہ اس نے ان کیلئے جنت کی طرف رہنمائی فرمائی اور اس کا راستہ آسان کر دیا، اور کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو ہماری مجال نہ تھی کہ ہم یہاں پہنچ سکتے، اس سے معلوم ہوا کہ کوئی انسان صرف اپنی کوشش سے جنت میں نہیں جاسکتا جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل اس پر نہ ہو، کیونکہ کوشش خود اس کے قبضہ میں نہیں وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ

اور کہیں گے شکر اللہ کا جس نے رہنمائی کی ہماری لئے اسکی اور نہ تھے ہم کہ ہدایت پاتے ہم

لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ

اگر نہ ہوتا کہ رہنمائی کرے ہم کو اللہ کوئی شک نہیں کہ آئے پیغمبر رب ہمارے کے سچی بات لے کر اور

نُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴿۴۳﴾ الثلثة

انہیں آواز دی جائیگی کہ یہ جنت ہے وارث بنائے گئے تم بدلے اسکے جو تھے تم عمل کرتے (۴۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور وہ کہیں گے شکر اللہ کا کہ جس نے ہم کو یہاں تک پہنچادیا اور اگر اللہ ہم کو نہ پہنچاتے تو ہم پہنچنے والے نہ تھے، بیشک ہمارے رب کے پیغمبر سچی بات لائے تھے اور آواز آئے گی کہ یہ جنت ہے تم اپنے عملوں کے بدلے میں اس کے وارث بنائے گئے ہو۔ (۴۳)

تفسیر

حقیقت میں انسان کیلئے اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کہ اسے مرنے کے بعد جنت مل جائے، دنیا میں نیک کام اپنے بل بوتے کے موافق کیے آنکھیں بند ہوئیں تو فرشتے خوشخبری لے کر آئے قیامت میں حکم ہو گیا کہ جاؤ تمہارا ٹھکانہ جنت ہے وہاں جا کر رہو، دل میں سے ساری برائیاں، آپس کی رنجش، بغض، کینہ، حسد نکال دی گئیں، ایک دوسرے کو مبارک باد کہتے ہوئے جنت میں داخل ہوئے اسے دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، تمام نعمتیں موجود، ارمان نکالنے کی پوری آزادی، اس سے بڑھ کر اور خوش نصیبی کیا ہوگی اس کیلئے جنتیوں کی زبان پر خدا کا شکر اور اس کی حمد و ثناء جاری ہوگی جیسا کہ اس آیت میں بیان ہے۔

ارشاد ہے کہ: جنتی جنت میں داخل ہو کر کہیں گے ہماری کیا مجال تھی جو اس آرام و آسائش کی جگہ میں پہنچتے یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل اور انعام ہے، تعریف اور شکر کے لائق وہی ہے کہ جس نے اپنی رحمت سے ہمیں یہاں پہنچنے کا راستہ بتایا، اگر اس کا فضل و کرم نہ ہوتا تو ہم یہاں پہنچ نہ سکتے تھے، اب ہمیں صاف نظر آ رہا ہے کہ اللہ کے پیغمبر جو باتیں ہمیں بتاتے تھے وہ سولہ آنے سچ تھیں اور ان میں جھوٹ کی ملاوٹ ذرا بھی نہ تھی اس پر ان کو ایک آواز سنائی دے گی جو عام اعلان کر دے گی کہ لو یہ جنت ہے تم اس کے مالک بنائے گئے ہو اور یہ اس کا بدلہ ہے جو تم دنیا میں کرتے تھے وہاں تم نے اپنی خواہشوں کو ہماری تابعداری میں روکا اور ہمیشہ پیغمبر اور قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق ایسے کام کرتے رہے جن سے جنت ملے یہاں ہم نے تمہیں اس کے بدلے میں جنت دی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جنت میں داخلے کا حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، مختلف کاموں کے ظاہری اسباب بھی ہوتے ہیں اور حقیقی بھی، جنت میں پہنچنے کیلئے نیک عمل ظاہری سبب ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت حقیقی سبب ہے، اللہ تعالیٰ ہی ایمان اور نیک عملوں کی توفیق دیتے ہیں، برائیوں سے بچنے کی توفیق دیتے ہیں اگر اس کی توفیق نہ ہو تو انسان کچھ نہیں کر سکتا، چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام نے یہی کہا تھا کہ ''میری توفیق اللہ تعالیٰ کی

مدد ہی کی وجہ سے ہے''، تمام پیغمبروں کی یہی تعلیم ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ توفیق نہ دیں کوئی کام انجام نہیں پاسکتا، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: آپ صبر کریں مگر صبر کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ ہی دیں گے، مقصد یہ ہے کہ جنت میں جانے کا حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، عمل اگرچہ ظاہری اسباب ہیں مگر ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا، پہلے گزر چکا ہے عمل کے مطابق ہر ایک کے درجے ہوں گے، جتنے کسی کے اچھے عمل ہوں گے اتنے ہی اسکے درجے بلند ہوں گے۔

گفتگو

وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا

اور پکاریں گے | جنت والے | دوزخ والوں کو | کہ | تحقیق | پایا ہم نے | جو وعدہ کیا تھا ہم سے

رَبُّنَا حَقًّا فَہَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ

رب ہمارے نے | سچا | پس کیا | پایا تم نے | جو | وعدہ کیا تھا رب تمہارے نے | سچا | وہ کہیں گے | ہاں

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور پکاریں گے جنت والے دوزخ والوں کو کہ ہم سے جو ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا وہ ہم نے سچا پایا، سو کیا تم نے بھی اپنے رب کے وعدہ کو سچا پایا؟ وہ کہیں گے، ہاں!

تفسیر

قیامت میں انسانوں کے تین گروہ ہوں گے:

(۱)..... دوزخ میں جانے والے۔

(۲)..... جنت میں جانے والے۔

(۳)..... وہ گروہ جو جنت اور دوزخ کے بیچ میں کھڑا ہوگا اور لوگوں کو جنت اور دوزخ میں جاتے ہوئے دیکھے گا۔

پہلے بیان ہوا کہ دوزخی دوزخ میں لڑتے ہوئے اور ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرتے ہوئے داخل ہوں گے اور جنتی آپس میں ہنستے بولتے جائیں گے اور جنت کی نعمتوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکرادا کریں گے، جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو جنتی دوزخیوں کو یاد کریں گے اور ان کو پکار کر سوال کریں گے اور وہ اس کا جواب دیں گے اسی طرح جو لوگ بیچ میں کھڑے ہیں وہ بھی ان سے بات کریں گے اس کے بعد دوزخ والے جنت والوں سے کچھ درخواست کریں گے آگے کی آیتوں میں اسی آپس کی گفتگو کا ذکر ہے۔

ارشاد ہے کہ جنت والے جنت کی نعمتوں پر جو انہیں نصیب ہوں گی اللہ تعالیٰ کا شکر کر کے دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے کہ ہمارے رب نے اپنے پیغمبر کے ذریعے سے قرآن کریم میں جو ہم سے وعدہ کیا تھا وہ آج پورا ہوا اور ہم نے ان سب باتوں کو جو ہم سے کہی گئی تھیں سچ پایا، اب تم کہو کیا تم سے بھی جو کچھ عذاب اور سزا کے بارے میں کہا گیا تھا وہ سچ نکلا یا نہیں اور تمہارے رب نے جو تم سے کہا تھا وہ ٹھیک ٹھیک پورا ہوا یا نہیں؟ دوزخ والے ان کا سوال سن کر یہ جواب دیں گے کہ ہاں! وہ سب کچھ ٹھیک تھا اور ہو بہو وہی ہوا جو کہا گیا تھا، یہ جواب جس حسرت و مایوسی کا اظہار کرتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے ایک طرف دوزخ کی ناقابل برداشت مصیبت اور تکلیف اور دوسری طرف دلی رنج، کوفت، حسرت اور شرمندگی، آج انسان کو یہ سب باتیں سوچ کر ان سے بچنے کی جس طرح ہو سکے کوشش کرنی چاہئے ورنہ اگر خدانخواستہ آج اسے معمولی بات سمجھ کر اڑا دیا تو کل سر پر مصیبت آسکتی ہے۔

جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں جگہوں میں ہر حیثیت سے دوری ہی دوری ہوگی لیکن اس کے باوجود قرآن کریم کی بہت سی آیتیں اس پر گواہ ہیں کہ ان دونوں مقامات کے درمیان کچھ ایسے راستے ہوں گے جن سے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے اور ان کی آپس میں بات چیت اور سوال و جواب ہوں گے۔

"سورۃ صٰفّٰت" میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ آتا ہے کہ جنت والا ایک شخص اپنے ایک دوست سے ملاقات کا

خواہشمند ہوگا جب اسے جنت میں نہ پائے گا تو جہنم میں تلاش کرے گا وہ دوزخ میں جھانک کر دیکھے گا تو اسے جہنم کے درمیان میں پڑا ہوا پائے گا جنت ساتوں آسمانوں سے اوپر اور جہنم ساتوں زمینوں سے نیچے ہے، کروڑوں میل کے فاصلے کے باوجود وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے اور ان میں بات چیت ہوگی، جنت والا کہے گا خدا کی قسم! قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر دیتا اگر میں تیری باتوں میں آ کر آخرت کا انکار کر دیتا تو آج میں بھی تیرے ساتھ ہی ہوتا مگر خدا تعالیٰ کا احسان ہے کہ میں تمہاری باتوں سے متاثر نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رحمت کے مقام میں پہنچا دیا، بہر حال اسی طرح کی ایک گفتگو کا ذکر ان آیتوں میں بھی ہے۔

اس قسم کی بات چیت کا ذکر ”صحیحین (بخاری و مسلم)“ کی حدیث میں بھی آتا ہے، بدر کی جنگ میں جب بڑے بڑے سردار مارے گئے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان کی لاشوں کو گھسیٹ کر اس کنویں میں ڈال دو، شدید گرمی کا مہینہ تھا ایک لاش ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی باقیوں کو گھسیٹ کر کنویں میں گرا دیا گیا اس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنویں پر کھڑے ہو کر ان سے اسی طرح خطاب کیا تھا جس طرح اس آیت میں ہے کہ ہم نے تو اپنے رب کا وعدہ سچا پالیا ہے، کیا تم نے بھی اپنے رب کا وعدہ سچا پایا؟ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، اے اللہ کے پیغمبر! آپ ایسے جسموں سے کلام فرماتے ہیں جن میں روحیں موجود نہیں ہیں یہ تو مردار ہیں اور کفر کی حالت میں مرے ہیں، آپ ان سے کیسے بات کر رہے ہیں؟ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے! میں جو باتیں کر رہا ہوں یہ ان باتوں کو تم سے زیادہ اچھی طرح سن رہے ہیں مگر یہ جواب نہیں دے سکتے، حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کو زندہ کیا اور انہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات سنوائی تاکہ لوگوں کو عبرت ہو کہ پیغمبر کے نافرمانوں، بڑے بڑے جابروں کا کیا حشر ہوا۔

یہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دوسرے کو دیکھنے اور باتیں کرنے کے راستے میں بھی حقیقت میں دوزخیوں کیلئے ایک اور طرح کا عذاب ہوگا کہ چاروں طرف سے ان پر ملامت ہوتی ہوگی اور وہ جنتیوں کی نعمتوں اور راحتوں کو دیکھ کر دوزخ کی آگ کے ساتھ حسرت کی آگ میں بھی جلیں گے اور جنتیوں کیلئے نعمت و راحت میں

ایک نئی طرح کا اضافہ ہوگا کہ دوسرے فریق کی مصیبت دیکھ کر اپنی راحت ونعمت کی قدر زیادہ ہوگی اور جو لوگ دنیا میں دین داروں پر ہنسا کرتے تھے اور ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور یہ کوئی بدلہ نہ لیتے تھے آج ان لوگوں کو ذلت وخواری کے ساتھ عذاب میں گرفتار دیکھیں گے تو یہ ہنسیں گے کہ ان کے عمل کی ان کو سزا مل گئی۔

غیبی آواز

فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ

پس پکارے گا ایک پکارنے والا بیچ میں انکے کہ پھٹکار ہے اللہ کی پر ظالموں (۴۴) جو

يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ

روکتے تھے سے راستہ اللہ کے اور تلاش کرتے تھے اس میں کجی اور وہ آخرت کا

كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ

انکار کرنے والے تھے (۴۵) اور درمیان ان دونوں کے آڑ ہوگی

وقف لازم باختلاف

بامحاورہ ترجمہ: پھر ان کے بیچ میں ایک پکارنے والا پکارے گا کہ ان ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔(۴۴) جو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور اس میں کجی ڈھونڈتے تھے اور وہ آخرت سے انکاری تھے۔(۴۵) اور دونوں کے بیچ میں ایک دیوار ہوگی۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: پھر ایک پکارنے والا ان دونوں کے بیچ میں کھڑا ہو کر پکارے گا کہ آج وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی سے محروم رہیں گے جو دنیا میں سچی باتوں سے دور بھاگتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے سے لوگوں کو روکتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی سیدھی ہدایتوں کے ٹیڑھے ٹیڑھے معنیٰ تلاش کرتے تھے اور ان کی اصل شکل بگاڑنے کی کوشش کرتے تھے اور اس بات کو بالکل نہ مانتے تھے کہ اس دنیا کے بعد انسان دوبارہ زندہ کیئے

جائیں گے اور ان کے عمل جانچے اور تولے جائیں گے اور نیک کام کرنے والوں، اللہ تعالیٰ کے فرمانبرداروں کو جنت رہنے کیلئے ملے گی اور بدکاروں، نافرمانوں کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا اور ان کو وہاں اپنی بدکرداری کی سزا ملے گی، آج ان دونوں کا ٹھکانہ بالکل الگ الگ ہے اور ان کے درمیان ایک آڑ اور دیوار حائل ہے کہ جس سے نہ جنت کا عیش و آرام دوزخ میں آسکتا ہے اور نہ دوزخ کی مصیبتیں دکھ درد جنت میں جاسکتی ہیں۔

جنت والوں اور دوزخ والوں کا یہ مقابلہ جو ان آیتوں میں کیا گیا ہے اس سے مقصود اس دنیا میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی ختم ہوجانے کے بعد اس کو پھر زندہ کیا جائے گا اور اس دنیا میں جو اس نے عمر بھر کام کیے جو عقیدے اس نے دل میں جمائے اور جن باتوں کو اس نے سچا یا جھوٹا کہا ان کی وجہ سے یا تو ان کو ہرے بھرے اور تمام نعمتوں سے پر باغ ملیں گے جس میں رہنے کیلئے شاندار محل اور مکانات ہوں گے صاف وشفاف نہریں ہر طرف بہتی ہوں گی، پاکیزہ بیویاں اس کی ساتھی ہوں گی اور آدمی ان سب کا مالک بن کر عیش و آرام سے وقت گزارے گا اور وہاں جس چیز کو اس کا جی چاہے گا وہ ملے گی یا ان کے عملوں کا بدلہ سلگتی ہوئی آگ سے دیا جائے گا جس کے اندر انسان پڑا جلا کرے گا، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو کتاب دے کر اسی لئے بھیجا ہے کہ انسان کے اوپر واضح کردے کہ دنیا میں انسان کیلئے وہ عمل کون سے ہیں جن کے بدلے جنت عطا ہوگی اور وہ عمل کون سے ہیں جن کے بدلے دوزخ ملے گی جو وہاں جاکر آگ بن جائیں گے اگر یہاں ان کو نہ سمجھا تو وہاں سوا پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں، ہر پیغمبر کے دور میں کافروں کا یہی طریقہ رہا ہے، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعوں میں ملتا ہے کہ ان کے مخالف لوگ لوگوں کو پیغمبر کی بات سننے سے روکتے تھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا اگر باہر سے کوئی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملنے کیلئے آتا تو کافروں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ آپ سے ملنے نہ پائے آپ کے بارے میں غلط پراپگینڈہ کر کے لوگوں کو باز

رہنے کی تلقین کرتے تھے کبھی دیوانہ کہتے اور کبھی شاعر کہتے ،بعض کو طرح طرح کے لالچ دے کر بھی آپ کے قریب جانے سے روکتے تھے اور بعض پر تشدد کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے ،حدیثوں میں دو صحابیوں کا ذکر آتا ہے جو مکی زندگی میں پیغمبر ﷺ سے ملنے کیلئے آئے اور کافروں کے تشدد کا نشانہ بنے ان میں سے ایک حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تھے جو خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سن رکھا تھا کہ مکے کے سردار باہر سے آنے والوں کو پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے سے روکتے ہیں، کہتے ہیں کہ جب میں مکہ پہنچا تو پیغمبر ﷺ کا پتہ دریافت کرنے کیلئے میں نے ایک کمزور سے آدمی کو مخاطب کیا خیال تھا کہ یہ آسانی سے پتہ بتادے گا اور کوئی چون و چرا نہ کرے گا مگر جونہی میں نے پیغمبر ﷺ کا نام لیا اس آدمی نے فوراً شور مچادیا پکڑلو یہ صابی ہے اور پیغمبر ﷺ کو ملنے کیلئے آیا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے حرم کے قریب مجھے اتنا مارا کہ میں لہولہان ہوگیا اور بیہوش ہوکر گر پڑا مطلب یہ کہ مشرک لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنے کیلئے غلط پراپگینڈہ کے علاوہ طرح طرح کی اذیت بھی دیتے تھے۔

وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا: یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں اسلام میں ایسی نکتہ چینی کرتے ہیں کہ کوئی شخص اس کے قریب نہ آئے۔

وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ: ان دونوں کے درمیان آڑ ہوگی ،"سورہ حدید" میں اسے ایک بڑی آڑ کہا گیا ہے جو دوزخیوں اور جنتیوں کے درمیان حائل ہوگی اس کی ایک طرف خدا تعالیٰ کی رحمت ہوگی اور دوسری طرف عذاب ہوگا۔

اعراف

وَ عَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَ نَادَوْا

اور اوپر اعراف کے کچھ مرد ہوں گے پہچانیں گے ہر ایک کو سے نشانی اس کی اور پکاریں گے

اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۟ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾

جنت والوں کو کہ سلام علیکم نہیں داخل ہوئے وہ اس میں اور وہ امیدوار ہیں (۴۶)

وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا

اور جب پھریں گی آنکھیں ان کی طرف دوزخ والوں کے کہیں گے اے رب ہمارے!

۵ ع ۸ ۱۲

لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

مت کر ہمیں ساتھ قوم ظالموں کی (۴۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اعراف کے اوپر کچھ مرد ہوں گے کہ ہر ایک کو اس کی نشانی سے پہچان لیں گے اور وہ جنت والوں کو پکاریں گے کہ سلامتی ہے تم پر ابھی وہ جنت میں داخل نہیں ہوئے حالانکہ وہ امیدوار ہیں۔ (۴۶) اور جب ان کی نگاہ دوزخ والوں کی طرف پھرے گی تو کہیں گے اے ہمارے رب! ہم کو ظالم لوگوں کیساتھ مت کر۔ (۴۷)

لفظی تحقیق: اَلْاَعْرَافُ: آڑ۔ جنت اور دوزخ کے درمیان شہر کے فصیل کی طرح ایک چوڑی دیوار ہوگی۔

تفسیر

جنت اور دوزخ کے درمیان "اعراف" پر کچھ مرد کھڑے ہوں گے جو جنتیوں کو جنت میں اور دوزخیوں کو دوزخ میں داخل ہوتے دیکھ رہے ہوں گے یہ لوگ جنت کے امیدوار ہوں گے لیکن ابھی اس میں داخل نہ ہوئے ہوں گے ان لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہے کہ "اعراف" پر کچھ لوگ کھڑے ہوں گے جن کے سامنے ایک طرف جنت نظر آ رہی ہوگی اور دوسری طرف دوزخ، یہ لوگ چہروں ہی سے سمجھ جائیں گے کہ یہ جنتی ہے یہ دوزخی ہے، جنت والوں کو دیکھ کر یہ ان سے کہیں گے "سلام علیکم" یہ لوگ ابھی خود جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے لیکن داخل ہونے کی امید کر رہے

ہوں گے، جنت والوں سے ہٹ کر ان کی نگاہ جب دوزخ والوں پر پڑے گی تو ان کی افسردہ اور مرجھائی ہوئی شکلیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگیں گے اور بے ساختہ ان کے منہ سے نکلے گا کہ اے ہمارے رب! ہمیں ان سیاہ کاروں اور بدبختوں کا ساتھی مت بنانا۔

جنت اور دوزخ کے اندر داخل ہونے والوں کی آپس میں گفتگو پہلے بیان کردی گئی ایک کے الفاظ سے خوشی اور دوسروں کے جواب سے غم کا اظہار ہو رہا ہے کچھ لوگ ابھی دونوں سے باہر "اعراف" میں کھڑے ہیں ان کی رائے بھی بیان کردی گئی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ "اعراف" کب تک قائم رہے گا تاہم قیامت والے دن حساب کتاب کی منزل کے بعد کچھ لوگ جنت میں جائیں گے اور کچھ لوگ جہنم میں جائیں گے مگر بعض لوگوں کو "اعراف" کے اوپر کچھ وقت کیلئے ٹھہرایا جائے گا۔

"اعراف" والے لوگوں کے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں، بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ اونچے درجے کے لوگ ہوں گے جن کو جنت اور دوزخ دونوں طرف کے حالات دیکھنے کیلئے کھڑا کیا جائے گا مگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "اعراف والے" وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی کچھ عرصہ تک وہ اس مقام میں ٹھہریں گے اور آخر میں اللہ تعالیٰ کی رحمت غالب آئے گی اور ان کو جنت میں جانے کی اجازت مل جائے گی تاہم وہ ایمان والے ہی ہوں گے کافر یا مشرک وغیرہ نہیں ہوں گے، بعض کہتے ہیں کہ مشرکوں کی نابالغ اولاد کو "اعراف" میں رکھا جائے گا، بعض یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اعراف" کے رہائشی وہ شہید ہوں گے جو دنیا میں اپنے والدین کے نافرمان ہوں گے بعض فرماتے ہیں کہ "اعراف والے" لوگ فترۃ والے لوگ ہوں گے، یعنی: ایسے لوگ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیانی دور میں دنیا میں آئے مگر ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آیا اور نہ انہیں ہدایت نصیب ہوئی، بہرحال انہوں نے شرک بھی نہیں کیا ایسے لوگوں کو "اعراف" میں کچھ عرصہ رکھا جائے گا اور پھر جنت میں داخل کردیا جائے گا۔

ایک قول کے مطابق "اعراف کے مقام پر دو قسم کے لوگ ہوں گے پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو صحیح عقل رکھتے ہیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر ان تک اسلام کی دعوت صحیح طریقے پر نہیں پہنچی، مثلاً: کسی مقام تک اسلام کا کوئی پہنچانے والا پہنچا ہی نہیں یا اگر پہنچا ہے تو زبان کے اختلاف کی وجہ سے وہ اسلام کی دعوت صحیح طریقے پر نہیں پہنچا سکا اور ان لوگوں نے کفر یا شرک بھی نہیں کیا نہ ہی مکمل طور پر ایمان لائے تو یہ لوگ" اعراف والے" ہوں گے۔

اعراف کی مزید تشریح

جنت و دوزخ والوں کے آپس کی گفتگو کے ضمن میں ایک اور بات آیت میں یہ بتلائی گئی کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو جہنم سے تو نجات پا گئے مگر ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے، البتہ اس کے امیدوار ہیں کہ وہ بھی جنت میں داخل ہو جائیں ان لوگوں کو "اعراف والے" کہا جاتا ہے۔

"اعراف" کیا چیز ہے اس کی تشریح "سورہ حدید" کی آیتوں سے ہوتی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں لوگوں کے تین گروہ ہوں گے ایک کھلے کافر و مشرک ان کو تو پل صراط پر چلنے کی نوبت ہی نہ آئے گی پہلے ہی جہنم کے دروازوں سے اس میں دھکیل دیئے جائیں گے، دوسرے مؤمنین ان کے ساتھ ایمان کے نور کی روشنی ہوگی، تیسرے منافقین یہ چونکہ دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ لگے رہے وہاں بھی شروع میں ساتھ لگے رہیں گے اور پل صراط پر چلنا شروع ہوں گے اس وقت ایک سخت اندھیرا سب کو ڈھانپ لے گا، مؤمنین اپنے ایمان کے نور کی مدد سے آگے بڑھ جائیں گے اور منافقین پکار کر ان کو کہیں گے کہ ذرا ٹھہرو کہ! ہم بھی تمہاری روشنی سے فائدہ اٹھائیں اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کہنے والا کہے گا کہ پیچھے لوٹو وہاں روشنی تلاش کرو مطلب یہ ہوگا کہ یہ روشنی ایمان اور نیک عملوں کی ہے جس کے حاصل کرنے کا مقام پیچھے، یعنی: دنیا میں گزر گیا جن لوگوں نے وہاں ایمان و عمل کے ذریعہ یہ روشنی حاصل نہیں کی ان کو آج روشنی کا فائدہ نہیں ملے گا اسی حالت میں منافقوں اور مؤمنوں کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا اس دروازہ کے باہر تو سارا عذاب

ہی عذاب نظر آئے گا اور دروازہ کے اندر جہاں مؤمنین ہوں گے وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا مشاہدہ اور جنت کی فضا سامنے ہوگی یہی مضمون اس آیت کا ہے: ”يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿١٣﴾“۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ”اعراف والوں“ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ: وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی؛ اس لئے جہنم سے تو نجات ہوگئی مگر جنت میں ابھی داخل نہیں ہوئے ان کو ”اعراف“ پر روک لیا گیا، یہاں تک کہ تمام جنت اور دوزخ کا حساب اور فیصلہ ہوجانے کے بعد ان کا فیصلہ کیا جائے گا اور بلا آخر ان کی بخشش ہوجائے گی اور جنت میں داخل کردیئے جائیں گے۔

ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ”اعراف والے“ کون لوگ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے والدین کی مرضی اور اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہوگئے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوگئے تو ان کو جنت کے داخلہ سے ماں باپ کی نافرمانی نے روک دیا اور جہنم کے داخلہ سے اللہ تعالیٰ کے راستہ کی شہادت نے روک دیا۔

”سلام“ کا سنت لفظ

”اعراف“ کی تشریح اور تعریف معلوم ہونے کے بعد اب اصل آیت کا مضمون دیکھئے جس میں ارشاد ہے کہ ”اعراف والے“ جنتیوں کو آواز دے کر کہیں گے ”سلامٌ علیکم“ یہ لفظ دنیا میں بھی آپس کی ملاقات کے وقت تحفہ اور تعظیم کے طور پر بولا جاتا ہے اور سنت ہے، اور موت کے بعد قبروں کی زیارت کے وقت بھی اور پھر محشر اور جنت میں بھی، لیکن آیتوں اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں تو ”السلام علیکم“ یہ کہنا سنت ہے اور اس دنیا سے گزرنے کے بعد بغیر الف لام کے ”سلامٌ علیکم“ کا لفظ سنت ہے، قبروں کی

زیارت کیلئے جوکلمہ قرآن کریم میں مذکور ہے وہ بھی "سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝۲۴" آیا ہے اور فرشتے جب جنتیوں کا استقبال کریں گے اس وقت بھی یہ لفظ اسی عنوان سے آیا ہے "سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝۷۳" اور یہاں بھی "اعراف والے" جنتیوں کو اسی لفظ کے ساتھ سلام کریں گے۔

"سلام" کے احکام ومسائل

ان ان شخصوں پر سلام کا جواب دینا واجب نہیں:

(۱)…. جو شخص نماز پڑھ رہا ہو۔

(۲)…. جو شخص خطبہ دے رہا ہو۔

(۳)…. جو شخص قرآن شریف پڑھ رہا ہو۔

(۴)…. جو اذان یا اقامت کہہ رہا ہو۔

(۵)…. جو شخص کتابوں کا درس دے رہا ہو۔

(۶)…. جو شخص انسانی ضروریات، مثلاً: کھانا کھانے، قضاء حاجت یا استنجاء وغیرہ کرنے میں مشغول ہو۔

(۷)…. جو شخص دعا میں مشغول ہو۔

(۸)…. ذکر اللہ میں مشغول ہو۔

(۹)…. تلبیہ پڑھ رہا ہو۔

(۱۰)…. جو فیصلہ کرنے میں مشغول ہو۔

(۱۱)…. اونگھنے اور سونے والوں پر سلام کا جواب دینا ضروری نہیں۔

(۱۲)…. جو شخص غسل کرنے میں مشغول ہو۔

(۱۳)…. بچہ بے ہوش اور مجنون پر سلام کا جواب دینا ضروری ہے۔

(۱۴)…. نوجوان عورتوں کو مردوں کے سلام کا جواب دینا ضروری نہیں۔

"سلام" کرنے کے چند اصول و آداب

(۱).... جو شخص سواری پر سوار ہو اس کو چاہیئے کہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے۔

(۲).... جو چل رہا ہو اس کو چاہئے کہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے۔

(۳).... جو لوگ تھوڑے ہوں انہیں چاہئے کہ وہ زیادہ کو سلام کریں۔

(۴).... چھوٹے بڑوں کو سلام کریں۔

(۵).... اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب وہ ہے جو سلام میں ابتداء کرے۔

(۶).... "گڈ مارننگ"، "صبح بخیر" وغیرہ الفاظ کے مقابلے میں سلام بہت جامع مفہوم رکھتا ہے، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے ایسے الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کریں اور سلام ہی کو عام کریں، قرآن پاک میں "سورۂ نساء: کی آیت نمبر: ۸۰، پارہ: **والمحصنٰت**" میں ہے کہ جب تمہیں کوئی سلام کرے تو تم اس سے بہتر الفاظ میں جواب دو یا پھر سلام کے وہی الفاظ لوٹا دو۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یوں سلام کیا، "السلام علیک یا رسول اللہ"، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: "وعلیک ورحمۃ اللہ"، پھر دوسرا شخص آیا اس نے "السلام علیک و رحمۃ اللہ کہا"، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں "وعلیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" فرمایا، پھر ایک اور صاحب آئے انہوں نے "السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا: "وعلیک"، ان صاحب کے دل میں اشکال پیدا ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان آپ نے صرف "وعلیک" پر اکتفاء کیوں فرمایا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ تم نے ہمارے لئے کوئی کلمہ چھوڑا ہی نہیں جو ہم جواب میں اضافہ کرتے تم نے سارے کلمے سلام میں جمع کر دیئے؛ اس لئے ہم نے قرآنی تعلیمات کے مطابق تمہارے سلام کو جواب بالمثل کر دیا۔ (الدر المنثور: ۲/۱۸۸)۔

اعراف والے

وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ قَالُوْا

اور پکاریں گے اعراف والے کچھ لوگوں کو جنہیں وہ پہچانتے ہوں گے سے علامت ان کی کہیں گے

مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ۝۴۸ اَهٰۤؤُلَآءِ

نہ فائدہ دیا تم کو جماعت تمہاری نے اور جو تھے تم تکبر کرتے (۴۸) کیا یہی

الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ

وہ لوگ ہیں قسمیں کھائیں تھیں تم نے نہ پہنچائے گا ان کو اللہ رحمت داخل ہوجاؤ جنت میں

لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ وَ لَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ۝۴۹

نہ ڈر ہے اوپر تمہارے اور نہ تم غمگین ہوگے (۴۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور "اعراف والے" ان لوگوں کو پکاریں گے جنہیں ان کی نشانی سے پہچانتے ہوں گے، کہیں گے تمہاری جماعت اور جن چیزوں کے ذریعے تم شیخی بگھارتے تھے وہ تمہارے کام نہ آئے۔(۴۸) کیا یہ وہی ہیں کہ تم قسم کھایا کرتے تھے کہ ان کو اللہ کی رحمت نہ پہنچے گی حالانکہ ان کو تو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) کہہ دیا گیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہوجاؤ نہ تم پر ڈر ہے اور نہ تم غمگین ہوگے۔(۴۹)

تفسیر

ارشاد ہے کہ "اعراف والے" دوزخیوں میں کچھ ایسے لوگ دیکھیں گے جن سے وہ دنیا میں واقف تھے وہ ان کی صورت شکل، وضع قطع سے انہیں پہچان لیں گے اور ان سے کہیں گے تم دنیا میں کسی کو خاطر ہی میں لاتے نہ تھے اپنے حمائیتیوں اور اپنے مال ودولت کے بل پر اکڑا کرتے تھے، آج وہ سارے جتھے والے کہاں گئے آج کچھ حیلے وغیرہ استعمال کرکے تمہیں چھڑا کیوں نہیں لیتے، وہ دھن دولت، غرور وتکبر، وہ لاؤ لشکر اور وہ ساز وسامان

وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر شیخیاں، وہ تمہارے اشارے پر چلنے والے وہ سب آج کہاں ہیں تمہارے کچھ کام نہیں آئے، ادھر ہم جنت میں ان لوگوں کو دیکھ رہے ہیں جن کو تم کہا کرتے تھے کہ یہ کسی کام کے نہیں کیا یہ سچ مچ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ یہ تو نکمے لوگ ہیں ایسے لوگوں پر اللہ کی رحمت کیسے ہوسکتی ہے، تم کہتے تھے کہ جنت دوزخ کوئی چیز ہی نہیں یونہی ایک بات ہے ہمیں دنیا میں اچھی حالت میں دیکھ کر نکمے لوگوں نے ہمارے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کو گھڑ لیا ہے آج جو وہ کہتے تھے وہ سچ ہوگیا ان کو پروانہ مل گیا کہ جاؤ جنت میں جہاں چاہو، آج تمہارا وہ رنج وغم وخوف وہراس جو تم دنیا میں دنیا داروں کے ہاتھوں جھیلتے تھے سب ختم ہوگیا آج تمہارے لئے نہ خوف ہے اور نہ رنج والم میں گھلنا ہے دوزخ والے "اعراف والوں" کے طعن وتشنیع کا کیا جواب دے سکیں گے بس خون کے گھونٹ پی کر رہ جائیں گے۔

دوزخیوں کی پکار

وَ نَادٰۤی اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِیْضُوْا عَلَیْنَا مِنَ

اور پکاریں گے دوزخ والے جنت والوں کو کہ بہاؤ پر ہم میں سے

الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَی

پانی یا اس سے جو روزی دی تم کو اللہ نے کہیں گے بیشک اللہ نے حرام کر دیا ان دونوں کو پر

الْكٰفِرِیْنَ ۝۵۰ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ

کافروں (۵۰) جنہوں نے بنایا دین اپنے کو کھیل اور کود اور دھوکا دیا ان کو

الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۚ

زندگی نے دنیا کی

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور دوزخ والے جنت والوں کو پکاریں گے کہ بہاؤ ہم پر تھوڑا سا پانی یا کچھ اس میں

سے جو اللہ نے تم کو روزی دی، کہیں گے اللہ نے ان دونوں کو کافروں کیلئے حرام کر دیا ہے۔ (۵۰) جنہوں نے اپنا دین کھیل تماشہ ٹھہرایا اور دنیا کی زندگانی نے ان کو دھوکے میں ڈالا۔

تفسیر

ان آیتوں میں پہلے تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو جنت والے اپنے سامنے وہ تمام چیزیں دیکھ کر جن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا بہت خوش ہوں گے، فوراً ان کو خیال آئے گا کہ نافرمانوں سے دوزخ کا وعدہ کیا گیا تھا وہ بھی ضرور پورا ہوا ہوگا؛ اس لئے وہ نافرمانوں کو خطاب کر کے ان سے سوال کریں گے کہ ہم نے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچ پایا، کیا تم نے بھی وہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے تم سے کیا تھا سچ پایا؟ اس پر دوزخی چلائیں گے کہ ہاں! ہاں! وہ بالکل سچ تھا، اس کے بعد ان باتوں کا ذکر تھا جو "اعراف والے" جنت اور دوزخ والے دونوں سے کریں گے سب سے آخر میں اب اس کا ذکر ہے کہ دوزخ والے جنت والوں سے کیا کہیں گے۔

ارشاد ہے کہ دوزخی دوزخ میں سے جنت والوں کو پکاریں گے کہ ہمارے بدن اس آگ میں جل رہے ہیں گرمی کی شدت برداشت سے باہر ہے تم ہمارے اوپر تھوڑا سا جنت کا پانی بہا دو اور اللہ تعالیٰ نے آرام وراحت کے سامان جو تمہیں دیئے ہیں ان میں سے ہمیں بھی کچھ دے دو، جنت والے اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہاں تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں چیزوں کو کافروں پر حرام قرار دے دیا ہے جنہوں نے دنیا میں ہماری باتوں پر دھیان نہیں دیا اور زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ ہم نے مقرر کیا تھا اس کو کچھ وقعت نہ دی کھیل کود، ناچ گانے، سیر و تفریح کو اپنی زندگی کا مقصد، دین کو کھیل کود بنا دیا، دنیا کے دھندوں میں ایسے پھنسے کہ آخرت کا کبھی خیال ہی نہ آیا آج اس کے بدلے جنت کی چیزوں سے انہیں محروم کر دیا گیا ہے۔

غفلت کا نتیجہ

فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَ مَا كَانُوْا
پس آج بھلا دینگے ہم انکو جیسا کہ بھلایا انہوں نے ملنا آج کے دن کا جو یہ ہے اور جیسے تھے وہ

بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ
آیتوں ہماری کا انکار کرتے (۵۱) اور البتہ تحقیق لائے ہم پاس ان کے کتاب جسے کھول کر بیان کیا ہم نے پر علم

هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ
ہدایت اور رحمت لئے ایسی قوم کے جو ایمان لائے ہیں (۵۲) کیا انتظار کرتے ہیں وہ یہی کہ اسکا کہنا پورا ہو جائے

بامحاورہ ترجمہ:۔ سو آج ہم ان کو بھلا دیں گے، جیسا انہوں نے اس دن کے ملنے کو بھلا دیا اور جیسا کہ وہ ہماری آیتوں سے انکاری تھے۔ (۵۱) اور ہم نے ان لوگوں کے پاس کتاب پہنچا دی ہے جس کو ہم نے مکمل علم کے ساتھ ایمان والوں کیلئے بہت واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور وہ مؤمن لوگوں کیلئے ہدایت اور رحمت ہے۔ (۵۲) کیا اب اسی کے منتظر ہیں کہ یہ حقیقت بن کر سامنے آ جائے گی۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ قیامت کے دن ہم ان کافروں کو بھلا دیں گے، یعنی: ان کو جنت کی نعمتوں سے محروم کر دیں گے کیونکہ انہوں نے دنیا میں ہماری ملاقات کو بھلایا، یعنی: آخرت کا خیال ہی دل سے نکال دیا، آج انہوں نے دیکھ لیا کہ جو ہم نے کہا وہ سچ تھا لیکن دیکھنے کے بعد ماننے کا کوئی فائدہ نہیں اگر دنیا میں آخرت کو مان لیتے تو وہ ماننا آج کام آتا، آج ماننے کا دن نہیں ہے دنیا میں نہ ماننے کی سزا کا دن ہے۔

دنیا میں ہم نے ان کے پاس اپنی کتاب بھیج دی تھی اس میں اٹکل پچو باتیں نہ تھیں ہم نے جو کچھ اس میں لکھا تھا وہ خوب کھول کر بیان کر دیا تھا ایمان والوں کیلئے وہ کتاب سراسر رحمت تھی یہ لوگ کافی سوجھ بوجھ والے

تھے، آج اے پیغمبر! ان سے پوچھئے کہ! اس قدر سب کچھ صاف صاف بیان کرنے کے بعد تمہارے نہ ماننے کی کیا وجہ ہے جنت دوزخ کا پورا حال تمہارے سامنے بیان کر دیا گیا ہے اب کیا اس انتظار میں ہو کہ جو کچھ کہا ہے وہ بالکل آنکھوں کے سامنے آجائے خوب سمجھ لو کہ یہ دنیا میں نہیں ہوسکتا دنیا میں تو ہمارے کہنے پر یقین کر کے ماننا ہوگا، آخرت میں سب کچھ سامنے آجائے گا۔

وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ: اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بہانہ ختم کرنے کیلئے فرمایا کہ ہم ان کے پاس کتاب لائے ہیں اس میں تفصیل بیان کردی ہے، یعنی: ایسی کتاب ہے جس میں حق عقیدوں کی تفصیل اور باطل عقیدوں کی تردید ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے حکموں کے وہ تمام بنیادی اصول بیان کردیئے گئے ہیں جن کی انسانوں کو ضرورت رہتی ہے، اور تفصیل کی صورت یہ ہے کہ بعض اوقات اسی کتاب میں کوئی چیز ایک مقام پر مختصر طور پر بیان ہوتی ہے تو دوسری جگہ پر تفصیل کے ساتھ بیان کردی جاتی ہے، چنانچہ قرآن پاک کی لمبی سورتوں میں تفصیلی حکم ہیں ان میں مسئلے بھی بیان ہوئے ہیں اور دلیلیں بھی ان میں مثالیں بھی بیان ہوئی ہیں، لمبی سورتوں کے بعد درمیانی سورتیں اور پھر چھوٹی سورتیں ہیں لمبی سورتوں میں تفصیل ہے تو چھوٹی سورتوں میں خلاصے بیان ہوئے ہیں، گویا اکثر حکموں کی تفصیل خود قرآن کریم میں موجود ہے، تفصیل کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بات سونپی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کریم کو کھول کھول کر لوگوں پر بیان کردیں تاکہ کسی کو شک و شبہ نہ رہے اس کی خوب وضاحت کردیں۔

هُدًى وَّ رَحْمَةً: یہ قرآن کریم سراسر ہدایت ہے، یعنی: یہ انسان کی رہنمائی کرتی ہے کوئی بھی مشکل درپیش ہو اگر انسان قرآن کریم کی طرف رجوع کرے گا تو لازماً رہنمائی حاصل کرے گا، پھر یہ بھی ہے کہ جتنا زیادہ رجوع کرے گا اتنا زیادہ فائدہ اٹھائے گا، قرآن کریم میں ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی ہے، جو شخص قرآن کریم کے اصولوں پر عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی اس کی طرف متوجہ ہوگی یہ رحمت دنیا میں بھی حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی، مگر یہ ان لوگوں کیلئے ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں ایمان کے بغیر قرآن کریم سے

فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

بے موقعہ ایمان

يَوْمَ يَأْتِيْ تَأْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ

جس دن آئے گا انجام اس کا کہیں گے وہ لوگ جو بھولے تھے اس کو سے پہلے بیشک آئے تھے

رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ

پیغمبر رب ہمارے کی ساتھ حق بات کے پس کیا ہیں لئے ہمارے کوئی سفارش کرنے والے پس سفارش کریں لئے ہمارے یا

نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

لوٹائے جائیں ہم پس کریں ہم سوا اس کے جو تھے ہم کرتے بیشک نقصان کیا انہوں نے اپنا

ع ۶ ۱۳ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور گم ہو گیا سے ان جو تھے وہ جھوٹ گھڑتے (۵۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جس دن اس کا مضمون ظاہر ہو جائے گا وہ لوگ جو اس کو بھول رہے تھے کہنے لگیں گے بیشک ہمارے رب کے پیغمبر سچی بات لائے تھے، سو اب کوئی ہماری سفارش کرنے والے ہیں تو ہماری سفارش کریں یا ہم (دنیا میں) لوٹا دیئے جائیں تو ہم اس کے خلاف عمل کریں گے جو ہم کر رہے تھے، بیشک انہوں نے اپنے آپ کو تباہ کیا اور ان سے گم ہو جائے گا جو وہ گھڑتے تھے۔(۵۳)

تفسیر

ارشاد ہے کہ مرنے سے کوئی بچ نہیں سکتا مرنے کے بعد اس کے آگے سب کچھ آ جائے گا اور اسے یقین ہو جائے گا کہ قرآن کریم کی آیتوں کا جو مطلب تھا ٹھیک تھا اس وقت بے ساختہ سب کے منہ سے نکلے گا کہ واقعی

ہم سے بڑی بھول ہوئی، اللہ تعالیٰ کے پیغمبر دنیا میں ہم سے بالکل سچی بات کہتے تھے لیکن ہم نے دنیا کی ہوس میں پھنس کر ان کے کہنے پر کبھی دھیان نہ دیا قیامت میں وہ لوگ ان باتوں کو جنہیں وہ دنیا میں بھولے بیٹھے تھے سچ مچ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر سٹ پٹا جائیں گے اور انہیں عذاب سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئے گی، مایوس ہو کر چلائیں گے، کاش! ہمیں آج کوئی ایسی بے چین کرنے والی آفت سے بچالے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری سفارش کردے یا ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تاکہ ہم نیک کام کر کے دکھائیں اور اپنے عمل کو درست کریں لیکن اب اس کا موقعہ کہاں وہ دنیا کا موقعہ کھو چکے اور اپنے کرتوتوں سے اپنی جان آفت میں پھنسا چکے، اور اپنا ستیاناس کر چکے دنیا میں جو جھوٹی باتیں بناتے تھے آج ان کے کام نہ آئیں گی اور سوا غم و محرومی کے انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔

حقیقی پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ
تحقیق | رب تمہارا | اللہ ہے | جس نے | پیدا کئے | آسمانوں | اور | زمین کو | میں | چھ

اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ
دنوں کے | پھر | قرار پکڑا | اوپر | عرش کے | اُڑھاتا ہے | رات کو | دن | پیچھے آتا ہے اس کے

حَثِیْثًا ۙ وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ
دوڑتا ہوا | اور | سورج | اور | چاند | اور | تارے | تابع ہیں | حکم اسکے کے

بامحاورہ ترجمہ:۔ بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں پیدا کئے، پھر قرار پکڑا عرش پر رات پر دن اوڑھاتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے اور پیدا کئے سورج اور چاند اور تارے جو اس کے حکم کے فرمانبردار ہیں۔

لفظی تحقیق: حَثِیْثًا: دوڑتے ہوئے، اس کا ایک معنٰی ہے تیزی سے بغیر وقفے کے۔

تفسیر

اس رکوع میں اس کا بیان شروع ہوتا ہے کہ اپنے رب کو دنیا میں پہچان لینے کا کیا طریقہ ہے۔

ارشاد ہے کہ آسمان، زمین، رات، دن چاند، سورج اور ستاروں کی طرف دیکھو اور سوچو کہ اس سارے جہان کا نظام کس قدر سلیقے کے ساتھ قائم ہے کیا یہ یونہی اپنے ہی آپ قائم ہو گیا ہے؟ نہیں! کوئی چیز اپنے آپ نہیں ہوتی ان ساری چیزوں کا بنانے والا ان کو ایک نظام کے تحت قائم رکھنے والا اور ان کو رفتہ رفتہ کمال تک پہنچانے والا اللہ ہے جس کو آج ہم اس جسمانی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے مگر اس کی نشانیوں کو دیکھ کر عقل سے سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ہے اور ضرور ہے، یہ سارے آسمان اور زمین اسی کے بنائے ہوئے مادہ سے ایک مدت میں جا کر بنے اور اپنی اپنی جگہوں پر قائم ہوئے یہ مدت چھ دن تھی لیکن یہ دن وہ نہیں جو سورج کے ذریعے متعین ہوتے ہیں بلکہ ان کا پیمانہ اور ہے، دن رات، سورج، چاند اور ستارے سب رفتہ رفتہ ظاہر ہوئے آسمان و زمین کی پیدائش کے دنوں کی پیمائش ان کی طرح نہیں ان سب کی مختلف مگر باقاعدہ حرکتیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں ان سے دن رات ایک دوسرے کے بعد دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے فرمانبردار ہیں ان سب چیزوں پر غور کر کے اللہ تعالیٰ کو پہچانو اور اس پر ایمان لاؤ تا کہ آخرت کے عذاب سے بچو۔

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا، مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ چھ دن سے مراد یہ چوبیس گھنٹے والے دن رات مراد نہیں ہیں بلکہ ان دنوں سے دن کی وہ مقدار مراد ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تیرے پروردگار کے نزدیک ایک ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے اس لحاظ سے چھ دن سے مراد ایک ایک ہزار سال کے چھ دور یا چھ وقفے یا چھ ہوگا، یعنی: تمہارا رب وہ اللہ تعالیٰ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو ایسے چھ دن میں پیدا فرمایا جو دنیا کے چھ ہزار سال کے برابر ہیں۔

اس آیت میں زمین وآسمان کو چھ دن میں بنانے کا ذکر ہے اس کی تفصیل "سورہ حم السجدہ" کی نویں اور دسویں آیتوں میں اس طرح آئی ہے کہ دو دن میں زمین بنائی گئی، پھر دو دن میں زمین کے اوپر پہاڑ، دریا، درخت، پودے اور انسان وحیوان کے کھانے پینے کی چیزیں بنائی گئیں کل چار دن ہوگئے اور دو دن میں ساتوں آسمان بنائے۔

حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو ایک لمحے میں بھی پیدا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں جیسا کہ قرآن میں مختلف مقامات پر " كُنْ فَيَكُوْنُ " کے الفاظ آتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہوجاؤ تو وہ فوراً ہوجاتی ہے اسی طرح اگر وہ چاہتے تو پوری کائنات کو بھی پلک جھپکنے میں پیدا کرسکتے تھے کیونکہ وہ قادر ہیں، اللہ تعالیٰ حکیم بھی ہیں اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے مگر انسان اسے نہیں سمجھ سکتے حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سارے جہاں کو چھ دن میں پیدا کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ جلد بازی نہیں کرنی چاہئے بلکہ تمام کام سکون کے ساتھ درجہ بدرجہ انجام دینے چاہئیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے، "آہستگی رحمان کی طرف سے جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے" انسان جو کام جلد بازی میں کرے گا اس میں خرابی واقع ہوگی، لہٰذا تمام کام سوچ سمجھ کر نہایت اطمینان کے ساتھ کرنے چاہئیں۔

پہلے دو دن جن میں زمین بنائی گئی اتوار اور پیر ہیں اور دوسرے دو دن جن میں زمین کی آبادی کا سامان پہاڑ دریا وغیرہ بنائے گئے وہ منگل اور بدھ ہیں اس کے بعد ارشاد فرمایا "فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ"، یعنی: پھر ساتوں آسمان بنائے دو دن میں ظاہر ہے کہ یہ دو دن جمعرات اور جمعہ ہوں گے اس طرح جمعہ تک چھ دن ہوگئے۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ: پھر عرش پر قائم ہوا "اِسْتَوٰى" کے معنیٰ قائم ہونے اور "عرش" بادشاہی تخت کو کہا جاتا ہے اب یہ عرش رحمٰن کیسا اور کیا ہے اور اس پر قائم ہونے کا کیا مطلب ہے؟

اس کے متعلق بے غبار اور صاف وصحیح وہ مسلک ہے جو سلف صالحین، صحابہ وتابعین سے اور بعد میں اکثر

حضرات صوفیائے کرام سے منقول ہے کہ انسانی عقل اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی حقیقت کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے اس کی کھوج میں پڑنا بیکار ہے بلکہ نقصان دہ ہے ان پر مختصراً یہ ایمان لانا چاہئے کہ ان الفاظ سے جو کچھ حق تعالیٰ کی مراد ہے وہ صحیح اور حق ہے اور خود کوئی معنیٰ متعین کرنے کی فکر نہ کرے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے یہی سوال کیا کہ عرش پر قائم ہونے کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد فرمایا کہ: لفظ "استواء" کے معنیٰ تو معلوم ہیں اور اس کی کیفیت اور حقیقت کا علم انسانی عقل کو نہیں ہوسکتا اور ایمان لانا اس پر واجب ہے اور اس کے متعلق کیفیت وحقیقت کا سوال کرنا بدعت ہے کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے سوال نہیں کئے، سفیان ثوری، امام اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان ابن عیینہ، عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا کہ جو آیتیں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق آئی ہیں ان کو جس طرح وہ آئی ہیں اسی طرح بغیر کسی تشریح وتاویل کے رکھ کر ان پر ایمان لانا چاہئے۔

يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا: وہ اڑھا دیتا ہے رات کو دن پر، یعنی: دن پر رات کی چادر ڈال کر اسے چھپا دیتا ہے۔

اہل علم کیلئے "يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ" کی تحقیق

رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور چونکہ یہ معلوم ہی تھا کہ دن کو بھی رات پر ڈھانک دیا جاتا ہے؛ اس لئے اس پہلو کو ذکر نہیں کیا، یا یوں کہا جائے کہ جملہ میں دونوں احتمال ہوسکتے ہیں، "الَّيْلَ" مفعول اوّل اور "النَّهَارَ" مفعول دوئم، یا "النَّهَارَ" مفعول اوّل اور "الَّيْلَ" مفعول دوئم، بغوی نے کہا یہاں دوسرا جملہ محذوف ہے اصل کلام یوں تھا "يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ وَ يُغْشِي النَّهَارَ الَّيْلَ" پہلے جملے سے دوسرا جملہ معلوم ہو رہا تھا؛ اس لئے اس کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

يَطْلُبُهٗ: یعنی: اس کے پیچھے آتا ہے جب ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہو تو ایسا ہی لگتا ہے کہ پیچھے والا آنے والے کو طلب کر رہا ہے، جس طرح رات دن پر چھا جاتی ہے اسی طرح دن رات پر مسلط ہو جاتا ہے

اور اسی طرح دن اور رات کی دوڑ جاری رہتی ہے جو کہ ہر ایک کے مشاہدہ میں ہے۔

مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ: یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں اللہ تعالیٰ جس طرح چلاتے ہیں اسی طرح چلتے ہیں اس کے حکم کے پابند ہیں اللہ تعالیٰ نے جس مدار میں ان کو چلایا ہے اور جو ڈیوٹی لگائی ہے وہ اس کو انجام دے رہے ہیں۔

اس میں عقلمند انسان کیلئے سوچ بچار کا مقام ہے جو مخلوق کی بنائی ہوئی مصنوعات کا ہر وقت مشاہدہ کرتا ہے کہ بڑے بڑے ماہرین کی بنائی ہوئی مشینوں میں اوّل تو کچھ نقص رہتے ہیں اور نقص نہ بھی رہیں تو کیسی فولادی مشینیں اور پرزے ہوں چلتے چلتے گھستے ہیں، ڈھیلے ہوتے ہیں، مرمت کی ضرورت ہوتی ہے، گریسنگ کی حاجت پیش آتی ہے اور اس کیلئے کئی کئی دن بلکہ ہفتوں اور مہینوں مشین معطل رہتی ہے لیکن ان خدائی مشینوں کو دیکھو کہ جس طرح اور جس شان سے پہلے دن ان کو چلایا تھا اسی طرح چل رہی ہیں نہ کبھی ان کی رفتار میں ایک منٹ سیکنڈ کا فرق آتا ہے نہ کبھی ان کا کوئی پرزہ گھستا ٹوٹتا ہے نہ کبھی ان کو ورکشاپ کی ضرورت پڑتی ہے وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے چل رہی ہیں، یعنی: ان کے چلنے چلانے کیلئے نہ کوئی بجلی کا پاور درکار ہے نہ کسی انجن کی مدد ضروری ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے چل رہی ہیں اسی کے تابع ہیں، اس میں کوئی فرق آنا ناممکن ہے، ہاں! جب خود اللہ تعالیٰ ہی ان کے فنا کرنے کا ارادہ ایک معین وقت پر کریں گے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا جس کا نام قیامت ہے۔

خالق اور حاکم

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾ اُدْعُوْا

سن لو! لئے اسی کے پیدا کرنا ہے اور حکم کرنا برکت والا ہے اللہ پالنے والا جہانوں کا (۵۴) پکارو

رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾

رب اپنے کو عاجزی سے اور چپکے چپکے بیشک وہ نہیں پسند کرتا حد سے نکل جانے والوں کو (۵۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ سن لو! پیدا کرنا اور حکم فرمانا اسی کا کام ہے، اللہ جو سارے جہان کا رب ہے بڑی برکت والا ہے۔ (۵۴) اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۵۵)

تفسیر

ارشاد ہے کہ یہاں کے بادشاہ تو بنی بنائی چیزوں پر حکومت کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے بارے میں سن لو کہ! اس نے یہ ساری چیزیں اپنی قدرت سے بنائی ہیں کسی اور کی مدد اس میں شامل نہیں ہے، پھر اس کے سوا اور کون ان پر حکم چلاسکتا ہے اسی نے انہیں پیدا کیا اور اسی نے ان کے اندر انتظام قائم کیا؛ اس لئے ہر بات میں اسی کا حکم چلتا ہے، خیال کرو کہ! اگر ایک بڑا زبردست انجینئر ایک بڑے زبردست کارخانے کا نقشہ جماتا ہے اس کیلئے تمام مناسب کل پرزے اور ہر ایک کیلئے اس کا کام اور جگہ مقرر کرتا ہے اس کے بعد اس زبردست کارخانے کو اپنے ہی سدھائے ہوئے کاریگروں کے ذریعے بنا کر کھڑا کردیتا ہے ظاہر بات ہے کہ اس کارخانے کے چلانے کیلئے ہر قدم پر اسی کا حکم چلے گا کیونکہ اس کے کل پرزوں سے اور ان سے کام لینے کے طریقوں سے پورے طور پر اس کے سوا کوئی واقف نہیں۔

اسی طرح جہان کے بنانے، اس کی تربیت کرنے اور دیکھنے والا وہی رب العالمین ہے جس کے لئے ہر ضروری چیز اسی کی توجہ سے مہیا ہوتی ہے اور اسی کا نام برکت والا ہے؛ اس لئے انسان کیلئے لازم ہے کہ عاجزی کے ساتھ دل میں اسی کو پکارے اور اسی سے مدد مانگے وہ بندگی کی حد سے نکل جانے والوں کو ناپسند کرتا ہے کیونکہ جب سب کچھ اسی کا ہے تو دوسرے سے مانگنے کے کوئی معنیٰ نہیں۔

تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ: اس میں لفظ "تبارک" برکت سے بنا ہے اور لفظ برکت، بڑھنے، زیادہ ہونے، ثابت رہنے وغیرہ کے کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس جگہ لفظ "تبارک" کے معنیٰ بلند و بالا ہونے کے ہیں جو بڑھنے کے معنیٰ سے بھی لیا جاسکتا ہے اور ثابت رہنے کے معنیٰ سے بھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ قائم اور ثابت بھی ہیں اور بلند و بالا بھی، بلند ہونے کے معنیٰ کی طرف حدیث کے ایک جملہ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے، تبارکت و

تعالیت یا ذا الجلال و الاکرام.

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً: تضرع کا معنٰی عاجزی کرنا اور گڑگڑانا ہے، ان آیتوں میں دعا کے بعض آداب بھی بتلادیئے گئے ہیں جن کی رعایت کرنے سے دعا کی قبولیت کی اُمید زیادہ ہوجاتی ہے۔

دُعا کے آداب

دعا مانگنے کا ایک ادب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے نہایت عاجزی وانکساری کے ساتھ دعا مانگے، دوسرا یہ کہ چپکے چپکے پوشیدہ طور پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے اور اس سے سوال کرے اور اپنی ضرورتیں مانگے۔

دعا ایک عبادت ہے پیغمبر ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ: عبادت کا مغز دعا ہے، یعنی: دعا عین عبادت ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ: ''مجھ سے دعا کیا کرو میں قبول کروں گا جو خدا تعالیٰ کے سامنے دعا کرنے سے تکبر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ذلیل کرکے جہنم میں داخل کریں گے، گویا اللہ تعالیٰ کو پکارنا، اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا عبادت کا اہم حصہ ہے، بہرحال یہاں پر دُعا کے دو آداب کا ذکر کیا گیا ہے ایک عاجزی و انکساری اور دوسرا خفیہ طور پر، یعنی: چپکے چپکے۔

دعا مانگنے کا ایک ادب یہ ہے کہ دعا کو ایسے طریقہ سے مانگے کہ لگے کہ اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگا جارہا ہے، دعا پڑھی نہیں جاتی بلکہ مانگی جاتی ہے۔

دعا مانگنے کا ایک ادب یہ ہے کہ جو الفاظ دُعا میں بولے جائیں ان کے معنٰی معلوم ہوں کہ مانگنے والا اپنے لئے کیا مانگ رہا ہے۔

دعا کے قبول ہونے کیلئے شرط یہ ہے کہ حلال روزی کمائے اگر پیٹ میں حرام کا لقمہ ہو تو دعا قبول نہیں ہوتی، پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ: بعض آدمی لمبے لمبے سفر کرتے ہیں اور اپنا حلیہ فقیروں کی طرح بناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کیلئے ہاتھ پھیلاتے ہیں مگر ان کا کھانا بھی حرام ہے اور پینا بھی حرام ہے اور لباس بھی

حرام کا ہے، سوایسے آدمی کی دعا کہاں قبول ہوسکتی ہے۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ جب صحابہ کرام نے بلند آواز سے ذکر کیا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی جانوں پر نرمی کرو تم کسی ایسے کو نہیں پکار رہے ہو جو (معاذ اللہ) بہرا یا غائب ہو بلکہ تم تو ایسے کو پکار رہے ہو جو نہایت سننے والا اور قریب ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعلانیہ اور بلند آواز سے دعا کرنے میں اور آہستہ دعا کرنے میں ستر درجہ فضیلت کا فرق ہے، بزرگوں کی عادت یہ تھی کہ ذکر و دعا میں محنت اور بہت کوشش کرتے اور اکثر اوقات مشغول رہتے تھے مگر کوئی ان کی آواز نہ سنتا تھا بلکہ ان کی دعائیں صرف ان کے اور ان کے رب کے درمیان رہتی تھیں۔

بلند آواز سے دعا کرنے کی بالکل ممانعت نہیں ہے بلکہ خاص خاص موقعوں پر بلند آواز سے دعا کرنا افضل بھی ہے اسی لئے فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے کہ جن خاص موقعوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز سے دعا فرمائی ہے وہاں اسی طرح کرنا چاہئے اس کے علاوہ دوسرے موقعوں میں آہستہ دعا کرنا افضل ہے۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ: اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو، بیشک اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے، ذکر کرتے وقت چیخنا، چلانا اور شور کرنا ہرگز پسندیدہ نہیں، اسی طرح اپنی دعا میں کسی غلط اور ناجائز چیز کا طلب کرنا بھی درست نہیں، کیونکہ یہ بھی حد سے گزرنے میں داخل ہے، حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے سنا کہ ان کا بیٹا یوں دعا کر رہا ہے اے اللہ! میں جنت میں دائیں طرف سفید محل کا سوال کرتا ہوں یہ سن کر آپ نے فرمایا بیٹے! ایسا مت کہو بلکہ اللہ تعالیٰ سے صرف جنت کا سوال کرو اور اس کی ذات کے ساتھ دوزخ سے پناہ مانگو، یہ دعا بھی کرو کہ اے اللہ! میں تجھ سے جنت طلب کرتا ہوں اور ایسی بات اور ایسا عمل طلب کرتا ہوں جو جنت کے قریب کردے، نیز: یہ بھی کہ میں دوزخ سے پناہ مانگتا ہوں اور اس بات اور عمل سے بھی جو دوزخ سے قریب کردے، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا سنی تھی، لہٰذا اے بیٹے! تیرے لئے

اتنی دعا ہی کافی ہے اپنی دعا میں سفید محل کا سوال مت کرو، پھر آپ نے یہی آیت پڑھی "اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ"، یعنی: اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

حد سے بڑھنے کی ایک صورت یہ ہے کہ دعا میں قافیہ بندی کی جائے اور بہت ہی زیادہ تکلفانہ الفاظ استعمال کئے جائیں، اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ عام مسلمانوں کیلئے بددعا کرے یا کوئی ایسی چیز مانگے جو عام لوگوں کیلئے نقصان دہ ہو۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):..... ایسی جگہ بلند آواز سے دعا کرنا مکروہ ہے جہاں دوسرے لوگوں کیلئے تکلیف کا باعث ہو۔

مسئلہ (۲):..... نمازی یا تلاوت کرنے والے کے سامنے بلند آواز سے دعا کرنے سے اس کی نماز یا تلاوت میں خلل واقع ہوتا ہو تو وہاں بلند آواز سے دعا نہ کرے۔

مسئلہ (۳):..... اگر کوئی شخص مسجد میں بلند آواز سے دعا کرے گا تو وہ دو وجہ سے مناسب نہیں ایک تو آواز کا بلند کرنا مسجد کے آداب کے خلاف ہے اور دوسرے نمازیوں یا تلاوت کرنے والوں کیلئے یا اعتکاف کرنے والوں کیلئے تکلیف کا باعث ہوسکتا ہے۔

مسئلہ (۴):..... نماز میں "سورۂ فاتحہ" کے ختم پر جو آمین کہی جاتی ہے اس کو بھی آہستہ کہنا افضل ہے کیونکہ آمین بھی ایک دعا ہے۔

زمین میں فساد مت مچاؤ

وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَ ادْعُوْهُ خَوْفًا

اور	نہ	فساد کرو	میں	زمین	بعد	اصلاح اس کی کے	اور	پکارو اس کو	ڈرتے ہوئے

وَّ طَمَعًا ؕ اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰهِ قَرِیۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۶﴾

اور توقع کرتے ہوئے بیشک رحمت اللہ کی قریب ہے کے اچھے کام کرنے والے(۵۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو اور اس کو ڈر اور توقع سے پکارو بیشک اللہ کی رحمت نیک کام کرنے والوں کے قریب ہے۔(۵۶)

تفسیر

اس آیت میں فساد سے مراد کفر اور شرک ہے مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کو توڑ کر فساد کا باعث نہ بنو جب تک اللہ تعالیٰ کے حکموں پر عمل ہوتا رہے گا تو انسانوں کو امن اور چین نصیب ہوگا، ایمان ہوگا تو سکون ہوگا اور جب شرک ہوگا تو بدامنی ہوگی اور فساد پھیلے گا؛ اسی لئے فرمایا کہ: زمین میں اصلاح کے بعد فساد مت کرو۔

زمین کی اصلاح سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر، اپنی کتابیں اور ہدایت بھیج کر زمین کو کفر و شرک اور گمراہی سے پاک کیا۔

زمین کی ظاہری اور باطنی اصلاح اور فساد کا تفصیلی بیان

جس طرح اصلاح کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی ہیں، اسی طرح فساد کی بھی دو قسمیں ہیں۔ زمین کی ظاہری اصلاح تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا جسم بنایا ہے کہ نہ پانی کی طرح نرم ہے جس پر چل پھر نہ سکے اور نہ پتھر اور لوہے کی طرح سخت ہے جس کو کھودا نہ جاسکے، ایک درمیانی حالت میں رکھا گیا ہے تاکہ انسان اس کو نرم کر کے اس میں کھیتی اور درخت اور پھول پھل اُگا سکے اور کھود کو اس میں کنویں، خندقیں اور نہریں بنا سکیں، مکانوں کی بنیادیں ڈال سکیں، پھر اس زمین کے اندر اور باہر ایسے سامان پیدا فرمادیئے جن سے زمین کی آبادی ہو اس میں سبزی اور درخت اور پھول پھل اُگ سکیں، باہر سے ہوا، روشنی، گرمی، سردی پیدا کی اور پھر بادلوں کے ذریعے اس پر پانی برسایا جس سے درخت پیدا ہوسکیں مختلف ستاروں اور سیاروں کی سرد گرم کرنیں ان پر ڈالی گئیں جن سے

پھولوں پھلوں میں رنگ اور رس بھرے گئے انسان کو عقل وسمجھ عطا کی گئی جس کے ذریعہ اس نے زمین سے نکلنے والے لکڑی، لوہا، تانبہ، پیتل، ایلمونیم وغیرہ کے جوڑ توڑ لگا کر مصنوعات کی ایک نئی دنیا بناڈالی یہ سب زمین کی ظاہری اصلاح ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے فرمائی۔

اور اصلاح باطنی وروحانی کا مدار اللہ تعالیٰ کے ذکر، اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اس کی اطاعت پر ہے اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے اوّل تو ہر انسان کیلئے دل میں ایک مادہ اور جذبہ خدا کی اطاعت اور یادکا رکھ دیا ہے اور انسان کے ارد گرد کے ہر ذرّے ذرّے میں اپنی قدرت کے ایسے کرشمے رکھے ہیں کہ ان کو دیکھ کر معمولی سمجھ رکھنے والا بھی بول اٹھے کہ "فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ" اس کے علاوہ اپنے پیغمبر بھیجے، کتابیں اتاریں جن کے ذریعہ مخلوق کا تعلق خالق و مالک کے ساتھ جوڑنے کا پورا انتظام فرمایا، اس طرح گویا زمین کی پوری پوری اصلاح ظاہری اور باطنی ہوگئی، اب حکم یہ ہے کہ ہم نے اس زمین کو درست کر دیا ہے تم اس کو خراب نہ کرو۔

جس طرح اصلاح کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی بیان کی گئی ہیں اسی طرح اس کے مقابلے میں فساد کی بھی دو قسمیں ظاہری اور باطنی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ذریعہ دونوں ہی کی ممانعت کی گئی ہے اگرچہ قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل فرض منصبی اصلاح باطنی ہے اور اس کے مقابلے میں فساد باطنی سے روکنا ہے، لیکن اس دنیا میں ظاہر و باطن کے اصلاح و فساد میں ایک ایسا ربط ہے کہ ایک کا فساد دوسرے کے فساد کا ذریعہ بن جاتا ہے؛ اس لئے قرآن کریم نے جس طرح باطنی فساد کے دروازے بند کئے ہیں اسی طرح ظاہری فساد کو بھی منع فرمایا ہے، چوری، ڈاکہ، قتل اور بے حیائی کے تمام طریقے دنیا میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کا فساد پیدا کرتے ہیں؛ اس لئے ان چیزوں پر خصوصیت سے پابندیاں اور سخت سزائیں مقرر فرمائی اور عام گناہوں اور جرموں کو بھی ممنوع قرار دیا کیونکہ ہر جرم و گناہ کہیں ظاہری فساد کا ذریعہ بنتا ہے کہیں باطنی فساد کا، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر ظاہری فساد باطنی فساد کا سبب بنتا ہے اور ہر باطنی فساد ظاہری فساد کا ذریعہ بنتا ہے، جب تک انسان اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع فرمان رہتا ہے تو یہ سب چیزیں انسان کی صحیح خدمت گار ہوتی ہیں اور جب انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے لگے

تو دنیا کی ساری چیزیں انسان کی نافرمان ہو جاتی ہیں جس کو انسان ظاہری طور پر اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا لیکن ان چیزوں کے اثرات، نتیجوں اور فائدوں میں غور کرنے سے صاف طور پر اس کا ثبوت مل جاتا ہے۔

اب دنیا کے حالات پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہوگا کہ آج کل راحت کے سامان اور دواؤں کی بہتات کے باوجود انسانوں کی اکثریت انتہائی پریشانیوں اور بیماریوں کا شکار ہے نئے نئے مرض، نئی نئی مصیبتیں برس رہی ہیں کوئی بڑے سے بڑا انسان اپنی جگہ مطمئن نہیں ہے بلکہ جوں جوں یہ سامان بڑھتے جاتے ہیں اسی انداز سے مصیبتیں اور آفتیں اور مرض اور پریشانیاں بڑھتی جاتی ہیں۔

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا: اس کے مفہوم میں وہ جرم اور گناہ داخل ہیں جن سے ظاہر طور پر دنیا میں فساد پیدا ہوتا ہے اسی طرح ہر نافرمانی اور خدا تعالیٰ سے غفلت بھی اس میں شامل ہے؛ اس لئے اس آیت میں اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو خوف اور اُمید کے ساتھ پکارو، یعنی: اس طرح کہ ایک طرف دعا کے ناقابل قبول ہونے کا خوف لگا ہوا ہو اور دوسری طرف اس کی رحمت سے پوری امید بھی لگی ہوئی ہو کہ وہ قبول ہوگی۔

بعض علماء نے فرمایا کہ: مناسب یہ ہے کہ زندگی اور تندرستی کے زمانہ میں خوف کو غالب رکھے تاکہ اطاعت میں کوتاہی نہ ہو اور جب موت کا وقت قریب آئے تو اُمید کو غالب رکھے کیونکہ اب عمل کی طاقت ختم ہو چکی ہے رحمت کی امید ہی اس کا عمل رہ گیا ہے۔

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ: اللہ تعالیٰ نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہیں، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ دعا کے وقت خوف اور اُمید دونوں ہی حالتیں ہونی چاہئیں لیکن ان دونوں حالتوں میں سے اُمید کا پہلو غالب ہونا چاہئے۔

دُعا کے آداب

اس آیت میں دعا کیلئے دو آداب بتلائے گئے ہیں جن کا تعلق انسان کے دل سے ہے، وہ یہ کہ دعا کرنے

والے کے دل میں اس کا خطرہ بھی ہونا چاہئے کہ شاید میری دعا قبول نہ ہو اور اُمید بھی ہونی چاہئے کہ میری دعا قبول ہوسکتی ہے، کیونکہ اپنے گناہوں سے بےفکر ہوجانا بھی ایمان کے خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوجانا بھی کفر ہے، دعا کی قبولیت کی جب ہی توقع کی جاسکتی ہے جبکہ ان دونوں حالتوں کے درمیان درمیان رہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: بندہ کی دعا اس وقت تک قبول ہوتی رہتی ہے جب تک وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے اور جلد بازی نہ کرے، صحابہ کرام نے دریافت کیا جلد بازی کا کیا مطلب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مطلب یہ ہے کہ یوں خیال کر بیٹھے کہ میں اتنے عرصہ سے دعا مانگ رہا ہوں اب تک قبول نہیں ہوئی یہاں تک کہ مایوس ہوکر دعا چھوڑ دے، اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے جب دعا مانگو تو اس حالت میں مانگو کہ تمہیں اس کے قبول ہونے میں کوئی شک نہ ہو، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کو سامنے رکھ کر دل کو اس پر جماؤ کہ میری دعا ضرور قبول ہوگی یہ اس کے منافی نہیں کہ اپنے گناہوں کے وبال کے سبب یہ خطرہ بھی محسوس کرے کہ شاید میرے گناہ دعا کی قبولیت میں رکاوٹ بن جائیں۔

زمین کا نظام

وَ هُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی

اور وہی ہے جو بھیجتا ہے ہوائیں خوشخبری کے طور پر درمیان دونوں ہاتھوں رحمت اپنی کے یہاں تک کہ

اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ

جب اٹھالاتی ہیں وہ بادل بھاری ہانک دیتے ہیں ہم اسکو طرف شہر مردہ پھر اتارتے ہیں ہم سے اس

الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی

پانی پس نکالتے ہیں ہم سے اس سے ہر قسم کے پھل اسی طرح نکالیں گے ہم مُردوں کو

لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝۵۷

تاکہ تم غور کرو (۵۷)

بامحاورہ ترجمہ: ۔ اور وہی ہے جو بارش سے پہلے خوشخبری لانے والی ہوائیں چلاتا ہے یہاں تک کہ جب ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھالاتی ہیں تو ہم اس بادل کو ایک مردہ زمین (یعنی: بنجر علاقے) کی طرف ہانک دیتے ہیں، پھر اس بادل سے ہم پانی برساتے ہیں، پھر اس سے سب طرح کے پھل نکالتے ہیں، اسی طرح مُردوں کو نکالیں گے تاکہ تم غور کرو۔(۵۷)

تفسیر

ارشاد ہے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے زمین پر بارش کرنے کا کیسا انتظام کیا ہے، پہلے خوشگوار ہوائیں چلتی ہیں، پھر ہوا بادلوں کو اُدھر سے اِدھر اٹھا کر لاتی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ان بادلوں سے ایسی زمین پر بارش برساتے ہیں جو خشک ہوکر بنجر ہوگئی تھی، اس سے مزیدار پھل اور خوشنما پھول نکلتے ہیں اس پر تم غور کرو تو تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ، جیسے: اس نے اس زمین کے مرجانے، یعنی: بنجر ہوجانے کے بعد اپنی رحمت سے پانی برسا کر زندہ کردیا اسی طرح وہ انسان کو بھی اس کے مرجانے کے بعد زندہ کرے گا، زمین کا خشک ہوجانا اس کی موت ہی ہے، تم دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اُسے بارش کے ذریعے دوبارہ زندہ کردیتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کریں گے اور ان کے زندہ ہونے کے بعد ان کو اپنے دنیا میں کئے ہوئے کاموں کا پھل ملے گا، لیکن یہ یاد رکھو کہ! اگر پھولنا پھلنا ہے تو اس دنیا میں اس روحانی بارش سے فائدہ اٹھاؤ جو اس نے اپنے پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعے برسائیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ: قیامت میں دو مرتبہ صور پھونکا جائے گا، پہلے صور میں سارا جہان فنا ہوجائے گا کوئی چیز زندہ باقی نہ رہے گی، اور دوسری مرتبہ صور پھونکنے پر سارا جہان پھر پیدا ہوگا اور سب مردے زندہ ہوجائیں گے، حدیث میں ذکر ہے کہ ان دونوں مرتبہ کے صور پھونکنے

کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہوگا اور ان چالیس سال میں مسلسل بارش ہوتی رہے گی اسی عرصہ میں ہر مردہ انسان اور جانور کے اجزاء بدن کے ساتھ جمع کر کے ہر ایک کا مکمل ڈھانچہ بن جائے گا، اور پھر دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے وقت ان لاشوں کے اندر روح آ جائے گی اور زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے اس روایت کا اکثر حصہ "بخاری و مسلم" میں موجود ہے۔

سب کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتے ہیں

یہاں تک آیت کے مضمون سے چند اہم چیزیں ثابت ہوئیں، اوّل یہ کہ بارش بادلوں سے برستی ہے جیسا کہ دیکھنے میں آتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں آسمان سے بارش برسنے کا ذکر ہے وہاں بھی لفظ سماء سے بادل مراد ہے، دوسرے یہ کہ بادلوں کا کسی خاص سمت اور خاص زمین کی طرف جانا یہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے وہ جب چاہتے ہیں جہاں چاہتے ہیں جس قدر چاہتے ہیں بارش برسانے کا حکم دیدیتے ہیں، بادل اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرتے ہیں۔

اس کا مشاہدہ ہر جگہ اس طرح ہوتا رہتا ہے کہ بسا اوقات کسی شہر یا بستی پر بادل چھایا رہتا ہے اور وہاں بارش کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن وہ بادل یہاں ایک قطرہ پانی کا نہیں برستا بلکہ جس شہر یا بستی میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے برسنا ہوتا ہے وہیں جا کر برستا ہے۔

پیداوار کی صلاحیت

وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِيْ خَبُثَ لَا

اور | زمین | پاکیزہ | نکلتی ہے | پیداوار اسکی | ساتھ حکم | رب اسکے کے | اور | جو (زمین) | خراب ہے | نہیں

ع ۵ / ۱۴ یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾

نکلتا اس میں سے مگر ناقص اسی طرح ہم ادل بدل کرتے ہیں آیتوں کو لئے انکے جو شکر کرتے ہیں (۵۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جو زمین پاکیزہ (یعنی: زرخیز) ہے اس کا سبزہ اس کے رب کے حکم سے نکلتا ہے اور جو خراب ہے اس سے ناکارہ چیزوں کے سوا کچھ نہیں نکلتا اور ہم یوں شکر کرنے والوں کیلئے آیتوں کو انداز بدل بدل کر بیان کرتے ہیں۔ (۵۸)

لفظی تحقیق: نَكِدًا: "نَكِدًا" کہتے ہیں اس چیز کو جو بے فائدہ بھی ہو اور پھر مقدار میں بھی کم ہو۔

تفسیر

وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا: آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بارش ہر شہر ہر زمین پر برابر برستی ہے لیکن نتیجے کے اعتبار سے زمین کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک پاکیزہ (زرخیز) زمین جس میں نشونما کی صلاحیت ہے اس میں تو ہر طرح کے پھول اور پھل پیدا ہوتے ہیں اور فائدے حاصل ہوتے ہیں، دوسری وہ سخت (سیم وتھور والی) زمین جس میں پیداوار کی صلاحیت نہیں ہوتی اس میں اوّل تو کچھ پیدا ہی نہیں ہوتا، پھر اگر کچھ ہوا بھی تو وہ بہت کم مقدار میں ہوتا ہے اور جتنا پیدا ہوتا ہے وہ بھی بیکار اور خراب ہوتا ہے، جیسے: جھاڑیاں اور جھاؤ وغیرہ۔

كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ: جس طرح بارش تمام مخلوق کیلئے برستی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ہدایت بھی تمام لوگوں کیلئے ہے مگر جس طرح ہر زمین بارش سے فائدہ نہیں اٹھاتی اسی طرح ہر انسان ہدایت سے فائدہ حاصل نہیں کرتا بلکہ فائدہ صرف وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو شکر گزار ہیں۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے جو کہ اس آیت کی تفسیر میں کہے جاسکتے ہیں:

باراں کے در لطافت طبعش کلام نیست　　در باغ لالہ روید ودر شور بوم خست

ترجمہ: بارش کے پاکیزہ ہونے میں تو کوئی کلام نہیں، یہی بارش جب باغ پر برستی ہے تو پھول پیدا ہوتے ہیں اور جب شوریلی زمین پر یہ بارش برستی ہے تو وہاں پر جھاڑیاں اور کانٹے اُگتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا

البتہ تحقیق بھیجا ہم نے نوح کو طرف قوم اس کی پس کہا اس نے اے قوم میری! بندگی کرو اللہ کی نہیں

لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾

لئے تمہارے سے کوئی معبود سوا اس کے بیشک میں ڈرتا ہوں میں پر تم عذاب سے ایک دن بڑے کے (۵۹)

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾

کہا معزز لوگوں نے میں سے قوم اس کی البتہ ہم یقیناً ہم دیکھتے ہیں تجھ کو میں گمراہی کھلی ہوئی (۶۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بیشک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، پس اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، مجھے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔(۵۹) ان کی قوم کے سردار بولے ہم یقیناً تجھ کو کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔(۶۰)

تفسیر

"سورۂ اعراف" کے شروع سے یہاں تک اسلام کے اصولِ توحید، پیغمبری، آخرت پر مختلف عنوان قائم کئے گئے تھے اور بہت سی دلیلیں پیش کی گئی تھیں اور لوگوں کو اس کی پیروی کی ترغیب اور اس کی مخالفت سے ڈرایا گیا تھا اور اس ضمن میں شیطان کے گمراہ کرنے والے مکروفریب وغیرہ کا بیان تھا، اب آٹھویں رکوع سے تقریباً آخر سورۃ تک کچھ پیغمبروں اور ان کی امتوں کا ذکر ہے جس میں تمام پیغمبروں کا متفقہ طور پر توحید، پیغمبری، آخرت کی طرف اپنی اپنی امتوں کو دعوت دینا اور ماننے والوں کے اجر وثواب اور نہ ماننے والوں پر طرح طرح کے

عذاب اور ان کے برے انجام کا تفصیلی بیان تقریباً چودہ رکوع میں آیا ہے، جس کے ضمن میں سینکڑوں اصولی اور ضمنی مسئلے بھی آ گئے ہیں اور موجودہ قوموں کو پچھلی قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا گیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے تسلی کا سامان ہوگیا کہ پہلے سب پیغمبروں کے ساتھ ایسے ہی معاملے ہوتے رہے ہیں، ان آیتوں میں "سورۂ اعراف" کا آٹھواں رکوع پورا ہوا ہے، اس میں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی امت کے حالات کا بیان ہے۔

پیغمبروں کے سلسلے میں سب سے پہلے پیغمبر اگر چہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں لیکن ان کے زمانہ میں کفر و گمراہی کا مقابلہ نہ تھا ان کی شریعت میں زیادہ تر حکم بھی زمین کی آبادکاری اور انسانی ضرورتوں کے متعلق تھے کفر اور کافر کہیں موجود نہ تھے، کفر و شرک کا مقابلہ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا اور پیغمبری و شریعت کی حیثیت سے دنیا میں وہ سب سے پہلے پیغمبر ہیں، اس کے علاوہ طوفان میں پوری دنیا غرق ہوجانے کے بعد جو لوگ باقی رہے وہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے کشتی میں سوار ہونے والے ساتھی تھے، ان ہی سے نئی دنیا آباد ہوئی؛ اسی لئے ان کو آدمِ ثانی کہا جاتا ہے۔

اس سورۃ میں حضرت نوح علیہ السلام کا، آپ کی قوم کا اور آپ کی تبلیغ کا ذکر ہے بعض دیگر سورتوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن، دس صدیاں، یا دس نسلیں گزری ہیں اور آپ دسویں نسل میں سے تھے، حضرت نوح علیہ السلام کے نام کے متعلق بھی مختلف روایتیں ملتی ہیں، بعض فرماتے ہیں کہ: آپ کا نام "سکن" تھا، یعنی: حضرت آدم علیہ السلام کے بعد لوگوں کو جس شخصیت کے پاس سکون میسر آیا تھا وہ حضرت نوح علیہ السلام تھے، بعض نے آپ کا نام "شاکر" یا "یشکر" بھی بتایا ہے، کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ شکر ادا کرنے والے تھے، "سورۃ بنی اسرائیل" میں آپ کے متعلق آتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بڑے شکر گزار بندے تھے، انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں مگر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

وحی کے اترنے کے وقت حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کے متعلق بہت سا اختلاف پایا جاتا ہے، بعض کہتے ہیں کہ آپ کی عمر اس وقت ۲۴۰ سال تھی، بعض روایتوں میں ۴۰۰ سال کا ذکر بھی آتا ہے مگر راجح بات یہ ہے کہ جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی اتاری اور آپ کو پیغمبری عطا ہوئی، قرآن کریم میں موجود ہے کہ آپ اپنی قوم میں ۹۵۰ سال ٹھہرے اور تبلیغ کرتے رہے، آپ نے پیغمبروں میں سب سے زیادہ عمر پائی، ایک روایت کے مطابق آپ کی عمر ۱۰۵۰ سال تھی، ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی ولادت حضرت آدم علیہ السلام کی وفات سے آٹھ سو چھبیس سال بعد ہوئی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی عمر کے متعلق ایک حدیث میں ہے کہ چالیس کم ایک ہزار سال ہے اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے حضرت نوح علیہ السلام کی وفات تک کل دو ہزار آٹھ سو چھپن سال ہو جاتے ہیں۔

ارشاد ہے کہ ایک زمانے تک حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو ان کی بیوی سمیت زمین پر بسنے کیلئے بھیج دیا گیا تھا، ان کی اولاد ٹھیک انہی کے بتائے ہوئے قاعدوں پر چلتی رہی لیکن ایک مدت کے بعد لوگ اس راستہ سے پھر گئے، تو ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کو اپنا پیغمبر بنا کر ان کے پاس بھیجا اور انہوں نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ: دیکھو! عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کرنی چاہئے اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اگر تم نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اوروں کو معبود بنایا تو مجھے خوف ہے کہ قیامت کے دن جو بڑا خوفناک دن ہے تم دکھ درد سے بھرا ہوا عذاب بھگتو گے یہ سن کر ان کے بڑے بڑے معزز اور مال دار لوگ بولے کہ اے نوح! ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) تیری عقل جاتی رہی ہے کیونکہ ہم گمراہی کی صاف صاف نشانیاں تیرے اندر پاتے ہیں، مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو بتا دیا تھا کہ ہمیں شیطان نے جنت سے نکلوا دیا ہے اور ہمارے لئے اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ اگر تم نے دنیا میں مجھے پہچان کر صرف میری عبادت کی اور کسی کو میرا شریک نہ ٹھہرایا تو مرنے کے بعد قیامت کے دن تمہارا حساب کر کے کامیاب لوگوں کو جنت میں پھر داخل کر دیا جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ دین کے دو ستون توحید اور آخرت کا یقین ہیں، حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد توحید پر بہت دن قائم رہی اور ان میں بڑے مرتبہ والے

لوگ پیدا ہوئے لوگ ان کے ایسے معتقد ہوئے کہ مرنے کے بعد ان کے بت بنا کر ان کی پوجا کرنے لگے تھے؛ اس لئے ان کو سمجھانے کیلئے حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔

لفظ "مَلَأُ" قوم کے سرداروں اور برادریوں کے چودھریوں کیلئے بولا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارے باپ دادوں کے دین سے ہم کو نکالنا چاہتے ہیں اور قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور جزاو سزا پانے کے خیالات یہ سب وہم ہیں۔

اس دل دکھانے والی اور جی ستانے والی گفتگو کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے پیغمبرانہ لہجہ میں جو جواب دیا وہ مبلغین اور مصلحین کیلئے ایک اہم ہدایت ہے کہ بھڑکانے والی بات پر بھڑکنے اور غصہ میں آنے کے بجائے سادہ لفظوں میں ان کے شبہات کو دور فرما رہے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کا جواب

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦١﴾

کہا اس نے اے قوم میری! نہیں مجھ میں گمراہی اور لیکن میں بھیجا ہوا ہوں طرف سے رب کی تمام جہان کے (٦١)

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ

پہنچاتا ہوں میں تم کو پیغامات رب اپنے کے اور نصیحت کرتا ہوں میں تم کو اور جانتا ہوں میں طرف سے اللہ کی

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾

جو نہیں جانتے تم (٦٢)

بامحاورہ ترجمہ: ۔ کہا اے میری قوم! میں ہرگز نہیں بہکا لیکن میں جہان کے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں۔ (٦١) تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور اللہ کی طرف سے تم کو نصیحت کرتا ہوں اور میں وہ باتیں

جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔(۶۲)

تفسیر

ارشاد ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ان سے کہا: نہ میری عقل میں فتور ہے اور نہ میں سیدھے راستے سے بھٹکا ہوا ہوں، بات اتنی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہوں وہی تمہارا بھی رب ہے اور وہی میرا بھی، میں اپنے رب کے پیغام تمہیں پہنچاتا ہوں اور تمہارا خیر خواہ ہوں دل سے چاہتا ہوں کہ تمہاری حالت درست ہو اور تم تباہی اور بربادی سے بچ جاؤ، مجھے اللہ تعالیٰ نے ایسی باتیں بتادی ہیں جن سے تم ناواقف ہو۔

حضرت نوح علیہ السلام کے جواب سے چند بڑی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱)....اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ایسی باتیں بتاتا ہے جو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں، ان میں سے بہت سی باتیں انہیں اپنی موجودہ مصلحتوں کے خلاف معلوم ہوتی ہیں ل؛ اس لئے وہ پیغمبروں کے بارے میں فیصلہ کردیتے ہیں کہ وہ سیدھی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔

(۲).... پیغمبر کی بتائی ہوئی باتیں سمجھنے کیلئے گو اکثر لوگوں کی سمجھ کافی نہیں ہوتی لیکن ہر شخص غور کرکے خود ان کی ذات میں کچھ ایسی خوبیاں دیکھ سکتا ہے جو اس بات کے یقین دلانے کیلئے کافی ہوتی ہیں کہ ایسا شخص کبھی جھوٹا اور فریبی نہیں ہوسکتا، پیغمبر کا عمل اور برتاؤ ایسا ہوتا ہے کہ جس سے ہر شخص بشرطیکہ انصاف سے کام لے اس کے سچے ہونے کا یقین کرسکتا ہے۔

(۳).... پیغمبر کی پہچان چند باتوں سے ہوتی ہے:

پہلی بات یہ ہے کہ: وہ کہتا ہیں کہ میں رب العالمین کا بھیجا ہوا ہوں جو سب کا پالنے والا ہے؛ اس لئے اس کے اخلاق سب سے بلند ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ: وہ لوگوں سے ایسی باتیں کہتا ہے جو سب کے فائدے کی ہوتی ہیں اس میں خود

غرضی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا، چنانچہ وہ لوگوں سے اپنے لئے کچھ نہیں مانگتا اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ: اس کی تعلیم میں انسانی ہمدردی اور خیر خواہی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ: وہ کسی انسان کا شاگرد نہیں ہوتا اس کو خود اللہ تعالیٰ ایسی باتیں سکھا دیتے ہیں جو دوسروں کو معلوم نہیں ہوتیں جس میں یہ باتیں ہوں اس کی ہدایت پر یقین کرنا چاہئے اور اس کے بتائے ہوئے حکموں پر عمل کرنا چاہئے۔

پیغمبر بھی انسان ہیں

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ

اور کیا تعجب ہوا تم کو اس سے کہ آیا پاس تمہارے پیغام طرف سے رب تمہارے کی پر ایک مرد میں سے تم ہی

لِيُنْذِرَكُمْ وَ لِتَتَّقُوْا وَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾

تا کہ وہ ڈرائے تم کو اور تا کہ تم بچو اور توقع ہو کہ تم پر رحم کیا جائے (۶۳)

بامحاورہ ترجمہ: کیا تم کو تعجب ہوا کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تا کہ وہ تم کو ڈرائے اور تا کہ تم (کفر و شرک سے) بچو اور تا کہ تم پر رحم ہو۔ (۶۳)

تفسیر

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت پر کافروں نے اپنا شبہ ظاہر کیا، یہاں اس کا جواب ہے جو کہ "سورۂ مؤمنون" میں صراحت کے ساتھ ذکر ہے: "مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً"، یعنی: ان کی قوم نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت پر ایک شبہ یہ بھی کیا کہ یہ تو ہماری ہی طرح ایک انسان ہیں ہماری ہی طرح کھاتے، پیتے، سوتے، جاگتے ہیں ان کو ہم کیسے اپنا پیشوا مان لیں، اگر اللہ تعالیٰ کو ہمارے لئے کوئی پیغام بھیجنا تھا تو وہ فرشتوں کو بھیجتے جن کا امتیاز اور بڑائی ہم سب پر واضح ہوتی اب تو

اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ ہماری قوم اور نسل کا ایک آدمی ہم پر اپنی بڑائی قائم کرنا چاہتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انسان کو پیغمبر بنایا جائے، اوّل تو اللہ تعالیٰ قادر ہیں جس کو چاہیں اپنی پیغمبری عطا فرمائیں، اس میں کسی کو چوں چرا کی مجال نہیں، اس کے علاوہ اصل معاملہ پر غور کرو تو واضح ہوجاتا ہے کہ عام انسانوں کی طرف پیغمبری کا مقصد انسان ہی کے ذریعہ پورا ہوسکتا ہے فرشتوں سے یہ کام نہیں ہوسکتا، کیونکہ پیغمبر بنا کر بھیجنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت اور عبادت پر لوگوں کو قائم کر دیا جائے اور اس کے حکموں کی مخالفت سے بچایا جائے اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ان کا کوئی ہم جنس، یعنی: انسان عملی نمونہ بن کر ان کو دکھائے کہ انسانی ضرورتوں اور خواہشوں کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کے حکموں کی اطاعت ہوسکتی ہے اگر فرشتے یہ دعوت لے کر آتے اور اپنی مثال لوگوں کے سامنے رکھتے تو سب لوگوں کا یہ عذر ظاہر تھا کہ فرشتے تو انسانی ضرورتوں اور خواہشوں سے پاک ہیں نہ ان کو بھوک لگتی ہے، نہ نیند آتی ہے، نہ تکان ہوتی ہے ان کی طرح ہم کیسے بن جائیں لیکن جب اپنا ہی ایک ہم جنس انسان تمام انسانی خواہشات اور خصوصیات رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ان حکموں کی اطاعت کر کے دکھائے تو ان کیلئے کوئی عذر نہیں رہ سکتا۔

لِيُنْذِرَكُمْ وَ لِتَتَّقُوْا: مطلب یہ ہے کہ جس کے ڈرانے سے متاثر ہو کر لوگ ڈر جائیں وہ وہی ہوسکتا ہے جو ان کا ہم جنس اور ان کی طرح انسانی خصوصیات رکھتا ہو یہ شبہ اکثر امتوں کے کافروں نے پیش کیا کہ کوئی انسان نبی اور رسول نہیں ہونا چاہئے اور قرآن کریم نے سب کا یہی جواب دیا ہے۔

جھٹلانے والوں کا انجام

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ

پس جھٹلایا انہوں نے اسکو پس بچالیا ہم نے انکو اور جو تھے ساتھ اسکے میں کشتی اور ڈبو دیا ہم نے ان کو جو

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ ع ۸ ۶ ۱۵

جھٹلاتے تھے آیتوں ہماری کو بیشک وہ تھے لوگ (عقل کے) اندھے (۶۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر انہوں نے اس (حضرت نوح علیہ السلام) کو جھٹلایا، پھر ہم نے اس کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں سوار کر کے بچالیا اور ان کو غرق کر دیا جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے بیشک وہ لوگ (عقل کے) اندھے تھے۔(۶۴)

تفسیر

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے دل دکھانے والے کلام کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کا یہ مہربانی اور شفقت سے بھرپور رویہ بھی ان کی بے حس قوم پر اثر انداز نہ ہوا، بلکہ اندھے بن کر جھٹلانے ہی میں لگے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفان کا عذاب بھیج دیا، یعنی: حضرت نوح علیہ السلام کی ظالم قوم نے ان کی نصیحت وخیر خواہی کی کوئی پرواہ نہ کی اور برابر جھٹلاتے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں سوار کر کے طوفان سے نجات دے دی اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو غرق کر دیا بیشک یہ لوگ اندھے ہو رہے تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ اور ان کی قوم کا غرق ہونا اور کشتی والوں کی نجات کی پوری تفصیل "سوۂ نوح" اور "سورۂ ہود" میں آئے گی اس جگہ اس کا خلاصہ بیان ہوا ہے حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر طوفان کا عذاب اس وقت آیا جب کہ وہ اپنی بہتات وقوت کے اعتبار سے بھرپور تھے، عراق کی زمین اور اس کے پہاڑ ان کی بہتات کی وجہ سے بھر گئے تھے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا یہی دستور رہا ہے کہ نافرمان لوگوں کو ڈھیل دیتے رہتے ہیں عذاب اس وقت بھیجتے ہیں جب وہ اپنی بہتات، قوت اور دولت میں انتہا کو پہنچ جائیں اور اس میں بدمست ہو جائیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں کتنے آدمی تھے اس میں مختلف روایتیں ہیں، ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث نقل کی ہے کہ یہ اسّی (۸۰) آدمی تھے جن میں ایک کا نام "جرہم" تھا یہ عربی زبان بولتا تھا، بعض روایتوں میں یہ تفصیل بھی آئی ہے کہ اسّی (۸۰) میں سے چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں طوفان کے بعد یہ سب حضرات موصل میں جس جگہ ٹھہرے اس بستی کا نام "ثمانون" مشہور ہوگیا۔

غرض اس جگہ حضرت نوح علیہ السلام کا مختصر قصہ بیان فرما کر ایک تو یہ بتلا دیا کہ تمام پیغمبروں کی دعوت اور اصولی عقیدے ایک ہی تھے، دوسرے یہ بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کی تائید و حمایت کس طرح حیرت انگیز طریقہ پر کرتے ہیں کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ جانے والے طوفان میں بھی ان کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا، تیسرے یہ واضح کر دیا کہ پیغمبروں کو جھٹلانا اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہے جس طرح پچھلی امتیں عذاب میں گرفتار ہوگئیں؛ آج کے لوگوں کو بھی اس سے بے خوف نہیں ہونا چاہئے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر اور قرآن مجید آخری کتاب ہے، ان کے ذریعے ہمیں قیامت تک کیلئے بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق عمل کرنے سے ایسی مصیبتوں سے جو زمین پر آتی رہتی ہیں محفوظ رہو گے اور اگر اس کو چھوڑ دیا تو پھر دل کی پریشانی، ڈر، خوف، بے اطمینانی ان کو اور بھی بھیانک بنا دیں گی، اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی کسی کو اپنی تدبیر سے نہیں بچا سکتا۔

حضرت ہود علیہ السلام

وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

اور طرف عاد کے بھائی ان کے ہود کو کہا اس نے اے قوم میری! بندگی کرو اللہ کی نہیں لئے تمہارے

مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ

کوئی معبود سوا اس کے کیا پس نہیں ڈرتے تم (۶۵) کہا سرداروں نے جو کافر تھے میں سے

قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ۝۶۶

قوم اس کی تحقیق ہم البتہ دیکھتے ہیں تجھ کو میں بے وقوفی اور ہم البتہ گمان کرتے ہیں تجھ کو میں سے جھوٹوں (۶۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا، کہا اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، سو کیا تم ڈرتے نہیں۔(۶۵) اس کی قوم کے ان سرداروں نے کہا جو کہ کافر تھے ہم دیکھتے ہیں تجھ کو بیوقوفی میں اور ہم تجھ کو جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔(۶۶)

تفسیر

عَادٍ: یہ ایک بڑی زبردست طاقتور قوم کا نام ہے یہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے "ارم" کی اولاد تھے، اور یمن کے اندر "احقاف" کے علاقہ میں رہتے تھے۔

"عاد" اصل میں ایک شخص کا نام ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی پانچویں نسل اور ان کے بیٹے "سام" کی اولاد میں ہے، پھر اس شخص کی اولاد اور پوری قوم عاد کے نام سے مشہور ہوگئی، قرآن کریم میں "عاد" کے ساتھ کہیں لفظ "عاد اولیٰ" اور کہیں "اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ" بھی آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "عاد کی قوم" کو "ارم" بھی کہا جاتا ہے اور "عاد اولیٰ" کے مقابلہ میں کوئی "عاد ثانیہ" بھی ہے اس کی تحقیق میں مفسرین اور مورخین کے اقوال مختلف ہیں، زیادہ مشہور یہ ہے کہ "عاد" کے دادا کا نام "ارم" ہے اس کے ایک بیٹے، یعنی: "عوص" کی اولاد میں "عاد" ہے یہ "عاد اولیٰ" کہلاتا ہے اور دوسرے بیٹے "جثو" کا بیٹا "ثمود" ہے یہ "عاد ثانی" کہلاتا ہے اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ "عاد" اور "ثمود" دونوں "ارم" کی دو شاخیں ہیں، ایک شاخ کو "عاد اولیٰ" اور دوسری کو "ثمود یا عاد ثانیہ" بھی کہا جاتا ہے اور لفظ "ارم" عاد و ثمود دونوں کیلئے مشترک ہے، اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ "قوم عاد" پر جس وقت عذاب آیا تو ان کا ایک وفد مکہ معظّمہ گیا ہوا تھا وہ عذاب سے محفوظ رہا اس کو "عاد اخریٰ" کہتے ہیں۔

"قوم عاد" کے تیرہ خاندان تھے، عمان سے لے کر حضر موت اور یمن تک ان کی بستیاں تھیں ان کی زمینیں

بڑی سرسبز و شاداب تھیں ہر قسم کے باغات تھے رہنے کیلئے بڑے بڑے شاندار محلات بناتے تھے، اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری ہی نعمتوں کے دروازے ان پر کھول دیئے تھے مگر ان کی ٹیڑھی عقل نے انہی نعمتوں کو ان کیلئے وبالِ جان بنا دیا وہ اپنی قوت و شوکت کے نشہ میں بدمست ہو کر شیخیاں مارنے لگے۔

ھُوْدٌ: یہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور "ارم" کی اولاد سے ہیں؛ اس لئے یہ "عاد" کے نسبی بھائی ہیں۔

"عاد" بڑے فسادی لوگ تھے یہ بڑے اونچے قد کے اور طاقتور لوگ تھے اور کمزوروں پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے ان سے بڑی محنتیں لیتے تھے اور ان سے غلاموں کا سا سلوک کرتے تھے اور ان کو جانوروں کی طرح سمجھتے تھے حضرت ہود علیہ السلام نے ان کو سمجھایا کہ اپنی طاقت پر اس قدر اترانا فضول ہے، اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ طاقتور ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، ان لوگوں میں بتوں کی پوجا رواج پا گئی تھی اور ہر کام کا ایک الگ دیوتا تھا کوئی دولت کا، کوئی قوت کا، کوئی عزت کا، کوئی خوشی کا، کوئی شفا کا، کوئی تندرستی وغیرہ کا، حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں سمجھایا کہ جو کچھ تمہیں ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے؛ اس لئے اسی کی عبادت کرو اور کمزوروں کو اپنی طرح کا انسان سمجھو، ان کو کسی طرح نہ ستاؤ مگر انہیں اپنی دولت اور بدنی طاقت پر غرور تھا انہوں نے ان کی بات نہ مانی، ارشاد ہے کہ ہم نے "عاد" کو سمجھانے اور سیدھے راستے پر لانے کیلئے ہود کو اپنا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا اس نے ان لوگوں سے کہا کہ تم بت پرستی سے باز آؤ، تمہارے پاس دولت، قوت، صحت، عزت جو کچھ ہے یہ سب ایک اللہ کی عطا ہے اس کے سوا کوئی کچھ دینے والا نہیں ہے یہ جو تم نے دیوتا بنا رکھے ہیں انہیں نہ اختیار ہے نہ قدرت، بے جان چیزوں کے بڑے بڑے نام رکھ لینے سے کچھ نہیں ہوتا، سوا اللہ کے تمہارا کوئی معبود نہیں؛ اس لئے اسی کی عبادت کرو، اسی کے آگے جھکو اسی سے مانگو اور اسی کا شکر ادا کرو کیا تم بری باتوں سے بچنا نہیں چاہتے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہو اس کے غضب سے نہیں ڈرتے اس پر عاد کی قوم کے اونچے طبقے کے لوگوں نے جن کی وجہ سے بت پرستی کا رواج قائم تھا جواب دیا کہ اے ہود! تو تو بالکل عقل سے خالی معلوم ہوتا ہے جمے جمائے رسم و رواج کو مٹانا اور ایک انوکھا طریقہ قائم کرنا چاہتا ہے یہ بات جو تو پیش کر رہا ہے بالکل جھوٹی نظر آ رہی ہے۔

قوم نے توحید کی دعوت قبول کرنے کے بجائے الٹا اپنے پیغمبر پر بیوقوفی کا الزام لگا دیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر پوری امت میں سب سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بڑی فوقیت دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا پیغمبر کمال درجے کا ذہین عقلمند اور کمال درجے کی صلاحیت والا ہوتا ہے مگر قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تو تجھے بیوقوف جانتے ہیں (العیاذ باللہ) تم بہکی بہکی باتیں کرتے ہو تم ہمیں آباؤ اجداد کی رسموں سے ہٹانا چاہتے ہو، تم ہمیں اپنے بڑوں کی بت پرستی سے روکنا چاہتے ہو جیسا کہ آگے آ رہا ہے کہ قوم نے کہا کہ اے ہود! کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم ایک خدا کی پوجا کریں اور جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں کیا انہیں چھوڑ دیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا آپ کا نام "عابر" بھی بیان کیا جاتا ہے آپ "سام" کے بیٹے "ارم" کی چھٹی پشت میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام "عبداللہ یا شالخ" تھا، آپ کی والدہ بھی "عاد کی قوم" ہی سے تھیں جن کا نام "مقمعہ" تھا، علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ کی کتاب "حسن المحاضرة فی أحوال المصر و القاهرة" میں لکھا ہے کہ نوح علیہ السلام کے طوفان کے 2600 سال بعد یا مصر بن بیصر کی حکومت میں حضرت ہود علیہ السلام کی ولادت ہوئی، آپ 460 یا 480 سال تک زندہ رہے اور قوم میں تبلیغ کرتے رہے قوم نے انکار کیا اور سرکشی اختیار کی جس کی وجہ سے اُن پر عذاب اترا، دوسری سورتوں میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیز ہوا بھیج کر ساری قوم کو ہلاک کر دیا۔

دوسری بات جو قوم نے اپنے پیغمبر سے کہی تھی وہ یہ تھی کہ ہم تو تجھے جھوٹا خیال کرتے ہیں تم جھوٹ بولتے ہو کہ خدا نے تم پر وحی اتاری، اس قسم کی بیہودہ گفتگو پچھلی سورۃ میں بھی گزر چکی ہے، یعنی: خدا تعالیٰ نے کسی انسان پر کوئی چیز اتاری ہی نہیں، اپنی چودھراہٹ جماتے کیلئے وحی کے اترنے کا دعویٰ کرتا ہے، ہر پیغمبر کے ساتھ یہی سلوک ہوتا رہا ہے، چنانچہ فرعون، ہامان، اور قارون تینوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا کہ تم جادوگر ہو اور جھوٹے بھی ہو، ابو جہل اور اس کے گروہ نے بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایمان والوں سے کہا کہ تم تو ایک جادو کے مارے کی پیروی کر رہے ہو، بہرحال عاد کی قوم نے بھی حضرت ہود علیہ السلام کو بے وقوف اور جھوٹا کہا۔ (نعوذ باللہ)

حضرت ہود علیہ السلام کا جواب

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾
کہا اے قوم میری! نہیں مجھ میں بے عقلی اور لیکن میں بھیجا ہوا ہوں طرف سے پروردگار کی تمام جہان کے (۶۷)

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَ عَجِبْتُمْ
پہنچاتا ہوں میں تم کو پیغامات رب اپنے کے اور میں لئے تمہارے خیر خواہ ہوں اعتماد کے لائق (۶۸) کیا عجب جانا تم نے

اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ
کہ آیا تمہارے پاس ذکر طرف سے رب تمہارے کی اوپر ایک آدمی کے میں سے تم ہی تا کہ ڈرائے تم کو

بامحاورہ ترجمہ:۔ کہا اے میری قوم! میں کچھ بے عقل نہیں لیکن میں تمام جہان کے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں۔ (۶۷) میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہارا خیر خواہ ہوں اور اعتماد کے لائق ہوں۔ (۶۸) کیا تم کو تعجب ہوا کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے تھا تا کہ تم کو ڈرائے۔

تفسیر

"عادؑ" کی قوم نے حضرت ہود علیہ السلام پر دو الزام لگائے، ایک تو یہ کہ جو تم کہتے ہو یہ کوئی عقل کی بات نہیں ان کے نزدیک یہ بات عقل کے خلاف تھی کہ جو رسم ورواج قائم ہو چکے ہیں اس کے خلاف کوئی بات پیش کی جائے، دوسرے یہ کہ اگر کوئی سب سے الگ ہو تو ایسی بات تو کہے جس کو سچ ماننا آسان ہو ورنہ صرف دعویٰ بغیر دلیل کے تو جھوٹا سمجھا جانے کے قابل ہے، ان الزاموں کا جواب حضرت ہود علیہ السلام دیتے ہیں، ارشاد ہے کہ: حضرت ہود علیہ السلام نے کہا کہ تم جو مجھے اس بنا پر کہ میں سب سے انوکھی بات کہتا ہوں بیوقوف ٹھہراتے ہو تو میں یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ میں ان تمام جہانوں کے پالنے والے کا پیغام تمہارے پاس لایا ہوں جو اس نے تم تک پہنچانے

کیلئے مجھے دیا ہے وہ تمہیں پہنچا تا ہوں یہ بیوقوفی تو جب ہوتی جب میں اپنی طرف سے کسی اپنی غرض کیلئے نئی بات گھڑ کر کہتا اور تم جو اس دعویٰ میں مجھے جھوٹا سمجھتے ہو تو یہ بھی غلط ہے؛ اس لئے کہ میں ہمیشہ تمہارا خیر خواہ رہا ہوں اور اب بھی وہی بات کہتا ہوں جس میں مجھے تمہارا بھلا نظر آتا ہے، پھر یہ بھی کہا ہے کہ میں نے کبھی دھوکا نہیں دیا کبھی تمہارے ساتھ بے وفائی، دغا یا خیانت نہیں کی، تمہارا اعتماد ہمیشہ مجھ پر قائم رہا، تم جانتے ہو کہ میں تمہیں دھوکا دے کر اپنا کام نکالنے والا نہیں ہوں، پھر تمہیں اس بارے میں مجھ پر شبہ کیوں ہوتا ہے کہ میں تمہیں جھوٹ بول کر دھوکا دے رہا ہوں، کیا تمہیں تعجب ہوتا ہے کہ تمہارا رب تم ہی میں سے ایک آدمی کو منتخب کر کے اس کے ذریعے تمہیں تمہاری بھولی ہوئی باتیں یاد دلائے اور اس کے حکم کو پورا کر کے تمہیں ڈرائے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کی تیاری کرلو ورنہ غافل لوگوں کیلئے عذاب آنے کے بعد کوئی حفاظت کی جگہ نہیں ہے اور نہ انہیں کوئی بچا سکتا ہے، بچتے صرف وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ہدایتوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں حضرت ہود علیہ السلام کی قوم نے ان سے تقریباً وہی کہا جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا تھا اور حضرت ہود علیہ السلام کے جواب بھی قریب قریب وہی ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام کے تھے۔

وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ: میں تمہارا خیر خواہ اور امانتدار ہوں، انسانیت کا ہر فرد خواہ پیغمبر ہو یا پیر و مرشد، وہ لوگوں کی خیر خواہی کی بات کرتا ہے تا کہ وہ برائی سے بچ جائیں اور بالآخر جہنم سے چھٹکارا پا جائیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص آگ جلائے اور اس پر پروانے پتنگے اکٹھے ہو جائیں، پھر وہ کوشش کرتا ہے کسی طرح یہ کیڑے مکوڑے آگ میں جلنے سے بچ جائیں وہ انہیں آگ کے قریب آنے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ ادھر جانے سے باز نہیں آتے اور آگ میں جل کر مرتے ہیں اسی طرح میں بھی تمہیں تمہاری کمروں سے پکڑ پکڑ کر آگ سے پیچھے ہٹاتا ہوں مگر تم ہو کہ اس میں زبردستی گرے جا رہے ہو۔ اللہ کے بندو! اس غلط راستے پر نہ جاؤ آگے دوزخ ہے مگر تم میری بات نہیں مانتے اور دوزخ میں جانے کی کوشش کرتے ہو، ہر نیک انسان نے لوگوں کو دوزخ سے بچانے کی کوشش کی ہے مگر اکثریت ہمیشہ غلط راستے پر ہی چلی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے سبق

وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ

اور یاد کرو جب کردیا تم کو جانشین سے پیچھے قوم کے نوح کی اور بڑھادیا تم کو

فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

میں بناوٹ فراخی کے اندر پس یاد کرو نعمتیں اللہ کی تاکہ تم فلاح پاؤ (۶۹)

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ

کہنے لگے کیا تو آیا پاس ہمارے اسلئے کہ ہم پوجیں اللہ کو صرف اور چھوڑ دیں جو تھے پوجتے

اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾

باپ دادا ہمارے پس لے آ تو وہ چیز جس کی دھمکی دیتا ہے تو ہمیں اگر ہے تو میں سے سچے آدمیوں (۷۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یاد کرو جب کہ تم کو نوح کے بعد جانشین کر دیا اور تمہارے بدن لمبے چوڑے اور موٹے تازے بنا دیئے، سو یاد کرو اللہ کے احسان کو تا کہ تمہارا بھلا ہو۔ (۶۹) بولے کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے تا کہ ہم ایک اکیلے اللہ کی بندگی کریں اور چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے رہے، پس تو لے آ ہمارے پاس جس چیز سے تو ہم کو ڈراتا ہے اگر تو سچا ہے۔ (۷۰)

تفسیر

اس آیت میں حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے پہچاننے کا اور اس کی فرمانبرداری کرنے کا ایک آسان طریقہ بتاتے ہیں اور حقیقت میں اس جواب میں ہر زمانے کے انسانوں کیلئے توحید کی طرف رہنمائی ہے اور اس کو قرآن کریم نے ہمیشہ کیلئے دنیا میں حضرت ہود علیہ السلام کے ذکر کے ضمن میں قائم کر دیا ہے۔

ارشاد ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا یہ بات یاد کرو کہ تم سے پہلے دنیا میں حضرت نوح علیہ السلام کی

قوم سب سے زبردست تھی آج اس کی جگہ تم کو انہی کی سی عزت اور قوت دے کر زمین کا حاکم مقرر کیا ہے بلکہ تمہارا قدو کاٹھ بڑا کر دیا اور دماغی اور بدنی قوت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر بنایا ہے، سوچو کہ یہ نعمتیں اور فضیلتیں جو تم کو عطا ہوئی ہیں یہ کس نے دی ہیں اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے دی ہیں اور اس بات کے اقرار کرنے میں ہی انسان کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے قوم نے یہ سن کر کہا اے ہود! کیا تم ہمارے پاس یہی کہنے کیلئے آئے ہو کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ کو صرف ایک اللہ کی پوجا کریں یہ تو ہم سے نہیں ہوگا جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو اگر تم سچے ہو تو جاؤ اس کو ہمارے سر پر لے آؤ ہم تو تیری بات نہیں مانتے جو تیرا جی چاہے وہ کر۔

حضرت ہود علیہ السلام کا آخری جواب

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ

کہا تحقیق واقع ہو چکا ہے پر تم طرف سے رب تمہارے کی عذاب اور غضب کیا جھگڑتے ہو تم مجھ سے

فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ

میں ان ناموں کہ رکھ لیا ہے تم نے ان کو تم نے اور باپ دادوں نے تمہارے نہیں اتاری اللہ نے ان کی سے

سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾

کوئی دلیل پس انتظار کرو میں بھی ساتھ تمہارے ہوں میں سے انتظار کرنے والوں (۷۱)

بامحاورہ ترجمہ:- کہا بیشک تم پر تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غصہ واقع ہو چکا ہے مجھ سے ان ناموں پر جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے کیوں جھگڑتے ہو؟ ان کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری سو منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ (۷۱)

تفسیر

ارشاد ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا: عنقریب دنیا میں سخت آندھی کا طوفان آنے والا ہے تمہارے

انکار کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اس آفت میں پھنس کر رہو گے میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ تمہاری کفر و دشمنی اس بات کی نشانی ہے کہ تمہارا رب اس عذاب اور غضب میں تم کو پھنسانے اور غارت کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے، بھلا اس نادانی کا کوئی ٹھکانہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے ایک بت گھڑلیا اور کہہ دیا کہ یہ ہمارا رزق، تندرستی، مال اور عزت وغیرہ دینے والا دیوتا ہے کیا تمہارے بڑوں کے تمہارے نام رکھ دینے سے یہ بت واقعی ایسی ہی ہو جائیں گی جیسا تم کہتے ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کی کوئی دلیل تمہیں دی ہے؟ پھر کیوں ان کے نام مقرر کر کے انہیں اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں لاتے ہو اور ان کی پوجا پاٹ کرتے ہو اور میں جو تمہیں اس حماقت سے روکتا ہوں تو مجھ سے ان کی حمایت میں جھگڑتے ہو، بھلا! کہاں وہ زبردست قدرت والا اور کہاں یہ مٹی کے کھلونے اتنی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی اور عذاب بھگتنے کیلئے تیار ہو گئے ہو اگر یہی کرتوت رہے تو عذاب آ کر رہے گا اس کا انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں مگر مجھے میرا رب اس سے بچالے گا۔

مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ: اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں کوئی دلیل نہیں اتاری کہ جن کاموں کو ان کے ساتھ منسوب کرتے ہو وہ کام واقعتاً کر بھی سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اولاد، شفا، روزی، عروج و زوال اور مدد یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہیں ان میں سے کوئی بھی صفت جھوٹے خداؤں میں نہیں پائی جاتی یہ بالکل بے اختیار ہیں بلکہ بعض ان میں سے بے جان ہیں، لہٰذا یہ تمہارے کچھ کام نہیں آسکتے تمہیں کوئی نفع نقصان نہیں پہنچا سکتے حتیٰ کہ فرشتے بھی خدا تعالیٰ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کرتے یہ تو تم نے صرف نام رکھ دیئے ہیں جن میں حقیقت کچھ بھی نہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔

لہٰذا تم بھی فیصلے کا انتظار کرو اور تمہارے ساتھ میں بھی اسی انتظار میں ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں کیا فیصلہ کرتا ہے؟ حضرت ہود علیہ السلام قوم کو خدا کا پیغام سناتے رہے اتنا لمبا عرصہ تبلیغ کا حق ادا کرنے کے باوجود جب قوم سرکشی سے باز نہ آئی تو پھر ان کیلئے فیصلے کا وقت آن پہنچا، اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر تین سال تک قحط مسلط کر دیا، وادی داہنا میں عمان سے حضر موت تک گرم ترین علاقے میں بارش کا قطرہ نہ برسا جس کی وجہ سے ہود کی

قوم نے سخت تکلیف اٹھائی مگر پھر بھی اپنے پیغمبر کی بات ماننے پر تیار نہ ہوئے اس کے بعد ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اترا، آسمان سے آگ برسی اور آٹھ دن اور سات رات تک مسلسل آندھی چلی جس سے پوری قوم تہس نہس ہوگئی، جب عاد کی قوم سخت قحط میں مبتلا ہوگئی تو انہوں نے اپنے ایک سردار قیل کی رہبری میں ایک وفد مکہ مکرمہ کی طرف روانہ کیا جو وہاں جا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کیلئے دعا کرے پیچھے ان لوگوں پر عذاب آ گیا۔

نافرمان تباہ ہوگئے

فَاَنْجَیْنٰهُ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ

پس نجات دی ہم نے اسکو اور جو تھے ساتھ اسکے ساتھ رحمت کے طرف سے اپنی اور کاٹ دی ہم نے جڑ ان کی

كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ مَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ۠﴿۷۲﴾ ع ۹/۸ ۱۶

جنہوں نے جھٹلایا آیتوں ہماری کو اور نہ تھے وہ ایمان والے (۷۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے بچالیا اور جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور نہیں مانتے تھے ان کی جڑ کاٹی۔ (۷۲)

تفسیر

ارشاد ہے کہ جب قوم نے اپنے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کا کہنا نہ مانا تو مقررہ وقت پر جو عذاب آنا تھا وہ آیا، حضرت ہود علیہ السلام اور جنہوں نے اس کا کہنا مانا تھا بچ گئے باقی سب فنا ہوگئے ہم نے اپنی رحمت سے حضرت ہود علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کو اس آفت سے محفوظ رکھا اور جو ہماری نشانیوں کو دیکھ کر ان کا یقین نہ کرتے تھے ہمیں اپنا واحد معبود نہ مانتے تھے اور شرک میں مبتلا تھے ان کو جڑ سے کھود کر پھینک دیا۔

دنیا میں کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے کوئی معمولی ہوتی ہے کوئی زبردست آندھی، طوفان، زلزلے وغیرہ معمولی حادثے ہیں، انسان اگر ان سے بچنے کا سامان وقت سے پہلے نہ کرے تو بالکل بے جان چیزوں کی

طرح ان کی لپیٹ میں آ کر نیست و نابود ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آفتوں سے محفوظ رہنے کیلئے انسان کو عملی تدبیریں اختیار کرنی لازم ہیں، پیغمبر کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ انسان کے دل کو مضبوط کریں تا کہ وہ مصیبت کے وقت گھبرا نہ جائے، وہ بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کی رحمت پر پورا بھروسہ کرنا اصل چیز ہے۔

جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اعتماد نہیں رکھتا اور ایمان و یقین سے محروم ہے اور اس کے بجائے اپنی قوت اور اپنے لوگوں، ساتھیوں، عمارتوں، قلعوں، ہتھیاروں وغیرہ ظاہری ساز و سامان پر بھروسہ کرتا ہے اور پیغمبروں کے سمجھانے اور ان کی ہدایتوں پر نہیں چلتا وہ نہ دنیا کی زبردست آفتوں سے بچ سکتا ہے اور نہ مرنے کے بعد سکون پا سکتا ہے، یہاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اپنے غلط کام جو پیغمبروں کی ہدایت کے مطابق نہیں ہوتے اس کو آفتوں کا شکار بنا دیتے ہیں اور چونکہ وہ ایمان نہ ہونے کی وجہ سے دلی اطمینان سے خالی ہوتا ہے؛ اس لئے اسے آخرت کا چین بھی نصیب نہیں ہوگا، پہلی قوموں کے حالات جو قرآن کریم ہمارے سامنے بیان کرتا ہے اس سے ہمیں یہی سبق سکھانا مقصود ہے کہ انسان دنیا کی آفتوں اور آخرت کے عذاب سے تبھی بچ سکتا ہے جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر چلے اور اس کے سوا اور کوئی صورت بچنے کی نہیں۔

حضرت ہود علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کو حکم ہوا کہ اس قوم سے الگ ہو جائیں کہتے ہیں کہ جانوروں کا کوئی باڑہ تھا، اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اور اس کے ساتھی جو چار یا چھ ہزار کی تعداد میں تھے اس باڑے میں چلے گئے خدا کی حکمت کہ اس باڑے میں تیز آندھی اثر نہیں کرتی تھی، لہٰذا ایمان والوں کا گروہ آٹھ روز تک وہیں رکا رہا اور ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا، قوم کی تباہی کے بعد حضرت ہود علیہ السلام مکہ مکرمہ پہنچے اور کچھ عرصہ وہیں مقدس مقام پر عبادت کرتے رہے اور پھر اپنے پیروکاروں کو لے کر حضر موت کے علاقے میں چلے گئے، آپ کی وفات کے متعلق دو روایتیں ملتی ہیں ایک یہ کہ آپ مکہ میں ہی فوت ہو گئے اور وہیں حرم شریف میں حجر کے مقام پر دفن ہوئے جہاں پر حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور بعض دوسرے پیغمبروں کی قبریں ہیں اور دوسری روایت یہ ہے کہ آپ حضر موت میں جا کر فوت ہوئے یہی بات عقل کو لگتی ہے وہیں یمن کے علاقے میں ریت کے ٹیلوں میں آپ

کی قبر ہے یہ سب تاریخی روایتیں ہیں جن کا سچ ہونا یقینی نہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے یہ بات ثابت نہیں ہے، لہٰذا تاریخی واقعے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔

ثمود کا حال

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ
اور طرف ثمود کی بھائی ان کے صالح کو کہا اے قوم میری! بندگی کرو اللہ کی نہیں لئے تمہارا

مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ
سے معبود سوا اس کے تحقیق آ چکی پاس تمہارے دلیل طرف سے رب تمہارے یہ اونٹنی

اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا
اللہ کی لئے تمہارے نشانی پس چھوڑ دو اس کو کھائے میں زمین اللہ کی اور نہ چھوؤ تم اس کو

بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۳﴾
بری طرح پس پکڑے تم کو عذاب دردناک (۷۳)

وقف لازم

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا، بولے اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارے لئے کوئی معبود نہیں تم کو تمہارے رب کی طرف سے دلیل پہنچ چکی ہے یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے نشانی ہے، سو اس کو چھوڑ دو کہ کھائے اللہ کی زمین میں اور اس کو برے ارادے سے (مار ڈالنے کے ارادے سے) ہاتھ نہ لگاؤ، ورنہ تم کو دردناک عذاب پکڑ لے گا۔ (۷۳)

تفسیر

"ثَمَدْ" پانی کی کمی کو کہتے ہیں، جس علاقے میں یہ قوم آباد تھی وہاں پانی کی شدید کمی تھی؛ اس لئے اس قوم کا نام "قوم ثمود" مشہور ہو گیا، ویسے "ثمود" ایک شخص کا نام بھی تھا، جو کہ ارم ابن سام ابن حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد

میں سے تھا کسی ایک شخص کے نام قوم یا علاقے کا نام پڑ جانا عین ممکن ہے اور اس کی بعض دوسری مثالیں بھی موجود ہیں، مثلاً: مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام ہے جو آپ کی تیسری بیوی کی اولاد میں سے تھے بعد میں اسی کے نام پر قوم کا نام بھی مدین مشہور ہوا اور اسی نام سے ایک شہر بھی آباد ہوا، اسی طرح ثمود بھی ایک فرد کا نام تھا جو کہ "عاد کی قوم" کے پسماندگان میں سے تھا، چونکہ ثمود بھی "عاد کی قوم" ہی کی نسل سے تھے؛ اس لئے پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ اس کو "عاد اولیٰ" کہتے ہیں اور "ثمود" کو "عادِ ثانیہ" کہا جاتا ہے، "عاد کی قوم" عرب کے سب سے بڑے ریگستان میں وادیٔ داہنا حضرت موت اور اس کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے جو کہ جزیرہ نمائے عرب کا جنوب مشرقی حصہ ہے، البتہ "ثمود کی قوم" کا وطن عرب کے شمال مغرب میں "وادیٔ حجر" سے لے کر "وادیٔ قریٰ" تک پھیلا ہوا تھا، اسے "مدائن صالح" بھی کہتے ہیں۔

"ثمود کی قوم" کا وطن "مدائن صالح" والا علاقہ تھا جو کہ تبوک تک چلا گیا ہے، تبوک وہی مقام ہے جہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رومیوں سے جہاد کرنے کیلئے مدینہ طیبہ سے تشریف لے گئے تھے اور "مدائن صالح" راستے میں آتا ہے، حدیثوں میں آپ کے اس سفر کی بہت سی تفصیل موجود ہیں اس علاقے میں تبوک سے لے کر مکہ کی طرف "وادیٔ قریٰ" تک "ثمود کی قوم" کے ایک ہزار سات سو بڑے بڑے شہر اور قصبے آباد تھے، "ثمود کی قوم" بڑے ترقی یافتہ لوگ تھے ان میں بڑے بڑے کاریگر تھے یہ لوگ معمولی مکان بنانے پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ بڑے بڑے نقش ونگار والے عالیشان محل تعمیر کرتے تھے یہ لوگ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر نہایت مضبوط مکان بناتے تھے جو حادثوں سے محفوظ رہتے تھے ان کے کھنڈرات دیکھنے کیلئے آج بھی سیاح جاتے ہیں ان پر ارامی زبان میں لکھے ہوئے کتبے اب بھی موجود ہیں اس قوم کو گزرے ہوئے پانچ ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔

"ثمود کی قوم" کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا، حضرت صالح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو وہی سبق دیا جو سارے پیغمبر دیتے آئے ہیں، اے میری قوم کے لوگو! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، کوئی بھی اس کے بغیر فریاد سننے والا نہیں ہے، لہٰذا عبادت بھی اسی کی کرنی چاہئے، توحید کا

درس دینے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے قوم سے کہا کہ تمہارے پاس کھلی نشانی یا دلیل تمہارے رب کی طرف سے آچکی ہے، آیت میں "بَيِّنَةٌ" سے مراد وہ اونٹنی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے صالح کی قوم کی فرمائش پر چٹان سے پیدا کیا تھا۔

"مسند احمد" کی حدیث شریف میں آتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! نشانیاں نہ مانگا کرو کیونکہ (حضرت) صالح (علیہ السلام) کی قوم نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر سے نشانی مانگی تھی کہ اس رنگ اور جسامت کی اونٹنی ہو جو آپ ہمارے سامنے اس پہاڑ کے پتھر سے نکالیں وہ گابھن بھی ہو اور ہماری آنکھوں کے سامنے بچہ جنے اللہ تعالیٰ نے اس فرمائش کو پورا کیا، حضرت صالح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں نے نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے پتھر کو پھاڑ کر اس میں سے اونٹنی کو نکالا یہ معجزہ دیکھ کر کچھ لوگ تو ایمان لے آئے مگر اکثریت پھر بھی ایمان نہ لائی اور آخر عذاب میں مبتلا ہوئی، "ثمود کی قوم" جس کنوئیں سے پانی پیتے پلاتے تھے اسی سے یہ اونٹنی بھی پانی پیتی تھی مگر یہ عجیب وغریب اونٹنی جب پانی پیتی تو پورے کنوئیں کا پانی ختم کر دیتی تھی اور "ثمود" کے جانور پیاسے رہ جاتے حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ فیصلہ فرما دیا تھا کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیئے گی اور دوسرے دن قوم کے سب لوگ پانی لیں گے، بہرحال قرآن کریم میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ پانی کو تقسیم کر دیا گیا تھا اور پھر وہ اونٹنی دودھ بھی خوب دیتی ہے جس کا جی چاہئے اس سے دودھ نکال لے البتہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے واضح طور پر حکم دیا تھا کہ جس دن اونٹنی کے پانی پینے کی باری ہو اس دن کوئی دوسرا جانور گھاٹ پر نہ جائے، نیز: یہ کہ اس اونٹنی سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے اور نہ اسے کوئی تکلیف پہنچائی جائے۔

تمام اونٹنیاں اور دوسرے جانور سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں مگر اس اونٹنی کو خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی اونٹنی اس کی شرافت کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ غیر معمولی طریقے سے پیدا فرمایا تھا، اس کی مثال بعض دوسری چیزیں بھی ہیں، جیسے: مساجد اللہ، یعنی: اللہ تعالیٰ کی مسجدیں یا بیت اللہ، یعنی: اللہ تعالیٰ کا گھر، حالانکہ ہر چیز کا مالک تو خدا تعالیٰ ہی ہے مگر یہ ایک خاص گھر ہے جو رہائش کیلئے نہیں بلکہ عبادت

کیلئے بنایا گیا ہے، لہٰذا اس کی شرافت کی وجہ سے اُسے بیت اللہ کہا گیا ہے کہ اس کے اردگرد چوبیس گھنٹے طواف ہوتا ہے اس کے اردگرد ہر وقت عبادت ہوتی ہے بلکہ دنیا بھر کے مسلمان اسی گھر کی طرف منہ کر کے محبوب ترین عبادت نماز ادا کرتے ہیں، اسی طرح یہ اونٹنی باقاعدہ افزائش نسل کے ذریعہ کسی دوسری اونٹنی کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے پتھر کو پھاڑ کر نکالا تھا، سیاح بیان کرتے ہیں کہ جس پتھر سے اونٹنی کو نکالا گیا تھا اس میں سات فٹ کا شگاف (پھٹن) اب بھی موجود ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ میں اس علاقے میں گیا جہاں وہ اونٹنی بیٹھا کرتی تھی میں نے بیٹھنے کی جگہ نوے فٹ پیمائش کی، یہ روایت تفسیر عزیزی میں موجود ہے۔

بہرحال یہاں پر اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کی دو باتوں کا ذکر فرمایا ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے کیں، ایک توحید کا درس دیا اور دوسرے نشانی کا ذکر کیا، بالآخر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا نہیں کیا اور اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ دیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

فساد مت کرو

وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي

اور | یاد کرو | جب | بنایا تم کو | خلیفہ | سے | بعد | عاد کے | اور | ٹھکانا دیا تم کو | میں

الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ

زمین | بناتے ہو تم | میں سے | نرم جگہوں اسکی | محل | اور | تراشتے ہو | پہاڑوں کو

بُیُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾

گھر کی شکل میں | پس یاد کرو | نعمتیں | اللہ کی | اور | نہ | بگاڑ پھیلاؤ | میں | زمین | فساد کرکے (۷۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یاد کرو! جب کہ تم کو عاد کے بعد سردار بنایا اور زمین میں تم کو ٹھکانا دیا کہ نرم زمین (میدانی علاقے) میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں میں گھر تراشتے ہو، سو اللہ کے احسان کو یاد کرو اور زمین میں فساد

مت مچاتے پھرو۔ (۷۴)

لفظی تحقیق: سُهُوْلٌ: نرم جگہیں۔ "سَهَلٌ" کی جمع ہے، نرم مٹی کے میدانی علاقے کو کہتے ہیں۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ تم اپنی حالت پر غور کرو تم سے پہلے عاد کی قوم گزر چکی ہے اب ان کے بعد تم نے ان کی جگہ سنبھالی ہے یہ دولت اور قوت تم کو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ملی ہے جس نے تم سے پہلے عاد کو یہی سب کچھ عطا کیا تھا تم میدانوں میں بڑے اونچے اونچے شاندار محل تعمیر کرتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر ان میں محفوظ مکان بناتے ہو تا کہ موسمی تبدیلی، سردی، آندھی، طوفان وغیرہ سے ان میں پناہ لو جب اللہ تعالیٰ نے تم کو اس قدر قوت عطا کی ہے اور اتنا ساز و سامان دیا ہے تو انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کا شکر کرو اور ان چیزوں کو اس کے حکم کے مطابق کام میں لاؤ۔

احکام و مسائل

مسئلہ (۱):.... تمام پیغمبروں کی توحید کی دعوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور اس کی خلاف ورزی پر دنیا و آخرت کے عذاب سے ڈرانا ہے۔

مسئلہ (۲):.... دوسرے یہ کہ تمام پچھلی امتوں میں ہوتا بھی رہا ہے کہ قوموں کے بڑے دولت مند آبرو والے لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول نہیں کیا ہے اور اس کے نتیجہ میں دنیا میں بھی ہلاک و برباد ہوئے اور آخرت میں بھی عذاب کے مستحق ہوئے۔

مسئلہ (۳):.... تیسرے یہ کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دنیا میں کافروں کو بھی دی جاتی ہیں، جیسا کہ "عاد و ثمود کی قوم" پر اللہ تعالیٰ نے دولت و قوت کے دروازے کھول دیئے تھے۔

مسئلہ (۴):.... چوتھے یہ کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بڑے بڑے محلوں اور عالیشان مکانوں کی تعمیر

بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں اور ان کا بنانا جائز ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ کے پیغمبروں اور ولیوں نے اس کو اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ یہ چیزیں انسان کو غفلت میں ڈال دینے والی ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جو اونچی تعمیروں کے بارے میں ارشاد موجود ہیں وہ اسی انداز میں ہیں۔

بڑوں کی چھوٹوں سے گفتگو

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا

کہا معززلوگوں نے جو بڑے بنتے تھے میں سے قوم اسکی سے ان لوگوں جوضعیف بنا دیئے گئے تھے

لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا

ان سے جو مؤمن ہوئے میں سے ان کیا تم جانتے ہو کہ صالح بھیجا ہوا ہے سے رب اسکے کی انہوں نے کہا

اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا

بیشک ہم پر اس جو لایا ہے ساتھ اسکے یقین رکھتے ہیں (۷۵) کہا ان لوگوں نے جو بڑے درجہ کے تھے بیشک ہم تو

بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾

اس چیز کا کہ ایمان لائے تم پر جس انکار کرنے والے ہیں (۷۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اس کی قوم میں جو متکبر سردار تھے غریب لوگوں کو جو کہ ان میں ایمان لا چکے تھے کہا تم کو یقین ہے کہ صالح کو اس کے رب نے بھیجا ہے، بولے ہم کو تو اس پر یقین ہے جو وہ لے کر آیا۔ (۷۵) وہ لوگ جو متکبر تھے کہنے لگے جس پر تم کو یقین ہے ہم تو اس کو نہیں مانتے۔ (۷۶)

تفسیر

ارشاد ہے کہ بڑے بڑے سرداروں نے عوام کو دیکھا کہ وہ ایمان لے آئے ہیں اور خوشحال ہیں تو ان سے کہا، کیا تم صالح کے اس دعوے کو سچا سمجھتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہے، وہ بولے اتنا بڑا ثبوت دیکھ کر سمجھ تو تم

بھی گئے ہو کہ یہ پیغمبر ہیں لیکن تم دھاندلی کرتے ہو اور ہم نہیں کرتے ہم سچے دل سے اس کی باتوں پر یقین کرتے ہیں اور اس کو واقعی اللہ تعالیٰ کا پیغمبر مانتے ہیں، اس کا جواب اس سر پھرے سرداروں کو کچھ نہ سوجھا لیکن سرداری کے زعم میں دھونس جمانے کی کوشش کی کہ تمہارے ماننے سے کیا ہوتا ہے جب تک ہم نہ مانیں گے ان کا کام نہیں چل سکتا، سن لو کہ! ہم اس کی بات کو نہیں مانتے۔

ہر پیغمبر کے دور میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ سب سے پہلے ایمان لانے والے غریب لوگ ہی ہوتے ہیں امیر لوگ اگر ایمان لائیں بھی تو بڑے دیر کے بعد، ابتداء میں ظلم کا نشانہ ہمیشہ غریب لوگ ہی بنتے رہے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے کہ اسلام کی ابتداء ہمیشہ غریب لوگوں سے ہوئی اور آخر میں بھی یہ غریبوں تک ہی محدود ہو کر رہ جائے گا، لہٰذا غریبوں کیلئے خوشخبری ہے، چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے لوگوں نے کمزور مگر ایمان دار لوگوں سے ان کے ایمان کا امتحان لینا چاہا تو وہ کامیاب نکلے مگر قوم کے سردار اپنی ضد پر اڑے رہے اور کہنے لگے کہ جس چیز پر تم ایمان لائے ہو ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں۔

نافرمان بہک گئے

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ قَالُوْا یٰصٰلِحُ ائْتِنَا

پس ٹانگیں کاٹیں انہوں نے اونٹنی کی اور سرکشی کی سے حکم رب اپنے کے اور کہا اے صالح! لے آ ہم پر

بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

جس سے تو ڈراتا ہے ہمیں اگر ہے تو میں سے پیغمبروں (۷۷) پس پکڑ لیا ان کو زلزلے نے

فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ یٰقَوْمِ

پس ہو گئے میں گھروں اپنے اندھے (۷۸) پس پیٹھ پھیری سے ان اور کہا اے قوم میری!

لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا

تحقیق پہنچایا میں نے تم کو پیغام رب اپنے کا اور خیر خواہی کی لئے تمہاری اور لیکن نہیں

تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٧٩﴾
پسند کرتے تم خیر خواہوں کو (۷۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر انہوں نے اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں اور اپنے رب کے حکم سے پھر گئے اور بولے اے صالح! اگر تو پیغمبر ہے تو لے آ ہم پر وہ چیز جس سے تو ڈراتا تھا۔(۷۷) پس ان کو زلزلے نے آ پکڑا، پھر صبح کو اپنے گھر میں اوندھے پڑے رہ گئے۔(۷۸) پھر انہوں نے پیٹھ پھیری ان سے اور بولے اے میری قوم! میں تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا چکا اور تمہاری خیر خواہی کی لیکن تم کو خیر خواہوں سے محبت نہیں۔(۷۹)

تفسیر

قوم نے اونٹنی کو قتل کرنے کی سازش کی، "سورہ نمل" میں ہے کہ "شہر میں غنڈہ قسم کے نو آدمی رہتے تھے ان کا کام ہی فتنہ فساد برپا کرنا تھا"، ان میں ایک سربراہ قسم کا آدمی قدار بن سالف تھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی مثال مکہ کے ابو زمعہ سے دی جو کہ بڑا شر پسند آدمی تھا تو قدار اونچے خاندان کا فرد تھا پورا خاندان اور قبیلہ اس کی پشت پر تھا مالدار ہونے کے باوجود ناجائز طریقے سے مال پر قبضہ کر لینا اس کا کام تھا، شہر میں عنیزہ نامی ایک حسین وجمیل عورت رہتی تھی جس کی جوان بیٹیاں تھیں جسے اللہ تعالیٰ کی اونٹنی کی وجہ سے اپنے جانوروں کو پانی پلانے میں دقت پیش آتی تھی ادھر قدار اس عورت اور اس کے مال پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، چنانچہ ان دونوں میں یہ طے ہوا کہ اگر قدار اونٹنی کو قتل کر ڈالے تو وہ عورت اپنی جس لڑکی سے چاہے اس کا نکاح کر دے گی، قدار نے اس کا ذکر اپنے ساتھیوں سے کیا اور وہ طے کئے ہوئے وقت پر اونٹنی کی گزرگاہ میں چھپ کر بیٹھ گئے، پھر جب اونٹنی اس جگہ سے گزری تو قدار نے آگے بڑھ کر اس پر تلوار سے حملہ کیا اور اس کے پاؤں کاٹ ڈالے جب وہ اونٹنی گر پڑی تو اس کے باقی ساتھی بھی آ گئے اور انہوں نے اونٹنی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی کچھ پروا نہ کی اور اونٹنی کو قتل کر دیا بلکہ حضرت صالح علیہ السلام کو بھی ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا، چونکہ آپ کے ساتھ کافی لوگ تھے؛ اس لئے

وہ کھلم کھلا آپ کو تکلیف نہ پہنچا سکے ایک موقع پر آپ مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے کہ منکرین نے حملہ کر دیا مگر آپ بچ گئے۔

جب حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو اونٹنی کے قتل پر سخت تنبیہ کی اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کی پیش گوئی کی تو کہنے لگے اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے تو وہ چیز لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے وہ اتنے بے باک ہو چکے تھے کہ خود عذاب کا مطالبہ کرنے لگے، "سورۂ ہود" میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے کہا کہ تین دن تک فائدہ اٹھالو پھر یہ ایسا وعدہ ہے جو جھوٹا نہیں ہوگا اور تم پر عذاب اترے گا، پہلے دن تمہارے چہروں پر زردی چھا جائے گی دوسرے دن سرخ ہو جائیں گے اور تیسرے دن سیاہ، پھر چوتھے دن تم خدا کی پکڑ میں آ جاؤ گے، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا یہ جمعرات کا دن تھا پھر جمعہ اور ہفتہ بھی گزر گئے اور اتوار کے دن صبح صبح ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اترا جو دو قسم کا تھا، ایک تو انہیں زلزلے نے آ پکڑا، "سورۃ الذاریات"، میں آتا ہے کہ فرشتے نے ایسی خوفناک چیخ ماری کہ لوگوں کے دل اور جگر پھٹ گئے اور ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا، سوائے ان لوگوں کے جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے، پس منکرین اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل گرے پڑے، دوبارہ اٹھنے کی ہمت نہ رہی اور ساتھ ہی خوفناک چیخ سنائی دی اور وہ وہیں ہلاک ہو گئے۔

قوم پر عذاب کے اترنے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے مؤمنین بھی اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے گئے بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ چار ہزار مؤمنین تھے ان سب کو لے کر یمن کے علاقہ حضر موت میں چلے گئے اور وہیں حضرت صالح علیہ السلام کی وفات ہوئی اور بعض روایات سے ان کا مکہ معظّمہ چلے جانا اور وہیں وفات ہونا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ پیچھے گزرا ہے، ظاہر عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے چلتے وقت اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے میری قوم! میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر اخواہی کی مگر افسوس تم خیر اخواہوں کو ہی پسند نہیں کرتے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا حال

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا
اور (یادکرو) لوط کو جب اس نے کہا سے قوم اپنی کیا آتے ہو تم پاس بے حیائی کے نہیں پہل کی تم سے ساتھ اسکے

مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۸۰﴾
سے کسی نے میں سے جہان والوں (۸۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور لوط کا ذکر کر جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسی بے حیائی کرتے ہو کہ جہان میں سے تم سے پہلے اس کو کسی نے نہیں کیا۔ (۸۰)

تفسیر

حضرت لوط علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، آپ کا سلسلہ نسب لوط بن ہاران بن تارخ یا آزر ہے آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام "عراق" سے "شام" کی طرف ہجرت کر گئے تو ان کے ساتھ حضرت لوط بھی "شام" چلے آئے حضرت ابراہیم علیہ السلام "فلسطین" میں ٹھہرے اور حضرت لوط علیہ السلام "اردن" چلے گئے، وہاں سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا پیغام دے کر "سدوم" جو وہیں کے ایک شہر کا نام ہے اور اس کے مضافات کے باشندوں کی طرف بھیجا تا کہ ان کو سمجھا کر ان کی بری عادت چھڑائیں، یہ علاقہ پانچ اچھے بڑے شہروں پر مشتمل تھا جن کے نام: "سدوم، عمورہ، ادمہ، صبوییم، اور بالع یا صوغر" تھے ان کے مجموعہ کو قرآن کریم نے "مؤتفکہ اور مؤتفکات" کے الفاظ میں کئی جگہ بیان فرمایا ہے، "سدوم" کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور یہ دارالخلافہ تھا، بڑا سرسبز علاقہ تھا، کھیتی باڑی اور باغات تھے، تجارت بھی وسیع پیمانے پر ہوتی تھی۔

حضرت لوط علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی ہدایت کیلئے بھیجا، انہوں نے قوم کو خطاب کر کے تنبیہ کے طور پر فرمایا: کیا تم ایسا فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے سارے جہان میں کسی نے نہیں کیا، قرآن کریم میں اس گناہ

کا بدکاری سے بھی زیادہ سخت ہونا بتایا گیا ہے، عمرو بن دینار نے فرمایا کہ: اس قوم سے پہلے دنیا میں کبھی ایسی حرکت نہ دیکھی گئی تھی اور نہ "سدوم والوں" سے پہلے کسی برے سے برے انسان کا ذہن اس طرف گیا تھا، اموی خلیفہ عبدالملک نے کہا کہ اگر قرآن کریم میں لوطِ کی قوم کا واقعہ ذکر نہ ہوتا تو میں کبھی گمان نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی انسان ایسا کام کرسکتا ہے۔

اس میں ان کی بے حیائی پر دو حیثیت سے تنبیہ کی گئی، اوّل تو یہ کہ بہت سے گناہوں میں انسان اپنے ماحول یا اپنے بڑوں کی پیروی کی وجہ سے مبتلا ہو جاتا ہے گو وہ بھی کوئی شرعی عذر نہیں مگر عرفا اس کو کسی نہ کسی درجہ میں معذور کہا جاسکتا ہے مگر ایسا گناہ جو پہلے کسی نے نہیں کیا نہ اس کیلئے خاص تقاضے ہیں اور یہ بھی زیادہ وبال ہے، دوسرے اس حیثیت سے کہ کسی برے کام یا بری رسم کو جو شخص ایجاد کرتا ہے اس پر اپنے فعل کا گناہ اور عذاب تو ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ان تمام لوگوں کا عذاب ووبال بھی اسی کی گردن پر ہوتا ہے جو قیامت تک اس کے فعل سے متاثر ہو کر گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک بالکل نیا گناہ

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ

بیشک تم دوڑنے لگے مردوں پر خواہش سے چھوڑ کر عورتوں کو بلکہ تم تو

قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾

وہ لوگ ہو جو فطرت کی حد سے نکل گئے (۸۱)

بامحاورہ ترجمہ: تم تو مردوں پر شہوت کے مارے دوڑتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر بلکہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو۔ (۸۱)

تفسیر

حضرت لوط علیہ السلام نے جب "سدوم والوں" سے کہا کہ تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے جہان میں کسی نے نہیں کیا، حضرت لوط علیہ السلام کو حکم ہوا تھا کہ انہیں جا کر سمجھائیں آپ نے ان لوگوں سے کہا کہ تم ایک فطری خواہش کے جوش کے وقت جسے تمہیں فطری طریقے سے پورا کرنے کے لئے عورت کے پاس جانا چاہئے تھا اپنے ہی جیسے مردوں کے پاس جاتے ہو (اس گندے کام کو عربی میں "لواطت" کہتے ہیں اور اردو میں لونڈے بازی کہتے ہیں) ایسا کرنا فطری قاعدے کو توڑنا ہے اور انسانیت کی حد سے باہر نکل جانا ہے، اس کا نتیجہ سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا جو انسانی فطرت کی حدوں کو توڑ کر باہر نکل جاتا ہے وہ اپنے پاؤں پر ہی کلہاڑی مار رہا ہے، اس کا انجام برا ہونا ایک ضروری اور لازمی بات ہے کیا تمہاری عقل بالکل ماری گئی ہے جو تم ایسے ناشائستہ خبیث اور گندے کام کرتے ہو۔

آخر آیت میں فرمایا کہ: تم ایسی قوم ہو جو انسانیت کی حد سے گزر گئی ہے، یعنی: تمہارا اصل مرض یہ ہے کہ تم ہر کام میں اس کی حد سے نکل جاتے ہو، جنسی خواہش کے بارے میں بھی ایسا ہی ہوا کہ خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ حدوں سے نکل گئے۔

"مردوں سے بدکاری" کی شرعی سزا

"مردوں سے بدکاری" کی شرعی سزا کے متعلق فقہائے کرام اور محدثین میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بدکاری کے تو کئی واقعے پیش آئے اور مجرموں پر حد بھی جاری کی گئی مگر "مردوں سے بدکاری" کا کوئی مقدمہ پیش نہیں آیا نہ آپ نے ایسا کوئی معاملہ نمٹایا، یہی وجہ ہے کہ اس گندے کام کی سزا میں اختلاف پایا جاتا ہے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جسے "ترمذی، ابو داؤد اور امام احمد" نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے ان کے مطابق "مردوں سے بدکاری" کی سزا یہ ہے کہ فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دیا

جائے، جو کوئی یہ برا کام کرے گا وہ ملعون ہے مگر اس حدیث میں قتل کرنے کا حکم نہیں۔

حضرت سعید ابن مسیب، حضرت عطا، حضرت امام حسن بصری، امام ابراہیم نخعی، امام سفیان ثوری، امام اوزاعی، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ "مردوں سے بدکاری" کی سزا عورتوں سے بدکاری کی سزا کے برابر ہے، یعنی: شادی شدہ کو سنگسار (پتھر مار مار کر ہلاک) کیا جائے گا اور غیر شادی شدہ کو سو کوڑے مارے جائیں گے، "صاحب روح المعانی" فرماتے ہیں کہ اس فعل کے پہلی دفعہ کرنے والے کیلئے سزا نہیں ہے اور اگر دوسری دفعہ پھر یہ فعل کرے تو اسے عورتوں سے بدکاری کرنے والے کے برابر سزا دی جائے، امام احمد اور امام اسحاق رحمۃ اللہ علیہما کا مذہب یہ ہے کہ ہم جنسی کرنے والا شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اسے ہر حالت میں سنگسار کر دینا چاہئے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "مردوں سے بدکاری" کرنے والے کو ہر حالت میں قتل کر دو یہ سب تعزیرات ہیں جو مختلف فقہائے کرام نے بیان کی ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ "مردوں سے بدکاری" میں حد نہیں ہے بلکہ تعزیر ہے جو کہ مسلمان حاکم کی صوابدید پر ہے کہ وہ عمر قید کی سزا دے، موت کی سزا دے دے یا کوڑے لگوائے چنانچہ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ مردوں سے بدکاری" کرنے والے کو کسی اونچی جگہ سے گرا کر اوپر سے پتھر بھی مارنے چاہئیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوط کی قوم کو یہی سزا دی تھی، اس مسئلہ میں بعض حضرات امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف زبان درازی کرتے ہیں کہ "ہدایہ" میں لکھا ہے کہ "مردوں سے بدکاری" کی حد نہیں ہے حالانکہ یہ بھی لکھا ہے کہ تعزیر ہے اور تعزیر میں سخت ترین سزا بھی دی جاسکتی ہے، جیسا کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے کہ کسی اونچے مینار سے گرا کر پتھر بھی مارو، بہر حال امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سزا کے قائل ہیں جو کہ حد نہیں بلکہ تعزیر ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا کہ آپ نے مجرم کو دیوار کے نیچے کھڑا کر کے اوپر دیوار گروادی مقصد یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پیش آئے تو انہوں نے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق تعزیر لگائی کیونکہ اس جرم کیلئے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا جواب

وَ مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ

اور نہ تھا جواب قوم اسکی کا مگر یہی کہ کہنے لگے نکال دوان کو سے بستی اپنی

بامحاورہ ترجمہ:۔ اس کی قوم نے کچھ جواب نہ دیا مگر یہی کہا کہ ان کو اپنے شہر سے نکال دو۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے سامنے کوئی جواب نہ بن پڑا اور بے تکے پن پر اتر آئے، انسان کو جب کوئی جواب نہیں سوجھتا تو وہ گالی گلوچ پر اتر آتا ہے اور مار پیٹ تک سے نہیں چوکتا، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم ان کی بات سے دل ہی دل میں تنگ ہوئی اور بولی تو یہ بولی کہ ان لوگوں کو اپنے درمیان سے نکال دو، ان کو اپنی بستی سے باہر کردو۔

اس قسم کا جواب لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا تھا کہ انہوں نے بھی بحث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہار مان لی کیونکہ فیصلہ یہ کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دو۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص کسی بات کے کہنے والے کو سزا دینے، مثلاً: قید یا شہر بدر کردینے یا مارنے پیٹنے پر آمادہ ہو جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ بات کہنے والا سچا ہے اور اس کا سزا دینے والا بحث میں اپنی ہار مان چکا ہے ورنہ اگر اس کے پاس اپنی صفائی اور اپنے کام کی سچائی کی ایک بھی دلیل ہوتی تو ضرور اسے پیش کرتا اور اپنے مخالف کو سمجھاتا۔

پاکیزگی کو جرم ٹھہرالیا

اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾

بیشک وہ لوگ لونڈے بازی سے صاف ستھرا رہنا چاہتے ہیں (۸۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بیشک یہ لوگ (لونڈے بازی سے) صاف ستھرا رہنا چاہتے ہیں۔(۸۲)

تفسیر

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم سے حضرت لوط علیہ السلام کی معقول باتوں کا کوئی جواب نہ بن پڑا آخر کسیانے ہوکر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ان کو اپنے شہر سے نکال دو، لوط کی قوم جو کہ اس گندے کام کی عادی ہو چکی تھی اور اسی کو اچھا سمجھنے لگے تھے طہارت اور پاکیزگی ان کے نزدیک بری چیز ہو چکی تھی، چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ لوط اور ان کے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دینا چاہئے۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ جس کام سے آدمی کی عقل الٹ جائے اور سمجھ ختم ہو جائے وہ کام انسانیت کا قاتل نہیں تو اور کیا ہے، کیا ایسے کام کے کرنے والے زندہ رہنے کے مستحق ہیں؟ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا میں کہیں بھی ان کے خلاف نفرت اور غضب کی زبردست لہر پیدا نہیں ہو رہی ہے؟ اگر یہ بدکار ایسا ہی سوچتے ہیں تو کھلی غلطی پر ہیں، دنیا میں ایک قانون جاری ہے کہ ہر کام کا نتیجہ ضرور نکلے گا اس کے پنجے سے نکل کر کوئی نہیں جا سکتا، یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے، ان لوگوں کا کیا حشر ہوا اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔

آخر کار تباہ ہوئے

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾

پس نجات دی ہم نے اسکو اور گھر والوں اسکے کو مگر عورت اس کی وہ تھی میں سے رہ جانے والوں (۸۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو بچا لیا مگر اس کی عورت (بیوی) کہ وہاں کے رہنے والوں میں رہ گئی۔(۸۳)

تفسیر

حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کے سوا ان کو اور ان کے گھر والوں اور ماننے والوں کو ہم نے بچا لیا وہ ہدایت

کے مطابق راتوں رات اس بستی کو چھوڑ کر نکل گئے اور بچ گئے ،لیکن حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی نے قوم کا ساتھ دیا، مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ بدنصیب عورت حضرت لوط علیہ السلام کے گھر میں آباد ہونے اور ان کی دولڑکیوں کی ماں ہونے کے باوجود ان پر ایمان نہ لائی اور نہ ان کی نصیحت اور وعظ کو دل سے مانا بلکہ اپنی قوم کے ہم خیال اور ہمدرد رہی ، ظاہر میں اپنے خاوند اور بیٹیوں کے ساتھ چل تو پڑی مگر مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی جاتی تھی نافرمان قوم کی اس محبت نے اسے بھی ان کے ساتھ ہی تباہ کروادیا اور ایک پتھر نے سر توڑ کر اس کا خاتمہ کر دیا۔

قرآن کریم کے الفاظ میں ''نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ'' آیا ہے، یعنی: ہم نے لوط اور ان کے ''اَهْلَ'' کو عذاب سے نجات دی یہ ''اَهْلَ'' کون لوگ تھے بعض حضرات مفسرین کا قول ہے کہ ''اَهْلَ'' میں دولڑکیاں تھیں جوان پر ایمان لے آئیں تھی؛اس لئے وہ عذاب سے بچ گئیں اور بیوی ایمان نہیں لائی تھی؛ اس لئے وہ قوم کے ساتھ عذاب میں گرفتار ہوئی، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ: اہل سے مراد عام ہے، اپنے گھر والے اور دوسرے لوگ جو مؤمن ہو چکے تھے، خلاصہ یہ ہے کہ گنے چنے چند مسلمان تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے عذاب سے بچانے کیلئے حضرت لوط علیہ السلام کو حکم دے دیا کہ بیوی کے سوا دوسرے گھر والوں اور مؤمنوں کو لے کر آخر رات میں اس بستی سے نکل جائیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں کیونکہ جس وقت آپ اس بستی سے نکل جائیں گے تو بستی والوں پر فوراً عذاب آ جائے گا۔

حضرت لوط علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کیلئے اپنے گھر والوں اور مؤمنوں کو لے کر رات کے آخر حصے میں ''سدوم'' سے نکل گئے، بیوی کے متعلق دو روایتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ ساتھ چلی ہی نہیں، دوسری یہ کہ کچھ دور تک ساتھ چلی مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف پیچھے مڑ کر بستی والوں کا حال دیکھنا چاہتی تھی تو اس کو عذاب نے پکڑ لیا، قرآن کریم کے مختلف مقام پر اس واقعہ کو کہیں مختصر طور پر اور کہیں تفصیلاً بیان فرمایا گیا ہے، یہاں صرف اتنا ذکر ہے کہ ہم نے لوط (علیہ السلام) اور ان کے گھر والوں کو اور مؤمنوں کو عذاب سے نجات دے دی مگر حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی عذاب میں رہ گئی۔

مجرموں پر پتھر برسے

ع ۱۰ / ۱۷ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۟﴿۸۴﴾

اور برسائی ہم نے پران بارش پس دیکھئے کیسا ہوا انجام مجرموں کا (۸۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے ان کے اوپر پتھروں کی بارش برسائی پس دیکھئے گناہگاروں کا کیسا انجام ہوا۔ (۸۴)

تفسیر

جب حضرت لوط علیہ السلام اپنے گھر والوں کو لے کر بستی سے نکل گئے تو ہم نے ان پر خاص قسم کی بارش برسائی جس میں پتھر برسے، "سورۂ ہود" میں اس کی تفصیل موجود ہے ہم نے پتھروں کی بارش کی اور پتھر بھی ایسے کہ جن پر نشان لگے ہوئے تھے کہ یہ پتھر فلاں بے ایمان کے سر پر لگے گا اور یہ فلاں کو ہلاک کرے گا اس طرح وہ قوم ہلاک ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں بھی عذاب اتارے وہاں پر ایسا ہی ذکر کیا ہے کہیں پتھر برسائے، کہیں زلزلہ آیا، کہیں ہوا کو بھیجا، کہیں طوفان آیا اور کہیں چیخ نے کام تمام کر دیا، اللہ تعالیٰ نے مختلف قوموں پر مختلف طریقوں سے عذاب اتارا، کہ دیکھو! مجرموں کا کیسا انجام ہوا؟ برے کاموں کا ہمیشہ برا ہی انجام ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں نہایت ہی سخت عذاب کے ذریعے ہلاک کیا جو بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آئے گا اگر کسی طرح دنیا میں بچ گیا تو قبر اور آخرت میں تو بہر حال پکڑا جائے گا۔

ان لوگوں پر اوپر سے پتھروں کی بارش بھی ہوئی اور نیچے سے زمین کو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اٹھا کر اوندھا کر دیا اور جن پتھروں کی بارش برسی وہ تہ بہ تہ تھے، یعنی: ایسی مسلسل بارش ہوئی کہ تہ بہ تہ جمع ہو گئے اور یہ پتھر نشان کئے ہوئے تھے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ: ہر ایک پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس کی ہلاکت

کیلئے اسے پھینکا گیا تھا، "سورۂ حجر" کی آیتوں میں اس عذاب سے پہلے یہ بھی ذکر ہے کہ آ پکڑا ان کو چنگھاڑ نے سورج نکلتے وقت، اس سے معلوم ہوا کہ پہلے آسمان سے کوئی سخت آواز چنگھاڑ کی صورت میں آئی، پھر دوسرے عذاب آئے، ظاہر الفاظ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ چنگھاڑ کے بعد پہلے زمین کا تختہ الٹ دیا گیا، پھر اس پر ان کی مزید ذلت کیلئے پتھراؤ کیا گیا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے پتھراؤ کیا گیا ہو بعد میں زمین کا تختہ الٹا دیا گیا ہو، کیونکہ قرآن کریم کے انداز بیان میں یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کا ذکر پہلے ہو وہ واقع ہونے کے اعتبار سے بھی پہلے ہو۔

مدین والوں کا قصّہ

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا

اور طرف بھیجا مدین کی بھائی ان کے شعیب کو کہا اے قوم میری! بندگی کرو اللہ کی نہیں

لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

لئے تمہارے کوئی معبود سوا اس کے تحقیق آ چکی تم تک دلیل طرف سے رب تمہارے کی

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، انہوں نے کہا اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل پہنچ چکی ہے۔

لفظی تحقیق: مَدْيَنَ: مدین کے بارے میں تحقیق پچھلی آیتوں میں گزر چکی ہے۔

تفسیر

حضرت شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور مدین ہی کی اولاد میں سے ہیں؛ اس لئے ان کو مدین کا بھائی کہا گیا، یہ اپنی قوم کی معاشرتی خرابیوں کو جن کی بنیاد توحید کے انکار پر تھی اور جو ان میں عام طور پر پھیل گئی تھیں، درست کرنے کی ہدایت کرتے ہیں، یہی برائیاں ایک اور ہمسایہ قوم میں جو "اصحاب الایکہ" (ایکہ جنگل

اور بن کو کہتے ہیں) کہلاتی تھی رواج پاچکی تھیں وہ مدین کی اولاد نہ تھے لیکن برائیوں میں ان کے شریک تھے؛ اس لئے ان کے پیغمبر بھی حضرت شعیب علیہ السلام ہی ہیں، حضرت شعیب علیہ السلام اپنی فصاحت اور بلاغت میں مشہور تھے؛ اس لئے ان کو ''خطیب الانبیاء'' کہا جاتا ہے اس سے پہلے بیان ہوا کہ "نوح کی قوم، عاد، ثمود اور لوط کی قوم" اپنے مجرمانہ طرزِ زندگی کی شامت میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوئے اور چونکہ سوا گنتی کے چند آدمیوں کے سارے کے سارے اپنی اپنی بری عادتوں پر اڑے رہے اللہ تعالیٰ نے عذاب کے ذریعے انہیں تباہ کر کے رکھ دیا، "نوح کی قوم" پانی کے طوفان سے، "عاد" آندھی کے جھکڑوں سے، "ثمود" زلزلے اور کڑک سے اور "لوط کی قوم" پتھروں کی بارش سے ہلاک ہوئے، اس کے بعد "مدین کی قوم" کا دور آیا جن کا حال اس آیت سے شروع ہوتا ہے۔

ارشاد ہے کہ "مدین کی قوم" کی طرف ہم نے انہیں کی برادری کے ایک معزز شخص حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کے سمجھانے کے لئے اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو بھول بیٹھے تھے حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو سمجھایا کہ بھائیو! انسان کو جس کے سامنے عاجزی کے ساتھ جھکنا چاہئے وہ تو صرف اللہ ہے اس کے سوا تو اور کوئی عبادت کے قابل نہیں، میری طرف دیکھو! تم ایسی نشانیاں پاؤ گے جو میرے سچا اور مخلص ہونے کی گواہی دے رہی ہیں تمہارے رب نے میرے ساتھ ایسی باتیں بھیجی ہیں جن کو دیکھ کر اور سن کر تمہیں میری سچائی میں ذرا بھی شبہ نہیں رہنا چاہئے، جن قوموں کا بیان ہو رہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں ایک خاص قسم کی برائی رواج پکڑ چکی تھی، لیکن ان سب کی جڑ ایک تھی، یعنی: اللہ تعالیٰ کو بھلا دینا اور دوسری چیزوں کی طرف جھکنا، یہ دوسری چیزیں اپنی بری خواہشوں کے سوا اور کچھ نہیں جو مختلف قسم کی برائیوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے حق کا پیغام اپنی قوم کو دیا، اسلام جو تمام پیغمبروں کی مشترک دعوت ہے اس کا خلاصہ حقوق کی ادائیگی ہے، پھر حقوق دو قسم کے ہیں: ایک براہِ راست اللہ تعالیٰ کا حق ہے جس کے کرنے یا چھوڑنے سے انسانوں کا کوئی خاص دنیاوی نفع نقصان نہیں، جیسے: عبادت، نماز روزہ وغیرہ دوسرے حقوق العباد

جن کا تعلق انسانوں سے ہے اور یہ قوم ان دونوں حقوق سے بے خبر اور دونوں کے خلاف کام کر رہی تھی۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم سے فرمایا کہ: تحقیق تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بینہ، نشانی یا معجزہ آ گیا ہے اللہ تعالیٰ نے ہر پیغمبر کو کوئی نہ کوئی معجزہ یا نشانی عطا کی ہے جسے "بینہ" کہا جاتا ہے، اس مقام پر حضرت شعیب علیہ السلام کی کسی خاص نشانی یا معجزے کو ذکر نہیں کیا گیا تاہم آپ کو بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی واضح نشانی ضرور عطا کی ہوگی جس کے بارے میں حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم سے کہا کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے کھلی دلیل آ چکی ہے،، بعض فرماتے ہیں کہ "بینہ" کا لفظ حکم اور دلیل پر بھی بولا جاتا ہے، اور بحیثیت پیغمبر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کوئی حکم اور دلیلیں بھی دیں، جن کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے، "بینہ" کا لفظ خود پیغمبر کی ذات پر بھی بولا جاتا ہے، چنانچہ "سورۂ بینہ" میں اللہ تعالیٰ نے دو دفعہ اس لفظ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد لی ہے، پیغمبر کا قول فعل اور عمل سب "بینہ" ہوتا ہے، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ یہاں پر "بینہ" سے مراد خود حضرت شعیب علیہ السلام کی ذات ہو۔

مدین والوں کی برائیاں

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ

پس پوری کرو ناپ اور تول اور مت گھٹاؤ لوگوں میں چیزیں ان کی

وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

اور مت فساد کرو میں زمین پیچھے اس کے سنورنے کے یہ بہتر ہے لئے تمہارے

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

اگر ہو تم مؤمن ہو (۸۵)

بامحاورہ ترجمہ: سو ناپ اور تول پوری کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر مت دو اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت پھیلاؤ، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو۔ (۸۵)

تفسیر

اس آیت میں اس بات کا بیان ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے کن کن برائیوں سے اپنی قوم کو روکنا چاہا اور اس غرض کیلئے کن الفاظ میں ان کو سمجھایا یہ برائیاں ان میں رائج ہو چکی تھیں، ارشاد ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ جو چیزیں تم دوسروں کو ان کا پورا معاوضہ لے کر دیتے ہو وہ اگر ناپ کر دینے کی ہیں تو ان کو پورا پورا ناپا کرو اگر تول کر دینے کی ہیں تو پورا پورا تول کر دو، لوگوں کو ان کی ضروریات کی چیزیں کم تول کر کے مت دیا کرو اور جب لین دین کا طریقہ طے ہو چکا اور لوگ اطمینان سے اپنے اپنے کام میں لگ گئے تو اب تم ناپ تول میں کمی کر کے اور لوگوں کے حق مار کے ناحق کے جھگڑے مت پیدا کرو، یہ مت سمجھو کہ کمزور کا حق اگر دبالیا تو وہ بے چارہ بے بس ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کہے گا، اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والا ایسی بات کبھی نہیں سوچ سکتا، وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کمزور اور بے بس کا بھی ویسا ہی رب ہے جیسا کہ میرا ہے، اگر میں اپنے آپ کو اونچے درجے کا سمجھ کر نیچے درجے والوں کو ستاؤں گا تو اللہ تعالیٰ مجھے اس کی سزا دیں گے، کیونکہ میں اس کے بندے کو بے وجہ نقصان پہنچا رہا ہوں اور اس کو ستا رہا ہوں۔

اس آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کی اس خرابی کو واضح کیا ہے اور اس کو دور کرنے کی تاکید کی کیونکہ لیتے وقت پورا ناپ تول کر لینا اور دیتے وقت کم دینا، دوسرے کا حق مارنا ہے اور بازار کے طے شدہ بھاؤ کو بگاڑنا ہے جس کے معنٰی اصلاح کے بعد فساد کرنا ہوئے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کی توجہ ان معاشرتی خرابیوں کی طرف دلائی کہ ناپ اور تول کو پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں نہ گھٹاؤ، مقصد یہ ہے کہ ناپ تول میں ڈنڈی مار کر لوگوں کا حق ضائع نہ کرو، یہاں پر اللہ تعالیٰ نے تاجروں کی گندی ذہنیت کا ذکر کیا ہے، "سورۂ مطففین" میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس طرح ہے کہ جب لوگوں سے ناپ کر یا تول کر خود لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں جب دوسروں کو دیتے ہیں تو اس میں کمی کر جاتے ہیں، بعض تاجر اسی ذہن کے مالک ہوتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایماندار تاجر کو خوشخبری سنائی ہے کہ اس کا حشر پیغمبروں، صدیقوں

اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا وہ تو حلال وحرام میں فرق رکھے گا کسی کا حق ضائع نہیں کرے گا، مگر کمزور ایمان والوں، مشرکوں اور کافروں کی نظر کے سامنے صرف دنیا کا فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی برائی بیان فرمائی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی یہ تقریر اس زمانے کی ہے جب ان کے اردگرد ہر طرف فساد ہی فساد تھا مگر یہاں پر "بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے زمین میں بالکل امن وامان تھا اور اس کے بعد فساد کا بازار گرم ہوا، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اصلاح سے مراد وہ اصلاح ہے جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی طرف بھیجا، خداوند تعالیٰ نے اس سلسلے میں پیغمبر بھیجے، کتابیں اتاریں، قانون اور شریعت دی تاکہ لوگ اس پر عمل کر کے دنیا میں امن وامان قائم کریں، مگر ان لوگوں نے اس کی طرف توجہ نہ دی، ظاہر ہے کہ اس کے آنے کے بعد جو شخص اس قانون کو توڑتا ہے اور اس کے خلاف چلتا ہے وہ باغی، شریر اور سزا کا مستحق ہے۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):..... جس طرح ناپ تول میں حق سے کم دینا حرام ہے اسی طرح دوسرے انسانی حقوق میں کمی کرنا بھی حرام ہے، کسی کی عزت وآبرو پر حملہ کرنا یا کسی کے درجہ اور رتبہ کے موافق اس کا احترام نہ کرنا، جس جس کی اطاعت واجب ہے ان کی اطاعت میں کوتاہی کرنا یا جس شخص کی تعظیم وتکریم واجب ہے اس میں کوتاہی برتنا یہ سب ناپ تول میں کمی جیسے جرم میں آتے ہیں۔

دوسروں کو سیدھی راہ سے روکنا

وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ

اور　نہ　بیٹھو　پر ہر　راستے　ڈراتے ہو تم　اور　روکتے ہو تم　سے　راستے

اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ

اللہ کے اس کو جو ایمان لائے پر اس اور ڈھونڈتے ہو تم اس میں ٹیڑھ پن

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور راستوں میں لوگوں کو ڈرانے کیلئے مت بیٹھو اور تمہاری فطرت یہ ہوگئی ہے کہ تم ان لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہو جو ایمان والے ہیں اور تم اس راستے کو بھی ٹیڑھا دیکھنا چاہتے ہو۔

تفسیر

جب حضرت شعیب علیہ السلام نے لوگوں کو سمجھانا شروع کیا اور سننے والوں پر آپ کے الفاظ کا اثر ہونے لگا تو ان کی قوم کے گمراہ لوگوں نے آمد ورفت کے راستوں پر بیٹھکیں قائم کیں اور لوگوں کو حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس جانے اور ان کی باتیں سننے سے روکنے لگے یہاں تک کہ ڈرانے دھمکانے پر اتر آئے اور ان کے بتائے ہوئے طریقے میں عیب نکالنے لگے اور لوگوں کو اپنے برے راستہ پر قائم رہنے کی ترغیب دینے لگے تو حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: دیکھو! ایسا مت کرو کہ لوگوں کا راستہ گھیر کر بیٹھ جاؤ اور ان کو ڈرا کر دھمکا کر میرے پاس آنے سے روکو اور جو لین دین کا راستہ اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے اس کی طرف سے ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لا چکے ہیں اور اس کی فرمانبرداری پر تیار ہیں ان کو ہٹانے کی کوشش کرو اور سیدھے راستے میں خواہ مخواہ عیب نکالو اور لوگوں کے دل میں اس کی طرف سے شک وشبہ پیدا کر کے انہیں اس کے چھوڑ دینے پر اُکساؤ۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بھی فرمایا کہ: ہر راستے میں مت بیٹھو تم لوگوں کو ڈراتے ہو اور ایمان لانے والے کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہو، ڈرانے سے مراد یہ ہے کہ تم شاہراؤں پر ڈاکے ڈالتے ہو لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے مال چھین لیتے ہو اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو جان سے مار دینے سے بھی نہیں چوکتے۔

ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا پراپگینڈہ کیا جائے جس سے متاثر ہو کر لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے کو چھوڑ دیں اور نئے آنے والے رُک جائیں، جو لوگ حضرت شعیب علیہ السلام کی بات

سننا چاہتے تھے قوم کے لوگ انہیں حیلے بہانے سے آپ کے پاس جانے سے روکتے تھے اور آپ کے خلاف غلط پراپگینڈہ کر کے لوگوں کو آپ سے نفرت دلاتے تھے، مکہ کے مشرک بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے ان کی بھی خواہش ہوتی تھی کہ کوئی نیا آنے والا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات نہ کر سکے، وہ جانتے تھے کہ اگر ایک دفعہ کسی نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات سن لی تو وہ انہی کا ہو کر رہ جائے گا، حضرت ضماد رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے آپ اسلام لانے سے پہلے بہت بڑے کاہن اور طبیب تھے مکہ آئے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی مشرکوں نے کہا وہ تو پاگل ہے (نعوذ باللہ) اس کے پاس جا کر کیا کرو گے، کہنے لگے میں طبیب ہوں اگر وہ بیمار ہیں تو ان کا علاج کروں گا آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر علاج کی پیش کش کی تو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا: پس آپ کی بات سننا تھا کہ دل میں ایمان اتر گیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہاتھ پر بیعت کر کے واپس آیا، بہرحال راستے سے روکنے کا یہی مطلب ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ: تم اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہو اور دین کے راستے میں ٹیڑھ پن تلاش کرتے ہو دین میں ایسی خامیاں تلاش کرتے ہو جن کا پراپگینڈہ کر کے لوگوں کو دین سے پھیرنا چاہتے ہو۔

بُروں کے انجام سے سبق لو

وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ

اور | یاد کرو | جب | تھے تم | تھوڑے | پس زیادہ کیا تم کو | اور | دیکھو | کیسا | ہوا

عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾

انجام | فسادیوں کا | (۸۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یاد کرو جب تم بہت تھوڑے تھے، پھر تم کو بڑھا دیا اور دیکھو! فساد کرنے والوں کا کیسا انجام ہوا۔ (۸۶)

تفسیر

اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور اس کی کتابوں کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی کامیابی کا کوئی راستہ نہیں سوا اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پہچانے اور اس کے حکموں کو پورا کرنے کیلئے دل و جان سے تیار ہو جائے اور اس کے مقابلے میں کسی کی نہ سنے جو اس کو اس کے سوا اور کوئی راستہ سجھائے اسے شیطان یا اس کے پھندے میں پھنسا ہوا شخص سمجھے اور اس کی بات کو بالکل رد کر دے، اللہ تعالیٰ کی پہچان کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جسے اس آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام کے قول کی صورت میں نقل کیا ہے۔

ارشاد ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ تم اس بات کو سوچو کہ تم پہلے ایک مٹھی بھر آدمی تھے زندگی کی ضرورت کے سامان بھی تمہارے پاس تھوڑے سے تھے، اس کے بعد تم ایک بڑی طاقتور قوم بن گئے، تمہاری تعداد بہت بڑھ گئی اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے ساز و سامان کا بھی انبار لگ گیا، اب تم ایک معزز اور دولت مند قوم بن گئے ہو، اس ترقی سے تم آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان تھا جو اس نے تمہارے ساتھ کیا وہ تم پر مہربانی نہ کرتا تو تم ایسے راستوں پر پڑ گئے ہوتے جس سے تمہاری نسل نہ بڑھتی اور نہ زندگی کی ضرورتیں فراہم ہوتیں، تم ان لوگوں کو دیکھ لو جو تم سے پہلے گذرے انہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلایا بری عادتیں اختیار کیں ان کے کرتوتوں سے دنیا میں فساد پھیلا امن و امان کا نشانہ نہ رہا آخر کار وہ نیست و نابود ہو کر رہ گئے۔

اختلاف کا فیصلہ

وَ اِنْ كَانَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ

اور | اگر | ہے | ایک گروہ | میں سے تم | جو ایمان لایا | پر اس | کہ بھیجا گیا مجھے ساتھ اسکے | اور

طَآىِٕفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَ هُوَ
ایک گروہ نہیں ایمان لایا پس صبر کرو یہاں تک کہ فیصلہ کرے اللہ درمیان ہمارے اور وہ

خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾
بہترین فیصلہ کرنے والا ہے (۸۷)

بامحاورہ ترجمہ: ۔ اور اگر تم میں سے ایک فرقہ اس پر جو میرے ساتھ بھیجا گیا ایمان لایا اور ایک فرقہ ایمان نہیں لایا تو صبر کرو جب تک اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ (۸۷)

تفسیر

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کو مانو اس نے جو پیغام تمہارے پاس میرے ذریعے بھیجا ہے اس کو سنو اور اس پر عمل کرو، میں تمہارے پاس اسی کا بھیجا ہوا ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بھلے کی کہتا ہوں میرے سچے ہونے کی نشانیاں صاف صاف ظاہر ہیں، میرے پیغمبر ہونے میں شک مت کرو لوگوں کے ساتھ معاملے درست کرو، ناپ تول میں کمی مت کرو زمین میں فساد مت کرو کسی کو مت ستاؤ جو ٹھیک بات سن کر عمل کرنے کیلئے تیار ہو اس کو دھمکیاں یا لالچ دے کر گمراہ کرنے کی کوشش مت کرو، اللہ تعالیٰ کو ماننے کی دلیلیں بہت سی ہیں یہی دلیلیں کیا کم ہیں کہ اس نے تم کو نیچے درجے سے اونچے درجے پر پہنچایا، تمہاری آبادی تھوڑی سی تھی اس کو زیادہ کر دیا، تمہارے پاس کھانے پینے اور ضرورت کی چیزوں کی کمی تھی اب ان کی بہتات ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے ورنہ اگر تمہیں بیماریوں، خشک سالیوں اور دوسری آفتوں میں پھنسا دیتا تو تمہارے نہ آدمی بڑھتے، نہ دولت نصیب ہوتی، یہ ہماری صاف صاف باتیں جن کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں، تعجب ہے کہ تم میں سے بہت سے ان کو نہیں سمجھتے۔

ارشاد ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو سب کچھ سمجھانے کے بعد کہا کہ اگر اب بھی تم سب کے سب میری باتوں کو نہیں سمجھتے اور اللہ تعالیٰ نے جو حکم تمہارے لئے میرے ذریعے بھیجے ہیں ان کو تم میں سے کچھ لوگ مانتے ہیں اور کچھ نہیں مانتے تو میں تم سب کو زبردستی نہیں منوا سکتا، میرا منصب یہ نہیں ہے کہ زبردستی اللہ کے مقرر کئے ہوئے سیدھے راستے پر چلاؤں، اگر تم میں سے کچھ مانتے ہیں اور کچھ نہیں مانتے تو اس کا فیصلہ میرے بس کا نہیں کہ ماننے والوں کو جتاؤں اور نہ ماننے والوں کو نیچا دکھاؤں یہ فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، میں نہ ماننے والوں کو اس کے غضب سے ڈراتا ہوں، اس سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں وہ جو فیصلہ کرتا ہے اس کو فوراً جاری بھی کر دیتا ہے کوئی اس کو روکنے والا نہیں، اب میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں کہ اسی پر فیصلہ چھوڑوں اور کہہ دوں کہ بس ٹھہرو تم بھی فیصلہ کا انتظار کرو میں بھی کرتا ہوں۔

قوم کا جواب

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ

کہا سرداروں نے جو بڑے بنتے تھے میں سے قوم اسکی البتہ نکال دیں گے ہم تجھ کو اے شعیب!

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ

اور ان کو جو ایمان لائے ساتھ تیرے سے بستی اپنی یا آ ناپڑے گا تم کو میں دین ہمارے

قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ

کہا کیا اگرچہ ہوں ہم بیزار (۸۸) تحقیق باندھا ہم نے پر اللہ جھوٹ اگر

عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ

لوٹے ہم میں دین تمہارے بعد اس کے کہ نجات دی ہم کو اللہ نے سے اس

بامحاورہ ترجمہ: اس کی قوم میں جو متکبر سردار تھے بولے، اے شعیب! ہم تجھ کو اور ان کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے اپنے شہر سے ضرور نکال دیں گے یا یہ کہ تم ہمارے دین میں آ جاؤ، بولے کیا اگر ہم تمہارے

دین کو ناپسند کرنے والے ہوں (پھر بھی اس میں لوٹ آئیں)۔(۸۸) اگر ہم تمہارے دین میں لوٹ آئیں اس کے بعد کہ اللہ ہم کو اس سے نجات دے چکا تو بیشک ہم نے اللہ پر جھوٹا بہتان باندھا۔

تفسیر

انسان کے اندر ایک اکڑ پائی جاتی ہے جو اس کو دوسرے کی بات ماننے سے روک دیتی ہے اسے ضد کہتے ہیں جس سے بہت سے لوگ اپنا نقصان کر لیتے ہیں شیطان اس کو آدمی کے گمراہ کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہے اس خصلت کا اثر یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی نہیں مانتا بلکہ اپنی ضد پر قائم رہنا چاہتا ہے؛ اسی لئے جب کسی بات پر انسان بگڑ جائے تو نصیحت کرنے والوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے، انسان کو شیطان ہر وقت بہکاتا ہے کہ تو ٹھیک ہے اور تجھے سمجھانے والے غلط ہیں، دیکھئے! مدین کے ضدی سرداروں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو کیا جواب دیا۔

اس آیت میں ارشاد ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے مغرور سرداروں نے حضرت شعیب علیہ السلام کی نصیحت سن کر ان سے کہا کہ اگر زیادہ بڑھ بڑھ کر بولو گے تو ہم تجھے اور تیرے ماننے والوں کو اپنی بستی سے نکال کر باہر کریں گے یا تجھے زبردستی اپنے طریقے پر لا کر چھوڑیں گے، حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا کہ یہ باتیں جنہیں تم نے اختیار کر رکھا ہے ہم اپنے لئے زہر سمجھتے ہیں تو کیا تم ہمیں زبردستی زہر کا پیالہ پلاؤ گے اگرچہ ہم اس سے بیزار ہوں۔

تمہارے اندر جو بری باتیں اور عادتیں پھیلی ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان سے بچا رکھا ہے تمہارا دین اور طریقہ جان بوجھ کر اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم جو کچھ اب تک تم سے نصیحت کی باتیں کرتے رہے وہ غلط تھیں اور ہم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی باتیں کہہ کر گویا اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھا، توبہ توبہ اس کا کبھی خیال بھی نہ کرنا، انسان کے اندر یہ غرور اور اپنی بڑائی کا گمان جس کی وجہ سے وہ پیغمبروں کی نصیحت کو ٹھکرا دیتا ہے، یہی کفر اور بے ایمانی کی اصل جڑ ہے، اسلام اس خصلت کا بالکل الٹ ہے اس کے معنیٰ ہیں نصیحت ماننے کیلئے ہر وقت تیار رہنا اور یہی ایمان کی جڑ ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی اور برے کاموں سے منع کرتے تھے، لوگوں کو تکلیف پہنچانے اور لوٹ مار کرنے سے روکتے تھے مگر قوم کو آپ کی یہ تبلیغ پسند نہ تھی؛ اس لئے قوم کے بڑے بڑے سرداروں نے کہا کہ آپ ہمیں تبلیغ کرنے اور برے کاموں سے روکنے سے باز آجائیں اور جس طرح ہم کرتے ہیں آپ بھی کرنے لگ جائیں، دین کے نام پر ان غلط کاموں کو قبول کرلیں ورنہ ہم آپ کو اپنے شہر سے نکال دیں گے۔

اس قسم کا سلوک صرف حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ ہی نہیں ہوا بلکہ ہر پیغمبر کے ساتھ اس کی قوم اسی طرح کرتی رہی ہے حتیٰ کہ پیغمبر علیہم السلام کی زندگی میں ایک موقع ایسا بھی آتا رہا ہے جب وہ اپنا ملک اور شہر چھوڑنے پر مجبور ہوگئے، خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا جب آپ پر پہلی بار وحی اتری اور آپ نے اس کا واقعہ اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ان کے بھائی ورقہ بن نوفل کے سامنے بیان کیا تو اس نے آپ کی بات سن کر یہی کہا تھا کاش! میں اس وقت جوان ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تعجب سے پوچھا کیا یہ لوگ مجھے مکہ سے نکال دیں گے؟ آخر میں ان کے ساتھ کون سا برا سلوک کرتا ہوں کہ یہ لوگ مجھے برداشت نہیں کریں گے، ورقہ بن نوفل پہلی کتابوں کا عالم تھا کہنے لگا کہ جو چیز آپ نے بیان کی ہے اس کو جس نے بھی بیان کیا اس کے ساتھ دشمنی ہی کی گئی، گویا یہ تو ایک پرانی عادت ہے کہ ہر پیغمبر کے ساتھ دشمنی کی گئی۔

قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ: قوم نے حضرت شعیب علیہ السلام کو اپنے دین کی طرف آنے کی دعوت دی تو آپ نے جواب میں فرمایا: اگرچہ ہم ناپسند کرنے والے اور بیزار ہوں، تمہارے دین سے تو کیا پھر بھی ہم اس میں چلے آئیں، یعنی: ہم تو کفر و شرک سے بیزار ہیں اور تم ہمیں اس باطل دین کی طرف بلاتے ہو، ظاہر ہے کہ ہر ایمان والا گندے عقیدوں اور برے عملوں سے بیزار ہی ہوتا ہے، کفر و شرک سے بیزاری ایمان کی شرطوں میں سے ہے۔

معاملہ دوٹوک ہو گیا

وَ مَا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَآ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ
اور نہیں ہے واسطے ہمارے کہ لوٹیں ہم میں اس مگر یہ کہ چاہے اللہ رب ہمارا

وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ
گھیر رکھا ہے رب ہمارے نے ہر چیز کو علم میں پر اللہ بھروسہ کیا ہم نے اے رب ہمارے! فیصلہ کریئے

بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ﴿۸۹﴾ وَ قَالَ
درمیان ہمارے اور درمیان قوم ہماری کے ساتھ حق کے اور آپ بہترین فیصلہ کرنے والے ہیں (۸۹) اور کہا

الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ
سرداروں نے جو کافر تھے میں سے قوم اسکی اگر پیروی کی تم نے شعیب کی تو ضرور تم

اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾
اس وقت گھاٹا پانے والے ہو جاؤ گے (۹۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہمارا کام نہیں کہ ہم اس میں لوٹ آئیں مگر یہ ہمارا مالک اللہ ہی ایسا کرنا چاہے (تو وہ الگ بات ہے)، ہمارا پروردگار سب چیزوں کو اپنے علم میں گھیرے ہوئے ہے ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا، اے ہمارے رب! ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کیساتھ فیصلہ کریئے اور آپ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔(۸۹) اور اس کی قوم کے سردار جو کافر تھے بولے اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو بیشک تم گھاٹا پانے والے ہو جاؤ گے۔(۹۰)

تفسیر

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کے سرداروں کو جواب دے رہے ہیں کہ تم ہم سے کہتے ہو کہ تمہارا دین

اپنی مرضی کے خلاف اختیار کریں یہ ہم سے نہ ہوگا، اس آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام کے جواب کا باقی حصہ ارشاد ہے کہ: حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا کہ تمہارے دین کو قبول کرنا ہمارا کام نہیں اگر اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہے تو اور بات ہے ورنہ ہم سے یہ ہرگز نہ ہوگا، ہمارا رب ہر چیز کا علم رکھتا ہے ہم نے اپنا معاملہ اس کے سپرد کر دیا ہے اس کے حکم کے آگے ہمارا سر جھکا ہوا ہے، اے ہمارے رب! ہم ان لوگوں کو تیرے حکم کے مطابق سیدھے راستے کی طرف بلاتے ہیں اور یہ لوگ زبردستی اپنے ٹیڑھے راستے پر چلانا چاہتے ہیں اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے ہم دونوں فریقوں کے درمیان ایسا فیصلہ کریں کہ جو جس چیز کا مستحق ہے وہ اسے مل جائے۔

اللہ تعالیٰ قادر ہیں، جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، وہ اگر چاہیں تو کوئی شخص برے عقیدوں کی طرف لوٹ سکتا ہے ورنہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ایک دفعہ اس غلاظت سے بچالیا ہے وہ اس میں واپس جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا؛ اسی لئے دعا میں عرض کیا جاتا ہے، "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِکَ/ اے دلوں کے پلٹنے والے خدا! ہمارے دلوں کو ہمیشہ ثابت قدم رکھ"، ایسا نہ ہو کہ ہم تیری ناراضگی کا شکار ہو کر کفر و شرک کی طرف پلٹ جائیں، دعا کے یہ الفاظ بھی منقول ہیں کہ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْکَوْرِ/ اے اللہ! میں اوپر کی طرف جانے کے بعد نیچے کی طرف آنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں"، ایسا نہ ہو کہ تیری اطاعت اختیار کرنے کے بعد پھر گناہ کی طرف جائیں "اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّنَا / کا یہی مطلب ہے"، اللہ تعالیٰ ہر ایک کی استعداد، صلاحیت، نیت اور ارادے کو جانتے ہیں اور اسی کے مطابق کسی کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ایمان سب سے زیادہ پیغمبر کے دل میں جما ہوا ہوتا ہے وہ خدا پر سب سے زیادہ اعتماد رکھتے ہیں ان کے دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عظمت سے بھرپور رہتے ہیں، چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام اسی چیز کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں؛ اس لئے ہمیں امید ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیں رسوا نہیں کریں گے اور ہمارے دلوں سے ہدایت نہیں چھینیں گے۔

ایسے اچھے الفاظ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی دعا سننے کے بعد بھی انہیں ہوش نہ آیا اور وہ ضدی سردار جو کفر

پڑے ہوئے تھے ان لوگوں سے یہی بولے کہ سنو! اگر ہم نے شعیب کا کہنا نہ مانا تو یہ ہمارا سارا بنا بنایا کام بگڑ جائے گا اور ہم سب کو زبردست نقصان اٹھانا پڑے گا، خود غرضوں کے ہاتھ میں اقتدار آ جائے تو وہ اسے قائم رکھنے کیلئے عوام کے خیر خواہوں کو کچلنے اور عوام کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے کی اسی طرح اندھے، بہرے بن کر کوششیں کرتے ہیں آخر کار نصیحت کرنے والوں کا کچھ نہیں جاتا، خود غرض خود بھی تباہ ہوتے ہیں اور عوام کو بھی اپنے ساتھ لے مرتے ہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ پر بھروسے کا اعلان فرمایا، اور پھر اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کی کہ: اے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کردے یہ تو ہمیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانے اور ہمیں شہر بدر کرنے پر تلے بیٹھے ہیں، ہمارے قتل کے درپے ہیں، مولیٰ کریم! آپ ہی بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں اب آپ ہی کوئی بہتر فیصلہ فرمائیں، کیونکہ قوم تو ہماری بات ماننے کیلئے تیار نہیں، تمام پیغمبروں نے آخر میں قوم سے ناامید ہو کر اسی قسم کی دعا کی ہے۔

قوم کے سردار پہلے تو حضرت شعیب علیہ السلام سے گفتگو کر رہے تھے آپ نے ان کا دین قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تو پھر وہ ایمان لانے والوں سے کہنے لگے کہ اگر تم نے (حضرت) شعیب (علیہ السلام) کی پیروی کی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو گے، اگر تم نے اپنے باپ، دادا کا دین چھوڑ دیا اور (حضرت) شعیب (علیہ السلام) کے پیچھے لگ کر تم نے ناپ تول اور لین دین کے بارے میں (حضرت) شعیب (علیہ السلام) کی بات مان لی تو پھر تمہارا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے گا اور تم سخت گھاٹے میں پڑ جاؤ گے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی پوری کوشش کے باوجود قوم کے لوگوں نے بات نہ مانی اور چند لوگوں کے سوا اکثریت اپنی بات پر اڑے رہے بلکہ الٹا حضرت شعیب علیہ السلام کی جان کے پیچھے پڑ گئے اور کہنے لگے اے شعیب! ہم تیرے خاندان کا خیال کرتے ہیں ورنہ ہم تجھے پتھر مار مار کر ختم کر دیتے، آخر اس قوم پر خدا کے عذاب کا وقت آ گیا۔

اللہ تعالیٰ پر توکل

حضرت شعیب علیہ السلام کے اس قول میں ایک قسم کا دعویٰ تھا کہ ہم اب تمہارے مذہب میں پھر واپس نہیں ہو سکتے اور ایسا دعویٰ کرنا ظاہر میں بندگی کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں خصوصاً پیغمبروں کی شان کے لائق نہیں؛ اس لئے فرمایا کہ ہم تمہارے مذہب میں ہرگز واپس نہیں ہو سکتے سوائے اس کے کہ (خدا نخواستہ) ہمارے پروردگار ہی کا ارادہ ہماری گمراہی کا ہو جائے، ہمارے رب کو ہر چیز کا علم ہے ہم نے اسی پر بھروسہ کیا ہے۔

اس میں اپنی کمزوری کا اظہار اور اللہ تعالیٰ پر توکل ہے جو پیغمبروں کے کمالات میں سے ہے کہ ہم کیا ہیں جو کسی کام کے کرنے یا اس سے بچنے کا دعویٰ کر سکیں، کسی نیکی کا کرنا یا برائی سے بچنا سب اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے ہے جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا مفہوم یہ ہے کہ، اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو ہم کو صحیح راستہ کی ہدایت نہ ہوتی اور نہ ہم صدقہ خیرات کر پاتے نہ نماز پڑھ سکتے۔

آخر وہی ہوا جو ہونا تھا

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِيْنَ

پس پکڑ لیا ان کو زلزلہ نے پس ہو گئے میں گھروں اپنے اوندھے پڑے (۹۱) وہ جنہوں نے

كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا

جھٹلایا شعیب کو گویا نہ بسے تھے میں اس جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو

كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ

تھے وہی نقصان اٹھانے والے (۹۲) پس منہ موڑا سے ان اور کہا اے قوم میری! البتہ تحقیق پہنچا دیے میں نے تم کو

ع ۹ | رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

پیغامات رب اپنے کے اور خیرخواہی کی تمہاری پس کیوں کر افسوس کروں پر قوم کافر (۹۳)

بامحاورہ ترجمہ: پس ان کو زلزلے نے آ پکڑا پس صبح کو اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے رہ گئے۔ (۹۱) وہ لوگ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ ایسے ہو گئے جیسے کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی خراب ہوئے۔ (۹۲) پھر ان لوگوں سے منہ موڑا اور کہا اے میری قوم! میں تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا چکا اور تمہاری خیرخواہی کر چکا اب کافروں پر افسوس کیا کروں۔ (۹۳)

لفظی تحقیق: اٰسٰی: میں غمگین ہوں۔ "اٰسٰی" کے معنٰی ہیں سخت رنج، افسوس۔

تفسیر

حضرت شعیب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان کے اور میرے درمیان آپ ہی فیصلہ کرنے والے ہیں، یہ لوگ زبردستی پر اتر آئے ہیں، ادھر میرے ساتھوں کا سوا تیرے کوئی مددگار نہیں۔

ارشاد ہے کہ: آخران غافل مغرور لوگوں کو زلزلہ نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گر پڑے اور پڑے کے پڑے رہ گئے، یہ لوگ جو حضرت شعیب علیہ السلام کا بڑی اکڑفوں کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے اور ان کو اور ان کے ماننے والوں کو شہر سے نکالنے کے درپے تھے اور اپنی قوت اور زور کے سامنے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، زلزلے کے زبردست جھٹکوں سے بالکل تباہ ہو گئے اس سے تھوڑے دن پہلے زور دکھا رہے تھے اور للکار رہے تھے کہ شعیب کا کہنا نہ ماننا، نہیں تو بڑا نقصان اٹھاؤ گے آج دنیا نے دیکھ لیا کہ ان کا خیال غلط تھا ان کا کہنا نہ مان کر وہ جان و مال سب سے ہاتھ دھو بیٹھے، حضرت شعیب علیہ السلام عذاب آتا دیکھتے ہی ایمان والوں کو لے کر باہر چلے گئے اور جاتے وقت کہتے جاتے تھے کہ اے میری قوم! میں نے اپنے رب کے حکم تمہیں پہنچائے، تمہاری خیرخواہی کی، افسوس! تم نے میری ایک نہ سنی اب میں کیا کروں ایسی ضدی اور کافر قوم پر کیسے رنج و افسوس کروں؟

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر تین قسم کا عذاب آیا، زلزلے کا ذکر تو اس جگہ پر موجود ہے اس کے علاوہ

ان پر سائبان کی شکل میں عذاب آیا، "سورۂ شعراء" میں ہے کہ انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا تو ان کو سائبان کے عذاب نے پکڑلیا، سخت گرمی سے بچنے کیلیئے ان لوگوں نے تہہ خانوں کا رُخ کیا مگر وہاں بھی سکون نہ ملا، پھر آسمان پر بادل نما دھواں سا اٹھا تو لوگ اُسے بادل سمجھ کر اس کی طرف دوڑے کہ شاید بارش ہوگی، بادل کے نیچے پہنچ کر انہیں وقتی طور پر ٹھنڈک بھی محسوس ہوئی جب سب لوگ وہاں جمع ہو گئے تو بادل سے پانی کے بجائے آگ برسی جس نے سب کو جھلسا کر رکھ دیا، یہ یوم الظلہ، یعنی: سائبان والے دن کا عذاب تھا، کہتے ہیں کہ جب اس قوم پر آگ برسانے والا بادل چھایا ہوا تھا تو انہیں ایک شخص نے کہا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کا انکار نہ کرو "اے لوگو! بیشک حضرت شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، شمیر اور عمران بن شداد جن کی ترغیب پر تم پوجا کرتے ہو ان کو چھوڑ دو، مجھے یہ خطرناک بادل نظر آ رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب کوئی آدمی نہیں بچ سکے گا صرف اس وادی میں کتے ہی چلتے پھرتے نظر آئیں گے"، مگر اس شخص کی تنبیہ کے باوجود قوم نہ مانی اور آخر ان پر عذاب آ ہی گیا۔

اس قوم پر تیسرا عذاب خوفناک چیخ کی صورت میں آیا، "سورۂ ہود" میں ہے کہ ظلم کرنے والوں کو چیخ نے آ پکڑا، فرشتے کی چیخ سے ان کے دل وجگر پھٹ گئے اور وہ ہلاک ہو گئے۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر مختلف حصے ہو کر بعض پر زلزلہ آیا اور بعض بادل کے عذاب سے ہلاک کیئے گئے ہوں۔

چنانچہ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: جن لوگوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا وہ ایسے ملیامیٹ ہوئے گویا کبھی تھے ہی نہیں۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... یہاں سے یہ اصول بھی نکلتا ہے کہ کافر اور ضدی لوگوں کی تکلیف پر افسوس نہیں کرنا چاہئے۔

تباہ کرنے سے پہلے مہلت

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ
اور نہیں بھیجا ہم نے میں کسی بستی کوئی پیغمبر مگر پکڑا ہم نے لوگوں کو وہاں کے ساتھ سختی کے

وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ
اور ساتھ دُکھ کے شاید وہ عاجزی کریں (۹۴) پھر بدلی ہم نے جگہ برائی کی

الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ
بھلائی یہاں تک کہ وہ بڑھ گئے اور بولے تحقیق پہنچ چکی ہیں باپ دادا ہمارے کو تکلیف اور

السَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ﴿۹۵﴾
خوشی پھر پکڑا ہم نے ان کو اچانک اس حال میں کہ وہ نہ تھے خبر رکھنے والے (۹۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جس بستی میں ہم نے پیغمبر بھیجا ہم نے وہاں کے لوگوں کو (پیغمبر کی نافرمانی کی وجہ سے) سختی اور تکلیف میں پکڑا تا کہ وہ گڑگڑائیں۔ (۹۴) پھر ہم نے برائی کی جگہ بھلائی بدل دی یہاں تک کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے ہمارے باپ دادوں کو بھی تکلیف اور خوشی رہی ہے، پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑا اور ان کو خبر نہ تھی۔ (۹۵)

لفظی تحقیق: بَاْسَآءَ، ضَرَّآءَ، سَرَّآءَ: تینوں ایک ہی وزن کے اسم ہیں جو ترتیب وار "بَاْسٌ: سختی"، "ضَرَرٌ: دکھ" اور "سُرُوْرٌ: خوشی" سے بنے ہیں۔ عَفَوْا: بڑھ گئے۔ "عَفْوٌ" کے معنٰی بہت سے ہیں، معاف کرنا، مٹ جانا، زیادہ ہو جانا، ترقی کرنا، بڑھ جانا۔

تفسیر

اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ: جس شہر میں ہم نے پیغمبر بھیجے ہمارا دستور یہ رہا ہے کہ

پیغمبر کی نافرمانی کی وجہ سے ہم نے وہاں کے لوگوں کی بدحالی اور تکلیفوں سے پکڑ کی، مقصد یہ کہ کسی قوم یا بستی کی طرف اپنا پیغمبر بھیج کر پھر ہم انہیں اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیتے بلکہ انہیں آزماتے ہیں۔

لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ: تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائیں اور عاجزی کا اظہار کریں، جب مشکل درپیش ہوتی ہے تو عام طور پر لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوجائے اور ان کی تکلیف دور کردے اور ان کو مصیبت سے نجات دیدے۔

کسی شخص یا قوم پر تکلیف کا آجانا اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہوتی ہے تاکہ لوگ کفر اور شرک سے باز آجائیں، برائی کو چھوڑ دیں اور نیکی کو اختیار کریں، اللہ تعالیٰ کو عاجزی بڑی پسند ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ مؤمن کی حالت بڑی عجیب ہے اگر اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کیلئے بہتر ہوتا ہے اور اگر اس کو راحت پہنچتی ہے، عزت وترقی ملتی ہے، صحت عافیت حاصل ہوتی ہے، مال و دولت کی فروانی ہوجاتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے یہ حالت بھی اس کیلئے بہتر ہوتی ہے، ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ ایمان دو چیزوں میں بند ہے اس کا آدھا حصہ صبر میں ہے اور آدھا حصہ شکر میں، یہ بھی ارشاد ہے کہ مؤمن کسی وقت آزمائش سے خالی نہیں رہتا ہے یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک صاف ہوکر نکل جاتا ہے، مؤمن شخص تنگی اور آسانی دونوں حالتوں میں کامیاب ہوکر نکلتا ہے، سختی میں صبر کرتا ہے اور راحت میں شکر ادا کرتا ہے، مؤمن کا شعور صحیح ہوتا ہے وہ کبھی غرور میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ عاجزی وانکساری کرتا ہے اس کے برخلاف منافق کی مثال گدھے کی ہے اسے کچھ پتہ نہیں کہ مالک نے اسے کیوں باندھ رکھا ہے اور کیوں کھول دیا ہے اسی طرح منافق بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے تکلیف میں کیوں مبتلا کیا تھا اور راحت کیوں عطا کی، وہ ہر حالت میں اپنی ڈگر پر چلتا رہتا ہے۔

قوموں کی آزمائش کا پہلا طریقہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ ہم قوم کو تکلیف میں مبتلا کرتے ہیں تاکہ وہ عاجزی کریں اور گڑگڑائیں اب آزمائش کا دوسرا طریقہ یہ بیان کیا جارہا ہے کہ ہم برائی کو بھلائی میں بدل دیتے

ہیں، پہلے تکلیف میں مبتلا تھے پھر راحت آ گئی، پہلے بیمار تھے اب تندرست ہو گئے، پہلے مال میں تنگی تھی پھر فروانی آ گئی مطلب یہ ہے کہ ہم نے کسی شخص یا قوم کی بدحالی کو خوشحالی میں تبدیل کر دیا یہاں تک کہ وہ خوشحالی میں بڑھ گئے تو کہنے لگے کہ یہ حالات ہمارے باپ دادا پر بھی آتے رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے دنیا کے دور اس طرح چلتے رہتے ہیں، کبھی مصیبت آ گئی، کبھی راحت مل گئی، کبھی خشک سالی اور کبھی فراوانی، کبھی بیماری اور کبھی صحت، کبھی غریبی اور کبھی امیری یہ زمانے کے چکر ہیں، افسوس کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان آزمائشوں سے کوئی سبق نہ سیکھا بلکہ اسے معمولی چیز سمجھ کر اس سے گزر جاتے ہیں، دراصل یہی چیز انسان کی ناکامی کا سبب بنتی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو راحت عطا کرتے ہیں تو پھر وہ قوم دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے جو مؤمن ہوتے ہیں وہ اسے اللہ تعالیٰ کا احسان مانتے ہوئے اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور جو منافق ہوتے ہیں وہ عیش و آرام، صحت، مال و دولت پا کر تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں پھر وہ غفلت میں پڑ جاتے ہیں حتیٰ کہ خدا تعالیٰ اور آخرت کو بھی بھلا دیتے ہیں ان کا نظریہ وہی ہوتا ہے کہ ایسی تکلیفیں تو اکثر آتی رہتی ہیں ہمارے بڑوں کو بھی آئیں اس میں فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے جب کسی قوم کی یہ حالت ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے اور قوم ہمیشہ کیلئے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً: بہرحال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی اپنے پیغمبروں کو بھیجا ان لوگوں کو راحت و تنگی دونوں طریقوں سے آزمایا، پھر جب وہ اس آزمائش میں پورے نہ اترے تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا۔

بَغْتَةً: قیامت کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی اچانک ہی آئے گی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اچانک موت مؤمن کے حق میں بہتر ہے کیونکہ وہ ایمان کی حالت میں اچانک فوت ہو گیا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں چلا گیا یہ موت اس کیلئے برکت کا باعث بن جائے گی اور کافر کیلئے اچانک موت نہایت افسوس ناک ہو گی کہ وہ کوئی بات نہ کر سکا، ہو سکتا ہے کہ وقت ملتا تو وہ توبہ ہی کر لیتا مگر اسے موقع ہی نہ ملا اور وہ ہمیشہ کیلئے ناکام ہو گیا۔

ہم نے انہیں اچانک پکڑا اس حالت میں کہ وہ بے خبر تھے، ان کو عذاب کے آنے کا علم ہی نہ ہوسکا اور وہ غفلت ہی کی حالت میں ہی اپنے انجام کو پہنچ گئے، اب اگلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اصول بیان فرمائے ہیں۔

ایمان اور تقویٰ

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ

اور اگر یہ ہوتا کہ والے بستیوں ایمان لاتے اور بچتے (برائی سے) البتہ کھول دیتے ہم پر ان برکتیں

مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا

سے آسمان اور زمین اور لیکن جھٹلایا انہوں نے پس پکڑا ہم نے ان کو بدلے اسکے جو

كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

تھے وہ کمائی کرتے (۹۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر بستی والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا، پس ہم نے ان کو ان کے عملوں کے بدلے پکڑا۔ (۶)

لفظی تحقیق: بَرَكٰتٍ: نعمتیں۔ "بَرْكَةٌ" کی جمع ہے، جس کو ہم نے اردو میں "برکت" بنالیا ہے، "بَرْكَةٌ" کے معنٰی ہیں: وہ بھلائی جو ہمیشہ رہے اور وہ تھوڑی چیز جس کا فائدہ بہت زیادہ ہو، یہاں ہر قسم کی بھلائی مراد ہے۔

تفسیر

پچھلی آیتوں میں بیان ہوا کہ لوگ جب پیغمبر کے فرمان پر دھیان نہیں دیتے تو ان پر عارضی سختیاں اور مصیبتیں بھیجی جاتی ہیں اور غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ ڈر کر پیغمبروں کا کہنا مانیں اگر وہ اس سے نہیں سنورتے تو پھر ان پر عارضی نعمتوں کی بوچھاڑ کی جاتی ہے حالات کی اس تبدیلی سے جب وہ کوئی سبق نہیں سیکھتے بلکہ ٹال دیتے ہیں کہ

یہ معمولی باتیں ہیں جو ہمیشہ ہوتی چلی آئی ہیں اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی، کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں، کبھی گرمی، کبھی سردی، کبھی اندھیرا، کبھی اجالا، اللہ تعالیٰ کے ماننے اور نہ ماننے سے انہیں کیا تعلق اور ہمارے عملوں سے کیا واسطہ؟

اس آیت میں اس واسطہ کو سمجھایا گیا ہے اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ اگر سب ایمان لے آئیں اور اچھے کام کرنے لگیں، کفر وشرک اور برے کاموں سے بچنے لگیں تو ان پر آسمانی اور زمینی نعمتیں لگا تار جاری رہیں اور تھوڑی محنت سے بڑے فائدے حاصل ہوں۔

ارشاد ہے کہ اگر ان بستیوں کے لوگ پیغمبروں کا کہنا مان کر اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آتے اور بری عادتوں اور گناہوں کو چھوڑ دیتے تو ان پر آسمان سے وقت پر مناسب طریقے سے بارشیں ہوتیں، زمین بھی غلہ اور پھل اُگاتی، لیکن لوگوں نے اس کے بجائے پیغمبروں کو جھوٹا ٹھہرایا ان کے بتائے ہوئے فائدہ مند کاموں سے منہ موڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اخلاق بگڑ گئے آخر کار انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا، خواہشوں کی اندھا دھند پیروی اپنا رنگ لائی، قانون کی خلاف ورزی کا مزہ چکھنا پڑا اور اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہلاک ہوگئے۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو پہلے عارضی مصیبتیں بھیجی جاتی ہیں تا کہ لوگ ڈر کر گناہوں سے توبہ کریں اور برے کام چھوڑ کر اچھے کام کریں اگر اس سے آنکھ نہیں کھلتی اور گناہ برابر جاری رہتے ہیں تو پھر خوشحالی دے دی جاتی ہے لیکن یہ بھی عارضی ہوتی ہے اور اگر لوگ پھر بھی ناسمجھی پر تلے رہیں تو پھر ان پر اچانک کوئی بڑی آفت آتی ہے جس سے وہ برباد ہو کر رہ جاتے ہیں، اس آیت میں صاف بتا دیا گیا ہے کہ لوگوں کی بدمعاشیاں ہی ان کی تباہی کا باعث ہوتی ہیں اور اول تو وہ دنیا ہی میں تباہ ہو جاتے ہیں اور اگر یہاں کسی وجہ سے بچ بھی گئے تو مرتے ہی تو ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا ہونا ہی ہے۔

غرضیکہ دنیا و آخرت میں کامیابی کے اللہ تعالیٰ نے دو اصول بیان فرمائے ہیں: ایک ایمان اور دوسرا تقویٰ، بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اگر انسان نیکی، ایمان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں تو پھر ہم ان پر ایسی مہربانی کریں کہ رات کو بارش برسائیں اور گرج کی آواز تک لوگوں کے کانوں میں نہ پہنچے پھر دن کے وقت سورج کو

خوب روشن کردیں اور اس طرح ان کی بدحالی خوشحالی میں بدل جائے، "ترمذی شریف" کی حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اے آدم کے بیٹے! اپنے دل کو میری عبادت کیلئے فارغ کردے اگر ایسا کروگے تو میں تمہارے دل کو غنیٰ سے بھردوں گا اور تیری محتاجی کو دور کردوں گا اور اگر ایسا نہیں کروگے میری عبادت کی طرف رجوع نہیں کروگے، میرے سامنے عاجزی کا اظہار نہیں کروگے تو تمہارے دل کو فکر اور اندیشے سے بھردوں گا اور تمہاری احتیاج کو بھی بند نہیں کروں گا۔

ایمان اور تقویٰ کی اہمیت سے متعلق "سورۂ مائدہ" میں بھی گزر چکا ہے کہ اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو ہم ان کے گناہ معاف کرکے انہیں جنت میں داخل کرتے مگر انہوں نے ناشکری کی اور طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہوئے۔

ایمان اور تقویٰ کے بجائے اکثر لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو جھٹلایا، اطاعت کے بجائے نافرمانی کا راستہ اختیار کیا اور نیکی کے بجائے برائی کو اختیار کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کو ان کی ان بدعملیوں کی وجہ سے پکڑ لیا جو وہ کرتے تھے، وہ لوگ کفر، شرک اور گناہوں میں غرق تھے، لہٰذا پہلے ہم نے انہیں مہلت دی اور جب انہوں نے تنبیہ کو قبول نہ کیا تو پھر اچانک ہماری پکڑ آئی اور وہ عذاب میں مبتلا ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے انہیں نہایت ذلت ناک طریقے سے ہلاک کیا، کسی پر زلزلہ آیا، کسی پر آسمان سے آگ برسی، کوئی طوفان کا شکار ہوئے اور کسی پر پتھروں کی بارش ہوئی، اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے پانچ قوموں کا حال بیان کیا ہے تاہم باقی قوموں کیلئے بھی یہی اصول ہے جو بھی قوم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتی ہے وہ طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے اور پھر آخرت کا عذاب تو سب سے بڑھ کر ہے اور ہمیشہ کیلئے ہے۔

"برکت" کا مفہوم

برکت ایسی زیادتی کو کہتے ہیں جس میں پاکیزگی کا مفہوم پایا جائے اس پاکیزگی کی مختلف صورتیں ہیں، بعض اوقات کسی ظاہری چیز میں فی الواقع اضافہ ہوجاتا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی معجزوں کے ذکر میں آتا ہے

کہ پانی یا کھانا کم مقدار میں تھا پھر اس میں اللہ تعالیٰ نے برکت دی تو چند آدمیوں کا کھانا سینکڑوں آدمیوں نے کھایا یا تھوڑا سا پانی تھا مگر اس سے سینکڑوں جانور اور آدمی سیراب ہوئے، اس کا مشاہدہ عام طور سے کیا جاتا ہے کہ کوئی برتن کپڑا یا گھر کا سامان ایسا مبارک ہوتا ہے کہ اس سے آدمی عمر بھر راحت اٹھاتا ہے اور وہ پھر بھی قائم رہتا ہے اور بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ بناتے ہی ٹوٹ گئیں یا سالم بھی رہیں مگر ان سے نفع اٹھانے کا موقع ہاتھ نہ آیا یا نفع بھی اٹھایا لیکن پورا نفع نہ اٹھا سکے، اور یہ برکت انسان کے مال میں بھی ہوتی ہے جان میں بھی کام میں بھی اور وقت میں بھی۔

بعض اوقات تھوڑی چیز میں اللہ تعالیٰ ایسی برکت عطا کرتے ہیں کہ اس سے زیادہ سے زیادہ صحت اور توانائی حاصل ہوتی ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب کھانا کھاؤ تو برتن کو اچھی طرح صاف کرلیا کرو پھر اپنی انگلیوں کو بھی چاٹ لیا کرو کیونکہ تمہیں علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس حصہ میں برکت رکھی ہے، ہوسکتا ہے کہ پورے کھانے میں صرف انگلی کو لگنے والے حصہ میں ہی برکت ہو، سیر بھر کھانا کھانے میں وہ صحت اور طاقت نہ ہو جو اس معمولی سے حصہ میں ہو، بعض اوقات اللہ تعالیٰ معمولی سی چیز کو بڑی چیز کی بہ نسبت زیادہ بابرکت بنا دیتے ہیں۔

بسا اوقات کسی خاص وقت میں بڑی برکت ہوتی ہے کوئی انسان بارہ گھنٹے میں اتنا کام نہیں کرسکتا جتنا ایک گھنٹے میں کرلیتا ہے، بزرگان دین کے مصروفیت کے اوقات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے کم وقت میں اتنا زیادہ کام کیسے انجام دے لیتے تھے۔

بہرحال برکتیں حاصل ہونے کا دارومدار دو چیزوں پر ہے، یعنی: ایمان اور تقویٰ یہ دونوں چیزیں جس قدر پرخلوص ہوں گی اللہ تعالیٰ ان میں اتنی ہی برکت عطا فرمائیں گے۔

اس زمانے میں اپنے اردگرد نظر ماریں چیزوں کی مقدار کی کمی نہیں ہے، اناج پہلے سے کئی گنا زیادہ ہے، زندگی کی روزمرہ کی ضرورتوں کی فروانی ہے، ہر گھر میں ہر کام مشینوں کے ذریعے ہونے لگا ہے، مہینوں کا کام ہفتوں میں اور ہفتوں کا دنوں میں ہو رہا ہے، بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں ہیں جن میں سو سو مزدور کا کام

ایک ایک مشین انجام دے رہی ہے مگر اس کے باوجود ایک عام آدمی کی پریشانیوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے آخر وجہ کیا ہے؟ زندگی کی ضروریات کی بہتات کے باوجود آدمی کو سکون کیوں میسر نہیں، بات وہی ہے کہ ہر چیز سے برکت اُٹھ گئی ہے، برکت دو چیزوں سے حاصل ہوتی ہے، یعنی: ایمان اور تقویٰ، جب انسان سے یہ بنیادی چیزیں ختم ہوگئیں تو اللہ تعالیٰ نے ہر چیز سے اپنی برکت اٹھالی اب بے چینی کے سوا کچھ نہیں، ایک مزدور بھی پریشان ہے اور کروڑوں روپے میں کھیلنے والا بھی، محلوں میں رہنے والا اور دنیا کی تمام آسائشوں والا بھی بے چین اور بے سکون ہے کہ آج روپے پیسے کی خوب ریل پیل ہے پرانے زمانے میں جو کام ایک پیسہ کے ذریعے ہوجاتا تھا وہ کام آج ایک روپے میں نہیں ہوتا، نہ دلوں میں ایمان اور تقویٰ ہے اور نہ مال میں خیر و برکت ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص جھوٹی قسم اٹھا کر سودا بیچتا ہے اس پر گاہک تو اعتماد کر لیتا ہے مگر اس کی کمائی سے برکت اُٹھ جاتی ہے، ایمان اور تقویٰ ہوگا تو تھوڑی چیز میں بھی برکت ہوگی، جو چیز تھوڑی ہو مگر کفایت کر جائے وہ بہتر ہے اس سے جو زیادہ ہو مگر غفلت میں ڈال دے، آج لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، کفر و شرک اور گناہ عام ہیں، ایمان اور تقویٰ کمزور ہیں، خدا تعالیٰ کا خوف غائب ہے ہر چیز کی فروانی ہے مگر سکون نہیں ہے۔

عذاب اچانک آ سکتا ہے

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّ هُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۹۷﴾

کیا پس نڈر ہوگئے والے بستیوں کہ آئے ان پر غضب ہمارا راتوں رات حالانکہ وہ سو رہے ہوں (۹۷)

اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّ هُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾

یا کیا نڈر ہوگئے والے بستیوں کہ آئے ان پر عذاب ہمارا دن چڑھے حالانکہ وہ کھیل رہے ہوں (۹۸)

ع ۱۲ ۲ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾

کیا پس نڈر ہوگئے پکڑ سے اللہ کی پس نہیں بےخوف ہوتے پکڑ سے اللہ کی مگر وہ لوگ جو اپنا نقصان کرنے والے ہیں (۹۹)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اب کیا بستیوں والے اس سے نڈر ہیں کہ ان پر ہماری آفت راتوں رات آ پہنچے جب وہ سوتے ہوں۔(۹۷) یا بستیوں والے اس بات سے نڈر ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آ پہنچے جب وہ کھیلتے ہوں۔(۹۸) کیا اللہ کے داؤ سے نڈر ہو گئے،سو اللہ کے داؤ سے خرابی میں پڑنے والے نڈر ہوتے ہیں۔(۹۹)

لفظی تحقیق: **مَكْرٌ**: یہ لفظ پہلے "آل عمران" میں گزر چکا ہے، مخالف کی تدبیروں کے توڑ میں تدبیریں کرنا، دشمن کو بے خبری میں دبوچنے کی تیاری کرنا اسی کو داؤ کہتے ہیں۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے یہ بات بھلا دیتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا پورا علم ہے اور اس کو ہر طرح کی قدرت حاصل ہے تو اس کی پکڑ سے نڈر ہو کر بیٹھے رہنے کی وجہ کوئی نہیں، کوئی اس بات سے کیونکر بے خوف ہوسکتا ہے کہ رات سوتے میں اچانک کوئی آفت آ پڑے یا جاگتے میں جب سورج خوب روشن ہو اور لوگ اپنے کھیل کود عیش و راحت میں مست اور دنیاوی کاروبار میں مصروف ہوں ایک دم کوئی مصیبت آ دبوچے، جو لوگ غفلت کی وجہ سے بے خوف ہو جاتے ہیں سراسر غلط فہمی میں مبتلا ہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک پورے خبردار اور زبردست حکم کی بے دھڑک خلاف ورزی کی جائے جب اس کے قبضے میں سب کچھ ہے تو اپنے خلاف چلنے والوں کو سزا دینے کی تدبیر اس کے پاس ضرور ہوگی۔

اس رکوع میں ان سب قوموں کے حالات پر تبصرہ ہے جن کا اوپر بیان ہوا، ان کے پاس پیغمبر بھیجے گئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ دلانے کیلئے ان پر مصیبتیں بھیجی گئیں تاکہ ڈر کر اس کی نافرمانی سے باز آ جائیں، ان کو نعمتیں دی گئیں تاکہ شاید وہ انہی کے ذریعے سیدھے راستے پر آ جائیں اور اللہ تعالیٰ کو اپنا مہربان آقا سمجھ کر اس کی شکرگزاری اور عبادت میں مصروف ہو جائیں لیکن انہوں نے نہ مصیبتوں سے سبق لیا نہ نعمتوں کو کچھ جانا، پیغمبروں

نے جب ادھر توجہ دلائی کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہورہا ہے؛ اس لئے اس پر ایمان لانے سے تمہاری حالت آرام واطمینان کی ہوجائے گی، جان لیوا مصیبتوں سے چھوٹ جاؤ گے تو اس پر بولے کہ یہ دنیا کا دستور ہے، ہمارے باپ دادا پر اسی طرح کبھی مصیبت، کبھی راحت کی گھڑیاں گزریں اسی طرح ہم پر گزر رہی ہیں ہم کیا بچے ہیں کہ ہمیں کبھی ڈرا کر کبھی سبز باغ دکھا کر خواہ مخواہ ایک بات منوائی جارہی ہے آخر ان نادانوں کو ان کی بے وقوفی لے ڈوبی اس سے موجودہ انسانوں کو سبق لینا چاہئے اور پیغمبروں کی نصیحت کو دل وجان سے قبول کرنا چاہئے۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بے خوف ہوجانا کبیرہ گناہ ہے؛ اسی لئے امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے بزرگان دین فرماتے ہیں کہ ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے، یعنی: انسان کو اللہ تعالیٰ کی پکڑ کا ڈر بھی ہونا چاہئے اور اس کی رحمت کی اُمید بھی اگر وہ مایوس ہوگیا تو خدا کی رحمت سے دور ہوگیا اور اگر نڈر ہوگیا تو پھر بھی تباہ ہوگیا۔

مسئلہ (۲):.... مؤمن آدمی نیک عمل بھی انجام دیتا ہے اور ساتھ خدا تعالیٰ سے ڈرتا بھی رہتا ہے، قرآن پاک میں "مُشْفِقُوْنَ" کا لفظ بھی آتا ہے مطلب یہ ہے کہ ہر وقت خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہئے کہ شاید کوئی کوتاہی ہوگئی ہو اور یہ کہ خدا تعالیٰ ناراض نہ ہوجائے، منافق قسم کے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو برائی بھی کرتے ہیں مگر بے خوف بھی ہوتے ہیں انہیں نہ کوئی فکر ہوتی ہے اور نہ اندیشہ۔

مسئلہ (۳):.... ایک حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ جب مؤمن سے گناہ ہوتا ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس کے سر پر پہاڑ آگرا ہے اور منافق بڑے سے بڑا گناہ بھی کرتا ہے تو ایسے محسوس کرتا ہے جیسے: ناک پر مکھی بیٹھ گئی ہو، بس یوں کیا اور اڑ گئی اسے گناہ کا اتنا بھی خوف نہیں ہوتا جتنا مکھی کے بیٹھنے کا، یہ منافقوں کی حالت ہے۔

پہلوں کی حالتوں سے پچھلے سبق سیکھیں

اَوَ لَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ

کیا نہیں دکھایا ان لوگوں کو جو وارث ہوئے زمین کے سے پیچھے رہنے والوں اسکے کے کہ اگر

نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا

ہم چاہتے تو مصیبت ڈالتے ان پر بدلے گناہوں انکے کے اور مہر کرتے ہیں ہم پر دلوں ان کے پس وہ نہیں

يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَ لَقَدْ

سنتے (۱۰۰) یہ بستیاں ہیں کہ بیان کرتے ہیں ہم پر آپ کچھ خبریں ان کی اور یقیناً

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا

آئے پاس انکے پیغمبر انکے ساتھ نشانیوں کی پس نہ تھے وہ کہ ایمان لاتے پر اس جیسے جھٹلایا

مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

سے پہلے اسی طرح مہر کرتا ہے اللہ پر دلوں کافروں کے (۱۰۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ زمین والوں کے (مرجانے کے بعد) کیا ان لوگوں کو جو زمین کے مالک ہوئے ہیں یہ بات ہدایت کا سبب نہیں بنی کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے گناہوں کے سبب ان پر مصیبت ڈال دیں گے اور ان کے دلوں پر مہر لگادیں گے کہ کچھ سن ہی نہ سکیں۔(۱۰۰) یہ بستیاں ہیں کہ ہم آپ کو ان کے کچھ حالات سناتے ہیں اور بیشک ان کے پاس پیغمبر نشانیاں لے کر پہنچ چکے، پھر ہرگز آمادہ نہ ہوئے اس بات پر کہ جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے اس چیز پر ایمان لائیں، اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کردیتے ہیں۔(۱۰۱)

تفسیر

پچھلی آیتوں میں بیان ہوتا چلا آرہا ہے کہ جب زمین کے مختلف حصوں کے بسنے والوں کے حالات

خراب ہوئے تو ان کی رہنمائی کیلئے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے، انہوں نے انہیں سمجھایا کہ جو کام تم کر رہے ہو تمہیں تباہی کی طرف لے جارہے ہیں، تمہارے پیدا کرنے والے نے تمہارے سمجھانے کیلئے ہمیں اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، ہمارا چال چلن تم سے مختلف ہے اور ہمیں حکم ملا ہے کہ تمہیں بھی اسی راستہ پر چلنا سکھائیں جس پر ہم چل رہے ہیں۔

ارشاد ہے کہ پچھلے نافرمانوں کی تباہی کیا موجودہ لوگوں کو اتنی بات نہیں سمجھاتی کہ اللہ تعالیٰ انہی کی طرح ان کو بھی ان کی بدعملیوں اور ان کے گناہوں کی وجہ سے تباہ و برباد کر سکتا ہے اگر یہ اتنا نہیں سمجھتے تو ظاہر ہے کہ ان کے دلوں میں سوا اپنی بیہودہ باتوں کے کسی بات کی گنجائش نہیں جس کی ظاہری شکل ان کی ضد اور ڈھٹائی ہے جو ان کو صحیح بات سننے سے روکتی ہے، اے ہمارے پیغمبر (محمد)! ہم نے پچھلے لوگوں کی بستیوں کے کچھ حالات آپ کو سنا دیئے ہیں ان کے پاس ان کے پیغمبر اپنی سچائی کی کھلی نشانیاں لے کر آئے مگر ان کی بات انہوں نے اپنے دلوں میں نہ بٹھائی، پیغمبروں نے لاکھ سمجھایا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے ان میں سننے سمجھنے کی طاقت موجود تھی وہ بہرے یا پاگل نہ تھے لیکن ان کی ضد نے ان کا بیڑا غرق کر دیا، کافروں کے دلوں پر اللہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی مہر لگا دیتا ہے اور وہ ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

پچھلے لوگوں کے حالات بیان کر کے موجودہ لوگوں کو عبرت دلانا مقصود ہے کہ دیکھو! ان لوگوں نے کس طرح خدا تعالیٰ کے حکموں کی نافرمانی کی، پیغمبروں کو جھٹلایا اور اپنی ضد پر اڑے رہے تو اللہ تعالیٰ نے تباہ و برباد کر دیا، لہٰذا تم بھی ان کے پیچھے نہ چلنا ورنہ تمہارا انجام بھی ان سے مختلف نہیں ہوگا۔

زمین کا وارث بنانے سے مراد یہ ہے کہ جن مکانوں میں پہلے لوگ رہتے تھے اور جس زمین پر کھیتی باڑی اور کاروبار کرتے تھے اس پر ہم نے تمہیں اختیار دے دیا گویا تم ہی ان کے وارث بنے ہو، یہ تو عام بات ہے کہ اگلا گرا تو پچھلا ہوشیار ہو گیا کہ جو غلطی کر کے یہ گرا ہے اس کو میں نہ دہراؤں گا مگر عام طور پر ذہنیت یہی رہی ہے کہ انہوں نے پہلی قوموں کے حالات سے کوئی سبق نہیں سیکھا، چاہئے تو یہ تھا کہ پیچھے آنے والے اس بات پر غور کرتے کہ پہلوں کی تباہی کی کیا وجہ تھی تاکہ اس سے بچ جاتے مگر تاریخ گواہ ہے کہ پچھلے بھی اگلوں کی راہ پر ہی اسی

طرح تباہی کے گڑھے میں گرے جس طرح پہلے گرے تھے۔

وَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ: اگر ہم چاہیں تو گناہوں کی وجہ سے انہیں مصیبت میں مبتلا کر دیں اور سزا کے طور پر ان کے دلوں پر مہر لگا دیں، پس وہ لوگ نہیں سنتے، اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ پہلے گناہ پر ہی دل پر ٹھپہ نہیں لگتا بلکہ کوئی انسان جوں جوں برائی اختیار کرتا جاتا ہے اس کا دل سیاہ ہوتا جاتا ہے اور پھر آخر میں اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں اس کی صلاحیت اور استعداد ہی ختم ہو جاتی ہے، پھر اس کے نزدیک نیکی اور برائی میں کوئی تمیز نہیں رہتی اور برائیوں میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، "سورۂ بقرہ" کی ابتداء میں بھی فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور اب ان کیلئے بہت بڑا عذاب ہے جب کسی کے دل پر ٹھپہ لگ جاتا ہے تو وہ دل سخت ہو جاتا ہے جو کہ بہت ہی خطرناک بیماری ہے، "سورۂ بقرہ" ہی میں بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا: پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، پھر یہ پتھر یا اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے اب ایسے دل میں نیکی کی کوئی بات داخل نہیں ہو سکتی اور آدمی ہلاک ہو جاتا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: اللہ تعالیٰ سے دور رہنے والی چیزوں میں سب سے دور وہ دل ہے جو سخت ہے، اللہ تعالیٰ سے دوری کا مطلب کوئی فاصلے کی دوری نہیں بلکہ انسان کے دل پر غفلت کے موٹے پردے پڑ جاتے ہیں اور انسان اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور توحید کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے، دل کو سختی سے بچانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے یہ نسخہ بیان فرمایا ہے اسی سورۃ میں ہے کہ اے لوگو! اپنے رب کو صبح و شام اپنے دل میں گڑگڑاتے ہوئے اور اس سے ڈرتے ہوئے پست آواز سے یاد کرتے رہو اور دیکھو اس سے غافل نہ ہونا۔

وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ: ہم آپ پر ان کی کچھ باتیں بیان کرتے ہیں، تمام کے تمام حالات نہیں بلکہ ان کے بعض حالات بیان کرتے ہیں، دوسری جگہ آتا ہے کہ ان میں سے بعض واقعات ایسے ہیں جو ہم نے بیان نہیں کیے، ویسے مختصراً فرما دیا کہ ہم نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے، مگر اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی تفصیل ذکر نہیں فرمائی کہ ہر ایک کے ساتھ کس قسم کے حالات پیش آئے، البتہ اتنی بات

واضح کردی کہ اللہ تعالیٰ کے ہر پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنی امت تک پہنچایا اور انہیں پوری پوری نصیحت کردی مگر اکثر لوگوں نے تسلیم نہیں کیا، "عاد و ثمود" جیسی قوموں کے کھنڈرات سے ان کی تہذیب کا کچھ پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قسم کے لوگ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے مختصراً بتادیا کہ ہمارے پیغمبر ہمارا پیغام لے کر ان قوموں کی طرف آئے، "بینة" کا معنیٰ معجزہ، دلیل، خود پیغمبر کی ذات مبارک اور اللہ تعالیٰ کے احکامات مراد ہوتے ہیں، یہاں اس سے مراد دلیل ہے، اس آیت سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ معجزے تمام نبیوں اور رسولوں کو عطا فرمائے گئے ہیں جن میں سے بعض پیغمبروں کے معجزوں کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے بہت سوں کا نہیں آیا اس سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوسکتا کہ جن کے معجزات کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا ان سے کوئی معجزہ ثابت ہی نہیں۔

ہمارے پیغمبران کے پاس واضح باتیں لے کر آئے وہ لوگ اس چیز پر ایمان لانے والے نہیں تھے جسے وہ پہلے جھٹلا چکے تھے، جب اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہلی دفعہ پہنچایا اور امت نے نہ مانا تو پھر جتنی بھی دلیلیں پیش کیں ان لوگوں نے نہ مانا، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ ہمیں واپس دنیا میں لوٹا دیا جائے ہم نیکی اختیار کریں گے مگر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اگر ان کو واپس لوٹا دیا جائے تو پھر بھی وہی کچھ کریں گے جن سے انہیں منع کیا گیا تھا، یہ ضدی لوگ ہیں، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ واپس جا کر یہ کیا کریں گے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیتے ہیں، ان کی ضد، اور ہٹ دھرمی کی بنا پر ان کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔

فرعون کا حال

وَ مَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَ اِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ

اور نہیں | پایا ہم نے | اکثر میں سے ان | کوئی | عہد کا پاس | اور | حقیقت میں پایا ہم نے | اکثر ان کے

لَفٰسِقِيْنَ ۝۱۰۲ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ
کھلے بدکار (۱۰۲) پھر بھیجا ہم نے سے بعد انکے موسیٰ کو ساتھ نشانیوں اپنی کے طرف فرعون کی

وَ مَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۱۰۳
اور سرداروں اسکے کے پس انکار کیا ان کا پس دیکھئے کیسا ہوا انجام فسادیوں کا (۱۰۳)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور ان کے اکثر لوگوں میں ہم نے عہد کا نباہ نہ پایا اور اکثر ان میں نافرمان پائے۔ (۱۰۲) پھر ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا، پس انہوں نے ان (نشانیوں) کے مقابلہ میں کفر کیا، سو! دیکھئے کہ فسادیوں کا کیا انجام ہوا؟ (۱۰۳)

لفظی تحقیق: ظَلَمُوْا: انہوں نے ظلم کیا۔ ''ظلم'' کے معنیٰ ہیں کسی کا حق ادا نہ کرنا، جیسا سلوک کسی کے ساتھ کرنا چاہیئے وہ نہ کرنا، یہاں مطلب یہ ہے کہ ان آیتوں کا حق یہ تھا کہ انہیں سچا اور ٹھیک مانا جانا، نہ مانا گیا تو ان کے ساتھ ظلم ہوا۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ جن نافرمانوں کا اب تک ذکر ہوا ان میں دو باتیں مشترک تھیں اور انہی کی شامت سے وہ پیغمبروں کی ہدایت سے فائدہ نہ اٹھا سکے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان میں اکثر کو بدعہدی میں مبتلا پایا اور اکثر ایسے تھے کہ گناہ اور نافرمانی کرنے میں بے باک تھے، مفسرین نے عہد سے ''عہد الست'' مراد لیا ہے جس کا ذکر اسی سورۃ میں آگے آئے گا، ''عہد الست'' سے مراد وہ عہد ہے جو ہر انسان کی روح اپنے رب سے پیدائش کے پہلے کر چکی ہے کہ دنیا میں وہ اس کے فرمان پر چلے گی یا اس آیت میں وہ عہد مراد ہے جو نافرمان لوگ سزا ملنے پر اپنے پیغمبر سے کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس عذاب سے ہمیں نجات دیں تو ہم آئندہ اس کی نافرمانی کبھی نہ کریں گے، اور جب عذاب ٹل جاتا تو اپنا قول بھول کر یا جان بوجھ کر توڑ دیتے تھے، لیکن آیت کا مفہوم عام ہے

اور اس میں ہر شخص جو دنیا میں اپنے قول وقرار کا پابند نہ ہو داخل ہے، اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ بداخلاقی اور جرائم پیشہ ہونے کی جڑ یہ ہے کہ آدمی اپنے قول وقرار کا پابند نہ ہو، آگے ارشاد ہے کہ اب فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا جاتا ہے، فرعون نے اور اس کے لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا جو ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھیجی تھیں پھر دیکھ لو ان کا کیا حشر ہوا آخر تباہ وبرباد ہوئے۔

وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ: فاسقوں، یعنی: نافرمانوں کی تین قسمیں ہیں۔ جن میں سے کسی نہ کسی قسم میں اکثر لوگ مبتلا ہوتے ہیں، پہلی قسم کا نافرمان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے حکموں کا کھلم کھلا انکار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو جھوٹا کہتا ہے ایسا آدمی کافر ہوتا ہے، دوسرا فاسق وہ ہے جو زبان سے تو تسلیم کرتا ہے مگر دل سے انکار کرتا ہے، اس کو عام اصطلاح میں اعتقادی منافق کہتے ہیں اور یہ بھی فاسق ہے، تیسرا فاسق وہ ہے جو دل وزبان سے اقرار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ایک جاننے اور ایک ماننے، اس کے پیغمبروں کی پیغمبری، آسمانی کتابوں اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے مگر عمل نہیں کرتا یہ عملی منافق ہے اور آج ایسے لوگوں سے دنیا بھری پڑی ہے، اعتقادی منافق کی نسبت عملی منافقوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، ہر چیز کو مانتے ہوئے اس پر عمل نہیں کرتے، نماز کے فرض ہونے کو تسلیم کرتے ہیں مگر پڑھتے نہیں، عدل کو ضروری سمجھتے ہیں مگر کرتے نہیں، زبان سے اقرار کرتے ہیں اور دل سے رسموں کو برا سمجھتے ہیں مگر ایسے مجبور ہیں کہ ان کو انجام بھی دیئے جا رہے ہیں تو یہ تینوں قسم کے لوگ فاسق ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ ہم نے ان میں سے اکثریت کو فاسق (نافرمان) پایا۔

ان کے بعد یعنی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کے یا ان کی قوموں کے بعد ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیتیں دے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا، آیتوں سے مراد "تورات" کی آیتیں بھی ہو سکتی ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی۔

پھر فرمایا کہ: دیکھو تو سہی کہ پھر ان فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا، مراد یہ ہے کہ ان کے حالات اور برے انجام پر غور کرو اور عبرت حاصل کرو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ
اور کہا موسیٰ نے اے فرعون! بیشک میں پیغمبر ہوں طرف سے پروردگار جہان کے (۱۰۴) جما ہوا

عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ
اس پر کہ نہ کہوں میں اوپر اللہ کے مگر سچ بات تحقیق آیا ہوں میں پاس تمہارے ساتھ کھلی نشانیوں کے

مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ؕ
طرف سے رب تمہارے کی پس بھیج تو ساتھ میرے بنی اسرائیل کو (۱۰۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور موسیٰ نے کہا، اے فرعون! میں جہانوں کے رب کی طرف سے پیغمبر ہوں۔ (۱۰۴) میں اس بات پر قائم ہوں کہ اللہ کی طرف سے سچ بات کے سوا کچھ نہ کہوں، میں تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانیاں لایا ہوں سو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔ (۱۰۵)

لفظی تحقیق: حَقِيْقٌ: جما ہوا، قائم۔ یہ حق سے بنا ہے حق کے معنیٰ: قریب قریب وہی ہیں جو حقیقت کے ہیں، ٹھیک، سچی بات، سزاوار، لائق، اپنی جگہ استوار، قائم اور جمی ہوئی چیز یا بات، یہاں ترجمہ میں پچھلے معنیٰ مراد لئے گئے ہیں، یعنی: اس میں اس بات سے ہٹ نہیں سکتا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام جوں کا توں پہنچا دوں، بناوٹ اور نفع کو ذرا دخل نہ دوں۔

تفسیر

اس سورۃ میں اب تک پچھلے پیغمبروں میں سے حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر ہوا یہ لوگ اپنی قوم میں سے خاص خاص برائیاں دور کرنے کیلئے آئے تھے اور چونکہ ان برائیوں کی جڑ یہ تھی کہ لوگ اصلی رب کو بھول گئے تھے؛ اس لئے توحید کی ضروری تعلیم

دینے کے بعد انہوں نے اپنی توجہ اس خاص برائی کے دور کرنے میں صرف کی جوان کی قوم میں جڑ پکڑ چکی تھی، یہ قومیں اپنے اپنے پیغمبر کا حکم نہ ماننے کی وجہ سے ایک ایک کر کے تباہ و برباد ہوئیں، انہی پیغمبروں کے زمرے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام اپنی قوم کو فرعون کے ظلم وستم سے بچانا تھا، پہلے پیغمبروں کی طرح آپ کا حکم نہ ماننے والے بھی تباہ و برباد ہوئے اور آپ اپنی قوم بنی اسرائیل کو ان کے پنجے سے چھڑانے میں کامیاب ہوئے۔

اس آیت سے ان واقعات کا بیان شروع ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے مقابلہ کے وقت پیش آئے، ارشاد ہے کہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر فرعون کے پاس آئے اور کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے اس کے پیغام کو ٹھیک ٹھیک تم تک پہنچا دینا میرا کام ہے اس میں میری طرف سے کوئی غلطی یا ملاوٹ نہ ہوگی، میرے پاس اپنے پیغمبر ہونے کی صاف صاف دلیلیں موجود ہیں جن کے بعد میری سچائی میں ذرا بھی شبہ باقی نہ رہنا چاہئے، اے فرعون! بنی اسرائیل پر جو ظلم وستم تو نے توڑ رکھے ہیں انہیں چھوڑ اور انہیں میرے ساتھ روانہ کر تا کہ میں ان کو ان کے اصلی وطن میں لے جا کر بساؤں اور ان کو اپنے رب کے حکم کے مطابق رہنا سکھاؤں۔

دوسری جگہ پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کو فرعون کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ خوف نہ کھاؤ، میں تمہارے ساتھ ہوں، انہوں نے کہا ہم دونوں تیرے رب کے پیغمبر ہیں، یہاں پر صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ انہوں نے فرعون سے اپنا تعارف کر کے یہ بھی فرمایا کہ میں اس بات کے لائق ہوں کہ اللہ تعالیٰ پر حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔

قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ: "بَيِّنَة" یعنی: نشانی سے مراد دین، شریعت، ایمان اور معجزہ وغیرہ مراد ہے، آگے کی آیت میں دو معجزوں کا ذکر آرہا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس لے کر گئے تھے۔

بنی اسرائیل قبطیوں کے پنجے میں کیسے آگئے تھے؟

حضرت یوسف علیہ السلام کا اصل وطن تو فلسطین تھا مگر مصر میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اقتدار بخشا، اس زمانے میں آپ کے خاندان کے ستر یا بہتر افراد تھے جنہیں حضرت یوسف علیہ السلام سے تعلق کی بنا پر بڑی عزت

حاصل تھی تاہم آپ کے بعد وہاں کے مقامی قبطی لوگ ہی برسر اقتدار آئے اور انہوں نے آہستہ آہستہ بنی اسرائیلوں کو غلام بنالیا اور انہیں سخت تکلیفوں میں مبتلا کر دیا اس دوران کئی صدیاں گزر گئیں، ان کی تعداد بڑھتی رہی، چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر راتوں رات مصر سے نکلے تو اس وقت تک ان کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار افراد تک پہنچ چکی تھی، اصلاً یہ لوگ ایک خدا کے جاننے اور ماننے والے تھے اور مصر کے مقامی لوگ مشرک تھے، مذہبی اختلاف کی بناء پر بھی بنی اسرائیل قبطیوں کے ظلم کا شکار بنے ہوئے تھے اور دوسری بات یہ ہوئی کہ کسی نجومی نے فرعون کو اس بات کی خبر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ ایسا پیدا ہونے والا ہے جو بڑے ہو کر تیری سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا، چنانچہ فرعون نے اسرائیلی بچوں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جس کا ذکر "سورۂ بقرہ" اور دوسری سورتوں میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے احسانوں کو یاد کراتے ہوئے فرمایا: "اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعون کی قوم سے نجات دی وہ تمہیں سخت تکلیفوں میں مبتلا کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور تمہاری بچیوں کو زندہ رکھتے تھے"، بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

کہا اگر تو لایا ہے کوئی نشانی تو لا اس کو اگر تو ہے میں سے سچوں (۱۰۶)

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ

پس ڈالی انہوں نے لاٹھی اپنی پس اچانک وہ اژدھا تھا کھلم کھلا (۱۰۷) اور نکالا انہوں نے ہاتھ اپنا پس اچانک وہ

۱۳ ع ۹ ۴ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

چمک دار تھا واسطے دیکھنے والوں کے (۱۰۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ کہا اگر تو کوئی نشانی لیکر آیا ہے تو اس کو لا اگر تو سچا ہے۔(۱۰۶) تب ڈال دی انہوں نے اپنی لاٹھی تو اسی وقت وہ کھلم کھلا اژدھا بن گیا۔(۱۰۷) اور نکالا اپنا ہاتھ تو وہ دیکھنے والوں کو اسی وقت چمکدار نظر آنے لگا۔(۱۰۸)

تفسیر

فرعون اپنی قوت پر بہت ہی بھروسہ کرتا تھا اس کے پاگل پن کو دور کرنے کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے معجزے دیئے گئے تھے کہ جن سے اللہ تعالیٰ کی شان و بڑائی ظاہر ہو، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پہلے ہی پیغام میں کہہ دیا کہ میرے پاس اپنی سچائی پر ایسی نشانیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر اے فرعون! تجھے خود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے بے بس و لاچار ماننا پڑے گا، فرعون کے پاس ظاہری طاقتیں موجود تھیں ملک کی ساری دولت پر اس کا قبضہ تھا، لوگ اس کی پوجا کرتے تھے اس کے حکم پر بے سوچ سمجھے چلتے تھے، ملک میں پیداوار کی فراوانی تھی، دریا تھے نہریں تھیں یہ سب چیزیں اپنے قبضہ میں دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مجھ سے بڑھ کر کوئی اور بھی طاقتور ہوسکتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ تجھ سے زیادہ طاقت ور اللہ تعالیٰ ہیں جو سارے جہان کے پروردگار ہیں، فرعون نے کہا، اچھا تیرے پاس اس کی کوئی نشانی موجود ہے تو لا پیش کر ہم بھی دیکھیں کہ وہ کیسی نشانی ہے۔

ارشاد ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتیں سن کر کہا کہ اگر تیرے پاس سچ مچ کوئی نشانی ہے تو دکھا تاکہ تیرا جھوٹ، سچ معلوم ہوجائے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے ہی یہ طریقہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا تھا انہوں نے فوراً اپنے ہاتھ کی لاٹھی زمین پر ڈال دی لاٹھی زمین پر گرتے ہی ایک بڑا اژدھا بن گیا اور پھنکارنے لگا اور لوگوں کی طرف لپکنے لگا، لکھا ہے کہ یہ دیکھتے ہی دیکھتے فرعون کی طرف بڑھا اور ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ بغل کے نیچے رکھ کر باہر نکالا وہ سورج کی طرح چمکنے لگا یہاں تک کہ فرعون کی اور دوسرے حاضرین کی نگاہیں چکا چوند ہوگئیں

اور آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

اژدھے کیلئے یہاں پر "ثُعْبَانٌ" کا لفظ ذکر ہے جبکہ دوسری بعض جگہوں پر "جان" یعنی: چھوٹے سانپ کا ذکر آتا ہے، لاٹھی کے سانپ بننے کا واقعہ کئی موقعوں پر پیش آیا ضرورت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی سے بڑا اژدھا بن جاتا اور کبھی چھوٹا، جب حضرت، موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں کے ساتھ کھلم کھلا مقابلہ ہوا اور جادوگروں نے رسیوں کے سانپ بنا ڈالے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی سے بہت بڑا اژدھا بن گیا جو تمام سانپوں کو نگل گیا، لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی جس میں کئی آدمی ہلاک ہو گئے خود فرعون پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ اسہال شروع ہو گئے۔

اس لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی ایسا واقعہ نہ تھا کہ کسی اندھیرے یا پردے میں واقع ہوا ہو جس کو کوئی دیکھے کوئی نہ دیکھے، جیسے: عموماً شعبدہ بازوں یا جادوگروں کا طرز ہوتا ہے بلکہ یہ واقعہ بھرے دربار میں سب کے سامنے پیش آیا۔

بعض تاریخی روایتوں میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اس اژدھا نے فرعون کی طرف منہ پھیلایا تو گھبرا کر شاہی تخت سے کود کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پناہ لی اور دربار کے ہزاروں آدمی دہشت سے مر گئے۔

لاٹھی کا سچ مچ سانپ بن جانا کوئی ناممکن یا محال چیز نہیں، ہاں عام طور طریقے کے خلاف ہونے کی وجہ سے حیرت انگیز اور تعجب کے قابل ضرور ہے اور معجزہ وکرامت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ جو کام عام آدمی نہ کر سکیں وہ پیغمبروں کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کر کے دکھایا جاتا ہے تاکہ عوام سمجھ لیں کہ ان کے ساتھ کوئی خدائی طاقت کام کر رہی ہے؛ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی تعجب اور انکار کے قابل نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوسری نشانی پیش کی کہ آپ نے اپنا ہاتھ اپنی بغل میں ڈال کر باہر

نکالا پس اچانک وہ دیکھنے والوں کیلئے سفید تھا، آپ کا ہاتھ اتنا روشن تھا کہ اس نے زمین و آسمانی فضا کو روشن کر دیا، دوسری جگہ یہ الفاظ آتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس سفیدی میں کوئی خرابی نہیں تھی، بعض اوقات برص کی بیماری کی وجہ سے انسانی جسم کے بعض حصے سفید ہو جاتے ہیں ایسا نہیں تھا بلکہ آپ کے ہاتھ میں نورانیت تھی اور وہ سورج کی طرح چمکتا تھا۔

جادوگر

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُرِيْدُ

کہا سرداروں نے سے قوم فرعون کی ضرور یہ کوئی جادوگر ماہر ہے(۱۰۹) چاہتا ہے

اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ

کہ نکال دے تم کو سے زمین تمہاری پس کیا مشورہ دیتے ہو تم (۱۱۰) بولے ڈھیل دے اسکو

وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ

اور بھائی اسکے کو اور بھیج میں شہروں جمع کرنے والے(۱۱۱) لائیں پاس تیرے ہر

سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

جادوگر ماہر کو لیکر(۱۱۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ فرعون کی قوم کے سردار بولے یہ تو کوئی بڑا ماہر جادوگر ہے۔(۱۰۹) چاہتا ہے کہ نکال دے تم کو تمہارے ملک سے اب تمہاری کیا صلاح ہے۔(۱۱۰) بولے! اس کو اور اس کے بھائی کو ڈھیل دے اور شہروں میں جمع کرنے والوں کو بھیج۔(۱۱۱) کہ تیرے پاس جو ماہر جادوگر ہیں ان کو جمع کر لائیں۔(۱۱۲)

لفظی تحقیق: اَرْجِهْ: مہلت دے اس کو۔ "اِرْجَاءٌ" کے معنٰی امید دلانا، متوقع کرنا، یہاں اس کے مراد ہے کچھ مدت کیلئے چھوڑ دینا۔ سٰحِرٌ: جادوگر۔ "سحر" جادو کو کہتے ہیں "سحر" کی حقیقت اتنی ہے کہ آدمی اپنے

خیال کو کسی چیز پر جمالیتا ہے جب اس کو خوب مشق ہو جاتی ہے تو وہ اپنے خیال کا اثر دوسروں کے خیال پر ڈال دیتا ہے اور وہ بھی وہی خیال کرنے لگتے ہیں جو وہ خیال کرنے لگتا ہے ایسے آدمی کو "سٰحِرٌ" کہتے ہیں "سٰحِرٌ عَلِيْمٌ" وہ ہے جو اس مشق میں پختہ ہو چکا ہو، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے دیکھ کر لوگ کہنے لگے کہ یہ بڑا بھاری جادوگر معلوم ہوتا ہے۔

تفسیر

ارشاد ہے: فرعون کے بڑے درباریوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو دیکھ کر فرعون سے کہا کہ ایسے ناٹک جادوگر دکھایا کرتے ہیں، موسیٰ ایک بہت بڑا ماہر فن جادوگر معلوم ہوتا ہے بہتر یہ ہے کہ موسیٰ اور اس کے بھائی کو ابھی کچھ دن کیلئے یونہی چھوڑ دیا جائے اور ان سے کچھ نہ کہا جائے اور اپنے معتبر آدمیوں کو ادھر ادھر ملک کے ہر حصے میں روانہ کیا جائے کہ وہ ہر جگہ سے ڈھونڈ کر بڑے بڑے ماہر جادوگروں کو اس دربار میں جمع کر دیں تا کہ وہ سب مل کر موسیٰ کے جادو کا زور توڑ کر رکھ دیں۔

فرعون کو اپنے درباریوں کی رائے ٹھیک معلوم ہوئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو جادو کا ایک ڈھکوسلا قرار دیا، فرعون اور اس کے درباریوں کی نادانی نے انہیں معاملہ کی تہ کو نہ پہنچنے دیا اور اپنی بات کو ثابت کر دکھانے اور مقابل کو ہرا دینے کی دھن کے سوا ضدی آدمی اور کچھ کر ہی نہیں سکتا اور یہی بربادی کے کرتوت ہیں۔

فرعون کی قوم کے سرداروں نے معجزوں کو جادو کہہ دیا انہوں نے نہ تو حقیقت کو دیکھا اور نہ انصاف سے کام لیا اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو جادوگر کہہ دیا، اس کے بعد لوگوں کو بدظن کرنے کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگایا کہ یہ تمہیں زمین سے نکال دینا چاہتا ہے، لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں سے بدظن کرنے کیلئے جابر قسم کے لوگوں کا ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے کہ وہ پیغمبروں کے خلاف اقتدار پر قبضہ کرنے کا جھوٹا پراپگینڈہ کرتے ہیں کہ دیکھو! اگر اس شخص کی بات مان لی تو یہ تمہیں ملک بدر کر دے گا اور خود تمہارے علاقے پر قبضہ کر لے گا، اس ملک

کے اصل مالک تم ہو، تمہاری حکومت ہے، تمہیں یہاں اقتدار حاصل ہے مگر یہ شخص اپنا اقتدار چاہتا ہے، لہٰذا اس سے خبردار رہنا اور اس کی باتوں میں نہ آنا، ہر پیغمبر کے بارے میں یہی پراپگینڈہ کیا گیا، مکہ کے مشرک بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر کہتے تھے، چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا معجزہ دیکھا تو کہنے لگے اس شخص نے جادو کر دیا ہے، فرعون اور اس کے درباریوں نے بھی یہی جھوٹے پراپگینڈے کا ہتھیار استعمال کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کو جادو اور آپ کو جادوگر کہا۔

پیغمبر کے بھیجنے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ایک جاننے اور ماننے اور اس کی عبادت کی دعوت دیں گویا بندوں کو اللہ تعالیٰ کی پہچان کرائیں، پیغمبروں کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ بیہودہ رسموں کو مٹائیں اور لوگوں کے درمیان ظلم و زیادتی کو ختم کریں، اللہ تعالیٰ کی پہچان کے بعد شریعت کے نافذ کرنے اور دوسرے کاموں کیلئے جماعت کی ضرورت ہوتی ہے جو معاشرتی نظام بھی درست کرتی ہے اور جہاد کا فرض بھی انجام دیتی ہے مگر پیغمبر کا مقصد صرف اقتدار نہیں بلکہ پوری قسم کی اصلاح مقصود ہوتی ہے؛ اسی لئے پیغمبروں کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبروں کے پورے سلسلے میں صرف چند ایک ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیغمبری کے ساتھ ساتھ زمین میں بادشاہت بھی عطا فرمائی ورنہ اکثر پیغمبروں کا مقصد اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچانے اور لوگوں کی اصلاح تک محدود رہا اور اگر کوئی بادشاہ حق دین کو قبول کر لے اس پر عمل کرنے لگے تو پھر پیغمبر کو حکومت کے تخت پر بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ طالوت اور حضرت داؤد علیہ السلام کے قصہ سے واضح ہے۔

جس طرح آج کل سائنس اور ٹیکنالوجی کو بڑا عروج حاصل ہے قدیم زمانے میں نجومیوں اور جادوگروں کی بڑی قدر و منزلت تھی جس طرح موجودہ زمانے میں مختلف کاموں میں فنی ماہرین کے مشورے کے بغیر حکومت کوئی کام شروع نہیں کرتی اس زمانے میں حکومت میں جادوگروں کا بڑا عمل دخل ہوتا تھا، حکمران ہر کام میں ان سے مشورہ لیتے تھے، چنانچہ فرعون کے دربار میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ زیر بحث آیا تو درباریوں نے

یہی مشورہ دیا کہ ہمارے ملک میں بڑے بڑے قابل جادوگر موجود ہیں انہیں اکٹھا کر کے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانا چاہئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادو کا کھیل دکھایا ہے تو اس کا مقابلہ ماہر جادوگر ہی کر سکتے ہیں، چنانچہ حکومت کے کارندے مختلف شہروں میں بھیجے گئے اور جادوگروں کو بلایا گیا، بڑے بڑے جادوگر دور دراز علاقوں سے اپنے ساز و سامان کے ساتھ اکٹھے ہو گئے ان کی تعداد کے متعلق مفسرین کی مختلف رائے ہیں بعض نے بیس ہزار، بعض نے نوے ہزار حتیٰ کہ تین لاکھ کی تعداد بھی روایتوں میں آتی ہے تاہم جادوگروں کی کم از کم تعداد امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی ہے وہ پندرہ ہزار ہے، ان جادوگروں کے کرتب کا سامان کم و بیش تین سو اونٹوں پر لاد کر لایا گیا۔

پیغمبروں کو کس مناسبت سے کون کون سے معجزے دیئے گئے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لاٹھی کے اژدھا بننے اور ہاتھ کے روشن ہونے کا معجزہ اسی لئے عطا فرمایا کہ جادوگروں سے مقابلہ ہو اور معجزہ کے مقابلہ میں جادو کی رسوائی سب لوگ آنکھوں سے دیکھ لیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ ہر زمانہ کے پیغمبر کو اس زمانہ کے مناسب معجزے عطا فرماتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یونانی حکمت اور یونانی طب اپنے عروج پر تھی تو ان کو معجزہ یہ دیا گیا کہ پیدائشی اندھوں کو بینا بنا دیں اور جذامی کوڑھیوں کو تندرست کر دیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب کا سب سے بڑا کمال فصاحت و بلاغت تھا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم بنایا گیا جس کے مقابلہ سے سارا عرب و عجم عاجز ہو گیا۔

جادوگر آدھمکے

وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ

اور آئے | جادوگر | فرعون کے پاس | بولے | ضرور لئے ہمارے صلہ ہے | اگر | ہوئے | ہم

الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى

جیتنے والے (۱۱۳) | کہا | ہاں! | اور | تم ضرور | میں سے | مقربوں (۱۱۴) | بولے | اے موسیٰ!

اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا

یا یہ کہ تو ڈالے اور یا کہ ہوں ہم ڈالنے والے (۱۱۵) کہا تم ڈالو

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور فرعون کے پاس جادوگر آئے بولے اگر ہم غالب ہوئے تو ہمارے لئے کچھ انعام ہے۔ (۱۱۳) بولا ہاں! اور تم بیشک مقرب ہو جاؤ گے۔ (۱۱۴) بولے اے موسیٰ! یا تو تو ڈال اور یا ہم ڈالتے ہیں۔ (۱۱۵) (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے) کہا تم ڈالو۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ لوگ ہر طرف سے پرانے تجربہ کار جادوگروں کو فرعون کے پاس گھیر لائے اور انہوں نے آتے ہی فرعون سے پہلی بات یہ کہی کہ آپ کی عنایت سے جیتیں گے، آپ مہربانی فرما کر ہمارے انعام واکرام کا اور محنت کے معاوضہ کا جو ہمیں ملنا چاہئے ابھی سے مقرر فرمادیں تاکہ ہمارا دل بڑھ جائے اور ہم سرتوڑ کوشش کریں، فرعون نے کہا کہ ہاں! ہاں! ضرور تمہیں بڑا معاوضہ اور انعام ملے گا اور ساتھ ہی تم میرے خاص مقربوں اور منتخب لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے، جادوگر خوش ہو گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منہ کر کے کہا بولو تم پہلے اپنا کرتب دکھاتے ہو یا ہم دکھائیں، انسان اپنی بات کے آگے دوسرے کی نہیں سنتا وہ کہتا ہے کہ میرے پاس کس چیز کی کمی ہے جو میں دوسرے کو خواہ مخواہ پانے سے بڑا مانوں یہ ضد ان لوگوں میں ہوتی ہے جن کے پاس اتفاق سے بہت ساز و سامان لاؤ لشکر جمع ہو جاتا ہے اور کم درجے کے پست لوگ ان کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے رہنے کو اپنی عزت کا ذریعہ سمجھنے لگتے ہیں اس وقت جہاں تک ہو سکتا ہے یہ لوگ ہمیشہ اپنا ہی اقتدار قائم رکھنے کی دُھن میں لگ جاتے ہیں اور اپنے عزت و مرتبہ کا مقابلہ کرنے والے کو جس طرح ہو سکے پست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فرعون اور اس کے سرداروں کے قصے میں ایسے لوگوں کیلئے سراسر عبرت کا سامان جمع ہے ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ان کے سامان اور دولت سے بھی بڑھ کر کوئی ایسی قوت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ظاہر ہوتی ہے جو ان کے

سارے کھیل کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

جادوگروں نے فرعون کے پاس آ کر جو یہ کہا کہ اگر ہم جیت گئے تو کیا ہمارے لئے انعام ہوگا؟ اس سے پیغمبر اور جادوگر میں فرق صاف سمجھ آتا ہے کہ جادوگر خودغرض اور مفاد پرست ہوتے ہیں وہ جو کام کرتے ہیں پیسے کی خاطر کرتے ہیں ان جادوگروں نے بھی کہ ہم دور دراز سے سفر کر کے آئے ہیں، تکلیفیں برداشت کی ہیں، وقت دیا ہے سفر کی مشقتیں اور اخراجات برداشت کیئے ہیں ہمیں ہماری محنت کا کچھ معاوضہ بھی ملے گا یا نہیں؟ ادھر اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہے جو کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے "سورۂ ہود" میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں "سورۂ اعراف" میں تمہاری بہتری چاہتا ہوں یہ دو ذہنوں کا فرق ہے جادوگروں کو شک تھا کہ کہیں فرعون صرف مفت میں ہی ہم سے کام نہ لے لے، لہٰذا انہوں نے اجرت کا مطالبہ پہلے کر دیا ادھر اللہ تعالیٰ کا سچا پیغمبر ہے جو بلا معاوضہ لوگوں کی خیر خواہی کا حق ادا کر رہا ہے۔

"سورۂ طٰہٰ" میں آتا ہے اس مقابلے کیلیئے دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا لاکھوں آدمی میدان میں اکٹھے ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کو پہلے وار کرنے کی دعوت دی۔

بعض روایتوں میں ہے کہ اس موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کے سردار سے گفتگو فرمائی کہ اگر میں تم پر غالب آ گیا تو کیا تم مجھ پر ایمان لے آؤ گے؟ اس نے کہا ہمارے پاس ایسے جادو ہیں کہ ان پر کوئی غالب آ ہی نہیں سکتا؛ اس لئے ہمارے مغلوب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوسکتا اور اگر بالفرض تم غالب آ گئے تو ہم علی الاعلان فرعون کی نظروں کے سامنے تم پر ایمان لے آئیں گے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ: "اِلْقَاءٌ" کے معنیٰ ڈالنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جب مقابلہ کے میدان میں پہنچے تو جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ یا تو آپ پہلے ڈالیں یا ہم پہلے ڈالنے والوں میں سے ہو جائیں، جادوگروں کا یہ کہنا اپنے بے فکری اور بڑائی جتانے کیلیئے تھا کہ ہمیں اس کی پرواہ نہیں کہ ابتداء ہماری طرف سے ہو کیونکہ ہم ہر حالت میں اپنے فن پر اطمینان رکھتے ہیں ان کے اس بیان کے انداز سے محسوس ہوتا ہے کہ چاہتے تو یہی تھے کہ پہلا وار ان کا ہو مگر قوت ظاہر کرنے کیلیئے حضرت

موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا کہ پہل آپ کرنا چاہتے ہو یا ہم کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی مرضی کو محسوس کر کے اپنے معجزہ پر مکمل اطمینان ہونے کے سبب پہلا موقعہ ان کو دے دیا اور فرمایا کہ تم ہی پہلے ڈالو، اور "ابن کثیر" نے فرمایا کہ: جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ادب واحترام کا معاملہ کیا کہ پہلا موقعہ ان کو دینے کی پیش کش کی اسی کا یہ اثر تھا کہ ان کو ایمان کی توفیق ہوگئی۔

جادو کا پول کھل گیا

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ

پس جب ڈالا انہوں نے باندھ دیں نظریں لوگوں کی اور ڈرادیا ان کو اور لائے

بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا

جادو بڑا (۱۱۶) اور دل میں ڈالا ہم نے طرف موسیٰ کے کہ ڈال دے لاٹھی اپنی پس اچانک

هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا

وہ نگلنے لگا جو انہوں نے بنایا تھا (۱۱۷) پس کھل گیا حق اور بگڑ گیا جو کچھ انہوں نے

يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

بنایا تھا (۱۱۸) پس مغلوب ہوگئے وہیں اور لوٹ گئے ذلیل (۱۱۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر جب انہوں نے ڈالا لوگوں کی آنکھوں کو باندھ دیا اور ان کو ڈرادیا اور بڑا جادو لائے۔(۱۱۶) اور ہم نے موسیٰ کو حکم بھیجا کہ اپنی لاٹھی ڈال دے سو وہ جبھی نگلنے لگا جو (جادو سے) انہوں نے بنایا تھا۔(۱۱۷) پس ظاہر ہو گیا حق اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا غلط ہو گیا۔(۱۱۸) پس اس جگہ ہار گئے اور (فرعون اور اس کے درباری) ذلیل ہو کر لوٹ گئے۔(۱۱۹)

تفسیر

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں سے کہا کہ پہلے تم نے جو کچھ ڈالنا ہے ڈالو، جادوگروں نے اپنے بانس، بلیاں (چھوٹی راڈ)، لکڑیاں وغیرہ زمین پر ڈال کر پھیلا دیں تھوڑی دیر میں وہ سانپ اور اژدہوں کی طرح دوڑتے نظر آنے لگے جیسا کہ اس سورۃ میں بیان ہے۔

ارشاد ہے کہ: جادوگروں نے اپنی چیزیں جو وہ ساتھ لائے تھے زمین پر ڈال دیں اور پھر لوگوں کی آنکھوں پر ایسا جادو کیا کہ ان کو وہ سب چیزیں دوڑتے ہوئے سانپ نظر آنے لگیں، لوگ ڈر کے مارے کانپنے لگے، حقیقت میں یہ جادو کا ایک بڑا کرشمہ تھا جو بغیر خیال جمانے کی اتنی مشق کے کہ جس سے دوسروں کے خیالوں کو اپنے خیال سے متاثر کیا جاسکے دکھایا نہیں جاسکتا لیکن یہ سب انسانی خیال کے فریب تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس خیالی باتوں کا کیا کام وہ تو انسانی خیال و وہم بلکہ عقل سے کہیں بالاتر تمام چیزوں کے پیدا کرنے والے اور ان میں جیسے چاہے تصرف کرنے والے مالک کی بے انتہاء قوت اور قدرت کا ظہور تھا جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی زمین پر گرتے ہی سچ مچ اژدھا بن جاتی ہے، وہاں انسانی خیال کے پر جلتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے موسیٰ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ اب آپ اپنی لاٹھی زمین پر پھینک دیں، لاٹھی کا ڈالنا تھا کہ اس نے اژدھا بن کر جادوگروں کی رسیوں اور ٹکڑیوں کو نگلنا شروع کردیا یہاں سے وہاں تک میدان صاف ہوگیا جادو کے فریب سب غائب ہوگئے جادوگروں کا بنا بنایا کھیل آناً فاناً بگڑ گیا سب کے سر شرمندگی اور خوف و ہراس سے جھک گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جیت ہوئی اور جادوگر بری طرح ہار گئے، فرعون اور اس کے درباری ایسے ذلیل ہوئے کہ کہیں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہی۔

فرعون کے جادوگروں کے جادو کی حقیقت

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا جادو ایک قسم کی نظر بندی اور خیال سازی تھی جس سے دیکھنے

والوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہے ہیں حالانکہ وہ واقع میں اسی طرح لاٹھیاں اور رسیاں ہی تھیں سانپ نہیں بنے تھے یہ ایک قسم کا مسمر یزم تھا جس کا اثر انسانی خیال اور نظر کو مغلوب کر دیتا ہے۔

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جادو صرف اسی قسم میں منحصر ہے کہ جادو کے ذریعے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل سکتی ایسا نہیں ہے، کیونکہ کوئی شرعی یا عقلی دلیل اس کی نفی پر قائم نہیں ہے بلکہ جادو کی مختلف قسمیں واقعات سے ثابت ہیں کہیں تو صرف ہاتھ کی چالاکی ہوتی ہے جس کے ذریعہ دیکھنے والوں کو مغالطہ لگ جاتا ہے کہیں صرف خیال سازی اور نظر بندی ہوتی ہے، جیسے: مسمر یزم سے اور اگر کہیں حقیقت بدل جاتی ہو کہ انسان کا گدھا یا بیل بن جانا تو یہ بھی کسی شرعی یا عقلی دلیل کے خلاف نہیں۔

جادوگر اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے

وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ

اور ڈال دیئے گئے جادوگر سجدہ کرنے والے (۱۲۰) بولے ہم ایمان لائے پالنے والے پر جہانوں کے (۱۲۱) یعنی رب پر

مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ

موسیٰ اور ہارون کے (۱۲۲) کہا فرعون نے ایمان لے آئے تم پر اس پہلے اسکے کہ اجازت دوں میں

لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ

تم کو تحقیق یہ ضرور ایک چال ہے جو تم نے چلی ہے میں اس شہر تاکہ تم نکال دو میں سے اس

اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

رہنے والوں اسکے کو پس عنقریب جان لوگے تم (۱۲۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جادوگر سجدہ میں گر پڑے۔ (۱۲۰) بولے: ہم جہانوں کے رب پر ایمان

لائے۔(۱۲۱) جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا۔(۱۲۲) فرعون بولا، کیا تم اس پر میری اجازت سے پہلے ایمان لے آئے، یہ تو سازش ہے جو تم سب نے اس شہر میں بنائی ہے تا کہ تم اس شہر سے اس کے رہنے والوں کو نکال دو، سو اب تم کو معلوم ہو جائے گا۔(۱۲۳)

تفسیر

جب جادوگروں نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی زمین پر پڑتے ہی اژدھا بن کر ان رسیوں اور لکڑیوں کو نگل گئی تو انہیں یقین ہو گیا کہ یقیناً یہ دونوں بھائی ٹھیک کہتے ہیں کہ اس دنیا کا قائم رکھنے والا اور پالنے والا ایک رب العالمین ہے اور وہی ہمارا رب ہے اسی کی قدرت میں ہر چیز ہے قوت اور طاقت میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، انہوں نے دیکھا کہ فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کھلم کھلا شکست دے دی اور وہ بیٹھا دیکھتا رہا اور ان کی کچھ بھی مدد نہ کر سکا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں، فوراً سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور کہا ہم رب العالمین پر ایمان لائے، جسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اپنا رب کہتے ہیں اور فرعون سے منہ موڑا، فرعون دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا کہ اس کے تابعدار بندے اس سے منہ موڑ گئے، بولا، یہ کیا میری اجازت کے بغیر ایمان لانے کے کیا معنیٰ؟ ضرور تم نے موسیٰ سے پہلے ہی ساز باز کر رکھی تھی کہ یہ جو فرعون نے اکھاڑا جمایا ہے اس میں ہم بھرے مجمع میں تجھ سے ہار جائیں گے اور کھلم کھلا تیرے ساتھ مل کر فرعون اور اس کے ماننے والوں کو باہر نکال دیں گے اور تجھے اپنا بادشاہ بنا کے خود تیرے معزز درباری اور عہدہ دار ہو جائیں گے خیر! جاتے کہاں ہو ابھی ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا میں طاقتور رہوں یا موسیٰ کا رب طاقتور ہے۔

دنیا میں جو اقتدار مال و دولت اور شان و شوکت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ دوسرا جو کچھ کر رہا ہے وہ صرف اس لئے کہ ہمیں ہٹا کر خود ان چیزوں پر قبضہ کر لے، ان کے نزدیک حق و صداقت کوئی چیز نہیں کہ جس کیلئے کوئی کچھ کرے سچ ہے کہ نگاہ کا دنیا سے اونچا اٹھانا ہمت والوں ہی کیلئے ممکن ہے۔

اس مقابلے کا اثر

ان سے پہلی آیتوں میں ذکر تھا کہ فرعون نے اپنی قوم کے سرداروں کے مشورہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کیلئے جن جادوگروں کو پورے ملک سے جمع کیا تھا وہ مقابلہ کے میدان میں ہار گئے اور صرف یہی نہیں کہ اپنی ہار مان لی بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔

تاریخی روایتوں میں ہے کہ جادوگروں کے سردار مسلمان ہو گئے تو ان کو دیکھ کر فرعون کی قوم کے چھ لاکھ آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور اعلان کر دیا۔

اس مقابلہ اور مناظرہ سے پہلے تو صرف دو حضرات موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے مخالف تھے اس وقت سب سے بڑے جادوگر جو قوم میں اقتدار کے مالک تھے اور ان کے ساتھ چھ لاکھ عوام مسلمان ہو کر ایک بہت بڑی طاقت مقابلہ پر آ گئی۔

اس وقت فرعون کی پریشانی بے جا نہ تھی مگر اس نے اس کو چھپا کر ایک چالاک ہوشیار سیاست دان کے انداز میں پہلے تو جادوگروں پر یہ باغیانہ الزام لگایا کہ تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خفیہ سازش کر کے یہ کام اپنے ملک و ملت کو نقصان پہنچانے کیلئے کیا ہے، یعنی: یہ ایک سازش ہے جو تم نے مقابلہ کے میدان میں آنے سے پہلے شہر کے اندر آپس میں کر رکھی تھی اور پھر جادوگروں کو خطاب کر کے کہا کیا تم نے میری اجازت سے پہلے ہی ایمان قبول کر لیا فرعون کا یہ سوال ڈانٹنے اور غم و غصہ کے اظہار کیلئے تھا اور اپنی اجازت سے پہلے ایمان لانے کا ذکر کر کے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ ہم خود بھی یہی چاہتے تھے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حق پر ہونا واضح ہو جائے تو ہم بھی ان کو مانیں گے اور لوگوں کو بھی اجازت دیں گے کہ وہ مسلمان ہو جائیں لیکن تم لوگوں نے جلد بازی کی اور حقیقت کو سوچے سمجھے بغیر ایک سازش کا شکار ہو گئے۔

اس کی چالاکی سے ایک طرف تو لوگوں کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ اور جادوگروں کے ایمان

قبول کرنے کو ایک سازش قرار دے کر ان کو قدیم گمراہی میں مبتلا رکھنے کا انتظام کیا اور دوسری طرف سیاسی چالا کی یہ کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عمل اور جادوگروں کا اسلام جو خالص فرعون کی گمراہی کو کھولنے کیلئے تھا قوم اور عوام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اس کو ایک ملکی اور سیاسی مسئلہ بنانے کیلئے کہا تم لوگوں نے یہ سازش اس لئے کی ہے کہ تم چاہتے ہو کہ مصر پر تم غالب آ جاؤ اور اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو، ان چالاکیوں کے بعد ان سب پر اپنی ہیبت اور حکومت کا رعب وخوف جمانے کیلئے جادوگروں کو دھمکیاں دینی شروع کیں، اوّل تو مبہم انداز میں کہا، یعنی: تم ابھی دیکھ لوگے کہ تمہاری اس سازش کا کیا انجام ہوتا ہے اس کے بعد اس کو واضح کر کے بتلایا جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

صبر کی دُعا

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ

البتہ ضرور کاٹوں گا میں ہاتھ تمہارے اور پاؤں تمہارے سے الٹی جانب پھر میں ضرور سولی چڑھاؤں گا تم کو

اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّآ

سب کو (۱۲۴) وہ بولے ضرور ہم طرف اپنے رب کی لوٹ جانے والے ہیں (۱۲۵) اور نہیں دشمنی کرتا تو سے ہم

اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا

مگر اسی لئے کہ ایمان لائے ہم نشانیوں پر رب اپنے کی جب آئیں وہ ہم تک اے رب ہمارے! انڈیل دے پر ہم صبر

وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ ع ۱۴ ۱۸ ۴

اور وفات دے ہمیں مسلمان ہونے کی حالت میں (۱۲۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ میں ضرور کاٹوں گا تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں، پھر تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔ (۱۲۴) وہ بولے ہم کو تو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہی ہے۔ (۱۲۵) اور تیری ہم سے یہی دشمنی ہے کہ ہم نے اپنے رب کی نشانیوں کو مان لیا جب وہ ہم تک پہنچیں اے ہمارے رب! ہم پر صبر کے دہانے کھول

دے اور ہم کو مسلمان ہونے کی حالت میں وفات دے۔(۱۲۶)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ فرعون نے جادوگروں سے مخاطب ہوکر کہا کہ تم سب کے پہلے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا اور پھر تم سب کو سولی چڑھاؤں گا، جادوگروں نے کہا کہ ہم سب اپنے رب کی طرف جاکر ہی رہیں گے، مرنا سب کو ہے تیرے ہی ہاتھ سے موت آتی ہے تو یوں ہی سہی، یہ تیری سزا تھوڑی دیر اذیت اور دکھ دے گی، اس کے بعد جب جان نکل گئی تو پھر چین ہی چین ہے مرے گا تو بھی لیکن تیرے لئے مر کر چین نہیں؛ اس لئے تجھے جو کرنا ہے کرلے ہم بالکل بے گناہ ہیں تو ہم پر صرف اس لئے غضب ناک ہورہا ہے کہ ہم نے اپنے رب کی کھلی نشانیاں دیکھ کر جو ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اس نے دکھائیں اس پر ایمان لائے، کوئی معقول آدمی سچائی کو دیکھ کر اس کے ماننے بغیر نہیں رہ سکتا اس بات میں برا ماننے کی کوئی وجہ نہیں نہ تجھے اس پر بگڑنے کا کوئی حق ہے لیکن اگر تو ظلم پر ہی تلا ہوا ہے تو تُو جان، ہم تو اپنے رب سے دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں ہمت اور صبر دے تاکہ یہ تھوڑی دیر کی اذیت جھیلنی ہمارے اوپر آسان ہوجائے، اے ہمارے رب! ہماری التجا اب یہ ہے کہ ہم پر صبر کے دروازے کھول دے تاکہ ہمارے قدم آپکی راہ سے نہ ڈگمگائے اور ہم تجھے دل سے اپنا رب مانتے ہوئے اور آپکی فرمانبرداری کا اقرار کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوں، دُکھ اور درد کی وجہ سے ہمارے ایمان میں خلل نہ آئے اور ہم آپکے فرمانبردار ہوکر آپکے دربار میں حاضر ہوں۔

ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ: پھر تم سب کو سولی پر چڑھادوں گا تاکہ لوگوں کو دیکھ کر عبرت ہوکہ ملک کے غداروں کا یہ حشر ہوتا ہے، محدثین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ عبرت کیلئے اس قسم کی سزا کو مشہور کرنا ہماری شریعت میں بھی جائز ہے، کسی مجرم کو چوراہے پر سولی پر چڑھا کر کچھ دن تک لٹکتا چھوڑ دیا جائے یا چور کا ہاتھ

کاٹ کر ہفتہ بھر کیلئے اس کے گلے میں لٹکا دیا جائے تا کہ وہ جہاں جائے لوگوں کو عبرت ہو کہ مجرم کو اس طرح سزا دی جاتی ہے اسی طرح قصاص میں قتل کرنے کی سزا بھی کھلم کھلا دی جاتی ہے تا کہ لوگ دیکھ کر عبرت پکڑیں۔

فرعون کی اس دھمکی کا جادوگروں پر کچھ اثر نہ ہوا کیونکہ وہ تو ایمان کی دولت سے مالا مال ہو چکے تھے وہ اس قسم کی سزاؤں سے بے نیاز تھے انہیں علم تھا کہ اگر وہ قتل کر دیئے گئے تو بہر حال اپنے رب کے ساتھ ملاقات کریں گے۔

وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا: ہم معجزوں کو دیکھ کر ان کی حقیقت کو پہچان گئے ہیں،، لہٰذا ہم ایمان لائے ہیں، سوائے اس کے ہمارا قصور کیا ہے، ہماری نہ کسی سے دشمنی ہے نہ کسی کا مال چھینا ہے اور نہ کسی کو بے آبرو کیا ہے، آخر ہمیں کس جرم کی سزا دی جائے گی؟

اس قسم کے الفاظ بعض دوسری قوموں کے متعلق بھی قرآن پاک میں آئے ہیں، مثلاً: جب ”اصحاب الاخدود“ کو آگ میں ڈالا گیا تو انہوں نے بھی یہی کہا تھا اس کے سوا ان کا کیا قصور تھا کہ وہ اللہ پر ایمان لائے تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوّلین ساتھی جو عام طور پر غریب اور کمزور لوگ تھے وہ بھی مشکلات برداشت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارا اس کے سوا کیا جرم ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں جو ہمارا رب ہے، ایمان تو کمال درجے کی چیز ہے جسے تم جرم سمجھ کر سزا دیتے ہو، بہر حال جادوگر بھی مکمل ایمان والے ہو چکے تھے جو کہ اولیاء اللہ کا درجہ ہے، اللہ تعالیٰ کے بندے ہر آزمائش کو برداشت کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں اور یہی پختہ ارادہ ان جادوگروں کا بھی تھا جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے رب پر سچے دل سے ایمان لا چکے تھے، جب جادوگروں کو یقین ہو گیا کہ فرعون انہیں سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑے گا تو انہوں نے ایمان پر قائم رہنے اور مصیبتوں پر صبر کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):..... پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کیا کرو، سلامتی چاہو

اور آزمائش کی خواہش کبھی نہ کرو اور جب تم کسی مصیبت میں ڈال دیے جاؤ تو صبر کرو۔

ایمان والوں کو دبانے کی تدبیر

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا

اور کہا سرداروں نے میں سے قوم فرعون کی کیا تو چھوڑے گا موسیٰ اور قوم اسکی کو کہ فساد کریں وہ

فِي الْاَرْضِ وَ يَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ

میں زمین اور چھوڑ دیں تجھ کو اور خداؤں تیرے کو کہا ہم عنقریب قتل کردینگے بیٹوں ان کے کو اور

نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

زندہ چھوڑیں گے عورتوں ان کی کو اور ہم اوپر انکے غالب ہیں (۱۲۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور فرعون کی قوم کے سردار بولے، کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑتا ہے کہ ملک میں اُدھم مچائیں اور وہ تجھ کو اور تیرے بتوں کو چھوڑ دیں، بولا، اب ہم ان کے بیٹوں کو مار ڈالیں گے اور عورتوں کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان پر غالب ہیں۔(۱۲۷)

لفظی تحقیق: اٰلِهَتَكَ: تیرے مقرر کئے ہوئے معبود: "اٰلِهَة" "اِلٰه" کی جمع ہے، "اِلٰه" معبود کو کہتے ہیں فرعون سب سے بڑا معبود تو خود کو کہتا تھا اور لوگوں سے اپنے آپ کو سجدہ کراتا تھا لیکن لوگوں کے گھروں میں چھوٹے چھوٹے معبود اپنے مقرر کئے ہوئے رکھ چھوڑے تھے تاکہ فرعون کے سامنے نہ ہونے کے وقت ان کو اپنے سامنے رکھیں اور ان کو سجدہ کریں، بعض نے کہا ہے کہ وہ گائے کی شکل کے بنے ہوئے بت تھے۔

تفسیر

جب فرعون کے درباریوں نے دیکھا کہ جادوگروں کے ایمان لے آنے سے دوسرے لوگ بھی اس طرف مائل ہو رہے ہیں اور اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غلبہ حاصل ہو جانے کا احتمال ہے تو انہوں نے فرعون

سے کہا، کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یونہی چھوڑتا ہے کہ وہ جو چاہیں کرتے پھریں اور اب ان کا ارادہ ہے کہ ملک میں فساد برپا کریں، فرعون کی قوم کے لوگ جانتے تھے کہ بنی اسرائیل تو پہلے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یقین رکھتے تھے اب جادوگروں کے ایمان لانے کی وجہ سے مزید لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف مائل ہو رہے تھے تو فرعون کے درباریوں نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اگر ان کو اسی طرح آزاد چھوڑ دیا گیا ان کی تبلیغ پر پابندی عائد نہ کی گئی یا انہیں سزا نہ دی گئی تو یہ لوگ ملک میں فساد کا باعث بنیں گے لہٰذا ان کا کوئی بندوبست ہونا چاہئے۔

فرعون کے درباریوں نے دوسری بات یہ کی یہ لوگ تمہاری سلطنت کا خاتمہ کر دیں گے اور تمہارے مقرر کردہ معبودوں کو بھی چھوڑ دیں گے، یعنی: لوگوں کو ان کی پوجا کرنے سے روک دیں گے اس طرح گویا فرعون کے سرکردہ لوگوں نے اس کے سامنے تین باتیں کر کے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی قوم کے خلاف ابھارا، پہلی بات یہ کہ تو نے موسیٰ اور ان کی قوم کو آزاد چھوڑ رکھا ہے، دوسری بات یہ کہ یہ لوگ ملک میں فتنہ وفساد کا بازار گرم کریں گے اور تیسری بات یہ کہ نہ تو یہ لوگ تیرا حکم مانیں گے اور نہ تیرے مقرر کردہ معبودوں کی پوجا پاٹ کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے فرعونیوں کو دینی اور دنیاوی دو قسم کا فساد نظر آ رہا تھا، ان کا دینی یا مذہبی فساد یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غلبہ کی صورت میں ان کی تمام مشرکانہ رسمیں ختم ہو جائیں گی اور فرعون سمیت تمام جھوٹے خداؤں کی پوجا پاٹ نہیں ہو سکے گی، ان کے نزدیک دنیاوی فساد یہ تھا کہ ان کی حکومت بھی چھن جائے گی اور سلطنت کے بل بوتے پر جو من مانی کر رہے ہیں لوگوں پر ظلم وستم ڈھا رہے ہیں اور انہیں غلام بنا رکھا ہے وہ سب کچھ جاتا رہے گا، فرعونیوں کی ذہنیت اس حد تک گر چکی تھی کہ فساد کو ختم کرنے والی چیزوں کو خود ہی فساد کہہ رہے تھے، اللہ تعالیٰ کا سچا پیغمبر تو خدا کا پیغام پہنچاتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایک جاننے اور ایک ماننے کی دعوت دیتا ہے، اس کی عبادت کا طریقہ سکھاتا ہے بلکہ مخلوق کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے جوڑتا ہے، دنیا میں عدل وانصاف قائم کرنے کی تعلیم دیتا ہے، پیغمبر سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اصلاح کرنے والا نہیں ہوتا، خدا کا پیغمبر پوری امت میں ہر لحاظ سے

اعلیٰ انسان ہوتا ہے مگر یہ لوگ پیغمبر پر فساد برپا کرنے کا الزام لگا رہے ہیں، لہٰذا فرعون کے بڑے سرداروں نے فرعون سے سفارش کی کہ (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) اور آپ کے ماننے والوں کے خلاف فوراً کاروائی ہونی چاہئے۔

زمین میں فساد مچانے کے ضمن میں منافقوں کا بھی یہی حال ہے یہ لوگ بھی بڑی بڑی سازشیں کرتے ہیں، لوگوں کو آپس میں لڑاتے ہیں اسلام اور اسلام والوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنی کرتوتوں کے ذریعے زمین میں فساد برپا نہ کرو، کفر، شرک، نفاق اور شریعت کی مخالفت زمین میں فساد مچانا ہے، لہٰذا اس سے باز آجاؤ، ناحق قتل، ظلم وزیادتی سب فساد ہے اس سے رُک جاؤ، تو وہ کہتے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، ہم فسادی تو نہیں ہیں، فرعونیوں کی ذہنیت بھی ایسی ہی تھی انہوں نے خود ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا تھا فسق وفجور میں مبتلا تھے کفر وشرک کرتے تھے مگر اپنے آپ کو مصلح کہتے تھے اور اللہ کے پیغمبر پر فساد مچانے کا الزام لگاتے تھے، بزرگان دین اس قسم کی الٹی ذہنیت سے پناہ مانگتے ہیں۔

اپنے درباریوں کی دلیلیں سننے کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کیلئے یہ سزا تجویز کی کہ ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے، یہ سزا بنی اسرائیل اس سے پہلے بھی برداشت کر چکے تھے یہ اس وقت کی بات ہے جب فرعون کو نجومیوں نے خبر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے جو بڑا ہو کر تیری سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا، چنانچہ فرعون نے حکم دے دیا تھا کہ اسرائیلی عورتوں کے ہاں جو بھی بچہ پیدا ہوا سے قتل کر دیا جائے اسی بات کے متعلق اگلی آیت میں آرہا ہے کہ بنی اسرائیل کے لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ کے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبتوں میں مبتلا رہے ہمارے لڑکوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور ہماری لڑکیوں کو زندہ رکھا جاتا تھا، "سورۂ بقرہ" میں اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے "اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی" اب جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کے ساتھ مقابلہ کیا اور وہ مغلوب ہو کر ایمان لے آئے تو اپنے درباریوں کے کہنے پر فرعون نے بنی اسرائیل کیلئے پھر وہی سزا تجویز کی کہ ان کے بچوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی بچیوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے، بہر حال فرعون کے ان دو انتہائی فیصلوں کے درمیانی

عرصہ میں اس سزا میں نرمی کردی گئی تھی اسی عرصہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے گھر میں پرورش پائی، جوان ہوئے تو قبطی کے قتل کا حادثہ پیش آ گیا، پھر آپ وہاں سے مدین چلے گئے، دس سال کا عرصہ وہاں گزرا، پھر واپسی پر راستے میں پیغمبری عطا ہوئی اور ساتھ حکم ہوا کہ اب واپس مصر جاؤ اور فرعون کو اپنے رب کا پیغام پہنچاؤ،، پھر جب آپ نے فرعون کو حق کی دعوت دی اور لاٹھی اور روشن ہاتھ کے معجزے پیش کئے، پھر جادوگروں سے مقابلہ ہوا اور وہ ہار گئے تو فرعون نے پھر بنی اسرائیل کیلئے یہی سزا تجویز کی، تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ فرعون نے نوے ہزار سے زیادہ بچے ان کے ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے قتل کروائے، بہر حال فرعون نے کہا کہ ہم انہیں یہ سزا دیں گے کیونکہ ہم ان پر غالب ہیں، ہماری حکومت ہے، ہم اقتدار والے ہیں، تمام وسائل ہمارے پاس ہیں لہٰذا ہم انہیں یہ سزا ضرور دیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ

کہا | موسیٰ نے | قوم اپنی سے | مدد مانگو | سے اللہ | اور | صبر کرو | تحقیق | زمین

لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾

لئے اللہ کی ہے | دے دے اسکو | جسے | چاہے وہ | میں سے | بندوں اپنے | اور | بہتر انجام | اللہ سے ڈرنے والوں کا (۱۲۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، بیشک زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں جس کو چاہے اس کا وارث کردے اور آخر میں بھلائی اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے ہے۔ (۱۲۸)

تفسیر

فرعون نے اپنے درباریوں کے کہنے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کا طریقہ تجویز کیا کہ آپ کی قوم کو

ابھرنے کے قابل ہی نہ چھوڑا جائے، پھر اکیلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کیا کر سکیں گے، اس نے پہلے بھی یہی کیا تھا کہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کروا دیتا تھا اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتا تھا، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی حالت میں پیدا ہوئے اور خود فرعون ہی کے گھر میں پلے بڑھے، آپ کی پیدائش کا ذکر "سورۂ طٰہٰ" اور "سورۂ قصص" میں آئے گا، اس آیت میں اس کا ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو ہدایت کی کہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو اور تکلیفوں پر صبر کرو۔

ارشاد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے اس مصیبت میں مدد مانگو اور جو مشقت آئے اس کو صبر کے ساتھ برداشت کرو، اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے لوگوں کو اس وقت سلطنت دے رکھی ہے اور اس سرزمین پر اس کا اقتدار قائم ہے، زمین کے اصل مالک اللہ تعالیٰ ہیں اس کے حکم کے بغیر کوئی اس پر قبضہ نہیں کر سکتا وہ اپنی حکمت اور مصلحت کی بنا پر جس کو چاہیں تھوڑی مدت کیلئے اس زمین کی حکومت دے دیتے ہیں، اب اگر وہ ظلم وستم سے کام لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو نسل اور نسب کا خیال کیے بغیر آرام و آسائش سے نہیں رکھتا تو وہ ظالم ہے، مظلوم لوگ بے بس ہیں وہ کچھ نہیں کر سکتے ان کیلئے صرف ایک راستہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہچانیں اور اس کی نافرمانی سے بچیں اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کریں، اس کے غضب سے ڈریں، توبہ و استغفار کریں نیک کام اختیار کریں ایسے لوگ آخرکار اپنے دشمنوں پر غالب آ کے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے اختیار اور قوت چھین کر ان کو دے دے گا یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی آزمائش کے طریقے رکھے ہیں ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور اسی طرح ہوتا رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہے۔

اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہر زمانے میں انسان کو یہی طریقہ بتاتے رہے ہیں کہ ظالموں سے نجات حاصل کرنی ہے تو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر کمر باندھو اور اسی سے مدد کیلئے التجا کرو، صبر سے کام لو، سیدھی راہ پر چلنے میں خواہ کتنی ہی مصیبتیں اور مشکلیں پیش آئیں سب کو ہنس ہنس کر برداشت کرو، ظالموں سے ہار مت مانو، ان کا ڈٹ کر جہاں تک ہو سکے مقابلہ کرو، آخر انجام یہ ہوگا کہ ایک دن ساری مصیبتیں دور ہو جائیں گی اور ظالموں کا

بیڑا غرق ہو جائے گا۔

بے چینی

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ

کہنے لگے اذیت دیئے گئے ہم اس سے پہلے کہ آئے آپ ہم میں اور سے اسکے بعد کہ آپ آئے ہم میں کہا

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ

قریب ہے رب تمہارا کہ ہلاک کردے دشمن تمہارے کو اور خلیفہ کردے تم کو میں زمین

فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵ ۵

پھر دیکھے کیسے کام کرتے ہو تم (۱۲۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ وہ بولے ہم پر آپکے آنے سے پہلے اور آپکے آنے کے بعد تکلیفیں رہیں (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے) کہا نزدیک ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کردے اور تم کو ملک میں خلیفہ کردے، پھر دیکھے تم کیسے کام کرتے ہو۔ (۱۲۹)

تفسیر

اس وقت جن کا بیان ہو رہا ہے، یعنی: بنی اسرائیل وہ خود اپنے ہی جیسوں کے نرغے میں پھنسے ہوئے تھے ظالم اور جابر مصری ان سے زبردستی بلا معاوضہ خدمت لیتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تمہارے لئے صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں لیکن تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ یقیناً تمہارا ایک بڑا زبردست مددگار موجود ہے وہ اس سارے جہان کا پیدا کرنے والا اور نظام چلانے والا ہے، اس نے اپنی حکمت کی بنا پر فرعون اور اس کے لوگوں کو اس وقت زبردست کر دیا ہے اس سے مقصد یہ ہے کہ تم بے بس ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف جھکو اس کے سامنے گڑگڑاؤ اور اپنی عاجزی پیش کر کے اس سے مدد طلب کرو، اس میں شک نہیں کہ ایسی حالت میں یہی ایک تدبیر ہے جو

کارگر ہوتی ہے اور ضرور ہوتی ہے لیکن اس میں صبر کی ضرورت ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو اور مصیبت میں صبر کرو، بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت پر بوکھلا گئے اور ڈرتے ڈرتے یہ عرض کیا کہ اے موسیٰ! آپکے آنے سے پہلے بھی ہم پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے اور اب آپکے آنے کے بعد بھی وہی چرچے ہو رہے ہیں کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالو، تاکہ یہ آہستہ آہستہ ختم ہی ہو جائیں آخر صبر کی کوئی حد ہے کہ ہم کہاں تک صبر کریں۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ آپ کے آنے سے پہلے تو اس اُمید پر وقت گزارا جا سکتا تھا کہ کوئی پیغمبر ہماری نجات کیلئے آئے گا، اب آپ کے آنے کے بعد بھی یہی ایذاؤں کا سلسلہ رہا تو ہم کیا کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سن کر فرمایا کہ: تم ہمت نہ ہارو، دل کو مضبوط رکھو تم تھوڑی ہی مدت میں دیکھ لوگے کہ تمہارا دشمن تباہ و برباد اور اس کی جگہ ساری قوت اور سارا اختیار تمہارے ہاتھ میں دے دیا جائے گا تاکہ تمہیں کام کرنے کا موقعہ دیا جائے اور دیکھا جائے کہ تم قوت اور اقتدار والے ہو کر کیا ڈھنگ اختیار کرتے ہو، فرعون کی طرح آپے سے باہر ہو کر خونخوار اور ظالم بن جاتے ہو یا آدمیت کے کام کر کے خود بھی چین کی زندگی بسر کرتے ہو اور دوسروں کو بھی آرام سے رکھتے ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ دنیا میں قوموں کے اوپر سختی اور نرمی، مصیبت اور راحت طاقت اور کمزوری سبھی قسم کے حالات آتے ہیں اور ہر ایک میں انسان کی آزمائش مقصود ہوتی ہے، انسان وہی ہے کہ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کو پہچانے اور اس سے اپنا تعلق پیدا کرے اور دنیا کے راحت و آرام، مصیبت و دکھ درد کو آنی جانی چیز سمجھے، نہ راحت میں اللہ تعالیٰ کو بھولے اور نہ مصیبت میں اس کی یاد سے غافل ہو۔

مزید تنبیہ!

وَ لَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ

اور البتہ تحقیق پکڑا ہم نے لوگوں کو فرعون کے ساتھ قحطوں کے اور کمی کے میں سے پھلوں

لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ
کہ شاید وہ نصیحت پکڑیں (۱۳۰) پس جب آئی پاس انکے اچھی حالت کہنے لگے لئے ہمارے یہی ہے

وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا
اور اگر پہنچی ان کو بری حالت نحوست بتائی موسیٰ کی اور جو ساتھ تھے انکے سن رکھو! بات یہی ہے

طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾
بدبختی ان کی پاس ہے اللہ کے اور لیکن اکثر انکے نہیں جانتے (۱۳۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے فرعون والوں کو قحطوں میں اور پھلوں کے نقصان میں پکڑ لیا تا کہ وہ نصیحت مانیں۔(۱۳۰) پھر جب ان کو اچھی حالت پہنچی، کہنے لگے، یہ ہمارے لائق ہے اور اگر بری حالت پہنچی تو موسیٰ کی اور اس کے ساتھ والوں کی نحوست بتلانے لگے، سن لو! ان کی نحوست تو اللہ کے پاس ہے پر اکثر لوگ نہیں جانتے۔(۱۳۱)

لفظی تحقیق: سِنِيْنَ: سال۔ "سَنَةٌ" کی جمع ہے، سالوں سے پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال ان پر قحط اور خشک سالی آتی ہے۔ يَطَّيَّرُوْا: بدشگونی لی۔ اس کا مصدر "طَيَّرٌ" ہے جو "طَيْرٌ" سے بنا ہے "طَيْرٌ" کے معنٰی پرندے کے ہیں، وہ لوگ پرندوں کے ذریعہ بدشگونی لیتے تھے، اس لئے "يَطَّيَّرُوْا" کا معنٰی شگون لینے کے ہوگئے، پرندوں سے شگون اس طرح لیتے تھے کہ اگر کسی کام کا ارادہ کیا اور کوئی پرندہ سامنے سے اڑ گیا تو کہتے تھے اب یہ کام نہیں کریں گے؛ اس لئے کہ پرندے کا ٹھیک کام کے وقت اڑنا بری علامت ہے، طائر بھی اسی سے بنا ہے جس کے معنٰی پرندہ ہیں، اسی وجہ سے اس سے بھی مراد نحوست، بدشگونی، شومی اور بدبختی ہے۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ ہم نے فرعون کی قوم پر قحط سالی کی مصیبت اتاری، شہروں میں میووں کی کمی ہوگئی، تفسیری روایتوں میں ہے کہ یہ قحط ان پر سات سال مسلسل رہا اور آیت میں جو اس قحط کے بیان میں دو لفظ آئے ہیں، ایک

"سنین" دوسرے "نقص ثمرات"، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: قحط اور خشک سالی کا عذاب تو گاؤں والوں کیلئے تھا اور پھلوں کی کمی شہر والوں کیلئے، کیونکہ عموماً دیہات میں غلہ کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور شہروں میں پھلوں کے باغات ہوتے ہیں تو اشارہ اس طرح ہوا کہ نہ غلہ کے کھیت باقی رہے نہ پھلوں کے باغات لیکن جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کا قہر ہوتا ہے تو صحیح بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی فرعون کی قوم بھی اس قہر میں مبتلا تھی۔

اس سے مقصد یہ تھا کہ ڈر کر آدمی بنیں، لیکن ان کی ڈھٹائی اور بڑھ گئی اچھی حالت ہوتی تو کہتے ایسا ہونا ہی چاہئے کیوں کہ ہم معزز اور شریف لوگ ہیں ہم پر مصیبت آنے کی کوئی وجہ ہی نہیں، کوئی مصیبت آتی تو کہتے یہ سب (نعوذ باللہ) موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی قوم کی بدبختی ہے جس کا اثر ہم پر پڑ رہا ہے، حالانکہ خود بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے ہر مصیبت سے محفوظ تھے اور جو مصیبت ان پر آتی تھی فرعون کے لوگوں پر ہی ہوتی تھی، بے وقوفوں کو اتنی سیدھی بات سمجھائی نہ دی کہ یہ سب ہمارے کرتوتوں کا پھل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں مل رہا ہے، اچھی حالت میں رکھنا اور بری حالت میں پھنسانا دونوں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اور وہ مصلحت کی بناء پر کسی کو اچھی حالت میں اور کسی کو بری حالت میں رکھتا ہے اور اس سے دنیا میں سبق دینا مقصود ہوتا ہے، مصیبت اور راحت دونوں میں صلاحیت ہے کہ انسان کیلئے اپنے مولائے حقیقی کی طرف رجوع کرنے کا موقعہ بھی مہیا کرے۔

خشک سالی اور کمی دراصل ایک چیز کے دو پہلو ہیں، جب خشک سالی کا زمانہ آتا ہے تو ظاہر ہے کہ پھل بھی پیدا نہیں ہوں گے اور اگر ان دو چیزوں کو علیحدہ علیحدہ شمار کیا جائے تو خشک سالی یا قحط سالی زیادہ تکلیف دہ چیز ہے جس سے انسان اور جانور سب تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھلوں کی کمی اس سے کم درجہ کی تکلیف ہے، بعض دفعہ خشک سالی تو نہیں ہوتی مگر درختوں پر پھل ہی نہیں آتا تیز ہواؤں کی وجہ سے بُور ضائع ہو جاتا ہے یا پھلوں کو ایسی بیماری لگ جاتی ہے کہ وہ استعمال کے قابل نہیں رہتے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے نشانی

کے طور پر فرعون کو قحط سالی اور پھلوں کی کمی میں مبتلا کیا تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کل نو نشانیاں عطا کیں ان میں سے ایک نشانی یہ ہے، دو پہلے بیان ہو چکی ہیں، لاٹھی اور روشن ہاتھ باقی کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

عام طور پر انسانی فطرت ایسی ہی ہے، اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں کا یہی حال بیان کیا ہے جب ان کے معاشی اسباب میں اضافہ ہو جاتا ہے رزق کی فراوانی ہوتی ہے تو وہ خدا کو بھول جاتے ہیں اور اپنے علم و ہنر پر اترانے لگتے ہیں خوشحالی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کے بجائے وہ اسے اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی اور اپنی منصوبہ بندی کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ آتی ہے تو پھر اپنی کوتاہیوں پر نگاہ کرنے کے بجائے خدا کا شکوہ کرنے لگتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی محنت اور علم و ہنر کا بدلہ نہیں دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرعون اور اس کی قوم کا بھی یہی حال تھا کہ جب خوشحالی آتی تو کہتے یہ ہماری محنت کا پھل ہے یہ ہمیں ملنا چاہئے تھا۔

مکہ کے قریشی اور عرب کے مشرک بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق اسی قسم کی بدشگونی لیتے تھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ بدشگونی لینا شرک کی قسموں میں سے ایک قسم کا شرک ہے، عرب لوگ پرندوں کو اڑا کر ان سے نیک یا بدشگون لیتے تھے یا اگر سامنے سے کوئی طبیعت کے خلاف جانور آ جاتا تو اسے بھی بدشگونی پر محمول کرتے، البتہ نیک فال لینے کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پسند کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اچھا لفظ یا اچھا نام سن کر انسان کی طبیعت خوش ہو جائے تو اسے وہ نیک فال سمجھے اس سے یہ مراد نہیں کہ قرآن پاک سے یا دیوان حافظ سے یا تیر وغیرہ سے فال نکالے یہ تو ناجائز ہے، ایمان والوں کو اس سے بچنا چاہئے، اسی طرح نجومی، کہانت، دست شناسی، رمل وغیرہ سب ناجائز ہیں اور ان کی کمائی بھی حرام ہے۔

تمام کام اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی مکمل قدرت کے مطابق واقع ہوتے ہیں کسی کی خوشحالی اور تنگدستی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کا کیا تعلق ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہیں، نیکی کا راستہ بتاتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں وہ خیر خواہ اور امین ہیں ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی کا سلوک کرتے ہیں ان کی وجہ سے

تو اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت اترتی ہے نہ کہ نحوست پیدا ہوتی ہے۔

نشانیوں کو بہکانے کا ذریعہ ٹھہرایا

وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ

اور کہا جو جو لائیگا تو ہم پر ساتھ اسکے کوئی نشانی تاکر تو جادو کرے ہم پر ذریعے اسکے پس نہیں ہم

لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ

پر تجھ ایمان لانے والے (۱۳۲) پس بھیجے ہم نے پر ان طوفان اور ٹڈی اور چچڑی

وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا

اور مینڈک اور خون نشانیاں جدا جدا پھر بھی اکڑتے رہے اور تھے وہ

قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

لوگ گناہگار (۱۳۳)

با محاورہ ترجمہ:۔ اور کہنے لگے جو کچھ تو ہمارے پاس نشانی لائے گا تاکہ اس کی وجہ سے ہم پر جادو کرے، سو! ہم ہرگز تجھ پر یقین نہیں کریں گے۔ (۱۳۲) پھر ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈی اور چچڑی اور مینڈک اور خون بہت سی الگ الگ نشانیاں بھیجیں، پھر بھی تکبّر کرتے رہے اور وہ گناہگار لوگ تھے۔ (۱۳۳)

لفظی تحقیق: مَهْمَا: جو۔ اصل میں یہ لفظ ”مَا مَا“ ہے عربی میں ”مَا“ کے معنیٰ ”جو“ کے ہیں اسی کو دو دفعہ کہا تو اس کے معنیٰ ”جو جو“ ہو گئے بولنے میں پہلے الف کو ہ بنالیا ”مَهْمَا“ ہو گیا معنیٰ وہی رہے۔

تفسیر

فرعونیوں کی ڈھٹائی دیکھئے!

سچ کہا ہے کہ ضد و بحث میں آدمی جان تک کھونے کو تیار ہو جاتا ہے اس وقت ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حضرت

موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ کچھ بڑا نہ تھا وہ صرف اتنا ہی تو چاہتے تھے کہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ بھیج دیا جائے لیکن فرعون کی قوم کو ان کے غرور اور اقتدار نے اندھا باؤلا کر رکھا تھا، ان کا تکبر کبھی اجازت نہ دے سکتا تھا کہ مفت کے غلاموں کو آسانی سے اپنے ہاتھ سے نکل جانے دیں، خود عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے وہ زمانہ تو پھر بھی ہمارے زمانے سے کم مہذب تھا، ہم آج کل تہذیب وتمدن کے دعویداروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کمزور قوموں کو دبا کر رکھنا چاہتے ہیں اور ان سے اپنے مطلب کے کام نکال کر کچھ پیسے دے دیتے ہیں وہ کبھی اس بات پر رضامند نہیں ہوتے کہ ان کے اوپر سے اپنی پکڑ ڈھیلی کریں جب آج کل کے تہذیب کے دعوے داروں کا یہ حال ہے تو فرعون کی قوم کی ڈھٹائی اور تکبر میں تعجب کی کوئی بات نئی نہیں، دیکھئے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا کہہ رہے ہیں، انہوں نے کہا کہ اے موسیٰ! تو چاہے جتنی انوکھی باتیں دکھا ہم تیرے جال میں پھنسنے والے نہیں۔

آگے ارشاد ہے کہ ہم نے ان پر مصیبتیں ڈالنی شروع کیں، بنی اسرائیل تو مصیبتوں سے بچے رہے لیکن فرعونیوں پر رہ رہ کر طوفان، ٹڈیوں اور چچڑیوں کی آفتیں آئیں، مینڈکوں کی بہتات نے آرام سے رہنا دشوار کر دیا پانی ان کیلئے خون ہو گیا لیکن واہ رے بدمستی، مصیبت آئی تو رونے لگے اور جب وہ دور ہوئی تو پھر وہی سرکشی اور وہی ضد۔

واقعہ یہ ہے کہ ان کی فطرت بگڑ چکی تھی اور وہ ظلم وستم کے عادی ہو چکے تھے ان میں اس کی صلاحیت ہی نہ رہی تھی کہ بھلائی برائی میں تمیز کریں اور نصیحت کرنے والوں کی بات سنیں یہی خرابی کے طور طریقے ہیں۔

جب فرعون اور اس کے درباری سرکشی میں حد سے بڑھ گئے تو ہم نے ان پر طوفان بھیج دیا، طوفان کا لفظ عام طور پر پانی کی بہتات پر بولا جاتا ہے جب بارش کی کثرت ہو یا دریا اور ندی نالے کناروں سے بہہ نکلیں جس کی وجہ سے لوگ گھروں میں قید ہو کر رہ جائیں یا پناہ لینے کیلئے محفوظ جگہوں پر جانا پڑے تو یہ طوفان کہلاتا ہے تاہم امام مجاہد کی روایت کے مطابق موت کی کثرت کو بھی طوفان کہا جاتا ہے، طاعون یا ہیضہ وغیرہ کی وبا پھیل جائے جس سے بہت تعداد میں موت واقع ہوں تو ایسے حادثہ کو بھی طوفان کہا جاتا ہے تاہم عام طور پر پانی کی کثرت کو

طوفان کہا جاتا ہے جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں آیا تھا۔

ایک تو ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور دوسرا ٹڈیوں کے لشکر کی آفت بھی مسلط کر دی، جب کسی علاقے میں ٹڈی دل کا حملہ ہوتا ہے تو تمام فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں، سارا سبزہ چٹ کر جاتا ہے اس کے حملہ سے بچاؤ کیلئے بڑی تدبیریں اختیار کرنا پڑتی ہیں پھر جس طرف ٹڈیوں کے لشکر کا رُخ ہو اس طرف کے لوگوں کو وقت سے پہلے اطلاع دی جاتی ہے تاکہ وہ بھی حفاظتی تدبیریں اختیار کر لیں تو جہاں ٹڈیوں کا لشکر جاتا ہے وہاں بھی قحط واقع ہو جاتا ہے کیونکہ یہ چھوٹے چھوٹے پرندے تمام فصلوں اور پھلوں کو کھا جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اس کے علاوہ ہم نے ان پر "قمل" بھی بھیجا "قمل قملة" کی جمع ہے جس کے مختلف معنیٰ بیان ہوئے ہیں، بعض نے اس سے جوئیں مراد لی ہیں جو انسانوں کے جسم میں پیدا ہو جاتی ہیں بعض نے چیچڑیاں کہا ہے جو جانوروں کو چمٹ جاتی ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ اس سے سُسری یا گُھن مراد ہے جو اناج کو کھا جاتا ہے۔

اور ہم نے مینڈک بھیجے اور خون کی مصیبت میں گرفتار کیا یہ سب علیحدہ علیحدہ نشانیاں ہیں جو ہم نے فرعون اور اس کی قوم پر بھیجیں تاکہ وہ نصیحت پکڑیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

یہ تمام نشانیاں اللہ تعالیٰ نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے اتاریں مگر وہ ایسے جرائم پیشہ اور متکبر لوگ تھے کہ کسی نے تسلیم نہ کیا، حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں آتا ہے کہ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا کہ انہیں چھوڑ دو میں ان کو لے کر مصر سے چلا جاتا ہوں جب فرعون نے یہ مطالبہ نہ مانا تو اللہ تعالیٰ نے بارش کا طوفان بھیج دیا جب مسلسل بارش کی وجہ سے فصلیں اور پھل تباہ ہونے لگے، انسانی اور حیوانی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمیں اس طوفان سے نجات دے اور ساتھ وعدہ بھی کیا کہا اگر طوفان ہٹ جائے گا تو میں بنی اسرائیل کو آزاد کر دوں گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور بارش رُک گئی اور اللہ تعالیٰ نے بارش کی زحمت کو رحمت میں بدل دیا اور خوب غلہ

پیدا ہوا مگر فرعون اپنے وعدے پر قائم نہ رہا، اس پر اللہ تعالیٰ نے دوسرا وبال بھیجا جب فصل پک گئی تو اللہ تعالیٰ نے ٹڈیوں کا لشکر بھیج دیا جس سے فصلوں اور پھلوں کی تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا فرعونی اس آفت سے گھبرا کر پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور دعا کی درخواست کی کہ یہ مصیبت بھی ٹل جائے اور وعدہ کیا کہ اب کہ بنی اسرائیل کو ضرور آزاد کر دینگے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر دعا کی تو یہ عذاب بھی ٹل گیا مگر فرعونی اپنے وعدے کو پھر بھول گئے، پھر جب لوگ غلہ اپنے گھروں میں لے آئے تو اسے گھن لگ گیا اور سارا غلہ ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا وہ لوگ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے آپ نے دعا کی اور تکلیف پھر دور ہو گئی مگر فرعون نے پھر اپنا وعدہ پورا نہ کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے بہت ہی زیادہ مینڈک بھیجے کہ ان کا کھانا پینا محال ہو گیا، ہر برتن میں مینڈک نظر آتے تھے جب کھانا کھانے کیلئے منہ کھولتے تو مینڈک اچھل کر منہ کے اندر چلے جاتے ان کا کھانا پینا بدمزہ ہو جاتا فرعونی پھر پریشان ہو گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلوا دیں اب ہم ضرور وعدہ پورا کریں گے ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی فرعونی مکر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ایک اور عذاب بھیجا جس برتن میں پانی ڈالتے وہ خون بن جاتا برتن میں پڑا ہوا پانی نظر آتا مگر جب اسے استعمال کرنے لگتے یا پینے کیلئے منہ کی طرف بڑھاتے تو خون بن جاتا اب پیاس کی وجہ سے مرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ہم نے ان پر لگاتار عذاب بھیجے مگر وہ ہمیشہ تکبر ہی کرتے رہے انہوں نے کسی نشانی سے عبرت حاصل نہ کی وہ بڑے گناہ گار لوگ تھے اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ حال بیان کیا، آگے مزید تفصیل آ رہی ہیں۔

فرعون والوں کی ضد

وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا

اور جب آپڑتا پر ان کوئی عذاب کہتے اے موسیٰ! پکار لئے ہمارے رب اپنے کو اس طرح کہ

عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ

بتایا اس نے تجھ کو البتہ اگر ہٹادیا تو نے سے ہم یہ عذاب ضرور ایمان لے آئینگے ہم پر تجھ اور

لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝١٣٤ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ

البتہ ہم ضرور بھیج دینگے ساتھ تیرے بنی اسرائیل کو (۱۳۴) پس جب ہٹادیا ہم نے سے ان عذاب

اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۝١٣٥

تک اس مدت کہ وہ پہنچنے والے تھے اس تک اچانک وہ توڑ دیتے عہد (۱۳۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب ان پر کوئی عذاب آپڑتا تو کہتے اے موسیٰ! ہمارے واسطے اپنے رب سے دعا کر جیسا کہ اس نے تجھے بتلا رکھا ہے اگر تو نے یہ عذاب ہم سے دور کر دیا تو بیشک ہم تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے۔ (۱۳۴) پھر جب ہم نے ان سے عذاب اٹھالیا اس مدت تک جس کو وہ پہنچنے والے تھے پس اچانک وہ عہد کو توڑ دیتے۔ (۱۳۵)

لفظی تحقیق: عَهِدَ: اس نے بتایا۔ "عَهِدَ" ماضی کا صیغہ ہے "عھد" کے معنیٰ ہیں کسی سے کچھ کہنا، بتانا، کسی کام کا طریقہ سکھانا یا کسی کے ذمے کچھ کام ڈالنا۔ عَهِدَ عِنْدَكَ: اس نے تجھ کو بتا رکھا ہے۔ لفظی معنیٰ ہیں: اس نے تیرے پاس ہدایت چھوڑی ہے، یعنی: تجھ کو جو طریقہ دعا کا سکھا رکھا ہے۔

تفسیر

ارشاد ہے کے فرعون کی قوم کی عادت تھی کہ ڈھیٹ بن کر اپنا کام کئے جاتے تھے جب ان کی تنبیہ کیلئے کوئی عذاب آتا تو اس وقت عاجز ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آتے اور کہتے اے موسیٰ! تیرے رب نے تجھے دعا کا جو طریقہ بتا رکھا ہے اس طریقے سے اپنے رب سے ہمارے لئے دعا مانگ، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تیری دعا سے اگر یہ عذاب ٹل گیا تو ہم ضرور تجھے سچا مان لیں گے اور تیرے اوپر ایمان لے آئیں گے اور صرف یہی نہیں بلکہ تیرے ساتھ تمام بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے مگر جب ہم تھوڑی مدت کیلئے ان پر سے عذاب دور کر دیتے

ہیں اور ان کو توبہ کی مہلت دیتے ہیں تو وہ عذاب کے دور ہوتے ہی فوراً اپنے قول وقرار سے پھر جاتے ہیں اور پھر انہی بدمعاشیوں پر اتر آتے ہیں جن کے وہ عادی ہو چکے تھے۔

انسان ہمیشہ اسی چکر میں رہتا ہے وہ پہلے بھی نہیں سمجھتا تھا اور آج تک بھی نہیں سمجھا کہ وہ انسان ہے اور انسان کیلئے ایک راستہ مقرر ہے جس پر اس کو چلنا چاہئے اور یہ راستہ اس کے واسطے پیدا کرنے والے اور پالنے والے نے مقرر کیا ہے اس راستہ سے ہٹ جانا آدمی کیلئے زہر ہے اس سے ہٹ کر جو وہ کام کرے گا اس کے برے عملوں میں شمار ہوگا اس کے سمجھانے کیلئے اس پر کبھی سختی اور کبھی خوش حالی آئے گی اگر وہ ان دونوں میں سے کسی سے بھی نہ سنبھلا تو اپنے کئے کی سزا پائے گا۔

"رجز" کا مفہوم

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کے متعلق بتایا ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی تھی تو وہ کیا کرتے تھے؟ ارشاد ہے کہ جب ان پر کوئی عذاب آتا تھا کسی تکلیف میں مبتلا ہوتے تھے تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس دعا کیلئے جاتے تھے، قرآن کریم میں لفظ "رجز" کئی ایک معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، جیسے: عذاب، تکلیف، مصیبت، بیماری وغیرہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون کو بھی "رجز" فرمایا ہے، طاعون کی وبا پہلی قوموں میں پھیلی اور بنی اسرائیل پر بھی یہ بیماری پڑی، ہر وبائی بیماری طاعون، ہیضہ، چیچک وغیرہ پر "رجز" کا لفظ بولا جاتا ہے، ایسی وبا جس سے غیر معمولی طور پر بہت زیادہ موتیں ہوں اور لوگوں پر خوف طاری ہو جائے، تفسیری روایتوں میں ہے کہ ان لوگوں پر طاعون کی وبا مسلط کر دی گئی جس میں ان کے ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے، "رجز" گندگی کو بھی کہتے ہیں تاہم یہاں پر اس سے مراد عذاب ہے جو کسی بھی شکل میں ہو، بہر حال فرمایا کہ: فرعونیوں پر جب بھی عذاب آتا یا کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے تو گھبرا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف دوڑتے۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ: پھر جب ہم نے اٹھا دیا عذاب کو ایک مدت تک جس کو وہ پہنچنے والے تھے، یعنی: اپنی موت یا عذاب کے وقت تک اچانک انہوں نے عہد توڑ دیا، جب

تکلیف آئی تو ایمان لانے کا وعدہ بھی کرتے اور بنی اسرائیل کو آزادی کی خوشخبری بھی سناتے مگر جب وہ مصیبت ٹل جاتی تو پھر اس وعدے کو توڑ دیتے، یعنی: نہ تو ایمان لاتے اور نہ ہی بنی اسرائیل کو آزاد کرتے، مکہ کے قریش کے ساتھ بھی ایک موقع پر ایسا ہی معاملہ پیش آیا تھا، علاقے میں قحط پیدا ہو گیا انسان اور جانور بھوک اور پیاس سے مرنے لگے تو مکہ والوں نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو مدینے بھیجا تاکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دعا کرائے کہ اللہ تعالیٰ اس قحط کو دور کر دے انہوں نے بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر یہ قحط دور ہو گیا تو ہم ایمان لے آئیں گے مگر قحط دور ہونے کے بعد اپنے عہد سے مکر گئے، فرعون اور اس کی قوم کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ تسلیم کرنے کا عہد کر لیتے مگر جب تکلیف دور ہو جاتی تو مکر جاتے۔

کرتوتوں کا وبال

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا

پس انتقام لیا ہم نے — سے ان — پس ڈبو دیا ہم نے ان کو — میں — سمندر — اسلئے کہ انہوں نے — جھٹلایا — ساتھ آیتوں ہماری کو

وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ

اور تھے وہ — سے ان — غفلت کرنے والے (۱۳۶) — اور وارث بنایا ہم نے — ان لوگوں کو — جو — تھے — کمزور مانے جاتے

مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ

مشرقوں کو — زمین کے — اور — مغربوں اسکے کا — جو کہ — برکت رکھی ہم نے — میں جس

بامحاورہ ترجمہ: پھر ہم نے ان سے بدلا لیا سو ہم نے ان کو ڈبو دیا سمندر میں اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے غفلت کرتے تھے۔ (۱۳۶) اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے وارث کر دیا زمین کے مشرق اور مغرب کا کہ جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔

لفظی تحقیق: اِنْتَقَمْنَا: ہم نے انتقام لیا۔ یہ "نِقْمَةٌ" سے بنا ہے "نِقْمَةٌ" کے معنیٰ عذاب اور دُکھ کے ہیں۔

تفسیر

فرعون کی قوم پر ایک کے بعد ایک جلدی جلدی بہت سی مصیبتیں آئیں جب مصیبت آتی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آتے اور کہتے اس مصیبت کو دور کرادے ہم تیرا کہنا ماننے کو تیار ہیں، جب مصیبت چلی جاتی پھر ویسے ہی ہوجاتے، آخر طاعون نے آدبوچا اور لوگ مرنے لگے، حضرت موسیٰ علیہ السلام راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر نکل گئے کئی دن کے بعد فرعون والوں کچھ ہوش آیا تو بنی اسرائیل کو پکڑنے کیلئے دوڑے اور بحیرۂ قلزم پر جا پہنچے، یہ قصہ "سورۃ الشعراء" میں آئے گا اور اس سے پہلے "سورۂ بقرہ" میں بھی گزرا ہے، دریا بنی اسرائیل کیلئے خشک ہوگیا اور وہ سمندر کے اس پار اتر گئے ان کے پیچھے فرعون بھی لاؤ لشکر کے ساتھ سمندر میں اترا، سمندر پانی سے بھر گیا فرعون اور فرعون کے ماننے والے غرق ہوگئے۔

ارشاد ہے کہ جب وقت آیا تو ہم نے ان سے ان کی سرکشی کا بدلہ لیا اور سب کو سمندر میں ڈبو دیا اس کے سوا اور ان کا علاج ہی کیا تھا، ہماری نشانیوں کو وہ برابر جھٹلاتے رہے ان پر لگاتار مصیبتیں پڑیں اگر سمجھ ہوتی تو سنبھل جاتے اور درست ہوکر آدمیوں کا سارویہ اختیار کرتے لیکن انہوں نے ٹیڑھ پن اختیار کیا اور جان بوجھ کر انجان بن گئے نصیحتیں اِس کان سے سنیں اُس کان سے اڑادیں، مصیبتیں دیکھیں لیکن اندھے بن گئے، غفلت کی انتہاء کردی آخر تباہ ہوگئے اور ہم نے ان کی جگہ انہی بنی اسرائیل کو جنہیں کمزور سمجھا جاتا تھا انکی تمام چیزوں کا وارث کرکے بٹھادیا اور وہ اس ملک کے جو نہایت سرسبز وشاداب خطہ کے تنہا مالک ہوگئے۔

فرعون والوں کے بار بار عہد توڑنے پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا پھر ہم نے ان سے انتقام لیا، یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ وہ غالب بھی ہے اور انتقام لینے والا بھی مگر اس کا انتقام لینا انسانوں کے انتقام کی طرح نہیں ہوتا جو دوسرے کو تکلیف پہنچا کر اپنے دل کو ٹھنڈا کرتے ہیں، مثلاً: ایک خاندان نے دوسرے خاندان کا کوئی آدمی قتل کردیا تو جب تک یہ بھی قتل نہ کریں ان کے انتقام کا جذبہ ٹھنڈا نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ بے نیاز اور غنی ہیں اس کو کسی

کے برائی کرنے سے نہ تو دکھ ہوتا ہے اور نہ کسی کی اطاعت کرنے سے خوشی ہوتی ہے، ہاں! جب کوئی انسان خدا تعالیٰ کے قانون کو توڑتا ہے تو پھر اس کے نتیجے میں اس کو سزا ملتی ہے۔

ہم نے ان سے انتقام لیا پس ہم نے انہیں سمندر میں ڈبو دیا، تاہم فرعون اور اس کے لشکری " دریائے نیل" میں نہیں بلکہ "بحیرہ قلزم" میں غرق ہوئے تھے، بارہ راستے جن کا ذکر آگے آرہا ہے وہ "بحیرہ قلزم" میں ہی بنے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام چھ لاکھ ستر ہزار افراد کو لے کر مصر سے نکلے تھے ان کے بارہ قبیلے تھے اللہ تعالیٰ نے پانی میں بارہ راستے بنا دیئے ہر قبیلہ اپنی اپنی سڑک پر جا رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے پانی کو روک دیا، جیسے: برف جم گئی ہو یا پہاڑ کھڑے کر دیئے گئے ہوں، تفسیری روایتوں کے مطابق بارہ لاکھ فرعونیوں نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا، "بحیرۂ قلزم" پر پہنچے تو بنی اسرائیل کو پانی میں بنے ہوئے راستوں پر چلتے دیکھا، انہوں نے بھی انہی راستوں پر سفر شروع کر دیا پھر کیا ہوا؟ جب سب لوگ "بحیرۂ قلزم" میں داخل ہو گئے پھر دریا نے ان کو ڈھانپ لیا نہ پوچھو پھر ان کا کیا حشر ہوا، بنی اسرائیل تو سمندر کے پانی کو پار کر گئے مگر تمام مجرم ان کی نگاہوں کے سامنے غرق کر دیئے گئے۔

ہم نے انہیں اس لئے غرق کر دیا کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے انہوں نے معجزوں کا انکار کیا، توحید اور اللہ تعالیٰ کے حکموں کی پرواہ نہ کی اور اپنی من مانی کرتے رہے، اللہ تعالیٰ کے حکموں کو ماننے کے بجائے وہ ان سے غفلت برتنے والے تھے۔

ہم نے ان لوگوں کو زمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جو کمزور خیال کئے جاتے تھے وہ سرزمین جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اس سے شام اور فلسطین کی مبارک سرزمین مراد ہے، بعض مفسرین اس میں مصر کو بھی داخل کرتے ہیں، بہر حال یہ زمین بنی اسرائیل کو فوراً نہیں مل گئی تھیں ان میں بہت سی کمزوریاں تھیں اور اقتدار کی منتقلی سے پہلے ان میں صلاحیت کا پیدا ہونا ضروری تھا، فرعون کے غرق ہونے کے بعد پونے صدی تک بنی اسرائیل نے خانہ بدوشی کی زندگی گزاری اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان میں مطلوبہ صلاحیت پیدا کی تو پھر انہیں شام و فلسطین کا وارث بنایا اور پھر ایک دور ایسا بھی آیا جب مصر کی خلافت بھی انہی کے حصے میں آئی، "سورۂ قصص"

میں بھی اسی طرح کا مضمون بیان ہوا ہے کہ ہم نے چاہا کہ جو لوگ زمین میں کمزور خیال کئے جاتے ہیں ان پر احسان کریں ان کو پیشوا اور زمین کا وارث بنادیں ان کو زمین میں ٹھکانہ مہیا کریں، ہم فرعون اور اس کے وزیر ہامان اور ان کے لشکروں کو دکھادیں کمزوروں کی طرف سے وہ بات جس سے وہ ڈرتے تھے، فرعونی ڈرا کرتے تھے کہ کبھی یہ کمزور سے لوگ ہم پر غالب نہ آجائیں ہم نے وہی بات ان کو کر کے دکھادی فرعون اور اس کے حواریوں کی سلطنت چھن گئی، لوگ ہلاک ہوگئے اور پوری کی پوری فوج غرق ہوگئی جن کو کمزور خیال کیا جاتا تھا ہم نے انہیں مشرق و مغرب، یعنی: شام و فلسطین کا مالک بنادیا اور یہ وہ سرزمین ہے جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں اس سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری و باطنی تمام خوبیوں سے مالا مال کیا ہے، ظاہری برکت تو یہ ہے کہ یہ علاقہ سرسبز و شاداب زرخیز اور خوش نظر ہے اس میں نہروں اور چشموں میں پانی کی فراوانی ہے جس کی وجہ سے یہ سرزمین خوب آباد اور پررونق ہے اور اس کی باطنی یا روحانی برکت یہ ہے کہ اس سرزمین میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے پیغمبر دفن ہیں اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے اس سرزمین کیلئے برکت کی دعا بھی کی تھی، ظاہر ہے کہ جہاں پیغمبر کا وجود ہوگا وہ جگہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مرکز ہوگی وہاں خدا تعالیٰ کی رحمتیں اتریں گی تو فرمایا اس کا مالک ہم نے بنی اسرائیل کو بنایا۔

قرآن کریم کے الفاظ میں غور کیجئے یہ نہیں فرمایا کہ جو قوم ضعیف و کمزور تھی بلکہ یہ فرمایا کہ جس کو فرعون کی قوم نے ضعیف و کمزور سمجھا تھا، اشارہ اس کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ جس قوم کی مدد پر ہوں وہ حقیقت میں کبھی کمزور و بے بس نہیں ہوتی گو کسی وقت اس کی ظاہری حالت سے دوسرے لوگ دھوکہ کھائیں اور ان کو کمزور سمجھیں مگر آخر کار سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کمزور و ذلیل نہ تھے کیونکہ حقیقت میں قوت و عزت حق تعالیٰ شانہٗ کے قبضہ میں ہے۔

زمین کا مالک بنادینے کیلئے لفظ ''اَوْرَثْنَا'' ارشاد فرمایا کہ: ہم نے ان کو وارث بنادیا، اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ جس طرح وارث ہی اپنے مورث کے مال کا مستحق ہوتا ہے باپ کی حیات ہی میں ہر شخص یہ جان لیتا ہے کہ اس کے مال و جائیداد کی مالک آخر کار اس کی اولاد ہے، اسی طرح اللہ کے علم میں بنی اسرائیل پہلے ہی سے فرعون کی قوم کے ملک و مال کے مستحق تھے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: مصر کا "دریائے نیل" سید الانہار ہے، یعنی: دریاؤں کا سردار ہے اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: برکتوں کے دس حصوں میں سے نو مصر میں ہیں اور باقی ایک پوری زمین میں۔

صبر کا پھل

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ

اور پورا ہو گیا وعدہ رب آپ کا نیکی کا اوپر بنی اسرائیل کے بوجہ اسکے کہ صبر کیا انہوں نے

وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

اور برباد کر دیا ہم نے جو تھے بناتے فرعون اور قوم اسکی اور جو تھے وہ اونچا پھیلاتے (۱۳۷)

بامحاورہ ترجمہ: اور آپ کے رب کا نیکی کا وعدہ بنی اسرائیل پر بسبب ان کے صبر کرنے کے پورا ہو گیا اور ہم نے خراب کر دیا جو کچھ فرعون اور اس کی قوم نے بنایا تھا اور جو اُونچا کر کے چھایا تھا۔ (۱۳۷)

لفظی تحقیق: **كَلِمَتُ:** بول۔ عام طور پر اس کو "کلمہ" لکھتے ہیں، کلام مجید میں اس جگہ لمبی "ت" سے لکھا جاتا ہے، ہر معنٰی والا لفظ جو منہ سے نکلے "کلمہ" کہلاتا ہے، یہاں اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی کیا تھا کہ عنقریب فرعون اور اس کی قوم کو تباہ کر کے بنی اسرائیل کو ان کا وارث اور جانشین بنایا جائے گا۔ **اَلْحُسْنٰى:** اسم تفضیل ہے اور "احسن" کا مؤنث ہے، یہ دونوں "حَسَنٌ" سے بنے ہیں جس کے معنٰی اچھائی، نیکی اور خوبصورتی کے ہیں، "احسن" کے معنٰی ہیں دل خوش کرنے والا، دل فریب، خوبصورت۔

دَمَّرْنَا: تباہ کر دیا ہم نے: اس کا مصدر تدمیر ہے جو "دما" سے بنا ہے جس کے معنٰی تباہی اور بربادی کے ہیں، "تدمیر" تباہ و برباد کرنا۔

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ ہم نے فرعون کو اس کے آدمیوں سمیت غرق کر کے بنی اسرائیل کو مصر اور شام کے زرخیز علاقوں کا مالک بنا دیا اور آہستہ آہستہ ان کے بادشاہوں کی سلطنت روئے زمین پر پھیل گئی اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا وہ احسان کا وعدہ جو اس نے بنی اسرائیل سے کیا تھا پورا ہوا اور یہ ان کے صبر کا بدلہ تھا جس سے وہ مدتوں فرعون کے ظلم و ستم سہتے رہے جو مصیبتیں اس نے ان پر ڈالیں انہیں خاموشی سے برداشت کیا، فرعون اور اس کی قوم نے ایکا کر کے اپنے غرور اور تکبر پر اتراتے ہوئے غریب لوگوں کو ستانے کیلئے جو ڈھونگ رچایا تھا اسے ہم نے تہس نہس کر دیا، اونچی اونچی فرواخ چھتوں والے محل چھوڑ کر سمندر کی تہہ میں بیٹھ گئے اور بنی اسرائیل نے دنیا میں اُبھرنا شروع کر دیا، اس آیت میں صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ آدمی کی فلاح اس کے اخلاق و عادات کی درستی پر موقوف ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں کہ اخلاق و عادات کیسے ہی ہوں دولت اور قوت سارے کام بنا دیتی ہے، دولت سے سخت سے سخت مخالفوں کو رام کیا جا سکتا ہے اور قوت سے سخت سے سخت دشمن کو کچلا جا سکتا ہے، ہو سکتا ہے کہ کچھ دن کیلئے یہ ڈھونگ چل جائے اور زبردست لوگ سمجھیں کہ اب ہم پورے طور پر دنیا پر مسلط ہو گئے اور ہمارے آگے کسی کی نہیں چل سکتی لیکن یہ غلط خیال ہے اس نے بہت سے لوگوں کو تباہ و برباد کیا ہے ان کی تباہی کے خود بخود ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو کبھی ان کے وہم و گمان میں بھی نہ گزرے تھے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے چاروں شانے چت جا پڑتے ہیں اور ان کے مخالف جنہیں انہوں نے دبا رکھا تھا اور کمزور سمجھتے تھے صبر و تحمل کی بدولت اوپر آ جاتے ہیں۔

جو چیز فرعون اور اس کی قوم بناتے تھے ہم نے اس کو ملیامیٹ کر دیا ظاہر ہے کہ فرعونی بڑی بڑی عمارتیں بناتے تھے محلات تعمیر کرتے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تباہ و برباد کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی ویران کر دیا جسے وہ اوپر چڑھاتے تھے اس سے ایک مراد تو اونچے اونچے مینار اور عمارتیں ہیں، جیسا کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو اونچا مینار تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ اوپر چڑھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو دیکھیں، یہ مینار تعمیر ہوا جسے اللہ تعالیٰ

نے ملیامیٹ کر دیا"یَعْرِشُوْنَ" سے مراد باغوں کی وہ بیلیں ہیں جنہیں درختوں پر چڑھایا جاتا ہے یا لکڑی کے فریم بنا کر ان کے اوپر چڑھا دیا جاتا ہے اس سلسلہ میں انگور کی بیل خاص طور پر قابل ذکر ہے جسے بہتر پھل حاصل کرنے کیلئے زمین سے اوپر اٹھا کر رکھنا پڑتا ہے خدا تعالیٰ نے یہ تمام باغ بھی تباہ کر دیئے، فرعونی قوم کی تمام عمارتیں، مینار، اور باغ تباہ ہو کر رہ گئے اور وہ خود بھی ہلاک ہوئے پھر ایک مدت کے بعد بنی اسرائیل کو اس سرزمین کا وارث بنایا جس کے بعد ان کی آزمائش کا دور شروع ہو گیا اس کا ذکر اسی سورۃ میں آگے آئے گا۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جب انسان کا مقابلہ کسی ایسے شخص یا جماعت سے ہو جس کا دفاع کرنا اس کی قدرت میں نہ ہو تو ایسے وقت کامیابی اور فلاح کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ مقابلہ نہ کرے بلکہ صبر کرے، انہوں نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی کسی کی تکلیف کا مقابلہ اس کی تکلیف سے کرتا ہے، یعنی: اپنا انتقام خود لینے کی فکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اسی کے حوالے کر دیتے ہیں کامیاب ہو یا ناکام اور جب کوئی شخص لوگوں کی تکلیف کا مقابلہ صبر اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے انتظار سے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اس کیلئے راستے کھول دیتے ہیں۔

غلامی رنگ لائی

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ

اور پار اتار دیا ہم نے | بنی اسرائیل کو | سمندر کے | پس آئے وہ | پر | ایک قوم | جو جمے ہوئے تھے

عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰـهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ

پر | بتوں | اپنے کے | بولے | اے موسیٰ! | بنا دے | لئے ہمارے | خدا | جیسے | لئے انکے خدا ہیں

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ

کہا یقیناتم ایک قوم ہو جو جہالت میں مبتلا ہو (۱۳۸) تحقیق یہ لوگ تباہ ہونے والی ہے وہ چیز وہ ہیں میں جس

وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

اور غلط ہے جو وہ کررہے ہیں (۱۳۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے اس پار اتار دیا تو ایک قوم پر پہنچے جو اپنے بتوں کے پوجنے میں لگے ہوئے تھے، بولے اے موسیٰ! ہماری عبادت کیلئے بھی ایسے ہی خدا بنادے، جیسے: ان کے خدا ہیں کہا بیشک تم لوگ جاہل قوم ہو۔ (۱۳۸) یہ لوگ جس چیز میں لگے ہوئے ہیں وہ تباہ ہونے والی ہے اور جو وہ کررہے ہیں غلط ہے۔ (۱۳۹)

لفظی تحقیق: يَعْكِفُوْنَ: جمے ہوئے۔ یہ "عَكْفٌ" سے بنا ہے اس کے معنیٰ ہیں ایک طرف دھیان جما کر بیٹھ جانا، اعتکاف بھی اسی سے بنا ہے۔ اَصْنَامٍ: بت۔ یہ "صنم" کی جمع ہے، کسی خیال کو مورت کی شکل میں ظاہر کیا جائے تو اسے "صنم" کہتے ہیں یہ مورت جس کو یہ لوگ پوجتے تھے، گائے کی تھی، ابتداء میں رب کا خیال ظاہر کرنے کیلئے اس شکل کو سامنے رکھتے تھے پھر رب کو بھول گئے اور اسی کی پوجا کرنے لگے۔

تفسیر

اَلْبَحْرَ: سمندر۔ اس بحر سے مراد "بحیرۂ قلزم" کی وہ شاخ ہے جو مصر اور جزیرہ نمائے سینا کے درمیان ہے، بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جب مصر سے نکلے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ سمندر پار کرکے ساحل پر پہنچ گئے وہاں انہوں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سامنے بت رکھ کر ان کی پوجا پاٹ کررہے ہیں انہیں بھی خیال آیا کہ اس میں کیا حرج ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور خیال کو یک سو کرنے کیلئے کوئی مورت اپنے سامنے رکھ لیں، چنانچہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ ہمارے لئے بھی ایسی ہی صورتیں بنانے کی اجازت مل جانی چاہئے، جیسے: انہوں نے بنارکھی ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر عبادت کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تم نہیں جانتے کہ اس میں کیا نقصان ہے، سنو! یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں یہ سب بے اصل خرافات ہیں اور ایک دن مٹ کر رہے گی کیونکہ اس میں نقصان ہی نقصان ہے فائدہ کوئی بھی نہیں، بنی اسرائیل مدتوں سے مصر میں بت پرستوں کے اندر رہتے چلے آرہے تھے اب جو یہاں لوگوں کو بت پوجتے دیکھا تو وہی شوق چرٓایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ شرک کا جال ہے اس کا مٹانا ہمارا فرض ہے۔

بنی اسرائیل قلزم سے پار ہوئے تو ایک مقام پر پہنچ کر ایک قوم کے پاس آئے یہ کون لوگ تھے جن پر بنی اسرائیل کا گزر ہوا اس کے متعلق مختلف قول ہیں بعض کہتے ہیں کہ یہ کنعانی یا عمالقہ کے لوگ تھے اور بعض کی تحقیق ہے کہ عربی قبیلہ بنی لخم کے ساتھ کچھ لوگ تھے تو بنی اسرائیل نے انہیں اس حالت میں پایا کہ وہ اپنے بتوں پر جھکے ہوئے تھے۔

یہاں پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ کیا بنی اسرائیل بھی بتوں کی اسی طرح عبادت کرنا چاہتے تھے جس طرح مشرک بتوں کی پوجا کرتے تھے؟ نہیں ایسا نہیں، بنی اسرائیل بتوں کی پوجا نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ انہیں خدا تعالیٰ کی عبادت کا وسیلہ بنانا چاہتے تھے، بتوں کو سامنے رکھ کر ان کے ذریعے خدا تعالیٰ کی عبادت کرنا چاہتے تھے، پرانے زمانے میں مشرک لوگ بھی یہی تصور رکھتے تھے وہ بھی بتوں کو تو معبود نہیں سمجھتے تھے البتہ انہیں ایک ذریعہ اور وسیلہ سمجھتے تھے گویا بت کے ذریعے خدا تعالیٰ کا تصور قائم کرتے تھے۔

بنی اسرائیل نے دیکھا کہ وہ قوم گائے کی صورت پوجتی تھی تو ان کو ایسی ہی خواہش پیدا ہوئی اور پھر اسی تصور کی بنا پر سامری نے سونے کا بچھڑا بنایا جسے قوم نے پوجا، اس کا ذکر بھی آگے آئے گا، بنی اسرائیل نے بھی انہی خیالات کی بناء پر خدا بنانے کی التجا کی جس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بڑی جاہل قوم ہو۔

ملت حنیفیہ کے لوگ اس تصور کو تسلیم نہیں کرتے کہ کسی چیز کا نمونہ سامنے رکھ کر خدا تعالیٰ کی عبادت کی جائے، حنیفی لوگ تو اپنے ذہن اور دماغ پر زور ڈال کر اپنی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں وہ جہالت کی شرکیہ رسموں سے پاک ہیں کہنے کو تو جاہل لوگ بھی خدا تعالیٰ ہی کی عبادت کرتے ہیں مگر وہ سامنے کوئی ایسا نمونہ رکھ لیتے

ہیں جس کی لگن ان کے دل میں موجود ہوتی ہے۔

تحقیق یہی لوگ ہیں جس چیز میں یہ ہیں وہ تباہ ہونے والی ہے، مطلب یہی ہے کہ یہ لوگ جس طریقے پر شرکیہ امور انجام دے رہے ہیں وہ انہیں تباہی کی طرف لے جا رہا ہے اور باطل ہے وہ عمل جو یہ انجام دے رہے ہیں ان کے شرکیہ کام بالکل قابل قبول نہیں بلکہ سراسر باطل اور مردود ہیں۔

معبود صرف اللہ تعالیٰ ہیں

قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾

کہا کیا سوا اللہ کے ڈھونڈوں تمہارے لئے دوسرا معبود اور اس نے بڑھایا تم کو پر تمام جہان والوں (۱۴۰)

وَ اِذْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ

اور جب چھڑایا ہم نے تم کو سے والوں فرعون کے دیتے تھے تم کو بُرا عذاب

یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ

مار ڈالتے تھے بیٹوں تمہارے کو اور زندہ رکھتے تھے عورتوں تمہاری کو اور میں اس احسان ہے

۱۶ ع ۱۲ ۲ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۱۴۱﴾

طرف سے رب تمہارے کی بڑا (۱۴۱)

بامحاورہ ترجمہ: ۔کہا کیا اللہ کے سوا تمہارے لئے کوئی اور معبود ڈھونڈوں حالانکہ اس نے تم کو تمام جہان والوں پر بڑائی دی۔(۱۴۰) اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات دی جو تم کو بُرا عذاب دیتے تھے جو تمہارے بیٹوں کو مار ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے رب کا بڑا احسان ہے۔(۱۴۱)

تفسیر

ارشاد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کو بھول جانا انسان کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے کیا ایسی بات کا اختیار کرنا مناسب ہوسکتا ہے یہ شروع میں تو بے ضرر سی معلوم ہوتی ہے لیکن آخر اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ لوگ بتوں ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں اور کفر وشرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، میں تمہاری درخواست نہیں مانتا کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور معبود بنا کر کھڑا کر دوں، اللہ تعالیٰ کی ایسی زبردست نشانیاں دیکھتے ہوئے کہ اس نے تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دی تو تم کو سارے جہان والوں سے اس وقت مرتبہ میں اونچا کر دیا اس کے بھول جانے کا سامان کرنا بڑا ظلم ہے آگے کی آیت میں یہودیوں کو پھر اس بڑی نعمت کی یاد دلائی جاتی ہے جو ان کے باپ دادوں پر کی گئی، اگر یہ نعمت ان پر نہ کی گئی ہوتی تو آج ان کا نشان زمین پر ڈھونڈے بھی نہ ملتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے مزید فرمایا: کیا میں تمہارے لئے خدا کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں کہ تم اس نمونے کو سامنے رکھ کر عبادت کر سکو، حالانکہ اس نے تمام جہان والوں پر تمہیں فضیلت عطا کی، اللہ تعالیٰ نے ان کے دور میں بنی اسرائیل کو تمام جہان کی قوموں پر برتری عطا کی، فرمایا جس مالک الملک نے تمہیں عظمت عطا کی ہے، اس کے انعاموں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے نہ کہ اس کی عبادت میں غیروں کو شریک کرنا چاہئے یہ تو بڑے شرم کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کیا جائے یا کوئی شخص اس کے وسیلے کے ذریعے خدا تعالیٰ کی عبادت کرے اور یہ سمجھے کہ اس کے بغیر عبادت کر ہی نہیں سکتا، یہ کتنی غلط بات ہے، بت جسے سامنے رکھ کر عبادت کی جاتی ہے وہ تو خود انسان سے کم تر ہے اسے تو خود انسانی ہاتھوں نے بنایا ہوا ہے وہ انسان سے اعلیٰ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس سے خود انسان بہت زیادہ افضل ہے مگر بے وقوفی کی انتہاء ہے کہ انسان تمام مخلوق میں سب سے اعلیٰ ہونے کے باوجود اپنے سے کم تر چیز کی تعظیم کرتا ہے ایسا عمل کر کے انسان نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکریہ ادا نہیں کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فضیلت بخشی ہے مگر تم دوسروں کو اس کے ساتھ شریک بنا رہے ہو یہ بہت ہی غلط تصور ہے۔

حضرت ابو واقد اللیثی رضی اللہ عنہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین کی جنگ میں ہم سفر تھے راستے میں آپ کا گزر ایک بیری کے درخت پر ہوا مشرک لوگ اس درخت کو مقدس خیال کرتے تھے اور تبرک کیلئے اپنے ہتھیار اس درخت سے لٹکاتے تھے اس درخت کو "ذات انواط" کہا جاتا تھا اس درخت کو دیکھ کر بعض مسلمانوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا ہمارے لئے بھی کوئی "ذات انواط" بنا دیں جس سے ہم اپنی تلواریں وغیرہ لٹکایا کریں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سبحان اللہ! یہ تو وہی بات ہوئی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے آپ سے کہی تھی یہ تو بڑی بے وقوفی اور حماقت کی بات ہے، مشرک لوگ تو کسی مشرکانہ تصور کی بنا پر اس درخت کو مقدس خیال کرتے ہیں مگر تم بھی انہی کی مشابہت اختیار کرنا چاہتے ہو؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے سے یہ بھی فرمایا کہ: تم بھی پہلے لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرو گے اور پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی، فرمایا: جس خدا نے تمہیں برتری عطا کی ہے اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرانا چاہئے اس کی عظمت اور تقدس کو پہچاننا چاہئے اس قسم کے بت یا کوئی دوسری چیز عبادت کے وقت سامنے رہنا اس کی عظمت کے خلاف ہے۔

اس وقت کو یاد کرو ابھی زیادہ مدت نہیں گزری کہ ہم نے تمہیں فرعون سے نجات دی، فرعونی تمہیں کتنی ذلت ناک سزا دیتے تھے وہ تمہیں بہت بڑا عذاب دیتے تھے اور وہ اس طرح تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے تاکہ انہیں لونڈیاں بنا کر ان سے خدمت لے سکیں، بچوں کے متعلق خطرہ تھا کہ اگر ان کی آبادی بڑھ گئی تو کہیں ہم پر غالب نہ آ جائیں اور ہماری سلطنت پر قبضہ نہ کر لیں؛ اس لئے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے، روایتوں میں آتا ہے کہ فرعونیوں نے بنی اسرائیل کے ہزاروں بچے قتل کروا دیئے تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے احسان کو یاد کرو! جس نے قریبی زمانہ میں تمہیں اس عذاب سے نجات دی ہے تمہیں تو شرکیہ کاموں کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے اپنے اوپر انعام کرنے والے کی احسان فراموشی نہیں کرنی چاہئے اس نے تمہارے دشمن کو نہ صرف تم سے دور کر دیا بلکہ اسے ہمیشہ کیلئے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اب تمہیں اللہ تعالیٰ کا احسان مند ہونا چاہئے۔

اس بات میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی" بَلَآءٌ " کا معنیٰ: آزمائش بھی آتا ہے اور احسان بھی، اگر اس کا معنیٰ احسان کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں فرعون سے نجات دینے میں اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا اور اگر" بَلَآءٌ " کا معنیٰ آزمائش کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ فرعون کی طرف سے بیٹوں کے مارنے اور بیٹیوں کے زندہ رکھنے میں بڑی آزمائش تھی، تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے بچوں کو قتل کردیا جاتا تھا مگر تم بے بس تھے اور کچھ نہیں کرسکتے تھے یہ تمہارے لئے بہت بڑا امتحان تھا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس ظلم وستم سے نجات دی فرعونی قوم نے تمہیں غلام بنا رکھا تھا تم سے بلا معاوضہ محنت ومشقت کا کام لیتے تھے تمہاری عورتوں کو لونڈیاں بنا رکھا تھا مگر تم ان کے مقابلے میں بے بس تھے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان مشکلوں سے نکالا تو تمہیں اس کا احسان مند ہونا چاہئے تھا اور اس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے تھا نہ کہ کوئی جہالت اور نادانی کی بات کرنی چاہئے تھی یہ تو سخت جہالت اور نادانی کی بات ہے کہ تم مشرکوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں کو معبود بنانے کا مطالبہ کررہے ہو، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو اس طرح بات سمجھائی اور اللہ تعالیٰ کے احسان یاد کرائے۔

قانون کی طلب

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ

اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا اور پورا کیا ہم نے اس کو سے دس پس پوری ہوئی مدت

رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ

رب اس کے کی چالیس رات اور کہا موسیٰ نے سے بھائی اپنے ہارون میرا نائب رہ میں

قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

قوم میری اور اصلاح کر اور نہ پیروی کر راہ کی فساد والوں کی (۱۴۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ کیا اور ان کو پورا کیا دس دن اور ملا کر پس آچکے رب کی مدت چالیس رات پوری ہوگئی اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا تو میرا جانشین رہ میری قوم میں اور

اصلاح کرتے رہنا اور مفسدوں کی راہ پر مت چلنا۔(۱۴۲)

لفظی تحقیق: مِیْقَاتُ: اسم ہے، جو میزان کے وزن پر وقت سے بنا ہے اس کے معنیٰ ہیں ایک معین مدت جو کسی ایک کام کے پورا کرنے کیلئے کافی ہو۔

تفسیر

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا وہ واقعہ مذکور ہے جو فرعون کے غرق ہونے کے بعد "توراۃ" لینے کیلئے طور پہاڑ پر گئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد ہے کہ ہم نے موسیٰ سے تیس دن کی مدت مقرر کردی کہ طور پہاڑ پر جا کر عبادت اور دعا میں مشغول رہیں، روزہ رکھیں اور اللہ تعالیٰ کے دھیان میں سارا وقت گزاریں جب تیس دن پورے ہوگئے تو دس کا اس میں اضافہ کیا گیا اور تنہائی میں عبادت کا ایک چلہ پورا ہوگیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حکم کے پورا کرنے کیلئے تیار ہوکر جانے لگے تو اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا کہ تم میرے پیچھے بنی اسرائیل کے نگران رہو گے ان کی دیکھ بھال کرنا کہ یہ کہیں واہی تباہی باتوں میں نہ پھنس جائیں، ہر وقت ان کی اصلاح کی کوشش کرتے رہنا، کیوں کہ ان میں کبھی کبھی ان بیہودہ رسموں کا شوق خواہ مخواہ چڑآتا ہے وہ جو مصر میں مدتوں تک دیکھتے رہے ہیں اور جن پر فرعون انہیں زبردستی چلاتا رہا ہے ان میں بہت سے لوگ ابھی شیطانی کاموں کی طرف بہت جلد مائل ہوجاتے ہیں اور فتنہ وفساد پھیلانے میں انہیں خاص طور پر دلچسپی ہوتی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ غالب آجائیں اور سارا کیا کرایا ضائع ہوجائے، تم ہرگز ان کے داؤ گھات کو کامیاب نہ ہونے دینا اور جو وہ کہیں اس کے خلاف کرنا ورنہ وہ ان سب کے تباہ کرنے میں کسر نہ رکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا، یعنی: طور پہاڑ پر تیس رات مسلسل اعتکاف کریں تو آپ کو کتاب دی جائے گی اور تیس رات کے بجائے اعتکاف کی مدت چالیس رات کردی گئی، بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اعتکاف کی لازمی مدت تیس رات ہی تھی تاہم مزید دس راتیں اختیاری تھیں، یعنی: حضرت

موسیٰ علیہ السلام اگر چاہتے تو دس رات کا اضافہ کر سکتے تھے اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کے دوسرے واقعہ میں ملتی ہے جس کا ذکر "سورۂ قصص" میں موجود ہے جب آپ مدین پہنچے اور وہاں حضرت شعیب علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا تھا کہ اگر تم آٹھ سال یہاں رہ کر میری خدمت کرو تو میں اپنی بیٹی کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں گا پھر انہوں نے یہ بھی فرمایا اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری طرف سے ہوگا، مفسرین فرماتے ہیں کہ اسی طرح طور پہاڑ پر اعتکاف بھی تیس رات کیلئے ضروری تھا اور مزید دس رات اختیاری تھا اور یہ تیس راتیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق ذوالقعدہ کے مہینے کی راتیں تھیں اور پھر ان پر دس راتیں ذوالحجہ کی بڑھائی گئیں اس سے معلوم ہوا کہ "تورات" کا عطیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوم النحر (یعنی: عیدالاضحیٰ) کے دن ملا۔

چلّہ کی اہمیت

چالیس دن کو بعض دوسرے کاموں میں بھی اہمیت حاصل ہے، مثلاً: ماں کے پیٹ میں بچے کی پیدائش کے مرحلے چالیس چالیس دن کے بعد تبدیل ہوتے ہیں، حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ جو شخص چالیس دن تک خلوص نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل سے حکمت کے چشمے جاری فرما دیتے ہیں، بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن تک روزہ رکھا اور اعتکاف کیا، جب قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا تو دوبار صور پھونکا جائے گا پہلے اور دوسرے صور کے درمیان ۴۰ سال کا عرصہ ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تو جیسا کہ اگلی آیتوں میں آرہا ہے اللہ تعالیٰ نے تختیوں پر لکھی لکھائی "تورات" عطا فرمائی۔

حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی ہیں، جو عمر میں تین سال بڑے تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیغمبری کی ذمہ داریوں کے بوجھ کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ان کے بھائی کو بھی پیغمبری عطا کی جائے تاکہ وہ ان کے پیغمبری کے کام میں ان کی مدد کر سکیں اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول کر کے حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی پیغمبری عطا فرمائی بلکہ انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وزیر بنا دیا اب جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اعتکاف کیلئے طور پہاڑ پر جارہے تھے تو قوم کو نگرانی کے بغیر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا، قرآن پاک میں موجود ہے کہ

جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے تو ان کے بارہ قبیلے تھے ہر ایک قبیلے کا ایک سردار تھا جو ان کی رہنمائی کرتا تھا اور پھر بحیثیت مجموعی وہ سب موسیٰ علیہ السلام کی نگرانی میں تھے، تفسیری روایتوں کے مطابق چھ لاکھ ستر ہزار افراد پر مشتمل اس قوم کی رہنمائی کیلئے نگران کی ضرورت تھی، ظاہر ہے کہ کوئی چرواہا بھی بکریوں کو بلا نگرانی چھوڑ کر نہیں جاسکتا وہ بھی کسی کے سپرد کر کے جاتا ہے مگر یہ لاکھوں انسانوں کا مسئلہ تھا خاص طور پر ان حالات میں کہ مسلسل غلامی میں رہنے کی وجہ سے ان کی عادتیں اور خصلتیں خراب ہوگئی تھیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پہاڑ پر جانے لگے تو انہوں نے قوم کی رہنمائی کیلئے اپنے بڑے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کرنا چاہا یہاں پر اسی بات کو بیان کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے کہا آپ میری قوم میں میرے نائب بن جائیں جب تک میں طور سے واپس آؤں قوم کی نگرانی کا فرض آپ انجام دیتے رہیں، آج کی دنیا میں بھی یہ اصول رائج ہے جب کبھی کسی ملک کا سربراہ بیرون ملک جاتا ہے تو وہ اپنا جانشین مقرر کر کے جاتا ہے تاکہ اس کی غیر حاضری میں ملکی کاموں کے انجام دینے میں رکاوٹ نہ آئے، یہ طریقہ دراصل پیغمبروں کی تعلیم ہی سے لیا گیا ہے تو اس اصول کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا کہ آپ میرے جانشین بن جائیں اور قوم کی اصلاح کی طرف توجہ دینا تاکہ کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو جائے اور فساد کرنے والوں کے راستے پر نہ چلنا حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے کردار سے واقف تھے، فرعون کی غلامی میں رہ کر ان کی صلاحتیں بگڑ چکی تھیں ان میں بہت سے فسادی لوگ بھی موجود تھے؛ اس لئے اپنے جانشین سے فرمایا کہ قوم کی اصلاح کرنا اور فسادیوں کے پیچھے نہ لگنا غلط قسم کے لوگ قوم میں بگاڑ کا باعث بنیں گے، لہٰذا ان کے طریقے سے بچنا اور میرے نائب ہونے کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔

احکام و مسائل

مسئلہ (۱):.... اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ پیغمبروں کی شریعتوں میں تاریخ کا حساب رات سے ہوتا

ہے کیونکہ اس آیت میں بھی تیس دن کے بجائے تیس راتوں کا ذکر فرمایا ہے وجہ یہ ہے کہ پیغمبروں کی شریعت میں چاند کے مہینے معتبر ہیں اور چاند کے مہینے کا شروع چاند دیکھنے سے ہوتا ہے وہ رات ہی میں ہوسکتا ہے؛ اس لئے مہینہ رات سے شروع ہوتا ہے پھر اس کی ہر تاریخ سورج غروب ہونے سے شمار ہوتی ہے جتنے آسمانی مذہب ہیں ان سب کا حساب اسی طرح چاند کے مہینوں سے اور شروع تاریخ سورج غروب ہونے سے اعتبار کی جاتی ہے۔

مسئلہ (۲):.... سورج کے حساب سے تاریخ دنیاوی فائدوں کیلئے ہے اور چاند کا حساب عبادتوں کی ادائیگی کیلئے ہے۔

مسئلہ (۳):.... اس آیت سے ثابت ہوا کہ اہم کاموں کیلئے اللہ تعالیٰ کا طریقہ ایک خاص وقت مقرر کرنا اور سہولت اور درجہ بدرجہ انجام دینا ہے جلد بازی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

مسئلہ (۴):.... اس آیت سے ثابت ہوا کہ جو شخص کسی کام کا ذمہ دار ہو وہ اگر کسی ضرورت سے کہیں جائے تو اس پر لازم ہے کہ اس کام کا انتظام کر کے جائے۔

مسئلہ (۵):.... یہ بھی ثابت ہوا کہ حکومت کے ذمہ دار حضرات جب کہیں سفر کریں تو اپنا قائم مقام اور جانشین مقرر کر کے جائیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عام عادت یہی تھی کہ جب کبھی مدینہ سے باہر جانا ہوا تو کسی شخص کو جانشین بنا کر جاتے تھے ایک مرتبہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو جانشین بنایا، ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کو اسی طرح مختلف وقتوں میں مختلف صحابہ کو مدینہ میں جانشین بنا کر باہر تشریف لے گئے۔

مسئلہ (۶):.... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو جانشین بناتے کے وقت ان کو چند ہدایتیں دیں، اس سے معلوم ہوا کہ جس کو قائم مقام بنایا جائے اس کی سہولت کیلئے ضروری ہدایتیں دے کر جائے۔

اللہ تعالیٰ کا دیدار

وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِیْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ

اور جب آئے موسیٰ لئے مقررہ مدت ہماری کے اور کلام کیا اس سے رب اسکے نے کہا اے رب میرے! دکھا مجھے کہ میں نظر کروں

اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ

طرف آپکی کہا توہرگزنہ دیکھے گا مجھ کو اور لیکن نظر کر طرف پہاڑ کی پس اگر ٹھہرا رہا

مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ۚ

اپنی جگہ پر پس عنقریب دیکھ لے گا تو مجھ کو

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب موسیٰ ہمارے وعدے پر پہنچا اور کلام کیا اس سے اس کے رب نے بولا تو مجھ کو دکھا کہ میں تجھ کو دیکھوں، فرمایا: تو مجھ کو ہرگز نہ دیکھ سکے گا لیکن تو پہاڑ کی طرف دیکھتا رہ اگر وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو تُو مجھ کو دیکھ لے گا۔

تفسیر

ان کے رب نے ان سے بات کی، بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے بات کرنے کا شرف حاصل ہوا وہ عرفہ کا دن تھا گویا نو ذی الحجہ کو اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام یا اور اگلے دن، یعنی: دس ذی الحج کو "تورات" عطا فرمائی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ مرتبہ ایک دم حاصل نہیں ہوا بلکہ آپ درجہ بدرجہ ترقی کی منزلیں طے کرتے گئے، پہلے مدین سے واپسی پر پیغمبری عطا ہوئی، فرعون سے بحث مباحثہ ہوتا رہا آخرکار فرعون اور اس کی قوم غرق ہوئی اور بنی اسرائیل کو آزادی نصیب ہوئی اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے طور پہاڑ پر اعتکاف کیا پھر اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی ہوئی اور آخر میں "تورات" عطا ہوئی، بہرحال فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام وعدے کے مطابق طور پر آئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ سے بات کی، دوسری جگہ پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے تو ہر پیغمبر سے کلام کیا ہے مگر براہِ راست بات کرنے کا شرف صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہوا۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بات کرنے کا اعزاز بخشا تو انہیں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا تاکہ جس ذات باری تعالیٰ سے بات چیت ہوئی ہے اسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے شوق کے ساتھ عرض کیا کہ اے پروردگار! مجھے دیکھنے کا موقع دیجئے کہ میں آپ کی طرف دیکھ سکوں کلام تو سن لیا ہے اب دیدار بھی حاصل ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکے گا، اس پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہا تو ممکن ہے کہ تو مجھے دیکھ سکے۔

تجلّی کا اثر

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ

پس جب ظاہر ہوا رب اسکا طرف پہاڑ کی کرڈالا اسکو ریزہ ریزہ اور گرے موسیٰ بے ہوش ہوکر پس جب

اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

ٹھیک ہوئے بولے پاک ہیں آپ توبہ کی میں نے طرف آپکی اور میں پہلا ہوں یقین کرنے والوں میں (۱۴۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنا نور ڈالا اس کو ریزہ ریزہ کردیا اور موسیٰ بے ہوش ہوکر گر پڑے پھر جب ہوش میں آئے تو بولے آپ کی ذات پاک ہے میں نے آپ کی طرف توجہ کی اور میں سب سے پہلے یقین لایا۔ (۱۴۳)

تفسیر

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شوق کے دیدار میں بے تاب ہوکر اپنے رب سے درخواست کی کہ مجھے ان آنکھوں سے اپنا دیدار کرا دیجئے جواب ملا کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا، اطمینان کرنے کیلئے ہم کہتے ہیں کہ اس پہاڑ کی طرف دیکھ ہم اپنی تھوڑی سی جھلک اس پر ڈالتے ہیں اگر یہ اسے برداشت کر گیا تو تو بھی مجھے دیکھ لے گا۔

ارشاد ہے کہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یقین دلانے کیلئے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کھلم کھلا نہیں ہوسکتا پہاڑ پر اپنے نور کی تھوڑی سی جھلک ڈالی پہاڑ کا وہ حصہ جس پر وہ جھلک پڑی ریزی ریزہ ہوکر زمین کے برابر ہوگیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس منظر کی تاب نہ لاسکے اور بیہوش ہوکر گر پڑے، کچھ دیر کے بعد جب ہوش آیا تو کہا اور میں

ہی سب سے پہلا شخص ہوں جسے اس بات کا پورا یقین تجربے سے حاصل ہوگیا ہے کہ واقعی اس دنیا میں آپ کا دیدار نہیں ہوسکتا۔

جَعَلَهٗ دَكًّا: تو اس کو ریزہ ریزہ کردیا، روایتوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھوٹی انگلی، یعنی: چھنگلی کے ذرا سے کنارے کے برابر اپنا نور ڈالا مگر پہاڑ اسے بھی برداشت نہ کرسکا اور ریزہ ریزہ ہوگیا۔

"امام احمد، ترمذی، حاکم" نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے اور اس کی سند کو "امام ترمذی" اور "حاکم" نے صحیح قرار دیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرما کر ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے سرے پر انگوٹھا رکھ کر اشارہ فرمایا کہ: اللہ جل شانہٗ کے نور کا صرف اتنا سا حصہ ظاہر کیا گیا تھا جس سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا یہ ضروری نہیں کہ سارا پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا ہو بلکہ جس حصہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنا نور ظاہر فرمایا وہ حصہ ہی ریزہ ریزہ ہوا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تسکین

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَ بِكَلَامِىْ ۖ

کہا اے موسیٰ! بیشک میں نے چن لیا تجھ کو پر لوگوں ساتھ پیغاموں اپنے کے اور ذریعے کلام اپنے کے

فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِى

پس پکڑ لے جو دیا میں نے تجھے اور ہوجا تو میں سے شکر گزاروں (۱۴۴) اور لکھ دی ہم نے لئے اس کے میں

الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ

تختیوں سے ہر چیز نصیحت اور تفصیل ہر چیز کی

فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ

پس پکڑ اس کو سے زور اور حکم کر قوم اپنی کو لے لیں وہ بہتر باتیں اس کی جلد دکھلا دوں گا میں تم کو

دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٤٥﴾

گھر نافرمانوں کا (۱۴۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔فرمایا: اے موسیٰ! میں نے تجھ کو لوگوں پر چنا اپنے پیغام بھیجنے اور اپنے کلام کرنے کے ذریعے، سو! لے جو میں نے تجھ کو دیا اور شکر کر۔(۱۴۴) اور ہم نے اس کو تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت کی اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی، سو! ان کو زور سے پکڑ لے اور اپنی قوم کو حکم کر کہ اس کی بہتر باتیں پکڑے رہیں عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا ٹھکانہ دکھادوں گا۔(۱۴۵)

تفسیر

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا جارہا ہے کہ ان کا کام بہت عظیم الشان ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا مرتبہ بہت بلند ہے؛ اس لئے انہیں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہئے اور اپنے فرض کو بہت زور کے ساتھ انجام دینا چاہئے، دنیا میں انسان کی عظمت کا دارومدار اس کام کی نوعیت پر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے ذمے مقرر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا دیدار اس دنیا کا نہیں آخرت کا مسئلہ ہے، ارشاد ہے کہ اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے موسیٰ! تجھے خوش ہونا چاہئے کہ میں نے تجھے اپنا پیغام لوگوں کی طرف پہنچانے کیلئے منتخب کیا اور تجھ سے خود براہِ راست کلام کیا، اب جو کچھ میں نے تجھے اپنے فضل وکرم سے عطا کیا ہے اس کو لے لو اور اس کیلئے میرے شکر گزار بنو، اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چند تختیاں جن پر ”تورات“ لکھی ہوئی تھی دی، چنانچہ ارشاد ہے کہ ہم نے اس کو تختیوں پر لکھی ہوئی ہر بات سے متعلق ضروری باتیں اور ہدایتیں عطا فرمائیں جن میں وعظ ونصیحت جہالت کی باتوں سے بچنے کی ترغیب اور تفصیل کے ساتھ حلال وحرام کا فرمجرموں کی سزاؤں کے قانون، عبادت کے طریقے اور دین سے متعلق ساری باتیں درج تھیں اور کہا کہ ان سب باتوں پر پوری کوشش اور قوت کے ساتھ خود عمل کرو اور اپنی قوم بنی اسرائیل سے میری طرف سے یہ کہو کہ ان میں سے بہتر سے بہتر باتیں چن کر ان پر عمل کریں، یعنی: صرف رخصتوں پر ہی نہیں بلکہ ان پر بھی جن پر زیادہ ثواب کا وعدہ ہے ان پر عمل

کرو، دین اسی وقت محفوظ رہتا ہے جب اس کی اچھی باتوں کو کوشش کے ساتھ قائم رکھا جائے، اس کے بعد ارشاد ہے کہ عنقریب میں تم کو ان لوگوں کے مقام اور ٹھکانے دکھاؤں گا جنہوں نے میری نافرمانی پر کمر باندھی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے موسیٰ کیلئے تختیوں میں ہر قسم کی نصیحت لکھ دی، یعنی: جو "تورات" ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی وہ نصیحت کا مجموعہ تھی، پوری "تورات" تختیوں کی دونوں طرف لکھی ہوئی تھی باقی رہی یہ بات کہ کل کتنی تختیاں تھیں اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، مفسرین کے مختلف قول ہیں، دس یا کم و بیش تختیوں کا ذکر بھی آتا ہے، تختیوں کی ساخت کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں کہ یہ لکڑی کی تھیں، زمرد کی یا کسی دوسری دھات، لوہے، تانبے وغیرہ کی بنی ہوئی تھیں تاہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ہم نے ان تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت لکھ دی، نصیحت سے وہ باتیں مراد ہیں جن کو سن کر انسان کے عقیدوں کی اصلاح ہوتی ہے عمل کی قوت بڑھتی ہے اور کوتاہیاں دور ہوتی ہیں، یہ نصیحت تمام آسمانی کتابوں کا موضوع ہے وعظ و نصیحت اعلیٰ درجے کی چیز ہے مگر بعض لوگ اسے صرف ثواب کی نیت سے سنتے ہیں کہ کوئی اچھی بات سن لی تو اس سے ثواب حاصل ہو جائے گا، ایسا نہیں ہے بلکہ یہ تو اصلاح ہے جس پر عمل کرنے سے ہی انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ: ان کو مضبوطی سے پکڑ لو، یعنی: اس "تورات" میں موجود حکموں پر سختی سے عمل کرو اور قوم سے کراؤ، مطلب یہ کہ ان کے حکموں کو دل کے پختہ ارادے سے پکڑیں، دل کی محبت اور توجہ کے ساتھ انہیں سیکھیں سکھائیں اور ان پر عمل کریں اگر ایسا کرو گے تو پختہ ہو جاؤ گے اور اس کا تمہیں فائدہ ہو گا اور اگر یہ چیز پیدا نہ ہو سکی تو کتاب سے تعلق پختہ نہیں ہو گا، انسانی سوسائٹی میں اسے رائج نہیں کیا جا سکے گا، قرآن کریم اور دوسری آسمانی کتابوں کے متعلق بھی یہی حکم ہے۔

سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ: اپنی قوم کو اچھے کام کرنے کا حکم دو، میں عنقریب تمہیں فاسقوں کا گھر دکھادوں گا، فاسقوں اور نافرمانوں کے گھر سے دوزخ بھی مراد ہو سکتی ہے کیونکہ نافرمان لوگ بالآخر وہیں پہنچیں گے۔

اس جگہ "دَارَ الْفٰسِقِيْنَ" سے کیا مراد ہے اس میں دو قول ہیں، ایک ملکِ مصر، دوسرا ملکِ شام، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فتح کرنے سے پہلے مصر پر فرعون اور اس کی قوم حکمران اور غالب تھی اس کی وجہ سے مصر کو

"دَارَ الْفٰسِقِيْنَ" اور ملک شام پر عمالقہ کا قبضہ تھا وہ بھی کافر فاسق تھے: اس لئے اس وقت شام بھی "دَارَ الْفٰسِقِيْنَ" تھا ان دونوں میں سے اس جگہ کون سا ملک مراد ہے اس میں اختلاف اس بنیاد پر ہے کہ فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل مصر میں واپس چلے گئے تھے یا نہیں، اگر اس وقت مصر واپس گئے اور مصر کی بادشاہت پر قبضہ کر لیا جیسا کہ آیت "وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ" سے اس کی تائید ہوئی تو مصر پر قبضہ اور غلبہ اس واقعہ طور (پہاڑ پر اللہ تعالیٰ کے نور ڈالنے) سے پہلے ہو چکا ہے اس میں "سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ" کا مفہوم ملک شام متعین ہو جاتا ہے اور اگر اس وقت واپس نہیں گئے تو دونوں ملک مراد ہو سکتے ہیں۔

متکبر ٹیڑھے چلتے ہیں

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ

عنقریب میں پھیر دوں گا سے اپنی نشانیوں ان کو جو اکڑتے پھرتے ہیں میں زمین بغیر حق کے

وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ

اور اگر دیکھ لیں وہ ہر نشانی نہ ایمان لائیں وہ پر اس اور اگر دیکھ لیں راستہ ہدایت کا

لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ

نہ پکڑیں گے وہ اس کو راستہ اور اگر دیکھ لیں راستہ گمراہی کا پکڑ لیں گے اس کو راستہ

بامحاورہ ترجمہ:۔ میں اپنی نشانیوں سے ان کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اور اگر وہ ساری نشانیاں دیکھ لیں تب بھی اس پر ایمان نہ لائیں گے اور اگر دیکھ لیں ہدایت کا راستہ تب بھی اس راستے کو اختیار نہیں کریں گے اور اگر دیکھ لیں گمراہی کا راستہ تو اس کو اپنا لیں گے۔

لفظی تحقیق: يَتَكَبَّرُوْنَ: بڑے بنتے ہیں۔ یہ "كِبْرٌ" سے بنا ہے "كِبْرٌ" کے معنیٰ یہاں ہیں بناوٹی طور پر بڑا بننا، یعنی: ایک شخص واقع میں تو چھوٹے درجے کا ہے مگر خواہ مخواہ بڑا بنتا ہے یہ معنیٰ "بِغَيْرِ الْحَقِّ"

سے جو اس کے بعد ذکر کیا گیا ہے سمجھ آتے ہیں۔ بِغَيْرِ الْحَقِّ: حق کے معنٰی واقعی اور ٹھیک کے ہیں، "بِغَيْرِ الْحَقِّ" کی جگہ ہم اپنی زبان میں ناحق کہیں گے، یعنی: کوئی چیز واقع میں تو کسی کی نہ ہو لیکن وہ اس پر قبضہ کرلے۔ رشد اور غی: ایک دوسرے کے مقابل لفظ ہیں، رشد: کے معنٰی ہیں سچائی اور درستی، غی کی ضد ہے، یعنی: جھوٹا پن، خرابی اور کجی۔ سَبِيْلَ الرُّشْدِ:: سیدھا راستہ۔ سَبِيْلَ الْغَيِّ: گمراہی کا راستہ۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: ہم اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کا دل پھیر دیں گے جو اپنے آپ ہی کو بڑا سمجھتے ہیں اور دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتے حالانکہ وہ اگر غور کریں تو ان میں کوئی بڑائی نہیں وہ سر سے پاؤں تک عاجز ہیں، یہ اگر تمام نشانیاں دیکھ لیں تو بھی ان کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو نہ سمجھیں گے ان کی خصلت تو یہ ہے کہ سیدھا راستہ دیکھ بھی لیں تو اس سے کترا کر چلیں گے اور ٹیڑھا راستہ دیکھتے ہی جھٹ اس کو اختیار کرلیں گے جو آدمی کسی چیز کی نشانیاں دیکھ کر عقل سے اس کے وجود کو نہ سمجھے تو جان لینا چاہئے کہ وہ اپنی خواہشوں کے جنجال میں پھنسا ہوا ہے خودغرضی نے اسے اندھا کر رکھا ہے، سیدھے راستہ کو جان بوجھ کر چھوڑتا ہے۔

امام سفیان ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ، امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے آپ اپنے زمانے کے بڑے محدث اور امام ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آیات سے پھیر دینے کا مطلب یہ ہے کہ متکبر لوگ قرآن کریم کی صحیح سمجھ سے کورے ہوں گے ان کو قرآن کریم کی سمجھ ہی نہیں آئے گی، امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ کلام تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب "تورات" کے ضمن میں ہو رہا ہے مگر تمام آسمانی کتابوں کا یہی حکم ہے کہ جو بھی زمین میں ناحق تکبر کریں گے وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے، بہرحال فرمایا کہ: آسمانی کتابوں کی سمجھ میں تکبر بہت بڑی رکاوٹ ہے مغرور آدمی اللہ تعالیٰ کی کتاب کو نہیں سمجھ سکے گا؛ اسی لئے فرمایا کہ میں اپنی آیتوں کو ایسے لوگوں سے پھیر دوں گا۔

ارشاد ہوتا ہے کہ اس قسم کے مغرور لوگوں کی حالت یہ ہے کہ اگر ہر قسم کی نشانی دیکھ لیں پھر بھی ایمان نہیں

لاتے، پہلے گزر چکا ہے کہ وہ جو بھی نشانی دیکھتے تھے اسے جادو کہہ کر انکار کر دیتے تھے اور ایمان نہیں لاتے تھے ان کی طبیعتوں میں بھی غرور و تکبر جڑ پکڑ چکا تھا۔

پیغمبر جو راستہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں کے ذریعے واضح کرتے ہیں وہ ہدایت ہی کا راستہ ہوتا ہے مگر ان لوگوں کی ذہنیت اس قدر بگڑ چکی ہے کہ راستے کو راستہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے اور اگر وہ گمراہی کے راستے کو دیکھیں تو جھٹ سے اس راستے کو اپنا لیتے ہیں، یعنی: وہ لوگ عیاشی، فحاشی، برائی، کھیل تماشہ، نام و نمود اور باطل رسموں اور فضول کاموں کو دیکھتے ہیں تو فوراً اس کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں۔

کام کئے بغیر مزدوری کیسی؟

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيْنَ

یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے جھوٹا کہا آیتوں ہماری کو اور رہے سے ان بے خبر (۱۴۶) اور جن لوگوں نے

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ

جھوٹا کہا آیتوں ہماری کو اور ملنے کو آخرت کے بیکار ہوئے عمل ان کے کیا بدلہ پائیں گے وہ

عٓ ۱۷ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

مگر اسکا جو تھے وہ کرتے (۱۴۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھوٹ جانا اور ان سے بے خبر رہے۔(۱۴۶)
اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو ان کی محنتیں برباد ہوئیں نہیں بدلہ دیا جائے گا مگر اس کا جو وہ عمل کرتے تھے۔(۱۴۷)

تفسیر

وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا نہ تو اس دنیا میں ہمارے حکموں اور

شریعت کو تسلیم کیا اور نہ ہی مرنے کے بعد جی اٹھنے پر یقین کیا کہ مرنے کے بعد عملوں کا جواب بھی دینا ہے ان کے متعلق فرمایا: ان کے عمل ضائع ہو گئے، اوّل تو انہوں نے نیک عمل کیے ہی نہیں اور اگر کوئی ہوگا بھی تو وہ ضائع ہو جائے گا اس کا کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا اگر کوئی نیکی کی ہوگی تو رائیگاں جائے گی، عملوں کی قبولیت تو جب ہوگی جب ان عملوں کے پیچھے ایمان کی بنیاد موجود ہوگی، اگر ایمان ہی نہیں ہے قیامت کے دن اور حساب کتاب پر یقین ہی نہیں ہے تو نیکی کس کام آئے گی وہ تو ایسا عمل کریں گے جسے اپنی عقل کے مطابق صحیح سمجھیں گے مگر وہ ان کیلئے قطعاً مفید نہیں ہوگا اور بالآخر انہیں مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے گا اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلے گا۔

وہ نہیں بدلہ دیئے جائیں گے مگر ان عملوں کا جو وہ انجام دیتے رہے، انہوں نے کفر و شرک کیا، اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلایا، عیاشی اور فحاشی کو اپنائے رکھا، کھیل تماشے میں مصروف رہے، ہدایت کی باتوں کو قبول نہ کیا تو پھر انہیں ان عملوں کا بدلہ بھی ایسا ہی ملے گا انہیں کسی اچھے بدلے کی اُمید نہیں رکھنی چاہئے۔

آخر بچھڑا بنا ہی لیا

وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ

اور بنالیا قوم نے موسیٰ کی سے پیچھے اسکے اپنے زیور بچھڑا ایک بدن کہ اسکی

خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَ لَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ

گائے کی آواز تھی کیا نہ دیکھا انہوں نے کہ وہ نہیں بولتا ان سے اور نہ بتلاتا ہے انہیں راستہ

وقف لازم

اِتَّخَذُوْهُ وَ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَ لَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَ رَاَوْا

بنالیا انہوں نے اسکو اور تھے وہ ظلم کرنے والے (۱۴۸) اور جب گرانی شروع ہوگئی میں ہاتھوں انکے اور دیکھا

اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ يَغْفِرْ لَنَا

کہ وہ تحقیق گمراہ ہو گئے کہنے لگے البتہ اگر نہ رحم کیا ہم پر رب ہمارے نے اور (نہ) بخش دیا ہم کو

لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴿۱۴۹﴾

ضرور ہوجائیں گے ہم میں سے گھاٹا پانے والوں (۱۴۹)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیور سے بچھڑا بنالیا (وہ) ایک بدن (تھا جس میں) گائے کی آواز نکلتی تھی، کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ ان سے بات نہیں کرتا اور نہ ان کی کوئی رہنمائی کرتا ہے، اس کو معبود بنالیا اور وہ ظالم تھے۔(۱۴۸) اور جب پچھتائے اور سمجھے کہ ہم بیشک گمراہ ہوگئے تو کہنے لگے اگر ہم پر ہمارا رب رحم نہ کرے اور ہم کو نہ بخشے تو بیشک ہم تباہ ہوجائیں گے۔(۱۴۹)

لفظی تحقیق: حُلِيِّهِمْ: اپنے زیوروں سے۔"حُلِيٌّ" جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد "حُلْيَةٌ" ہے "حُلْيَةٌ" زیور کو کہتے ہیں، یعنی: ان لوگوں نے اپنے گھر کے سارے زیور اکٹھے کرکے اس سے بچھڑے کی شکل بنالی۔ سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ: پچھتائے۔ یہ عربی کا محاورہ ہے جس کو ایسے موقعہ پر بولتے ہیں جب کسی بھاری غلطی پر عام پچھتاوا پھیل جائے۔

تفسیر

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پہاڑ پر چلے گئے تو پیچھے قوم کے اکثر لوگ گمراہی میں مبتلا ہوگئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے آپ کے جانے کے بعد اپنے زیورات سے بچھڑا بنالیا، دوسری سورتوں میں تفصیل موجود ہے کہ سامری نامی شخص نے یہ بچھڑا بنایا اور تفسیری روایتوں میں موجود ہے کہ پھر اس میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے گھوڑے کے پاؤں کی مٹی ڈالی تو کرشمے کے طور پر وہ بولنے لگا، یہ بچھڑا سونے کو پگھلا کر بنایا گیا ایک جسم تھا جس کے اندر سے گائے کی آواز آتی تھی، خوار گائے کی آواز کو کہا جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بچھڑا اپنی مخصوص آواز میں بول رہا ہے جن زیورات کو پگھلا کر بچھڑا بنایا گیا تھا وہ اصلاً بنی اسرائیل کے لوگوں کی ملکیت نہ تھے بلکہ مصر سے چلتے وقت انہوں نے قبطیوں سے وقتی طور پر استعمال کرنے کیلئے لئے تھے، "تورات" میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل

نے قبطیوں سے کہا کہ وہ اپنے ایک مذہبی میلہ میں جارہے ہیں، لہٰذا آپ انہیں کچھ زیورات اُدھار دے دیں، قبطیوں نے یہ زیورات خوشی سے ان کو دے دیئے جنہیں لے کر وہ "بحیرہ قلزم" سے ہوتے ہوئے "صحرائے سینا" میں پہنچ گئے، فرعونی تو سمندر میں غرق ہو چکے تھے اب یہ زیورات انہی کے قبضے میں تھے، لہٰذا سامری کے کہنے پر انہوں نے وہ سارے زیورات اکٹھے کئے اور انہیں پگھلا کر ایک بچھڑا بنالیا جس سے بولنے کی آواز بھی آتی تھی، بعض کہتے ہیں کہ بچھڑے کے منہ میں کرشمے والی مٹی ڈالنے سے وہ گوشت پوست کا بچھڑا بن کر بولنے لگا تھا مگر زیادہ تر خیال یہی ہے کہ وہ سونے کا بچھڑا تھا تاہم اس سے آواز آتی تھی۔

جب سونے کا بچھڑا تیار ہو کر بولنے لگا تو سامری نے بنی اسرائیل کو ورغلایا کہ دیکھو! خدا تو یہ ہے اس کی پوجا کرو، موسیٰ (علیہ السلام) کو بھول کر طور پر گئے ہیں تمہارے لئے یہی معبود کافی ہے، چنانچہ بچھڑے کے سامنے سجدے کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کتنے بیوقوف لوگ ہیں اور کیسی حرکتیں کر رہے ہیں، کیا یہ نہیں دیکھتے کہ یہ بچھڑا تو ان سے بات بھی نہیں کرسکتا صرف ایک بے معنیٰ آواز نکل رہی ہے جس کی وجہ سے اسے خدائی کا درجہ دے دیا گیا ہے اور وہ نہ ہی ان کی رہنمائی کرتا ہے وہ تو بیچارہ خود عاجز ہے یہ کیسے معبود ہوسکتا ہے، یہ مجسمہ سامری نے بنایا تھا وہ خود گمراہ تھا اور اس نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سامری بنی اسرائیل کا فرد نہیں تھا اس کا تعلق سامری بستی سے تھا مگر منافقوں کی طرح بنی اسرائیل میں شامل ہو چکا تھا اور انہی میں شمار ہوتا تھا، بعض فرماتے ہیں کہ تھا تو اسرائیلی مگر اس میں بگاڑ پیدا ہو چکا تھا وہ منافق تھا اور اس کا دل ایمان سے خالی تھا اس کے ورغلانے پر اسرائیلیوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا، اور وہ بڑے بے انصاف تھے، یہ ان کی انتہائی درجے کی حماقت تھی کہ خود کے بنائے ہوئے بے جان ڈھانچے سے آواز نکلتی سن کر گمراہ ہو گئے اور خدا تعالیٰ کی شان اور عظمت کو بھول بیٹھے جب انسان کا ذہن خراب ہونے پر آتا ہے تو پھر ایسی ہی بیوقوفی کی باتیں کرتا ہے سانپ جیسے جانور کی پوجا کرنے والے ناگ پنچی بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں، انسانوں، پتھروں، پانی، بلیوں، گائے، بیل، سورج، چاند اور ستاروں کی پوجا کرنے والے بھی موجود ہیں، اسرائیلوں نے بھی یہی کیا کہ ایک بے

جان بچھڑے کی پوجا کرنے لگے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ بڑے بے انصاف لوگ تھے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے بجائے خود کی گھڑی ہوئی چیز کے سامنے جھک گئے، "سورۂ طٰہٰ" میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے انہیں بڑا سمجھایا مگر انہوں نے آپ کی بات نہ مانی، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سارے بنی اسرائیلی اس برائی پر تھے، پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے اور انہوں نے سمجھایا تو اسرائیلیوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جیسا کہ "سورۂ بقرہ" میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کی قبولیت کیلئے بڑی شرط لگائی اور وہ یہ تھی کہ پوجا نہ کرنے والے بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں وہاں پر "فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: پھر انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا" کے الفاظ آتے ہیں باپ نے بیٹے کو قتل کیا بھائی نے بھائی کو مار ڈالا تو جب جا کر ان کی توبہ قبول ہوئی، یہ قتل کرنا بطور توبہ کے تھا نہ کہ بطور خانہ جنگی کے۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ: اور جب بنی اسرائیلی شرمندہ ہوئے، "سُقِطَ" مجہول کا صیغہ ہے اور اس کا لفظی معنیٰ ہے کہ جب وہ گرائے گئے اپنے ہاتھوں میں، مطلب یہ ہے کہ غلط کام کرنے کی وجہ سے خود اپنی نظروں میں گر گئے، جب کوئی آدمی شرمندہ ہوتا ہے تو اپنی گردن جھکا دیتا ہے یا اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے چباتا ہے، یہی حالت بنی اسرائیل کے ان لوگوں کی تھی جنہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی جب وہ شرمندہ ہوئے اور انہوں نے دیکھ لیا، یعنی: سمجھ گئے کہ وہ تو گمراہ ہو چکے ہیں، کہنے لگے کہ اگر ہمارا پروردگار ہم پر رحم نہیں فرمائے گا اور ہمیں معاف نہیں کرے گا تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے اس طرح گویا انہوں نے اپنی جہالت اور گمراہی کا اقرار کیا اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔

احکام و مسائل

مسئلہ (۱):.... جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا کہ جن زیورات سے بچھڑا بنایا گیا تھا وہ ان کی اپنی ملکیت نہ تھے بلکہ وہ قبطیوں سے وقتی طور پر استعمال کیلئے لے کر گئے تھے مگر یہاں پر اللہ تعالیٰ نے "حُلِيِّهِمْ"، یعنی: ان کے زیورات فرمایا ہے، مفسرین کرام اس سے مسئلہ نکالتے ہیں کہ حربی کافروں کا مال مسلمانوں کیلئے مباح ہے اور

مسلمانوں کا مال ان کیلئے جائز نہیں ہے۔

مسئلہ (۲):..... غنیمت کا مال اسی اصول کے تحت جائز قرار پایا ہے جب کوئی کافر قوم مسلمانوں سے لڑ رہی ہو یا نہ لڑ رہی ہو تو ان کا مال خواہ جنگ کے نتیجے میں حاصل ہو یا بغیر لڑائی کے وہ مسلمانوں کیلئے مباح ہوتا ہے، قبطی چونکہ کافر تھے اور بنی اسرائیلیوں پر ظلم بھی ڈھاتے تھے؛ اس لئے ان سے حاصل کئے ہوئے زیورات مسلمانوں کی ملکیت بن چکے تھے اللہ تعالیٰ نے اسی لئے "حُلِيِّهِمْ" کہا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام غضب ناک ہوئے

وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا

اور جب واپس آئے موسیٰ طرف قوم اپنی کے غضب ناک ہوکر افسوس کرتے ہوئے کہا برا ہے

خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ

جو تم نے کیا سے پیچھے میرے کیا جلدی کی تم نے حکم سے رب اپنے کے اور ڈال دیں تختیاں

وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ

اور پکڑا سر بھائی اپنے کا کھینچنے لگا اسکو طرف اپنی

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور جب موسیٰ اپنی قوم میں غصہ میں بھرے ہوئے افسوس کرتے ہوئے لوٹے، کہا تم نے میرے بعد کیا برا کیا، کیوں جلدی کی تم نے اپنے رب کے حکم سے؟ اور تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے۔

تفسیر

حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پہاڑ پر چالیس دن پورے کر کے اپنی قوم کی طرف واپس آئے، اللہ تعالیٰ نے انہیں پہلے ہی اطلاع دے دی تھی کہ آپ کی قوم کے لوگ آپ کے بعد گمراہ ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنے

پرانے بت پرستانہ ذہنیت کے زیر اثر بچھڑے کی شکل بنا کر اس کی پوجا پاٹ شروع کر دی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ اطلاع پا کر غضب ناک ہوئے اور اپنی قوم کی نادانی پر انہیں سخت افسوس ہوا، اسی حالت میں اپنی قوم کی طرف "تورات" کی تختیاں لئے ہوئے لوٹے اور آتے ہی غضب اور افسوس دونوں کا اظہار فرمایا، اس کا اس آیت میں بیان ہے۔

ارشاد ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو ان کے دل پر رنج وافسوس دونوں کا ملا جلا اثر تھا، آتے ہی قوم کو مخاطب کر کے کہا کہ تم نے اس کا جو میں تمہیں کہہ گیا تھا میرے بعد خیال نہیں رکھا، میں تمہارے ذمہ ایک کام ڈال گیا تھا کہ میرے بعد تم اتحاد واتفاق سے رہنا اور گمراہی اور کفر وشرک کی باتوں سے بچتے رہنا، میں دیکھتا ہوں کہ تم نے میرا کہا نہیں مانا اور میری جانشینی کا کام بری طرح اپنی غفلت کے ہاتھوں ضائع ہونے دیا، کیا میں نے تمہیں صاف طور نہیں سمجھا دیا تھا کہ میں اللہ عزوجل سے تمہارے لئے قانون لینے جارہا ہوں اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق میں تمہارے لئے زندگی بسر کرنے کے پورے پورے قانون لے کر آؤں گا اس وقت تک اپنی طرف سے کوئی بے ہودہ رسم قائم نہ کر لینا اور صبر کے ساتھ میرے آنے کا انتظار کرنا تم پر ایسی کیا مصیبت آپڑی تھی کہ میرے آنے کا انتظار نہ کیا، یہ کہہ کر "تورات" کی تختیاں جو اٹھائے ہوئے لائے تھے جلدی سے نیچے رکھ کر اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ عام لوگوں کی طرح نہ تھا جو اپنی بات نیچی ہوتے دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ایمانی غیرت سے بے قابو ہو گئے تھے ان کو یہ گمان ہو گیا تھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف سے کوتاہی ہوئی ہے یہ حق کی حمایت کا جوش ایمان کا جوش تھا جس کی وجہ سے آپ نے "تورات" کی تختیاں نیچے ڈال کر بڑے بھائی کے سر اور داڑھی کے بال پکڑ کر انہیں زور سے اپنی طرف کھینچا اس میں نہ کوئی خودغرضی تھی اور نہ حضرت ہارون علیہ السلام کی توہین مقصود تھی بلکہ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ حق کی حمایت میں رشتہ داری کوئی چیز نہیں اور یہی سبق بنی اسرائیل کو سکھانا تھا۔

بعض فرماتے ہیں کہ قوم کی گمراہی کی خبر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ پر ہی دے دی تھی کہ اس

طرح سامری نے قوم کو شرک میں ملوث کر دیا ہے اس وقت تختیاں بھی آپ کے پاس تھیں مگر وہاں آپ کو اتنا غصہ نہیں آیا کہ تختیاں وہیں پھینک دیتے، "مسند احمد" کی روایت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سننے اور دیکھنے میں فرق ہوتا ہے یہ دونوں چیزیں برابر نہیں، بہر حال وہاں تو آپ کو اتنا غصہ نہیں آیا مگر جب واپس آ کر دیکھا کہ قوم بچھڑے کے گرد جمع ہے تو پھر آپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا آپ نے تختیاں پھینک دیں اور بھائی کو بھی سخت تنبیہ کی۔

اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ: کیا تم نے اپنے رب کا حکم آنے سے جلد بازی کی، یعنی: اللہ تعالیٰ کی کتاب "تورات" کے آنے کا انتظار تو کر لیتے تم نے اس سے جلد بازی کر کے یہ گمراہی اختیار کر لی، اور بعض مفسرین کرام نے اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ کیا تم نے جلد بازی کر کے یہ قرار دے لیا تھا کہ میری موت آ گئی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ "الواح تورات" کو بے ادبی کے ساتھ ڈال دینا گناہ ہے اور پیغمبر علیہم السلام سب گناہوں سے معصوم ہیں؛ اس لئے مراد آیت کی یہی ہے کہ اصل مقصود حضرت ہارون علیہ السلام کو پکڑنے کیلئے ہاتھ خالی کرنا تھا اور غصہ کی حالت میں جلدی سے ان کو رکھا جس سے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ ڈال دیا اس کو قرآن کریم نے بطور تنبیہ کے ڈالنے کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

حضرت ہارون علیہ السلام بے قصور تھے

قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ كَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۫ۖ

بولے اے بیٹے! ماں کے تحقیق قوم نے کمزور سمجھا مجھ کو اور قریب تھا کہ قتل کر ڈالیں مجھ کو

فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝۱۵۰

پس نہ خوش کر پر مجھ دشمنوں کو اور نہ کر تو مجھ کو ساتھ قوم ظالموں کے (۱۵۰)

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِاَخِیْ وَ اَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۫ۖ وَ اَنْتَ

بولا اے رب میرے! بخش تو مجھ کو اور بھائی میرے کو اور داخل کر ہم کو میں اپنی رحمت اور تو

ع ۱۸ ۸ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

زیادہ رحم کرنے والے ہیں سب رحم کرنے والوں میں (۱۵۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ انہوں نے کہا اے میرے ماں جائے بھائی! لوگوں نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالیں، سو! مجھ پر دشمنوں کو مت ہنسا اور مجھ کو گنہگار لوگوں میں مت ملا۔ (۱۵۰) (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے) کہا اے میرے رب! تو مجھ کو اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ (۱۵۱)

تفسیر

بنی اسرائیل حضرت ہارون علیہ السلام کو خود ستانا چاہتے تھے اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جوان کو ڈانٹا تو وہ خوش ہوئے، حضرت ہارون علیہ السلام نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو سب کے سامنے ڈانٹ رہے ہیں تو سمجھ گئے کہ انہیں یہ شبہ ہو گیا ہے کہ میں نے جان بوجھ کر اپنے فرض میں کوتاہی کی ہے؛ اس لئے ان سے اصل واقعہ کہا۔

ارشاد ہے کہ: حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے اوپر ناراض دیکھ کر ان سے کہا کہ اے میرے ماں جائے بھائی! میں اس تنبیہ کا مستحق نہیں ہوں، واقعہ یہ ہے کہ میں یہاں تقریباً تنہا تھا اور میرے ساتھی اور مددگار کچھ زیادہ نہ تھے قوم قریب قریب ساری کی ساری ایک طرف ہو گئی تھی انہوں نے ہم کو دبایا یہاں تک کہ مار ڈالنے کی دھمکی دی میں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ ہمارے لئے اس وقت سوا خاموشی کے کوئی چارہ نہیں اگر ہم سختی کرتے ہیں تو آپس کی لڑائی چھڑتی ہے اور قوم میں تفرقہ ہو جاتا ہے اور پھر ہم چونکہ تعداد میں کم ہیں اس لئے جان جوکھوں کا معاملہ آ پڑتا ہے بہتر یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے تک صبر و تحمل سے کام لیں یہ لوگ پہلے ہی مجھے رسوا کرنے پر تلے ہوئے تھے آپ نے بھی آ کر پہلے مجھ ہی پر اپنا غصہ اتارا اس سے یہ لوگ جو ہمارے دشمن ہیں کیسے خوش ہو رہے ہوں گے کہ اچھا ہوا حضرت ہارون علیہ السلام کو ڈانٹ پڑی، خدا کیلئے ان کو میرے اوپر خوش ہونے کا موقعہ نہ دیجئے اور ہرگز خیال نہ کریں کہ میں بھی انہیں ظالموں کا ہم خیال ہوں یا ہو گیا تھا۔

اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ: میری قوم نے مجھے کمزور خیال کیا اور میری بات نہ مانی، دوسری جگہ موجود ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا کہ اے لوگو! خدا کا خوف کھاؤ تم کس گندگی میں مبتلا ہو گئے ہو، میری بات سنو پروردگار تو وہی رحمان ورحیم ہے تم کس کو معبود بنا رہے ہو؟ کچھ غور وفکر کرو مگر قوم نے ایک نہ سنی، دوسری جگہ موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھائی سے کہا کہ جب تم نے دیکھا کہ یہ شرک میں مبتلا ہو گئے ہیں تو آپ ان سے علیحدگی اختیار کر لیتے تو حضرت ہارون علیہ السلام نے جواب دیا کہ ایسا میں نے اس لئے نہیں کیا کہ واپس آ کر آپ یوں نہ کہہ دیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا تھا ان کے گروہ بنا دیئے، فرمایا: میں نے اس مصلحت کے تحت مخلص ایمان والوں کو شرک کرنے والوں سے علیحدہ نہیں کیا۔

اس میں اپنے بھائی ہارون کیلئے تو اس بناء پر مغفرت کی دعا کی شاید ان سے کوئی کوتاہی قوم کو گمراہی سے روکنے میں ہوئی ہو اور اپنے لئے دعائے مغفرت یا تو اس بناء پر کی کہ جلدی کے ساتھ "تورات" کی تختیوں کو رکھ دینا جس کو قرآن کریم نے ڈال دینے سے تعبیر کر کے ایک غلطی پر متنبہ فرمایا ہے اس سے مغفرت طلب کرنا مقصود تھا اور یا یہ کہ دعا کا ادب ہی یہ ہے کہ دوسرے کیلئے دعا کرے تو خود کو بھی اس میں شامل کرے تا کہ خود کا بخشش سے بے نیاز ہونے کا شبہ نہ ہو، یعنی: یہ کہ اپنے آپ کو دعا کا محتاج نہیں سمجھتا۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):..... اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ دنگے فساد سے بچنا چاہئے اور اصلاح کیلئے مناسب موقعہ کا انتظار کرنا چاہئے۔

گناہ کا علاج توبہ

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ

تحقیق　جن لوگوں نے　بنالیا معبود　بچھڑے کو　عنقریب پہنچے گا ان کو　غضب　طرف سے　رب انکے کی　اور

ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَ

ذلت میں زندگی دنیا کی اور اسی طرح سزا دیتے ہیں ہم بہتان باندھنے والوں کو (۱۵۲) اور

الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَ اٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ

جن لوگوں نے کئے برے کام پھر توبہ کی سے بعد اسکے اور ایمان لائے بیشک

رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾

رب آپ کا سے بعد اس کے البتہ بخشنے والا مہربان ہے (۱۵۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا ان کو ان کے رب کا غضب پہنچے گا اور دنیا کی زندگی میں ذلت پہنچے گی اور ہم بہتان باندھنے والوں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ (۱۵۲) اور جنہوں نے برے کام کئے پھر اس کے بعد توبہ کی اور ایمان لائے تو بیشک توبہ کے بعد آپ کا رب البتہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۱۵۳)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اے موسیٰ! ان کو سنا دیجئے جنہوں نے بچھڑا بنا کر اس کی پوجا کی ہے ان پر ان کے رب کی طرف سے غضب اور ذلت دونوں اسی دنیا میں اتریں گے، ہمارے ہاں ایسوں کی جو اپنی طرف سے نئی باتیں اور عبادت کے طریقے تراش کر اسے دین میں داخل کر لیتے ہیں اور پھر اسی کو دین سمجھتے ہیں ان کی یہی سزا ہے، یہ لوگ چکنی چپڑی باتیں کر کے جھوٹ گڑھتے ہیں اور اس کو ہنسی کھیل بنانا چاہتے ہیں کہ جو جس کے دل میں آئے کر بیٹھے اور پھر لوگوں میں اسے دین کہہ کر رواج دے دیتے ہیں، ایسے لوگ انسانوں کیلئے گمراہی کا راستہ کھولتے ہیں اور دین کو اپنی مرضی کا تابع بنا کر رکھنا چاہتے ہیں، ہمارے ہاں ایسے لوگوں کیلئے خالص توبہ کے بغیر کوئی بخشے جانے کی صورت نہیں ہے، ہاں! جن لوگوں نے ہمارے مقرر کردہ قاعدے کے مطابق توبہ کر لی اور اپنے خلوص اور سچائی کا ثبوت دے دیا اور ایمان دار بن گئے تو ایسی توبہ کے بعد ان کو معاف کر دیا جائیگا اور ان پر رحم کیا جائیگا، یعنی: آخرت میں ان کو عذاب نہ ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو جو توبہ کا طریقہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بتایا اس کا

ذکر ”سورۂ بقرہ“ میں بھی گزر چکا ہے کہ بچھڑا پوجنے والوں کو وہ لوگ جنہوں نے بچھڑا نہیں پوجا اپنے ہاتھ سے قتل کریں اس میں غضب اور رسوائی دونوں چیزیں شامل ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنایا انسان کی ذہنی پستی ملاحظہ کریں کہ سونے سے بنے ہوئے بچھڑے میں ذرا سا کرشمہ دیکھا تو فوراً اس کی پوجا شروع کر دی انسان جب ماننے پر آجاتا ہے تو حقیر سے حقیر چیز کو خدا بنا لیتا ہے، دیکھ لیں کہ کچھ ہندو سانپ کی پوجا کرتے ہیں، کچھ گائے کی پوجا کرنے والے ہیں نہ صرف گائے بلکہ اس کے گوبر اور پیشاب کو بھی پاک خیال کرتے ہیں کوئی چیز برتن وغیرہ ناپاک ہو جائے تو اسے گائے کے پیشاب سے پاک کرتے ہیں مگر یہی انسان جب انکار پر آتا ہے تو ”اللہ وحدہٗ لا شریک“ کے ایک جاننے اور ماننے کا انکار کر دیتا ہے اس کی بھیجی ہوئی کتابوں کو تسلیم نہیں کرتا حتیٰ کہ اس کے مقدس پیغمبروں کو پتھر مار کر ہلاک کر دیتا ہے یہ انسان کی ذہنی پستی کی انتہاء ہے۔

جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا عنقریب انہیں ان کے رب کی طرف سے غضب پہنچے گا، اللہ کے پیغمبر ان میں موجود ہیں اور سمجھا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ایک جانو اور مانو اور بچھڑے کی پوجا چھوڑ دو ورنہ عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے، یہاں پر غضب سے مراد عذاب ہے، ایک تو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں عذاب ہوگا اور دوسرے انہیں دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی اٹھانا پڑے گی، جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ بچھڑے کے پجاریوں کی توبہ اس شرط کے ساتھ قبول ہوئی تھی کہ نہ پوجنے والے پوجنے والوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں، چنانچہ ایسا ہی ہوا ان کے اس قتل کو ہی ذلت شمار کیا گیا ہے جو انہیں اسی دنیا میں حاصل ہوئی جو لوگ اس طریقے سے قتل ہو گئے اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور وہ آخرت کی پکڑ سے بچ گئے اور جنہوں نے اس طریقے سے توبہ نہ کی ان کے متعلق فرمایا کہ وہ عنقریب آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

اور پھر سزا کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ: ہم بہتان باندھنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ جس نے شرک کیا اس نے گویا اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا اور اس قسم کے بہتان باندھنے والوں

کیلئے سزا بھی ایسی ہی مقرر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں بڑے بڑے جرموں کیلئے سخت سزائیں رکھی ہیں وہاں اس کی رحمت بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے اور بغاوت سے شرمندہ ہونے والے کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے، ارشاد ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے برے کام کیئے پھر اس کے بعد انہوں نے توبہ کرلی اور ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیا، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ جرم کتنا بھی سخت ہو حتیٰ کہ کفر اور شرک کے بعد بھی اگر کوئی شخص توبہ کرلے اور مرنے سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر معافی مانگ لے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتے ہیں، "سورۂ بقرہ" میں توبہ کے ساتھ اصلاح کا ذکر بھی ہے، یعنی: انہوں نے معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ اپنی اصلاح بھی کرلی گویا ایسی سچی توبہ کی کہ پھر اس جرم کے کبھی قریب نہیں آئے تو اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والے اور مہربان ہیں۔

البتہ ایک بات یاد رہے کہ! حقوق العباد توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتے اگر کسی کا حق دبایا ہے کسی کو تکلیف پہنچائی ہے تو جب تک تکلیف وہ شخص معاف نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ بھی ایسے جرم کو نہیں بخشیں گے، اللہ تعالیٰ کے حقوق تو توبہ سے معاف ہوجاتے ہیں مگر بندوں کے حقوق کیلئے اس کے پاس جانا ہوگا جس کا حق ضائع ہوا ہے اگر اس دنیا میں کسی کا غصب کیا ہوا حق واپس نہیں کیا تو آخرت میں لازماً ادا کرنا پڑے گا مگر وہاں مال تو نہیں ہوگا لہٰذا اس حق کے بدلے میں نیکیاں دینا ہوں گی اور اگر کسی غصب کرنے والے کے پاس نیکیاں بھی نہ ہوں گی تو حقدار کی برائیاں غصب کرنے والے کے سر پر ڈال دی جائیں گی، مقصد یہ ہے کہ بندوں کے حقوق کی پکڑ لازمی ہے ، لہٰذا اس کی تلافی اسی دنیا میں کردینی چاہئے۔

بعض گناہوں کی کچھ سزا دنیا میں بھی ملتی ہے

جیسے سامری اور اس کے ساتھیوں کا حال ہے کہ انہوں نے بچھڑے کی پوجا سے صحیح توبہ نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا میں ہی ذلیل وخوار ردیا کہ اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ حکم دے دیا کہ وہ سب لوگوں سے الگ رہے نہ وہ کسی کو ہاتھ لگائے نہ کوئی اس کو ہاتھ لگائے ، چنانچہ وہ عمر بھر اسی طرح جانوروں کے ساتھ پھرتا رہا کوئی

انسان اس کے پاس نہ آتا تھا۔

"تفسیر قرطبی" میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ عذاب مسلط کر دیا تھا کہ جب کوئی اس کو ہاتھ لگائے یا وہ کسی کو ہاتھ لگائے تو فوراً دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا۔

دیدار کی طلب

وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا

اور جب اتر گیا سے موسیٰ غضب لے لیا انہوں نے تختیوں کو اور میں انکے لکھے ہوئے

هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَ اخْتَارَ مُوْسٰى

ہدایت اور رحمت تھی لئے ان لوگوں کے جو سے رب اپنے ڈرتے ہیں (۱۵۴) اور چن لئے موسیٰ نے

قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

سے قوم اپنی ستر (۷۰) مرد لئے مقررہ وقت ہمارے کے پس جب آلیا ان کو زلزلہ نے

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب موسیٰ کا غصہ کا تھم گیا انہوں نے تختیوں کو اٹھایا اور جو ان میں لکھا ہوا تھا اس میں ان کیلئے رحمت تھی جو اپنے رب سے ڈرتے تھے۔(۱۵۴) اور موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر (۷۰) مرد ہمارے وعدے کے وقت پر لانے کو چن لئے پھر جب زلزلے نے ان کو آ پکڑا۔

تفسیر

بچھڑا پوجنے والوں کی سزا پچھلی آیت میں بتائی گئی تھی اور ساتھ ہی مقرر کئے ہوئے طریقہ سے توبہ کرنا اس کیلئے نجات کا باعث تجویز کیا گیا تھا اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حال پھر اس آیت میں بیان کیا جاتا ہے، ارشاد ہے کہ: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ جاتا رہا تو انہوں نے "تورات" کی تختیاں جو نیچے ڈال دی تھیں اٹھالیں ان کے اندر جو کچھ لکھا ہوا تھا اس میں اللہ تعالیٰ کے ماننے والوں کیلئے جو ان کا رب ہے کام کی باتیں درج

تھیں، رب کے ماننے والوں کی نشانی آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں اور ہر بات میں سب سے پہلے اس کا خیال رکھتے ہیں کہ کہیں وہ ہم سے ناراض نہ ہو جائے، سچ مچ اگر کسی کو اس کا یقین ہو جائے کہ مجھے جو کچھ مل رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے سوا اس کے اور کوئی دینے والا نہیں ہے میری زندگی اسی وجہ سے قائم ہے کہ وہ ہر وقت میری خبر گیری کرتا ہے اور جس وقت جو چیز میرے زندہ رہنے اور میری حالت کے سنورنے کیلئے ضروری ہوتی ہے وہ فوراً مہیا کرتا ہے تو وہ کبھی اپنے اوپر ایسے مہربانی کرنے والے کو ناراض نہیں کرسکتا، ہر وقت اس سے ڈرتا ہے کہ اگر اس نے میری طرف سے توجہ ہٹالی تو میں پھر کہیں کا نہ رہوں گا، آیت میں "یَرْھَبُوْنَ" سے یہی معنیٰ ہیں کہ وہ اسے ہر وقت راضی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کے بعد کی آیت میں اس قصہ کا ذکر ہے جس کا "سورۂ بقرہ" میں بیان ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم تو جب مانیں گے جب اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کی آواز سن لیں گے، مقررہ وقت پر حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پہاڑ پر اپنے ساتھ ستر آدمی بنی اسرائیل سے گئے انہوں نے جب اللہ تعالیٰ کے دیکھنے پر ضد کی تو ان پر زلزلہ آیا اور بجلی گری اور بے حس وحرکت مردے کی طرح ہو گئے۔

"مسند احمد، طبرانی اور مستدرک حاکم" میں یہ روایت موجود ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غصے میں آکر تختیاں زمین پر ڈال دیں تھیں تو اس وقت ان میں سے کوئی تختی ٹوٹ بھی گئی تھی مگر بالکل چورا چورا نہیں ہوئی تھی کہ اس کی تحریر ہی پڑھی نہ جاسکے، بعض اوقات اس قسم کی چیز اگر دو ٹکڑے بھی ہو جائے تو ان ٹکڑوں کو جوڑ کر اس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھی جاسکتی ہے، "تورات" میں تختی کے بالکل چورا چورا ہو جانے کا ذکر ہے جو کہ درست نہیں، اس آیت سے بھی واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھینکی ہوئی وہ تختیاں دوبارہ اٹھالیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی تختی بالکل ناکارہ نہیں ہوگئی تھی ہوسکتا ہے کہ معمولی ٹوٹن آئی ہو کانچ کی طرح ٹوٹ کر بالکل ریزہ ریزہ نہیں ہوئی تھی۔

اب آگے اللہ تعالیٰ نے تختیوں کی تحریر کے متعلق فرمایا، اور ان تختیوں پر جو چیز لکھی ہوئی تھی وہ ہدایت اور رحمت تھی، پچھلے رکوع میں یہ بھی گزر چکا ہے کہ ان تختیوں میں ہم نے ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی تھی،

تمام ضروری باتیں جن کی قوم کو ضرورت تھی وہ اس میں لکھ دی گئی تھیں فرمایا اس میں ایک چیز تو ہدایت تھی، "سورۂ مائدہ" میں موجود ہے کہ ہم نے "تورات" اتاری جس میں ہدایت اور روشنی تھی اسی طرح قرآن کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے قرآن کریم کی شکل میں آپ کی طرف واضح روشنی اتاری ہے، اللہ تعالیٰ نے "تورات" "انجیل" اور "قرآن پاک" کو بھی "نور" فرمایا ہے۔

جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ہدایت حاصل کر کے اس کے اصولوں کے مطابق عمل کرتا ہے تو پھر اس کے نتیجے میں رحمت اترتی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسے شخص کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے، بہر حال فرمایا کہ: "تورات" کی تختیوں میں جو چیز لکھی ہوئی تھی وہ ہدایت اور رحمت تھی مگر کن لوگوں کیلئے؟ ان لوگوں کیلئے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ظاہر ہے کہ ہدایت پر وہی شخص عمل کر سکتا ہے جس میں خدا کا خوف ہو گا جو شخص اس چیز سے کورا ہے وہ ہدایت پر عمل نہیں کرے گا اور نہ ہی اس کے حق میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو گی، "سورۂ بقرہ" کی ابتداء میں ''متقیوں کیلئے ہدایت ہے'' کا یہی مطلب ہے، قرآن کریم سراپا ہدایت ہے مگر متقیوں کیلئے جن لوگوں میں تقویٰ ہو گا رب تعالیٰ کی ہدایت سے وہی فائدہ اٹھا سکیں گے جو اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرے گا اسے کیا فائدہ پہنچے گا؟ تو یہاں پر "تورات" کے متعلق بھی فرمایا کہ اس میں ہدایت اور رحمت لکھی ہوئی ہے مگر اسے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکیں گے جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو گا۔

ستّر (۷۰) آدمیوں کا انتخاب

ستر (۷۰) آدمیوں کے انتخاب کے متعلق مفسرین کرام نے مختلف وجہیں بیان فرمائی ہیں، بعض فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی اپنی فرمائش پر جب اللہ تعالیٰ نے "تورات" اتاری حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے قوم پر پیش کیا اور اس کے حکموں پر عمل کرنے کا کہا تو وہ بگڑ گئے، انہوں نے طرح طرح کے حیلے بہانے شروع کر دیئے، کہنے لگے کہ اس کتاب کے حکم تو بہت مشکل ہیں ہم سے ان پر عمل نہیں ہو سکے گا اس کے علاوہ انہوں نے کتاب کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے پر شبہ کا اظہار کیا کہنے لگے پتہ نہیں کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یا حضرت موسیٰ

علیہ السلام خود بنا کر لے آئے ہیں، امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے جس کے مطابق لوگوں نے کہا کہ ہم سے "تورات" پر عمل نہیں ہوتا بلکہ ہمارا اس پر یقین ہی نہیں ہے، "سورۂ بقرہ" اور دوسرے جگہوں میں لکھا ہے کہ اس قوم کا مزاج ہی ایسا تھا اس وجہ سے یہ قوم لعنت کی مستحق ٹھہری اب دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر سے خود ہی کتاب کا مطالبہ کیا اس پر اعتماد کا اظہار کیا مگر جب کتاب آ گئی تو بے اعتمادی کا اظہار کیا اور اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے پر ہی شبہ کا اظہار کر دیا، نیز: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزے دیکھنے کے باوجود آپ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا دوسری جگہ موجود ہے کہ انہوں نے "تورات" سن کر کہا کہ ہم نے لیا لیکن اس پر عمل نہیں کرینگے کیونکہ اس کے حکم بڑے مشکل ہیں ان حالات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا، اے ہمارے اللہ! اس نالائق قوم کا کیا علاج کروں تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ان میں سے ستر (۷۰) آدمیوں کو منتخب کر کے طور پہاڑ پر لاؤ، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے پورا کرنے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ستر (۷۰) آدمیوں کا انتخاب کیا۔

بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: جب بنی اسرائیل کے بعض لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی تو اللہ تعالیٰ اس بری حرکت سے سخت ناراض ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کے ستّر (۷۰) سردار قسم کے آدمیوں کو طور پہاڑ پر لائیں جو اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور معافی کی درخواست کریں، اس حکم کے پورا کرنے کیلئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسے آدمیوں کو منتخب کیا جنہوں نے خود تو بچھڑے کی پوجا نہیں کی تھی مگر انہوں نے دوسروں کو منع بھی نہیں کیا تھا، مفسرین کرام کا تیسرا قول یہ ہے کہ جب حضرت ہارون علیہ السلام کا آخری وقت قریب آ گیا تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خاندان کے دوسرے لوگ ایک پہاڑ کے دامن میں ٹھہرے ہوئے تھے جب ہارون علیہ السلام فوت ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کے پاس واپس آئے اور انہیں بھائی کی وفات کی خبر دی قوم نے کہا کہ حضرت ہارون علیہ السلام آپ کے مقابلے میں بڑے نرم مزاج تھے وہ ہم پر بڑے مہربان تھے جب کہ آپ سختی سے پیش آتے ہیں، ہمیں شبہ ہے کہ آپ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو خود قتل

کر دیا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو لے کر واپس اپنے مقام پر آئے جہاں حضرت ہارون علیہ السلام کا جسم مبارک رکھا ہوا تھا ان لوگوں کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارون علیہ السلام سے خطاب کیا کہ آپ کو کس نے قتل کیا ہے تو حضرت ہارون علیہ السلام نے بول کر کہا کہ مجھے کسی نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے طبعی وفات دی ہے یہ بات اپنے کانوں سے سن کر بھی وہ لوگ مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حیلہ بازی کی جس کی وجہ سے آگے واقعات پیش آئے، گو یا بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے ستر (۷۰) آدمیوں کا انتخاب اس مقصد کیلئے کیا تھا تاہم معذرت والی بات عقل کے زیادہ قریب ہے۔

بہر حال ستّر (۷۰) آدمیوں کے انتخاب کی جو بھی وجہ ہو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر طور پہاڑ پر گئے تا کہ اللہ تعالیٰ سے آمنے سامنے بات کر سکیں، تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ جب یہ لوگ طور پہاڑ پر پہنچے تو بادل چھا گیا پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا جسے بنی اسرائیل نے خود سنا مگر پھر بھی ایمان نہ لائے اور کہنے لگے کہ ہمیں کیا معلوم ہے کہ آپ کے ساتھ واقعی اللہ تعالیٰ نے بات کی، نیز: یہ بھی کہا کہ ہم آپ کی بات ہرگز نہیں مانیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، یہ ان کا نیا مطالبہ تھا اللہ تعالیٰ کو اس دنیا میں دیکھنا چاہتے تھے جو کہ ممکن نہیں ہے۔

بہر حال جب قوم کے ستّر (۷۰) آدمیوں نے اللہ کا کلام سن کر بھی اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کر دیا تو اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا، "سورۂ بقرہ" میں آتا ہے کہ پھر تمہیں بجلی نے پکڑ لیا ان لوگوں پر اوپر سے بجلی پڑی اور نیچے سے زلزلہ آیا اور یہ ستّر کے ستّر آدمی وہیں ہلاک ہو گئے، بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: وہ لوگ بے ہوش ہو کر نیم مردہ حالت میں ہو گئے اور بعض کہتے ہیں کہ ان کو حقیقت میں موت آ گئی تھی اب حضرت موسیٰ علیہ السلام پریشان ہو گئے کہ یہ لوگ تو اپنی گستاخی کی وجہ سے ہلاک ہو گئے مگر میں واپس جا کر قوم کو کیا جواب دوں گا؟ وہ کہیں گے کہ تم نے ہمارے آدمی ساتھ لے جا کر مروا دیئے۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ: یہ ستّر (۷۰) آدمی جن کا ذکر اس آیت میں ہے وہ نہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی درخواست کی تھی اور اس پر صاعقہ کے ذریعہ ہلاک کئے گئے تھے بلکہ یہ وہ لوگ تھے جو خود تو

بچھڑے کی پوجا میں شریک نہ تھے مگر قوم کو اس حرکت سے روکنے کی کوئی کوشش بھی نہ کی تھی اس کی سزا میں ان پر زلزلہ آیا اور بیہوش ہو گئے واللہ اعلم، بہر حال یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا

قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا

کہا اے رب میرے! اگر آپ چاہتے ہلاک کردیتے ان کو سے پہلے اور مجھ کو کیا ہلاک کرتے ہیں آپ ہم کو اس پر جو

فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ

کیا بے وقوفوں نے میں سے ہم نہیں ہے یہ مگر آزمائش آپ کی بہکائے آپ میں اس جس کو چاہیں آپ

وَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَ

اور راہ دکھادیں جس کو چاہیں آپ آپ خبر رکھنے والے ہمارے پس بخش دیں آپ ہم کو اور رحم کیجئے آپ ہم پر اور

اَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَ اكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً

آپ بہترین بخشنے والے ہیں (۱۵۵) اور لکھ دیجئے لئے ہمارے میں اس دنیا بھلائی

وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ

اور میں آخرت بیشک ہم رجوع ہوئے طرف آپ کی

بامحاورہ ترجمہ:۔ تو بولے اے میرے رب! اگر آپ چاہتے آپ ان کو اور مجھ کو پہلے ہی ہلاک کردیتے کیا آپ ہم کو ہماری قوم کے احمقوں کے کام کی وجہ سے ہلاک کرتے ہیں یہ سب آپ کی آزمائش ہے اس میں جس کو آپ چاہیں گمراہ کریں اور جس کو چاہیں سیدھا رکھیں آپ ہی ہمارے تھامنے والے ہیں، سو! بخش دیجئے ہم کو اور رحم کیجئے ہم پر آپ سب سے بہتر بخشنے والے ہیں۔ (۱۵۵) اور ہمارے لئے اس دنیا میں اور آخرت میں بھلائی لکھ دیجئے ہم نے آپ کی طرف رجوع کیا۔

تفسیر

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا اے میرے رب! اگر آپ چاہتے تو انہیں اور مجھے دونوں کو پہلے ہی فنا کر دیتے اور ہم میں سے کسی کو یہاں آنے کی جرأت ہی نہ ہوتی لیکن آپ نے کرم فرمایا اور میں ان لوگوں کو لے کر آپ کی اجازت سے حاضر ہوا اب اگر ان میں سے چند بے وقوفوں نے اپنی حاجت سے زیادہ سوال کر لیا تو کیا آپ ان کو اور ہم سب کو تباہ کر دیں گے؟ یہ مصیبت آپ کی طرف سے ایک آزمائش ہے آپ ہی نے یہ آفت ان پر ڈالی ہے اور آپ ہی ان کی مدد کریں گے کہ یہ اس میں سے نکلیں اور ایمان کی نعمت سے مالا مال ہوں، آپ جس کو چاہیں گناہ کے ذریعہ گمراہ کر دیں اور جس کو چاہیں سیدھا راستہ دکھا دیں، ہمارے ولی اور سرپرست آپ ہی ہیں آپ کو ہمارے اوپر پورا اختیار حاصل ہے ہماری خطائیں بخش دیجئے ہمارے اوپر رحم کیجئے آپ ہم سب کے حقیقی اور اصلی مالک ہیں آپ فیصلہ فرما دیجئے کہ ہمیں دنیا میں نیک نامی عزت اور غلبہ نصیب ہو اور آخرت میں بھی مرتبہ میسر ہو، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی ان لوگوں کا قصور معاف کر دیا گیا اور وہ پھر ہوش میں آ گئے اور جی اٹھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا باقی حصہ آ رہا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں یہ بھی عرض کیا کہ اے اللہ! ہمارے لئے اس دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھلائی لکھ دیجئے، بیشک ہم نے آپ کی طرف رجوع کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پہلی دعا گناہ پر معافی کیلئے تھی اور اب یہ دعا دنیا و آخرت میں بھلائی کیلئے ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اپنی امت کے حق میں دنیا و آخرت کی بھلائی سے مراد یہ ہے کہ ان کی امت دنیا و آخرت میں تمام امتوں پر آگے رہے، یعنی: اللہ تعالیٰ ان کو باقی ساری امتوں پر برتری عطا فرمائیں مگر اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ میرا عذاب اور رحمت کسی خاص فرقے یا گروہ کیلئے مخصوص نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں عذاب دے دیں اور اس کی رحمت ساری مخلوق کو شامل ہے، البتہ خاص رحمت کا مطالبہ آپ کر رہے ہیں وہ تو ان لوگوں کو حاصل ہوگا جن میں اللہ تعالیٰ کا خوف پایا جائے، جو زکوٰۃ ادا کرتے ہوں اور جو اللہ کی تمام باتوں پر یقین

رکھتے ہوں اور یہ تینوں صفات آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں پائی جائیں گی، اس کے حقدار حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کے وہ لوگ بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر اور اس کی کتاب پر ایمان لے آئیں گے اور جو لوگ آخری امت کا حصہ نہیں بن سکیں گے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لائیں گے وہ اس دعا میں شامل نہیں ہوں گے۔

الغرض! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس طرح دعا کی کہ اے اللہ! ہمارے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دیجئے اور آخرت میں بھی، بیشک ہم نے آپ کی طرف رجوع کیا، قرآن کریم میں یہی دعا ان الفاظ میں بھی آئی ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرمایئے اور آخرت میں بھی اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچایئے، اس کے علاوہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو یوں دعا کرتے ہیں اے اللہ! ہمیں اس دنیا میں بھلائی عطا فرمایئے، دوسری جگہ پر آتا ہے اے اللہ! ہمیں جو کچھ دینا ہے قیامت سے پہلے پہلے یہیں دے دے گویا ہم آخرت کو نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسے لوگوں کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، دنیا و آخرت دونوں جگہوں کیلئے بھلائی طلب کرنی چاہئے یہی دعا درست اور پسندیدہ ہے۔

دنیا اور آخرت کی بھلائی کی دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی اور یہ ہماری امت کیلئے بھی نہایت فائدہ مند ہے، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بھلائی اپنے اندر بڑا وسیع مفہوم رکھتی ہے، مثلاً: انسان غلطی کرنے کے بعد اگر توبہ کرلے تو یہ اس کیلئے بمنزلہ بھلائی کے ہے توبہ کی توفیق حاصل ہوجانا بہت بڑی نیک بختی ہے جس کو توبہ کی توفیق نہیں ملتی وہ شخص بد بخت ہوتا ہے اور بھلائی یہ ہے کہ انسان کو نیکی کی توفیق مل جائے، رزق حلال نصیب ہو، اطاعت کی توفیق ملے اور دنیا میں نیک نیتی اور سچائی حاصل ہو، سچ بولنا بھی بہت بڑی نعمت ہے جسے حاصل ہوجائے۔

نیک بخت کون ہیں؟

قَالَ عَذَابِيٓ أُصِيبُ بِهِۦ مَنْ أَشَآءُ ۖ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ

کہا عذاب میرا پہنچاتا ہوں میں اسکو جسے میں چاہوں اور رحمت میری گھیرے ہوئے ہے ہر چیز کو

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ

پس لکھ دوں اسے لئے ان کے جو ڈرتے ہیں اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور جو لوگ ہیں وہ

بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٥٦﴾

پر آیتوں ہماری ایمان رکھتے ہیں (۱۵۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: میں اپنا عذاب جس کو چاہوں پہنچاتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے، سو! اس کو ان کیلئے لکھ دوں گا جو ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ (۱۵۶)

تفسیر

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ: میرا غضب اور میری رحمت کسی فرقے یا امت کے ساتھ مخصوص نہیں، اس کا تعلق آدمی کے اپنے عملوں کے ساتھ ہے رحمت تو کسی نہ کسی شکل میں ہر ایک پر ہر وقت ہوتی ہی رہتی ہے عذاب صرف ان ہی کو دیا جاتا ہے جن کے عمل حد درجہ خراب ہوجاتے ہیں، عذاب کسی پر ہر وقت مسلط نہیں رہتا، البتہ رحمت ہر شے کو ہر وقت گھیرے رہتی ہے لیکن تم جو بنی اسرائیل کیلئے جو تمہاری امت ہے یہ چاہتے ہو کہ یہ دنیا اور آخرت دونوں میں سب سے اونچے رہیں اور انہیں دونوں جہاں کی عزت نصیب ہو تو یہ رحمت ہم نے ان لوگوں کیلئے مخصوص کردی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈر کر بری باتوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں جو اپنے مال کا کچھ حصہ ضرورت مندوں اور محتاجوں کو دیتے رہتے ہیں اور جو ہماری آیتیں اور نشانیاں دیکھ کر ہمیں پہچان لیتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ان کے ظاہر کرنے سے غرض یہی ہے کہ انسان اسے پہچانے اس کو اپنا اور ساری کائنات کا خالق رب اور مالک مانے، اس سے معلوم ہوا کہ عام رحمت کے بغیر تو دنیا میں کسی چیز کا موجود ہونا اور باقی رہنا ممکن ہی نہیں خاص رحمت جس کا مطلب دونوں جہاں کی بھلائی اور دنیا اور آخرت میں عزت اور مرتبہ ہے وہ ضرور انسان ہی کیلئے ہے مگر چند شرطوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۱)....برائیوں سے بچنا اس سے مراد یہ ہے کہ جانوروں کی سی چالیں، یعنی: اچھل کود، دھینگا مستی کرنا شتر بے مہار کی طرح آزاد پھرنا، چوپایوں کی طرح کھانا پینا اور خواہش پوری کرنا انسان کو اللہ کی خاص رحمت سے دور کردیتا ہے۔

(۲)....مال کو سمیٹ سمیٹ کر نہ رکھنا بلکہ اس میں سے مفلسوں اور بے بسوں کا حصہ نکال دینا، مراد یہ ہے کہ مال کی ہوس ذلت اور خواری کا باعث ہے۔

(۳)....اللہ تعالیٰ کو اس کی آیتیں سن کر اور نشانیاں دیکھ کر پہچاننا اور اس پر ایمان لانا، اللہ تعالیٰ کو مانے بغیر انسان کو چین نصیب نہیں ہوتا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت کرتی ہے یہ بہت وسیع ہے اور ہر ایک کو نصیب ہے، البتہ دوسری قسم کی خاص رحمت جو صرف خاص لوگوں کیلئے ہوگی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی خاص رحمت کی دعا کی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ان خاص لوگوں کیلئے ہے جن میں ذکر کردہ تین صفتیں پائی جائیں گی، رحمت کی وسعت کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے بنائے ہیں ان میں سے ایک حصہ دنیا میں تقسیم کیا ہے یہ اسی رحمت کا تقاضا ہے کہ ایک جانور بھی پاؤں زمین پر رکھنے سے پہلے دیکھ لیتا ہے کہ اس کا بچہ کہیں اس کے پاؤں کے نیچے نہ آجائے وہ اپنی اولاد پر اتنا رحم اور شفقت کرتا ہے، رحمت کے باقی ننانوے حصے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھے ہیں جو آخرت میں صرف ایمان والوں پر تقسیم کئے جائیں گے اس میں کافروں کیلئے کوئی حصہ نہیں ہوگا یہ خاص ہے۔

اس رحمت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پس میں لکھ دوں گا اس کو ان لوگوں کیلئے جو ڈرتے ہیں، تقویٰ کا معنیٰ سنبھل کر قدم رکھنا ہے گناہوں کے کانٹوں کے درمیان پھونک پھونک کر قدم رکھنا کہ کہیں دامن نہ الجھ جائے، نیز: کفر، شرک گناہ اور تمام برائیوں سے بچتے رہنا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری خاص رحمت ان لوگوں کیلئے ہے جو بچتے ہیں، یعنی: تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

خاص رحمت کے مستحقین کا دوسری جماعت ان کی ہے جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، یعنی: اگر اللہ تعالیٰ نے مال

عطا کیا ہے اور وہ نصاب کو پہنچ گیا ہے تو اس میں سے اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا حصہ مستحقین کو ادا کرتے ہیں ایسا کرنے سے مال پاک ہوجاتا ہے، "ابوداؤد شریف" میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے تاکہ انسان کا باقی مال پاک ہوجائے اگر کوئی شخص زکوٰۃ نہیں نکالتا تو اس کا سارا مال ناپاک رہتا ہے ایسا مال کھائے گا تو اس سے ناپاک خون پیدا ہوگا، اس کے جذبات اور احساسات بھی ناپاک ہوں گے حتیٰ کہ ارادے اور خیالات بھی ناپاک ہوں گے اور پھر ناپاکی کا یہ سلسلہ دور تک چلا جائے گا بعض "یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ" کا معنیٰ کرتے ہیں جو نفس کو پاک کرتے ہیں، یعنی: باطن کو کفر، شرک، نفاق اور گناہوں سے پاک کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ان لوگوں کیلئے ہے جو اس معیار پر پورا اتریں گے، یہ باطن کی زکوٰۃ ہے، "سورۂ شمس" میں ہے کہ بیشک وہ کامیاب پاگیا جس نے نفس کو پاک کرلیا، غرضیکہ زکوٰۃ سے مراد مال اور نفس (باطن) کی زکوٰۃ ہے۔

خاص رحمت کے مستحق تیسرے طبقے کے متعلق فرمایا کہ: وہ لوگ جو ہمارے ساری باتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور یہی صفت ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو خاص رحمت کے لئے خاص کرتی ہے، "سورۂ بقرہ" کی ابتداء میں ہے، یعنی: وہ لوگ جو اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری اور اس چیز پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری گئی گویا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا تمام آسمانی کتابوں پر ایمان ہے وہ خدا کی تمام باتوں کو سچ جاننے و ماننے والے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کے مستحق ہیں، برخلاف اس کے دوسرے مذہبوں والے صرف اپنی اپنی کتابوں "تورات، انجیل، زبور" پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کی آخری کتاب "قرآن کریم" کا انکار کرتے ہیں؛ اس لئے وہ تمام باتوں پر ایمان لانے والوں کو شامل نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت سے محروم ہوجاتے ہیں، بہر حال فرمایا کہ: دنیا و آخرت میں تمام امتوں پر برتری ان لوگوں کو نصیب ہوگی جن میں یہ تین صفتیں پائی جائیں گی، یعنی: تقویٰ، زکوٰۃ اور مجموعی ایمان اس کے بعد چوتھی صفت کا ذکر آگے آرہا ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: جب یہ آیت "وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ" اتری تو ابلیس نے کہا میں اس رحمت میں داخل ہوں لیکن بعد کے جملوں میں بتلادیا کہ آخرت کی رحمت ایمان کے پائے جانے سے حاصل ہوگی اس کو سن کر ابلیس ناامید ہوگیا مگر یہودیوں اور عیسائیوں نے دعویٰ کیا کہ ہم میں تو یہ صفتیں بھی موجود

ہیں، یعنی: تقویٰ اور زکوٰۃ کی ادائیگی اور ایمان مگر اس کے بعد جو شرط آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی بیان ہوئی تو اس سے وہ یہودی اور عیسائی نکل گئے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔

غرض! اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کی قبولیت کا بیان بھی ہو گیا اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص فضیلتوں کا ذکر بھی۔

باقی شرطیں

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا

وہ جو | تابعداری کرتے ہیں | پیغمبر کی | جو پیغمبر | اُمّی ہے | جس کو | وہ پاتے ہیں | لکھا ہوا

عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ۫ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ

پاس اپنے | میں | تورات | اور | انجیل کے | حکم دیتا ہے وہ ان کو | نیک کام کا | اور

يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ

روکتا ہے ان کو | سے | برے کام | اور | حلال کرتا ہے | لئے انکے | پاک چیزیں | اور | حرام کرتا ہے | پر ان

الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ

ناپاک چیزیں | اور | اتارتا ہے | سے ان | بوجھ ان کے | اور | طوق | جو | تھے | پر ان

بامحاورہ ترجمہ:۔ وہ لوگ جو اس پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جو پیغمبر اُمّی ہے جسے وہ اپنے پاس "تورات" اور "انجیل" میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ ان کو نیک کام کا حکم دیتا ہے اور برے کام سے منع کرتا ہے اور ان کیلئے سب پاک چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق (یعنی: سخت حکم) اتارتا ہے جو ان پر تھیں۔

تفسیر

اَلَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ: جسے وہ لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے پاس "تورات" اور "انجیل" میں گویا اللہ تعالیٰ نے آخری پیغمبر محمد ﷺ کی پیروی کو خاص رحمت حاصل کرنے کیلئے چوتھی صفت کے طور پر بیان فرمایا اب یہ پیغمبر اُمّی کون ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کی چھ صفتیں بیان فرمائی ہیں یہ چھ صفتیں دراصل تمام انسانوں کیلئے ہدایت کا ذریعہ ہیں۔

اس آیت میں جس ذات کی پیروی کو لازم قرار دیا گیا ہے اس کیلئے نبی اور رسول دونوں الفاظ استعمال کیے گئے ہیں دونوں میں فرق یہ ہے کہ نبی وہ ہوتا ہے جس پر وحی آتی ہے اور حکم اترتے ہیں اور رسول کے ساتھ مستقل کتاب یا صحیفہ اور مستقل شریعت بھی اترتی ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے پیغمبر ﷺ سے دریافت کیا کہ حضرت! انبیاء علیہم السلام میں سب سے پہلا نبی کون ہے اور سب سے آخری کون؟ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخری نبی حضرت محمد ﷺ ہیں انہوں نے پھر عرض کیا، اے پیغمبر! ان میں رسول کتنے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: تین سو پندرہ رسول ہیں اور باقی کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب نبی ہیں۔

آپ ﷺ کی ایک صفت یہ ہے کہ آپ اُمّی ہیں اس لفظ کے کئی معنٰی ہو سکتے ہیں، عربی زبان میں "ام" ماں کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا اصل ہوتی ہے اور اس سے کوئی دوسری چیز نکلتی ہے جب کوئی بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو اس وقت بالکل بے پڑھا ہوتا ہے پڑھنے لکھنے کا موقع کہیں بعد میں جا کر ملتا ہے اس لحاظ سے نئے پیدا ہونے والے بچے کو اُمّی کہہ سکتے ہیں جس نے ابھی تک کسی سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا ہوتا چونکہ پیغمبر ﷺ نے بھی کسی شخص سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا؛ اس لئے آپ کا لقب اُمّی ہے پوری عرب قوم کا لقب بھی اُمّی ہے اور پیغمبر ﷺ کی قوم کو اُمّیین کہا گیا ہے، "سورۂ جمعہ" میں ہے کہ وہ وہی ذات ہے جس نے امیوں میں انہی میں سے

عظیم الشان پیغمبر بھیجا، اسی طرح کی پیشین گوئیاں "تورات" اور "انجیل" اور دوسری کتابوں میں بھی موجود تھیں حتیٰ کہ "بائبل، تورات اور انجیل" جس میں اب تک بہت سی تبدیلیاں کی جا چکی ہیں اس میں اب بھی اُمّی پیغمبر کے متعلق پیشین گوئیاں موجود ہیں، پیغمبر ﷺ کا اُمّی لقب اس لحاظ سے بھی ہے کہ آپ نے اپنی امت کے متعلق فرمایا کہ: ہم تو اُمّی امت ہیں ہم نہ تو لکھنا جانتے ہیں اور نہ حساب کرنا۔

پیغمبر ﷺ کا اُمّی لقب اس لحاظ سے بھی درست ہے کہ آپ اُمّ القریٰ (مکہ مکرمہ) کے رہنے والے ہیں اور آپ کی اصولی ذمہ داری میں داخل ہے کہ آپ اُمّ القریٰ اور اس کے ارد گرد والوں کو ڈرائیں، "سورۂ انعام" ہی میں ہے کہ آپ کہہ دیں کہ یہ قرآن پاک میری طرف اس لئے وحی کیا گیا تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں بھی اور ان سب کو ڈراوں جن تک یہ کتاب پہنچے، یہی اُمّ القریٰ (مکہ مکرمہ) پیغمبر ﷺ کی پیدائش کی جگہ بھی ہے، لہٰذا آپ کے اُمّی لقب کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔

اُمّی ہونا کسی انسان کیلئے کوئی تعریف کی بات نہیں بلکہ ایک عیب سمجھا جاتا ہے مگر پیغمبر ﷺ کیلئے حق میں اُمّی ہونا آپ کے نبی و رسول ہونے کی خصوصیات میں سے اور بڑی واضح دلیل ہے کیونکہ اگر علمی، عملی، اخلاقی کمالات کسی لکھے پڑھے آدمی سے ظاہر ہوں تو اس کی تعلیم کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن ایک اُمّی (بے پڑھے) سے اسی اونچی علمی باتوں کا ظاہر ہونا اس کا ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ ہے جس سے کوئی پرلے درجہ کا مخالف بھی انکار نہیں کرسکتا خصوصاً جب کہ آپ کی عمر شریف کے چالیس سال مکہ مکرمہ میں سب کے سامنے اس طرح گزرے کہ کسی سے نہ ایک حرف پڑھا نہ سیکھا ٹھیک چالیس سال کی عمر ہونے پر یکایک آپ کی زبان مبارک پر وہ کلام جاری ہوا جس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی مثال لانے سے ساری دنیا عاجز ہوگئی تو ان حالات میں آپ کا اُمّی ہونا آپ کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر ہونے اور قرآن کریم کے اللہ کے کلام ہونے پر ایک بہت بڑی گواہی ہے اس لئے اُمّی ہونا اگرچہ دوسروں کیلئے کوئی تعریف کی بات نہیں مگر پیغمبر ﷺ کیلئے بہت بڑی صفت ہے، جیسے: متکبر (تکبر کرنے والا) کا لفظ عام انسانوں کیلئے تعریف کیلئے نہیں بلکہ عیب ہے مگر حق تعالیٰ شانہٗ کیلئے تعریف ہے۔

”تورات“ کی گواہی

”بیہقی“ نے ”دلائل النبوۃ“ میں نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی ابوسحر عقیلی رضی اللہ عنہ ہوئے ہیں جو دیہات کے رہنے والے تھے مگر کاروبار کے سلسلے میں شہر میں بھی آمدورفت تھی پہلی دفعہ مدینے آئے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی کیونکہ وہ آپ کی تعریف سن چکے تھے وہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ایک یہودی کے گھر اس کے بیمار لڑکے کی عیادت کیلئے جارہے تھے ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ یہودی لڑکا آپ کی خدمت کیا کرتا تھا، بہرحال آپ وہاں تشریف لے گئے لڑکا مرنے کے قریب تھا اور اس کا باپ اس کے سرہانے بیٹھا ”تورات“ پڑھ رہا تھا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے باپ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ: میں تجھے قسم دلا کر پوچھتا ہوں کہ تم میرے متعلق اور میری ہجرت کے متعلق ”تورات“ میں لکھا ہوا پاتے ہو یا نہیں اس کے جواب میں یہودی نے ایسی کسی پیشین گوئی کا انکار کر دیا اس پر وہ لڑکا بول اٹھا اور کہنے لگا، اے اللہ کے پیغمبر! میرا باپ غلط کہتا ہے خدا کی قسم ہم ”تورات“ میں آپ کی صفت اور آپ کی ہجرت کے متعلق لکھا ہوا پاتے ہیں اور پھر اس نے کلمۂ شہادت پڑھ دیا اس کے بعد لڑکا فوت ہو گیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ: اب اس بچے کا اس کے باپ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اس کی لاش کو سنبھال لو اور اس کا کفن دفن کرو یہ مسلمان ہو چکا تھا اور اسی حالت میں فوت ہوا، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خود اس بچے کے کفن دفن کا انتظام کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ پہلی کتابوں کے عالم کعب احبار وغیرہ کا بیان موجود ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض صفتیں جو ”تورات“ میں موجود تھیں وہ قرآن پاک میں بھی آئی ہیں، مثلاً: قرآن کریم میں ”مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا“ کی صفتیں ہیں اور یہی صفتیں ”تورات“ میں بھی پائی جاتی ہیں کہ آپ مبشر اور نذیر ہوں گے، ”تورات“ میں آپ کی یہ صفت موجود تھی کہ آپ بازاروں میں شور وشر کرنے والے نہیں ہوں گے جس طرح قرآن کریم میں ہے کہ اگر آپ سخت مزاج اور تنگ دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے گرد

جمع نہ ہوتے اسی طرح "تورات" میں بھی تھا کہ آپ نہ سخت مزاج تھے اور نہ تنگ دل، "تورات" میں آپ کے متعلق "حِرْزًا لِّلْاُمِّیِّیْنَ" کے الفاظ بھی پائے جاتے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ امیوں کی پناہ گاہ ہیں، آپ کی یہ بھی صفت ہے کہ آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے، نیز: یہ بھی کہ آپ درگزر فرماتے ہیں اور معاف کردیتے ہیں "تورات" میں موجود ان میں سے بعض صفتیں قرآن کریم میں اور بعض حدیثوں میں موجود ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ایک یہودی کا قرض تھا اس نے آکر اپنا قرض مانگا آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں کچھ مہلت دو، یہودی نے سختی کے ساتھ مطالبہ کیا اور کہا کہ میں آپ کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک میرا قرض ادا نہ کردو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہیں اختیار ہے میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں گا، چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ بیٹھ گئے اور ظہر، عصر، مغرب، عشاء کی اور پھر اگلے روز صبح کی نماز یہیں ادا فرمائی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ ماجرا دیکھ کر رنجیدہ اور غضبناک ہورہے تھے اور آہستہ آہستہ یہودی کو ڈرا دھمکا کر یہ چاہتے تھے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو سمجھ گئے اور صحابہ سے پوچھا یہ کیا کرتے ہو؟ تب انہوں نے عرض کیا، اے اللہ کے پیغمبر! ہم اس کو کیسے برداشت کریں کہ ایک یہودی آپ کو قید کرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مجھے میرے رب نے منع فرمایا ہے کہ کسی معاہد (ذمّی) پر ظلم کروں یہودی یہ سب ماجرا دیکھ اور سن رہا تھا، صبح ہوتے ہی یہودی نے کہا "اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ" اس طرح اسلام قبول کر کے اس نے کہا کہ اے اللہ کے پیغمبر! میں نے اپنا آدھا مال اللہ تعالیٰ کے راستہ میں دے دیا اور قسم ہے خدا تعالیٰ کی کہ! میں نے اس وقت جو کچھ کیا اس کا مقصد صرف یہ امتحان کرنا تھا کہ "تورات" میں جو آپ کی صفتیں بتلائی گئی ہیں وہ آپ میں صحیح طور پر موجود ہیں یا نہیں میں نے "تورات" میں آپ کے متعلق یہ الفاظ پڑھے ہیں۔

"محمد بن عبداللہ ان کی ولادت مکہ میں ہوگی اور ہجرت مدینہ طیبہ کی طرف اور ان کی حکومت ملک شام تک ہوگی، نہ وہ سخت مزاج ہوں گے نہ سخت بات کرنے والے نہ بازاروں میں شور کرنے، فحش اور بے حیائی سے دور ہوں گے"۔

اب میں نے ان تمام صفتوں کا امتحان کر کے آپ میں صحیح پایا؛ اس لئے گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور یہ میرا آدھا مال ہے آپ کو اختیار ہے جس طرح چاہیں خرچ فرمائیں اور یہ یہودی بہت مالدار تھا آدھا مال بھی ایک بڑی دولت تھی اس روایات کو "تفسیر مظہری" میں "دلائل النبوة" کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے۔

اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ کعب احبارؒ سے نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ "تورات" میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے کہ:

"محمد اللہ کے پیغمبر اور منتخب بندے ہیں نہ سخت مزاج ہیں نہ بیہودہ بات کرنے والے، نہ بازاروں میں شور کرنے والے، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف فرمادیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں ولادت آپ کی مکہ میں اور ہجرت مدینہ طیبہ کی طرف ہوگی اور امت آپ کی حمادین (اللہ کی خوب حمد وثنا کرنے والے) ہوگی، یعنی: راحت اور تکلیف دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد وشکر ادا کرے گی ہر بلندی پر چڑھنے کے بوقت وہ تکبیر کہا کرے گی وہ سورج کے سایوں پر نظر رکھے گی تاکہ اس کے ذریعہ اوقات کا پتہ لگا کر نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھا کرینگے وہ اپنے نچلے بدن پر تہبند استعمال کریں گے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو وضو کے ذریعہ پاک صاف رکھیں گے ان کا اذان دینے والا فضا میں آواز بلند کرے گا جہاد میں ان کی صفیں ایسی ہوں گی، جیسے: جماعت کی نماز میں، رات کو ان کی تلاوت اور ذکر کی آوازیں اس طرح گونجیں گی جیسے شہد کی مکھیوں کا شور ہوتا ہے"۔

اور ابن سعد نے "طبقات" میں دارمی نے اپنے "مسند" میں بیہقی نے "دلائل النبوة" میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے جو یہودیوں کے سب سے بڑے عالم اور "تورات" کے ماہر مشہور تھے انہوں نے فرمایا کہ "تورات" میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ الفاظ موجود ہیں:

"اے پیغمبر! ہم نے آپ کو بھیجا ہے سب امتوں پر گواہ بنا کر اور نیک عمل کرنے والوں کو

خوشخبری دینے والا برے عمل والوں کو ڈارنے والا بنا کر اور اُمّیین ، یعنی: عرب کی حفاظت کرنے والا بنا کر، آپ میرے بندے اور پیغمبر ہیں میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے نہ آپ سخت مزاج ہیں نہ جھگڑالو اور نہ بازاروں میں شور کرنے والے برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت تک وفات نہ دیں گے جب تک ان کے ذریعہ ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کر دیں یہاں تک کہ وہ "لا الہ الا اللہ" کے قائل ہو جائیں اور اندھی آنکھوں کو کھول دیں اور بہرے کانوں کو سننے کے قابل بنادیں اور بند دلوں کو کھول دیں''۔

اس جیسی ایک روایت "بخاری" میں بروایت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے بھی مذکور ہے اور پچھلی کتابوں کے بڑے ماہر عالم حضرت وہب بن منبہ سے بیہقی نے "دلائل النبوۃ" میں نقل کیا ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے "زبور" میں حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف یہ وحی فرمائی کہ اے داؤد! آپ کے بعد ایک پیغمبر آئیں گے جن کا نام "احمد" ہوگا میں ان پر کبھی ناراض نہ ہوں گا اور وہ کبھی میری نافرمانی نہ کریں گے اور میں نے ان کیلئے سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دیں ہیں ان کی امت امت مرحومہ ہے میں نے ان کو وہ نوافل دیئے ہیں جو پیغمبروں کو عطا کی تھیں اور ان پر وہ فرائض عائد کئے ہیں جو پچھلے پیغمبروں پر لازم کئے گئے تھے یہاں تک کہ وہ محشر میں میرے سامنے اس حالت میں آئیں گے کہ ان کا نور پیغمبر علیہم السلام کے نور کی طرح ہوگا اے داؤد! میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی ہے میں نے ان کو چھ چیزیں خصوصی طور پر عطا کی ہیں جو دوسری امتوں کو نہیں دی گئیں ، اول یہ کہ بھول چوک پر ان کو عذاب نہ ہوگا جو گناہ ان سے بغیر ارادہ کے ہو جائے اگر وہ مجھ سے اس کی بخشش مانگیں گے تو میں بخشش دوں گا اور جو مال وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں گے تو میں دنیا ہی میں ان کو اس سے بہت زیادہ دے دوں گا اور جب ان پر کوئی مصیبت پڑے گی اور وہ "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہیں گے تو میں ان پر اس مصیبت کو صلوٰۃ ورحمت اور جنت کی طرف ہدایت بنادوں گا وہ جو دعا کریں گے میں قبول کروں گا کبھی اس طرح کہ

جو مانگا ہے وہی دے دوں گا اور کبھی اس طرح کہ اس دعا کو ان کی آخرت کا سامان بنا دوں''۔

سینکڑوں میں سے یہ چند روایتیں ''تورات، انجیل، زبور'' کے حوالہ سے نقل کی گئی ہیں پوری روایتوں کو محدثین نے مستقل کتابوں میں جمع کیا ہے۔

وہ اُمّی پیغمبر جن کی صفتیں ''تورات اور انجیل'' میں موجود ہیں وہ یہ کام انجام دیتے ہیں پہلی بات یہ کہ جو لوگ اُمّی پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں وہ ان کو نیکی کا حکم دیتے ہیں معروف اس نیکی اور اچھے کام کو کہتے ہیں جسے شریعت اور صحیح عقل دونوں اچھا سمجھیں اس میں ایمان، توحید، نیکی، اچھے اخلاق، والدین کی خدمت اور صلہ رحمی وغیرہ شامل ہیں یہ ایسی چیزیں ہیں جو شریعت اور صحیح عقل دونوں کی کسوٹی پر پورا اترتی ہیں البتہ اس معاملہ میں شریعت معیار ہے گویا معروف یا نیکی وہ ہوگی جسے شریعت معروف کہے اور صحیح عقل اس کی تائید کرے۔

وہ اُمّی پیغمبر ایک تو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور دوسرا وہ برائی سے منع کرتے ہیں برائی بھی وہ جسے شریعت اور صحیح عقل برائی کہیں، کسی کام کے برا ہونے کا فیصلہ بھی شریعت کرتی ہے اور صحیح عقل اس کی تائید کرتی ہے، کفر، شرک، ظلم، زیادتی، بدعت، نفاق، قطع رحمی، والدین کی نافرمانی، حق تلفی وغیرہ شامل ہیں اسی طرح چوری، ڈاکہ، زنا، حرام خوری اور دوسری تمام بری باتیں برائیوں میں داخل ہیں۔

الغرض! اچھائی اور برائی دو حقیقتیں ہیں جو قیامت کے دن سامنے آئیں گی اچھی باتوں کا حکم کرنا اور بری باتوں سے روکنا تمام انسانوں کے فائدے میں ہے اس پر عمل کرنے سے دنیا میں امن و امان قائم رہ سکتا ہے، پیغمبر ﷺ کی صفتوں کے ضمن میں یہ بتا دیا گیا ہے اور پھر آپ کی پیروی میں آپ کی امت کے لوگ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے ہیں قرآن کریم میں بہت سی جگہوں پر ایمان والوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں یہ کام کبھی زبان سے کیا جاتا ہے کبھی ہاتھ سے کبھی قانون سے اور کبھی طاقت سے جس مقام پر جو چیز فائدہ مند ہو اسی کو کام میں لایا جاتا ہے، انفرادی طور پر ایک دوسرے کو زبان اور ہاتھ سے نیکی کا حکم کیا جاتا ہے یا برائی سے روکا جاتا ہے اگر یہ چیز انفرادی قوت سے باہر ہو تو پھر قانون کے ذریعے اچھائی کو پھیلایا جاتا ہے اور برائی کو ختم کیا جاتا ہے۔

یہ صفت اگر چہ تمام پیغمبروں میں ہے اور ہونا ہی چاہئے کیونکہ ہر پیغمبر اسی کام کیلئے بھیجے جاتے ہیں کہ لوگوں کو نیک کاموں کی طرف ہدایت کریں اور برے کاموں سے منع کریں لیکن اس جگہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کے موقع پر اس کا بیان کرنا اس کی خبر دیتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صفت میں دوسرے پیغمبروں سے کوئی خاص امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے۔

اُمّی پیغمبر کی تیسری اور چوتھی صفت کے متعلق فرمایا کہ: وہ ان کیلئے پاک چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں اور ان پر گندی اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے حلال وحرام کا قانون قرآن کریم میں بہت سی جگہوں پر بیان فرمایا ہے یہ ایک اہم قانون ہے جس کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے کہ اے لوگو! زمین میں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص حلال وحرام اور پاک وناپاک کی تمیز نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کے قانون پر عمل نہیں کرتا اور شیطان کے نقش قدم پر چلتا ہے یا خواہشوں کی پیروی کرتا ہے ایسا شخص کامیاب نہیں ہوسکتا کیونکہ کامیابی، ترقی اور سربلندی اسی صورت میں حاصل ہوگی جب کہ حلال وحرام کے قانون کی پابندی کی جائے یہ بڑا ضروری قانون ہے جسے طیبات اور خبائث کے نام سے بیان کیا گیا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح بھی بیان کی ہے۔

وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ: اس آیت میں حلال وحرام کے فعل کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ وہ پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا کام ہے پیغمبر خود کسی چیز کو حلال یا حرام قرار نہیں دیتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی حرام یا حلال کردہ چیز کو بتلانے والے ہوتے ہیں اور پیغمبر کا بتلانا اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ چیز حرام ہے، وہ پیغمبر ان کیلئے پاک چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں اور پھر ان کی وضاحت بھی فرماتے ہیں کہ پاک چیزوں کی علامت کیا ہے اور پھر اسے استعمال کرنے کا طریقہ کون سا ہے؟ پچھلی "سورۂ انعام" میں جانوروں کے حلال وحرام کا قانون بیان ہو چکا ہے یہ ایسے جانور ہیں

جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اُمّی پیغمبر کی پانچویں صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ لوگوں کے بوجھ اتارتے ہیں، یہاں پر بوجھ سے مراد وہ مشکل حکم ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بعض امتوں پر ڈالے تھے، مثلاً: بنی اسرائیل کو اپنی سخت مزاجی کی وجہ سے بہت سے مشکل حکموں پر عمل کرنا پڑا، پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی غلطی کی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے کیلئے یہ شرط لگائی کہ انہیں قتل کر دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تاہم ہماری امت کیلئے اللہ تعالیٰ نے آسانی پیدا فرمائی ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے مجھے آسانی کرنے والا بنا کر بھیجا ہے؛ اسی لئے اس امت کے گناہگاروں کی توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ انسان سچے دل سے شرمندہ ہو جائے اور معافی مانگ لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتے ہیں، البتہ اگر کسی کی حق تلفی کی ہے تو اس کی ادائیگی ضروری ہے، کپڑے کی ناپاکی کو دور کرنے کیلئے اس امت کیلئے حکم یہ ہے کہ پانی سے تین دفعہ دھولیا جائے تو گندگی دور ہو کر کپڑا پاک ہو جاتا ہے برخلاف اس کے بنی اسرائیل کیلئے گندگی والے کپڑے کو پاک کرنے کیلئے گندگی والے حصے کو قینچی سے کاٹنا پڑتا ہے تب جا کر باقی کپڑا پاک ہوتا تھا اسی طرح بنی اسرائیل کیلئے قتل کی سزا صرف قصاص تھی، یعنی: قاتل کو قتل کے بدلے میں قتل ہی کرنا پڑتا تھا جب کہ ہمارے لئے دیت (خون بہا، یعنی: ۱۰۰ اونٹ یا ۱۰۰ کپڑے کے جوڑے یا ۱۰۰۰۰ درہم یا ۱۰۰۰ دینار) اور معاف کر دینے کی گنجائش بھی موجود ہے، بنی اسرائیل ہفتہ کے روز کوئی کام نہیں کر سکتے تھے حتیٰ کہ کھانا پکانا تک منع تھا مگر ہمارے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آسانی پیدا کر دی ہے کہ صرف جمعہ کے روز جمعہ کی پہلی اذان سے لے کر جمعہ کی نماز ادا کرنے تک کاروبار بند رکھنا ضروری ہے، نماز کے بعد کاروبار دوبارہ شروع ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل، یعنی: رزق کی تلاش میں لگ جاؤ، بنی اسرائیل صرف مقررہ عبادت خانے میں ہی عبادت کر سکتے تھے جب کہ آخری امت کیلئے اللہ تعالیٰ نے پوری زمین کو مسجد بنا دیا ہے کوئی شخص کہیں بھی ہو وقت ہونے پر نماز ادا کر سکتا ہے، البتہ بعض ناپاک جگہوں پر نماز نہیں ادا کی جا سکتی، مثلاً: جانوروں کا باڑہ، ذبح خانہ،

چلتے ہوئے راستے، قبرستان میں جہاں قبریں گری پڑی ہو اور مردوں کی بدبو آرہی ہو یا نماز کے وقت نہایت قریب سامنے کوئی قبر موجود ہو تو نماز ادا نہیں کی جاسکتی اس کے علاوہ خشکی تری ہر جگہ نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

لفظ "اصر" کے معنیٰ بھاری بوجھ کے ہیں جو آدمی کو حرکت کرنے سے روک دے اور اغلال غل کی جمع ہے اور زنجیر کو غل کہتے ہیں جس کے ذریعہ مجرم کے ہاتھوں کو اس کی گردن کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور وہ بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے۔

"اصر" اور "اغلال" اور قید سے مراد اس آیت میں وہ سخت حکم اور دشوار واجبات ہیں جو اصل دین میں مقصود نہ تھے بلکہ بنی اسرائیل پر بطور سزا کے لازم کردیئے گئے تھے، مثلاً: کپڑا ناپاک ہو جائے تو پانی سے دھونا بنی اسرائیل کیلئے کافی نہ تھا بلکہ یہ واجب تھا کہ جس جگہ نجاست لگی ہے اس کو کاٹ دیا جائے اور کافروں سے جہاد کر کے جو غنیمت کا مال ان کو ہاتھ آئے ان کیلئے حلال نہیں تھا بلکہ آسمان سے ایک آگ آکر اس کو جلا دیتی تھی، ہفتہ کے دن شکار کھیلنا ان کیلئے حرام تھا، کسی کا قتل خواہ جان بوجھ کر ہو یا بھول کر دونوں صورتوں میں قصاص، یعنی: قاتل کا قتل کرنا واجب تھا خون بہا ادا کرنے کا قانون نہ تھا۔

ان سخت حکم کو جو بنی اسرائیل پر نافذ تھے قرآن کریم میں "اصر" اور "اغلال" فرمایا اور یہ خبر دی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سخت حکموں کو منسوخ کر کے آسان حکم جاری فرمائیں گے، اسی کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ: میں نے تم کو ایک آسان شریعت پر چھوڑا ہے جس میں نہ کوئی مشقت ہے نہ گمراہی کا اندیشہ، ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ: دین آسان ہے، قرآن کریم میں ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی نہیں ڈالی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ

پس جو لوگ ایمان لائے پر اس اور حمایت کی اسکی اور مدد کی اسکی اور پیچھے چلے اس روشنی کے جو

۱۹ ع ۲ ۹

اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

اتاری گئی ساتھ اسکے یہ لوگ وہی کامیاب ہیں (۱۵۷)

بامحاورہ ترجمہ: ۔ جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کا ساتھ دیا اور مدد کی ہے اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو ان کے ساتھ اتری تھی وہی لوگ کامیاب ہیں ۔ (۱۵۷)

تفسیر

آیت کے اس حصے میں پہلی ساری باتوں کا خلاصہ دے دیا گیا ہے، پہلے کہا گیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہدایت کا نچوڑ یہ ہے کہ وہ نیک کام کرنے کا حکم دیتے ہیں برائیوں سے روکتے ہیں، نفیس پاکیزہ اور فائدہ مند چیزوں کا کھانا پینا حلال قرار دیتے ہیں، گندی، ناپاک اور نقصان دہ چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں اور پہلے کے دینوں میں جو مشکل اور مشقت والی باتیں تھیں ان کو ہٹا کر ان کی جگہ آسان کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور یہ سب اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے ہوتا ہے کیونکہ خود تو نہ لکھنا جانتے ہیں نہ پڑھنا، جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سکھانے سے کہتے ہیں پھر جب واقعہ یہ ہے کہ جو بات بھی کہتے ہیں وہ اچھی ہی ہوتی ہے تو پھر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

اس آیت میں ارشاد ہے کہ: اوپر جتنی باتیں کہی گئی ان سب کے ملانے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو لوگ اس پیغمبر کے کہنے کا یقین کریں گے اور اس کو سچا مانیں گے، دل و جان سے اس کی حفاظت کریں گے کوئی شبہ نہیں کہ کامیابی ان کے قدم چومے۔

یہاں سے صاف سمجھ آتا ہے کہ اسلام کسی خاص فرقے یا جماعت کا طرف دار نہیں ہے صرف اپنے اصول کا طرف دار ہے اور جو ان کی پیروی کرے اس کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کا ذمہ لیتا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اپنی قوم کا مرتبہ سب سے بلند کئے جانے کی دعا کر رہے تھے اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کو دل و جان سے مان لیا اور بنی اسرائیل کو ہدایت کی کہ ان اصولوں پر عمل کریں اور وقت آنے پر آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کا ساتھ دیں۔

اس نور کی پیروی کی جو پیغمبر کے ساتھ اتارا گیا، یعنی: پیغمبر نے جو کتاب پیش کی ہے اس کے حکموں پر عمل کیا، قرآن کریم کو بھی نور کہا گیا ہے کہ ہم نے تمہاری طرف واضح نور اتارا ہے اس نور سے مراد ہدایت کی روشنی ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی رہنمائی کرتی ہے انسانوں کو کوئی بھی مشکل پیش آئے قرآن کریم وہ روشنی ہے جس کے ذریعے تمام مسئلے حل ہوتے ہیں؛ اسی لئے فرمایا: جس نے پیغمبر پر اترنے والی روشنی، یعنی: کتاب کی پیروی کی وہی لوگ کامیابی پانے والے ہیں۔

پیروی کے سلسلے میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ سنت پر بھی عمل کرنا ضروری ہے، سنت قرآن کریم کے اصولوں کی تشریح کرتی ہے گویا قرآن کریم متن ہے تو سنت اس کی تشریح ہے؛ اس لئے جب تک سنت پر عمل نہیں ہوگا قرآن کریم پر مکمل طور سے عمل نہیں ہوسکتا، تو فرمایا: جو لوگ اُمّی پیغمبر پر ایمان لائے اس کی تائید کی اس کی مدد کی اور اس پر اترنے والی کتاب اور خود اس کی سنت کی پیروی کی تو یہی لوگ کامیابی کی منزلیں طے کرنے والے ہیں اور یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کے مستحق ہیں، اگر یہودی و عیسائی بھی اُمّی پیغمبر کا دامن پکڑ لیں تو وہ بھی مستحقین کی فہرست میں شامل ہوجائیں گے ورنہ وہ محروم رہ جائیں گے، ان کے حق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول نہیں ہوگی، کامیابی کا راز اس آیت میں بیان کردیا گیا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صرف پیروی کافی نہیں،

ادب واحترام اور محبت بھی فرض ہے

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایسی پیروی مقصود نہیں جیسے عام دنیا کے حاکموں کی پیروی زبردستی کرنا پڑتی ہے بلکہ وہ پیروی مقصود ہے جو عظمت ومحبت کا نتیجہ ہو، یعنی: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت ومحبت دل میں اتنی ہو کہ اس کی وجہ سے آپ کے حکموں کی خوش دلی سے پیروی کرے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع تو امت پر فرض ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ پیغمبروں کے بھیجنے کا مقصد ہی اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا لیکن حق تعالیٰ نے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صرف اسی پر بس نہیں کی بلکہ امت پر آپ کی تعظیم وتوقیر اور ادب کو بھی لازم قرار دیا ہے اور قرآن کریم میں جگہ جگہ اس کے آداب سکھائے گئے ہیں۔

یہاں پر فلاح، یعنی: کامیابی پانے کیلئے چار شرطیں ذکر کی گئی ہیں: **پہلی**: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا۔ **دوسری**: آپ کی تعظیم وتکریم۔ **تیسری**: آپ کی مدد اور **چوتھی**: قرآن کریم کی پیروی ہے۔

پیغمبری سب کی طرف

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ

کہہ دیجئے　اے　لوگو!　تحقیق میں　پیغمبر ہوں　اللہ کا　طرف تمہاری　سب کی　وہ اللہ کہ　لئے جس کے

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا

حکومت ہے　آسمانوں کی　اور　زمین کی　نہیں کوئی معبود　مگر　وہ　پیدا کرتا ہے　اور　مارتا ہے　پس ایمان لاؤ

بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ

پر اللہ　اور　پیغمبر اس کے　پیغمبر　اُمی پر　جو　یقین رکھتا ہے　پر اللہ　اور　پر حکموں اسکے　اور

اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ

چلو پیچھے اس کے　تاکہ تم　راہ پاؤ　(۱۵۸)　اور　سے　قوم　موسیٰ کی　ایک گروہ ہے جو راہ بتاتے ہیں

بِالْحَقِّ وَ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

ساتھ حق کے　اور　ساتھ اسی کے　انصاف کرتے ہیں (۱۵۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے اے لوگو! میں اللہ کا پیغمبر ہوں تم سب کی طرف جس کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں وہی پیدا کرتا ہے وہی مارتا ہے، سو! اللہ پر ایمان لاؤ اور اس

کے بھیجے ہوئے اُمّی پیغمبر پر جو اللہ پر اور اس کے سب کلاموں پر یقین رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو تا کہ تم کامیابی کی راہ پاؤ۔(۱۵۸) اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ہے جو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی کے مطابق انصاف کرتے ہیں۔(۱۵۹)

تفسیر

اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہے کہ لوگوں سے کہہ دیں کہ وہ پیغمبر جس کی تابعداری کا حکم دیا گیا ہے وہ میں ہی ہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی ساری مخلوق کی طرف اپنا پیغام دے کر بھیجا ہے کہ انہیں پہنچادوں، اللہ تعالیٰ کی حکومت سارے آسمانوں میں اور ساری زمین میں پھیلی ہوئی ہے اس کے سوا کسی کی بندگی ایک بے عقلی کا کام ہے وہی تنہا سب کا معبود ہے اسی کے ہاتھ میں پیدا کرنا اور مارنا ہے؛ اس لئے لوگوں کو پورا یقین کرنا چاہئے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ان کے معبود ہیں اس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا پیغمبر بنا کر ان کی طرف بھیجا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعے انسان کی بہتری کا راستہ بتادیا ہے آپ کا پہلا کام یہ ہے کہ خود اللہ عزوجل پر مکمل ایمان رکھتے ہیں اور اس کی وحی کو اور کتابوں کو جو اس نے اس سے پہلے بھیجی ہیں اور قرآن کریم کو جو آپ پر اتارا گیا ہے برحق مانتے ہیں، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہنے پر چلو، سیدھی راہ تمہیں اسی کے ذریعہ سے مل سکتی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے کہ: یہودیوں میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں کہ جو حق پسند ہیں اور لوگوں کو سیدھی راہ پر چلنے کی ہدایت کرتے ہیں اور حق کو سامنے رکھ کر انصاف کرتے ہیں اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ ہیں جو یہودی تھے اور اسلام اختیار کرلیا تھا، نیز: وہ تمام یہودی داخل ہیں جو قیامت تک تعصب چھوڑ کر اسلام کی سچی تعلیم اختیار کرلیں۔

یہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبری کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ سب کیلئے ہے، ارشاد ہے کہ: اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! یعنی: عرب وعجم کے لوگوں! یہ گویا تمام انسانوں سے خطاب ہے خواہ وہ مشرق میں رہتے ہوں یا مغرب میں، شمال کے باشندے ہوں یا جنوب کے، شہروں کے رہنے والے ہوں یا جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے والے سب کو خطاب کیا گیا ہے، یہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے کہلوایا جارہا ہے کہ میں تم

سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہوں، میری پیغمبری سے کوئی ملک خواہ وہ دنیا کے کسی خطے میں ہو یا کوئی آدمی خواہ وہ کسی رنگ ونسل کا ہو جدا نہیں ہے میں سب کیلئے سچا پیغمبر ہوں، میں اس ذات کی طرف سے بھیجا گیا ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے وہ پوری کائنات کا خالق ومالک ہے اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ وحدہٗ لاشریک لہ ہے، یہ اسلام کا بنیادی نظریہ ہے جس کی دعوت سارے پیغمبر دیتے آئے ہیں، یہ عقیدہ تمام پیغمبروں کے درمیان ایک مشترک بات ہے، پیغمبروں کی اس دعوت کی حقانیت لازماً ظاہر ہوگی لہٰذا ہر انسان کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا بھی اسی طرح برحق ہے جس طرح یہ بات برحق ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، حشر میں ہر چیز کھل کر سامنے آجائے گی اور اس وقت معلوم ہوگا کہ پیغمبر علیہم السلام جو دعوت دیتے رہے وہ بالکل صحیح تھی، فرمایا: جس خدا نے مجھے بھیجا ہے اس کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی وہی دیتا ہے، "سورۂ بقرہ" میں فرمایا کہ: تم اللہ تعالیٰ کا کس طرح انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان نطفہ تھے اللہ تعالیٰ نے تمہیں زندگی بخشی کہ تم کچھ بھی نہیں تھے پھر تمہیں موت دیگا تم اپنی عمر گزار کر مر جاؤ گے قیامت کو وہ پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہوگا، حساب کتاب کی منزل آئے گی اور پھر عملوں کا بدلہ ملے گا، اللہ تعالیٰ کی یہ صفتیں بھی بیان ہوگئیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی صفتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اللہ پر اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ، کامیابی کا یہی راستہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو ایک جانو اور اس کے پیغمبر کو سچا مانو، وہ پیغمبر جو کہ پیغمبر اُمّی ہیں ان کی پیشین گوئیاں اسی نام کے ساتھ پہلی کتابوں میں بھی آچکی ہیں اور خود اس پیغمبر کی کیفیت یہ ہے کہ وہ بھی اس اللہ پر اسی طرح ایمان رکھتے ہیں جس طرح دوسروں کو دعوت دیتے ہیں، وہ نہ صرف اس کی ذات پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ اس کے تمام کلاموں پر بھی یقین رکھتے ہیں، کلمات سے مراد تمام آسمانی کتابیں اور صحیفے ہیں "تورات، زبور، انجیل قرآن پاک" اور دوسرے صحیفوں پر اس کا یکساں ایمان ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی اتارا ہے وہ برحق ہے، لہٰذا اس پیغمبر کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ اب ہدایت کا واحد راستہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر بتلاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں آپ کی قوم کی کئی ایک خرابیاں بیان ہو چکی ہیں یہ الٹی ذہنیت کے لوگ تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا کہ: تم میں اکثر لوگ نافرمان ہیں تاہم ان میں بعض اچھے لوگ بھی ہیں، "سورۂ آل عمران" میں گزر چکا ہے کہ ان میں سارے برابر نہیں بلکہ بعض ایسے بھی ہیں جو حق کو پہچانتے ہیں، چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں مدینے کے دس یہودی علماء میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو ایمان کی توفیق بخشی، ایسے لوگ ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبری تمام جہان کیلئے قیامت تک ہے؛

اسی لئے آپ پر پیغمبری ختم ہے

یہی اصلی راز ہے مسئلہ ختم نبوت کا، کیونکہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبری قیامت تک آنے والی سب نسلوں کیلئے عام ہے تو پھر کسی دوسرے پیغمبر کے بھیجے جانے کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش اور یہی راز ہے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کی، اس خصوصیت کا کہ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہمیشہ حق پر ایک ایسی جماعت قائم رہے گی جو دین میں پیدا ہونے والے سارے فتنوں کا مقابلہ اور دینی معاملوں میں پیدا ہونے والے سارے رخنوں کو روکتی رہے گی، کتاب وسنت کی تعبیر وتفسیر میں جو غلطیاں رائج ہوں گی یہ جماعت ان کو بھی دور کرے گی اور حق تعالیٰ کی خاص مدد اس جماعت کو حاصل ہوگی جس کے سبب یہ سب پر غالب آکر رہے گی کیونکہ حقیقت میں یہ جماعت ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغمبری کے فرائض ادا کرنے میں آپ کے قائم مقام ہوگی۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت "كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ" کے تحت میں بتلایا ہے کہ اس آیت میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اس امت میں صادقین (سچوں) کی ایک جماعت ضرور باقی رہے گی ورنہ دنیا کو سچوں کے ساتھ رہنے کا حکم ہی نہ ہوتا اور اسی سے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ہر دور میں اجماع امت کا شرعی حجت ہونا ثابت کیا ہے، کیونکہ سچوں کی جماعت کے موجود ہوتے ہوئے کسی غلط بات یا گمراہی پر سب کا اجماع واتفاق نہیں ہو سکتا۔

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم النبیین اور آخری پیغمبر ہونے کی

طرف اشارہ ہے، کیونکہ جب آپ کو قیامت تک آنے والی نسلوں کیلئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے تو اب کسی دوسرے نئے پیغمبر کی ضرورت باقی نہیں رہتی؛ اسی لئے آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو وہ بھی اپنی جگہ اپنی پیغمبری پر برقرار ہونے کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت پر عمل کریں گے جیسا کہ صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبر بنا کر بھیجا جانا ساری دنیا کیلئے ہونا اور قیامت تک کیلئے ہونے پر یہ آیت بھی بہت بڑا ثبوت ہے اس کے علاوہ قرآن کریم کی بہت سی آیتیں اس پر گواہ ہیں، مثلاً: ایک جگہ ہے کہ یہ قرآن مجھ پر وحی کے ذریعہ بھیجا گیا تا کہ میں تم کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراؤں اور ان لوگوں کو بھی جن کو میرے بعد یہ قرآن پہنچے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند اہم خصوصیات

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ: تبوک کی جنگ کے موقعہ پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تہجد کی نماز میں مشغول تھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خوف ہوا کہ کوئی دشمن حملہ نہ کر دے؛ اس لئے آپ کے گرد جمع ہو گئے جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ: آج کی رات مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں ملیں، پہلی یہ کہ: میری پیغمبری کو ساری دنیا کی ساری قوموں کیلئے عام کیا گیا ہے اور مجھ سے پہلے جتنے پیغمبر آئے ان کا اللہ تعالیٰ کی طرف بلانا اور ان کا بھیجا جانا اپنی اپنی قوم کے ساتھ مخصوص تھا، دوسری بات یہ ہے کہ: مجھے میرے دشمن کے مقابلہ میں ایسا رُعب عطا کیا گیا ہے کہ وہ مجھ سے ایک مہینہ کی مسافت پر ہو تو میرا رُعب اس پر چھا جاتا ہے، تیسری یہ کہ: میرے لئے کافروں سے حاصل کیا ہوا غنیمت کا مال حلال کر دیا گیا حالانکہ پچھلی امتوں کیلئے حلال نہ تھا بلکہ اس کا استعمال کرنا بڑا گناہ تھا ان کے غنیمت کے مال صرف یہ مصرف تھا کہ آسمان سے ایک بجلی آئے اور اس کو جلا کر خاک کر دے، چوتھی یہ کہ: میرے لئے تمام زمین کو مسجد اور پاک کرنے کا ذریعہ بنا دیا کہ ہماری نماز زمین پر ہر جگہ ہو جاتی ہے مسجد کے ساتھ مخصوص نہیں، بخلاف پہلی امتوں کے کہ ان کی عبادت صرف

ان کے عبادت خانوں کے ساتھ مخصوص تھی اپنے گھروں میں یا جنگل وغیرہ میں ان کی نماز وعبادت نہ ہوتی تھی، نیز: یہ کہ جب پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو خواہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے یا کسی بیماری کے سبب تو وضو کے بجائے مٹی سے تیمم کرنا اس امت کیلئے پاکی وضو کے قائم مقام ہوجاتا ہے، پچھلی امتوں کیلئے یہ آسانی نہ تھی، پھر فرمایا: اور پانچویں چیز کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں وہ خود ہی اپنی نظیر ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو ایک دعا کی قبولیت ایسی عطا فرمائی ہے کہ اس کے خلاف نہیں ہوسکتا اور ہر پیغمبر نے اپنی اپنی دعا کو اپنے خاص خاص مقصدوں کیلئے استعمال کرلیا وہ مقصد حاصل ہوگئے مجھ سے یہی کہا گیا کہ آپ کوئی دعا کریں میں نے اپنی دعا کو آخرت کیلئے محفوظ کرادیا وہ دعا تمہارے اور قیامت تک جو شخص "لا الہ الا اللہ" کی گواہی دینے والا ہوگا اس کے کام آئے گی، نیز: امام احمد کی ایک روایت حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جس کو میرے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے جانے کا علم ہو اور وہ نہ مانے خواہ وہ کوئی بھی ہو اگر وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے گا تو دوزخ میں جائے گا۔

"صحیح بخاری" میں اسی آیت کے تحت حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان کسی بات میں اختلاف ہوا حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناراض ہوکر چلے گئے یہ دیکھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ان کو منانے کیلئے چلے مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہ مانا یہاں تک کہ اپنے گھر میں پہنچ کر دروازہ بند کرلیا مجبوراً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ واپس ہوئے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوگئے ادھر کچھ دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے اس فعل پر شرمندگی ہوئی اور یہ بھی گھر سے نکل کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنا واقعہ عرض کیا، حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوگئے جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہونے لگے تو عرض کیا اے اللہ کے پیغمبر! زیادہ قصور میرا ہی تھا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میرے ایک ساتھی کو اپنی تکلیفوں سے چھوڑ دو کیا تم نہیں جانتے کہ جب میں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ کہا کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں

توتم سب نے مجھے جھٹلایا صرف ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہی تھے جنہوں نے پہلی بار میں ہی میری تصدیق کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ: اس آیت سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کیلئے اور ہر ملک ہر خطہ کے باشندوں کیلئے اور ہر قوم و برادری کیلئے آپ کا پیغمبر ہونا ثابت ہوا اور یہ کہ آپ کے بھیجے جانے کے بعد جو شخص آپ پر ایمان نہیں لایا وہ اگرچہ کسی شریعت و کتاب کا یا کسی اور مذہب کی پوری پوری پیروی تقوٰی و احتیاط کے ساتھ بھی کر رہا ہو وہ ہرگز نجات نہیں پائے گا۔

آخر آیت میں بتلایا کہ میں اس ذات پاک کی طرف سے پیغمبر ہوں جو تمام آسمان و زمین کا مالک ہے وہ ہی زندہ کرتا ہے وہ ہی مارتا ہے۔

یہاں پر بھی اسی بات کو بیان فرمایا ہے کہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک امت ایسی ہے جو حق کے ساتھ رہنمائی کرتی ہے اور اسی حق کے ساتھ انصاف کرتی ہے اگرچہ ان کی تعداد بہت ہی کم ہے تاہم ایسے لوگ ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں، البتہ یہودی و عیسائی اسلام دشمنی میں پیش پیش رہے ہیں، یہودی ہمیشہ اندرونی سازشیں کرتے ہیں اور عیسائی طاقت کے بل پر اسلام کو مغلوب کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے قبیلے

وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی

اور الگ الگ کرلیا ہم نے انکو بارہ ایک دادا کی اولاد بڑی بڑی جماعتیں اور وحی بھیجی ہم نے طرف موسیٰ کی

اِذِ اسْتَسْقٰهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ

جب پانی مانگا اس سے قوم اسکی نے کہ ماریں لاٹھی اپنی پتھر کو پس ظاہر ہوئے

مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ

سے اس بارہ چشمے تحقیق پہچان لیا ہر قبیلے نے گھاٹ اپنا

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے جدا جدا کر کے بارہ دادوں کی اولادوں کو بڑی بڑی جماعتیں بنادیا اور ہم

نے موسیٰ کو حکم بھیجا جب اس سے اس کی قوم نے پانی مانگا کہ ماریں اپنی لاٹھی اس پتھر پر تو اس سے پھوٹ نکلے بارہ چشمے ہر قبیلے نے اپنا گھاٹ پہچان لیا۔

لفظی تحقیق: حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا ان کے بارہ بیٹے تھے ان کی اولاد "اسباط" کہلائی اور ان کے بارہ قبیلے بن گئے جو "بنی اسرائیل" مشہور ہیں۔ **اَنْۢبَجَسَتْ:** کے اصل معنیٰ رِسنا ہیں، "سورۂ بقرہ" میں اس موقعہ پر "اِنْفَجَرَتْ" آیا ہے جس کے معنیٰ ہیں بہہ پڑنا دونوں کو ملا کر مطلب یہ ہوا کہ پہلے پانی رسنے لگا اور تھوڑی دیر میں بہہ پڑا۔ مفسرین کرام اس کا یہ مطلب نکالتے ہیں کہ ابتداء میں تھوڑا تھوڑا پانی نکلا ہوگا مگر بعد میں اس میں اضافہ ہو گیا اور چشمہ پوری طرح بہنے لگا۔

تفسیر

اس آیت میں بنی اسرائیل کو وہی احسان جتائے گئے ہیں جن کی یاد دہانی اکثر سورتوں میں کی گئی ہے ان احسانات کو بار بار اس لئے یاد دلایا جاتا ہے کہ ان پر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر ماننے سے انکار کرنا اللہ عزوجل کے حکم سے منہ موڑنا ہے جس نے انکو ہمیشہ اپنے احسان و کرم سے نوازا ہے۔

ارشاد ہے کہ: ان کی سہولت کے واسطے ہم نے ان کو بارہ بڑے بڑے خاندانوں میں بانٹ دیا اور بارہ دادوں کی اولاد الگ الگ ایک بڑی امت بن گئی، ایک دفعہ جب وہ جنگل میں پیاسے ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے حکم دیا کہ سامنے کے پتھر پر اپنی لاٹھی ماریں لاٹھی مارتے ہی اسمیں سے بارہ چشمے ظاہر ہوئے اور ان کے ہر قبیلہ نے ایک ایک چشمہ سے پانی لیا۔

ہر قبیلے نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا، چنانچہ ہر ایک کو حکم ہوا کہ وہ اپنے اپنے مقررہ چشموں سے پانی حاصل کریں اور ایک دوسرے کے گھاٹ میں مداخلت نہ دیں، اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے اس نے معجزانہ طریقے سے بنی اسرائیل کیلئے پانی کا انتظام کر دیا یہاں پر عقل مند شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعتراف کرتا ہے۔

جنگل میں آرام

وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ

اور سایہ کیا ہم نے پران ابر کا اور اتارا ہم نے پران من اور سلویٰ

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا

کھاؤ سے پاکیزہ صاف ستھری چیزوں کو جو دیں ہم نے تم کو اور نہیں انہوں نے ظلم کیا ہم پر اور لیکن تھے وہ

اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

جانوں اپنی پر ظلم کرتے (۱۶۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے ان کے اوپر بادلوں کا سایہ کیا اور ہم نے ان پر من وسلویٰ اتارا (ان سے کہا) کھاؤ صاف ستھری چیزیں جو ہم نے تم کو دیں اور انہوں نے ہمارا کچھ نہ بگاڑا لیکن وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ (۱۶۰)

تفسیر

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ کر دیا، اللہ تعالیٰ انہیں ایک عرصہ تک صحرا میں رکھ کر ان کی کمزوریاں دور کرنا چاہتے تھے، لہٰذا ان کیلئے بنیادی ضرورتوں کا انتظام بھی فرما دیا۔

پانی کے بعد اگلی ضرورت خوراک کی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کا بندوبست بھی معجزانہ طریقہ سے کیا، اللہ تعالیٰ نے ان پر "من وسلویٰ" اتارا، "من" کا لغوی معنیٰ: احسان ہے جو چیز مفت مل جائے وہ احسان ہوتا ہے تو اس کو "من" اس لئے بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بنی اسرائیل پر خاص احسان تھا ویسے "من" سے مراد ترنجبین کی قسم کی سفید شکر ہے جو بنی اسرائیل کے قیام کی جگہ پر شبنم کی طرح گرتی تھی اور جسے وہ اکٹھا کر لیتے تھے یہ خوش ذائقہ طاقتور اور جلد ہضم ہونے والی خوراک تھی جسے بنی اسرائیل استعمال کرتے تھے۔

بہر حال خوراک کیلئے ایک تو اللہ تعالیٰ نے "من" مہیا کیا اور دوسرا "سلویٰ" یہ بٹیر کی طرح کا پرندہ تھا ان کو ہوا اڑا کر بنی اسرائیل کے خیموں کے پاس لے آتی جنہیں وہ آسانی سے پکڑ لیتے اور ذبح کر کے اس کا گوشت کھاتے جو نہایت ہی لذیز ہوتا "من" میں شکر اور نشاستہ کے اجزاء پائے جاتے تھے جب کہ اعلیٰ طاقت کیلئے اللہ تعالیٰ نے پرندوں کا گوشت مہیا کر دیا اور اس طرح بنی اسرائیل کی خوراک کا مسئلہ بھی حل ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: کھاؤ جو ہم نے تمہیں پاک روزی عطا کی ہے، طیبات سے مراد پاک چیزیں جو ملتی بھی مفت تھی مگر اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت پر بھی وہ لوگ مطمئن نہ ہوئے اور جیسا کہ "سورۂ بقرہ" میں ہے کہنے لگے روزانہ ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے کھاتے ہمارے منہ کا ذائقہ بگڑ گیا ہے، لہٰذا ہمارے لئے اپنے رب سے سبزی ترکاری، دال، لہسن، پیاز وغیرہ کا سوال کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمجھایا کیا تم "من وسلویٰ" جیسی اعلیٰ چیزوں کے بجائے ساگ پات جیسی ادنیٰ چیزیں چاہتے ہو؟ مگر وہ قوم اپنی بات پر اڑی رہی اس کے بعد کا بیان اگلی آیت میں آرہا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انہوں نے نافرمانی کر کے ہم پر ظلم نہیں کیا، یعنی: ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں کسی کے غلط کام کا اس پر کیا اثر ہو سکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اپنے پیغمبر کی بار بار نافرمانی کر کے انہوں نے خود اپنا ہی نقصان کیا اس سے اللہ تعالیٰ کا کیا نقصان ہو سکتا تھا انہوں نے اپنے آپ پر ہی ظلم اور زیادتی کی۔

شہر میں بسنے کی اجازت

وَ اِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

اور جب کہا گیا ان سے رہو بسو اس شہر میں اور کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو تم

وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ

اور کہو بخش دے اور داخل ہو دروازے میں جھکتے ہوئے بخش دیں گے ہم تمہیں خطائیں تمہاری

سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

عنقریب زیادہ دیں گے ہم نیکی کرنے والوں کو (۱۶۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب ان کو حکم ہوا کہ اس شہر میں بسو اور اس میں جہاں سے چاہو کھاؤ اور کہو ہم کو بخش دے اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے (یعنی: جھکتے ہوئے) داخل ہو تو ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے نیکی کرنے والوں کو ہم البتہ زیادہ دیں گے۔ (۱۶۱)

تفسیر

بنی اسرائیل مصر سے نکلنے کے بعد چالیس سال سینا کے جنگل میں جسے "وادی تیہ" بھی کہتے ہیں خانہ بدوش پھرتے رہے یہ انہیں نافرمانی کی سزا ملی تھی اس کا تفصیلی ذکر "سورۂ بقرہ" اور "سورۂ مائدہ" میں گزر چکا ہے اس زمانے میں ان پر خدا تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتیں ہوئیں دھوپ میں بادل سے سایہ کیا پانی پینے کیلئے پتھر سے چشمے بہنے لگے کھانے کو "من وسلویٰ" ملا، لیکن یہ لوگ طرح طرح کی سبزیاں، ترکاریاں اور غلے کھانے کے عادی تھے جب جنگل میں پھرتے پھرتے اور ایک ہی طرح کی غذا کھاتے کھاتے اُکتا گئے تو ان کی درخواست پر انہیں حکم ہوا کہ شہر میں جا کر بسیں اس شہر کا نام "اریحا" تھا جو بیت المقدس کے قریب ایک آباد اور سرسبز شہر تھا اور بعض نے بیت المقدس ہی کہا ہے یہ شہر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں فتح کیا۔

اس آیت میں ارشاد ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اس شہر میں بسنے کا حکم دیا اور اجازت دی کہ پیداوار خوب کھاؤ لیکن مزاج میں سرکشی اور غرور نہ آنے پائے، فاتحین کی طرح شہر میں چیختے چلاتے، باجے بجاتے، بیہودہ شور وغل کرتے داخل نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی سے سر جھکاتے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے داخل ہوں اس رویہ کے اختیار کرنے سے ہم ان پر مہربانی کریں گے اور ان کی خطائیں معاف کر دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیں گے، یعنی: ابھی ایک شہر فتح ہوا ہے چال چلن ٹھیک رہا تو ابھی اور ایک ملک ملے گا، نیز: ٹھیک طرح چلنے والوں کو آخرت میں ان کے نیک عملوں کا بدلہ الگ ملے گا۔

اس واقعہ کے پیش آنے کے زمانہ کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے، بعض فرماتے ہیں کہ: بنی اسرائیل کا مذکورہ بستی میں داخلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہی پیش آیا، تاہم اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ: یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد آپ کے جانشین حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا، یہ بستی کون سی تھی جس میں داخلے کا حکم ہوا؟ اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ: یہ "اریحا" نامی بستی تھی جو کہ دشمن قوم کنعانیوں کے قبضے میں تھی بعض نے "ستیم" کی بستی کا ذکر کیا ہے جو "یروشلم" سے تیس میل کے فاصلے پر تھی، بعض فرماتے ہیں کہ: یہ کوئی بستی تھی جو نہروان کی مشرق کی جانب آٹھ دس میل کی مسافت پر تھی، بہر حال اکثر رائے "اریحا" نامی بستی کے حق میں ہے اس بستی کے باشندوں سے جنگ کر کے اس پر قبضہ کرنا تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، بائبل کی روایت کے مطابق وہاں پر زبردست لڑائی کے بعد شہر فتح ہوا تو بنی اسرائیل اس میں داخل ہوئے۔

ہمارے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا "اسوۂ حسنہ" مشعل راہ ہے جب آپ مکہ مکرمہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو آپ نے سر مبارک پر خود پہنا ہوا تھا اور آپ کی گردن جھکی ہوئی تھی پھر جب آپ سواری سے اترے تو خود اتار دیا پھر غسل فرما کر آٹھ رکعت نماز ادا فرمائی، بہر حال بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: پہلی بات یہ ہے کہ استغفار کرتے ہوئے بستی میں داخل ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرر کئے ہوئے قاعدوں اور قانونوں پر چلنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں دنیا میں بھی اچھی طرح رکھا جائے گا اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی انہیں آرام اور چین نصیب ہوگا۔

ظالم پھر بھی نہ چوکے

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا

پس بدل ڈالا　انہوں نے　جو ظالم تھے　میں سے ان　قول　علاوہ　اس قول کو　جو کہا گیا　سے ان　پس بھیجا ہم نے

عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ ع ۲۰ ۵ ۱۰

پران　عذاب　سے　آسمان　بوجہ اسکے کہ تھے وہ　ظلم کرتے　(۱۶۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پس ان میں ظالموں نے اس لفظ کو جوان سے کہا گیا تھا بدل کر اور لفظ کہا، پھر ہم نے ان پر ان کی شرارت کے سبب آسمان سے عذاب بھیجا۔ (۱۶۲)

تفسیر

بنی اسرائیل کے حالات پڑھ کر یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ یہ لوگ ملک شام کے رہنے والے تھے جہاں ان کے دادا بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام جن کا لقب اسرائیل تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے رہا کرتے تھے ان کے بارہ بیٹے تھے جن میں حضرت یوسف علیہ السلام ایک عجیب طریقے سے مصر پہنچ گئے (جس کا ذکر "سورۂ یوسف" میں تفصیل سے آئے گا) اور آہستہ آہستہ وہاں کے بادشاہ ہوگئے، شام میں قحط پڑا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ماں باپ اور تمام بھائیوں کو مصر میں بلا کر بسالیا، حضرت یوسف علیہ السلام کے انتقال کے بعد مصر کی سلطنت بنی اسرائیل کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہاں کے اصلی باشندے برسر اقتدار آگئے انہوں نے بنی اسرائیل پر بڑے بڑے ظلم وستم توڑنے شروع کردیئے اور قوم کی قوم کو غلام بنا کر رکھ دیا آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے اور ان کو مصر سے نکال کر پھر شام لائے اور کہا کہ یہ ملک تمہارا آبائی ملک ہے اس پر قبضہ کرو اور چین سے اپنے وطن میں رہو، انہوں نے کہا کہ وہاں تو بڑے بڑے زبردست اور لمبے تڑنگے لوگوں کا قبضہ ہے ان سے لڑنا اور وہاں سے انہیں نکال کر ملک پر قبضہ کرنا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے اس نافرمانی کی یہ سزا ملی کہ چالیس سال تک جنگلوں کی خاک چھاننی پڑی اور "وادی تیہ" میں بھٹکتے پھرے اس خانہ بدوشی کی زندگی میں جو جو احسان ان پر ہوئے ان کو یہاں گنوایا گیا ہے آخر جب سزا کی مدت ختم ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہو چکا تھا اور حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں انہوں نے "اریحا" شہر فتح کیا یہ اسی شہر میں داخل ہونے اور بسنے کے ادب اور طریقے تھے جو انہیں سکھائے گئے اور جن کا ذکر پچھلی آیت میں گزرا، لیکن انہوں نے ان ہدایتوں کے بالکل خلاف کیا اور اپنی اکڑفوں سے کام خراب کرلیا انہوں نے بجائے عاجزی وانکساری اختیار کرنے کے تکبر اور گستاخی کو اپنا طور طریقہ بنایا اور منہ سے واہی تباہی باتیں بکنے لگے آخر ان کو اس کی سزا ملی اور ان میں سخت طاعون پھیل گیا لکھا

ہے کہ آدھے ہی دن میں ستر ہزار افراد مر گئے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی نافرمانی سے بچائے اور ہر ایک آفت و بلا سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے قصہ سے ہمیں بہت کچھ سیکھنا ہے قرآن کریم نے اس کا بار بار بیان کرکے ہمیں جتا دیا ہے کہ جن باتوں میں پھنس کر یہودی تباہ و برباد ہوئے ان کے قریب بھی نہ پھٹکنا چاہئے۔

یہ فسادی ذہن کے لوگ تھے یہ ہمیشہ الٹا چلتے تھے اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا تھا کہ شہر میں داخل ہوتے وقت "حِطَّۃٌ" کہنا، یعنی: اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا، "بخاری شریف" کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل نے "حِطَّۃٌ" کے بجائے "حنطة فی شعیرة" کے الفاظ کہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں گندم اور جو ملا ہوا غلہ دیں، انہوں نے ایسی الٹ پلٹ باتیں کیں۔

ایک اور واقعہ

وَ سْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ یَعْدُوْنَ
اور پوچھئے ان سے بارے میں اس بستی کے جو تھی سامنے سمندر کے جب حد سے بڑھنے وہ

فِی السَّبْتِ اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ یَوْمَ
میں ہفتہ کے بارے جب آتی تھی پاس انکے مچھلیاں انکی دن ہفتہ انکے کے قطار در قطار اور جس دن

لَا یَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِیْهِمْ ۛۚ كَذٰلِكَ ۛۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾
ہفتہ نہ ہوتا تو نہ آتی تھیں اسی طرح آزماتے تھے ہم انکو اس وجہ سے کہ تھے وہ نافرمانی کرتے (۱۶۳)

وقف لازم

النصف

معانقة ۲ عند المتأخرين ۱۲

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ان سے اس بستی کا حال پوچھ جو دریا کے کنارے تھی جب وہ ہفتہ کے حکم میں حد سے بڑھنے لگے جب ان کے پاس مچھلیاں ہفتہ کے دن پانی کے اوپر آنے لگیں اور جب ہفتہ نہ ہوتا تو وہ نہ آتی تھیں اس طرح ہم نے ان کو آزمایا؛ اس لئے کہ وہ نافرمان تھے۔ (۱۶۳)

لفظی تحقیق: اَلْقَرْیَۃِ: گاؤں۔ اس سے "ایلہ" بستی مراد ہے جو بحیرۂ قلزم کے کنارے مدین اور طور کے درمیان واقع تھی اور چونکہ سمندر ان کے قریب تھا؛ اس لئے یہ لوگ مچھلی کے شکار کے عادی تھے جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا جہاں پہلے "ایلہ" بستی واقع تھی آج کل اس جگہ عقبہ ہے جس کے نام پر خلیج عقبہ مشہور ہے۔ شُرَّعًا: شارع کی جمع ہے، وہ چیز جو بہت زیادہ ظاہر ہو اور سب کو کھلم کھلا نظر آئے، چوڑی سڑک کو جسے سب دیکھ سکیں شارع (شاہراہ) کہتے ہیں یہاں مراد یہ ہے کہ مچھلیاں بہت زیادہ تھوڑی تھوڑی دیر میں پانی میں اچھلتی تھی اور بہت موٹی تازی تھیں۔

تفسیر

اس آیت میں یہودیوں کے ایک فرقے کی بے باکی، ضد اور ہٹ دھرمی کا بیان ہے "ایلہ" کے رہنے والے بہت سخت طبیعت کے تھے اور شریعت کے حکم توڑنے میں بہت نڈر تھے یہودیوں کیلئے حکم تھا کہ ہفتہ کے دن سوا اللہ تعالیٰ کی عبادت کے کچھ نہ کریں، چنانچہ ہفتہ کے دن اور کاروبار کی طرح مچھلی کا شکار بھی ان کیلئے حرام تھا "ایلہ" کے لوگوں کو اس آزمائش میں مبتلا کیا گیا کہ اور ان دنوں میں دریا میں مچھلی بہت کم آتی لیکن ہفتہ کے دن دریا مچھلیوں سے بھر جاتا، یہ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کا امتحان تھا، آیت میں ارشاد ہے کہ نافرمان لوگوں کو اللہ تعالیٰ اسی طرح آزمائش اور امتحان میں مبتلا کرتے رہتے ہیں تاکہ انہیں فرمانبرداری کی عادت ہو اور سرکشی چھوڑ دیں۔

مختلف قوموں کے نزدیک ہفتہ کے مختلف دنوں کو احترام حاصل ہے مسلمانوں کے نزدیک جمعہ تمام دنوں کا سردار ہے اللہ تعالیٰ نے اسے باقی تمام دنوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے اس دن جمعہ کی نماز خاص اہتمام کے ساتھ ادا کرنے کا حکم ہے تاہم دنیا کے دوسرے کاروبار بھی نماز کے وقت کے علاوہ بدستور انجام دیئے جاسکتے ہیں، چنانچہ "سورۂ جمعہ" میں فرمایا گیا کہ: جب جمعہ کی نماز ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل (روزی)

تلاش کرو گویا ایمان والوں کیلئے اس مقدس دن میں مکمل طور پر کاروبار بند کرنا ضروری نہیں اسی طرح عیسائیوں کے ہاں اتوار کا دن مقدس ہے جس دن وہ خصوصی عبادت کرتے ہیں یہودیوں نے مقدس دن کے طور پر ہفتہ کو اختیار کیا اور ان کیلئے حکم یہ تھا کہ اس دن صرف عبادت کریں اور کوئی دوسرا کام نہ کریں بلکہ یہودی لٹریچر میں تو یہ بھی ملتا ہے کہ اس دن یہودی کھانے بھی نہیں پکاتے تھے اور ان کے چولھے ٹھنڈے پڑے رہتے تھے۔

ہفتہ کے دن مچھلیوں کی بہتات سے فائدہ اٹھانے کیلئے بستی والوں نے یہ حیلہ کیا کہ سمندر کے کنارے کنارے بڑے بڑے حوض بنائے اور انہیں نالیوں کے ذریعہ سمندر سے ملا دیا، ہفتے کے دن جب مچھلیاں کثرت سے پانی کی سطح پر ہوتیں تو سمندر کا پانی نالیوں کے ذریعہ حوضوں پر چھوڑ دیتے جس کے ساتھ بہت سی مچھلیاں بھی بہہ کر حوضوں میں جمع ہو جاتیں اس کے بعد پیچھے بند لگا دیتے تا کہ مچھلیاں واپس سمندر میں نہ چلی جائیں پھر جب اگلا دن، یعنی: اتوار کا دن آتا تو ان مچھلیوں کو آسانی سے حوضوں سے پکڑ لیتے اس طرح وہ ہفتے کے دن مچھلیوں کو جمع کرتے اور اتوار کے دن انہیں پکڑ لیتے اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی عملی طور پر خلاف ورزی کرتے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اے میری امت کے لوگو! ایسا کام نہ کرنا جس طرح یہودیوں نے کیا کہ اس طرح تم بھی معمولی حیلوں سے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھنے لگ جاؤ، دوسری حدیث میں آتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کہ انہوں نے حرام چیز کو حیلے کے ساتھ حلال قرار دیا، اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے چربی حرام کی تھی مگر وہ چربی کو خود تو نہیں کھاتے تھے مگر اس کو بیچ کر اس کے پیسے کھا جاتے تھے یہ بھی ان کی غلط حیلہ سازی تھی، اسی طرح انہوں نے حیلے سے ہفتہ کے دن کے احترام کو ضائع کیا اس قسم کی حیلہ سازی اس زمانے میں پائی جاتی ہے، مثلاً: بعض لوگ زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کیلئے یہ حیلہ کرتے ہیں کہ سال کا اکثر حصہ نصاب والا مال اپنی ملکیت میں رکھتے ہیں اور سال کے آخر میں یہی مال بیوی کو تحفہ کے طور پر دے دیتے ہیں اس طرح ایسے مال پر کسی ایک فرد کی ملکیت میں سال پورا نہیں ہو پاتا اور ان میں سے کوئی بھی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اس قسم کی حیلہ سازی بالکل ناجائز اور حرام ہے ایسا شخص زکوٰۃ کی ادائیگی سے بری نہیں ہوسکتا۔

پچھلے قصّے کا بقیہ

وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ

اور جب کہا ایک فرقہ نے میں سے ان کس لئے نصیحت کرتے ہو ایسی قوم کو کہ اللہ ہلاک کرنے والا ہے انکو

اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ

یا عذاب کرنے والا ہے انکو عذاب سخت وہ بولے (ہم نصیحت کرتے ہیں) عذر کرنے کیلئے سامنے رب تمہارے کے اور

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

اس لئے کہ شاید وہ بچیں (۱۶۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔اور جب ان میں سے ایک فرقہ بولا ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ چاہتا ہے کہ ہلاک کرے یا ان کو سخت عذاب دے، وہ بولے یہ ہم تمہارے رب کے سامنے عذر بیان کرنے کیلئے کرتے ہیں اور اس لئے بھی کرتے ہیں کہ شاید وہ ڈریں۔ (۱۶۴)

تفسیر

اب یہاں پر شکار سے روکنے اور خاموشی اختیار کرنے والوں کے درمیان آپس کی گفتگو کا ذکر ہو رہا ہے اور جب ان میں سے ایک گروہ، یعنی: خاموشی اختیار کرنے والوں نے روکنے والوں سے کہا، تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرنا چاہتے ہیں یا سخت عذاب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، اس پر روکنے والوں نے جواب دیا ہم اس لئے انہیں منع کرتے ہیں تا کہ تمہارے پروردگار کے سامنے عذر پیش کرسکیں، یعنی: اگر اللہ تعالیٰ پوچھیں کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے غلط کام ہوتا تھا تو تم نے روکا کیوں نہیں تو ہم کہہ سکیں کہ پروردگار ہم نے تو ان کو بہت سمجھایا مگر انہوں نے ہماری بات پر کان نہ دھرا کسی کو برائی سے روکنے کے تین ہی طریقے ہیں اعلیٰ طریقہ تو یہ ہے کہ برائی کو طاقت کے ساتھ دبا دیا جائے اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے روکنے کی کوشش کی جائے

اگر کوئی شخص زبان سے روکنے کی ہمت بھی نہیں پاتا تو گناہ سے روکنے کا ادنیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ اس برائی کو دل سے برا جانے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: جب بعض لوگ دیکھیں کہ ان کے درمیان برائی ہو رہی ہے اور وہ منع نہ کریں تو خطرہ ہے کہ سارے کے سارے ہی ہلاک نہ ہو جائیں، "سورۂ مائدہ" میں گزر چکا ہے کہ علم والے لوگ اپنے سامنے برائی ہوتی دیکھتے تھے مگر منع نہیں کرتے تھے تو یہ برائی ان میں مسلسل آ رہی تھی، چنانچہ اس واقعہ میں بھی ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو خود تو خاموش تھے برائی سے نہیں روکتے تھے مگر روکنے والوں کو بھی کہتے تھے کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں منع کرتے ہو تو منع کرنے والوں نے روکنے کی پہلی وجہ یہ بیان کی تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عذر پیش کر سکیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ شاید یہ لوگ ڈر جائیں اور ہفتہ کے دن شکار کرنے سے باز آ جائیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ سکیں۔

نافرمانوں کی سزا

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ

پس جب بھول گئے اس بات کو کہ سمجھائے جاتے تھے ساتھ اسکے بچا لیا ہم نے ان کو جو روکتے تھے سے برائی

وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴿۱۶۵﴾

اور پکڑ لیا ہم نے ان کو جنہوں نے ظلم کیا میں عذاب سخت اس وجہ سے کہ تھے وہ نافرمانی کرتے (۱۶۵)

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ﴿۱۶۶﴾

پھر جب سرکشی کی سے اس جس سے کہ منع کئے گئے تھے سے جس حکم دیا ہم نے ان کو ہو جاؤ بندر ذلیل و خوار (۱۶۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر جب وہ اس کو بھول گئے جو ان کو سمجھایا تھا تو ہم نے ان کو جو برے کام سے منع کرتے تھے نجات دی اور گناہگاروں کو بسبب ان کی نافرمانی کے برے عذاب نے پکڑا۔ (۱۶۵) پھر جب وہ اس کام میں آگے نکل گئے جس سے ان کو روکا گیا تھا تو ہم نے حکم کیا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔ (۱۶۶)

تفسیر

ارشاد ہے کہ جب انہوں نے سمجھانے والوں کی بات پر کان نہ دھرے یہاں تک کہ بہت سے سمجھانے والے ان کی ہدایت سے مایوس ہوکر بیٹھ رہے تو ان سب منع کرنے والوں کو بچالیا، لیکن ان نافرمانوں کو ان کی نافرمانی کی سزا میں سخت عذاب میں مبتلا کردیا، جب وہ اس پر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور نافرمانی میں دن بدن بڑھتے ہی چلے گئے تو پھر ہم نے حکم دیا کہ بندر بن جاؤ اور ذلت وخواری کا مزہ چکھو، اس واقعہ کا ذکر "سورۂ بقرہ" میں بھی آیا ہے وہاں اس کی تشریح بھی گزر چکی ہے، بنی اسرائیل اس کو اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے، چنانچہ یہودیوں کی مقدس کتابوں میں آج بھی اس کا ذکر موجود ہے، انسان کو اس واقعہ سے یہ سبق سیکھنا ہے کہ اس کو کسی قسم کی حیل وحجت کے بغیر کیسے خالص نیت کے ساتھ اس راستہ پر چلنا چاہئے جو اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے مقرر کردیا ہے۔

جب نصیحت کرنے والوں کی نصیحت کے باوجود وہ لوگ ہفتے کے دن شکار کرنے سے باز نہ آئے تو انہوں نے شکار کرنے والوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا درمیان میں دیوار کھڑی کردی آنے جانے کا راستہ تھا مگر مجموعی حیثیت سے انہوں نے نافرمانوں کا بائیکاٹ کردیا ان کا خیال تھا کہ ان کے ساتھ میل جول رکھنے سے کہیں وہ بھی ان کے ساتھ مصیبت میں گرفتار نہ ہوجائیں، پھر ایک دن ایسا ہوا کہ صبح اٹھے تو نافرمانوں کی طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دی دیوار پر جھانک کر دیکھا تو ہر گھر میں انسانوں کے بجائے بندر تھے مرد عورتیں سب بندروں کی شکل میں تبدیل ہوچکے تھے، تاریخی روایتوں میں ان لوگوں کی تعداد بیس ہزار سے ستر ہزار تک بیان کی گئی ہے، "سورۂ مائدہ" میں بندروں کے ساتھ خنزیروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔

خنزیر اور بندر دونوں لعنتی ہیں اللہ تعالیٰ سزا کے طور پر انسانوں کی شکلیں جن جانوروں کی شکلوں میں تبدیل کرتے ہیں وہ جانور لعنتی اور قطعی حرام ہوتے ہیں، خنزیر نجس اور ناپاک جانور ہے اور یہ تمام شریعتوں میں حرام رہا ہے، بندر نقل اتارنے والا بری صورت والا جانور ہے اور اس میں غیر فطری کام بھی پائے جاتے ہیں۔

خدا کا قانون ہے کہ ظلم اور نافرمانی کرنے والوں کو سزا ضرور ملتی ہے خواہ وہ کسی بھی قسم کی ہو، آج کے زمانے میں سزا کے طور پر ظاہری شکلیں تو تبدیل نہیں ہوتیں، البتہ بہت سے انسانوں کے باطن خنزیروں، بندروں اور کتوں جیسے ہو جاتے ہیں پھر جب قیامت کے قریب کا زمانہ آئے گا تو پھر سزا کے طور پر کہیں کہیں شکلیں بھی تبدیل ہوتی نظر آئیں گی، سزا کے طور پر بعض لوگ زمین میں دھنسا دیئے جائیں گے اور بعض دوسرے ظاہری عذاب بھی آئیں گے مگر ایسے عذاب مجموعی طور پر نہیں آئیں گے بلکہ کہیں کہیں ایسے واقعات پیش آئیں گے اور اِکا دُکا لوگوں کی شکلیں بھی مسخ ہوگی، کبھی اوپر سے پتھر برسیں گے اور کبھی زمین میں دھنسا دیئے جائیں گے۔

ایک اور سزا

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ
اور جب خبر دی رب آپ کے نے کہ البتہ ضرور بھیجے گا پر ان تک دن قیامت کے ایسا شخص جو

يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚۖ وَ اِنَّهٗ
دیا کرے ان کو برا عذاب بیشک رب آپکا البتہ جلد دینے والا ہے عذاب اور بیشک وہ ہے

لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾
البتہ بخشنے والا مہربان (۱۶۷)

با محاورہ ترجمہ:۔ اور اس وقت کو یاد کیجئے جب آپ کے رب نے خبر کر دی تھی کہ یہودیوں پر قیامت کے دن تک ضرور ایسے شخص کو بھیجتے رہیں گے جو ان کو برا عذاب کرے، بیشک آپ کا رب جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۱۶۷)

تفسیر

ارشاد ہے کہ اس واقعہ کو بھولنا نہ چاہئے کہ اے محمد! آپ کے رب نے صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ

بنی اسرائیل پران کی سرکشی اور بدمعاشی کی وجہ سے ذلت اور خواری ہمیشہ ہمیشہ کیلئے لکھ دی گئی اگر انہوں نے اپنا رویہ درست نہ کیا تو قیامت تک ایسے لوگ دنیا میں پیدا ہوتے رہیں گے جوان پر مصیبتیں ڈالیں گے اور کچل کر رکھ دیں گے اور آپ کا رب بھی قیامت میں ان پر عذاب مسلط کرے گا کیونکہ وہ عذاب دینے میں جلدی کرتا ہے کوئی چیز اسے روکنے والی نہیں ہے اور ساتھ ہی وہ گناہوں کا بخشنے والا اور رحم کرنے والا بھی ہے، جو توبہ کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو درست کر لیتا ہے اسے وہ معاف کر دیتا ہے اور اس پر اپنی رحمت اتارتا ہے، تاریخ گواہ ہے کہ بنی اسرائیل اپنی کرتوتوں کی وجہ سے ہمیشہ سے ذلیل وخوار رہے، پرانے زمانے میں یونانی، کلدانی اور بخت نصر وغیرہ نے ان کو تہس نہس کیا اس دور میں جرمنی، ہنگری وغیرہ نے ان کو ملک بدر کیا اور اب دوسروں کے بل بوتے پر جی رہے ہیں اگر ان کے طرف دار آج انہیں اکیلا چھوڑ دیں تو پھر ان کیلئے کوئی ٹھکانہ نہیں اور یہ سب مسلمانوں کی نصیحت اور عبرت کیلئے بیان کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کیلئے بھی قرآن مجید میں جگہ جگہ کامیابی کا وعدہ کیا ہے لیکن ساتھ ہی ہر جگہ یہ شرط لگائی ہے کہ یہ مدد اور کامیابی تب ہی ملے گی جب اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور تابعدار رہیں گے، کیونکہ تابعداری کا نام ہی تو اسلام ہے اس کے بغیر اسلام کا دعویٰ صرف منافقت ہے جس کی یہی سزا ہے جو بیان کی گئی ہے۔

قیامت کے قریب کے زمانے میں جب حضرت مسیح علیہ السلام اتریں گے تو وہ تمام یہودیوں کو قتل کر دیں گے حتیٰ کہ دجال یہودی بھی آپ کے ہاتھوں قتل ہوگا، مطلب یہ ہے کہ یہودیوں پر ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے اس وقت، یعنی: قیامت کے قریب زمانہ تک مختلف ذریعوں سے ذلت مسلط رہے گی۔

مچھلی کے شکار والا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً سات سو سال پہلے پیش آیا اس وقت سے لے کر یہودیوں پر مسلسل ذلت مسلط رہی ہے اور یہ قیامت کے قریب زمانہ تک اسی طرح رہے گی یہ لوگ کبھی بخت نصر کی غلامی میں رہے اور کبھی رومیوں اور کلدانیوں کے ماتحت ذلت سہتے رہے اور ان کے ظلم برداشت کرتے رہے، پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کے یہودیوں نے اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف بڑی سازشیں کیں جس کی وجہ سے یہاں کے یہودی کچھ مارے گئے اور کچھ ملک بدر کئے گئے جب یہودیوں کا

گڑھ خیبر فتح ہوگیا تو انہوں نے زمین کی نصف پیداوار کے عوض وہیں آباد رہنے کی درخواست کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شرط کے ساتھ اجازت دے دی کہ ہم جب چاہیں گے تمہیں یہاں سے بے دخل کردیں گے، چنانچہ آپ کی خصوصی وصیتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ میرے بعد تمام یہودیوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دینا اس سرزمین پر کوئی غیر مذہب جزیہ دے کر بھی نہیں رہ سکے گا، اسلامی حکومت میں صرف مسلمان ہی رہیں گے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلافت کے زمانہ میں یہودیوں کو ملک بدر کردیا گیا۔

یہودی آج تک پوری دنیا میں ماتحت ہی رہے ہیں دوسری جنگ عظیم میں ساٹھ ہزار یہودیوں کو سخت ترین سزائیں دے کر ہلاک کیا گیا، ہٹلر کیلئے ثابت ہوگیا تھا کہ یہ بڑے سازشی لوگ ہیں، دنیا میں کہیں بھی ان کی آزاد حکومت نہ کہیں پہلے رہی ہیں اور نہ آئندہ ہوگی، ہاں! یہ لوگ ذلت سے اسی صورت میں بچ سکتے ہیں کہ یا تو اللہ تعالیٰ کی رسّی کو پکڑلیں، یعنی: ایمان لے آئیں یا لوگوں کی رسّی کو تھام لیں، آج انہوں نے امریکہ کی رسّی کو پکڑا ہوا ہے اور اسی کے سہارے پر زندہ ہیں اگر امریکہ آج ان کے سر پر سے ہاتھ اٹھالے تو یہ دو دن بھی زندہ نہیں رہ سکتے، اسرائیلی ریاست کا قیام دراصل ان کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخفی تدبیر ہے یہی وہ علاقہ ہے جہاں قیامت کے قریب زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام یہودیوں اور ان کے سرغنہ دجال کو قتل کریں گے، تل ابیب سے چھتیس میل دور ''لد'' کا مقام ہے جہاں پر دجال قتل ہوگا، روایتوں میں آتا ہے کہ اس وقت کسی یہودی کو کہیں پناہ نہیں ملے گی حتیٰ کہ پتھر اور درخت بھی بول کر کہیں گے کہ اے مسلمان! میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے اس کا کام تمام کردو، اس لحاظ سے ان کی موجودہ اسرائیلی سلطنت ان کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی ہے تاکہ مقررہ وقت پر ان کا خاتمہ کیا جاسکے، بہرحال یہودی ایک خراب قوم ہے اور قیامت کے قریب زمانہ تک ذلت ان پر مسلط رہے گی، چنانچہ پچھلی اڑھائی ہزار سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہ لوگ دولت مند ضرور ہیں موجودہ بینکاری کا نظام انہی کی ایجاد ہے یہ دولت پر سانپ میں سب کو قتل کردیا جائے گا، لوگ کہتے ہیں کہ اب ان کی اسرائیلی ریاست قائم ہوچکی ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ تو روس، برطانیہ، امریکہ، فرانس اور

جرمنی کی فوجی چھاؤنی ہے اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے اب اس پر مکمل طور پر امریکہ کا قبضہ ہے یہ تو بڑی طاقتوں نے اپنے مفاد کیلئے اسرائیل کو کھڑا کر رکھا ہے ورنہ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے پھر کوئی وقت آئے گا جب یہ یہاں بھی ذلیل وخوار ہوں گے۔

یہودی تتّر بتّر ہو گئے

وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ

اور متفرق کردیا ہم نے ان کو میں زمین فرقہ فرقہ بعض ان کے نیک اور بعض ان کے سوا

ذٰلِكَ ۫ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾

اس کے اور آزمایا ہم نے انکو سے خوبیوں اور سے برائیوں تاکہ وہ لوٹ آئیں (۱۶۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے ان کو ملک میں فرقے فرقے کر کے متفرق کردیا، بعض ان میں سے نیک تھے اور بعض اور طرح کے اور آزمایا ہم نے ان کو خوبیوں میں اور برائیوں میں آزمایا تاکہ وہ لوٹ آئیں۔ (۱۶۸)

تفسیر

ہم نے ٹکڑے ٹکڑے کردیا ان کو زمین میں مختلف فرقوں میں، بنی اسرائیل میں اکہتر مذہبی فرقے بن گئے جو آپس میں لڑتے رہتے تھے یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ فرقے پہلے بھی موجود تھے اور آج بھی ہیں، عقیدوں، عملوں اور بدعتوں کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ فرقے بنے ہوئے ہیں جو کہ سزا ہی کی ایک صورت ہے۔

ان لوگوں میں کچھ لوگ نیک ہیں اور کچھ دوسری طرح کے، دوسری طرح سے مراد کافر دگناہ گار لوگ ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہودیوں میں سب ایک ہی طرح کے لوگ نہیں کچھ نیک بھی ہیں، مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو "تورات" کے زمانہ میں "تورات" کے حکم کے پورے پابند رہے نہ ان کی نافرمانی میں مبتلا ہوئے نہ کسی تاویل و تحریف کے پیچھے پڑے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد وہ حضرات ہوں جو قرآن کریم کے اترنے کے بعد قرآن کریم کے ماننے والے ہو گئے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے، اس کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جنہوں نے "تورات" کو آسمانی کتاب ماننے کے باوجود اس کی خلاف ورزی کی یا اس کے حکموں میں تبدیلی کر کے اپنی آخرت کو دنیا کی گندی چیزوں کے بدلہ میں بیچ ڈالا۔

ہم نے اچھی بری حالتوں سے ان کا امتحان لیا تا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں، اچھی حالتوں سے مراد ان کو مال و دولت کے ذخیرے اور عیش وعشرت کے سامان دینا ہے اور بری حالتوں سے مراد یا تو ذلت و خواری کے وہ واقعے ہیں جو ہر زمانہ میں مختلف صورتوں سے پیش آتے رہے اور یا کسی وقت کا قحط، تنگدستی جوان پر ڈالی گئی وہ مراد ہے، بہر حال مطلب یہ ہے کہ ان کی فرمانبرداری یا سرکشی کا امتحان لینے کے دو ہی طریقے ہیں دونوں استعمال کر لئے گئے، ایک یہ کہ احسانات وانعامات کر کے ان کی آزمائش کی جائے کہ وہ احسان کرنے والے اور انعام دینے والے کے شکر گزار فرمانبردار ہوتے ہیں یا نہیں، دوسرے یہ کہ ان کو مختلف تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا کر کے ان کی آزمائش کی جائے کہ وہ اپنے رب کی طرف رجوع ہوتے اور بد عملی سے توبہ کرتے ہیں یا نہیں، لیکن یہودی ان دونوں امتحانوں میں ناکام ہو گئے۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان پر نعمت کے دروازے کھولے، مال و دولت کی فراوانی عطا فرمائی تو کہنے لگے، یعنی: (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ فقیر ہیں اور ہم غنی (مالدار) ہیں اور جب ان کو تنگدستی اور غربت سے آزمایا گیا تو کہنے لگے، یعنی: اللہ تعالیٰ کا ہاتھ تنگ ہو گیا۔

اس آیت سے ایک فائدہ تو یہ حاصل ہوا کہ کسی قوم کا ایک جگہ ہونا اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اس کا بکھر جانا عذاب، دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اس دنیا کی راحت و آرام اور خوشی وغم حقیقت نہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں امتحان لینے کے مختلف طریقے ہیں جن کے ذریعے اس کے ایمان کی آزمائش کی جاتی ہے نہ یہاں کی تکلیف کچھ زیادہ رونے دھونے کی چیز ہے نہ کوئی راحت مغرور ہو جانے کا سامان، انجام کو سوچنے والے عقلمند کیلئے یہ دونوں چیزیں قابل توجہ نہیں۔

آگے کیا ہوا

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ
پس آئے سے بعد انکے نالائق جانشین جو وارث بنے کتاب کے لے لیتے ہیں متاع

هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ
اس گھٹیا زندگی کا اور کہتے ہیں عنقریب معاف کر دیا جائے گا ہمیں اور اگر پاس آئے انکے سامان

مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ
اسی جیسا تو لے لینگے اسے

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر ان کے پیچھے نالائق جانشین آئے جو کتاب کے وارث بنے اس ادنیٰ زندگی کا سامان لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں عنقریب ہمیں معاف کر دیا جائے گا اور اگر ان کے پاس ایسا ہی سامان پھر آئے اسکو دوبارہ بھی لے لیں گے۔

لفظی تحقیق: **خَلْفٌ:** کسی کے پیچھے اگر اس کی اولاد نالائق اٹھے تو اس اولاد کو "خَلْفٌ" کہتے ہیں، یعنی "کپوت"، یعنی: نالائق جانشین اور اگر لائق اور نیک ہو تو اسے "خَلَفٌ" کہتے ہیں "سپوت"؛ اسی لئے "خَلْفٌ" کا ترجمہ ناخلف ہے۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ بنی اسرائیل کے پہلے لوگوں میں تو کچھ نیک لوگ بھی تھے لیکن پچھلے تو ایسے نالائق اٹھے کہ معاملہ ہی چوپٹ کر دیا، "تورات شریف" ان کے ہاتھ لگی تو اس سے پیسہ کمانے لگے کہیں سے کچھ تھوڑا سا بھی ساز و سامان ملتے دیکھا تو آیتوں کے کبھی لفظ بدل دیئے کبھی معنیٰ کچھ کے کچھ کر دیئے، نذرانہ، تحفہ تحائف دینے والوں کو خوش کرنے کیلئے ان کی مرضی کے مطابق مسئلے بتانے لگے اگر کسی نے ٹوکا کہ یہ طرز عمل تو ٹھیک نہیں اس طرح تو

اللہ تعالیٰ کے عذاب میں پکڑے جاؤ گے تو گردن ہلا کر بے پروائی سے کہہ دیتے ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں ان کی سفارش ہمیں صاف بچالے گی، کہتے تھے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے لاڈلے ہیں ہمیں سزا نہیں مل سکتی، جب ایسی ذہنیت ہوجائے تو آدمی گناہ کرنے پر دلیر ہوجاتا ہے اور جب موقعہ مل جائے خوب ہاتھ رنگتا ہے بلکہ موقعوں کی تلاش میں رہتا ہے کہ کب کوئی شکار پھنسے اور کب میں اپنا الو سیدھا کروں۔

اس آیت کو پڑھنے کے بعد ان برے عالموں کو گریبان میں منہ ڈالنا چاہئے کہ کہیں وہ مالداروں کو خوش کرنے کیلئے شریعت کے قانون کی کوئی بے جا تاویل تو نہیں کر رہے، بعض وقت انسان اپنے کسی سرپرست یا مربی کو خوش کرنے کیلئے کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جو شریعت میں جائز نہیں ہوتی اس وقت وہ ایسی ہی باتوں سے دل بہلاتا ہے جو یہودیوں کی باتوں سے ملتی جلتی ہوتی ہیں، مثلاً: کہتا ہے کہ اس وقت مصلحت اسی میں ہے کہ کام چلتا کیا جائے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے جہاں اور گناہ معاف ہوں گے وہاں یہ بھی معاف ہوجائے گا، فلاں بزرگ کی سفارش بچالے گی ان خیالات سے اللہ بچائے، بعض وقت یہ انسان کو گناہ پر دلیر کردیتے ہیں یہودیوں کے طرز عمل سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہئے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یہودی بھی کہتے تھے کہ ان اعرابیوں (عرب کے گنواروں) کا مال کھالینے میں ہم پر کوئی حرج نہیں گویا یہ ہمارے لئے بالکل جائز ہے، یہ لوگ اس قسم کے باطل گمان میں مبتلا تھے، انہوں نے "تورات" میں مقرر کی گئی سزاؤں کو بھی تبدیل کردیا، چنانچہ بدکاری اور چوری کی سزاؤں کو جان بوجھ کر بدل دیا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: عقلمند انسان وہ ہے جو اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی کیلئے کچھ سامان پیدا کرتا ہے، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ: آخرت کے اعتبار سے نکما انسان وہ ہے جو خواہش کے پیچھے چلتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بڑی بڑی آرزوئیں رکھتا ہے، کہتا ہے کہ ہم تو بخشے ہوئے ہیں ہمیں فلاں بزرگ بچالیں گے یا فلاں پیغمبر کی سفارش کام آجائے گی؛ اس لئے ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے، ایسے شخص کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کے اعتبار سے نکما فرمایا ہے۔

آگے ارشاد ہے کہ: اگر دنیا کا سامان ان کے سامنے بار بار آئے تو اسے لے لیتے ہیں اور فلسفہ یہ بنا رکھا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں ہماری پکڑ نہیں ہوگی۔

کتاب کی کھلم کھلا مخالفت

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا

کیا نہیں لیا گیا پر ان عہد کتاب کا کہ نہ کہیں پر اللہ کے مگر

الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ

سچ حالانکہ وہ پڑھ چکے جو کچھ تھا میں اس اور گھر آخرت کا بہتر ہے لئے ان لوگوں کے جو ڈرتے ہیں

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَ الَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ

کیا پس نہیں تم سمجھتے (۱۶۹) اور جو لوگ مضبوط پکڑے ہوئے ہیں کتاب کو اور قائم رکھتے ہیں نماز کو

اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾

بیشک ہم نہیں ضائع کرتے ثواب اچھے کام کرنے والوں کا (۱۷۰)

بامحاورہ ترجمہ: کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا گیا تھا کہ نہ بولیں اللہ پر سوائے سچ کے اور انہوں نے پڑھا جو کچھ اس میں لکھا ہے اور ڈرنے والوں کیلئے آخرت کا گھر بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔ (۱۶۹) اور جو لوگ کتاب کو خوب پکڑ رہے ہیں اور نماز کو قائم رکھتے ہیں، بیشک ہم نیکی کرنے والوں کا ثواب ضائع نہیں کریں گے۔ (۱۷۰)

لفظی تحقیق: مِيْثَاقُ الْكِتٰبِ: کتاب میں لکھی ہوئی ہدایت۔ کتاب سے مراد "تورات شریف" ہے، "مِيْثَاق" ایسا حکم جس کے ماننے کا سننے والا اقرار کرے۔ دَرَسُوْا: پڑھ لیا۔ یہ "دَرْسٌ" سے بنا ہے، درس کے معنٰی ہیں سیکھنا، پڑھنا "تَدْرِيْس" اسی سے بنا ہے جس کے معنٰی ہیں سکھانا، پڑھانا اسی سے "مُدَارِسٌ" بنا ہے

جو پڑھانے والے کو کہتے ہیں، ''مدرسہ'' بھی درس سے بنا ہے، یعنی: پڑھنے کی جگہ۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ "تورات" میں ان کو یہ حکم ملا تھا اور اس کی تعمیل کا انہوں نے پکا عہد کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے لوگوں کو وہی باتیں سکھائیں گے جو اس نے واقعی سکھائی اور سمجھائی ہیں اپنی طرف سے باتیں گھڑ کر اور انہیں اللہ تعالیٰ کا حکم ٹھہرا کر لوگوں کے سامنے کبھی پیش نہ کریں گے یہ لوگ کتاب پڑھ چکے ہیں اور اس کی باتیں سمجھ چکے ہیں اب جان بوجھ کر ان کو بدلنا اپنے قول وقرار سے پھرنا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو آخرت کا زیادہ خیال رکھنا چاہئے آخرت اس دنیا سے کہیں بہتر ہے آخر کیا یہ عقل سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے ہیں؟ آگے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: کتاب پر عمل کرنے والے اور باقاعدہ نماز کے قائم رکھنے والے نیک لوگ ہیں ان کا اجر ہم کبھی ضائع نہ ہونے دیں گے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں، ہم اصلاح کرنے والوں اور نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے، یعنی: ہم ایسے لوگوں کو ضرور بہتر اجر عطا کریں گے، یہاں پر اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا ذکر فرمایا ہے کہ جو یہ دو کام کرتے ہیں وہ اجر کے مستحق ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بہتر بدلہ پائیں گے، دوسرے لفظوں میں اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جو لوگ ان کاموں سے منہ موڑیں گے وہ سزا کے مستحق ہوں گے، چنانچہ آگے آرہا ہے کہ بعد میں آنے والے نالائقوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوط پکڑنے کے بجائے اسے بیچ ڈالا اور اس کے بدلے دنیا کا حقیر مال حاصل کیا، اللہ تعالیٰ کی کتاب کے حکموں کو چھپایا اور ایسا کرنے کیلئے رشوت لی اس کے علاوہ انہوں نے نمازوں کی پرواہ بھی نہ کی بلکہ انہیں ضائع کیا تو ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ ہی بن سکتے ہیں۔

تَمَسَّكَ بِالْكِتٰبِ: کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے'' کا مطلب یہ ہے کہ اسے پڑھا جائے اور پھر اس

کے حکموں پر عمل کیا جائے برخلاف اس کے کہ یہودی اپنی کتاب "تورات" کو صرف ادب وآداب تک ہی محدود رکھتے ہیں، اب یہ بیماری ہماری امت میں بھی آ چکی ہے ہمارے ہاں بھی قرآن کریم صرف زبانی ادب اور ریشمی غلاف تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے، اول تو پڑھتے ہی نہیں اگر ناظرہ پڑھتے بھی ہیں تو صرف ثواب کیلئے اسے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

نماز اللہ تعالیٰ کا قرب دلانے والی عبادتوں کی بنیاد ہے، نماز سے مؤمن کو بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں وقت کی پابندی، نظم وضبط، پاکیزگی، آپس میں برابری، اجتماعیت، توحید، ایمان وغیرہ بہت سے دنیاوی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں جو شخص نماز کی حیثیت کو سمجھے گا اور اسے قائم کرے گا وہ یقیناً مصلح ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کا مستحق ہوگا۔

جو کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں ہم ان کا اجر ضائع نہیں کریں گے یہ بات تو یہودیوں کے مذہب کے سلسلے میں بیان فرمائی ہے مگر یہ ہمارے لئے بھی یکساں قانون ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑے گا اسے ضرور اجر ملے گا۔

کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے والا اور اس کے حکموں کی پابندی کرنے والا صرف اسی کو سمجھا جائے گا جو نماز کو اس کے آداب وشرائط کے ساتھ پابندی سے ادا کرے اور جو نماز میں کوتاہی کرے وہ کتنے ہی وظیفے پڑھے یا مشقتیں جھیلے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ نہیں اگرچہ اس سے کرامتیں بھی ظاہر ہوں۔

بنی اسرائیل کا عہد

وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ

اور جب اٹھایا ہم نے پہاڑ اوپر ان کے گویا وہ سائبان ہے اور گمان کیا انہوں نے کہ وہ گرنے والا ہے پر ان

ع ۲۱ ۹ ۱۱

خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْکُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

پکڑو جو دیا ہم نے تم کو ساتھ قوت کے اور یاد رکھو! جو ہے میں اس امید ہے کہ بچتے رہو (۱۷۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جس وقت ہم نے ان کے اوپر پہاڑ اٹھا کر سائبان کی طرح کر دیا اور انہوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر گرے گا ہم نے کہا قوت کے ساتھ پکڑو جو ہم نے تم کو دیا اور جو اس میں ہے اسے یاد رکھو! امید ہے کہ تم بچ جاؤ گے۔ (۱۷۱)

تفسیر

ارشاد ہے کہ جس وقت کسی بات کو منوانے کیلئے کوئی خاص اہتمام کیا گیا ہو اس کے بھولنے کی کوئی وجہ نہیں انہیں یاد ہوگا کہ انہوں نے سیدھی طرح اطاعت کے اقرار میں ٹال مٹول کیا؛ اس لئے پہاڑ اکھاڑ کر ان کے سر پر لٹکا دیا گیا اس طرح کہ گویا ان کے سر پر گرنے ہی والا ہے یہ خوف کے مارے کانپنے لگے اور انہیں یقین ہوگیا کہ اگر اس وقت اقرار نہ کیا تو یہ پہاڑ ہم پر گر پڑے گا اور ہم اس کے نیچے دب کر رہ جائیں گے اس حالت میں ان سے کہا گیا کہ جو کچھ اس کتاب میں تمہیں حکم دیئے گئے ہیں انہیں مضبوطی سے پکڑو اور ہر وقت یاد رکھو بس اسی سے تمہارے متقی ہونے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اگر ایسا نہ کیا تو تم کہیں کے نہ رہو گے۔

پہاڑ کا یہ ہولناک منظر اس لئے دکھایا گیا تھا کہ یہ انہیں ہمیشہ یاد رہے گا اور اس کے ساتھ وہ عہد بھی یاد آجائے گا جو انہوں نے کیا تھا کیوں کہ جس بات کے ساتھ کوئی انوکھی بات تھی کر دی جائے وہ بھولی نہیں جا سکتی۔

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور بات بھی یاد کرائی کہ اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ جب ہم نے پہاڑ کو اکھاڑ کر ان کے اوپر کر دیا گویا کہ وہ سائبان تھا، پہاڑ کو زمین سے اکھاڑ کر بنی اسرائیل کے سروں پر معلق کر دیا جیسے سائبان کھڑا کر دیا جاتا ہے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ ان پر گرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس حالت میں بنی اسرائیل سے فرمایا کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور یاد کرو جو کچھ اس میں لکھا ہے، ظاہر ہے کہ یہ

معلوم ہوتا ہے کہ سروں پر پہاڑ کو لٹکا کر ان سے عہد لینا زبردستی ہے حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے، یہودیوں نے اللہ تعالیٰ سے بار بار عہد کیا اور ہر بار اسے توڑتے رہے آخر کار اللہ تعالیٰ نے انہیں خوف دلانے کیلئے پہاڑ کو سروں پر لٹکا دیا تاکہ آئندہ عہد کو نہ توڑیں اور انہیں ڈر ہو کہ اگر پھر عہد توڑا تو یہ وبال دوبارہ آسکتا ہے بعض کہتے ہیں کہ پہاڑ کو بنی اسرائیل کے سروں کے اوپر نہیں اٹھایا گیا تھا بلکہ ان لوگوں کو کسی جھکے ہوئے پہاڑ کے دامن میں کھڑا کیا گیا تھا یہ بات درست نہیں ہے، "نَتَقْ" کا معنیٰ اکھاڑنا ہوا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے اکھاڑ کر اوپر لٹکا دیا گیا صرف کسی پہاڑ کے دامن میں کھڑا کرنے سے وہ خوف پیدا نہیں ہوسکتا جو پہاڑ کو اکھاڑ کر اوپر لٹکا دینے سے ہوسکتا ہے۔

یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کا ذکر کیا ہے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور دوسرا یہ کہ اس کے لکھے ہوئے کو یاد کرو، آگے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے عہد لیا کہ جو کچھ ہم دیں اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور اس کو یاد کرو تاکہ تم بچ جاؤ، مگر اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھتے پڑھاتے رہو گے اس پر عمل کرتے رہو گے تو دنیا میں برائی سے بچ جاؤ گے اور آخرت میں عذاب سے محفوظ ہو جاؤ گے۔

دین میں زبردستی نہیں کا صحیح مطلب

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کریم کا عام اعلان ہے کہ دین میں زبردستی نہیں کہ کسی کو زبردستی حق دین کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے اور اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو دین کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔

لیکن ذرا غور کیا جائے تو فرق کھلا ہوا ہے کہ کسی غیر مسلم کو اسلام کے قبول کرنے پر کبھی کہیں مجبور نہیں کیا گیا لیکن جو شخص دین قبول کرنے کے بعد اس پر عمل کرنے میں ٹال مٹول کرنے لگے تو اس پر ضرور جبر کیا جائے گا اور خلاف ورزی کی صورت میں سزا دی جائے گی، اسلامی تعزیرات میں بہت سی سزائیں ایسے لوگوں کیلئے مقرر ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ ”دین میں زبردستی نہیں“ کا تعلق غیر مسلموں سے ہے کہ ان کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جائے گا اور بنی اسرائیل کے اس واقعہ میں کسی کو دین قبول کرنے کیلئے مجبور نہیں کیا گیا بلکہ ان لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دین قبول کرنے کے باوجود ”تورات“ کی پابندی سے انکار کر دیا؛ اس لئے ان پر زبردستی کر کے پابندی کرانا شریعت کے اس قول (دین میں زبردستی نہیں) کے خلاف نہیں۔

عہدِ الست

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ

اور جب لیا رب آپکے نے سے اولاد آدم کی سے پیٹھوں ان کی ان کی اولاد کو اور

اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ

گواہ بنایا ان کو پر جانوں ان کی کیا نہیں ہوں میں رب تمہارا؟ بولے کیوں نہیں! اقرار کیا ہم نے

اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۟ۙ (۱۷۲)

کہ کبھی کہنے لگو دن قیامت کے کہ بیشک تھے ہم سے اس بے خبر (۱۷۲)

معانقة ٤ عند المتأخرين ١٢

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب آپکے رب نے آدم کی اولاد کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان کی جانوں پر اقرار کرایا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، بولے کیوں نہیں! ہم اقرار کرتے ہیں، کبھی کہنے لگو قیامت کے دن ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی۔ (۱۷۲)

تفسیر

اس آیت کے مضمون پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اپنے رب کو پہچاننے کیلئے انسان کو بڑی بڑی منطقی اور فلسفی دلیلوں کی ضرورت نہیں ذرا سی توجہ سے اس کی سمجھ میں آپ ہی آ جاتا ہے کہ ہر چیز کا پالنے والا اللہ ہے جو کائنات کی ان ظاہری چیزوں سے بلند و بالا ہے ظاہری چیزوں میں چھوٹی سے چھوٹی بڑی سے بڑی

چیز سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے وہی ہر چیز کو پیدا کرتا ہے پالتا ہے اور آگے بڑھاتا ہے۔

"عہد الست" کے متعلق حدیثوں میں بڑی تفصیلات آئی ہیں یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ اور اس واقعہ کو یاد کرو جب آپکے رب نے آدم کے بیٹوں سے ان کی اولاد کو نکالا یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کی پشت سے نکالنے کا ذکر ہے جب کہ حدیث شریف میں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالنے کا ذکر ہے یہ دونوں باتیں درست ہیں اور اس میں کوئی اشکال واقع نہیں ہوتا جہاں براہ راست آدم کی پشت سے نکالنے کا ذکر ہے تو اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو براہِ راست حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور بنی آدم سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کی اولاد ہیں اور اس میں نسل در نسل قیامت تک آنے والے تمام لوگ شامل ہیں، مقصد بہر حال یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک پیدا ہونے والے لوگوں سے یہ عہد لیا تھا۔

یہ عہد کس بارے میں تھا اس کے بارے میں تفصیل آگے آرہی ہے، باقی رہی یہ بات کہ "عہد الست" کا واقعہ کہاں پیش آیا تو اس سلسلے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ مکہ معظمہ کے قریب عرفات کے میدان کی "وادی نعمان" میں یہ واقعہ پیش آیا، اس عہد سے اللہ تعالیٰ کو ایک جاننے اور ماننے کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہے، روحوں کے اس عہد کے علاوہ اسی دور کے ایک خاص عہد کا ذکر بھی قرآن وسنت میں آتا ہے جو صرف پیغمبروں سے لیا گیا اور اسے میثاق النبیین کہا گیا ہے، "سورۂ آل عمران" میں اس عہد کا ذکر اس طرح آتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں سے عہد لیا تھا اور کہا تھا کہ میں نے کتاب وحکمت سے جو تمہیں عطا کیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب میرا آخری پیغمبر تمہارے پاس آئے تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔

اور اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولادوں کو نکالا اور ان سے اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے عہد و پیمان پتھر کی طرح کسی بے جان چیز سے نہیں کیا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت کے ساتھ سب کو عقل اور سمجھ عطا فرمائی جس کی بناء پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوال کا جواب یوں دیا کیوں نہیں اے اللہ! بیشک آپ ہی ہمارے پروردگار ہیں ہم

اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس بات پر گواہ ہیں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار کرلیا ہے جس کا معنیٰ ہے پالنے پوسنے والا، یعنی: اللہ تعالیٰ ہی سب کو پیدا کرنے والے، پالنے والے اور آگے بڑھانے والے اور اس کو کمال تک پہچانے والے ہیں جب اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار ہو گیا تو پھر اس کے خالق و مالک ہونے کا اقرار بھی خود بخود ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لینے کی وجہ بھی خود ہی بیان فرمائی ہے کہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں تو اس بات کا علم ہی نہیں تھا اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا میں ایک خاص کام دے کر بھیجا ہے اور ایسا نہ ہو کہ یہاں کے کاموں میں مصروف ہو کر تم اس کام کو ہی بھول جاؤ، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ابتداء ہی میں اپنے رب ہونے کا اقرار کرالیا کہ دنیا میں جا کر خالق، مالک، رب اور قادر مجھے ہی ماننا کسی مخلوق کو یہ مرتبہ نہ دے دینا اور پھر اس عہد کو یاد دلانے کیلئے اس نے پے در پے پیغمبر بھیجے اور کتابیں اتاریں، تمام پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کو یہ عہد یاد دلایا اور اس پر عمل کرنے کو کہا، لہٰذا اب کوئی شخص اس عہد کا انکار نہیں کرسکتا، باقی رہی یہ بات کہ اس دنیا میں آ کر انسان کو وہ عہد یاد نہیں رہا تو یہ عذر قابل قبول نہیں ہے اور نہ اس سے اس عہد کی ذمہ داری ختم ہوتی ہے یہ تو روحوں کے جہان کی بات ہے جو دوسرا جہان تھا خود اس جہان میں آ کر بھی انسان بہت سی چیزوں کو بھول جاتے ہیں ہیں جو ان کے ساتھ پیش آ چکی ہوتی ہیں اس بات کو ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ کوئی بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ کب اور کہاں پیدا ہوا، کون اس کا باپ ہے، کون اس کی ماں ہے؟ بلکہ بعد میں لوگوں کے بتانے سے ان سب کے بارے میں پتہ چلتا ہے اور ان کو آدمی سچ مان لیتا ہے۔

بیعت لینے کی حقیقت

اس آیت سے بیعت لینے کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے معاملوں میں صحابہ کرام سے بیعت لی جن میں سے بیعت رضوان کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے، یعنی: اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان لوگوں

سے جنہوں نے ایک خاص درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

صوفیائے کرام میں جو بیعت رائج ہے وہ بھی ایمان اور عمل کی پابندی اور گناہوں سے بچنے کی کوشش کا عہد ہے اور اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے اسی وجہ سے اس میں خاص برکتیں ہیں کہ انسان کو گناہوں سے بچنے اور شریعت کے حکموں پر عمل کرنے میں ہمت اور توفیق بڑھ جاتی ہے۔

باپ دادوں کا مشرک ہونا شرک کے جائز ہونے کی دلیل نہیں

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ

یا کہنے لگو بات یہی ہے کہ شرک کیا باپ دادوں ہمارے نے سے پہلے ہی اور تھے ہم اولاد سے

بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ

بعد ان کے کیا پس آپ ہلاک کرتے ہیں ہمیں اس پر جو کیا گمراہوں نے (۱۷۳) اور اسی طرح کھول کھول کر بیان کرتے ہیں ہم

الْاٰيٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

آیتوں کو اور تاکہ وہ لوٹ آئیں (۱۷۴)

بامحاورہ ترجمہ: یا کہنے لگو شرک تو ہمارے باپ دادوں نے ہم سے پہلے اختیار کیا تھا اور ہم تو ان کے پیچھے ان کی اولاد تھے کیا آپ ہمیں اس پر ہلاک کرتے ہیں جو گمراہوں نے کیا۔ (۱۷۳) اور یوں ہم باتیں کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ لوٹ آئیں۔ (۱۷۴)

تفسیر

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: یہ عہد لینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کل کو یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں اس کا علم نہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ یا تم یہ عذر نہ پیش کر دو کہ شرک تو ہمارے باپ دادوں نے ہم سے پہلے کیا تھا اور ہم تو بعد میں آنے والی ان کی اولاد ہیں شرک انہوں نے کیا غلط رسم اور باطل عقیدے انہوں نے ایجاد کئے ہم تو ان کی دیکھا دیکھی

تمام کام انجام دیتے رہے ہیں، لہٰذا ہماری پکڑ نہیں ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: یہ عذر قبول نہیں کیا جائے گا ہر بری رسم کو کرنے والا یہی عذر پیش کرتا ہے کہ یہ کام ہماری قوم، برادری اور باپ دادا کرتے آئے ہیں ان کی دیکھا دیکھی ہم بھی کرر ہے ہیں ہم بھی اسی راستے پر چل رہے ہیں، فرمایا: ہر شخص "عہد الست" کا خود ذمہ دار ہے اللہ تعالیٰ کو خدا جاننے اور ماننے کا عقیدہ انسان کی فطرت میں داخل ہے، لہٰذا ہر شخص کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ایک جانے اور ایک مانے، جس انسان تک اسلام کے حکم نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ نہیں پہنچے اور اس نے یہ فرائض انجام نہیں دیئے اس کو تو معافی مل سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ایک جاننے ماننے کا عقیدہ انسان کی فطرت میں داخل ہے اگر اس کے خلاف کرے گا تو پکڑا جائیگا۔

"عہد الست" کی یاد دہانی اسی لئے کرائی ہے تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہماری بدعملیوں کے ذمہ دار ہمارے باپ دادا ہیں اور یہ سوال بھی پیش نہ کرسکو کہ اے اللہ! کیا تو ہمیں گمراہوں کی وجہ سے ہلاک کرے گا، یعنی: گمراہ تو ہمارے باپ دادا تھے اور ان کے جرم کی وجہ سے ہمیں کیوں سزا دی جارہی ہے، فرمایا: اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارے برے عملوں کے ذمہ دار تمہارے باپ دادا نہیں بلکہ تم خود ہو یہ بات ہم نے واضح کردی ہے کہ "عہد الست" ہر شخص نے کرر کھا ہے اور وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔

اور اسی طرح ہم اپنی آیتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں آیت سے حکم، دلیل اور معجزے مراد ہوسکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے سارے حکم حلال حرام اور جائز ناجائز تفصیل کے ساتھ کتابوں کے ذریعے اتارے اور پیغمبروں کے ذریعے امتوں کو پہنچا دیئے ہیں، اپنے خالق و مالک ہونے کی تمام دلیلیں بھی انسان کے ارد گرد بکھیر دی ہیں، زمین، آسمان، چاند، سورج، رات، دن، گرمی، سردی، بارش اور ہوا وغیرہ سب کے سب اس کی قدرت کی دلیلیں ہیں جن سے کوئی بھی انسان آنکھیں نہیں چرا سکتا، پھر انسان کی مزید تسلی کیلئے اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے ہاتھوں پر مختلف معجزوں کا ظاہر فرمایا، بعض معجزے تو ایسے بھی تھے جنہیں امتوں نے خود مانگا مگر ان میں سے زیادہ تر لوگ پھر بھی ایمان نہ لائے اور بعض معجزے ایسے تھے جو ایمان والوں کی مضبوطی کا باعث بنے، بہر حال فرمایا کہ: اسی

طرح ہم اپنی نشانیوں کو کھول کر بیان کرتے ہیں تا کہ یہ لوگ لوٹ کر آ جائیں، یعنی: کفر، شرک اور گناہوں کو چھوڑ کر ایمان کی طرف لوٹ آئیں، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بھی ان کے عہد و پیمان یاد دلائے، پیغمبروں کے ذریعے ان کو خبر دار کیا اور اصل دین کی طرح رجوع کرنے کی وصیت کی اور تمام انسانوں کو خبر دار کیا کہ تم نے اللہ تعالیٰ سے پکا وعدہ کر رکھا ہے جس کے گواہ موجود ہیں خود انسان کا اپنا ضمیر اس بات پر گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ "وحدہٗ لاشریک لہٗ" ہیں اس کے سوا کوئی رب اور معبود نہیں اس کے باوجود جو شخص کفر اور شرک میں مبتلا ہوگا وہ قیامت کو پکڑا جائے گا اور اس دن اس کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا۔

شیطان کی پیروی

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ

اور پڑھیئے سامنے ان کے خبر اس شخص کی دیں ہم نے اسکو آیتیں اپنی پس وہ باہر نکل گیا سے ان پس پیچھے لگ گیا اسکے

الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

شیطان پس ہو گیا وہ سے گمراہوں (۱۷۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ان کو اس شخص کا حال سنا دیجئے جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں، پھر وہ ان کو چھوڑ نکلا، پھر اس کے پیچھے شیطان لگ گیا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ (۱۷۵)

تفسیر

اس آیت میں بنی اسرائیل کا ایک سبق سکھانے والے واقعہ کا ذکر ہے جس میں بنی اسرائیل کے ایک بڑے عالم اور صوفی کا ذکر ہے جو اچانک گمراہ ہو گیا ساتھ اس کے اس کے اسباب بھی بیان کئے گئے ہیں۔

اس واقعہ کی پچھلی آیتوں سے مناسبت یہ ہے کہ ان میں میثاق، یعنی: عہد کا ذکر تھا جو ازل میں اللہ تعالیٰ نے سارے انسانوں سے لیا تھا اور پھر خاص خاص حالات میں خاص خاص قوموں یہودیوں اور عیسائیوں وغیرہ

سے لیا تھا اور ان آیتوں میں اس کا بھی ذکر آیا تھا کہ عہد کرنے والوں میں بہت سے لوگ اس عہد پر قائم نہیں رہے جیسے یہودی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں تشریف لانے سے پہلے آپ کے آنے کا انتظار کرتے تھے اور آپ کی صفتیں لوگوں سے بیان کیا کرتے تھے، اور ان کی تصدیق کیا کرتے تھے مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو دنیا کی غرضوں کی خاطر آپ پر ایمان لانے اور آپ کی پیروی کرنے سے منہ موڑ لیا۔

ارشاد ہے کہ: آپ ان کو اس شخص کی خبر پڑھ کر سنائی جسے ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں وہ شخص کون تھا اور کس امت سے تعلق رکھتا تھا؟ اس سلسلے میں تین شخص کے نام ملتے ہیں ان میں سے پہلا شخص "بلعم بن باعور" ہے جس کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے اور دو شخص کا "ابو عامر صیفی" اور "امیہ بن ابی صلت" جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوئے ہیں۔

اکثر مفسرین کرام جن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں، فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جس شخص کا ذکر کیا ہے اور پھر اس کی مثال بیان فرمائی ہے وہ بنی اسرائیل یا کنعانی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور "تورات" میں اس کا نام "بلعم بن باعور" مذکور ہے نام کے تلفظ میں قدرے فرق اور زبان کے ادل بدل سے واقع ہو جاتا ہے، جیسے: عربی میں ابراہیم کو عبرانی زبان میں ابراہام کہتے ہیں، بلعام اور بلعم میں بھی غالباً اسی قسم کا فرق پایا جاتا ہے، بہر حال یہ شخص اپنے زمانے میں نہایت نیک، عبادت گزار اور کرامت والا بزرگ تھا اس کی مشہور کرامت یہ تھی کہ اس کی دعائیں قبول ہوتی تھیں لوگ اپنی ضرورتوں میں اس سے دعائیں کراتے تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر اس علاقے میں پہنچے جہاں یہ شخص رہتا تھا تو وہاں کا بادشاہ خوفزدہ ہو گیا کہ کہیں بنی اسرائیل ان پر حملہ آور ہو کر ان پر غالب نہ آجائیں اس نے بلعم بن باعور کو بلا بھیجا کہ یہاں آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف دعا کرے تا کہ وہ کامیاب نہ ہو سکیں وہ شخص جانتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور ان کے مقابلے میں بددعا کرنا لعنتیوں کا کام ہے،

لہٰذا اس شخص نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اب بادشاہ نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور بلعم بن باعور کو پیسے اور عورت کا لالچ دیا تو وہ بددعا کرنے پر تیار ہو گیا۔

بہر حال بلعم بن باعور بھی لالچ میں آ گیا اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف بددعا کیلئے پہاڑی پر کھڑے ہو کر ہاتھ پھیلا دیئے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی ساری کرامتیں چھین لیں اور اس کے منہ سے الٹے الفاظ نکلنے لگے وہ شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے بددعا کرنا چاہتا تو اس کے منہ سے دعا کے الفاظ نکلتے پھر اللہ تعالیٰ نے اسے یہ سزا دی کہ اس کی زبان کتے کی زبان کی طرح لٹک گئی۔

اب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ میری تو دنیا و آخرت تباہ ہو گئی اب دعا تو میری چلتی نہیں لیکن میں تمہیں ایک چال بتاتا ہوں جس کے ذریعہ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر غالب آ سکتے ہو وہ یہ ہے کہ تم اپنی خوبصورت لڑکیوں کو سجا کر کے بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دو اور ان کو یہ تاکید کر دو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ان کے ساتھ جو کچھ کریں کرنے دیں، رکاوٹ نہ بنیں یہ لوگ مسافر ہیں اپنے گھروں سے مدت کے نکلے ہوئے ہیں اس چال سے ممکن ہے کہ یہ لوگ حرام کاری میں مبتلا ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرام کاری انتہائی ناپسندیدہ چیز ہے جس قوم میں یہ ہو اس پر ضرور عذاب اترتا ہے وہ فتح نہیں پا سکتی۔

بلعم کی یہ شیطانی چال ان کی سمجھ میں آئی اس پر عمل کیا گیا بنی اسرائیل کا ایک بڑا آدمی اس چال کا شکار ہو گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اس وبال سے روکا مگر وہ باز نہ آیا اور شیطانی جال میں مبتلا ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل میں سخت قسم کا طاعون پھیلا جس سے ایک روز میں ستر ہزار اسرائیلی مر گئے یہاں تک کہ جس شخص نے برا کام کیا تھا اس جوڑے کو بنی اسرائیل نے قتل کر کے سر عام لٹکا دیا کہ سب لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور توبہ کی اس وقت یہ طاعون دور ہوا۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہ مثال بیان فرما کر نہ صرف بنی اسرائیل کو ڈرا و سنایا ہے بلکہ اس آخری امت کے لوگوں کو بھی بات سمجھائی ہے کہ عہد و پیمان توڑنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔

دوسرا شخص جس کے بارے میں خیال ہے کہ آیت میں جو مراد ہے وہ مدینہ کا رہنے والا ابو عامر صیفی تھا یہ بڑا عبادت گزار اور درویش تھا ٹاٹ پہنتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو حق کی تلاش ہے یہی وہ شخص ہے جس کے کہنے پر منافقوں نے مسجد ضرار تعمیر کی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ جب وہ مدینہ طیبہ میں آئے تو کسی کے گھر میں ٹھہرنے کے بجائے مسجد میں ٹھہرے اللہ تعالیٰ نے اس مسجد کو گرانے کا حکم دیا، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ احد کی جنگ میں یہ کافروں کے ساتھ تھا اور اس نے جنگ کے میدان میں بہت سے گڑے بھی کھدوائے تھے تاکہ مسلمان ان میں گر کر نقصان اٹھائیں چنانچہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک گڑھے میں گر گئے اور آپ کو بڑی چوٹیں آئی تھیں یہ شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے سخت دشمنی رکھتا تھا البتہ اس کا بیٹا عبدالرحمن (رضی اللہ عنہ) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا اصحابی تھا۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: ان آیتوں میں مراد قبیلہ ثقیف کا امیہ بن ابی صلت تھا یہ بہت بڑا شاعر اور جہان دیدہ آدمی تھا یہ روم اور شام وغیرہ کے علاقوں میں گھومتا رہا "تورات" اور "انجیل" پڑھ چکا تھا اور سچے مذہب کی تلاش میں تھا مگر جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت مخالف ہو گیا بدر کی جنگ میں بڑے سردار مارے گئے تو کہنے لگا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے پیغمبر ہوتے تو اپنی قوم کے خلاف کیوں لڑنے کھڑے ہوتے اور ان کو کیوں قتل کرتے اس نے بدر کے کافروں کا مرثیہ بھی لکھا تھا۔

یہ مختلف رائے ہیں تاہم مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اس آیت میں مراد بلعم بن باعور ہے اس نے خدا کے عہد و پیمان کو توڑا اور لالچ میں آ کر ایمان والوں کے واسطے بددعا کرنے کی کوشش کی مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا پھر اس دنیا میں بھی ذلت کی زندگی بسر کی اور آخرت میں بھی ہمیشہ کے عذاب کا حقدار ٹھہرا۔

اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے نکلنے کا مطلب

ان کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیں جسے ہم نے بڑی بزرگی عطا کی تھی مگر وہ ان آیتوں سے باہر نکل گیا، یعنی: ہمارے انعاموں سے ہمیشہ فائدہ نہ اٹھا سکا "انسلاخ" کا معنٰی کسی چیز سے نکل جانا ہے کسی کی کھال کھینچ لی

جائے تو وہ "انسلاخ" کہلاتا ہے سانپ جب اپنی کینچلی اتارتا ہے تو اس کو بھی "انسلاخ" کہتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ جس شخص کو ہم نے کرامتیں عطا کی تھیں وہ ان سے باہر نکل گیا اس انعام کو اپنے اوپر قائم نہ رکھ سکا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان نے اس کا پیچھا کیا پس وہ گمراہوں میں سے ہو گیا وہ بھی شیطان کے رنگ میں رنگا گیا۔

دنیا کا لالچ

وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَ اتَّبَعَ

اور اگر چاہتے ہم تو بلند کرتے اسکو ساتھ انکے اور لیکن وہ مائل ہوا طرف زمین کی اور پیروی کی

هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ

خواہش اپنی کی سو حال اسکا کا ساحال ہے کتے اگر تو لادے پر اس تو وہ ہانپے یا

تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ

چھوڑ دے اسکو تو ہانپے

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی بدولت اس کا مرتبہ بلند کرتے لیکن وہ تو زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہش کے پیچھے ہو لیا تو اس کا حال ایسا ہے جیسے کتا اس پر تو بوجھ لادے تو بھی ہانپے یا اسے چھوڑ دے تو بھی ہانپے۔

لفظی تحقیق: اَخْلَدَ: ہو رہا، رہ پڑا: یہ "خُلْدٌ" سے بنا ہے، "خُلُوْدٌ" کے معنٰی ہیں ہمیشہ رہنا، "اَخْلَدَ" ہمیشہ کیلئے اختیار کرنا، "اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ" اس نے زمین میں ہی رہنا پسند کیا، یعنی: اس نے دنیا کی چیزوں کو ترجیح دی۔

تفسیر

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں آدمی کا مرتبہ بلند کرنے کیلئے کافی ہیں اور اس کو حیوانیت

کی سطح سے اٹھا کر انسانیت کے بلند مقام پر پہنچا سکتی ہیں لیکن ہر انسان اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اگر اس کی فطرت کا سبق اس کے ماحول نے اسے بھلا دیا ہے اور وہ باوجود پیغمبروں کی تنبیہ کے اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا علم رکھنے کے اس کی طرف مائل نہیں ہوتا تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی خراب عادتیں اسے تباہ کریں گی اور اس کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں کچھ فائدہ نہ پہنچائیں گی وہ اپنی خواہش کا غلام ہو چکا ہے دنیاوی ظاہری اور عارضی چمک دمک اس کے دل کو بھا چکی ہیں اس کی مثال بالکل کتے کی سی ہے جیسے وہ اپنی عادت کے مطابق چاہے اس پر بوجھ لاد و یا نہ لادو ہانپنا نہیں چھوڑتا اسی طرح یہ شخص اپنی خواہشوں کی پیروی میں بری بری عادتیں ڈالے گا اور اس پر علم کا بوجھ لدا ہوا ہو یا نہ ہو برابر ہے جو اس کی طبیعت کا تقاضا ہے کر کے رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان کا مطلب ہے کہ اگر ہم چاہتے تو اس شخص کو اپنی آیتوں کی بدولت بلندی تک پہنچاتے ،بعض فرماتے ہیں کہ وہ شخص "اسم اعظم" جانتا تھا جس کی وجہ سے اس کی دعا قبول ہوتی تھی مگر خدا تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ ترقی اور بلندی اس کو حاصل ہوتی ہے جو حق وسچائی پر قائم رہتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے مگر وہ شخص زمین کی طرف جھک گیا زمین سے مراد دنیاوی فائدہ ہے ،یعنی: وہ حقیر دنیا، پیسے اور عورت کی طرف جھک گیا، اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے انعاموں کے بدلے ان حقیر چیزوں کو پسند کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ساری بزرگی واپس لے لی اب نہ اس کے پاس کوئی کرامت باقی رہی اور نہ ہی اس کی دعا قبول ہوتی ، اللہ تعالیٰ نے اس کی تمام خوبیاں چھین لیں اور وہ ذلیل وخوار ہو کر رہ گیا، وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر عمل کرنے کے بجائے خواہش کے پیچھے لگ گیا گویا اس نے ایسا راستہ اختیار کیا جو انسان کو بلندی کے بجائے پستی کی طرف لے جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی بہت بری مثال بیان فرمائی ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ اس کی مثال کتے جیسی ہے کہ اگر تم اس کو ڈانٹ پلا دو تو بھی ہانپتا ہے یا اگر چھوڑ دو پھر بھی ہانپتا ہے "تَحْمِلْ" کے کئی معنیٰ آتے ہیں ،یعنی: کوئی چیز لادنا، حملہ کرنا یا ڈانٹ پلانا مقصد یہ ہے کہ کتا ہمیشہ ہانپتا رہتا ہے خواہ اسے کوئی تکلیف پہنچے یا نہ پہنچے۔

گمراہوں کی مثال

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ

یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا آیتوں ہماری کو پس بیان کردیں احوال

لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾

شاید وہ سوچیں (۱۷۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، سو! یہ احوال بیان کیجئے تا کہ وہ دھیان کریں۔ (۱۷۶)

لفظی تحقیق: مَثَلُ: اس کے بہت سے معنٰی ہیں کسی سے ملتی ہوئی چیز، مشابہ، نمونہ، ایسا حال جو بہت سی صورتوں پر فٹ آئے یہاں یہی معنٰی مراد ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ اس آدمی کی ہی خاص بات نہیں جتنے ہماری آیتوں کے جھٹلانے والے ہیں وہ سب اسی طرح کے ہوتے ہیں انہیں ان کی برائیاں لے ڈوبتی ہیں وہ جانتے سب کچھ ہیں لیکن مانتے بالکل نہیں یہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں آخرت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، اللہ تعالیٰ کے پیغمبر لاکھ ان کو سمجھائیں اللہ تعالیٰ کی آیتیں پکار پکار کر انہیں کتنا ہی جھنجھوڑیں ان کی آنکھ نہیں کھلتی نہ وہ دوسروں کے سبق سکھانے والی باتوں سے سبق حاصل کرتے ہیں پھر بھی اے پیغمبر! آپ ان کو پہلے کے لوگوں کے حالات سناتے جایئے اوران کا افسوس ناک انجام انہیں یاد دلائے جایئے اس سے یہ توقع ہوسکتی ہے کہ شاید ان کے دل میں کچھ خیال پیدا ہو جائے اور یہ اپنی سمجھ سے کام لینا شروع کردیں ورنہ وعظ و نصیحت کے بند کردینے کے بعد تو سوائے اس کے کہ تباہ و برباد ہوں اور کوئی امید ان کیلئے ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، یہ جھٹلانا قول سے بھی ہوتا ہے اور عمل سے بھی، آپ یہ حالات وواقعات لوگوں کے سامنے بیان کر دیں تاکہ یہ غور وفکر کریں اور سوچیں کہ خدا تعالیٰ کے عہد و پیمان کو توڑ کر کس قدر ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بلعم بن باعور، امیہ ابن ابی صلت اور راہب ابو عامر صیفی کا انجام ہمیشہ نظروں کے سامنے رہنا چاہئے۔

یہی مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: مراد اس سے وہ مکہ والے ہیں جو ہمیشہ سے یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ ان کے پاس کوئی پیغمبر آئے جو ان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف بلائے اور اطاعت کے صحیح طریقے سکھائے، پھر جب وہ پیغمبر آ گئے اور ایسی کھلی نشانیوں کے ساتھ آئے کہ ان کی سچائی میں ذرا بھی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہی تو ان کو جھٹلانے لگے اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے منہ موڑنے لگے۔

اور بعض مفسرین کرام نے فرمایا کہ: اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے جانے سے پہلے آپ کی نشانیاں "تورات" میں پڑھ کر لوگوں کو بتلایا کرتے اور آپ کے آنے کا انتظار کیا کرتے تھے مگر جب آپ تشریف لے آئے تو سب سے زیادہ دشمنی اور مخالفت انہی لوگوں نے کی اور "تورات" کے حکم سے ایسے صاف نکل گئے، جیسے: بلعم بن باعور نکل گیا تھا۔

آخر آیت میں فرمایا کہ: آپ اس شخص کا واقعہ ان لوگوں کو سنا دیجئے شاید یہ کچھ سوچیں اور اس کے واقعہ سے سبق حاصل کریں۔

اللہ ہی بچانے والا ہے

سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا

بری ہے | مثال | ان لوگوں کی | جنہوں نے | جھٹلایا | آیتوں ہماری کو | اور | جانوں اپنی پر | رہے

يَظْلِمُوْنَ﴿۱۷۷﴾ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ
ظلم کرتے (۱۷۷) جس کو راہ دکھائے اللہ پس وہی راستہ پانے والا ہے اور جس کو گمراہ کرے

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴿۱۷۸﴾
پس وہ وہی ہیں خسارے میں (۱۷۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بری ہے مثال ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔(۱۷۷) جس کو اللہ راستہ دکھائے وہی راستہ پاسکتا ہے اور جس کو گمراہ کرے، سو! وہی خسارے میں ہیں۔(۱۷۸)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: ان دنیا کے پرستاروں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو تو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا اب انہیں نقصان سے بچانے والی کیا چیز باقی رہ گئی یہ دنیا کے نام ونمود کے پیچھے دیوانوں کی طرح دوڑے چلے جارہے ہیں اور چاروں طرف اندھیرا ہے، کیوں کہ روشنی تو صرف اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے حاصل ہوسکتی تھی ان کو انہوں نے جھٹلایا اب کوئی چیز نہیں جو انہیں راستے کے گڑھوں اور ٹھوکروں سے بچائے، وہ عنقریب کسی گڑھے میں اوندھے منہ جا پڑیں گے۔

ہدایت وہی شخص پاتا جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت عطا کرتے ہیں، لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ہدایت مانگنی چاہئے اور گمراہی سے بچنا چاہئے، "ترمذی شریف" کی روایت میں آتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: تم سب بھٹکے ہوئے ہو مگر وہ جسے میں ہدایت دوں، لہٰذا ہدایت مجھ سے ہی مانگا کرو، میں تمہیں سیدھے راستے پر چلاؤں گا، "سورۂ فاتحہ" میں یہی بات سکھائی گئی ہے کہ، اے مولائے کریم! ہمیں ہر معاملہ میں سیدھا راستہ ہی دکھایئے، کیونکہ راستہ وہی پاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ راہ دکھائیں اور جو شخص حق کی مخالفت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے لازمی طور پر گمراہ کریں گے، پھر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو بلا وجہ گمراہ نہیں کرتے جو لوگ حق کی مخالفت کریں گے وہ

گمراہی میں پڑیں گے اور جو ہدایت کی طرف آنا چاہیں گے انہیں ہدایت نصیب ہوجائے گی یہاں پر بھی یہی بات فرمائی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ راہ دکھادیں وہی راہ پانے والا ہے، پس یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں یہ لوگ ناکام ہوں گے اور ہمیشہ کے نقصان میں رہیں گے جو شخص دنیا سے گمراہی کا سامان لے کر جائے گا وہ ہمیشہ کیلئے ناکام ہوجائے گا۔

ایک نصیحت

اللہ تعالیٰ کی آیت کی خلاف ورزی خود بھی ایک عذاب ہے اور اس کی وجہ سے شیطان اس پر غالب آکر ہزاروں خرابیوں میں بھی مبتلا کر دیتا ہے؛ اس لئے جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے دین کا علم عطا کیا ہو اس کو چاہئے کہ اس کی قدر کرے اور اپنے عمل کو درست رکھنے کی اور دوسروں کے عمل کو درست کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

بہت سے جہنم ہی کیلئے بنے ہیں

وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ لَهُمْ

اور البتہ پیدا کئے ہم نے لئے دوزخ کے بہت سے جن اور انسان ان کے

قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَ

دل نہیں سمجھتے سے ان اور ان کی آنکھیں ہیں نہیں دیکھتے سے ان اور

لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ

ان کے کان ہیں نہیں سنتے ہیں سے ان وہ ہیں مویشیوں کے مانند بلکہ وہ زیادہ گمراہ ہیں

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

یہ لوگ وہی ہیں غفلت کرنے والے (۱۷۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے دوزخ کے واسطے پیدا کئے بہت سے جن اور انسان، ان کے دل ہیں کہ

ان سے سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں کہ ان سے نہیں دیکھتے اور کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں اور وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہیں، وہی لوگ غافل ہیں۔ (۱۷۹)

تفسیر

وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ: البتہ تحقیق ہم نے پیدا کیئے ہیں جہنم کیلئے بہت سے لوگ جنوں میں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی۔

صرف آیت کے اس ٹکڑے سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے صرف دوزخ میں ڈالنے کیلئے جنوں اور انسانوں کو پیدا کیا؟ ایسا نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں کے پیدا کرنے کے مقصد کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ: جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے، جنوں اور انسانوں کی پیدائش کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔

اہل کیلئے خصوصی مضمون

اس بات کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ "لِجَهَنَّمَ" کا "لام" ابتداء کیلئے نہیں بلکہ عاقبت کیلئے آیا ہے، یعنی: مقصد دوزخ نہیں بلکہ اس کی انتہا دوزخ ہے، اس کی مثال "سورۂ قصص" میں موجود ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے آپ کو ایک نہر میں بہادیا "فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ" پس اس بچے کو فرعونیوں نے اٹھالیا "لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا" تاکہ وہ ان کیلئے دشمن اور غم کا باعث ہوجائے "لِیَكُوْنَ" کا "لام" بھی اسی قسم کا ہے، بچے کو اٹھانے کا بنیادی مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ ان کیلئے مصیبت کا باعث بن جائے بلکہ ان کا مقصد تو یہ تھا شاید یہ ہمیں فائدہ دے یا ہم اسے بیٹا بنالیں، مگر اس کی انتہاء یہ ہوئی کہ وہ فرعونیوں کا دشمن اور ان کیلئے غم کا باعث ہوا، ظاہر ہے کہ فرعون اور اس کی قوم کا زوال اس بچے کی وجہ سے آیا جسے انہوں نے دریا سے اٹھالیا تھا، بہرحال اس آیت کا مطلب یہی ہے کہ ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو پیدا کیا کہ جب وہ سیدھے کام نہیں کریں

گے تو ان کی انتہاء دوزخ ہوگی۔

اس قسم کے کلام کی مثالیں عربی ادب میں بھی ملتی ہیں، مثلاً: عرب کہتے ہیں:

فلا تحزنی ام اوس فانه　　　للموت ماغذت الوالدة

اے ام اوس! تو غم نہ کر کیونکہ ماں اپنے بچے کو موت ہی کیلئے غذا دیتی ہے، یعنی: کھلاتی پلاتی اور پرورش کرتی ہے۔

اگر چہ ماں بچے کو موت کیلئے نہیں پالتی مگر اس کی انتہاء یہی ہے کہ بالآخر ہر پیدا ہونے والا موت کے منہ میں چلا جاتا ہے ایک اور عربی شاعر کہتا ہے:

لنا ملک ینادی کل یوم　　　لدو للموت و ابنوا للخراب

ہمارے لئے ہر روز فرشتہ آواز دیتا ہے کہ اے انسانو! اولاد موت کیلئے جنو اور عمارتیں بربادی کیلئے تعمیر کرو، مقصد یہ کہ جننے کا انجام موت ہے اور تعمیر کا انجام ویرانی ہے۔

جسم کے تین اعضاء کے ذکر کرنے کا نکتہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کے دوزخی ہونے کیلئے اس کے جسم کے تین جزؤں کا ذکر فرمایا ہے، یعنی: دل، آنکھیں اور کان، جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے وہی دوزخ کے حقدار بنتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ بلاوجہ کسی کو سزا میں مبتلا نہیں کرتے اسے پورا پورا اختیار دیا جاتا ہے اور پھر عمل کیلئے میدان مہیا کیا جاتا ہے، ہر ایک کو اس چیز کی توفیق ملتی ہے جس چیز کیلئے وہ پیدا کیا گیا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ اس کے آخری عمل کے مطابق کر دیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ جو شخص دل، آنکھ اور کان کو صحیح طور پر کام میں نہیں لائے گا وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھا پائے گا اور نہ ہی کامیاب ہوگا بلکہ ایسا شخص دوزخ کا حقدار ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر انسان کے تین اہم جزؤں دل، آنکھ اور کان کا ذکر کر کے فرمایا کہ جن لوگوں نے ان اعضاء سے صحیح کام نہ لیا تو یہ جانوروں اور مویشیوں کی طرح ہیں، جانور بھی اپنی ضرورتوں کھانے پینے اور جنسی

خواہشات پوری کرنے کی حد تک محدود رہتے ہیں ان کے نزدیک اور کوئی مقصد نہیں ہوتا اسی طرح یہ لوگ بھی ہیں، لہٰذا یہ بھی جانوروں کی طرح ہیں بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں وجہ یہ ہے کہ کوئی جانور اپنی پیدائش کے مقصد کو نہیں بھولتا، اللہ تعالیٰ نے اسے جس مقصد کیلئے پیدا فرمایا ہے وہ اپنا فرض انجام دیتا ہے جب اس کا مالک کسی کام کیلئے پکارتا ہے تو وہ اس آواز کو سنتا ہے اور اس کے حکم پر عمل کرتا ہے اور جس چیز سے منع کرتا ہے اس سے رُک جاتا ہے، کفر اور شرک کرنے والے اللہ تعالیٰ کی بدترین مخلوق ہیں اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو قرآن کریم میں بدترین مخلوق فرمایا ہے، وجہ یہی ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کو مالک کی خواہش پر ترجیح دیتے ہیں۔

جو لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں وہ حقیقت میں غافل ہیں، غفلت انسان کو دوزخ تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہونا ناکامی کی دلیل ہے غفلت ہی حرص اور دنیا میں دل لگائے رکھنے کا سبب بنتی ہے؛ اسی لئے فرمایا کہ یہ لوگ غافل ہیں جو اپنے رب تعالیٰ کو یاد ہی نہیں کرتے اس کا حکم تو یہ ہے کہ اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو اور غفلت کرنے والوں میں سے نہ بنو۔

غفلت کا علاج

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ

اور لئے اللہ کے ہیں تمام نام اچھے پس پکارو اس کو سے ناموں ان اور چھوڑ دو ان کو جو ٹیڑھے چلتے ہیں

فِيْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَ مِمَّنْ خَلَقْنَاۤ

میں ناموں اسکے عنقریب بدلہ دیئے جائینگے اسکا جو تھے وہ کرتے (۱۸۰) اور میں سے ان جنہیں پیدا کیا ہم نے

ع ۲۲ ۱۰ ۱۲

اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾

کچھ لوگ ہیں جو راہ بتاتے ہیں ٹھیک اور اسی کے مطابق انصاف کرتے ہیں (۱۸۱)

بامحاورہ ترجمہ: ۔ اور سب اچھے نام اللہ کے ہیں، سو! اس کو پکارو وہی نام لے کر اور اس کے ناموں میں

جو ٹیڑھی راہ چلتے ہیں ان کو چھوڑ دو وہ اپنے کیے کا بدلہ پائیں گے۔ (۱۸۰) اور لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے ایک جماعت ہے جس کے افراد سچی راہ بتاتے ہیں اور اسی کے مطابق انصاف کرتے ہیں۔ (۱۸۱)

تفسیر

اللہ تعالیٰ کو کن ناموں کے ساتھ پکارنا چاہیے اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب نام اچھے ہیں پس اسے انہی ناموں سے پکارو، اللہ تعالیٰ کے تمام ناموں اور اس کی صفتوں پر ایمان لانا ضروری ہے جیسا کہ ہم ایمان مفصل کے بیان میں اقرار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ناموں کے بارے میں صحیح حدیث میں آتا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو شخص ان کو یاد کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا یاد کرنے سے مراد محض زبانی رٹ لینا نہیں بلکہ ان کے مفہوم پر ایمان لانا اور ان کے مطلب پر عمل کرنا ضروری ہے جو شخص ایسا کرے گا وہ یقیناً جنت کا حقدار ہوگا ان میں سے زیادہ تر نام قرآن کریم میں موجود ہیں اور سب کے سب اسمائے حسنہ (یعنی: اللہ تعالیٰ کے خوبصورت نام) ہیں، لہٰذا انہی ناموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے بعض اس کے ذاتی نام اور بعض صفاتی ہیں جو الفاظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر بولے جاتے ہیں وہ ذاتی ہیں اور جو اس کی صفت کو ظاہر کرتے ہیں وہ صفاتی نام کہلاتے ہیں۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ مشرک لوگ اعتراض کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ایک طرف توحید کی دعوت دیتا ہے اور دوسری طرف اس کے بہت سے نام بھی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ خدا کو لفظ اللہ کے ساتھ پکارو، یا رحمان کے ساتھ اس کے سارے نام اچھے ہیں اور اسے ہر نام سے پکارنا درست ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اچھے نام ہیں اسے ان کے ساتھ پکارو اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کے ناموں سے الحاد کرتے ہیں، یعنی: ٹیڑھا چلتے ہیں ''لحد'' کے معنٰی ٹیڑھا ہوتا ہے، ملحد ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کی فکر ٹیڑھی اور

فاسد ہوتی ہے تو فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد کرنے والوں کو چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ کے ناموں کے ساتھ الحاد کا مطلب یہ ہے کہ جو نام اللہ تعالیٰ کی ذات کیلئے خاص ہیں ان ناموں کو کسی دوسرے کیلئے نہ بولو، جیسے: مسیلمہ کذاب کے ساتھی اسے رحمان یمامہ کہتے تھے یا جیسے مشرکوں نے اپنے معبودوں کے نام اللہ تعالیٰ کے نام پر رکھ لیئے تھے، مثلاً: "اللہ تعالیٰ" سے اس کی مؤنث لات بنالیا اور "عزیز" سے اس کی مؤنث عزیٰ کا نام نکال لیا اور اسی طرح "منان" سے اس کی مؤنث مناۃ بنالیا، یہ الحاد اور کج روی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اصل ناموں کو بگاڑ کر وہی نام اپنے جھوٹے خداؤں کیلئے مقرر کر لیئے جائیں۔

عنقریب انہیں ان کے عملوں کا بدلہ دیا جائے گا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں کجی، یعنی: ٹیڑھ پن اختیار کر کے بچ نہیں سکتے۔

امام تفسیر ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ پیغمبر ﷺ نے اس آیت کو تلاوت کر کے ارشاد فرمایا کہ: یہ امت جس کا ذکر اس آیت میں ہے میری امت ہے جو اپنے سب جھگڑوں کے فیصلے حق وانصاف، یعنی: اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق کریں گے اور لینے دینے کے تمام معاملوں میں حق وانصاف کو سامنے رکھیں گے۔

اور عبد بن حمید کی ایک روایت میں ہے کہ پیغمبر ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ آیت تمہارے حق میں آئی ہے اور تم سے پہلے بھی ایک امت کو یہ صفتیں عطا ہو چکی ہیں، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی "وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ" مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں بھی ایک جماعت ان صفتوں کی حامل تھی کہ لوگوں کی رہنمائی میں اور آپس کے جھگڑوں کے فیصلوں میں حق کی مکمل پیروی کرتی تھی اور پیغمبر ﷺ کی امت کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ ممتاز صفت دی ہے، خلاصہ اس کا دو خصلتیں ہیں ایک یہ کہ دوسرے لوگوں کی قیادت اور رہنمائی یا مشورہ میں شریعت کی پیروی کریں، دوسرے یہ کہ اگر کوئی جھگڑا آپس میں پیش آجائے تو اس کا فیصلہ شریعت کے قانون کے مطابق کریں۔

آیت سے سبق

آیت کے اس جملہ میں دو ہدایتیں امت کو دی گئیں ایک یہ کہ حمد وثناء اور مشکلوں اور حاجتوں کیلئے صرف اللہ تعالیٰ کو پکارو مخلوقات کو نہیں دوسرے یہ کہ اس کو انہی ناموں سے پکارو جو اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہیں اس کے الفاظ نہ بدلو۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... اللہ تعالیٰ پر وہی نام بولنے چاہئیں جو قرآن وسنت سے ثابت ہوں اور اپنی طرف سے کوئی ایسا نام نہیں رکھنا چاہئے جو شریعت میں ثابت نہ ہو۔

مسئلہ (۲):.... شریعت کے بتلائے ہوئے صفاتی نام ہی درست ہیں، جیسے: عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کیلئے اب، یعنی: باپ کا نام تجویز کرلیا ہے، خدا تعالیٰ کو باپ کہنے سے شرک کی ابتداء ہوئی ہے، اللہ اکبر کا ترجمہ ہم "خدا بڑا ہے" تو کرتے ہیں مگر خدا لمبا ہے نہیں کر سکتے ایسا نام یا صفت بالکل خود کا بنایا ہوا اور غلط کام ہوگا اسی طرح خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کیلئے قدیم کا لفظ استعمال ہوتا ہے مگر ہم اس لفظ کا ترجمہ کر کے اللہ تعالیٰ کیلئے پرانا کا نہیں کہہ سکتے ایسا کرنا الحاد، یعنی: کج روی ہے۔

مسئلہ (۳):.... اللہ تعالیٰ کے مخصوص ناموں کو کسی دوسرے شخص کیلئے استعمال کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اسماء حسنیٰ میں سے بعض نام ایسے بھی ہیں جن کو خود قرآن وحدیث میں دوسرے لوگوں کیلئے بھی استعمال کیا گیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کیلئے استعمال کرنا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں تو جن ناموں کا استعمال غیر اللہ کیلئے قرآن وحدیث سے ثابت ہے وہ نام تو اوروں کیلئے بھی استعمال ہو سکتے ہیں، جیسے: رحیم، رشید، علی، کریم، عزیز وغیرہ اور اسماء حسنیٰ میں سے وہ نام جن کا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کیلئے استعمال کرنا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کیلئے استعمال

کرنا الحاد میں داخل اور ناجائز وحرام ہے، مثلاً: رحمن، رزاق، خالق غفار، قدوس وغیرہ۔

مسئلہ (۴):..... اللہ تعالیٰ کے مخصوص ناموں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کیلئے استعمال کرنا اگر کسی غلط عقیدہ کی بناء پر ہے کہ اس کو ہی خالق یا رازق سمجھ کر ان الفاظ سے خطاب کررہا ہے تب تو ایسا کرنا کفر ہے اور اگر عقیدہ غلط نہیں محض بے فکری یا بے سمجھی سے کسی شخص کو خالق، رزاق یا رحمن کہہ دیا تو یہ اگرچہ کفر نہیں مگر سخت گناہ ہے۔

مسئلہ (۵):..... جن لوگوں کے اسلامی نام ہیں: عبد الرحمن، عبد الخالق، عبد الرزاق، عبد الغفار، عبد القدوس وغیرہ ان کو مختصر کرکے یہ غلط طریقہ اختیار کرلیا گیا ہے کہ صرف آخری لفظ ان کے نام کی جگہ پکارا جاتا ہے رحمن، رزاق، غفار کہہ کر پکارا جاتا ہے جو کہ صحیح نہیں۔

ہم منکروں کو ڈھیل دیں گے

وَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾

اور جن لوگوں نے جھٹلایا آیتوں ہماری کو ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے سے اس طرح کہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی (۱۸۲)

وَ اُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۱۸۳﴾

اور مہلت دوں گا میں ان کو بیشک داؤ میرا پکا ہے (۱۸۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے اس طرح کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ (۱۸۲) اور میں ان کو ڈھیل دوں گا بیشک میرا داؤ پکا ہے۔ (۱۸۳)

تفسیر

ارشاد ہے کہ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کو زیادہ تر فوراً سزا نہیں ملتی بلکہ ان کو غفلت میں بڑھنے دیا جاتا ہے اور دنیا کی دولت اور قوت خوب دی جاتی ہے وہ خوش ہوتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ اللہ، پیغمبر، کتاب، قیامت یہ سب ایک فریب بنا رکھا ہے، دیکھو! ہم اپنی ہوشیاری اور عقلمندی سے کہاں سے کہاں تک پہنچے ہیں۔

آگے ارشاد ہے کہ: میں انہیں ڈھیل دیتا رہتا ہوں تاکہ آخر کار جب چاہوں گا پکڑ لوں گا وہ میرے داؤ

اور خفیہ تدبیر سے بچ نہیں سکتے وہ ان کو چاروں طرف سے گھیر کر خوب مال و دولت اور خوشحالی میں بڑھتے ہوئے رکھ کر آخر سخت مصیبت اور عذاب میں پھنسا کر چھوڑے گی، یہ آیت بڑی سبق سکھانے والی ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے پیغمبروں اور کتابوں کو فضول سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مال و مرتبے میں بڑھتے چلے جارہے ہیں ان کو سوچنا چاہئے کہ اگر اسی طرح چلتے چلتے ایک دن اچانک سخت مصیبت آپڑی تو کچھ نہ بن سکے گا؛ اس لئے مناسب ہے کہ اسلام کے حکم سچے دل سے مانیں اور دنیا کا کام وقتی سمجھ کر کریں اور اتنا ہی کریں جتنا جینے کیلئے ضروری ہے باقی آخرت کی فکر میں لگیں۔

اس لیے دنیا میں کافروں اور نافرمانوں کی مالداری یا عزت و مرتبہ سے دھوکہ نہ کھایا جائے کیونکہ وہ حقیقت میں ان کے لیے کوئی بھلائی کا سامان نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہے۔

قرآن کریم نے مختلف سورتوں اور آیتوں اس ڈھیل کا ذکر فرمایا ہے" جب یہ لوگ اس چیز کو بھلا بیٹھے جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ یہ اپنی ملی ہوئی نعمت ودولت پر اکڑ گئے تو ہم نے ان کو اچانک عذاب میں پکڑ لیا تو وہ خلاصی سے ناامید ہو کر رہ گئے"۔

فکر کی دعوت

اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ

کیا نہیں سوچا انہوں نے نہیں ساتھی ان کے کو کچھ جنوں نہیں وہ مگر ڈرانے والا

مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا

کھلم کھلا (۱۸۴) کیا نہیں غور کیا میں انتظام آسمانوں کے اور زمین کے اور جو

خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ

پیدا کی اللہ نے کوئی چیز اور اس میں کہ شاید کہ یہ بات ہو تحقیق بہت قریب آگئی ہے گھڑی انکی

بامحاورہ ترجمہ:۔ کیا انہوں نے دھیان نہیں کیا کہ ان کے ساتھی (یعنی: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) کو کچھ بھی جنون

نہیں وہ تو (اللہ کے عذاب سے) صاف ڈرانے والے ہیں۔ (۱۸۴) کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی سلطنت اور دوسروں میں اور ان چیزوں میں جو اللہ نے پیدا کی ہیں غور نہیں کیا اور یہ نہیں سوچا کہ شاید ان کا وقت قریب ہی آ گیا ہو۔

تفسیر

اس آیت میں ان لوگوں کو اپنی حالت پر غور کرنے کی دعوت ہے انہیں سوچنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اتنی زبردست سختیاں برداشت کر کے اور محنت اٹھا کر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے میں اتنی سرگرمیاں میں کیوں دکھاتے ہیں ان کے دماغ میں کوئی فتور نہیں۔

ارشاد ہے کہ: آخر انہیں اتنا تو سوچنا چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے اور ان آیتوں کے لانے والے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہمیشہ سے ان کے اندر رہتے سہتے چلے آ رہے ہیں ان کی عادتوں سے یہ خوب واقف ہیں ان کی دیانتداری اور سمجھ کا اور معاملوں میں پاک وصاف ہونے کا اقرار کرتے ہیں ان کے اخلاق کی تعریف کرتے ہیں ان کی بے لوثی اور عوام کی خیرخواہی کی گواہی دیتے ہیں انہیں جنون نہیں بلکہ ان سب سے زیادہ عقلمند اور دور اندیش ہیں پھر ان کی بات نہ سننے کی کوئی وجہ نہیں ان کو لوگوں کے اوپر حکومت کرنے کی خواہش نہیں وہ انہیں اپنا فرمانبردار بنا کر اپنی سلطنت جمانا نہیں چاہتے۔

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان وزمین کی سلطنت میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی زمین وآسمان جیسی بڑی بڑی چیزوں اور دوسری چھوٹی سے چھوٹی مخلوقات میں غور کرتے تو آیا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے اور نہ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ دیوانہ کہتے، مگر افسوس کہ! لوگ غور وفکر سے کام نہیں لیتے، ایسے لوگوں کی حالت پہلے بیان ہو چکی ہے ان کے دل ہیں مگر وہ سمجھتے نہیں آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں کان ہیں مگر سنتے نہیں یہ سب چیزیں غور وفکر نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

آیت میں وعدے کے وقت سے مراد مجرموں کی پکڑ کا وقت بھی ہو سکتا ہے اور زندگی کے ختم ہونے کا وقت بھی مراد ہو سکتا ہے کہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور دھیان ہی نہیں دیتے کہ ان کی زندگی کسی وقت بھی ختم

ہوسکتی ہے دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی شخص بالکل تندرست ہوتا ہے کھاتا پیتا، کھیلتا کودتا ہے مگر موت کا وقت اچانک آجاتا ہے اور اس کے تمام پروگرام دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، انسانوں کی انفرادی موت کی طرف قوموں کی اجتماعی موت بھی ایسے ہی واقع ہوجاتی ہے اور پھر ان کی پکڑ ہوجاتی ہے،لوگ بڑی بڑی بادشاہتوں کے مالک ہوتے ہیں دنیا بھر کے فیصلے کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ڈھیل دیتے رہتے ہیں مگر جب ان کا مقررہ وقت آجاتا ہے توان کو اچانک پکڑ لیتے ہیں تو ان کی ساری نعمتیں چھن جاتی ہیں وہ ناشکری کی وجہ سے ذلیل وخوار ہوکر رہ جاتے ہیں۔

قرآن کریم آخری پیغام ہے

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

پس کون سی بات پر بعداسکے ایمان لاویں گے(۱۸۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ سو!اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے۔(۱۸۵)

تفسیر

اس سے پہلے بیان ہوا کہ انسان کے ہونے کا مدار اس پر ہے کہ وہ اپنے رب کو پہچانے اور اس کے حکم کے مطابق زندگی بسر کرے اور یہ بھی کہہ دیا گیا کہ رب کے پہچاننے سے جو چیز روکتی ہے وہ دنیا کی چیزوں کا لالچ ہے انسان کی خواہشیں مچلتی ہیں کہ انہیں پورا کیا جائے اس کے رب کا حکم ہے کہ خبردار! خواہشوں کے جال میں نہ پھنسنا، اس دنیا کے اندران کے پورا کرنے میں ہم نے بندشیں لگادی ہیں اور حدیں مقرر کردی ہیں ان حدوں کے اندر رہ کر جتنی خواہشیں پوری ہوسکتی ہیں انہیں پورا کرنے میں حد سے باہر کبھی نہ نکلو انسان کیلئے یہ اتنی مشکل چیز ہے کہ ہروقت وہ راستہ توڑ کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، اسے پابندی میں اپنی موت نظر آتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ زندگی نام ہی اس کا ہے کہ اپنی خواہشیں پوری کرے اور خوب مزے اڑائے، اس کیلئے وہ ذریعے تلاش کرتا ہے مال جمع کرتا ہے اگر نہیں ہوسکتا تو دوسروں سے چھین جھپٹ کرتا ہے ان جھگڑوں میں بھلا کسے فرصت ہے جو رب تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرنے میں مشغول ہو، پھر ان باتوں کے سمجھانے کیلئے پیغمبر آتے ہیں اللہ تعالیٰ کی کتابیں لاتے

ہیں انہیں پڑھ کر سناتے ہیں ان کے معنیٰ سمجھاتے ہیں ان پر خود عمل کر کے دوسروں کو عمل کرنا سکھاتے ہیں اگر ان کا کہنا مان لیا جائے تو پھر رب تعالیٰ کی پہچان اور اس کی اطاعت آسان ہوجاتی ہے پیغمبر ان کو خواہشوں کے پھندے سے نکالتے ہیں اور ان کو آدمیوں کی طرح پورا کرنے کے طریقے سکھاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انسان کے مرتبہ کے مناسب نہیں کہ جانوروں کی طرح ہر وقت جا بے جا کھانے پینے اور شہوت رانی میں لگا رہے اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے اس کی ترقی کے راستے مقرر کر دیئے ہیں ان راستوں پر چلنا اس کا فرض ہے۔

پیغمبر اللہ تعالیٰ کی کتاب ان کو دینے کیلئے آئے یہاں تک کہ پیغمبروں کا سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا اور آپ نے انسان کی ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ کی سب سے آخری کتاب قرآن کریم انسان کو لا کر دے دی، اس میں ان سب باتوں کا نچوڑ اور خلاصہ موجود ہے جو پہلے پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانے میں اس وقت کے انسانوں پر پہنچائیں اب آپ کے بعد نہ کوئی پیغمبر آئے گا اور نہ اور کوئی کتاب آئے گی؛ اس لئے اگر انسان کو انسان بننا ہے تو اس کتاب کی پیروی اس کیلئے لازم ہے اور اگر جانوروں کی طرح اپنی نفسانی خواہشوں کو بے لگام چھوڑنا ہے اور ان کے پورا کرنے کے ذریعوں میں عمر بسر کرنی ہے تو اسے اختیار ہے، ہم اس کیلئے کوئی حکم نہیں لگاتے یہی اللہ تعالیٰ کی کتاب اس سے پوچھنا چاہتی ہے کہ اگر اس کتاب کو نہ مانا تو اور کیا رکھا ہے جسے مانو گے اگر وہ مانتا ہے تو اسے سمجھنا چاہئے کہ اس کتاب نے دنیا میں پھنسنے والوں کی جو سزائیں بتائی ہیں اگر وقت آنے پر وہ ان کو ملیں تو پھر سوائے اس کے کہ وہ اپنے آپ سے اور کسی پر الزام نہیں رکھ سکتا پھر تو جو سر پر پڑے گا بھگتنا ہوگا انسان میں جو بڑی کمزوری ہے وہ نفسانی خواہشیں ہیں اور انسان چاہتا ہے کہ ان کو فوراً پورا کرلے، اللہ تعالیٰ ان خواہشوں سے بالکل تو نہیں روکتا، البتہ وہ طریقہ سکھاتا ہے جس میں فائدہ تو پورا ملے اور نقصان نہ ہو لیکن اس کیلئے کچھ محنت ضروری ہے، جیسے: نکاح کر کے بیوی کا خرچ برداشت کرنا جس سے گھر اور اولاد کی وہ راحت نصیب ہوتی ہے جو بدکاری میں نہیں۔

ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٨٦﴾

جس کو گمراہ کرے اللہ پس نہیں کوئی راہ دکھانے والا اس کو اور وہ چھوڑے رکھتا ہے انکو میں سرکشی انکی سرگرداں (۱۸۶)

بامحاورہ ترجمہ: جس کو اللہ گمراہ کرے اس کو کوئی راہ دکھانے والا نہیں، اور اللہ ان کو ان کی شرارت میں سرگرداں چھوڑے رکھتا ہے۔ (۱۸۶)

تفسیر

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر، کتاب اور اس کے علاوہ بہت سی نشانیاں دنیا میں سب کے سامنے رکھ دی ہیں، زبردستی کسی پر نہیں، اگر کوئی دنیا ہی کی دھوکے بازیوں میں پھنسا رہنا چاہتا ہے اور اس سے اوپر اس کی نگاہ اٹھتی ہی نہیں، وہ اچھی باتوں کو برا اور بری باتوں کو اچھا سمجھتے رہتے ہیں، پیغمبروں کو جھٹلاتے رہتے ہیں اور شیطان کی پیروی کرتے ہیں، قیامت کے متعلق شبہوں کا اظہار کرتے ہیں اور آخرت کیلئے کوئی تیاری نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ اسے اسی میں پھنسا ہوا چھوڑ دیں گے اور وہ اپنی شرارتوں میں اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرے گا اور ایک دن چل بسے گا اس کی دولت، قوت، دبدبہ اس کا زور وشور اس کا جاہ وجلال اس کی اکڑ فوں، غرضیکہ کوئی چیز اس کو نہ بچا سکے گی۔

یہاں تو یہ کہہ دینا آسان ہے کہ آخرت کوئی چیز نہیں عذاب وثواب، جنت ودوزخ سب من گھڑت باتیں ہیں، لیکن جب یہ سچ ثابت ہوں گی تو پھر ان لوگوں کی مصیبت کا کیا ٹھکانہ ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں قیامت کے دن اس ہمیشہ کے حسرت وافسوس سے محفوظ رکھے اور دنیا میں ہدایت نصیب کریں۔ آمین

کافروں کا نہ ماننا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے انتہائی رنج وغم کا سبب ہوسکتا تھا: اس لئے یہاں آپ کو تسلی دینے کیلئے ارشاد فرمایا کہ: جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کردیں اس کو کوئی راہ پر نہیں لاسکتا اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو گمراہی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی اور حق کو قبول نہ کرنے سے آپ غمگین نہ ہوں کیونکہ آپ کا فرض اتنا ہی تھا کہ حق بات کو صاف صاف مؤثر انداز میں پہنچادیں وہ آپ پورا کر چکے آپ کی ذمہ داری ختم ہو چکی اب کسی کے ماننے یا نہ ماننے کی آپ پر ذمہ داری نہیں۔

قیامت کب آئے گی؟

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ

پوچھتے ہیں آپ سے بارے میں قیامت کے کب ہے قائم ہونا اس کا؟ کہہ دیجئے بات یہ ہے علم اسکا پاس ہے

رَبِّیْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؔۘ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ

رب میرے کے نہ ظاہر کرے گا اس کو پر وقت آنے اسکے مگر وہی بھاری ہے وہ میں آسمانوں اور زمین

وقف لازم، وقف منزل

لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا

نہ آئے گی پاس تمہارے مگر اچانک پوچھتے ہیں آپ سے گویا آپ ٹوہ میں ہیں اس کی کہہ دیجئے بات یہی ہے

عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

علم اسکا پاس ہے اللہ کے اور لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے (۱۸۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس کے قائم ہونے کا وقت کب ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ! اس کی خبر تو میرے رب کے پاس ہی ہے، وہی اس کو اس کے وقت پر کھول کر دکھادے گا وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری بات ہے جب تم پر آئے گی تو اچانک آئے گی آپ سے پوچھنے لگتے ہیں کہ گویا آپ اس کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں، آپ کہہ دیجئے! اس کی خبر خاص اللہ کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ (۱۸۷)

لفظی تحقیق: اَلسَّاعَةِ: وقت کا ایک چھوٹا سا حصہ جس کو گھڑی کہتے ہیں، یہاں اس سے مراد قیامت کی گھڑی ہے جس میں سب کا حساب کتاب ہوگا۔

تفسیر

قیامت کے بارے میں لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کب آئے گی اس کا ذکر تو پہلے ہی آسمانی کتابوں میں

ہو چکا ہے قرآن کریم نے اس پر زور دیا اور پیغمبر ﷺ نے لوگوں کو قرآن کریم پڑھ کر سنایا تو لوگ سمجھے کہ آپ نے بھی اس مسئلہ پر غور وخوض کیا ہے، لہٰذا آپ سے سوال کیا کہ آپ یہ بتائیں کہ قیامت کب آئے گی؟ اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے، ارشاد ہے کہ: قیامت کے آنے کا وقت پوشیدہ رکھا گیا ہے اس کو سوا اللہ کے کوئی نہیں جانتا لوگوں کی اصلاح کیلئے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ قیامت ضرور آئے گی بلکہ اس کا وقت نہ بتانے میں یہ مصلحت ہے کہ لوگ ہر وقت اس سے ڈرتے ہیں جب اس کا وقت آئے گا اللہ تعالیٰ اسے کھلم کھلا سب کو دکھا دیں گے اس کے علم کی برداشت کی کسی مخلوق میں طاقت نہیں اگر اس کے آنے کا وقت مخلوق کو معلوم ہو جائے تو ان کیلئے اپنا اپنا کام کرنا مشکل ہو جائے گا، جب اس کو آنا ہو گا بالکل اچانک اور بے خبری کی حالت میں آئے گی، پیغمبر ایسی باتیں جاننے کی کوشش نہیں کرتے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے خود نہیں بتائیں اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اکثر لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے پوشیدہ رکھنے میں کیا مصلحتیں ہیں؟

جب پیغمبر ﷺ قیامت کا ذکر فرماتے اور لوگوں کو بتاتے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب ہر ایک کو اپنی کارکردگی کا حساب دینا ہو گا تو مشرک لوگ طنز کرتے ہوئے کہتے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو بتاؤ کہ قیامت کب آئے گی؟ ہم نے تو آج تک کسی کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوتے نہیں دیکھا، یہاں بھی اسی طرح کے سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ قیامت کے واقع ہونے کا علم تو میرے رب کے پاس ہے اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو اپنی ذات کے ساتھ خاص رکھا ہے ان میں قیامت بھی شامل ہے قیامت کے واقع ہونے کی خبر تو دے دی گئی ہے اور قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں یہی مضمون بیان کیا گیا ہے، مگر اس کے واقع ہونے کا عین وقت نہیں بتایا گیا، معراج کے واقعہ سے متعلق "ابن ماجہ اور مسند احمد" کی روایت میں آتا ہے کہ جب تمام پیغمبر اکٹھے ہوئے تو ان کے درمیان قیامت کا ذکر بھی ہوا تھا، ہر پیغمبر نے قیامت کے واقع ہونے کے وقت سے لاعلمی کا اظہار فرمایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: قیامت کے واقع ہونے کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقت کے متعلق نہ کسی پیغمبر کو خبر دی ہے اور نہ کسی مقرب

فرشتے کو، البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے زمین پر اتر کر اللہ تعالیٰ کے دشمن دجال کو قتل کروں، قیامت کے قریب کی بعض دوسری نشانیاں بھی بتلائی گئی ہیں، حدیث جبرائیل میں آتا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ایمان، اسلام اور احسان کے بعد جب یہ سوال کیا کہ قیامت کب ہے؟ یعنی : پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتائیں کہ کہ قیامت کب آئے گی؟ تو آپ نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ جس سے یہ سوال کیا جارہا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، یعنی: جس طرح اس بات کا علم پوچھنے والے کو نہیں ہے اسی طرح جواب دینے والے کو بھی نہیں ہے اس بات کی وضاحت "سورۂ لقمان" میں موجود ہے کہ قیامت کے واقعہ ہونے کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہی اس کو اپنے وقت پر ظاہر کرے گا۔

آگے قیامت کے متعلق مزید فرمایا کہ: قیامت کا واقع ہونا آسمانوں اور زمین میں بھاری ہے، بڑی بوجھل ہے کیونکہ جب یہ واقع ہوگی تو ہر چیز کو درہم برہم کردے گی، جیسے: فرمایا کہ: "جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور جب تارے بے نور ہوجائیں گے" غرض! یہ کہ آسمان و زمین کا یہ موجودہ شمسی نظام ختم ہوجائے گا اس نظام کے تمام سیارے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوجائیں گے اس وقت لوگوں پر بڑی دہشت طاری ہوگی، "سورہ الحاقہ" میں موجود ہے کہ "جب صور پھونکا جائے گا تو پہاڑ بادلوں کی طرح چلادیئے جائیں گے اور آسمان پھٹ جائے گا اور فرشتے اس کے کناروں پر اتر آئیں گے پورے کا پورا نظام بدل جائے گا"۔

قیامت بھاری ہے آسمان اور زمین پر تمہارے پاس اچانک آئے گی، قیامت کے اچانک آنے کے بارے میں حدیثوں میں مختلف روایتیں ملتی ہیں، مثلاً: صحیحین "بخاری و مسلم" کی روایت میں آتا ہے کہ دو آدمی کپڑا پھیلائیں گے اور اس کا بھاؤ نہیں طے کرپائیں گے کہ قیامت قائم ہوجائے گی کوئی شخص جانور خریدے گا اس کا دودھ دوہے گا مگر پینے سے پہلے قیامت آجائے گی، پھر فرمایا کہ: ایک شخص کھانا کھانے کیلئے برتن سے لقمہ اٹھائے گا مگر منہ میں نہیں ڈال سکے گا اور قیامت واقع ہوجائے گی۔

یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق اس طرح سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔

قیامت کے بارے میں ایمان والے بھی سوال کرتے تھے تو آپ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے اس کے وقت کو مخلوق سے اس لئے پوشیدہ رکھا ہے تا کہ لوگ ڈرتے رہیں اور نیکی کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہوں وہ ہمیشہ فکرمند رہیں کہ پتہ نہیں قیامت کب آجائے گی؛ اس لئے ہمیں غافل نہیں ہونا چاہئے اور نیکی کرنے میں آگے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ

کہہ دیجئے نہیں مالک ہوں میں لئے جان اپنے کے بھلے کا اور نہ برے کا مگر جو چاہے اللہ اور اگر

كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَا سْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚۛ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚۛ

میں ہوتا جانتا غیب کو تو بہت سمیٹ لیتا سے بھلائیاں اور نہ چھوتی مجھ کو تکلیف

ع ۲۴ / ۱۴ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

نہیں میں مگر ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں (۱۸۸)

معانقة بعد المتأخرين ۱۲

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے کہ! میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور برے کا، مگر جو اللہ چاہیں اور اگر میں غیب کی بات جان لیا کرتا تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھ کو کوئی تکلیف کبھی نہ پہنچتی میں تو بس (دوزخ کا) ڈر اور (جنت کی) خوشخبری سنانے والا ہوں ایماندار لوگوں کو۔(۱۸۸)

تفسیر

آدمی ہر وقت دنیا کے نفع کی تلاش میں رہتا ہے ہر کام کرنے سے پہلے وہ جاننا چاہتا ہے کہ انجام کار اس میں نفع ہوگا یا نقصان، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو لوگوں کو بتانا شروع کیا کہ مرنے کے بعد ہر ایک کے عملوں کا جائزلیا جائے گا اور لوگ اپنے کئے کی سزا بھگتیں گے تو لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ آئندہ کی باتیں بتا رہے ہیں

ان سے پوچھنا چاہئے کہ اس وقت کیا چیز خرید لیں جو آگے چل کر مہنگی ہو جائے جو ذرا اونچے خیال کے تھے انہوں نے قیامت کے بارے میں پوچھنا شروع کیا اس آیت میں آپ کو ان لوگوں کا جواب سکھایا گیا ہے جس میں پیغمبری کی شان پورے طور پر واضح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ پیغمبر کا کام یہ نہیں کہ تم کو تمہارے کاروبار کے نفع و نقصان کی باتیں بتایا کرے یا بڑے بڑے واقعات کا ٹھیک ٹھیک وقت بتایا کرے اس کا کام صرف یہ ہے کہ ایمان والوں کو خوشخبری سنائے اور باقی لوگوں کو ایمان نہ لانے کے نتیجے سے ڈرائے۔

ارشاد ہے کہ: ان سے کہہ دیجئے کہ! مجھے تو اپنے نفع ونقصان کی بھی کچھ خبر نہیں میں تم کو تمہارے نفع و نقصان کے بارے میں کیا بتاؤں گا، اللہ تعالیٰ ہی چاہتے ہیں تو مجھے موقع کے اوپر کسی کام کی بھلائی برائی اور اسکے نفع ونقصان سے آگاہ کر دیتے ہیں۔

لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ : پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اس کا اعلان کر دیں کہ میں اپنے لئے بھی نفع نقصان کا مالک نہیں دوسروں کے نفع نقصان کا تو کیا ذکر ہے؟

اسی طرح یہ بھی اعلان کر دیں کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ہر چیز کا علم ہونا میرے لئے ضروری ہو اور اگر مجھے علم غیب ہوتا تو میں ہر نفع کی چیز کو ضرور حاصل کر لیا کرتا اور کوئی نفع میرے ہاتھ سے فوت نہ ہوتا اور ہر نقصان کی چیز سے ہمیشہ محفوظ ہی رہتا اور کبھی کوئی نقصان مجھے نہ پہنچتا حالانکہ یہ دونوں باتیں نہیں ہیں بہت سے کام ایسے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حاصل کرنا چاہا مگر حاصل نہیں ہوئے اور بہت سی تکلیفیں اور نقصانات ایسی ہیں جن سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچنے کا ارادہ کیا مگر وہ تکلیفیں اور نقصانات پہنچیں، حدیبیہ کی جنگ کے موقع پر آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ احرام باندھ کر عمرہ کا ارادہ کر کے حرم کی حدود تک پہنچ گئے مگر حرم میں داخلہ اور عمرہ کی ادائیگی اس وقت نہ ہو سکی سب کو احرام کھول کر واپس ہونا پڑا۔

اسی طرح احد کی جنگ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زخم پہنچا اور مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی اسی طرح کے اور بہت سے واقعے ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں معروف ومشہور ہیں اور شاید ایسے واقعے کے ظاہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہو کہ لوگوں پر عملاً یہ بات واضح کر دی جائے کہ پیغمبر علیہم السلام اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ

مقبول اور افضل مخلوق ہیں مگر پھر بھی وہ غیب نہیں جانتے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا یہ مفہوم بنتا ہے کہ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے خوشی بھی پہنچتی ہے اور رنج بھی، تکلیف بھی ہوتی ہے اور آرام بھی ملتا ہے، ہاں! البتہ مجھے یہ کام سپرد کیا گیا ہے کہ تمہیں ایسے کاموں سے ڈراؤں جن کا نتیجہ مرنے کے بعد تمہارے لئے برا ہوگا اور جو ایمان لے آئیں ان کو خوشخبری دے دوں کہ ان کا انجام بہت اچھا ہوگا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک بشر سے بہت زیادہ علم عطا فرمایا ہے لیکن وہ آخرت کی بھلائی سے متعلق زیادہ ہے، دنیا کے بارے میں آپ کو یہ حکم ہے کہ لوگوں سے کہہ دیں کہ میرا علم اپنا ذاتی علم نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے میں تم سے اپنی طرف سے کچھ کہنا نہیں چاہتا تم سے وہی بات کہوں گا جس کے کہنے کا اللہ تعالیٰ مجھے حکم دیں گے اس کے سوا مجھے کچھ علم نہیں۔

انسان کی نسل

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا

وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو سے نفس ایک اور بنایا سے اسی جوڑا اس کا

لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ

تا کہ سکون پائے پاس اسکے پس جب چھا گیا اس پر اٹھایا اس نے بوجھ ہلکا پس لئے پھری اس کو

فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ

پس جب بھاری ہوگئی پکارا دونوں نے اللہ رب اپنے کو البتہ اگر دیا آپ نے ہم کو اچھا بچہ تو ضرور ہوں گے ہم

مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۱۸۹﴾

میں سے شکر کرنے والوں (۱۸۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ وہی ہے جس نے تم کو ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ اس سے سکون حاصل کرے، پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانپا (یعنی: صحبت کی) تو ہلکا سا حمل رہا تو اس کو لیئے

چلتی پھرتی رہی تو پھر بوجھل ہوگئی تو دونوں نے اللہ، یعنی: اپنے رب کو پکارا، اگر آپ ہم کو صحیح سلامت بچہ دے دیں تو ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ (۱۸۹)

تفسیر

اس آیت میں انسان کی پیدائش کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا پھر ان کے آرام اور سکون کیلئے انہی میں سے ان کے جوڑے حوا کو نکالا، پھر اس کے بعد مرد وعورت کے ملاپ سے اولاد پیدا ہونے کا سلسلہ جاری کیا۔

ارشاد ہے کہ: ہم نے تمام انسانوں کو ایک ہی نفس حضرت "آدم" سے پیدا کیا اور انہی کے اندر سے ان کی بیوی "حوا" کو بنایا تا کہ وہ ان کے ساتھ آرام وسکون سے رہے سہے، اس کے بعد پیدائش کا سلسلہ جاری ہوا پہلے مرد وعورت کے پاس اپنی فطری خواہش سے جاتا ہے عورت ابتداء میں تھوڑا سا بوجھ اپنے اندر اٹھاتی ہے اور معمول کے مطابق چلتی پھرتی بیٹھتی اٹھتی اور کام کاج کرتی رہتی ہے۔

جب حمل کو کچھ دن گزر جاتے ہیں تو پیٹ کا بوجھ بڑھ جاتا ہے دونوں اپنے رب کے سامنے اس تمنا کا اظہار کرتے ہیں کہ ہمارے رب! ہمیں ایک تندرست اور صحیح سالم بچہ عنایت کیجئے ہم آپ کے شکر گزار رہیں گے۔

حضرت "حوا" کی پیدائش کے متعلق آتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سوئے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی پسلی سے حضرت "حوا" کو پیدا فرمایا، دراصل جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو وہ جنت میں اکیلے تھے کوئی ان کا ہم جنس نہ تھا جس کی وجہ سے انہیں گھبراہٹ ہوتی تھی اور بے اطمینانی کی سی کیفیت تھی اس بے سکونی کی حالت کو تبدیل کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے "حوا" کی صورت میں ان کا جوڑا پیدا کیا تا کہ حضرت آدم علیہ السلام حوا سے سکون حاصل کریں، چنانچہ جب آپ نیند سے بیدار ہوئے تو "حوا" آپ کے پاس موجود تھیں، جنہیں پا کر آپ کو سکون ہوا۔

شرک کی آفت

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ
پس جب دیا ان دونوں کو صحیح سالم بچہ تو ٹھہرانے لگے اسکے شریک اس میں جو اس نے دیا انہیں پس بلند ہے اللہ
عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾
اس سے جو وہ شریک کرتے ہیں (۱۹۰) کیا شریک کرتے ہیں اسکو جو نہیں پیدا کرتے کوئی چیز اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں (۱۹۱)
وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾
اور نہیں طاقت رکھتے ان کی مدد کی اور نہ خود اپنی ہی مدد کرتے ہیں (۱۹۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر جب ان کو صحیح سالم بچہ دیا تو اس کی بخشی ہوئی چیز میں اس کیلئے شریک بنانے لگے، سو! اللہ ان کے شریک بنانے سے برتر ہے۔ (۱۹۰) کیا اس کو اس کا شریک بناتے ہیں جو ایک چیز بھی پیدا نہ کریں اور خود پیدا کیے گئے ہوں۔ (۱۹۱) اور وہ ان کی مدد نہیں کر سکتے اور نہ خود اپنی مدد کرتے ہیں۔ (۱۹۲)

تفسیر

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے بعض خاص خاص چیزیں صرف اسی لیئے پیدا کی ہیں کہ وہ انسان کو اپنے رب کے پہچاننے کا طریقہ سکھائیں یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اور اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں لیکن عام طور پر جو بات بھی انسان سے تعلق رکھتی ہے اس کے اندر غور کرنے والوں کیلئے ایسی نشانیاں موجود ہیں جن سے وہ اپنی عقل سے مدد لے کر اپنے رب کو پہچان سکتا ہے، رب کے صحیح طور پر پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اس کی ذات اور صفات میں یکتا مانا جائے اور کسی چیز کو اس کی کسی چیز میں ساتھی شریک یا حصہ دار نہ ٹھہرایا جائے ان آیتوں میں انسان کی پیدائش کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس میں بھی رب کے پہچاننے اور اس کا شریک کسی کو نہ ماننے کا راستہ بالکل صاف دکھائی دے رہا ہے، انسان کی پیدائش چار طریقوں سے ہو سکتی تھی:

(۱)....بغیر ماں باپ کے، جیسے: حضرت آدم علیہ السلام۔

(۲)....بغیر ماں کے، جیسے: حوا۔

(۳)....بغیر باپ کے، جیسے: حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔

(۴)....مرد و عورت کے ملاپ سے۔

دنیا میں تین صورتوں کی تو ایک ایک مثال دکھادی، چوتھی صورت کو خاص خاص طور پر سمجھایا گیا اس میں ہمبستری اور عمل کی تمام منزلوں میں انسان اپنے اندر پیدائش کی کوئی طاقت اور اختیار نہیں رکھتا اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف اُمید کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ بچہ صحیح تندرست چاق و چوبند ہو، لیکن جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کو بھول کر بچہ کی پیدائش میں اوروں کا اثر ماننے لگتا ہے۔

ارشاد ہے کہ: سب کچھ تو ہم نے کیا اور جب کام ہو گیا تو تم دوسروں کا نام لگانے لگے یہ کس قدر بے انصافی کی بات ہے اس کا وبال خود انسان کے اپنے اوپر پڑتا ہے، اسے سوچنا چاہئے کہ کیا ایسی چیزیں جو خود پیدا کی ہوئی ہیں اور کسی چھوٹی سی چیز کو بھی پیدا نہیں کر سکتیں اللہ تعالیٰ کے برابر قوت والی ٹھہرائی جا سکتی ہیں پیدا کرنا تو الگ وہ تو کسی کی ذرا بھی مدد نہیں کر سکتیں اور نہ اپنی آپ مدد کر سکتی ہیں۔

احکام و مسائل

مسئلہ (۱):.... بچوں کے ایسے نام رکھنا جن سے مشرکانہ مفہوم لیا جا سکتا ہو، چاہے نام رکھنے والوں کی نیت یہ نہ ہو وہ بھی ایک مشرکانہ رسم ہونے کے سبب بڑا گناہ ہے، جیسے: عبد الرسول، عبد المصطفیٰ، پیراں دتہ وغیرہ نام رکھنا، یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی اولاد میں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا ہے۔

مسئلہ (۲):.... بچوں کے نام رکھنے میں بھی شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نام اللہ و پیغمبر کے ناموں پر رکھے جائیں؛ اسی لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد الرحمن، عبد اللہ وغیرہ کو زیادہ پسند فرمایا ہے۔

افسوس ہے کہ! آج مسلمانوں میں سے یہ رہی سہی اسلامی رسم بھی ختم ہوتی جا رہی ہے، اول تو نام ہی غیر

اسلامی رکھے جاتے ہیں اور جو کہیں ماں باپ نے اسلامی نام رکھ بھی دیئے تو ان کو بھی انگریزی کے مخفف حروف میں منتقل کر کے ختم کر دیا جاتا ہے، سیرت وصورت سے تو کسی کو مسلمان سمجھنا پہلے ہی مشکل ہو چکا تھا ناموں کے اس نئے طرز نے اسلام کی اس آخری علامت کو بھی رخصت کر دیا، اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی سمجھ اور محبت عطا فرمائے۔ آمین

بُت تمہاری نہیں سنتے

وَ اِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَى الۡهُدٰى لَا يَتَّبِعُوۡكُمۡ‌ؕ سَوَآءٌ عَلَيۡكُمۡ

اور اگر پکارو تم ان کو طرف ہدایت کے نہ پیروی کریں وہ تمہاری برابر ہے پر تم

اَدَعَوۡتُمُوۡهُمۡ اَمۡ اَنۡتُمۡ صَامِتُوۡنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ

کہ پکارو تم ان کو یا تم چپ رہو (۱۹۳) بیشک جن کو پکارتے ہو تم سے

دُوۡنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمۡثَالُكُمۡ‌ فَادۡعُوۡهُمۡ فَلۡيَسۡتَجِيۡبُوۡا لَـكُمۡ اِنۡ

سوا اللہ کے بندے ہیں تم جیسے پس پکارو ان کو پس چاہئے کہ وہ مانیں تمہاری اگر

كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾

تم ہو سچے (۱۹۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر تم ان کو سیدھے راستہ کی طرف پکارو تو تمہاری پکار پر نہ چلیں، برابر ہے تمہارے لئے کہ ان کو پکارو یا چپ رہو۔ (۱۹۳) جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہارے جیسے بندے ہیں، بھلا پکارو تو ان کو بس چاہئے کہ وہ تمہارے پکارنے کو قبول کریں اگر تم سچے ہو۔ (۱۹۴)

تفسیر

اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور چیزوں کو شریک ٹھہرانے والے سوچ فکر سے کچھ کام نہیں لیتے، جانداروں کو تو

شریک ٹھہراتے ہی ہیں بعض وقت بے جان بتوں کو بھی اللہ تعالیٰ کا ساتھی اور شریک سمجھنے لگتے ہیں ایسے لوگ اور بھی زیادہ سزا کے قابل ہیں، اس آیت میں ان کو سمجھایا گیا ہے، ارشاد ہے کہ: یہ جو تم بے جان چیزوں اور اپنے ہاتھ سے گھڑے ہوئے بتوں کو اپنا حاجت روا سمجھتے ہو ان میں تو اتنی طاقت بھی نہیں کہ تمہاری آواز سن سکیں اگرچہ تم ان کے آنکھ، کان اور ناک وغیرہ بنا دیتے ہو لیکن جب ان کے اندر سننے، دیکھنے وغیرہ کی طاقت ہی نہیں تو ان کے بنا دینے سے کیا فائدہ ان کا پکارنا برابر ہے کہ پکارا کرو یا چپکے کھڑے رہو دونوں حالتیں ایک جیسی ہیں کوئی فرق نہیں اس کے بعد ایک عام قاعدہ بیان کر دیا جس میں سب چیزیں بے جان، جان دار، بت، صنم اور مورتیاں آ گئیں۔

فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کے سوا تم جس چیز کو بھی پکارو گے وہ مخلوق ہوگی اور اس لئے اپنے خالق کی تابعدار ہوگی ہر مخلوق تمہاری ہی طرح اللہ تعالیٰ کے آگے عاجز اور بے طاقت ہے بلکہ بعض چیزیں تو تم سے بھی گئی گزری ہیں ان کو معبود بنا لینا اور ان کے اندر کچھ دینے یا چھین لینے کی قوت مان لینا انتہائی نادانی ہے اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ یہ کام کر سکتے ہیں تو بھلا انہیں پکار کر دیکھو، اب اگر ان میں کچھ بھی طاقت ہے تمہاری پکار سن کر انہیں تمہاری مدد کرنی چاہئے اور تمہاری فریاد پوری کرنے کیلئے فوراً آنا چاہئے، حالانکہ وہ تمہاری پکار کا کچھ بھی جواب نہیں دیتے انسان ایک زمانے میں اس قدر غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ دکھ، سکھ مصیبت ڈالنا، آرام دینا، کھانے پینے کی چیزوں کا مہیا کرنا سب کچھ بتوں کے اختیار میں سمجھتا تھا، پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں کو سچ مچ اس بات سے ڈرایا کہ اگر تم اپنی باتیں نہ چھوڑو گے تو یہ بت تمہیں کسی سخت مصیبت میں پھنسا دیں گے خود مکہ کے کافروں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بتوں کے غضب سے ڈرایا بلکہ آج تک بھی ایسے نادان لوگ موجود ہیں جو بتوں سے ڈرتے ہیں اور انہی کو ہر چیز دینے والا سمجھتے ہیں۔

جن کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو وہ تو تمہاری طرح بندے ہیں جس طرح تم پیدا کیے گئے ہو اسی طرح وہ بھی پیدا کیے گیے ہیں تم بھی خدا کے سامنے عاجز ہیں جس طرح تم ہر چیز کے محتاج ہو اسی طرح وہ بھی محتاج ہیں اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمادی ہے آسمان و زمین کی ہر چیز اپنی ہر ضرورت کیلئے اسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہے

تمام مخلوق مانگنے والی ہے اور دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، انسان، اولاد، دولت اور اقتدار مانگتے ہیں فرشتے اللہ تعالیٰ کا قرب مانگتے ہیں اور اس کی رضا کے طلب گار ہوتے ہیں، فرمایا: جب ہر چیز اسی سے مانگتے ہیں تو پھر تم ان کو شریک کیسے بناتے ہو جو خود عاجز اور محتاج ہیں۔

بُت کچھ نہیں کر سکتے

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ
کیا انکے پاؤں ہیں وہ چلتے ہیں جن سے یا ان کے ہاتھ ہیں وہ پکڑتے ہیں جن سے یا

لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ
ان کی آنکھیں ہیں وہ دیکھتے ہیں جن سے یا ان کے کان ہیں وہ سنتے ہیں جن سے کہہ دیجئے

ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾
بلالو شریکوں اپنے کو پھر مکر چلاؤ میرے ساتھ پس نہ مہلت دو مجھ کو (۱۹۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں، آپ کہہ دیجئے! اپنے شریکوں کو پکارو، پھر جو کچھ تم میرے خلاف سازش کرنا چاہتے ہو تو کر گزرو اور مجھ کو مہلت بھی نہ دو۔ (۱۹۵)

تفسیر

اس آیت میں بتوں کی بے بسی کا ذکر ہے مشرکوں پر تعجب ہے کہ وہ بتوں کی شکل جانداروں کے نمونے پر گھڑ لیتے ہیں اور ان کے ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، کان سب کچھ بنا دیتے ہیں لیکن کیا وہ ان مصنوعی اعضاء سے جانداروں کی طرح کام لے سکتے ہیں اگر سوچا جائے تو وہ ان سے بھی زیادہ عاجز ہیں یہ اپنے اعضاء سے جو کام لینا ہونے سکتے ہیں اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

ارشاد ہے کہ: ذرا ان سے پوچھو تو کہ یہ بت جو تم نے بنائے ہیں کہ مانا کہ تم ان کے ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، کان بھی بنا دیئے ہیں لیکن کیا وہ ان سے اصل اعضاء کا کام لے سکتے ہیں، پاؤں سے چل سکتے ہیں؟ ہاتھوں سے پکڑ سکتے ہیں؟ آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں؟ کانوں سے سن سکتے ہیں؟

ان کے پاس تو کچھ بھی نہیں پھر وہ تمہاری پکار سن کر تمہاری مدد کیسے کر سکتے ہیں، "سورۂ حج" میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تم جن کو پکارتے ہو وہ تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اور مکھی کوئی چیز ان سے چھین لے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے اس بات کے کیا کہنے کی وہ تمہاری فریاد کو پہنچیں۔

افسوس ہے تمہاری عقل پر! اور اس پر مزید یہ کہ تم مجھے ان سے ڈراتے ہو گویا یہ باوجود کھلم کھلا بے بسی کے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں تمہیں اختیار ہے کہ تم دھوکے میں پھنسے رہو لیکن میری تو ظاہری اور باطنی آنکھیں اللہ تعالیٰ نے کھول دی ہیں مجھے تو صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے ہیں تم سے کھلم کھلا کہتا ہوں کہ تم ان سب کو بلا لو اور میرے ستانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو، دیکھیں! یہ میرا کیا کر لیں گے کمزور عقیدے والے لوگ ایسا کھلا چیلنج نہیں دے سکتے ان پر بتوں کے گرد پیدا کیے ہوئے ماحول کا اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ وہ سچ مچ ڈرنے لگتے ہیں کہ خبر نہیں کچھ ہو ہی نہ جائے ان پر وہمی اور خیالی باتوں کا اتنا اثر ہو جاتا ہے کہ ان کی سمجھ بالکل جواب دے دیتی ہے۔

حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام سے بھی مشرکوں نے یہی کہا تھا کہ ہمارے معبودوں نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے تم باز نہیں آتے اور بہکی بہکی باتیں کرتے ہو (نعوذ باللہ)، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ایسی باتوں کا یہی جواب ہے کہ تم اپنے تمام معبودوں کو اکٹھا کر لو اور پھر جو تدبیر میرے خلاف کرنا چاہتے ہو کر لو میں کسی سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔

خدا تعالیٰ نگہبان ہیں کسی کی مخالفت بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا تمہارے معبود بے بس ہیں اگلی آیتوں میں شرک کی مزید مذمت بیان کی جا رہی ہے۔

ایمانی قوت

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَ هُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹۶﴾
یقیناً ساتھی میرا اللہ ہے جس نے اتاری کتاب اور وہ سنبھالتا ہے نیک بندوں کو (۱۹۶)
وَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَ لَاۤ
اور جن کو پکارتے ہوتم سے سوااسکے نہیں طاقت رکھتے مدد تمہاری کی اور نہ
اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَسْمَعُوْا ؕ
جانوں اپنی کی مدد کرسکتے ہیں (۱۹۷) اور اگر بلائیں آپ ان کو طرف ہدایت کے نہ سنیں وہ
وَ تَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَ هُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾
اور دیکھتے ہیں آپ انکو آنکھیں کئے ہوئے ہیں طرف آپ کی حالانکہ وہ نہیں دیکھ رہے (۱۹۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ میرا ساتھ تو اللہ ہے جس نے کتاب اتاری اور وہ نیک بندوں کی حمایت کرتا ہے۔ (۱۹۶) اور جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کرسکتے اور نہ اپنی جان بچا سکتے۔ (۱۹۷) اور اگر آپ ان کو پکاریں ہدایت کی طرف تو کچھ نہ سنیں اور آپ ان کو دیکھتے ہیں کہ (گویا کہ وہ) آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ نہیں دیکھ رہے۔ (۱۹۸)

تفسیر

ان آیتوں میں یقین واطمینان کی اس قدر قوت بھری ہوئی ہے کہ جس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے، پچھلی آیتوں میں یہ کہہ کر کہ یہ تمہارے بت جنہیں تم نے اپنا معبود بنا رکھا ہے کوئی طاقت نہیں رکھتے، ان آیتوں میں ارشاد ہے کہ: میرا مددگار، میرا ساتھی، میری حمایت کرنے والا اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے وہ ان بتوں کی طرح معاذ اللہ سننے، دیکھنے اور پکڑنے سے عاجز نہیں ہے، وہ اپنے بندوں کیلئے حکم جاری کرتا ہے، ان کی فریاد

سنتا ہے ان کے پاس ہر وقت موجود ہے، نافرمانوں کو سزا دیتا ہے، وہ سارے سمجھ دار لوگوں کے جو اس کا سہارا لیتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہ کچھ التجا کرتے ہیں اور نہ کسی کی مدد کی توقع رکھتے ہیں اپنی رحمت سے سارے کام آسان کر دیتا ہے میں نے بھی سب کو چھوڑ کو اسی کا آسرا ڈھونڈا وہ میری حفاظت اور مدد کرے گا تم یا تمہارے معبود میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کو ان کو تم فضول پکارتے ہو یہ تمہاری ذرا مدد نہیں کر سکتے تمہاری مدد تو کیا کرتے ان کو اپنا ہی کچھ ہوش نہیں ہے ابھی کوئی چاہے تو ان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے یہ اپنے آپ کو بچانے کیلئے بھی کچھ نہیں کر سکتے تم ان کو کوئی ہدایت کر کے دیکھو یہ تمہاری ذرا بھی نہ سنیں گے تمہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیکھ رہے ہیں مگر ان کی آنکھوں میں دیکھنے کی قوت کہاں وہ تو تم نے ہاتھوں سے ایک نشان بنا دیا ہے۔

”سورۂ بقرہ“ میں اس مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ایمان والوں کا کام بنانے والا ہے جو انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور کافروں کا دوست شیطان ہے جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتا ہے، ایمان والے چونکہ صحیح عقیدہ پر ہوتے ہیں؛ اس لئے ان کی حفاظت اللہ تعالیٰ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی ان کے کام بناتے ہیں، چنانچہ میرا کام بنانے والا بھی وہی اللہ ہے، اس نے ہمارے لئے کتاب اتار کر ہدایت کا سامان مہیا کر دیا ہے اور ہدایت ایک ایسی چیز ہے کہ ہر انسان زندگی کے ہر موڑ پر اس کا سب سے زیادہ محتاج ہے اور پھر اس قرآن کریم کی صفت یہ ہے کہ یہ لوگوں کیلئے ہدایت ہے، اللہ تعالیٰ کا کلام زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی کرتا ہے اور تمام مشکلوں کے حل کا ذریعہ ہے اگر اس پر ایمان لا کر عمل کیا جائے تو انسان کی زندگی سنور سکتی ہے، انسان کا اخلاق درست ہو سکتا ہے اور اس کی فکر پاک ہو سکتی ہے اسی قرآن کریم کی بدولت آدمی کے عمل درست ہو سکتے ہیں اور انسانی زندگی ایک کارآمد زندگی میں تبدیل ہو سکتی ہے بہر حال اللہ تعالیٰ نے انسان کو بیکار نہیں چھوڑا بلکہ اپنی عظیم کتاب اتار کر اس کی ہدایت کا سامان مہیا کر دیا ہے؛ اسی لئے فرمایا کہ میرا کام بنانے اور سنوارنے والا وہ اللہ رب العزت ہے جس نے کتاب اتاری ہے۔

خدا تعالیٰ نہ صرف میرا کام بنانے والا ہے بلکہ وہ تمام نیکو کاروں کا کام بنانے والا ہے اور ان کی

کامیابی اور ہدایت کا سامان مہیا کرتا ہے مگر مشرکوں کو وہ سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتا، صالح اس شخص کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور بندوں دونوں کے حقوق ادا کرتا ہے، اسی طرح قرآن کریم میں "ابرار" اور "مقربین" کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

آگے مشرکوں کے معبودوں کے متعلق فرمایا کہ: جن کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہاری مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے جن کو تم مدد کیلئے پکارتے ہو وہ سب مخلوق ہیں، خواہ پیغمبر ہوں یا فرشتے، عام انسان ہوں یا پتھر کے بت اور درخت ہوں یا پتھر وہ تمہاری مدد کرنے کے قابل نہیں ہیں، مدد تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا لہٰذا ان جھوٹے خداؤں کو آوازیں دینا بیکار ہے۔

اور اگر تم انہیں ہدایت کی طرف پکارو تو وہ تو سنتے ہی نہیں، درخت، پتھر وغیرہ بے جان چیزیں تو ویسے ہی دیکھنے، سننے سے محروم ہیں اور جاندار بھی ہوں تو انہیں تو علم ہی نہیں کہ کوئی پکار رہا ہے تو وہ کیا سنیں گے اور کیا مدد کریں گے، جھوٹے خداؤں کے متعلق فرمایا: اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں، حالانکہ وہ نہیں دیکھتے، مشرک لوگ بتوں کے تمام اعضاء بناتے تھے حتیٰ کہ ان کی آنکھیں اس طرح نظر آتی تھیں گویا کہ وہ پوجا کرنے والے کو دیکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: حقیقت میں وہ کچھ نہیں دیکھتے کیونکہ ان میں دیکھنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں ہے اور اگر اس سے کافر اور مشرک مراد لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ منکرین لوگ ظاہر میں جسمانی آنکھوں سے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتے ہیں مگر حقیقت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اگر دل کی آنکھوں سے دیکھیں تو ضرور آپ کو پہچان لیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے پیغمبر ہیں یہ لوگ سمجھ جائیں کہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہمارا بھلا چاہنے والا ہے اور ہمیں خدا تعالیٰ کے عذاب سے بچانا چاہتا ہے مگر وہ حقیقت میں دیکھتے ہی نہیں اس لئے ناکام ہیں، ابوجہل، امیہ بن خلف اور ابولہب جیسے ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود آپ کو نہ پہچان سکے اور نامراد ہوئے، جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حقیقت کی آنکھوں سے دیکھ لیا او وہ کامیاب ہوگئے۔

ہٹ دھرموں کیساتھ سلوک

خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَ اِمَّا

اختیار کیجئے درگزر کو اور حکم دیجئے بھلائی کا اور منہ پھیر لیجئے سے جاہلوں (۱۹۹) اور اگر

یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۰۰﴾

چھیڑے آپ کو سے شیطان کوئی وسوسہ پس پناہ مانگئے اللہ کی تحقیق وہ ہے سننے والا جاننے والا (۲۰۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ درگزر کرتے رہئے اور نیک کام کرنے کا حکم کیجئے اور جاہلوں سے کنارہ کیجئے۔(۱۹۹)

اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پہنچے تو اللہ کی پناہ مانگئے وہی سننے والا جاننے والا ہے۔(۲۰۰)

تفسیر

اللہ تعالیٰ اس آیت میں دوست کارساز اور کام بنانے والا ہونے کی حیثیت سے آپ کو ہدایت کرتے ہیں کہ آئندہ کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے، ارشاد ہے کہ: اے پیغمبر! درگزر اور برداشت سے کام لیجئے، سچی بات کہئے اور انسانیت کے کام کرنے کی تاکید کئے جایئے اگر مخالف جہالت اور اکڑپن پر اتر آئیں تو ان کا جواب نہ دیجئے اور اس سے جو کوفت ہو اسے برداشت کیجئے، اگر کبھی شیطان اس بات پر اُکسائے کہ لوگ آپ کی بے عزتی کر رہے ہیں ''ان کی گالیوں کا جواب گالیوں سے دیں'' انسان ہونے کے ناطے آپ کے دل میں بھی اس وسوسہ کے اثر کا خوف ہو تو فوراً اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ لیجئے وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، ان کی گستاخیوں کا جواب نہ دیجئے۔

امام تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: کنارہ کش ہونے کا بھی مطلب یہ ہے کہ ان کی برائی کا جواب برائی سے نہ دیں، یہ معنیٰ نہیں کہ ان کو ہدایت کرنا چھوڑ دیں کہ یہ پیغمبری کی شایان نشان نہیں۔

آپ اپنے کام سے کام رکھیئے یہ اتنی بڑی کام کی بات ہے کہ اس سے زندگی کے بڑے بڑے مسئلے حل ہوتے ہیں، انسان جب موقعہ ملے سچی بات کے اور نیک کام کرنے کا حکم دے، مخالفوں کو بھڑکانے والوں کا

جواب صبر وتحمل سے دے اپنی طرف سے لڑائی کا موقعہ نہ دے اگر اس سے بھی نہ مانیں تو ایک دن فیصلے کا آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی مدد صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوگی۔

عمدہ اخلاق کے سلسلے میں قرآن کریم میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ معاف کرنے کی عادت ڈالیں اور مخالفوں سے نہ الجھیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں بھی آتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نہ بری بات کرتے تھے اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے تھے بلکہ آپ لوگوں کو معاف فرمادیتے تھے، بہر حال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپ ان لوگوں کی اُلٹی سیدھی باتوں کو دل پر نہ لیں بلکہ معافی کو اپنائیں۔

"مسند احمد" کی روایت میں آتا ہے کہ انسان کے ساتھ شیطان کی ضرور چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے وہ انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے جب کوئی شخص نیکی کے راستے پر جانا چاہتا ہے تو شیطان اس کے راستے میں آکر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے دل میں برے خیال ڈال کر اسے راستے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کو بھی شیطان کے برے ارادوں سے آگاہ فرمادیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ: شیطان کے وسوسوں میں سراسر برائی ہوتی ہے یہ حق کو جھٹلاتا ہے اور برائی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرشتے بھی انسان کے دل میں خیالات ڈالتے ہیں جن میں نیکی اور سچائی کی ترغیب ہوتی ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے کہ: جب کوئی شخص اپنی طبیعت میں برائی محسوس کرے تو اس وقت اسے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا چاہئے اور برے خیالوں کو شیطان کی چھیڑ خانی سمجھنا چاہئے اور اگر انسان کے دل میں اچھے خیال آئیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، کیونکہ اچھی باتیں اللہ تعالیٰ کے فرشتے دل میں ڈالتے ہیں، بہر حال فرمایا کہ: اگر شیطان کی طرف سے کوئی ابھار ہو تو اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کیلئے کئی ایک الفاظ سکھائے ہیں، جیسے:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ: پناہ مانگتا ہوں میں اللہ کی شیطان مردود سے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ: نیکی میں لگانے والی اور برائی سے بچانے والی ذات اللہ ہی کی ہے۔

وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾

ترجمہ: اور کہیے اے اللہ! میں شیطانوں کے وسوسے اور ان کی حاضری سے پناہ مانگتا ہوں۔

امام تفسیر ابن جریر طبری نے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے آیت کا مطلب، پوچھا حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کرنے کے بعد یہ مطلب بتایا کہ اس آیت میں آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص آپ پر ظلم کرے آپ اس کو معاف کردیں اور جب آپ کو کچھ نہ دے آپ اس پر بخشش کریں اور جو آپ سے تعلق توڑے آپ اس سے تعلق جوڑیں۔

اس جگہ ابن مردویہ نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ احد کی جنگ میں جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا اور بڑی بے دردی سے ان کے اعضاء کاٹ کر لاش کی بے حرمتی کی گئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے لاش کو اس حالت میں دیکھ کر فرمایا کہ جن لوگوں نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے میں ان کے ستر آدمیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کر کے چھوڑوں گا، اس پر یہ آیت اتری جس میں آپ کو بتلایا گیا کہ آپ کا یہ مقام نہیں، آپ کے شایانِ شان یہ ہے کہ معافی سے کام لیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اخلاق ہمیشہ اسی طرح رہے جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور آپ کے جانی دشمن آپ کے قبضہ میں آئے تو آپ نے سب کو آزاد کر کے فرمادیا کہ تمہارے ظلم کا بدلہ لینا تو کیا ہم تمہیں پچھلے معاملوں پر ملامت بھی نہیں کرتے، "صحیح بخاری" میں ایک جگہ ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں عیینہ ابن حصین مدینہ میں آیا اور اپنے بھتیجے حر ابن قیس رضی اللہ عنہ کا مہمان ہوا، حضرت حر بن قیس ان حضرات میں سے تھے جو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شوریٰ کی مجلس میں شریک ہوا کرتے تھے، عیینہ نے اپنے بھتیجے حر بن قیس سے کہا کہ تم امیر المؤمنین کے قریبی ہو میرے لئے ان سے ملاقات کا کوئی وقت لے لو حر بن قیس رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ میرا چچا عیینہ آپ سے ملنا چاہتا ہے آپ نے اجازت دے دی مگر عیینہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مجلس میں پہنچ کر نہایت غیر مہذب اور غلط گفتگو کی نہ آپ ہمیں ہمارا پورا حق دیتے ہیں نہ ہمارے ساتھ انصاف کرتے ہیں، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

کو اس پر غصہ آیا تو حر بن قیس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا امیر المومنین اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: "خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ" اور یہ شخص بھی جاہلوں میں سے ہے، یہ آیت سنتے ہی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا سارا غصہ ختم ہو گیا اور اس کو کچھ نہیں کہا، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ عادت مشہور تھی کہ کتاب اللہ کے حکم کے آگے سر جھکا لیتے تھے۔

حدیث شریف میں ہے کہ دو شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جھگڑ رہے تھے اور ایک شخص غصہ سے بے قابو ہو رہا تھا آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا: میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ شخص وہ کلمہ کہہ لے تو اس کا یہ غصہ جاتا رہے، فرمایا: وہ کلمہ یہ ہے: "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" اس شخص نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن کر فوراً یہ کلمہ پڑھ لیا تو فوراً ہی اس کا سارا غصہ ختم ہو گیا۔

شیطان کے پھندے

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا

بیشک جو لوگ بچتے ہیں جب چھوتا ہے انکو کوئی گزرنے والا سے شیطان جبھی سنبھل جاتے ہیں

فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ

پس فوراً وہ سمجھ لیتے ہیں (۲۰۱) اور بھائیوں شیطان کے کو کھینچتے ہیں شیطان انکو میں گمراہی

ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

پھر وہ نہیں کوتاہی کرتے (۲۰۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جن کے دل میں ڈر ہے جہاں ان پر شیطان کا گزر ہوا وہ چونک گئے، پھر اس وقت ان کو سمجھ آجاتی ہے۔ (۲۰۱) اور جو شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچنے میں کمی نہیں کرتے۔ (۲۰۲)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: جو لوگ اللہ تعالیٰ کا حکم مانتے ہیں ان پر جب کوئی شیطان اپنا اثر ڈالتا ہے تو وہ فوراً سنبھل جاتے ہیں اور انہیں فوراً یاد آ جاتا ہے کہ ہمیں شیطان سے بچنے کا حکم ہے، اتنا یاد آتے ہی ان کی سمجھ میں یہ بات یاد آ جاتی ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہئے، فوراً وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ ہم میں تو اس کے مقابلے کی طاقت نہیں سب کچھ آپ ہی عطا کرتے ہیں، ہمیں قوت دیجئے کہ ہم اس کے بہکاوے میں نہ آئیں، "لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کا یہی مطلب ہے اور شیطانی وسوسہ کا بہترین توڑ بھی، لوگ ایمان کے کمزور ہیں ان پر شیطان کا داؤ چل جاتا ہے اور وہ ان کی گمراہی کو بھول بھلیاں میں پھنسا دیتا ہے جہاں سے ان کا نکلنا بغیر کسی جاننے والے کی مدد کے بہت مشکل ہے؛ اس لئے انہیں اپنے خیر خواہوں کے کہنے پر چلنا ضروری ہے۔

فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ: پس وہ اچانک سمجھدار ہوجاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ دل میں خدا کا خوف رکھنے والے لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب ان کے خیالوں پر شیطان کا حملہ ہوتا ہے تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کرنے کیلئے اس کے ذکر میں مصروف ہوجاتے ہیں اور اس طرح وہ شیطان سے بچنے کیلئے اس طرح محفوظ ہوجاتے ہیں جس طرح کوئی قلعہ میں محفوظ ہوجائے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے کہ: سوتے وقت جب انسان کے جسم کے تمام راستے بند ہوجاتے ہیں تو شیطان اس کی ناک پر آ کر بیٹھ جاتا ہے اور وہاں سے آدمی کے دل پر پھونکیں مارتا ہے پھر سونے والا اگر رات کو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہے شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اس کے وسوسے اثر نہیں کرتے اور اگر سونے والے شخص نے سونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کیا، یعنی: نماز بھی ادا نہیں کی وہ سوتا رہا حتیٰ کہ فجر طلوع ہوگئی پھر سورج نکل آتا ہے اور سونے والا سویا رہتا ہے تو پھر شیطان اس کے کان میں پیشاب کر کے چلا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کامیاب ہوگیا ہوں کیونکہ میں نے اس شخص کو رات بھر خدا تعالیٰ کے ذکر سے غافل رکھا، بہرحال فرمایا

کہ: شیطان کے وسوسے ڈالنے کا علاج اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ: پھر وہ اس معاملہ میں کوتاہی بھی نہیں کرتے بلکہ برائی سے روکنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں اور گمراہی کی طرف لانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، "سورۂ زخرف" میں بھی آتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ذکر سے منہ موڑتا ہے ہم اس پر شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور پھر وہ عمر بھر اسے گمراہی میں مبتلا رکھتا ہے حتیٰ کہ موت کے وقت افسوس کرتا ہوا شیطان سے کہتا ہے کہ کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا فاصلہ ہوتا، میں نے تیری بات کیوں مانی تو بہت برا ساتھی ہے مگر اس وقت کا افسوس کرنا کسی کام نہ آئے گا، غرضیکہ شیطان انسان کو ہمیشہ گمراہی کی طرف لگائے رکھتے ہیں۔

پیغمبر کا صحیح تصوّر

وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ

اور جب نہیں لاتے آپ پاس انکے کوئی معجزہ کہتے ہیں کیوں نہیں گھڑ لیتا تو اس کو کہہ دیجئے بات یہ ہے کہ میں پیروی کرتا ہوں

مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ

اس پر جو وحی کی جاتی ہے مجھ پر طرف سے رب میرے کی یہ سمجھ کی باتیں ہیں طرف سے رب تمہارے کی اور ہدایت اور

رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

رحمت ہے لئے ان لوگوں جو ایمان لاتے ہیں (۲۰۳)

با محاورہ ترجمہ:۔ اور جب آپ ان کے پاس کوئی معجزہ نہ لائے تو کہتے ہیں چھانٹ کر کیوں نہ لایا اپنی طرف سے، کہہ دیجئے! میں تو اس پر چلتا ہوں جو میرا رب مجھ پر وحی کرتا ہے یہ تمہارے رب کی طرف سے سمجھ کی باتیں ہیں اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کیلئے جو مؤمن ہیں۔ (۲۰۳)

تفسیر

دنیا کی چیزوں اور باتوں میں پھنس کر رہ جانے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف سے غافل ہوجاتا ہے اور پیغمبر اور قرآن کریم کسی کو نہیں مانتا، چنانچہ کافر لوگ پیغمبر ﷺ کو (نعوذ باللہ) شعبدہ باز اور بازی گر کہتے تھے اور قرآن کریم کی آیتوں کی اور معجزوں کی ہنسی اڑاتے تھے یہ وہی شیطان کے بھائی ہیں جو شیطان کے اشاروں پر چلتے ہیں اور اپنی عقل سے کام نہیں لیتے، ارشاد ہے کہ: یہ حقیقت کے سمجھنے سے اتنے دور ہیں کہ آیتیں لانے کی فرمائشیں کرتے ہیں اور معجزے طلب کرتے ہیں اور جب ان کی فرمائشیں پوری نہیں ہوتیں تو ہنسی اڑاتے ہیں کہ اس خدا پر جس پر اس کا ایمان ہے اتنی قدرت نہیں کہ اس کے کہنے کے مطابق کردے اور پھر اپنی طرف سے یہ گستاخانہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ آخر معاذ اللہ تو قرآن کریم تو خود ہی گھڑتا ہے فرمائش کے وقت کیوں نہیں گھڑ لیتا اور انوکھی باتوں میں سے وہی باتیں کیوں نہیں چن لیتا جسے ہمارا دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔

ارشاد ہے کہ: تم نے اصلی بات نہیں سمجھی، میں کوئی مداری اور باتیں گھڑنے والا نہیں ہوں، میں تو ان باتوں پر ٹھیک ٹھیک چلنے والا ہوں جو اللہ تعالیٰ میری طرف وحی کے ذریعے بھیجتا ہے میں اس پر خود عمل کرتا ہوں اور پھر وہی تمہارے سامنے رکھ دیتا ہوں اگر تم غور کرو تو ہر ایک بات تمہاری آنکھیں کھولنے والی ہے اور اگر تم ان کو سچا مان کر ان پر چلو تو پھر یہ یقین کرنے والوں کیلئے ہدایت اور رحمت ہیں اور کامیابی کا ذریعہ ہیں، یہ ماننے والوں کیلئے فائدہ مند کام کا دروازہ کھول دیں گی اور انہیں دونوں جہان میں سرخرو کریں گی۔

اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے ایک اعتراض کا ذکر کیا ہے جو وہ وحی کے عارضی طور پر رک جانے کے موقع پر کرتے تھے، ارشاد ہے کہ: جب آپ نہیں لائیں ان کے پاس کوئی نشانی تو کہتے ہیں کیوں نہیں چھانٹ کر لایا تو اس کو، یہاں پر مفسرین کرام نے آیت کے دونوں معنٰی بیان کئے ہیں، یعنی: قرآنی آیت اور معجزہ، اگر قرآن کریم کی آیت مراد لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جب کئی کئی روز یا کئی کئی ماہ تک وحی کا سلسلہ رک جاتا تھا تو مشرک لوگ بیہودہ اعتراض کرتے تھے، بعض ظالم کہتے تھے کہ شیطان نے تجھے چھوڑ دیا ہے (نعوذ باللہ) اب وہ تجھے کچھ نہیں

سکھاتا، اور بعض یہ بھی کہتے تھے کہ اگر تیرے پاس وحی آنا بند ہوگئی ہے تو تو اپنی طرف سے قرآن بنا کر سنا دیا کر، کافر کہتے تھے اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز نہیں اتاری تو خود ہی بنا کر لے آئیں، اس قسم کا طعنہ دیتے تھے۔

اور اگر آیت سے معجزہ مراد لیا جائے تو بھی درست ہے کیونکہ مشرک لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی مرضی کے معجزے مانگتے تھے اور پھر اسے نہ پا کر طرح طرح کے بیہودہ اعتراض کرتے تھے اور کہتے کہ آپ مانگا ہوا معجزہ کیوں نہیں پیش کرتے، بعض اوقات اللہ تعالیٰ مشرکوں کی طرف سے مانگا ہوا معجزہ ظاہر فرما دیتے تھے، جیسے: "شق القمر" (چاند کو ٹکڑے کرنے) والا معجزہ مشہور ہے، یا اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کیلئے اونٹنی کا معجزہ ظاہر فرما دیا مگر بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے نزدیک معجزے کا ظاہر کرنا مناسب نہیں ہوتا تھا، لہٰذا کافروں کی فرمائش پوری نہیں ہوتی تھی، "سورۂ بنی اسرائیل" میں ہے کہ مشرک لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں تو آپ کے پاس کھجور اور انگور کے باغ ہونے چاہئیں، سونے چاندی ہونے چاہئیں، یا آپ آسمان پر چڑھ کر دکھائیں، یا ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیں، یا خدا تعالیٰ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئیں، یا آپ کیلئے سونے کا گھر ہونا چاہئے، یا ہمارے سامنے آسمان سے کتاب اتار دیں تو پھر ہم ایمان لائیں گے، بہرحال جب آپ ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے تو کہتے ہیں کہ آپ چن کر کیوں نہیں لے آئے جب آپ ان کا منہ مانگا معجزہ پیش نہیں کرتے تو کہتے ہیں کہ اپنی مرضی سے کوئی ایسا معجزہ چن کر کیوں نہیں لاتے کہ جس کے آنے کے بعد ہمارے لئے ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ میں تو اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، آپ کی مانگی ہوئی نشانیاں پیش کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے یہ تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے جب چاہئے کوئی معجزہ ظاہر فرما دے، اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی معجزہ ظاہر کر دے، معجزہ کا ظاہر کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے جو وہ اپنے پیغمبر کے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے۔

یہ قرآن کریم جس کی آیتیں لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے یہ تو تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی باتیں ہیں، بصارت آنکھوں کی روشنی کو کہتے ہیں اور بصیرت سے دل کی روشنی مراد ہے تو فرمایا: اس قرآن کریم کے مطالعہ سے دل میں ایمان اور توحید کا نور پیدا ہوتا ہے یہ قرآن کریم دلیل تو سارے جہان کیلئے ہے مگر مقصد تک پہنچانے والا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق بنانے والا صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو اس پر ایمان لائیں۔

قرآنِ کریم رحمت کا ذریعہ کیسے ہوتا ہے؟

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

اور جب پڑھا جائے قرآن پس غور سے سنو اسے اور خاموش رہو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے (۲۰۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (۲۰۴)

لفظی تحقیق: اِسْتَمِعُوْا: غور سے سنو۔ اس کا مصدر "اِسْتِمَاعٌ" ہے جو "سمع" سے بنا ہے "سمع" کے معنٰی ہیں سننا اور "اِسْتِمَاعٌ" کے معنٰی ہیں: دھیان دینا۔ تُرْحَمُوْنَ: رحم کیے جاؤ تم۔ یہ "رَحِمَ" سے بنا ہے، "رحمت" اسی لفظ کی دوسری شکل ہے یہ دونوں لفظ ہماری زبان میں بہت استعمال ہوتے ہیں؛ اس لئے ان کے معنٰی کی طرف کوئی خیال نہیں کرتا، "رحم" کے معنٰی ہیں ضرورت مند کو اس کی ضرورت کی چیز فوراً دینا، "رحمت" وہ چیز جس سے ضرورت فوراً پوری ہوتی ہو، آدمی کوئی چیز کسی کو اس پر ترس کھا کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی بے انتہا سخاوت سے ہر ایک کی ضرورت کی چیزیں اس کو دیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کی دینی اور دنیاوی ضرورتیں پوری کرنے کیلئے اسے قرآن کریم دیا یہ اس کے رحم کا کرشمہ ہے اور قرآن کریم اس کی دی ہوئی رحمت ہے جس سے ہر ایک فائدہ اٹھا سکتا ہے اور حقیقت میں قرآن کریم رحمت ہے اسی کیلئے ہے جو اس کی طرف دھیان لگاتے ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن کریم سے فائدہ اٹھانے کی ترکیب بتائی ہے تاکہ وہ رحمت ثابت ہو، گویا یہ فائدہ اٹھانے کی پہلی سیڑھی ہے، ارشاد ہے کہ: قرآن کریم اپنے ماننے والوں کیلئے ہدایت اور رحمت ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے، اب اگر اس سے فائدہ اٹھانا ہے تو سب سے پہلے تمہیں دو باتیں کرنی پڑیں گی۔

(۱)…. جب قرآن کریم پڑھا جارہا ہو تو کان لگا کر پوری توجہ کے ساتھ سنو اور سمجھنے کی کوشش کرو کہ یہ ہم سے کیا کہہ رہا ہے۔

(۲)…. بالکل خاموش رہو، بولنا، بتلانا، اِدھر اُدھر دیکھنا چھوڑ دو، کیونکہ اس سے توجہ ہٹ جاتی ہے خواہ کان میں آواز آتی رہتی ہو لیکن مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔

اس طرح سننے سے قرآن کریم تمہارے لئے رحمت کا ذریعہ ہوسکتا ہے، یعنی: تم اس سے اپنے کام کی ہر بات حاصل کرسکتے ہو اور ہر مشکل میں تمہاری مدد کرسکتا ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس ارشاد کو گرہ میں باندھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تلاوت فرماتے تو وہ دھیان سے سنتے تھے، الفاظ کے کان میں پڑتے ہی مطلب ان کے دل میں اترتا جاتا تھا، کبھی کبھی سمجھنے میں کچھ دشواری ہوتی تو بعد میں فوراً ہر ایک آپ سے پوچھ لیتا اور جب آپ سمجھاتے اس کو دل میں رکھ لیتا، نتیجہ یہ تھا کہ ہر معاملہ میں قرآن کریم ان کی رہنمائی کرتا اور وہ اس کے ارشادات کے مطابق جو کہتا کرتے تھے اور دنیا جانتی ہے جو کامیابی انہیں نصیب ہوئی وہ کسی اور کو نہ ہوئی۔

"سورۂ حٰم سجدہ" میں کافروں کی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جب قرآن کریم پڑھا جارہا ہو تو اس کو مت سنو بلکہ شوروغل کرو تاکہ تم غالب آجاؤ، مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: قرآن کریم کی تلاوت کے وقت خوب کان لگا کر سنو اور خاموش رہو، تاکہ تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔

مفسرین کرام اس آیت کا شان نزول یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس سے پہلے مسلمان نماز کے دوران

بات چیت بھی کر لیتے تھے، ایک دوسرے سے کوئی بات پوچھنا ہوتی تو پوچھ لیتے، مثلاً: رکعتوں کی تعداد معلوم کر لیتے یا باہر سے آنے والا سلام کہتا تو اس کا جواب دے دیتے، "ترمذی شریف" کی روایت میں آتا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو ہمیں نماز کے دوران سلام و کلام کرنے سے روک دیا گیا، "سورۂ بقرہ" کی آیت میں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا، یعنی: اللہ تعالیٰ کے دربار میں عاجزی اور خاموشی اختیار کرتے ہوئے کھڑے ہو اور نماز کو نہایت عاجزی و انکساری کے ساتھ ادا کرو۔

امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ جب نماز میں قرأت بلند آواز سے ہو رہی ہو تو اس کو کان لگا کر سنو اور جب قرأت آہستہ ہو رہی ہو یا مقتدی تک امام کی قرأت کی آواز نہ پہنچ رہی ہو تو ایسی صورت میں دھیان دینے کا حکم ہے، یعنی: خاموش رہو۔

احکام و مسائل

مسئلہ (۱):.... نماز جہری ہو یا سرّی مقتدی کو ہر حالت میں خاموش ہی رہنا چاہئے اسے خود قرأت نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ حدیث کی رو سے امام کی قرأت اس کیلئے کافی ہے۔

مسئلہ (۲):.... نماز کے اندر قرآن کریم کی طرف کان لگانا اور خاموش رہنا تو عام طور پر مسلمانوں کو معلوم ہے اگرچہ عمل میں کوتاہی کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ امام نے کونسی سورۃ پڑھی ہے ان پر لازم ہے کہ وہ قرآن کریم کی عظمت کو پہچانیں اور سننے کی طرف دھیان رکھیں، جمعہ کے خطبہ وغیرہ کا بھی شرعاً یہی حکم ہے۔

مسئلہ (۳):.... نماز اور خطبہ کے علاوہ عام حالات میں کوئی شخص بطور خود تلاوت کر رہا ہے تو دوسروں کو خاموش رہ کر اس پر کان لگانا واجب ہے یا نہیں؟ اس میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، بعض حضرات نے اس صورت میں بھی کان لگانے اور خاموش رہنے کو واجب اور اس کے خلاف کرنے کو گناہ قرار دیا ہے، اور اسی لئے ایسی جگہ جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں یا آرام کرتے ہوں کسی کیلئے با آواز بلند قرآن کریم پڑھنے کو

جائز نہیں رکھا اور جو شخص ایسے موقعوں میں قرآن کریم بلند آواز سے پڑھتا ہے اس کو گناہ گار فرمایا ہے۔

مسئلہ (۴):..... اگر کوئی شخص بطور خود تلاوت کر رہا ہے یا چند آدمی کسی ایک مکان میں اپنی اپنی تلاوت کر رہے ہیں تو دوسرے کی آواز پر کان لگانا اور خاموش رہنا واجب نہیں، کیونکہ صحیح حدیثوں سے یہ ثابت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز میں اونچی آواز سے قرأت فرماتے تھے اور ازواج مطہرات اس وقت نیند میں ہوتی تھیں، بعض اوقات حجرہ سے باہر بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی جاتی تھی۔

اللہ تعالیٰ کو دل سے یاد کرو

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ

اور یاد کیجئے رب اپنے کو میں دل اپنے عاجزی سے اور ڈرتے ہوئے اور کم پکار کر سے

الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

بولنے صبح اور شام اور نہ ہوں آپ میں سے بے خبروں (۲۰۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اپنے رب کو اپنے دل میں یاد کرتے رہئے گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اور ایسی آواز سے جو کہ پکار کر بولنے سے کم ہو صبح کے وقت اور شام کے وقت اور بے خبر مت رہئے۔ (۲۰۵)

تفسیر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھنے اور اس کے ذکر کرنے کی اہمیت بتائی ہے اور اس کا طریقہ سمجھایا گیا ہے، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دل کے ساتھ زبان پر بھی اس کا نام جاری ہو اور آواز بہت اونچی نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کی یاد کیلئے صبح اور شام خاص طور پر مناسب وقت ہیں گویا اس کے خیال سے کسی وقت بھی غافل نہ ہونا چاہئے، قرآن کریم کو دھیان سے سننے کا پہلا اثر اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی زبان پر اللہ تعالیٰ کا ذکر جاری ہوتا ہے، زبان کے ساتھ دل سے بھی ہونا چاہئے اور ذکر میں آواز کو بہت اونچا نہ کرنا چاہئے زبانی ذکر شروع

میں کیا جاتا ہے اور دل کو زبان کے ساتھ ہو جانے کی عادت ڈالی جاتی ہے اس کے بعد دل ذکر میں پہل کرنے لگتا ہے اور زبان کو بھی اپنے ساتھ لگالیتا ہے اس وقت سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ غفلت دور ہوئی ہے اور ذکر کا اصل مقصد حاصل ہوا آہستہ آہستہ غفلت ختم ہوتی جاتی ہے اور انسان کا دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہنے لگتا ہے۔

یہاں پر ذکر سے مراد زبان کا ذکر ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی جاتی ہے، قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے نماز پڑھی جاتی ہے اور دوسرے ذکر کئے جاتے ہیں، زبانی ذکر کے سلسلے میں "سورۂ بنی اسرائیل" میں آتا ہے آپ نماز نہ زیادہ بلند آواز سے پڑھیں اور نہ بہت آہستہ بلکہ درمیانی راستہ اختیار کریں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ مکی زندگی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کافروں کی موجودگی میں نماز ایسی جگہ ادا کرتے تھے جہاں کافروں کا ہجوم نہ ہو کیونکہ کافر قرآن کریم کی بلند آواز سے تلاوت برداشت نہیں کرتے تھے اور اس میں خلل ڈالتے تھے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ بلند آواز سے تلاوت نہ کریں مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اتنا آہستہ بھی قرآن کریم نہ پڑھیں کہ آپ کے ساتھی بھی نہ سن سکیں، لہٰذا ان دونوں حالتوں کا درمیانی راستہ اختیار کریں۔

وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ: اس میں تلقین کی گئی ہے کہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت نے اس کی مزید وضاحت ان لفظوں میں فرمائی ہے کہ: "وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا" اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہے کہ اپنی قرأت میں نہ زیادہ جہر کیا کریں اور نہ بالکل اخفاء بلکہ جہر اور اخفاء کی درمیانی کیفیت رکھا کریں، نماز میں قرآن کریم کی قرأت کے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو یہی ہدایت فرمائی۔

صحیح حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخر رات میں گھر سے نکلے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز میں مشغول تھے مگر تلاوت آہستہ کر رہے تھے پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ بہت بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے جب صبح کو یہ دونوں حضرات آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: میں رات تمہارے پاس گیا تو دیکھا کہ تم پست آواز سے تلاوت کر رہے تھے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، اے اللہ کے پیغمبر! مجھے جس ذات کو سنانا تھا اس نے سن لیا یہ کافی ہے اسی طرح فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے انہوں نے عرض کیا کہ قرأت میں جہر کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ نیند کا غلبہ نہ رہے اور شیطان اس کی آواز سے بھاگے، پیغمبر ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت کی کہ ذرا کچھ آواز بلند کیا کریں اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت کی کہ کچھ آواز پست کیا کریں۔

بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ: صبح بھی اور پچھلے پہر بھی۔ بعض فرماتے ہیں کہ "غُدُوِّ" سے مراد فجر کے طلوع سے لے کر سورج کے طلوع تک کا وقت ہے، مگر صحیح قول یہ ہے کہ اس کا وقت فجر کے طلوع سے لے کر سورج ڈھلنے تک ہے جہاں تک "اٰصَالِ" یعنی: پچھلے پہر کا تعلق ہے، بعض فرماتے ہیں کہ یہ وقت عصر سے مغرب تک کا ہے مگر صحیح بات یہ ہے کہ سورج ڈھلنے کے بعد سے لے کر مغرب تک کا وقت مراد ہے دوسرے مقام پر رات کی گھڑیوں کے الفاظ آتے ہیں، بہر حال فرمایا کہ: اپنے رب کو یاد کرو صبح کے وقت بھی اور پچھلے پہر بھی اور مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ ذکر کرتے رہنا چاہئے اور غافلوں میں نہیں ہونا چاہئے۔

مقرب فرشتوں کا حال

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يُسَبِّحُوْنَهٗ

تحقیق جو نزدیک ہیں رب آپکے نہیں تکبر کرتے سے عبادت اسکی اور تسبیح کرتے ہیں اسکی

وَ لَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۝۲۰۶ ۲۴ ع ۱۸ السجدة ۱

اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں (۲۰۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بیشک جو آپکے رب کے نزدیک ہیں وہ اس کی بندگی سے تکبر نہیں کرتے اور یاد کرتے

ہیں اس کی ذات کو اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔(۲۰۶)

لفظی تحقیق: عِبَادَةٌ: بندگی۔قرآن کریم میں اس کے معنیٰ انتہائی عاجزی کے اظہار کے ہیں، انسان کو اس بات سے روکا گیا ہے کہ کسی کے سامنے اپنی ذلت اور عاجزی کا اظہار نہ کرے، صرف اللہ عزوجل کے سامنے انسان ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو کر جھک کر زمین پر ماتھا ٹیک کر زبانی اقرار کرے، دل کی حالت سے اپنی عاجزی اور ذلت کا اظہار کرسکتا ہے کسی اور کے سامنے ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے اور یہ عمل اس کو تباہی کی طرف لے جانے والا ہے۔يَسْجُدُوْنَ: سجدہ کرتے ہیں۔یہ "سَجَدَ" سے بنا ہے، یہ شرع کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اور اس کے معنیٰ زمین پر اللہ تعالیٰ کے آگے ماتھا، ناک، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے، دونوں پاؤں کے انگوٹھے بیک وقت ٹیک دینے کے ہیں اور اس کا اصل جز سر جھکا کر پیشانی زمین پر رکھنا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے آگے کرنا حرام ہے۔

تفسیر

پچھلی آیت میں انسان کو اللہ تعالیٰ سے غافل نہ رہنے کا حکم کیا گیا ہے اور غفلت کے دور کرنے کا طریقہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کو بتایا گیا ہے، اصل مقصود اللہ تعالیٰ کا ہر وقت دھیان رکھنا ہے اور دل سے اسے یاد کرنا ہے، انسان کیلئے یہ مشکل بات ہے؛ اس لئے کہ ایک طرف تو دنیا کے دھندے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے دوسری طرف شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ تو خود سب سے زیادہ طاقت ور ہے اور عقل کے زور سے سب کو زیر کرلیتا ہے تجھے کیا ضرورت ہے کہ ان دیکھے خدا کو اپنے سے بڑا مانے، اس آیت میں اس بیہودہ خیال کا خاتمہ کیا گیا ہے، ارشاد ہے کہ: تم سے بہت زیادہ معزز مخلوق ایک اور ہے جو اللہ تعالیٰ کے آگے ذرا تکبر نہیں کرتی اور ہر وقت اس کی بڑائی اور پاکیزگی کا اقرار کرتی ہے اور اس کے سامنے سجدے میں گر پڑتی ہے تم کیا اس سے زیادہ قوت والے ہو جو اس قدر غرور پر کمر باندھے ہوئے ہے اگر اللہ تعالیٰ کے نہیں تو پھر اپنی خواہشوں کے غلام بنو گے اور ان کے حکم کے خلاف نہ کرو گے اس سے اللہ تعالیٰ کی غلامی ہزار درجہ بہتر ہے۔

وہ جو آپ کے رب کے پاس تسبیح کرتے ہیں، مراد اس سے فرشتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، فرشتے اگرچہ پاک اور مقدس ہیں گناہوں سے خالی ہیں مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگے رہتے ہیں ان کے مقابلے میں انسان تو خطا کار ہیں؛ اس لئے انہیں اس طرف زیادہ توجہ دینی چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل نہیں ہونا چاہئے، ایک تو فرشتے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اس کے علاوہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں، تسبیح کا معنیٰ خدا تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا ہے جب کوئی شخص "سبحان اللہ" کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر عیب، کمزوری اور کمی سے پاک ہے یہ بہت بلند کلمہ ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کیلئے یہ چار کلمات منتخب فرمائے ہیں، یعنی: "سبحان اللہ، الحمد للہ"، "لا الٰہ الا اللہ" اور "اللہ اکبر" بلا شبہ اللہ ہی بڑا ہے؛ اسی لئے "سورۂ مدثر" میں حکم ہے کہ اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کریں اور اس کا ذکر کیا کریں۔

اللہ تعالیٰ کے فرشتے تو ایک تو تسبیح بیان کرتے ہیں اور دوسرے اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، سجدہ بھی بہت بڑی عبادت ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: سجدہ کی حالت میں انسان اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، سجدہ میں انتہائی درجے کی عاجزی پائی جاتی ہے اور یہی چیز اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، انسان جس قدر عاجزی کا اظہار کرے گا اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے قریب ہوگا، "سورۂ علق" میں ارشاد ہے کہ: سجدہ کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو، سجدہ کی مختلف صورتیں ہیں، سجدہ نماز کیلئے بھی ہوتا ہے، سجدہ تلاوت بھی ہے اور نعمت ملنے پر شکر کا سجدہ بھی ادا کیا جاتا ہے، سجدے میں چونکہ تسبیح بھی کی جاتی ہے، لہٰذا اس میں سجدہ اور تسبیح دونوں چیزیں آ جاتی ہیں؛ اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کا قرب کا ذریعہ ہے، صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی انسان سجدہ کرتا ہے تو شیطان اپنے سر پر خاک ڈالتا ہے اور افسوس کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کو سجدے کا حکم ہوا تو اس نے حکم کو پورا کیا مگر مجھے سجدے کا حکم ہوا تو میں انکار کر کے مردود ٹھہرا، شیطان کا یہ افسوس اس کے حسد کی بنا پر ہوتا ہے کیونکہ وہ اب توبہ تو کرنا نہیں چاہتا انسان کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھ کر اس کو جلن ہوتی ہے کہ یہ کیوں اللہ تعالیٰ کے سامنے

پیشانی کو رکھ رہا ہے کیونکہ وہ تو چاہتا ہے کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ کا باغی بن کر اس کی جماعت میں شامل ہو جائے، تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے تکبر نہیں کرتے اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اس کی پاکی کو بیان کریں اور سجدہ کے ذریعے اس کا قرب حاصل کریں۔

سورۃ کے آخر میں اس کا خلاصہ بیان ہوگیا ہے کہ یہ مکی سورۃ ہے اس میں صحیح عقیدے، توحید، پیغمبری، قیامت اور قرآن کریم کی عظمت بیان کی گئی ہے، تاریخ، پیغمبری اور توحید اس سورۃ کے بنیادی مضمون ہیں، چونکہ توحید ایک بنیادی مسئلہ ہے اور خدا تعالیٰ کی عبادت اس کا ذکر اور تسبیح سورۃ کا کا خلاصہ ہے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا فرشتوں اور انسانوں کا فرض ہے اگر انسان کامیابی کے طلب گار ہیں تو انہیں اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق برقرار رکھنا چاہئے اور اس کا طریقہ وہی ہے جو اس سورۃ میں خاص طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

سورۂ فاتحہ سے اعراف تک کی سورتوں کا اجمالی خاکہ

قرآن کریم میں سب سے پہلے "سورۂ فاتحہ" کو رکھا گیا ہے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے تمام اصولوں کا خلاصہ دے دیا گیا ہے؛ اسی لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چاروں آسمانی کتابوں، یعنی: "تورات، انجیل، زبور اور قرآن کریم" میں "سورۂ فاتحہ" جیسی کوئی دوسری سورۃ نہیں، تمام کتابوں میں "سورۂ فاتحہ" کو سب سے زیادہ فضیلت حاصل ہے یہ وہی سورۃ ہے جسے ہم نماز میں پڑھتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ سورۃ سورۃ الصلوٰۃ، یعنی: نماز کی سورۃ بھی کہلاتی ہے۔

"سورۂ فاتحہ" کے بعد دو سورتوں "سورۂ بقرہ" اور "سورۂ آل عمران" میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی ظاہری تفصیل ہے، ان سورتوں میں معمولی مسئلوں سے لے کر خلافت تک کے نظام کے مسئلے بیان کئے گئے ہیں اور انفرادی حکم سے لے کر اجتماعی تک سب چیزیں آ گئی ہیں اسی طرح عبادت کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے تاہم اس دین کی شکل وصورت اس وقت مکمل ہوتی ہے جب ان کے ساتھ "سورۂ نساء" اور "سورۂ مائدہ" کے مضمونوں کو بھی ملا لیا جائے، چنانچہ ان چار سورتوں کو آپس میں ملانے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین

کی ظاہری اور باطنی دونوں صورتیں کھل کر سامنے آ جاتی ہیں، "سورۂ نساء" اور "سورۂ مائدہ" میں انسانی زندگی سے متعلق اہم باتیں بیان کی گئی ہیں، انسانی زندگی کے ساتھ عورت اور کھانے کا گہرا تعلق ہے جب تک ان دونوں چیزوں کا توازن موجود نہ ہو انسان کو سکون حاصل نہیں ہوتا۔

ایک لحاظ سے "سورۂ بقرہ" اور "سورۂ آل عمران" میں ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کو بگاڑ دیا تھا، "سورۂ بقرہ" میں زیادہ تر یہودیوں کے باطل عقیدوں کا ذکر ہے اور "سورۂ آل عمران" میں عیسائیوں کا ذکر ہے یہ دونوں قومیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد اور پیروکار ہونے کی دعویدار ہیں مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کو بگاڑنے کی ذمہ داری بھی انہی پر آتی ہے، لہٰذا ان دو سورتوں میں ان دونوں گروہوں کو خطاب کیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں بگاڑ پیدا کرنے والا تیسرا گروہ عرب کے مشرکوں کا تھا جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد اور ان کے بہت سے خاندانوں پر مشتمل تھا، چنانچہ اگلی دو سورتوں "نساء" اور "مائدہ" میں عرب کے مشرکوں کو خطاب ہے جب قرآن کریم اترا تو اس نے یہ تعلیم دی کہ اگر یہ سب لوگ اپنے اپنے پیدا کئے ہوئے بگاڑ کو چھوڑ دیں تو یہ لوگ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کا حصہ بن جائیں گے اور اسی راستے پر گامزن ہو جائیں گے جس راستے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے بعد آنے والے تمام پیغمبر علیہم السلام چلتے رہے یہ تمام پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے ہی امام تھے، غرضیکہ "سورۂ مائدہ" تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کو بگاڑنے والے تینوں فرقوں یہودی، عیسائی اور مشرکوں کو خطاب ہو گیا ہے۔

"سورۂ بقرہ" میں "یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ" سے شروع کر کے یہودیوں کی چالیس خرابیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور "سورۂ آل عمران" میں معاملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور ۱۸۳ آیتوں تک عیسائیوں کو خطاب ہے جن میں ان کے غلط عقیدوں کی نشاندھی کی گئی ہے، ان آیتوں میں عیسائیوں پر واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں مگر تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے کے قائل ہو چکے ہو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو آؤ! آپس میں فیصلہ کر لیں، بحث کے ذریعے معاملے کو صاف کر لیں یا پھر مباہلے کے ذریعے سچ اور

جھوٹ کی پہچان ہو جائے، مگر یہ لوگ آج تک اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر اڑے ہوئے ہیں، غرضیکہ ان چاروں طویل سورتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کا ظاہر و باطن بیان کر دیا گیا ہے اب تک قرآن کریم کی پانچ سورتوں کا بیان ہو چکا ہے اس کے بعد چھٹی سورۃ "سورۂ انعام" اور ساتویں "سورۂ اعراف" ہے یہ ساتوں سورتیں مل کر قرآن کریم کا ایک باب بنتا ہے، اس باب کا پہلا حصہ "سورۂ مائدہ" پر ختم ہوا جس کے ساتھ ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کا مکمل بیان ہوا ہے اور اب کلام کا رخ "سورۂ انعام" سے صابئین کی طرف ہوتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک صابی مذہب کا دور تھا بلکہ اس سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام کا زمانہ بھی اسی دور میں شمار ہوتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے ماننے والوں کی طرح صابی مذہب کے پیروکاروں نے بھی اس کے اصول بگاڑ دیئے تھے، اصل دین کو کفر و شرک میں تبدیل کر دیا تھا اس مذہب میں بھی توحید، پاکی، ناپاکی، کے چاروں اصول موجود تھے جیسا کہ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "حسن المحاضرۃ فی احوال المصر و القاهرۃ" میں لکھا ہے اس ملت کے پیروکاروں نے خود ان اصولوں کو بگاڑ دیا اور دین میں خرابیاں پیدا کر دیں قرآن کریم کا فرمان ہے کہ: اگر تم ان خرابیوں کو چھوڑ دو تو تمہارا مذہب بھی ٹھیک ہے قرآن کریم آج بھی پکار رہا ہے کہ غلط عقیدوں کو چھوڑ کر سیدھے راستے پر آجاؤ تو تم آج بھی نجات پانے والے بن سکتے ہو۔

صابی ملتوں میں مشرق میں چینی قوم ہے، ہندوستان میں آریہ اور اس سے پہلے اور بعد والی قدیم قومیں ہیں وسط ایران کے مجوسی اور مغرب میں رومی اور یونانی ہیں یہ پانچوں قومیں صابی ملت کی پیروکار ہیں مگر یہ ملت کے اصل اصولوں کو چھوڑ کر شرک میں مبتلا ہو گئے جس طرح یہودی، عیسائی اور عرب جو کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے انہوں نے کفر و شرک کو اپنا کر انہی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین قرار دے دیا اسی طرح ان قوموں نے بھی باطل عقیدوں پر صابی مذہب کا لیبل چسپاں کر دیا، صابی قوموں میں سے وسطی علاقوں کے مجوسی چونکہ عرب سے زیادہ قریب تھے، لہٰذا سب سے پہلے ان کو خطاب کیا گیا ہے اس کے بعد تمام صابی قوموں کے شرک کی تمام قسموں کا رد کیا گیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ماننے والوں سے خطاب کی ابتداء بھی الحمد للہ سے ہوتی تھی اور اب

صابی مذہب سے خطاب الحمد للہ سے ہی ہو رہا ہے۔

احکام و مسائل

مسئلہ(۱):..... اس آیت کو پڑھنے کے بعد یا دوسرے سے سننے کے بعد سجدہ کرنا واجب ہے۔

سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ مَدَنِيَّة

سورۃ الانفال مدنی ہے، اس میں پچھتر آیتیں اور دس رکوع ہیں۔

غنیمت کی تقسیم کا قانون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا

پوچھتے ہیں آپ سے بارے میں غنیمت کے کہہ دیجئے غنیمت کا مال ہے لئے اللہ کے اور لئے پیغمبر کے پس ڈرو

اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اِنْ

اللہ سے اور سنوارو تعلقات آپس کے اور اطاعت کرو اللہ کی اور پیغمبر اسکے کی اگر

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

ہو تم ایمان لانے والے (۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ سے غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے! غنیمت کا مال اللہ اور پیغمبر کا ہے، سو! اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اللہ کا اور اس کے پیغمبر کا حکم مانو، اگر تم ایمان رکھتے ہو۔(۱)

لفظی تحقیق: ذَاتَ بَيْنِكُمْ: آپس کی باتیں۔عربی میں ذات کا لفظ "ذو" کا مؤنث ہے اور دونوں "والے" کے معنیٰ میں آتے ہیں، "بين" کے معنیٰ درمیان کے ہیں، "ذَاتَ بَيْنٍ" کے معنیٰ ہیں درمیانی تعلقات، رشتے جھگڑے، آپس کے معاملے "ذَاتَ بَيْنِكُمْ" وہ باتیں جو تمہیں مل جل کر رہنے کی وجہ سے آپس میں اختیار کرنی پڑتی ہیں۔

تفسیر

مکہ مکرمہ میں برابر ۱۳ سال تک مسلمانوں کو مکہ کے کافروں سے سخت سے سخت تکلیفیں پہنچتی رہیں اور وہ ان کو صبر کے ساتھ جھیلتے رہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ والوں کو لاکھ سمجھایا کہ اسلام کے اندر تمہاری ہمیشہ کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے اگر تم اس کو قبول نہیں کرتے تو تم جانو لیکن جو اسلام میں خوشی سے داخل ہونا چاہے اسے روکنے کا تمہیں کوئی حق نہیں، مل جل کر رہو اور دین کے بارے میں ہر ایک کو آزاد رکھو، لیکن انہوں نے آپ کی نہ سنی، مسلمان اس مدت میں بہت پریشان ہوئے اور ان کے ظلموں کا بدلہ لینے کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا: صبر کرو اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلم کھلا اجازت نہ آئے کسی سے نہ لڑو، جب ظلم کی حد ہوگئی اور مکہ مکرمہ والوں نے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تو آپ کو حکم ہوا کہ مدینہ چلے جائیں وہاں اور مسلمان پہلے ہی پہنچ گئے تھے آپ نے مدینہ پہنچتے ہی اسلامی بھائی چارے کی بنیاد رکھی، "سورۂ بقرہ" میں اللہ تعالیٰ نے صاف اجازت دی کہ مسلمان مکہ والوں سے ان کے ظلم کا بدلہ لے سکتے ہیں اس ہجرت کے کوئی ڈیڑھ سال بعد بدر کی جنگ ہوئی کافر بری طرح ہارے اور ان کا مال مسلمانوں کے ہاتھ لگا اس سورۃ میں اس مسئلہ کا فیصلہ کر دیا گیا، ارشاد ہوتا ہے کہ: مشرکوں سے حاصل ہونے والے مال کا مسئلہ درپیش ہے اس کے بارے میں یہ فیصلہ سن لو کہ وہ کسی کا ذاتی حق نہیں ہے اس کے مالک اللہ ہیں اور اس کے پیغمبر ہیں، مال کی تقسیم میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرو اور جو حکم آئے اس پر عمل کرو تمہارا کام اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت ہے اس میں اپنی خوشی کو بالکل دخل نہ دو اللہ کو ماننے اور اس پر ایمان لانے اور اس کے حکم پر چلنے کے یہی معنیٰ ہیں۔

سورۃ الانفال

یہ سورۃ مدینہ میں ۲ سنہ ھ میں بدر کی جنگ کی غنیمتیں جمع کرنے کے بعد اتری اس جنگ میں مسلمانوں کو مکہ کے کافروں پر عظیم الشان فتح حاصل ہوئی، مسئلہ یہ درپیش آیا کہ غنیمت کا مال جو مسلمانوں کے ہاتھ لگا اس کو کس طرح تقسیم کیا جائے مسلمانوں کی یہ پہلی لڑائی تھی اس سے پہلے غنیمت کا مال کے بانٹنے کا کوئی حکم موجود نہیں تھا۔

بدر کی جنگ دنیا کی تاریخ میں ایسی جنگ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد کل ۳۱۳ تھی، جنہیں آپ ۳ رمضان المبارک ۲ سنہ ھ کو ساتھ لے کر مدینہ کے باہر نکلے ان میں گھوڑے کل ۲ تھے، چنانچہ کل دو ہی سوار تھے جن کے نام تاریخ میں مقداد بن عمر اور زبیر بن العوام بتائے گئے ہیں اور ستر اونٹ تھے جن پر باری باری سے لوگ سوار ہوتے تھے، ہتھیار اور جنگ کا سامان برائے نام تھا ان کا مقابلہ کافروں کی ایک جماعت سے ہوا جس میں مکہ کے تقریباً سارے بڑے بڑے مشہور کھاتے پیتے لوگ تھے آدمیوں کی تعداد ۹۵۰ تھی جن میں سو گھوڑ سوار تھے اور ہر آدمی کے پاس ضروری ہتھیار تھے اور جنگ کا سامان موجود تھا ایسے حالات میں مسلمانوں کا کامیاب ہونا واقعی ایک معجزہ تھا اس لڑائی کی تاریخ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ ۱۷ رمضان المبارک ۲ سنہ ھ بروز جمعہ وقت صبح ہے۔

اس لڑائی میں مکہ کے کافروں کے بڑے بڑے ستر سردار مارے گئے اور ستر کو مسلمان زندہ گرفتار کر کے لے آئے مسلمانوں میں سے کل ۱۴ آدمی شہید ہوئے، ۶ مہاجرین میں سے ۱۸ انصار میں سے، اس سورۃ میں اس لڑائی کا ذکر ہے اور اس کے اسباب کی طرف اشارہ ہے، غنیمت کا مال کا قانون ہے، قیدیوں کے ساتھ سلوک کرنے کا بیان ہے اور مسلمانوں کیلئے بہت سی کام کی باتوں کی ہدایت ہے اس لڑائی سے مکہ والوں کی کمر ٹوٹ گئی اور مسلمانوں کی عرب میں دھاک بیٹھ گئی اور ان کیلئے اپنے دشمنوں سے نمٹنے کا راستہ کھل گیا۔

آیت کی تفسیر سے پہلے وہ واقعہ سامنے رکھا جائے تو تفسیر سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ بدر کی جنگ جو کفر و اسلام کی سب سے پہلی لڑائی تھی اس میں جب مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کچھ غنیمت کا مال ہاتھ آیا تو صحابہ کرام کے درمیان اس کی تقسیم کے متعلق ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جو اخلاص و اتفاق کے اس مقام کے شایان نشان نہ تھا جس پر صحابہ کرام کی پوری زندگی ڈھلی ہوئی تھی؛ اس لئے سب سے پہلی ہی آیت میں اس کا فیصلہ فرمادیا گیا تاکہ جماعت کے دلوں میں اخلاص اور اتفاق کے سوا کچھ نہ رہے۔

اس واقعہ کی تفصیل بدر کی جنگ کے شریک حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی زبانی "مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک حاکم" وغیرہ میں اس طرح منقول ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت سے کسی نے آیت میں لفظ "انفال" کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ: یہ آیت تو ہمارے، یعنی: بدر والوں ہی کے بارے میں اتری ہے جس کا واقعہ یہ تھا کہ غنیمت کا مال کی تقسیم کے بارے میں ہمارے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہو گیا تھا جس نے ہمارے اخلاق پر برا اثر ڈالا، اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ غنیمت کے مال کو ہمارے ہاتھوں سے لے کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی جنگ میں شریک ہونے والے تمام صحابہ کرام میں برابر برابر تقسیم فرمادیا۔

صورت یہ پیش آئی تھی کہ ہم سب بدر کی جنگ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور دونوں فریق میں گھمسان کی جنگ کے بعد اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی تو اب ہمارے لشکر کے تین حصے ہو گئے کچھ لوگوں نے دشمن کا پیچھا کیا تاکہ وہ پھر واپس نہ آسکے، کچھ لوگ غنیمت کا مال جمع کرنے میں لگ گئے اور کچھ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد اس لئے جمع رہے کہ کسی طرف سے چھپا ہوا دشمن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ نہ کر دے، جب جنگ ختم ہوگئی اور رات کو ہر شخص اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو جن لوگوں نے غنیمت کا مال جمع کیا تھا وہ کہنے لگے کہ یہ مال تو ہم نے جمع کیا ہے؛ اس لئے اس میں ہمارے سوا کسی کا حصہ نہیں اور جو لوگ دشمن کا پیچھا کرنے گئے تھے انہوں نے کہا کہ تم لوگ ہم سے زیادہ اس کے حقدار نہیں ہو کیونکہ ہم نے ہی دشمن کو بھگایا اور تمہارے لئے یہ موقع فراہم کیا کہ تم بےفکر ہو کر غنیمت کا مال جمع کر لو اور جو لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کیلئے آپ کے گرد جمع رہے انہوں نے کہا کہ ہم چاہتے تو ہم بھی مال غنیمت جمع کرنے میں تمہارے ساتھ شریک ہوتے لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت جو جہاد کا سب سے اہم کام تھا ہم اس میں مشغول رہے؛ اس لئے ہم بھی اس کے حقدار ہیں۔

صحابہ کرام کی یہ گفتگو پیغمبر ﷺ تک پہنچی اس پر یہ آیت اتری جس نے واضح کر دیا کہ یہ مال اللہ تعالیٰ کا ہے اس کا کوئی مالک و حقدار نہیں سوائے اس کے جس کو پیغمبر ﷺ عطا فرمائیں، پیغمبر ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اس مال کو بدر کی جنگ میں شریک ہونے والے تمام صحابہ کرام میں برابر برابر تقسیم فرما دیا اور سب کے سب اللہ تعالیٰ و پیغمبر کے اس فیصلہ پر راضی ہو گئے اور غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ان کی شان کے خلاف آپس کی کھینچا تانی سے جو صورت حال پیش آ گئی تھی اس پر شرمندہ ہوئے۔

اس آیت کے شانِ نزول کا ایک دوسرا واقعہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بھی منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ: بدر کی جنگ میں میرے بھائی عمیر شہید ہو گئے میں نے ان کے بدلے مشرکوں میں سے سعید بن العاص کو قتل کر دیا اور اس کی تلوار لے کر پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں چاہتا تھا کہ یہ تلوار مجھے مل جائے مگر پیغمبر ﷺ نے حکم دیا کہ اس کو غنیمت کے مال میں جمع کر دو، میں حکم ماننے پر مجبور تھا مگر میرا دل اس کا سخت صدمہ محسوس کر رہا تھا کہ میرا بھائی شہید ہوا اور میں نے اس کے بدلے ایک دشمن کو مار کر اس کی تلوار حاصل کی وہ بھی مجھ سے لے لی گئی اس کے باوجود حکم کو پورا کرنے کیلئے غنیمت کا مال جمع کرنے کیلئے آگے بڑھا تو ابھی دور نہیں گیا تھا کہ پیغمبر ﷺ پر "سورۂ انفال" کی یہ آیت: "يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ" اتری اور آپ نے مجھے بلوا کر فرمایا: تم نے مجھ سے یہ تلوار مانگی تھی اس وقت یہ نہ میری تھی نہ آپ کی تھی، اب اللہ تعالیٰ نے اس کا اختیار مجھے دے دیا ہے جاؤ، لے لو: ممکن ہے کہ یہ دونوں واقعے پیش آئے ہوں اور دونوں ہی کے جواب میں یہ آیت اتری ہو۔

لوگوں کے آپس کے اتحاد و اتفاق کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے

اس آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا: "اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اللہ کا اور اس کے پیغمبر کا حکم مانو اگر تم ایمان رکھتے ہو" جس میں صحابہ کرام کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور آپس کے تعلقات کو درست رکھو، اس میں اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جو بدر کی جنگ میں غنیمت کے مال کی تقسیم کے

بارے میں صحابہ کرام کے درمیان پیش آ گیا تھا جس میں آپس کی ناراضگی کا خطرہ تھا، اللہ تعالیٰ نے غنیمت کی تقسیم کا معاملہ خود اس آیت کے ذریعہ طے فرما دیا اب ان کے دلوں کی اصلاح اور آپس کے تعلقات کی خوشگواری کا طریقہ بتایا گیا ہے جس کا مرکزی نقطہ تقویٰ اور اللہ تعالیٰ خوف ہے۔

جب تقویٰ اور آخرت کا خوف غالب ہوتا ہے تو بڑے بڑے جھگڑے لمحوں میں ختم ہوجاتے ہیں یا ایک دوسرے کے خلاف نفرتیں غبار بن کر اڑ جاتی ہیں؛ اسی لئے اس آیت میں تقویٰ کی تدبیر بتا کر فرمایا کہ: تقویٰ کے ذریعہ آپس کے تعلقات کی اصلاح کرو اس کی مزید تشریح اس طرح فرمائی کہ اللہ اور پیغمبر کی مکمل اطاعت کرو اگر تم مؤمن ہو، یعنی: ایمان کا تقاضا ہے کہ اطاعت ہو اور اطاعت نتیجہ ہے تقویٰ کا اور جب یہ چیزیں لوگوں کو حاصل ہوجائیں تو ان کے آپس کے جھگڑے خود بخود ختم ہوجائیں گے اور دشمنی کی جگہ دلوں میں الفت ومحبت پیدا ہوجائے گی۔

مؤمنوں کی نشانیاں

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا

بات یہ ہے کہ ایمان والے وہ ہیں کہ جب ذکر کیا جائے اللہ کا ڈر جائیں دل انکے اور جب

تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۲﴾

پڑھی جائیں سامنے انکے آیتیں اسکی بڑھائیں وہ انکا ایمان اور پر رب اپنے بھروسا کرتے ہیں (۲)

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾

وہ جو قائم رکھتے ہیں نماز اور میں سے اس جو ہم نے دیا انکو خرچ کرتے ہیں (۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا نام آئے تو ان کے دل ڈر جائیں اور جب ان پر اس کا کلام پڑھا جائے تو ان کا ایمان زیادہ ہوتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔(۲) وہ لوگ جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور ہم نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔(۳)

تفسیر

اس آیت میں مؤمن کی علامتیں صاف طور پر بتائی گئی ہیں، ارشاد ہے کہ مؤمن وہی ہیں کہ:

(۱)…. جب اللہ تعالیٰ کا نام سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور خوف کی وجہ سے ان کا دل لرزنے لگتا ہے۔

(۲)…. جب ان کے سامنے قرآن کریم کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کو سن کر ان کا ایمان زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں، ہوسکتا ضرور یہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اپنے پیغمبر کی طرف اور اپنے پیغمبر کے ذریعے ہماری طرف بھیجا ہے۔

(۳)…. وہ نماز قائم کرتے ہیں اور وقت پر اس کے ادا کئے جانے کا پورا پورا اہتمام کرتے ہیں۔

(۴)…. بجائے اس کے کہ دوسروں سے ناجائز طور پر چھین کر مال و دولت جمع کرنے کی فکر میں رہیں وہ ہر اس چیز کو جو ان کے پاس ہے اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھتے ہیں اور ہر موقعہ پر اس میں سے اس کے نام پر خرچ کرتے ہیں اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۵)…. ان کا بھروسہ صرف اپنے رب کے اوپر ہوتا ہے وہ اسی سے مانگتے ہیں اس کے سوا کسی کی نہ عبادت کرتے ہیں اور نہ کسی سے مدد چاہتے ہیں۔

ایمان والوں کی یہ پہلی صفت ہے کہ خدا کے ذکر سے ان کے دلوں میں خوف پیدا ہوتا ہے وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہیں وہ بڑی عظمت اور بزرگی والے ہیں، اگر ہم سے کوئی غلطی ہوگئی تو وہ پکڑ لیں گے یہی ایمان کی نشانی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے متعلق بھی فرمایا ہے کہ: وہ ہمیں پکارتے ہیں اس رغبت اور امید کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انعام و اکرام حاصل ہو اور ہم سے ڈرتے بھی ہیں کہ کہیں پکڑ نہ ہو جائے دراصل ایمان خوف اور امید کے درمیان ہی ہے اگر کسی آدمی پر اس قدر خوف طاری ہو جائے کہ وہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہی ہو جائے تو یہ کفر کی نشانی ہے اسی طرح کوئی شخص اتنا پر امید ہو جائے کہ خدا تعالیٰ کا خوف ہی دل سے جاتا

رہے یہ بھی نافرمانی اور کفر کی نشانی ہے، لہذا انسان کے دل میں اس کی رحمت کی امید اور اس کے عذاب کا خوف دونوں چیزیں موجود ہونی چاہئیں۔

ایمان والوں کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ اپنے رب پر مکمل بھروسہ رکھتے ہیں ان کا اعتماد اسباب کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہوتا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا کارساز بھی اسی کو مانو، قرآن کریم میں ہے کہ: ''ہم اللہ تعالیٰ کی ذات پر کیوں نہ بھروسہ کریں حالانکہ اسی نے ہمیں سیدھا راستہ بھی دکھایا ہے'' اور اس پر چلنے کی توفیق بھی، وہی دیتا ہے تمام اسباب کا مہیا کرنے والا اور تمام چیزوں پر اختیار رکھنے والا وہی ہے، لہٰذا بھروسہ بھی اسی کی ذات پر ہونا چاہئے نہ کہ ان عارضی اور ختم ہونے والی چیزوں پر۔

چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ لوگ نماز کو قائم کرتے ہیں یہ بھی ایک اہم ترین کام ہے، ''موطا امام مالک'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دفتری خط موجود ہے جو آپ نے تمام صوبوں کے حاکموں کو بھیجا تھا اور جس میں لکھا تھا کہ میرے نزدیک تمہارے کاموں میں سب سے اہم کام نماز ہے اس پر خود بھی عمل کرتے رہو اور دوسروں سے بھی پابندی کرانے کی کوشش کرو۔

اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی پانچویں صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ جو روزی ہم نے انہیں دی ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں اگر نصاب والے ہیں تو سب سے پہلے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں جو کہ فرض ہے، البتہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال کے حقوق ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: زکوٰۃ کے علاوہ مالی عبادتوں میں حج اور عمرہ بھی ہے اس کے علاوہ قربانی اور صدقہ فطر واجبات میں سے ہیں اگر کسی مالدار آدمی کا کوئی عزیز رشتہ دار غریب ہو تو اس کی مدد بھی واجب ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ بعض کو بعض پر مالی لحاظ سے فضیلت عطا کرتے ہیں تو یہ مال ان کیلئے آزمائش ہوتا ہے اللہ تعالیٰ دیکھتے ہیں کہ اس کے دیئے ہوئے مال میں سے غریبوں، مسکینوں اور دوسرے مستحقوں کا حق ادا کیا گیا ہے یا نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اگر اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو، اس کو کھیل تماشے میں خرچ نہ کرو، باطل رسموں اور حرام کاموں میں دولت خرچ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

سچّے مؤمنوں کا انعام

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ
یہ لوگ وہی ایمان والے ہیں ٹھیک طور پر لئے انکے درجے ہیں پاس رب انکے کے اور بخشش ہے

وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴
اور روزی ہے باعزت (۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہی لوگ سچے ایمان والے ہیں ان کیلئے اپنے رب کے پاس درجے ہیں اور معافی ہے اور عزت کی روزی ہے۔ (۴)

تفسیر

اس آیت میں ان مؤمنوں کے جو اپنے ایمان کا زبان سے اقرار کرنے ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ مؤمنوں کی سی عادتیں اور خصلتیں اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے انعام کا بیان ہے جو ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھا ہے۔

ارشاد ہے کہ: جن میں یہ پانچ عادتیں ہو وہی سچے مؤمن ہیں، یوں تو ہر ایک اپنے آپ کو مؤمن ہی کہتا ہے، کافر کے لفظ سے کوئی خوش نہیں ہوتا لیکن کام تو جب بنے گا جب اپنے اخلاق اور عملوں سے بھی ثابت کر دے گا کہ میں واقعی مؤمن ہوں، ایسے لوگوں کیلئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں اونچے درجے ہیں ان کے درجے کے مطابق ان کو اللہ تعالیٰ اپنی نزدیکی اور قرب کا مرتبہ عطا فرمائیں گے ان کی معمولی کوتاہیاں اور بھول چوک معاف کر دی جائیں گی اور ان کو کھانے، پینے، آرام وراحت سے رہنے سہنے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت میں ہر وقت مگن رہنے کے سب سامان عطا کیئے جائیں گے اور وہ عزت کے ساتھ اپنی آرام گاہوں پر بیٹھے بیٹھے یہ سب کچھ پائیں گے۔

سمجھداروں نے ان آیتوں سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلامی برادری میں داخل ہونے کیلئے اللہ، پیغمبر اور

آخرت کا زبانی اقرار کافی ہے جو شخص اس کا اقرار کرے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے طریقے سے رہنا سہنا اختیار کرے وہ اسلام میں داخل ہوگیا اور اس کی حفاظت اور مدد مسلمانوں کے ذمہ واجب ہوگئی، اس کے بعد اسے چاہئے کہ دل کے اندر ایمان کی سچائی بٹھائے اور ان عادتوں کے دل سے اختیار کرنے کی کوشش کرتا رہے جن کا ذکر پچھلی آیت میں ہوا ہے۔

جن لوگوں میں یہ پانچ صفتیں پائی جائیں گی وہی سچے مؤمن ہوں گے کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کے ایمان تازہ ہوجاتے ہیں اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر توکل رکھتے ہیں، معاملہ تجارت کا ہو یا زراعت کا، صلح کا ہو یا جنگ کا، معیشت کا ہو یا معاشرت کا وہ لوگ کام انجام دے کر نتیجہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیتے ہیں وہ لوگ نماز کو قائم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، یہی مکمل ایمان والے لوگ ہیں اور ان جیسی صفتوں والی جماعت سے ہی اسلامی نظام قائم کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے وہی دنیا میں امن وامان قائم کرسکتے ہیں اور ان ہی کی سربراہی میں انصاف کا بول بالا ہوسکتا ہے، "سورۂ آل عمران" میں ہے کہ اگر تم پکے سچے مؤمن ہوگے تو دنیا میں تمہارا ہی سرا ونچا رہے گا اور جب تمہارے ایمان میں خرابی آجائے گی تو دنیا میں ذلیل وخوار ہوکر رہ جاؤ گے۔

لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ: ایسے لوگوں کیلئے ان کے رب کے ہاں درجے ہیں، "سورۂ احقاف" میں ہے کہ ہر آدمی کیلئے اس کے عملوں کے مطابق درجے ہوں گے، درجوں میں فرق عملوں کا نتیجہ ہوگا، ایمان جنت کے دروازے کی چابی ہے ایمان ہوگا تو جنت کا دروازہ کھل جائے گا مگر وہاں پر درجے عملوں کے اعتبار سے حاصل ہوں گے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: جنت کے سو درجے ہیں اور ہر درجہ ایک دوسرے سے اتنا بلند ہے جتنا زمین سے آسمان، غرضیکہ ایمان والوں کیلئے اپنی اپنی حیثیت خلوص اور کارگزاری کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ہاں درجے ہوں گے۔

مؤمنوں کیلئے دوسرا انعام اللہ تعالیٰ کی بخشش ہوگی دنیا میں جو غلطیاں ہوگئی تھی اس کی معافی مل جائے گی

یہ بھی بہت بڑا انعام ہے؛ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کی زبان سے کہلوایا کہ مولا کریم! ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا، "سورۂ اعراف" میں ہے کہ اگر آپ ہماری غلطیوں کو معاف نہیں کریں گے اور ہم پر رحم نہیں فرمائیں گے تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے، دنیا میں انسانوں سے بہت سی غلطیاں ہوں گی مگر مکمل ایمان والے لوگوں کو معافی مل جائے گی۔

تیسرا انعام یہ ہے کہ ایمان والوں کو باعزت روزی نصیب ہوگی، باعزت رزق آخرت میں تو یقیناً میسر ہوگا اور اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں کرسکتا کہ یہ کتنا بڑا انعام ہوگا مگر اس دنیا میں بھی اطاعت کے ساتھ حلال رزق نصیب ہو جائے تو اس سے بلند کوئی روزی نہیں، باعزت رزق اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے بالمقابل آیا ہے کہ جو کچھ خرچ کیا اس سے بہت بہتر اور بہت زیادہ اس کو آخرت میں ملے گا۔

لڑائی کیسے ہوئی

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ

جس طرح نکالا آپ کو رب آپکے نے سے گھر آپکے لئے ٹھیک کام کے اور بیشک ایک گروہ میں سے

الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ

ایمان والوں پسند نہ کرتا تھا (۵) جھگڑتے تھے وہ آپ سے میں ٹھیک بات بعد اسکے کہ وہ ظاہر ہو چکی تھی

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶ؕ

گویا کہ وہ چلائے جا رہے ہیں طرف موت کی اس حال میں کہ وہ دیکھ رہے ہیں (۶)

بامحاورہ ترجمہ: جیسے آپ کو آپ کے رب نے حق کام کے واسطے آپ کے گھر سے نکالا اور مؤمنوں کی ایک جماعت راضی نہ تھی۔ (۵) وہ آپ سے حق بات میں اس کے ظاہر ہو جانے کے بعد جھگڑتے تھے گویا کہ وہ آنکھوں سے دیکھتے دیکھتے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔ (۶)

تفسیر

پچھلی آیتوں میں غنیمت کے مال کے بارے میں حکم ہوا تھا کہ یہ مال اللہ تعالیٰ کا ہے وہ اپنے پیغمبر کے ذریعے جسے چاہے گا اسے بانٹے گا اس بات کو اس آیت میں اور اس سے آگے کی آیتوں میں خود بدر کی لڑائی کے بڑے بڑے واقعات بیان کر کے سمجھایا گیا ہے کہ ان واقعات پر غور کرو اور سوچو کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے حکم سے واقع ہوئے، شروع سے لے کر آخر تک تمہاری مرضی کو ان میں کوئی دخل نہیں، پھر اس میں تمہاری فتح بھی صرف اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہوئی ورنہ تمہارے پاس فتح کا کچھ سامان نہ تھا، پھر اب تم مال پر اپنا حق کیسے بتاتے ہو؟ ظاہر ہے کہ جس کی مرضی سے جنگ ہوئی اور جس کی مدد سے فتح ہوئی وہی اس مال کا مالک ہے۔

ارشاد ہے کہ: "انفال" (غنیمت کا مال) اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور یہ ویسی ہی بات ہے جیسے کہ ساری لڑائی شروع سے آخر تک ہوئی، شروع میں اللہ تعالیٰ ہی نے اے پیغمبر! آپ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ کافروں سے بدلہ لینے کا یہی موقعہ ہے ورنہ مسلمانوں کی ایک جماعت تو شروع ہی سے لڑائی کرنے سے ہچکچا رہی تھی اور جب آگے چل کر سوداگروں کے قافلے سے نہیں بلکہ خود مسلح لوگوں کے لشکر سے مقابلہ آپڑا تو بہت سے لوگ جھگڑنے لگے اور ان پر ایسا خوف طاری ہوا کہ گویا ان کو جان بوجھ کر موت کے گڑھے کی طرف ہانکا جا رہا ہے مگر یہ اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی تھی کہ قریش سے مقابلہ ہو اور نہتے مسلمانوں کی فتح ہو۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ : جس طرح نکالا آپ کے پروردگار نے آپ کو آپ کے گھر سے حق کے ساتھ، یہاں پر مفسرین نے بہت سی باتیں بیان کی ہیں مگر واضح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایمان والوں کو گھروں سے نکالنا دشمنوں سے ٹکرانا اور پھر فتح دلانا اس کی تدبیر اور مصلحت کے مطابق تھا اس واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ مکی زندگی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کافروں کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اٹھاتے تھے چونکہ اس وقت تک تنظیم نہیں تھی؛ اس لئے جہاد کا حکم بھی نہیں تھا مگر اللہ تعالیٰ کا حکم یہی تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے

رکھو، پھر جب مدنی زندگی میں آ کر مسلمانوں نے قوت جمع کر لی تو اللہ تعالیٰ نے جہاد کی اجازت دے دی، پھر نہ صرف اپنا دفاع کرنے کا حکم ہوا بلکہ آگے بڑھ کر دشمن پر کاری ضرب لگانے کی بھی اجازت مل گئی، بدر کی جنگ کا واقعہ ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ بمطابق مارچ ۶۲۴ء میں پیش آیا اس واقعے سے پہلے بھی کافروں کے ساتھ چند ایک معمولی جھڑپیں ہو چکی تھیں جن میں سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذات العشیر ہ کی جنگ کا ذکر بھی کیا ہے مگر سب سے پہلا بڑا معرکہ بدر میں ہی پیش آیا۔

اسلام والوں کی مدینہ میں ہجرت کے بعد بھی مکہ کے مشرکوں کی اسلام دشمنی میں کمی نہ آئی تھی بلکہ وہ مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کیلئے ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے تھے اس سے پہلے جب کچھ مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تو اس موقع پر کافروں نے اپنے آدمی حبشہ کے بادشاہ کے پاس بھیج کر اسے مسلمانوں سے بدگمان کرنے کی کوشش کی تھی، تحفے تحائف بھی بھیجے مگر ان کی دال نہ گلی اسی طرح وہ مدینہ والوں کو بھی ڈراتے رہتے تھے کہ تم نے مسلمانوں کو پناہ دی ہے، لہٰذا ہم مسلمانوں کے ساتھ تمہیں بھی نیست و نابود کر دیں گے، مکہ کے کافروں نے یہودیوں کے ساتھ مل کر بھی مسلمانوں کے خلاف کئی ایک سازشیں کیں مگر کامیاب نہ ہو سکے، بہر حال مشرک لوگ مسلمانوں کو مدینہ میں بھی سکون و چین کی زندگی نہیں بسر کرنے دیتے تھے بلکہ ہر وقت ڈراتے دھمکاتے رہتے تھے۔

ان حالات میں مسلمان بھی اپنے دفاع اور کافروں پر چوٹ لگانے کے منصوبے بناتے رہتے تھے مکہ کے تاجر پیشہ لوگوں کا معمول تھا کہ وہ سردی کے موسم میں یمن جیسے گرم علاقے کی طرف تجارت کیلئے جاتے تھے اور گرمیوں میں شام و فلسطین جیسے سرد علاقوں کا سفر کرتے تھے اس دوران مکہ کے مشرکوں نے پچاس ہزار دینار کے تجارتی سامان کے ساتھ اپنا ایک قافلہ شام کی طرف روانہ کیا یہ قافلہ ڈیڑھ سو اونٹوں پر مشتمل تھا جس کی نگرانی کیلئے ابوسفیان اور عمرو ابن العاص کی نگرانی میں چالیس آدمی ساتھ تھے قافلہ روانہ کرتے وقت مشرکوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس قافلے کا سارا منافع مسلمانوں کے خلاف تیاری پر خرچ کیا جائے گا جب یہ قافلہ شام سے

واپس مکہ کی طرف آرہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اس کی خبر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی آپ نے مدینہ کے مسلمانوں کو جمع کیا اور اس کی خبر دی اور یہ بھی بتایا کہ اس قافلے کا سارا منافع تمہارے خلاف استعمال ہونے والا ہے، لہٰذا یہ طے پایا کہ اس قافلے کا پیچھا کیا جائے اور اس سے پہلے کہ یہ مکہ پہنچ کر ہمارے خلاف استعمال ہوا سے راستے ہی میں پکڑ لیا جائے چونکہ اس موقع پر کافروں کے ساتھ کسی جنگ کا ارادہ نہیں تھا، لہٰذا مسلمان جنگی سامان کے بغیر ہی قافلے کے پیچھے نکل کھڑے ہوئے اس مہم میں سب کا شریک ہونا بھی ضروری نہیں تھا، لہٰذا جتنے آدمی بھی جا سکے روانہ ہو گئے اس کے لئے زور نہ دیا گیا۔

ادھر قافلے والے بھی چوکنا تھے انہوں نے بھی جاسوس چھوڑ رکھے تھے ان کو اطلاع مل گئی کہ مسلمان ان کے قافلہ پر حملہ آور ہونے والے ہیں، چنانچہ ابوسفیان نے ایک تیز رفتار اونٹنی سوار کو مدد کیلئے بھیجا اس نے عربوں کے دستور کے مطابق اونٹنی کے ناک کان کاٹ دیئے کجاوہ الٹا رکھ دیا اور اپنے کپڑے آگے پیچھے سے پھاڑ دیئے وہ لوگ سخت خطرے کے وقت ایسے ہی کیا کرتے تھے، چنانچہ ابوسفیان کا قاصد جب اس حال میں مکہ پہنچا تو وہاں ہلچل مچ گئی ابوجہل نے خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اعلان کیا کہ مسلمان تمہارے تجارتی قافلے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، لہٰذا ان کی مدد کیلئے تیار ہو جاؤ اس طرح مسلمانوں سے مقابلے اور قافلے کی مدد کیلئے مکے میں زور و شور سے تیاری شروع ہو گئی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی چار پھوپھیاں تھیں ان میں سے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا تو ایمان لے آئیں مگر دو کفر کی حالت میں ہی مریں، عاتکہ کے متعلق دونوں قسم کی روایتیں ہیں مگر زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ بھی ایمان لے آئی تھیں جن دنوں مکہ میں مسلمانوں کے خلاف غم و غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی عاتکہ نے خواب دیکھا کہ ایک فرشتہ آسمان سے اترا ہے اس نے پہاڑ سے ایک پتھر لے کر اس طریقے سے مارا ہے کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور مکے کے ہر گھر میں ایک ایک ٹکڑا گرا ہے اس نے یہ خواب اپنے بھائی عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان کیا جنہوں نے آگے دوسروں کو بتایا تو اس خواب کا عام چرچا ہو گیا اس پر ابوجہل کو بڑا غصہ آیا کہنے لگا پہلے اس خاندان کے مرد پیغمبری کا

دعویٰ کرتے تھے اب عورتیں بھی دعویٰ کررہی ہیں اور کہا یہ سب فضول ہے کسی وہم میں مبتلا نہ ہو مسلمانوں کے خلاف نکل کھڑے ہو اس طرح اس نے اپنے آدمیوں کو زبردستی ساتھ ملا لیا۔

ادھر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ۳۱۳ یا ۳۱۹ صحابہ کی جماعت کے ساتھ تجارتی قافلے کا پیچھا کرنے کیلئے نکلے جب "وادی ذفران" میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حالات سے باخبر کر دیا قافلے والوں کو مسلمانوں کی تیاری کی خبر پہنچ چکی تھی انہوں نے مشہور راستہ چھوڑ کر سمندر کے ساحل کا راستہ اختیار کر لیا جو کہ اگر چہ قدرے لمبا تھا مگر نسبتاً محفوظ تھا ادھر ابوجہل بھی مکہ کے مشرکوں کے ساتھ نکلا اس کا مقصد تو تجارتی قافلے کی حفاظت تھا مگر جب وہ بدر کے مقام پر پہنچا تو مسلمانوں کی جماعت "وادی ذفران" میں پہنچ چکی تھی جب مسلمانوں کو خبر ملی کی قافلہ سمندر کے ساحل کی طرف ہو گیا ہے اور ابوجہل مکے سے لشکر لے کر چل نکلا ہے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آئندہ کیلئے مشورہ فرمایا اور ساتھ ہی مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دے دی کہ دو باتوں میں سے ایک ضرور تمہیں حاصل ہوگی یا تو قافلہ تمہارے ہاتھ آئے گا یا تمہیں جنگ کے میدان میں فتح حاصل ہوگی اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم پر لبیک کہنے کو تیار تھے مگر انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے کچھ مختلف تھی وہ جنگ کے ارادے سے تو نکلے نہیں تھے آدمی بھی تھوڑے تھے اور اسلحہ بھی پاس نہ تھا سواریاں بھی نہیں تھیں، لہٰذا ان کی رائے یہ تھی جنگ کا خطرہ مول نہ لیا جائے اور اس کے بجائے تجارتی قافلے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ اس کی حفاظت کیلئے چالیس آدمی تھے تو انہیں آسانی کے ساتھ دبوچا جا سکتا ہے۔

بہر حال جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا تو بعض نے تصدیق کی اور بعض خاموش رہے آپ بار بار فرماتے تھے کہ اس معاملہ میں مشورہ دو اس موقع پر حضرت مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ جو مہاجرین میں سے تھے کھڑے ہوئے اور عرض کیا، اے پیغمبر! آپ جس طرح حکم دیں گے ہم کر گزریں گے، آپ کے ایک اشارے پر ہم خشکی اور سمندر میں ہر جگہ جانے کو تیار ہیں اور ہر مشکل سے مشکل مقام میں گھس جائیں گے، ہم

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی طرح آپ سے یہ نہیں کہیں گے کہ ''تم اور تمہارا خدا جا کر لڑو ہم تو یہیں بیٹھیں گے''، ہم تو اپنی جان پر کھیل جائیں گے آپ نے اس پیش کش کی تعریف فرمائی، اس کے بعد فرمایا: لوگو! مشورہ دو آپ کی بات کا رُخ مدینہ کے انصار کی طرف تھا اس پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے تقریریں کیں اور عرض کیا اے پیغمبر! ہم آپ کے ہر حکم مانیں گے آپ کے اشارے پر ہم عدن ابین تک جانے کو تیار ہیں جو کہ مکہ سے بہت دور ہے، پیغمبر مدینہ کے انصار کی طرف سے بھی مطمئن ہو گئے اور اس خوشی کا اظہار فرمایا: چلو! اللہ تعالیٰ کی برکت سے، یعنی: بدر کی طرف چلو، جہاں ابو جہل اپنے لشکر کے ساتھ پہنچ چکا تھا اسی سورۃ میں ساری تفصیلات آ رہی ہیں کہ مشرکوں نے بدر کے مقام پر پہنچ کر اچھی جگہ پر پہلے ہی قبضہ کر لیا تھا تاہم بڑے گھمسان کی جنگ ہوئی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی ہر طرف مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی اور اس طرح ایمان والوں کا غلبہ شروع ہو گیا۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اسی واقعہ کو بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اس کی تدبیر اور مرضی کافروں کو مغلوب کرنا تھا، حالانکہ ایمان والوں میں سے ایک گروہ اس کو ناپسند کرتا تھا وہ کہتے تھے کہ بے سروسامانی کی حالت میں جنگ کیسے کر سکیں گے، بعض کہتے تھے کہ جنگ کے بجائے قافلے کا پیچھا کرنا چاہئے، وہ حق بات میں آپ سے جھگڑا کرتے ہیں اس کے بعد کہ بات واضح ہو چکی ہے گویا کہ وہ موت کی طرف چلائے جا رہے ہیں اس حال میں کہ وہ دیکھ رہے ہیں مطلب یہ ہے کہ ان پر یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ دونوں میں سے ایک فائدہ ضرور تم کو حاصل ہو گا یا تو قافلہ ہاتھ آئے گا یا جنگ میں فتح ہو گی۔

تجارتی قافلے کے بدلے لشکر ملا

وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ

اور جب وعدہ کرتا تھا تم سے اللہ ایک کا دو گروہوں میں سے کہ وہ لئے تمہارا اور تم پسند کرتے تھے کہ

غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ

بغیر والا کانٹے ہوجائے لئے تمہارے اور ارادہ کرتا ہے اللہ کہ حق ثابت کردے حق کو

بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷﴾

سے حکم اپنے اور کاٹ دے جڑ کافروں کی (۷)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور جس وقت تم سے اللہ دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کرتا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گی اور تم چاہتے تھے کہ تم کو وہ ملے جس میں کانٹا نہ لگے (یعنی: تجارتی قافلہ کا مال مل جائے اور جنگ کی مشقت نہ برداشت کرنی پڑے) اور اللہ چاہتا تھا کہ سچ کو اپنے حکم کے ذریعہ سچا کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ ڈالے۔(۷)

تفسیر

مسلمانوں کو مدینہ میں آئے ہوئے ایک سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ ہوا تھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آپس میں مل جل کر آرام سے بسا دیا تھا لیکن مکہ والوں کی طرف سے ہر وقت کھٹکا لگا ہوا تھا اور یقین تھا کہ وہ اپنی حرکتوں سے کبھی باز نہ آئیں گے؛ اس لئے آپ مدینہ کے اردگرد ماحول کی خبر رکھنے کیلئے کچھ جماعتیں بھیجتے رہتے تھے اور مکہ کے کافروں کی نقل وحرکت کی خبر رکھنے کی تاکید فرماتے تھے، آخر ایک دن خبر پہنچی کہ شام سے تاجروں کا ایک قافلہ بہت کچھ مال ودولت اور ساز وسامان لے کر مکہ واپس آرہا ہے اور مدینہ کے قریب سے اس کے گزرنے کا راستہ ہے، قافلہ کا سردار ابوسفیان تھا اس نے ایک اونٹنی سوار کو مکہ کی طرف دوڑا دیا کہ قافلہ کی حفاظت کیلئے دوڑو مسلمانوں کے حملہ کا خطرہ ہے یہ سنتے ہی مکہ کے سارے بڑے بڑے لوگ لڑنے کی تیاری کر کے نکل کھڑے ہوئے ادھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر مدینہ سے نکل پڑے، مسلمانوں کا خیال تھا کہ تجارتی قافلہ ہاتھ آجائے گا اور کسی خاص مقابلے کے بغیر دشمنوں کے مال پر قبضہ ہوجائے گا، لیکن ہوا یہ کہ قافلہ کو ابوسفیان مدینہ سے بچا کر دوسرے راستہ سے لے کر نکل گیا اور مکہ سے جو لشکر اس کو بچانے کیلئے آیا تھا اس سے مسلمانوں کا بدر

کے مقام پر آمنا سامنا ہوا۔

اس آیت میں اس کا بیان ہے کہ تم چاہتے تھے کہ بغیر لڑے بھڑے دشمن کا مال نقصان پہنچاؤ، لیکن اللہ تعالیٰ عالم الغیب نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ تمہارا جنگی لشکر سے مقابلہ ہو اور کافروں کو شکست ہو اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے حق کا حق ہونا دنیا پر ظاہر ہو جائے اور باطل مٹ جائے کافروں کو شکست بھی ایسی ہوئی کہ ان کی جڑ ہی کٹ گئی۔

اس آیت میں تجارتی قافلے پر قبضہ چاہنے والے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تمہیں تو اپنی سہولت پسندی اور خطرات سے بچنے کے پیش نظر یہی پسند تھا کہ تجارتی قافلہ پر تمہارا قبضہ ہو جائے مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ اسلام کا اصل مقصد حاصل ہو، یعنی: حق کا حق ہونا واضح ہو جائے اور کافروں کی جڑ کٹ جائے اور ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ فوج سے مقابلہ اور اس پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ اور غلبہ ہو۔

جنگِ بدر کی غرض

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸ اِذْ
تاکہ غالب کر دکھائے حق کو اور جھوٹ کر دکھائے جھوٹ کو اور اگرچہ ناپسند کریں گناہگار (۸) جب

تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ
فریاد کرنے لگے تم سے رب اپنے پس جواب دیا اس نے تم کو کہ میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ساتھ ہزار کے میں سے

الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝۹
فرشتوں آنے والے ایک دوسرے کے پیچھے (۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔تاکہ سچ کو سچا کر دکھائے اور جھوٹ کو جھوٹا کر دکھائے اگرچہ (اللہ تعالیٰ کے) مجرم اس کو ناپسند کریں۔(۸) جب تم اپنے رب سے فریاد کرنے لگے تو وہ تمہاری فریاد کو پہنچا کہ میں تمہاری مدد کو لگاتار

آنے والے ہزار فرشتے بھیجوں گا۔ (۹)

تفسیر

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ تجارتی قافلہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور مکہ سے آنے والے لشکر سے مقابلہ ہو، تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا کرشمہ دکھائیں اور تھوڑے سے نہتے مسلمان اپنے سے تگنے مسلح آدمیوں کو ماریں اور قید کریں تاکہ سچی بات دنیا میں واضح ہو جائے، مجرم، یعنی: کافر لوگ کتنی ہی ناراضگی ظاہر کریں اور ان کو اپنا شکست کھا جانا کتنا ہی ناگوار گزرے تم اپنے آپ کو ان کے مقابلہ کے قابل نہ سمجھتے تھے اپنی تعداد کی کمی تمہیں پریشان کر رہی تھی تم نے اللہ تعالیٰ کے آگے مدد کیلئے ہاتھ پھیلا دیا اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد قبول کر لی اور کہا کہ میں ہزار فرشتے تمہاری مدد کیلئے بھیجوں گا جو لگا تار ایک دوسرے کے پیچھے آتے رہیں گے فرشتے انسان کو دکھائی نہیں دیتے لیکن اس کا اثر دل پر فوراً پڑتا ہے اور اطمینان پیدا ہوتا ہے، آدمی کو مشکل کے موقعہ پر دعا کے بعد اگر اطمینان محسوس ہو اور پریشانی جاتی رہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ فرشتے اس کی مدد کر رہے ہیں۔

تیسری اور چوتھی آیتوں میں اس واقعہ کا بیان ہے جو مسلح فوج سے مقابلہ ٹھن جانے کے بعد پیش آیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ آپ کے ساتھی صرف تین سو تیرہ اور وہ بھی اکثروں کے پاس پتھر بھی نہیں ہیں اور مقابلہ پر تقریباً ایک ہزار جوانوں کا لشکر ہے تو اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں مدد کی دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے آپ دعا مانگتے تھے اور صحابہ کرام آپ کے ساتھ آمین کہتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے یہ کلمات نقل فرمائے۔

> ''یا اللہ! مجھ سے جو وعدہ آپ نے فرمایا ہے اس کو جلد پورا فرما دیجئے، یا اللہ! اگر مسلمانوں کی یہ تھوڑی سی جماعت فنا ہوگئی تو پھر زمین مین کوئی آپکی عبادت کرنے والا باقی نہ رہے گا کیونکہ ساری زمین کفر و شرک سے بھری ہوئی ہے، یہی چند مسلمان ہیں جو صحیح عبادت بجالاتے ہیں''۔

پیغمبر ﷺ برابر اسی طرح آہ وزاری کے ساتھ دعا میں مشغول رہے یہاں تک کہ آپ کے کاندھوں سے چادر بھی سرک گئی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر چادر اوڑھائی اور عرض کیا اے اللہ کے پیغمبر! آپ زیادہ فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ آپ کی دعا ضرور قبول فرمائیں گے اور اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے۔

آیت میں "اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ" کے الفاظ سے یہی واقعہ مراد ہے جس کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے اور مدد طلب کر رہے تھے، یہ فریاد کرنا اگرچہ دراصل پیغمبر ﷺ کی طرف سے ہوا تھا مگر تمام صحابہ آمین کہہ رہے تھے؛ اس لئے پوری جماعت کی طرف منسوب کیا گیا۔

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے جو بے مثال قوت وطاقت عطا فرمائی ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے جو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی زمین کا تختہ الٹنے کے وقت پیش آیا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ایک پر کے ذریعہ یہ تختہ الٹ دیا ایسی بے مثال طاقت والے فرشتوں کی اتنی بڑی تعداد مقابلہ میں بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی ایک بھی کافی تھا مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی فطرت سے واقف ہیں کہ وہ تعداد سے بھی متاثر ہوتے ہیں؛ اس لئے مقابل فریق کی تعداد کے مطابق فرشتوں کی تعداد بھیجنے کا وعدہ فرمایا، تاکہ ان کے دل پوری طرح مطمئن ہوجائیں۔

خوشی اور اطمینان

وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَ لِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَ مَا

اور نہیں کیا اس کو اللہ نے مگر خوشخبری اور تاکہ مطمئن ہوجائیں ساتھ اس کے دل تمہارے اور نہیں

النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾ ع ۱۰ ۱۵

مدد مگر سے طرف اللہ کی یقیناً اللہ زبردست حکمت والا ہے (۱۰)

بامحاورہ ترجمہ: اور یہ تو اللہ نے صرف خوشخبری دی تاکہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہوجائیں اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، بیشک اللہ طاقت والا حکمت والا ہے۔ (۱۰)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ فرشتوں کی مدد ایک زبردست خوشخبری ہے جس سے تمہارے دل مضبوط ہوں گے اللہ تعالیٰ کی مدد کی بہت سی صورتیں ہیں لیکن جس طرح کی بھی مدد ہو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، اس نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ جن کا ایمان پختہ ہوگا وہ ڈھل مل یقین والوں پر یقینا غالب آئیں گے فتح و کامیابی کا دار و مدار نہ اس ظاہری ساز و سامان پر ہے اور نہ لڑنے والوں کی تعداد پر، بلکہ وہ دل کے اطمینان اور مضبوطی پر ہے جو صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس پر پورا بھروسہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہیں اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ فرشتوں کا کام ایمان والوں کے دلوں کو مطمئن کرنا تھا تاہم اسی ضمن میں اِکا دُکا ایسے موقعے بھی پیش آئے جب فرشتوں نے کافروں پر وار بھی کیا، مقصد مسلمانوں کو یقین دلانا تھا کہ ان کی مدد کیلئے فرشتے موجود ہیں، چنانچہ ان کے حوصلے بلند ہو گئے وہ کافروں پر ٹوٹ پڑے اور آخر اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی۔

بدر کی جنگ میں جو اللہ تعالیٰ نے فرشتے مدد کیلئے بھیجے ان کی تعداد اس جگہ ایک ہزار ذکر ہے اور "سورۂ آل عمران" میں تین ہزار اور پانچ ہزار ذکر کی گئی ہے اس کا سبب دراصل تین مختلف وعدے ہیں جو مختلف حالات میں کئے گئے ہیں پہلا وعدہ ایک ہزار فرشتوں کا ہوا جس کا سبب پیغمبر ﷺ کی دعا اور عام مسلمانوں کی فریاد تھی، دوسرا وعدہ جو تین ہزار فرشتوں کا "سورۂ آل عمران" میں پہلے ذکر ہے وہ اس وقت کیا گیا جب مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ قریشی لشکر کیلئے مکہ سے اور مدد آ رہی ہے، "روح المعانی" میں ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر وغیرہ میں شعبی کی روایت سے منقول ہے کہ مسلمانوں کو بدر کے دن یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکوں کی مدد کیلئے مزید لشکر لے کر آ رہا ہے اس خبر سے مسلمانوں میں پریشانی پیدا ہوئی اس پر "آل عمران" کی آیت اتری جس میں تین ہزار فرشتے مدد کیلئے آسمان سے اتارنے کا وعدہ ذکر کیا گیا۔

تیسرا وعدہ پانچ ہزار کا اس شرط کے ساتھ تھا کہ اگر مخالف گروہ نے یکبارگی حملہ کر دیا تو پانچ ہزار فرشتوں کی مدد بھیج دی جائے گی وہ "آل عمران" کی آیت کے بعد کی آیت میں اس طرح ذکر ہے کہ اگر تم ثابت قدم رہے اور تقویٰ پر قائم رہے اور مقابل لشکر یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑا تو تمہارا رب تمہاری مدد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا جو خاص نشان، یعنی: خاص وردی میں ہوں گے۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ: اس وعدہ میں تین شرطیں تھیں ایک ثابت قدمی دوسرے تقویٰ تیسرے مخالف فریق کا یکبارگی حملہ، پہلی دو شرطیں تو صحابہ کرام میں موجود تھیں اور اس میدان میں اول سے آخر تک ان میں کہیں فرق نہیں آیا، مگر تیسری شرط یکبارگی حملہ کی واقع نہیں ہوئی؛ اس لئے پانچ ہزار فرشتوں کے بھیجنے کی نوبت نہ آئی، اس لئے معاملہ ایک ہزار اور تین ہزار تک رہا جس میں یہ بھی احتمال ہے کہ تین ہزار سے مراد یہ ہو کہ ایک ہزار جو پہلے بھیجے گئے ان کے ساتھ مزید دو ہزار شامل کر کے تین ہزار کر دیئے گئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ تین ہزار اس سے پہلے ہزار کے علاوہ ہوں۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان تین آیتوں میں فرشتوں کی تین جماعتوں کے بھیجنے کا وعدہ ہے اور ہر جماعت کے ساتھ ایک خاص صفت کا ذکر ہے "سورۂ انفال" کی آیت جس میں ایک ہزار کا وعدہ ہے اس میں تو ان فرشتوں کی صفت میں "مُرْدِفِيْنَ" فرمایا ہے جس کے معنیٰ ہیں پیچھے لگانے والے اس میں شاید اس طرف پہلے ہی اشارہ کر دیا گیا کہ ان فرشتوں کے پیچھے دوسرے بھی آنے والے ہیں اور "سورۂ آل عمران" کی پہلی آیت میں فرشتوں کی صفت "مُنْزَلِيْنَ" ارشاد فرمائی، یعنی: یہ فرشتے آسمان سے اتارے جائیں گے اس میں اشارہ خاص اہمیت کی طرف ہے کہ زمین میں جو فرشتے پہلے سے موجود ہیں ان سے کام لینے کے بجائے خاص اہتمام کے ساتھ یہ فرشتے آسمان سے اسی کام کیلئے بھیجے جائیں گے اور "آل عمران" کی دوسری آیت جس میں پانچ ہزار کا ذکر ہے اس میں ملائکہ کی صفت "مُسَوِّمِيْن" ارشاد فرمائی ہے کہ وہ ایک خاص لباس اور علامت کے ساتھ ہوں گے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ بدر میں اترنے والے فرشتوں کے عمامے سفید اور حنین کی جنگ میں مدد کیلئے آنے والے فرشتوں کے عمامے سرخ تھے۔

مدد کی صورتیں

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَ يُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ

جب ڈال دی اس نے تم پر اونگھ تسکین کیلئے طرف سے اپنی اور اتارا پر تم سے آسمان

مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَ يُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَ لِيَرْبِطَ

پانی تا کہ پاک کرے تم کو ساتھ اسکے اور دور کردے سے تم گندگی شیطان کی اور تا کہ بندھن باندھ دے

عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾

پر دلوں تمہارے اور جمادے سے اس قدم (۱۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جس وقت اس نے تم پر اپنی طرف سے سکون کیلئے اونگھ ڈال دی اور تم پر آسمان سے پانی اتارا کہ اس سے تم کو پاک کردے اور تم سے شیطان کی گندگی (یعنی: شیطانی وسوسوں) کو دور کردے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کردے اور اس سے تمہارے قدم جمادے۔(۱۱)

تفسیر

ارشاد ہے کہ وہ وقت یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے اونگھ بھیج کر تمہارے دل میں چین اور سکون پیدا کردیا آسمان سے بارش برسائی تا کہ تم نہا دھو کر پاک صاف ہو، پانی سے پیاس بجھاؤ، شیطانی وسوسے دلوں سے دور ہوں، دل مضبوط ہوں، زمین جم جائے اور پاؤں جم کر زمین پر پڑنے لگیں۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کیلئے ایک تو فرشتوں کو بھیجا اور دوسری مدد اس طرح فرمائی کہ ان پر سکون ڈالنے کیلئے اونگھ ڈال دی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جس دن بدر کی جنگ ہوئی اس رات کوئی صحابی ایسا نہ تھا جو سویا نہ ہو اللہ تعالیٰ نے سب پر نیند ڈال دی اور وہ خوب سوئے صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری رات جاگ کر نماز پڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہے، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر نیند طاری کردینا اللہ تعالیٰ کی خاص

حکمت اور مسلمانوں کی فتح کی نشانی تھی، جنگ کے دوران نیند کا آنا مبارک ہوتا ہے اس کے برخلاف اگر نماز کے دوران نیند آئے تو یہ منحوس ہوتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں شیطان وسوسہ ڈالتا ہے، جنگ کے دوران نیند آجائے تو انسان کی دہشت دور ہوجاتی ہے اور آدمی پھر سے تازہ دم ہوجاتا ہے، چنانچہ بدر کی جنگ کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ مہربانی فرمائی کہ مسلمانوں پر نیند یا اونگھ ڈال دی جس سے وہ تازہ دم ہوکر بہتر طور پر جنگ کے قابل ہوگئے۔

اللہ تعالیٰ کا تیسرا انعام یہ ہوا کہ تم پر آسمان سے پانی اتارا، یعنی: بارش برسائی جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ مسلمانوں کے بدر کے میدان میں پہنچنے سے پہلے کافروں نے پکی جگہوں پر قبضہ کرلیا تھا اور مسلمانوں کے حصے میں ریتیلا علاقہ آیا تھا جہاں پاؤں دھنستے تھے اور سواری ٹھیک طور پر نہیں چل سکتی تھی اسی دوران بعض مجاہدین کو غسل کی ضرورت پڑ گئی مگر پانی نہیں تھا اور ساتھ شیطان نے وسوسے بھی ڈالنے شروع کردیئے مگر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بارش برسی جس کی وجہ سے مسلمانوں نے غسل کیا اور استعمال کیلئے پانی جمع بھی کرلیا، جانوروں کو پلایا اور مشکیزے بھر لیئے، اس کے علاوہ بارش کی وجہ سے ریت جم کر سخت ہوگئی اور سواریوں کو چلنے میں دقت نہ رہی ریتلا حصہ سخت ہوگیا جس کی وجہ سے مجاہدین کے پاؤں بھی جمنے لگے ادھر کافروں کے پاس پکی زمین والا نچلا علاقہ تھا وہاں دلدل ہوگئی اور ان کیلئے مشکلات پیدا ہونے لگیں، گویا بارش برسا کر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کیلئے آسانی اور کافروں کیلئے مشکل پیدا فرمادی۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر آسمان سے پانی اتارا تاکہ تمہیں اس کے ذریعے پاک کردے تم نے وضو اور غسل کیا طہارت حاصل کرلی، نیز اس سے یہ بھی مقصود تھا کہ اس کے ذریعے تم سے شیطان کے وسوسے کو دور کردے بارش ہونے سے پہلے شیطان دلوں میں وسوسہ ڈال رہا تھا کہ دیکھو! تم خود کے بارے میں کہتے ہو کہ ہم حق پر ہیں مگر تمہاری حالت یہ ہے کہ نہ تو تمہارے پاس اچھی جگہ ہے جس پر قدم جم سکے اور نہ تمہارے پاس پانی ہے جس سے تم اپنی ضروریات پوری کرسکو، چنانچہ جب بارش ہوگئی تو اس قسم کے شیطانی وسوسے دور ہوگئے اور مسلمانوں کے دل مطمئن ہوگئے؛ اسی لئے فرمایا کہ: بارش کا ہونا شیطان کے وسوسوں کو دور کرنے کیلئے بھی تھا اور اس لئے بھی کہ

تمہارے دلوں کو مضبوط کردے اور تمہارے قدموں کو جما دے ظاہری طور پر تو قدم اس لئے جم گئے کہ ریت جم گئی اور باطنی طور پر فرشتوں کو اتار کر مسلمانوں کے دلوں کو مطمئن کر دیا قدم جمانے کے یہ دونوں مطلب ہیں۔

جس جگہ پہنچ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم شروع شروع میں ٹھہرے اس جگہ کو حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ جانتے تھے اس جگہ کو انہوں نے جنگی اعتبار سے نامناسب سمجھ کر عرض کیا کہ اے اللہ کے پیغمبر! جو مقام آپ نے اختیار فرمایا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے جس میں ہمیں کوئی اختیار نہیں یا محض رائے اور مصلحت کے پیش نظر اختیار فرمایا گیا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ: نہیں! یہ کوئی اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں اس میں تبدیلی کی جاسکتی ہے تب حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ پھر تو بہتر ہے کہ اس مقام سے آگے بڑھ کر مکی سرداروں کے لشکر کے قریب ایک پانی کا مقام ہے اس پر قبضہ کیا جائے وہاں ہمیں پانی وافر مقدار کے ساتھ مل جائے گا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مشورہ قبول فرمایا اور وہاں جا کر پانی پر قبضہ کیا ایک حوض پانی کیلئے بنا کر اس میں پانی کا ذخیرہ جمع فرمایا، اس سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، اے اللہ کے پیغمبر! ہمارا خیال یہ ہے کہ ہم آپ کیلئے ایک خیمہ کسی محفوظ جگہ میں بنادیں جہاں آپ مقیم رہیں اور آپ کی سواریاں بھی آپ کے پاس رہیں، مقصد اس کا یہ ہے کہ ہم دشمن کے مقابلہ میں جہاد کریں گے اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح نصیب فرمائی تو یہی مقصد ہے اور اگر خدا نخواستہ کوئی دوسری صورت ہو تو آپ اپنی سواری پر سوار ہو کر ان صحابہ کرام کے ساتھ جا ملیں جو مدینہ طیبہ میں رہ گئے ہیں کیونکہ میرا گمان یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جانثاری اور آپ سے محبت میں ہم سے کم نہیں اور اگر ان کو آپ کے نکلنے کے وقت یہ خیال ہوتا کہ آپ کا اس جنگجو لشکر سے مقابلہ ہوگا تو ان میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہتا آپ مدینہ میں پہنچ جائیں گے تو وہ آپ کے ساتھی رہیں گے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس بہادرانہ اور دانشمندانہ پیش کش پر دعائیں دیں اور ایک مختصر سا خیمہ آپ کیلئے بنا دیا گیا جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر کے سوا کوئی نہ تھا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ دروازہ پر حفاظت کیلئے سوار لئے کھڑے تھے۔

فرشتوں کی مدد

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَٰٓئِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ

جب وحی بھیجی رب آپ کے نے طرف فرشتوں کی کہ میں ساتھ ہوں تمہارے پس جمائے رکھو ان کو جو ایمان لائے

سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ

عنقریب ڈالوں گا میں میں دلوں ان کے جو کافر ہوئے ڈر پس مارو اوپر

الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۚ﴿١٢﴾

گردنوں کے اور چوٹ لگاؤ ان کی ہر پور پر (۱۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جب آپ کے رب نے فرشتوں کو حکم بھیجا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، سو! تم مسلمانوں کو جمائے رکھو، میں کافروں کے دل میں انکی دہشت ڈال دوں گا، سو! انکی گردنوں پر مارو اور ان کے پوروں پر مارو۔ (۱۲)

تفسیر

اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے مسلمانوں کو دلیری اور بے باکی کے ساتھ کافروں سے لڑنے کی ہدایت کی گئی ہے اور لڑائی کا خاص طریقہ سکھایا ہے، اس آیت کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں کہا گیا ہے کہ آپ کے رب نے اس لڑائی کیلئے خاص تدبیریں کر دی ہیں فرشتوں کو بھیج کر ان کو ہدایت کر دی ہے کہ تمہارا کام مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرنا ہے، آپ کے رب نے فرشتوں کو حکم دیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم مسلمانوں کے دل بڑھاؤ اور شیطان جو وسوسے ڈال کر ان کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہا ہے اسے دور کرو اور فتح و کامیابی کی خوشخبری دو، دوسرے حصے میں مسلمانوں کو ارشاد ہے کہ: میں کافروں کے دل میں تمہارا رعب بٹھائے دیتا ہوں تم بے دھڑک ان کے بدن کے ان حصوں پر وار کرو جس سے وہ فوراً یا تو مر جائیں یا ان کا بدن

حرکت کے قابل ہی نہ رہے۔

یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کافروں کی گردنوں اور ان کے پور پر مارنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو دیا یا مجاہدین کو، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ لڑائی کرنا فرشتوں کا کام نہیں تھا یہ تو مجاہدین کو ہی انجام دینا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اسباب مہیا کر دیئے تو انہوں نے یہ کام بخوبی انجام بھی دیا، تاہم اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف سے وار کرنے کے اکادکا واقعات بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دکھا دیئے اس طرح کافروں کے دلوں میں رعب بھی طاری ہو گیا اور مسلمانوں کو فرشتوں کی مدد بھی حاصل ہو گئی اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی۔

اس آیت سے ظاہر یہی ہے کہ فرشتوں نے دونوں کام انجام دیئے، مسلمانوں کے دلوں میں ہمت قوت بھی بڑھائی اور لڑائی میں بھی حصہ لیا اور اس کی تائید چند حدیثوں سے بھی ہوتی ہے جو تفسیر "در منثور اور مظہری" میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور فرشتوں کی لڑائی کی آنکھوں دیکھی گواہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نقل کی ہیں۔

فسادیوں کی یہی سزا ہے

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ

یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے مخالفت کی اللہ اور پیغمبر اسکے سے اور جو سر اٹھائے خلاف اللہ کے اور

رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ

پیغمبر اسکے کے تو یقیناً اللہ سخت سزا دینے والا ہے (۱۳) تو تم چکھو اس کو اور یقیناً

لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

لئے کافروں کے عذاب ہے دوزخ کا (۱۴)

بامحاورہ ترجمہ: یہ اس واسطے ہے کہ وہ اللہ کے اور اس کے پیغمبر کے مخالف ہوئے اور جو اللہ کا اور اس کے پیغمبر کا مخالف ہوا تو بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے۔ (۱۳) یہ تو تم چکھ لو اور جان رکھو کہ کافروں کیلئے دوزخ کا عذاب ہے۔ (۱۴)

تفسیر

ارشاد ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی اور اس کے پیغمبر کی مخالفت کی ہے؛ اس لئے اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان پر مسلط کردیا ہے اس واقعہ کے بارے میں جو حدیثیں آئیں ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی وار کسی کافر پر اس لڑائی میں شاذ ونادر ہی خالی گیا ہوگا اور اکثر حملہ کرنے والوں نے بتایا ہے کہ ہم نے مارنے کیلئے ابھی ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اتنے میں کافر یا اس کا سر زمین پر گر بھی پڑا، گویا مارنے کے بجانے مارنے کا اشارہ ہی مخالف کا کام تمام کرنے کیلئے کافی تھا اس کی وجہ مسلمانوں کا رُعب اور فرشتوں کی مدد تھی۔

آگے کافروں سے خطاب ہے کہ یہ تو تمہارے لئے دنیا کی ذلت، رسوائی اور مصیبت ہے جو تمہارے کرتوتوں کی وجہ سے تم پر اتاری گئی اسے چکھو اور اپنے نصیبوں کو روؤ، اس کے بعد جب قیامت میں فرمانبرداروں کو انعام ملے گا تو تمہارے لئے حکم ہوگا کہ انہیں کھینچ کر دوزخ کی آگ میں جھونک دو جو کافروں کیلئے ہم نے تیار کر رکھی ہے۔

مکہ مکرمہ کی تیرہ سالہ زندگی میں ایمان والوں نے کافروں کے ہاتھوں سخت تکلیفیں برداشت کیں مگر جب ہجرت کر کے مسلمان مدینہ پہنچ گئے کافروں کی تکلیفوں سے چھٹکارا حاصل ہوا اور انہوں نے اسلامی حکومت قائم کر لی تو ڈیڑھ سال کے انتہائی کم عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی اس قدر حوصلہ افزائی فرمائی کہ مکہ کے کافروں کو شکست دیدی، ابھی کچھ دن پہلے ابوجہل نے کعبہ شریف کی چھت پر کھڑے ہو کر اپنے تجارتی قافلے کی حفاظت کے نام پر لوگوں کو نکالا تھا وہ بڑی شان وشوکت کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوئے تھے بہت زیادہ ساز و سامان تھا شراب کے مٹکے اور ناچنے گانے والی عورتیں حوصلہ افزائی کیلئے ساتھ تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے شکست سے دوچار کیا کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی سخت مخالفت کی تھی ایمان والوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی تھیں حتیٰ کہ ان کے ہجرت کر جانے کے بعد بھی ان کے خلاف منصوبے بناتے رہتے تھے کافروں کے اس جرم کے بدلے اللہ تعالیٰ کی سزا بھی بڑی سخت آئی، ستر بڑے بڑے کافر سردار مارے گئے اور ستر قیدی بنالیئے

گئے یہ تو دنیا کی سزا تھی اور آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے۔

یہ سزا تم نے دیکھ لی ہے اس کا مزہ چکھو، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بدر کے کنوئیں پر کھڑے ہو کر قتل ہونے والے کافروں سے خطاب فرمایا تھا، آپ نے نام لے لے کر کہا تھا اے فلاں! اے فلاں! اللہ تعالیٰ نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ تو پورا ہو گیا اب تم بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ تمہیں ذلیل کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کو تم نے سچا پایا یا نہیں؟ اسی لئے فرمایا کہ: اس عذاب کا مزہ چکھو، اور بیشک کافروں کیلئے دوزخ کی سزا ابھی باقی ہے جس کا خاتمہ کفر پر ہوگا وہ اس ہمیشہ کی سزا میں بھی ضرور مبتلا ہوگا دنیا میں سزا کے طور پر ساز وسامان گیا، آدمی مارے گئے، ذلیل وخوار ہوئے، کفر کا زور ٹوٹ گیا اور وہ مرعوب ہو گئے اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی وہ بے سروسامانی کی حالت میں تھے خدا کی رحمت کے سوا کوئی سہارا نہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں کھلم کھلا فتح عطا فرمائی جس سے مسلمانوں کا رعب ساری دنیا پر چھا گیا۔

میدان سے مت بھاگو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو جب ملو تم ان لوگوں سے جو کافر ہوئے لڑنے کو تو نہ پھیروان سے

الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ

پیٹھیں (۱۵) اور جو پھیرے ان سے اس وقت پیٹھ اپنی مگر گھات لگاتا ہوا لڑائی کی یا

مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ

ٹھکانا لے طرف اپنی جماعت کی پس تحقیق وہ لوٹا ساتھ غضب کے سے اللہ اور ٹھکانہ اس کا دوزخ ہے

وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾

اور بری ہے لوٹنے کی جگہ (۱۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والوں! جب تم کافروں سے جنگ کے میدان میں بھڑو تو ان سے پیٹھ مت پھیرو۔(۱۵) جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری مگر ہاں جنگی چال کے طور پر (دشمن کو دھوکہ میں ڈالنے کیلئے) یا (میدان جنگ سے ایک طرف ہو جائے تاکہ) اپنی جماعت کی طرف پناہ حاصل کر سکے (وہ مستثنیٰ ہے باقی جو بھی ایسا کرے گا) وہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں گر جائے گا اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔(۱۶)

تفسیر

ایمان والوں سے کہا جا رہا ہے کہ جب لڑائی ہو رہی ہو اور دونوں فریق آپس میں بھڑنے کیلئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے ہوں تو اس موقعہ پر لڑائی سے جان بچا کر موت کے خوف سے بھاگنا نامردی ہے ایسا تم ہرگز مت کرنا کہ لڑائی کے میدان میں خوف کے مارے پیٹھ دکھاؤ اور دشمنوں کے ڈر سے بھاگ جاؤ۔

ارشاد ہے کہ: جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لا چکے ان کو اپنے مخالفوں سے مقابلہ کے وقت ڈر کر بھاگنا نہیں چاہئے کیونکہ جب لڑائی کرنی ہی پڑ گئی تو مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہئے بھاگنے کے کیا معنٰی؟ جو شخص ایسے موقعہ پر بھاگے گا وہ گناہ گار ہوگا البتہ پیٹھ موڑ کر بھاگنا صرف دو موقعوں پر جائز ہو سکتا ہے، ایک تو یہ کہ لڑنے کے وقت کوئی داؤ کیا جائے اور پینترا بدل کر وار کرنا مقصود ہو تو جس طرف چاہے ہٹ سکتا ہے یا چھوٹی سی جماعت ہے اور بڑی جماعت سے مقابلہ آ پڑا ہے اور بڑا لشکر کسی قدر دور ہے تو یہ جماعت مقابلہ سے بھاگ کر بڑی جماعت کے اندر پناہ لے سکتی ہے ورنہ اور کسی حالت میں مقابلہ سے بھاگنا جائز نہیں، ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا جو بھاگے گا وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا حقدار ہوگا دنیا میں ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کرے گا اور آخرت میں اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا جو بہت بری جگہ ہے، "ترمذی شریف" میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ دشمن کے مقابلے کیلئے روانہ کیا لشکر کو وہاں کی صورتحال کے پیش نظر پیچھے ہٹنا پڑا تاہم انہیں سخت پریشانی ہوئی کہ کہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کوتاہی پر سزا کے مستحق نہ ٹھہریں، واپس آ کر انہوں نے صورتحال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی اور

ساتھ اپنی اس پریشانی کا بھی ذکر کیا، آپ نے فرمایا: فکر نہ کرو! تم بھاگنے والے نہیں بلکہ کمک حاصل کر کے دوبارہ حملہ کرنے والے ہو اور میں تمہارے لئے کمک ہوں تمہیں واپس لوٹ آنے پر کچھ ملامت نہیں تم دوزخ میں جانے والے نہیں ہو بلکہ اپنے گروہ کے پاس پہنچ جانے والے ہو تا کہ بہتر تدبیر نکالی جا سکے، تو فرمایا: ان دو صورتوں کے علاوہ اگر کوئی مسلمان جنگ سے بھاگ آئے گا تو وہ خدا کے غضب کا نشانہ بنے گا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ میں ہوگا، بہر حال دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا بہت عظیم قانون ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: دشمن کے ساتھ ٹکر لینے کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ سے خیر و عافیت کا سوال کیا کرو، فرمایا: جب دشمن سے آمنا سامنا ہو ہی جائے تو جان لو کہ جنت تلواروں کے سایہ میں ہے جب تم پر جنگ ٹھونس دی جائے تو پھر ڈٹ کر مقابلہ کرو اور پیٹھ نہ دکھاؤ، اللہ تعالیٰ نے "سورۂ بقرہ" میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھیوں کا ذکر فرمایا ہے، انہوں نے بھی خدا تعالیٰ سے یہی دعا کی تھی کہ اے اللہ! ہمیں صبر عطا کر اور ہمارے قدموں کو دشمن کے مقابلے میں مضبوط کر دے اور ہمیں کافروں کے خلاف مدد عطا فرما، غرضیکہ ثابت قدمی جنگ کا پہلا قانون ہے۔

جنگ سے پیٹھ پھیرنا کب جائز ہے؟

بدر کی جنگ میں یہ آیتیں اتریں اس وقت یہی حکم عام تھا کہ خواہ کتنی ہی بڑی تعداد سے مقابلہ ہو جائے اور اپنی تعداد سے ان کی کوئی نسبت نہ ہو پھر بھی پیٹھ پھیرنا اور میدان چھوڑنا جائز نہیں، بدر کے میدان میں یہی صورت تھی کہ تین سو تیرہ کا مقابلہ تگنی تعداد، یعنی: ایک ہزار سے ہو رہا تھا بعد میں اس معاملے میں رعایتی حکم "سورۂ انفال" کی آیت (۶۵) اور (۶۶) میں اترا، اور آیت (۶۵) میں بیس مسلمانوں کو دو سو کافروں کے اور سو مسلمانوں کو ایک ہزار کافروں کے مقابلہ میں جہاد کرنے کا حکم ہے اور آیت (۶۶) میں مزید نرمی کا یہ قانون اتارا کہ اب اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے آسانی کر دی اور تمہاری کمزوری کے پیش نظر یہ قانون جاری کر دیا کہ اگر مسلمان سو آدمی ثابت قدم ہوں تو دو سو کافروں پر غالب آسکیں گے، اس میں اشارہ کر دیا کہ اپنے سے دوگنی تعداد تک تو

مسلمانوں ہی کے غالب رہنے کی توقع ہے؛ اس لئے پیٹھ پھیرنا جائز نہیں، ہاں! مخالف گروہ کی تعداد دوگنی سے بھی زیادہ ہوجائے تو ایسی حالت میں میدان چھوڑ دینا جائز ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کہ: جو شخص اکیلا تین آدمیوں کے مقابلہ سے بھاگا وہ بھاگا نہیں، ہاں! جو دو آدمیوں کے مقابلہ سے بھاگا وہ بھاگنے والا ہے، یعنی: کبیرہ گناہ کرنے والا ہے اب یہی حکم قیامت تک باقی ہے، جمہور امت اور چاروں اماموں کے نزدیک شرعی حکم یہی ہے کہ جب تک مخالف گروہ کی تعداد دوگنی سے زیادہ نہ ہو اس وقت تک جنگ کے میدان سے بھاگنا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔

صحیحین "صحیح بخاری و صحیح مسلم" میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سات کاموں کو انسان کیلئے ہلاک کرنے والا فرمایا ہے، ان میں جنگ کے میدان سے بھاگنے کو بھی شمار فرمایا ہے۔

جو کیا اللہ نے کیا

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ

پس ان کو نہیں قتل کیا تم نے اور لیکن اللہ نے قتل کیا ان کو اور نہیں پھینکا آپ نے جب پھینکا آپ نے

وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَ لِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ

اور لیکن اللہ نے پھینکا اور تاکہ کرے وہ مؤمنوں پر طرف سے اپنی احسان اچھا تحقیق

اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾

اللہ سننے والا جاننے والا ہے (۱۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ سو! آپ نے ان کو نہیں مارا، لیکن اللہ نے ان کو مارا اور آپ نے مٹھی بھر خاک جس وقت پھینکی تو آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی اور تاکہ ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان کرے، بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (۱۷)

تفسیر

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی کیا مجال جو کچھ کر سکے جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کرتا ہے مسلمانوں نے کافروں کو قتل کیا؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ وہ قتل ہوں۔

ارشاد ہے کہ: اے مسلمانو! تم تو کافروں کو کیا قتل کرتے ان کو تو ہم نے قتل کیا، پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: آپ نے خاک کی مٹھی جو کافروں کی طرف پھینکی تھی وہ آپ نے نہیں اصل میں اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی اور اسی وجہ سے اس کا اثر ایسا ہوا کہ ان کی جان پر بن گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ اس لڑائی میں مسلمان جیتیں اور ان کو دنیا میں عزت اور غلبہ حاصل ہو۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جب بدر کی لڑائی زوروں پر تھی تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ: آپ ایک مٹھی بھر مٹی لے کر دشمن کی طرف پھینکیں، چنانچہ طبرانی کی روایت میں آتا ہے کہ آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مٹھی بھر مٹی اٹھانے کو فرمایا، انہوں نے دی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے کافروں کی طرف پھینک دی اور زبان سے فرمایا: "شَاهَتِ الْوُجُوْهُ" کافروں کے چہرے ذلیل وخوار ہو جائیں خدا کی قدرت وہ مٹی ہر کافر کی آنکھ میں پڑی وہ پریشان ہو کر آنکھیں ملنے لگے تو ادھر مسلمانوں نے فیصلہ کن حملہ کر کے کافروں کی کمر توڑ دی، بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد تھی کہ مٹھی بھر مٹی نے سارے کافروں کو پریشان کر دیا، بیشک اللہ تعالیٰ ہر بات کو سننے والے اور ہر چیز کو جاننے والے ہیں، مسلمانوں کی ساری محنت اور کوشش اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

بے بسی اور بے کسی کے عالم میں یہ عظیم فتح مسلمانوں کو حاصل ہوئی جنگ کے میدان سے واپس آ کر آپس میں گفتگوئیں شروع ہوئیں، صحابہ کرام اپنے اپنے کارنامے ایک دوسرے سے بیان کرنے لگے اس پر یہ آیت اتری۔

غور کیا جائے تو مسلمانوں کیلئے جہاد کی فتح وکامیابی سے زیادہ قیمتی یہ ہدایت تھی جس نے ان کے ذہنوں کو

اسباب سے پھیر کر اللہ تعالیٰ سے جوڑ دیا اور اس کے ذریعہ اس فخر وغرور کی خرابی سے بچالیا جس کے نشہ میں عموماً جیتنے والی قومیں مبتلا ہو جایا کرتی ہیں اور اس کے بعد یہ بتلایا کہ فتح وشکست ہمارے حکم کے تابع ہیں اور ہماری فتح و کامیابی ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اطاعت گزار ہوں، یہ عظیم فتح ہم نے اس لئے دی کہ مؤمنوں کو ان کی محنت کا پورا بدلہ دے دیں، "بَلَآءً" کے لفظی معنیٰ امتحان کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا امتحان کبھی مصیبت ومشقت میں مبتلا کر کے ہوتا ہے اور کبھی راحت و دولت دے کر، "بَلَآءً حَسَنًا" اس امتحان کو کہا گیا ہے جو راحت دولت اور فتح و کامیابی دے کر لیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس کو ہمارا انعام سمجھ کر شکر گزار ہوتے ہیں یا اس کو اپنی ذاتی قابلیت کا اثر سمجھ کر فخر وغرور میں مبتلا ہو جاتے اور اپنے عمل کو برباد کر دیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کسی کے فخر وغرور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ مؤمنوں کے ساتھ ہیں

ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا

یہ تو ہوا اور یہ ہے کہ اللہ سست کرنے والا ہے تدبیر کافروں کی (۱۸) اگر تم فیصلہ چاہتے ہو

فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ

تو لو آ گیا پاس تمہارے فیصلہ اور اگر رک جاؤ تو وہ بہتر ہے لئے تمہارے اور اگر

تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَ لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ

تم نے پھر کیا تو ہم بھی پھر یہی کریں گے اور ہرگز نہ فائدہ دے گا تم کو جتھا تمہارا کچھ بھی اور اگرچہ زیادہ ہو

وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ ع ۹/۲ ۱۶

اور بیشک اللہ ساتھ مؤمنوں کے ہے (۱۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہ تو ہو چکا اور جان رکھو کہ! اللہ کافروں کی تدبیر کو کمزور کر دیں گے۔ (۱۸) اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو تمہارے پاس فیصلہ پہنچ چکا اور اگر باز آ ؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر پھر یہی کرو گے تو ہم بھی پھر

یہی کریں گے اور تمہارا جتھہ تمہارے کچھ کام نہ آئے گا اگرچہ (جتھا) بہت ہو اور جان لو کہ! اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔(۱۹)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: تم نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے سارے منصوبے ملیامیٹ کردیئے اور جیسے تم نے اس وقت اس کی قدرت کا ایک کرشمہ دیکھا ہے اسی طرح آئندہ بھی ان کی تمہارے خلاف سب تدبیریں خاک میں ملادی جائیں گی۔

آگے کافروں سے خطاب ہے کہ تم فیصلہ چاہتے تھے تو لو! یہ فیصلہ تمہارے سامنے ہے آج تم ذلیل ہوا اور مسلمانوں کو تم پر غلبہ حاصل ہے اور یہ تو اس دنیا کی سزا ہے اس کے بعد جب مر کے دوبارہ اٹھو گے تو وہاں کی سزا الگ بھگتنی پڑے گی اب اگر تم اپنی شرارتوں سے باز آجاؤ تو خیر، ورنہ اگر پھر شرارت پر کمر باندھی تو پھر تمہاری اسی طرح خبر لی جائے گی، یہ مت سمجھنا کہ تم اپنے حمایتیوں کے بل بوتے پر کودتے پھرو گے وہ اگر بہت زیادہ بھی ہوں تب بھی کچھ نہیں کرسکتے، ادھر یہ یاد رکھو! کہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کے ساتھ ہیں اور ان کی مدد کا وعدہ کرچکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دعاؤں کو قبول فرمایا، خوشخبری سنائی، فرشتے اتارے، دلوں کو سکون بخشا، شدید خطرے کے دوران نیند طاری کرکے دلوں کو سکون بخشا، عین موقع پر بارش برسا کر مسلمانوں کے حق میں آسانی کے اسباب پیدا کئے اور شیطان کے وسوں کو دور کیا اور اس طرح مسلمانوں کو فتح کے تمام اسباب مہیا کئے پھر آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے مٹی کی مٹھی پھنکوا کر کافروں کو پریشان کردیا اور اس طریقے سے ایمان والوں کی فتح کیلئے راستہ ہموار کیا، بہرحال اللہ تعالیٰ کافروں کی تدبیر کو سست، کمزور اور ناکام کرنے والے ہیں۔

یہاں تک تو مسلمانوں پر احسانات جتلا کر انہیں اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے اب آگے کافروں کو مخاطب کیا جارہا ہے کہ مکی زندگی میں مشرک لوگ ایمان والوں سے کہا کرتے تھے کہ تم کس کامیابی کی امید لگائے بیٹھے ہو، اگر تم سچے ہو تو بتاؤ تمہارے رب کا فیصلہ کب آئے گا؟ اسی سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے

فرمایا ہے کہ: اگر تم فیصلہ طلب کرتے ہوتو وہ فیصلہ آ گیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری بربادی اور مسلمانوں کی کامیابی کا فیصلہ دے دیا اگر تم اب بھی کفر، شرک سے باز آ جاؤ، توبہ کر کے سچے دین کو قبول کر لو تو تمہارے لئے یہی بہتر ہے ، اور اگر تم لوٹ کر اسی طرح مخالفت کرو گے تو ہم بھی پلٹ کر تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں گے، تمہیں ذلیل و خوار کریں گے اور مسلمانوں کو غالب کریں گے کیونکہ وہ سیدھے راستے پر ہیں، یاد رکھو! تمہارا جتھا، گروہ اور پارٹی تمہارے کسی کام نہ آئے گی اگر چہ وہ کتنی ہی زیادہ تعداد میں کیوں نہ ہو۔

اللہ اور پیغمبر کی اطاعت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو کہنا مانو اللہ کا اور پیغمبر اسکے کا اور مت پھرو سے اس

وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ

جبکہ تم سن چکے ہو (۲۰) اور مت ہو ویسے جنہوں نے کہا سنا ہم نے حالانکہ

هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿٢١﴾

وہ نہیں سنتے (۲۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! اللہ کا اور اس کے پیغمبر کا حکم مانو اور سن کو اس سے مت پھرو۔ (۲۰) اور ان جیسے مت بنو جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سنتے نہیں۔ (۲۱)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو، اللہ تعالیٰ کی آیتیں تمہارے سامنے رات دن پڑھی جاتی ہیں اور تم ان کو سنتے ہو ایسا نہ کرو کہ ان کو سن کر ان سے منہ پھیر لو، دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جو تمہیں اللہ تعالیٰ سے غافل کرنا اور اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی ہیں ان کے بہکاوے میں آ کر ان

آیتوں کی طرف سے منہ مت پھیر لینا، کیونکہ ان کے سوا اور کہیں سے تمہیں ہدایت نہیں مل سکتی، دیکھو! تم سے پہلی ایسی قومیں گزری ہیں بلکہ خود تمہارے اندر بھی ایسے لوگ اس وقت موجود ہیں جو قرآن مجید کو اور پیغمبر کے فرمان کو سن سن کر زبانی تو کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا لیکن وہ دل سے ان کے خلاف چلنے پر تلے ہوئے ہیں، تم ہرگز ان جیسے مت بنو! یہ لوگ سنتے ہوئے بہرے ہیں انہوں نے دل میں ٹھان لی ہے کہ اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر ہرگز نہ چلیں گے اور قرآن کریم کی آیتوں کو اور پیغمبر ﷺ کے ارشادات کو سن ضرور لیں گے لیکن عمل ان کے خلاف کریں گے یہ لوگ سننے کا اقرار زبانی کر لیتے ہیں لیکن توجہ سے نہیں سنتے؛ اس لئے ان کا سننا نہ سننا برابر ہے تمہیں ایسا نہ ہونا چاہئے۔

یہ رکوع شروع سے لے کر آخر تک نہایت قیمتی نصیحتوں سے بھرا ہوا ہے مسلمان اگر ان باتوں پر جو انہیں اس رکوع میں بتائی گئی ہیں سچے دل سے عمل کریں تو وہ دنیا میں کبھی پست اور ذلیل نہیں ہوسکتے اور نہ آخرت کے عذاب میں گرفتار ہوسکتے ہیں یہ وہ قیمتی خزانہ ہے کہ جس کو لینے والے کبھی کسی کے محتاج نہیں ہوسکتے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو خطاب ہے کہ تم لوگ حق بات کو سن تو لیتے ہی ہو، یعنی: سننا، سمجھنا، عقیدہ رکھنا تو تمہاری طرف سے موجود ہے مگر آگے اس پر عمل بھی پورا کرو، اطاعت سے منہ نہ موڑو تاکہ سننے کا اصل مقصد حاصل ہوجائے۔

دوسری آیت میں اسی مضمون کی مزید تاکید کیلئے ارشاد فرمایا کہ: تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم نے سن لیا مگر حقیقت میں سنا سنایا کچھ نہیں ان لوگوں سے مراد عام کافر بھی ہیں جو سننے کا کہتے تو ہیں مگر نہ اس پر عقیدہ رکھتے ہیں نہ عمل کرتے ہیں اور منافق بھی ہیں جو سننے کے ساتھ سمجھنے اور عقیدہ رکھنے کا کہتے تو ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ غور وفکر اور صحیح سمجھ سے یہ دونوں محروم ہیں؛ اس لئے ان کا سننا نہ سننا برابر ہے مسلمانوں کو ان جیسا ہونے سے منع فرمایا گیا۔

بدترین مخلوق

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

بیشک بدترین چلنے پھرنے والے نزدیک اللہ کے بہرے گونگے ہیں جو نہیں سمجھتے (۲۲)

وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا

اور اگر جانتا اللہ میں ان بھلائی تو ضرور سنا دیتا ان کو اور اگر اب ان کو سنا بھی دے تو بھاگ جائیں

وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

اس حال میں کہ وہ منہ پھیرنے والے ہیں (۲۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بیشک اللہ کے نزدیک سب جانداروں میں بدتر وہ بہرے گونگے ہیں جو سمجھتے نہیں۔(۲۲) اور اگر اللہ ان میں کچھ بھلائی جانتا تو ان کو سنا دیتا اور اب اگر ان کو سنا بھی دے تو ضرور منہ پھیر کر چل دیں گے۔(۲۳)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب جانداروں میں بدتر وہ جاندار ہیں جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے ٹھیک کام نہیں لیتے، اس نے کان اس لئے دیئے تھے کہ اچھی باتیں سنیں، زبان اس لئے دی تھی کہ اس سے حق بات بولیں اور جو بات سمجھ میں نہ آئے پوچھیں، دل ودماغ اس لئے دیئے تھے کہ جو کچھ سنا اور پوچھا ہے اس سے فائدہ مند نتیجہ نکالیں جن لوگوں نے کان، زبان، عقل اور فکر سے یہ کام نہیں لئے جو ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں وہ بالکل گئے گزرے لوگ ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تو اچھے بھلے کان دیئے تھے لیکن وہ جان بوجھ کر بہرے بن گئے، زبان دی تھی لیکن گونگے بن گئے، اس ڈھٹائی کی وجہ سے ان میں اچھی باتیں سننے سمجھنے کی قابلیت ہی نہ رہی؛ اس لئے ان کو سنانا بے کار ہے اور ایسی حالت میں اگر سنایا بھی جائے تو سوا

اس کے کہ وہ اس سے منہ پھیر کر چل دیں ان سے اور کوئی توقع نہیں ہوسکتی۔

یہاں سے یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ انسان جب اپنی اچھی صلاحیتوں کو بیکار کر لیتا ہے اور ان سے ٹھیک کام نہیں لیتا تو اللہ تعالیٰ اس کو سیدھا راستہ دکھانا چھوڑ دیتے ہیں اور اس کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی ایمان والے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے فرمان کو توجہ سے سنتے ہیں۔

یہاں ان لوگوں کی سخت مذمت ہے جو حق بات کو غور و فکر کے ساتھ نہیں سنتے اور اس کو قبول نہیں کرتے ایسے لوگوں کو قرآن کریم نے جانوروں سے بھی بدتر قرار دیا ہے، لفظ: "دَوَآبّ، دَابّۃٌ" کی جمع ہے، اور اصل لغت کے اعتبار سے ہر زمین پر چلنے والے کو "دَابّۃٌ" کہا جاتا ہے مگر عرف و محاورہ میں صرف چوپایہ جانوروں کو "دَابّۃٌ" کہتے ہیں معنیٰ آیت کے یہ ہوئے کہ: سب سے بدترین چوپائے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہیں جو حق کو سننے سے بہرے اور اس کے قبول کرنے سے گونگے ہیں، اور بہرے گونگے میں اگر کچھ عقل ہو تو وہ بھی اشاروں سے اپنے دل کی بات کہہ لیتا ہے اور دوسروں کی بات سمجھ لیتا ہے یہ لوگ بہرے گونگے ہونے کے ساتھ بے عقل بھی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جو بہرا گونگا عقل سے بھی خالی ہو اس کے سمجھنے سمجھانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی بھلائی دیکھتے تو ان کو عقیدت مندی کے ساتھ سننے کی توفیق بخش دیتے اور اگر ان کو موجودہ حالت میں حق سننے کی خواہش ہی نہیں ہے اگر اللہ تعالیٰ ان کو حق بات سنا بھی دیں تو کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ وہ سننے کے بعد منہ پھیر کر چل دیں گے۔

زندگی کا انعام

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو بات مانو اللہ کی اور پیغمبر کی جب بلائے وہ تم کو

لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ

واسطےاس چیز کے جوزندہ کرے تم کو اور جان لو کہ اللہ حائل ہوجاتا ہے درمیان آدمی کے اور دل اسکے کے

وَ اَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

اور یہ کہ طرف اسی کی تم اکٹھے کئے جاؤ گے (۲۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! اللہ کا اور اس کے پیغمبر کا حکم مانو، جس وقت وہ تم کو اس کام کیلئے بلائے جس میں تمہاری زندگی ہے اور جان لو کہ! اللہ آدمی کو اس کے دل سے روک لیتا ہے اور یہ کہ تم اسی کے پاس جمع ہو گے۔ (۲۴)

تفسیر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کا کہنا ماننے کیلئے کہا گیا ہے اور یہی معنیٰ اسلام کے ہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان ہی باتوں کا حکم دیتے ہیں جس میں انسان کا فائدہ ہی فائدہ ہے اللہ تعالیٰ کا حکم اور اس کے پیغمبر کا حکم ایک ہی بات ہے، کیونکہ پیغمبر ایسی کسی بات کا حکم نہیں دیتے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو، اس کے حکم ماننے کے دو نتیجے یقینی ہیں۔ ایک یہ کہ اسے دنیا میں عزت نصیب ہوگی، دوسرے یہ کہ آخرت میں ہمیشہ آرام وراحت سے زندگی بسر کرے گا اور یہی وہ زندگی ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کے پیغمبر دعوت دیتے ہیں۔

ارشاد ہے کہ: جب تم ایمان کا اقرار کر چکے تو اب پیغمبر کے کہنے پر چلے چلو، دونوں جہان میں کامیابی یقینی ہے، اول تو جو وہ کہتے ہیں انسانی عقل بہ آسانی سمجھ سکتی ہے کہ وہی انسان کیلئے بہترین راستہ ہے لیکن اگر کسی کی سمجھ میں اتنی بات نہ آئے تب بھی پیغمبر کے فرمان کو سر آنکھوں پر رکھے اور اپنے سے بہتر عقل والوں کے کہنے سے مان لے، یقیناً اسی میں بہتری ہے جو آدمی پیغمبر کے حکم میں پس وپیش کرے گا اس کو ڈرنا چاہئے کہ کہیں اس شک کی نحوست سے اس کا دل ایمان سے نہ پھر جائے، انسان کا دل مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے یاد رکھو! کہ اللہ تعالیٰ جدھر چاہے انسان کا دل پھیر سکتا ہے، ایسا نہ ہو کہ شک کی نحوست سے اللہ تعالیٰ تمہارا دل سیدھے راستے

سے پھیر دے، پھر ایک دن تم سب اس کے سامنے اکٹھے ہوگے اور تمہارے اوپر واضح ہو جائے گا کہ شک کس قدر تباہ کرنے والی چیز تھی۔

آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہونے کا مطلب

جس کسی نیک کام کے کرنے یا گناہ سے بچنے کا موقعہ آئے تو اس کو فوراً کر گزرو، دیر نہ کرو اور اس وقت کو غنیمت سمجھو کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کوئی بیماری پیش آ جائے یا موت آ جائے یا کوئی ایسا مشغلہ پیش آ جائے کہ اس کام کی فرصت نہ ملے؛ اس لئے انسان کو چاہئے کہ عمر اور وقت کو غنیمت سمجھ کر آج کا کام کل پر نہ ڈالے کیونکہ معلوم نہیں کل کیا ہونا ہے۔

کریں تھوڑے بھریں سب

وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَ

اور بچو ایسے فساد سے جو نہیں پہنچے گا ان کو جنہوں نے ظلم کیا میں سے تم صرف (انہیں کو) اور

اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

جان لو کہ اللہ سخت ہے عذاب دینے میں (۲۵)

بامحاورہ ترجمہ: اور بچتے رہو اس فساد سے کہ تم میں خاص ظالموں ہی پر نہیں پڑے گا اور جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔ (۲۵)

تفسیر

اس آیت میں ایک بڑے کام کی بات بتائی گئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ برے کاموں کا وبال صرف کرنے والوں ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ دوسروں تک بھی پہنچتا ہے؛ اس لئے ان سے بہرحال پرہیز کرنا چاہئے

اس سے ہمیں دو سبق حاصل ہوتے ہیں۔

(۱)…. کسی شخص سے نادانی کی بناء پر تنہائی میں کوئی برا کام ہو جائے تو اس سے چپکے ہی چپکے توبہ کرے، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور پختہ ارادہ کرے کہ آئندہ یہ کام کبھی نہ کروں گا اگر وہ اپنی توبہ اور آئندہ نہ کرنے کے ارادے میں سچا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیں گے ایسے کاموں کا کسی سے ذکر نہ کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ سن کر کسی کے دل میں بھی ویسا ہی کام کرنے کا خیال آ جائے یا خود اسی کو اقرار کی وجہ سے سزا مل جائے وہ اپنا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ رکھے کیونکہ وہی اس کو دیکھ رہا تھا۔

(۲)…. کھلم کھلا گناہ سے خود بھی بچے اور دوسروں کو بھی بچائے، کیونکہ اگر کوئی گناہ کسی کی وجہ سے پھیل گیا تو اس کی سزا سب کو ملے گی اور عذاب آیا تو سب پر آئے گا، کرنے والے پر تو اس کے کرتوت کی وجہ سے اور نہ کرنے والوں پر اس لئے کہ انہوں نے اسے روکا کیوں نہیں؛ اس لئے ہر ایک کا یہ فرض ہے کہ وہ خود بھی برائی نہ کرے اور دوسروں کو بھی روکے۔

یہاں سے صاف یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جن لوگوں کا دوسروں پر اثر پڑتا ہو، مثلاً: ماں، باپ، استاد، پیر، قائد، مولوی، وعظ کہنے والے وغیرہ ان کو خاص طور پر گناہوں سے اور برے کاموں سے بچنا چاہئے، کیونکہ لوگ وہی کام کریں گے جو انہیں کرتے دیکھیں گے ان کے سمجھانے کا وہ یہ جواب دیں گے کہ آپ بھی تو کرتے ہیں پھر ہمیں کیوں روکتے ہیں؛ اس لئے واعظوں، پیروں، استادوں وغیرہ کو بڑی احتیاط سے زندگی بسر کرنی پڑتی ہے تاکہ لوگ ان کا بہانہ کر کے غلطیوں میں نہ پھنس جائیں۔

اس آیت میں بڑی سخت دھمکی ہے، ارشاد ہے کہ: دیکھو! احتیاط سے چلو ورنہ برے کاموں کی وجہ سے عذاب آیا تو کرنے والے اور نہ کرنے والے دونوں اسے بھگتیں گے، آخر میں فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کا عذاب اور اس کی پکڑ بڑی سخت ہے؛ اس لئے ایسا انتظام کرو کہ لوگ برائی کے پاس جاتے ہوئے بھی ڈریں ورنہ تھوڑے لوگوں نے بھی برائی کی تو اس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑے گا۔

جن لوگوں کی وجہ سے بری رسمیں جاری ہوتی ہیں یا جاری ہونے کا خوف ہوتا ہے انہیں چاہئے کہ وہ اس آیت کو بار بار پڑھیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو

وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ

اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے کمزور سمجھے جاتے تھے میں زمین ڈرتے تھے تم

اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَ رَزَقَكُمْ

کہ اُچک لے جائیں تم کو لوگ پس ٹھکانہ دیا تم کو اور طاقت دی تم کو مدد سے اپنی اور رزق دیا تم کو

مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

سے ستھری چیزوں تاکہ تم شکر کرو (۲۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے ملک میں کمزور سمجھے جاتے تھے ڈرتے تھے کہ کہیں تمہیں لوگ اُچک لیں، پھر اس نے تم کو ٹھکانہ دیا اور تمہیں اپنی مدد کے ذریعے قوت دی اور تمہیں پاکیزہ رزق عطا کیا تا کہ تم شکر کرو۔ (۲۶)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اس بات کو ہمیشہ دھیان میں رکھو کہ شروع میں تم مٹھی بھر آدمی تھے، سامان بھی کچھ تمہارے پاس نہ تھا تمہیں ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ اگر یہ لوگ ہم پر ٹوٹ پڑے تو تکا بوٹی کر کے رکھ دیں گے اور پنجوں میں دبا کر اڑا لے جائیں گے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ دیکھو کہ تمہارے لئے مدینہ میں ایک مضبوط اور مستقل ٹھکانہ مقرر کیا اور وہاں کے لوگوں کے دلوں میں تمہاری محبت ڈال دی اور انہوں نے تمہیں بھائی بنا کر بلکہ بھائی سے بھی زیادہ عزیز رکھا، پھر بدر کی جنگ کے موقعہ پر اپنی خاص مدد بھیج کر تمہیں قوت اور طاقت دی تمہارے

دشمنوں کو ہمیشہ کیلئے زیر کر دیا ان کا مال، غنیمت اور فدیہ کی شکل میں تمہیں دلوایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں حلال صاف ستھری چیزیں عطا کیں اور اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیا۔

قرآن مجید میں ان سب باتوں کو ہمیشہ کیلئے ذکر کرنے سے مطلب یہ ہے کہ مسلمان انہیں ہر وقت یاد رکھیں اور اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے بنے رہیں اور ہمیشہ اس کے حکم پر چلیں۔

خیانت مت کرو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو خیانت مت کرو اللہ اور پیغمبر کی اور نہ خیانت کرو

اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ

امانتوں اپنی میں حالانکہ تم جانتے ہو (۲۷) اور جان لو حقیقت یہ ہے کہ مال تمہارے اور اولاد تمہاری

ع ۹ ۳ ۱۷ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

خرابی کا باعث ہیں اور یہ کہ اللہ پاس ثواب ہے بڑا (۲۸)

با محاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! اللہ اور پیغمبر کی خیانت مت کرو، اور آپس کی امانتوں میں خیانت مت کرو، حالانکہ تم جانتے ہو۔ (۲۷) اور جان لو کہ! تمہارے مال اور اولاد خرابی میں ڈالنے والے ہیں اور یہ کہ اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔ (۲۸)

تفسیر

اس آیت میں بلند اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے جس میں سمجھایا گیا ہے کہ اللہ اور پیغمبر کی خیانت مت کرو، اس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ دین اسلام کے قانون اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور وہ ہر وقت تمہارے ہر کام کو دیکھتا ہے اور تنہائی میں بھی وہ تمہارے ساتھ ہے؛ اس لئے اس کے حکم کے خلاف تنہائی میں بھی کچھ نہ کرد

ورنہ پکڑے جاؤ گے۔

حضرت ابولبابہ ابن عبد المنذر رضی اللہ عنہ کا واقعہ تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنو قریظہ پر چڑھائی کی جو ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تمہارے متعلق جو فیصلہ سعد (رضی اللہ عنہ) بن معاذ کرے گا وہ تمہیں قبول کرنا ہوگا، ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا یہودیوں کے ساتھ تجارتی لین دین تھا اور وہ ایک دوسرے کے دوست تھے یہودیوں نے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا کہ کیا انہیں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ قبول کر لینا چاہئے اس پر حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے گلے کی طرف اشارہ کیا اگر چہ انہوں نے منہ سے کوئی بات نہ کی تھی تاہم اس کا مطلب یہ تھا کہ سعد رضی اللہ عنہ کا فیصلہ تمہارا گلا کٹوا دے گا، لہٰذا اس معاملہ میں محتاط رہو، یہ اشارہ تو کر بیٹھے مگر بعد میں انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے یہودیوں کے حق میں بات کر کے خیانت کی ہے، چنانچہ انہوں نے سزا کے طور پر اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا اور قسم اٹھائی کہ جب تک اللہ تعالیٰ کے پیغمبر مجھے خود اپنے دستِ مبارک سے نہیں کھولیں گے میں یہیں بندھا رہ کر جان دے دوں گا اس دوران اللہ تعالیٰ سے اپنی غلطی کی معافی طلب کرتے رہے حتیٰ کہ چھ دن گزر گئے اور آپ پر بیہوشی کے دورے پڑنے لگے بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دستِ مبارک سے ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی رسیاں کاٹ کر آزاد کیا، بہر حال فرمایا کہ: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے پیغمبر سے خیانت نہ کرو۔

آیت میں آگے ذکر ہے کہ اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرنے کا ذکر ہے، مراد یہ ہے کہ بندوں کے حقوق میں خیانت نہ کرو، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے، لہٰذا کسی کو غلط مشورہ نہیں دینا چاہئے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق صحیح صحیح مشورہ دینا چاہئے اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کسی کو غلط مشورہ دے گا تو وہ اس کے حق میں خیانت کرنے والا ہوگا۔

بندوں کے حقوق کے سلسلے میں خیانت کی مثالیں عام طور پر دیکھنے میں آتی رہتی ہیں، شراکت دار آپس میں خیانت کرتے ہیں، مختلف انجمنیں بنتی ہیں اور پھر ان انجمنوں کے کارکن خیانت کے ذریعے مال کھاتے ہیں،

مسجدوں اور مدرسوں کے فنڈ میں خیانت ہوتی ہے اور حکومت کے فنڈز میں تو اربوں روپوں کی خیانت ہوتی ہے یہ سب معاملوں کی خیانت ہے اور قطعی حرام ہے، بعض لوگ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے خیانت کر بیٹھتے ہیں اگر آٹھ گھنٹے کا کام کرنے کا معاہدہ ہے تو پانچ گھنٹے کام کر کے تین گھنٹے چوری کر لیے، ڈیوٹی میں کمی کرنا خیانت ہے اور ایسی کمائی حرام ہے، ووٹ جیسی قیمتی امانت کسی غیر مستحق کے سپرد کر دینا بھی خیانت میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: اپنی امانتیں ان لوگوں کے سپرد کر دو جو اس کے اہل ہیں اگر کوئی شخص کسی عہدے پر ہے اور وہ اپنے عہدے کی ذمہ داری پوری نہیں کرتا تو وہ خیانت کا مجرم ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: منافق کی ایک نشانی یہ ہے کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرتا ہے، بہرحال اپنے اختیارات سے تجاوز کرنا، حکموں کی خلاف ورزی کرنا یہ سب خیانت میں داخل ہیں جس سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے۔

اللہ اور اس کے پیغمبر اور آپس کے معاملوں میں خیانت نہ کرو اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کامیابی اسی میں ہے اگر کسی بھی معاملہ میں خیانت کے مرتکب ہو گے تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا، دنیا میں ذلیل ہو جاؤ گے اور آخرت میں عذاب کے مستحق ٹھہرو گے، یاد رکھو! خیانت اکثر مال اور اولاد کی محبت کی وجہ سے کی جاتی ہے اکثر لوگ اولاد کی خاطر مال حاصل کرنے میں خیانت کر بیٹھتے ہیں جو کہ بہت بری بات ہے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ تمہارے مال اور اولاد خدا تعالیٰ کی جانب سے فتنہ، یعنی: آزمائش ہیں ان چیزوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ تمہیں آزمانا چاہتا ہے، "سورۂ تغابن" میں ہے تمہارے بیوی بچے تمہارے دشمن ہیں ان کی محبت میں مبتلا ہو کر خدا اور پیغمبر سے خیانت کرو گے تو دوزخ میں جاؤ گے، بیوی بچوں کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم ہے مگر اللہ اور پیغمبر کے ساتھ خیانت کرنے کی ہرگز اجازت نہیں، اس چند روزہ زندگی میں حقیر مال میں خیانت نہ کرو اجر عظیم تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اگر خدا تعالیٰ کے حکموں کو مانو گے، اولاد کیلئے خیانت نہیں کرو گے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرو گے تو اس کے ہاں بہت بڑا اجر پاؤ گے، بہرحال یہ کامیابی کا اصول ہے کہ اللہ اور اس کے پیغمبر سے خیانت نہ کرو اور نہ آپس کے معاملوں میں خیانت کرو۔

"فتنہ" کا معنیٰ امتحان کے بھی آتے ہیں اور عذاب کے بھی اور ایسی چیزوں کو بھی "فتنہ" کہا جاتا ہے جو عذاب کا سبب بنیں، قرآن کریم کی مختلف آیتوں میں ان تینوں معنیٰ کیلئے لفظ "فتنہ" استعمال ہوا ہے، یہاں تینوں معنیٰ کی گنجائش ہے، بعض اوقات مال واولاد خود بھی انسان کیلئے دنیا ہی میں وبال بن جاتے ہیں اور ان کے سبب غفلت و گناہ میں مبتلا ہو کر عذاب کا سبب بن جانا تو بالکل ظاہر ہے، اول یہ کہ مال واولاد کے ذریعہ تمہارا امتحان لینا مقصود ہے کہ یہ چیزیں ہمارے انعام ہیں تم انعام لے کر شکر گزار اور اطاعت گزار بنتے ہو یا ناشکرے اور نافرمان بنتے ہو، دوسرے اور تیسرے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مال اور اولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا تو یہی مال واولاد تمہارے لئے عذاب بن جائیں گے، بعض اوقات تو دنیا ہی میں یہ چیزیں انسان کو سخت مصیبتوں میں مبتلا کر دیتی ہیں اور دنیا ہی میں مال واولاد کو وہ عذاب محسوس کرنے لگتے ہیں ورنہ یہ تو لازمی ہے کہ دنیا میں جو مال اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کمایا گیا یا خرچ کیا گیا وہ مال ہی آخرت میں اس کیلئے سانپ بچھو اور آگ میں داغ دینے کا ذریعہ بن جائے گا، جیسا کہ قرآن کریم کی بہت سی آیتوں اور بہت سی حدیثوں میں اس کی صراحت موجود ہے اور تیسرے معنیٰ یہ کہ یہ چیزیں عذاب کا سبب بن جائیں تو یہ ظاہر ہی ہے کہ جب یہ چیزیں اللہ تعالیٰ سے غفلت اور اس کے حکموں کی خلاف ورزی کا سبب بنیں تو عذاب کا سبب بن گئیں۔

تمام مشکلات کا حل

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر ڈرو گے اللہ سے کر دے گا وہ لئے تمہارے فیصلہ اور

يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ

مٹا دے گا سے تم گناہ تمہارے اور بخش دے گا تم کو اور اللہ والے ہیں فضل

الْعَظِیْمِ ﴿۲۹﴾ وَ اِذْ یَمْکُرُ بِكَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ
بڑے (۲۹) اور جب سوچتے تھے آپکے بارے میں وہ جنہوں نے کفر کیا کہ قید کردیں آپ کو یا مارڈالیں آپکو

اَوْ یُخْرِجُوْكَ ؕ وَ یَمْکُرُوْنَ وَ یَمْکُرُ اللّٰہُ ؕ وَ اللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ ﴿۳۰﴾
یا نکال دیں آپکو اور وہ سوچتے ہیں اور سوچتا ہے اللہ اور اللہ بہترین ہے سوچنے والوں میں (۳۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تم میں فیصلہ کردے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کردے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔(۲۹) اور جب تدبیر کرتے تھے کافر کہ آپ کو قید کردیں یا مارڈالیں یا نکال دیں وہ تدبیر کرتے تھے اور اللہ بھی تدبیر کرتا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔(۳۰)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، یعنی: تقویٰ اختیار کرو اور تقویٰ صرف اسی کو حاصل ہوسکتا ہے جو خیانت، دغا اور فریب سے بچے اور یہی باتیں ہیں جن سے بچنے کیلئے پہلے سے کہا جارہا ہے، تقویٰ سے تمہیں یہ فائدے حاصل ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نیک و بد میں تمیز کرنے کی قوت عطا فرمائیں گے جس کا نام فرقان ہے، تمہاری خطاؤں اور لغزشوں کا برا اثر تم پر نہیں ہونے دیں گے اور ان پر پکڑ بھی نہیں کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑے سخی ہیں اور اس کا فضل بہت بڑا ہے۔

اس سے آگے کی آیت میں ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! وہ وقت یاد کرو جب ہجرت سے پہلے کافر آپ کو قید کرنے یا قتل کرنے یا نکال دینے کے بارے میں سوچ رہے تھے لیکن ادھر وہ اپنی تدبیروں میں مصروف تھے اور ادھر اللہ تعالیٰ اپنی تدبیریں کررہے تھے آخر اللہ تعالیٰ کی تدبیر غالب آئی، اللہ تعالیٰ سے بہتر تدبیر کرنے والا کون ہوسکتا ہے ان احسانوں کے یاد دلانے سے یہ مقصود ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی تدبیر سب پر غالب ہے تو پھر اوروں

سے ڈرنے کے کوئی معنیٰ ہی نہیں اسی کے حکم کو سامنے رکھنا چاہئے اور سوا اس کے کسی سے نہ ڈرنا چاہئے۔

پیغمبر ﷺ کو قید کرنے یا قتل کرنے یا شہر بدر کرنے کیلئے کافروں نے مشورہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے پیغمبر ﷺ کو باخبر کر کے یہ تدبیر بتلائی کہ آج رات آپ اپنے بستر پر آرام نہ کریں اور بتلایا کہ اب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ سے ہجرت کرنے کی اجازت دے دی ہے، مشورہ کے مطابق شام ہی سے قریشی نوجوانوں نے پیغمبر ﷺ کے مکان کا محاصرہ کرلیا، پیغمبر ﷺ نے یہ دیکھا تو حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ آج کی رات وہ پیغمبر ﷺ کے بستر پر آرام کریں اور یہ خوشخبری سنادی کہ اگرچہ بظاہر اس میں آپ کی جان کا خطرہ ہے مگر دشمن آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کام کیلئے اپنے آپ کو پیش کردیا اور آپ کے بستر پر لیٹ گئے مگر اب مشکل یہ پیش آئی کہ پیغمبر ﷺ اس محاصرہ سے کیسے نکلیں اس مشکل کو اللہ تعالیٰ نے ایک تدبیر کے ذریعہ حل کیا وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیغمبر ﷺ ایک مٹھی میں مٹی بھر کر باہر تشریف لائے اللہ تعالیٰ نے کافروں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور کوئی بھی آپ کو دیکھ نہ سکا اور آپ ان میں سے ہر ایک کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے نکلے چلے گئے آپ کے تشریف لے جانے کے بعد کسی آنے والے نے ان لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کیوں کھڑے ہو تو انہوں نے بتلایا کہ محمد ﷺ کے انتظار میں اس نے کہا کہ تم کس خیال میں ہو وہ تو یہاں سے نکل کر جا بھی چکے ہیں اور تم میں سے ہر ایک کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے گئے ہیں ان لوگوں نے اپنے اپنے سروں پر ہاتھ رکھا تو اس کی تصدیق ہوئی کہ ہر ایک کے سر پر مٹی پڑی ہوئی تھی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ آپ کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے مگر محاصرہ کرنے والوں نے ان کے کروٹیں بدلنے سے پہچان لیا کہ یہ محمد ﷺ نہیں اس لئے قتل نہیں کیا صبح تک محاصرہ کرنے کے بعد یہ لوگ ناکام ہو کر واپس ہوگئے یہ رات اور اس میں پیغمبر ﷺ کیلئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خاص فضائل میں سے ہے، قریشی سرداروں کے مشورہ میں تین رائیں پیغمبر ﷺ کے متعلق پیش کی گئی تھیں ان تینوں کو

قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر فرمایا ہے کہ وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب کافر آپ کے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کریں یا قتل کردیں یا شہر بدر کردیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی سب تدبیریں خاک میں ملا دیں؛ اسی لئے آخر آیت میں فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ بہتر تدبیر کرنے والے ہیں جو ساری تدبیروں پر غالب آجاتی ہے جیسا کہ اس واقعہ میں دیکھنے میں آیا ہے۔

ضد کی انتہا

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ

اور جب پڑھی جاتی ہیں پر ان آیتیں ہماری تو کہتے ہیں تحقیق سُن لیا ہم نے اگر ہم چاہیں تو کہہ لیں جیسا

هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ

اس نہیں یہ مگر قصے پہلے لوگوں کے (۳۱) اور جب کہنے لگیں اے اللہ! اگر

كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ

ہے یہی صرف سچا دین طرف سے آپ کی تو برسا پر ہم پتھر سے

السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾

آسمان یا لے آ ہم پر عذاب دکھ دینے والا (۳۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب ان پر کوئی ہماری آیت پڑھی جائیں تو کہتے ہیں ہم سن چکے اگر ہم چاہیں تو ایسا ہم بھی کرلیں یہ تو کچھ بھی نہیں مگر اگلوں کے قصے ہیں۔ (۳۱) اور جب وہ کہنے لگے کہ اے اللہ! آپ کی طرف سے اگر یہی سچا دین ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسادے یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ۔ (۳۲)

تفسیر

اس آیت میں کافروں کی ایک اور ہٹ دھرمی کا بیان ہے، ارشاد ہے کہ تم نے دیکھا جب ان کافروں کو

ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو بے پروائی سے کہتے ہیں بس سن لیا کہ ان میں رکھا کیا ہے صرف اگلے لوگوں کے قصے کہانیاں جوڑ کر لکھ لی ہیں ہم بھی لکھنے بیٹھیں تو لکھ لیں اس کا جواب مکی اور مدنی سورتوں میں بار بار دیا گیا ہے کہ تم پوری کتاب تو کیا لکھو گے دس سورتیں ہی اس جیسی بنالاؤ اس کے بعد کہا اچھا دس نہیں تو ایک ہی سورت بنا لاؤ لیکن وہ نہ لا سکے اور عملی جواب بدر کی جنگ میں مل گیا اور ان کی آنکھیں کھل گئیں، معلوم ہوگیا کہ قرآن مجید قصے کہانیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا، اس کے بعد وہ کہنے لگے اے اللہ! یہی دین سچا ہے اور آپکی طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی سخت دکھ دینے والا عذاب اتار، کافروں کی اس دعا سے ان کی انتہائی ضد تو ظاہر ہی ہے مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایسی سخت دعا مانگ کر وہ مسلمانوں کو بھی متاثر کرنا چاہتے تھے۔

نضر بن حارث کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایران میں کافی عرصہ تک رہ چکا تھا اور وہاں کے رستم واسفندیار کے قصے خوب جانتا تھا جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے سامنے پرانی قوموں کے متعلق قرآنی آیتیں پیش کرتے تو نضر کہتا کہ محمد تمہیں عاد و ثمود کے قصے سناتا ہے، آؤ! میں تمہیں اس سے بہتر کہانیاں سناتا ہوں، چنانچہ یہ شخص ایرانیوں کے پرانے قصے کہانیاں لوگوں کو سنایا کرتا تھا تاہم مشرکوں کی اکثریت ایسی تھی جو قرآن کریم کی کسی بھی آیت کی مثال لانے سے عاجز تھی، لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو سننے کے بعد یوں کہہ دیتے کہ یہ تو بس پرانے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔

عذاب نہ آنے کی وجہ

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ

اور نہیں ہے اللہ کہ عذاب کرے ان کو حالانکہ آپ ہیں میں ان اور نہیں ہے اللہ عذاب کرنے والا انکو

وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ مَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ

حالانکہ وہ استغفار کریں گے (۳۳) اور کیا ہے ان میں کہ نہ عذاب کرے ان کو اللہ حالانکہ وہ روکتے ہیں

عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا

سے مسجد عزت والی حالانکہ نہیں وہ والی وارث اس کے نہیں اسکے والی وارث مگر

الْمُتَّقُوْنَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

اللہ سے ڈرنے والے اور لیکن اکثر میں سے ان نہیں جانتے (۳۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اللہ ان کو ہرگز عذاب نہ کرے گا جب تک آپ ان میں ہیں اور ان کو اللہ ہرگز عذاب نہ کرے گا جب تک وہ معافی مانگتے رہیں گے۔ (۳۳) اور ان میں کیا بات کہ اللہ ان کو عذاب نہ کرے اور جبکہ وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں حالانکہ وہ اس کے والی وارث نہیں، اس کے والی وارث تو صرف پرہیزگار لوگ ہیں لیکن ان میں سے اکثر کو اس کی خبر نہیں۔ (۳۴)

تفسیر

ارشاد ہے کہ عذاب دو وجہ سے رکا ہوا ہے ورنہ یہ تو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کب کے عذاب کے مستحق ہو چکے تھے، ایک تو یہ وجہ ہے کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان تشریف رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان میں موجود ہونے کی وجہ سے عذاب نہ بھیجا پہلے اپنے پیغمبر کو ان میں سے نکال لیا تب عذاب بھیجا، دوسری وجہ یہ ہے کہ ان میں توبہ اور استغفار کی آواز بلند ہے کیونکہ مسلمان ان میں ملے جلے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی مغفرت اور رحمت طلب کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ استغفار کرنے والوں پر عذاب نہیں بھیجتا۔

آگے ارشاد ہے کہ: یہ سب کام ایسے ہی کر رہے ہیں جن سے ان پر عذاب آنا لازم ہے، ذرا دیکھو تو! یہ لوگ مسجد حرام پر ناجائز قبضہ جمائے بیٹھے، ہیں یہ بے وقوف یوں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ہم مسجد حرام کے متولی ہیں جس کو چاہیں اس میں آنے کی اجازت دیں جس کو چاہیں نہ دیں، حالانکہ وہ اس کے متولی نہیں بلکہ اس کے متولی صرف متقی مسلمان ہی ہو سکتے ہیں، اس سے بڑھ کر معاشرے کیلئے کوئی برائی نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان دوسرے کا حق چھین لے اس کے دکھ اور تکلیف کا کچھ خیال نہ کرے صرف اپنی بڑائی اور اقتدار جمانے کی کوشش میں لگا رہے

ہے ان لوگوں کا بھلا مسجد حرام سے کیا کام، مسجد حرام اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ایک مقدس جگہ ہے اس پر صرف ان ہی لوگوں کا اختیار ہونا چاہئے جو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور اس کی سزا کے خوف سے دنیا میں احتیاط سے بچ بچ کر چلتے ہیں، عبادت صرف معبود کو راضی اور خوش کرنے کیلئے ہوتی ہے اس کا طریقہ انسان خود مقرر نہیں کرسکتا یہ خود معبود ہی بتا سکتا ہے کہ میں ان باتوں سے خوش ہوتا ہوں اور ان باتوں سے ناراض، اس سے ظاہر ہے کہ معبود جاننے بوجھنے اور بولنے والا ہونا چاہئے، آگے ان کے عبادت کے غلط طریقے کا بیان ہے۔

اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کریں گے کہ آپ کے مکہ میں ہوتے ہوئے ان پر عذاب اتاریں، کیونکہ اول تو سب ہی پیغمبر علیہم السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کا دستور یہ رہا ہے کہ جس بستی میں وہ موجود ہوں اس پر اس وقت تک عذاب نہیں اتارتے جب تک اپنے پیغمبروں کو وہاں سے نکال نہ لیں جیسے حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے معاملہ میں ہوا کہ جب تک یہ حضرات بستی میں رہے عذاب نہیں آیا جب وہاں سے نکال لئے گئے اس وقت عذاب اترا خصوصاً پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمۃ للعالمین کا لقب دے کر بھیجے گئے ہیں آپ کے کسی بستی میں موجود ہوتے ہوئے ان پر عذاب آنا آپ کی شان کے خلاف تھا۔

خلاصہ جواب کا یہ ہوا کہ تم تو قرآن کریم اور اسلام کی مخالفت کی وجہ سے اسی کے حقدار ہو کہ تم پر پتھر برسائے جائیں مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں موجود ہونا عذاب کیلئے رکاوٹ ہے، امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آیت کا یہ حصہ اس وقت اترا جب کہ آپ مکہ مکرمہ میں موجود تھے، پھر مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد آیت کا دوسرا حصہ یہ اترا، یعنی: اللہ تعالیٰ ان پر عذاب اتارنے والے نہیں جب کہ وہ استغفار کرتے ہیں، مراد اس سے یہ ہے کہ آپ کے مدینہ شریف چلے جانے کے بعد اگرچہ عمومی عذاب بھیجنے کیلئے جو رکاوٹ تھی وہ دور ہوگئی مگر اس وقت بھی عذاب اتارنے سے دوسری چیز جو رکاوٹ تھی اب بھی موجود رہی کہ بہت سے کمزور مسلمان جو ہجرت نہ کرسکے تھے مکہ میں رہ گئے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہتے تھے ان کی وجہ سے مکہ والوں پر عذاب نہیں اتارا گیا، پھر جب یہ سب حضرات بھی ہجرت کرکے مدینہ پہنچ گئے تو بعد کی آیت کا یہ جملہ اترا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ

اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہ دیں حالانکہ وہ لوگوں کو مسجد حرام میں عبادت کرنے سے روکتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اب عذاب سے وہ دونوں چیزیں جو رکاوٹ تھیں اب باقی نہ رہیں نہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہے اور نہ استغفار کرنے والے مسلمان مکہ میں باقی رہے تو اب عذاب آنے سے کوئی رکاوٹ باقی نہیں، خصوصاً ان کے عذاب کے حقدار ہونے میں خود اسلام کے مخالف ہونے کے علاوہ اس جرم کا بھی اضافہ ہوگیا کہ یہ لوگ خود تو عبادت کے قابل نہ تھے اور جو مسلمان عبادت عمرہ وطواف کیلئے مسجد حرام میں جانا چاہتے ان کو روکنے لگے تو اب ان کا عذاب کا بالکل مستحق ہونا مکمل ہوگیا، چنانچہ فتح مکہ کے ذریعہ ان پر عذاب اتارا گیا۔

مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکنے کا واقعہ حدیبیہ کی جنگ میں پیش آیا تھا جب کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ کے ارادے سے تشریف لے گئے اور مکہ کے مشرکوں نے آپ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور آپ کو اور سب صحابہ کرام کو اپنے احرام کھولنے اور واپس جانے پر مجبور کیا یہ واقعہ ۶ سنہ ھ کا ہے اس کے دوسال بعد ۸ سنہ ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوگیا اس طرح ان پر مسلمانوں کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ کا عذاب اترا۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):..... سرپرست کو یہ حق ہے کہ جس کو چاہے مسجد میں آنے سے روک دے جب کہ مسجد اللہ کا گھر ہے اس میں آنے سے روکنے کا کسی کا حق نہیں، سوائے ایسی خاص صورتوں کے جن میں مسجد کی بے حرمتی یا دوسرے نمازیوں کی تکلیف کا اندیشہ ہو جیسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اپنی مسجدوں کو بچاؤ چھوٹے بچوں سے اور پاگل آدمیوں سے اور آپس کے جھگڑوں سے، چھوٹے بچوں سے مراد وہ بچے ہیں جن سے ناپاکی کا خطرہ ہے اور پاگل سے ناپاکی کا بھی خطرہ ہے اور نمازیوں کی تکلیف کا بھی اور آپس کے جھگڑوں سے مسجد کی بے حرمتی بھی ہے اور نمازیوں کو تکلیف بھی۔

اس حدیث کی رو سے مسجد کے سرپرست کو یہ تو حق ہے کہ ایسے چھوٹے بچوں، پاگلوں کو مسجد میں نہ آنے دے اور آپس کے جھگڑے مسجد میں نہ ہونے دے لیکن بغیر ایسی صورتوں کے کسی مسلمان کو مسجد سے روکنے کا

مسجد کے کسی سرپرست کو حق نہیں۔

مسئلہ (۲):.... مسجد کا سرپرست مسلمان دیندار پرہیز گار ہونا چاہئے۔

مسئلہ (۳):.... جو لوگ شریعت و سنت کے خلاف عمل کرنے کے باوجود ولی اللہ ہونے کا دعویٰ کریں وہ جھوٹے ہیں اور جو ایسے لوگوں کو ولی اللہ سمجھیں وہ دھوکے میں ہیں۔

مال کا غلط خرچ

وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا

اور نہ تھی نمازان کی پاس نزدیک کعبہ کے مگر سیٹیاں اور تالیاں پس چکھو

الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ

عذاب بدلے اس کے کہ تھے تم کفر کرتے (۳۵) تحقیق جنہوں نے کفر کیا وہ خرچ کرتے ہیں

اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ

مال اپنے تا کہ روکیں سے راستے اللہ کے سو وہ خرچ کریں گے پھر ہو جائیگا وہ

عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۭ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾

لئے انکے حسرت پھر وہ مغلوب ہوں گے اور جنہوں نے کفر کیا طرف دوزخ کے اکٹھے کئے جائیں گے (۳۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور کعبہ کے پاس ان کی نماز نہیں تھی مگر سیٹیاں اور تالیاں بجانا، سو! عذاب چکھو بدلے اپنے کفر کے۔ (۳۵) بیشک جو لوگ کافر ہیں وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں تا کہ اللہ کے راستے سے روکیں، سو! وہ خرچ کریں گے پھر وہ ان کیلئے حسرت کا سبب بن جائے گا آخر وہ مغلوب ہوں گے اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے۔ (۳۶)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: وہ سمجھتے ہیں کہ مال اور دولت اور جنگی ساز و سامان ہی ایسی چیزیں ہیں جو لڑائی میں کامیاب کرتی ہیں، ارشاد ہے کہ: مال کے خرچ کرنے سے کیا ہوگا خرچ کئے جاؤ گے لیکن آخر سوا پشیمانی کے کچھ پلے نہ پڑے گا تمہارا مال کچھ نہ کر سکے گا تمہیں شکست ہوگی اور اگر پھر بھی ہوش ٹھکانے نہ آئے اور اسلام قبول نہ کیا تو پھر سب کو اکٹھا کر کے دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ مکہ کے مشرکوں نے عبادت کے کئی خود کے طریقے ایجاد کر رکھے تھے جو بذات خود مسجد کے آداب کے خلاف تھے، مثلاً: ان کے دل میں شیطان نے یہ بات ڈال دی تھی کہ جن کپڑوں میں ہم گناہ کرتے ہیں ان کپڑوں کے ساتھ ہم بیت اللہ جیسے پاک جگہ کا طواف کیسے کر سکتے ہیں؟ چنانچہ جن لوگوں کو مکہ کے قریشی اپنے کپڑے استعمال کیلئے دے دیتے تھے وہ ان کپڑوں کے ساتھ طواف کر لیتے تھے اور باقی زیادہ تر حاجی اپنے کپڑوں میں طواف کرنے کے بجائے ننگے طواف کرنے کو ترجیح دیتے تھے، چنانچہ مرد دن کے وقت بیت اللہ کا طواف کرتے اور عورتیں رات کے وقت، وہ بد بخت اس برے کام کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے کہتے تھے کہ ہم اللہ کے حکم سے ایسا کرتے ہیں حالانکہ پچھلی سورۃ "سورۂ اعراف" میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اس بے حیائی کا حکم نہیں دیتے ایسے عمل کو اللہ تعالیٰ یا شریعت کا حکم بتانا تو بہت بڑی زیادتی کی بات ہے۔

مفسرین کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ: جب خود پیغمبر ﷺ یا آپ کا کوئی صحابی بیت اللہ کے پاس نماز کیلئے کھڑا ہوتا تو مشرک لوگ دخل اندازی کیلئے سیٹیاں بجانا شروع کر دیتے تھے جو کہ نہایت ہی بے ادبی اور گستاخی کی بات تھی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: مشرکوں کی نماز یہ ہے کہ بیت اللہ کے نزدیک سیٹیاں اور تالیاں بجائی جائیں، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "تَصْدِيَةً" سے مراد وہ آواز ہے جو ہاتھ مارنے سے پیدا ہوتی ہے گویا

اللہ تعالیٰ نے تالیاں بجانے سے منع فرمایا ہے ۶ ؁ھ میں مکہ کے مشرکوں نے عمرہ کیلئے آنے والے مسلمانوں کو مکہ سے باہر ہی روک دیا تھا اور شہر میں داخل نہیں ہونے دیا تھا۔

کافر لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنے کیلئے اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں ان کے پیش نظر غریبوں کی ہمدردی کا کوئی کام نہیں ہوتا بلکہ یہ لوگ اس لئے بہت مال خرچ کرتے ہیں تاکہ اسلام کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جاسکیں اور یہ آگے نہ بڑھ سکے، چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے کہ عرب کا ایک بہت بڑا شاعر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا مگر کافر اسے صرف اس لئے آپ کے پاس جانے سے روکتے تھے کہ اگر اس نے اسلام سے متأثر ہوکر کوئی قصیدہ کہہ دیا تو سارا عرب اسلام کی طرف مائل ہوجائے گا، چنانچہ مشرکوں نے سو اونٹ اناج کے عوض اس شاعر کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے سے روک دیا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے کافروں کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ اسلام کا راستہ روکنے کیلئے اپنے مال خرچ کرتے ہیں پھر وہ مال ان کیلئے حسرت کا باعث ہوگا اور بالآخر وہ حق کے مقابلے میں ذلیل وخوار ہوکر رہ جائیں گے۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... مسجد میں تالیاں بجانا، سیٹیاں مارنا مسجد کے آداب کے خلاف ہے۔

اچھے کو بُرے سے الگ کرنا

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَ يَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى

تاکہ جدا کردے اللہ گندے کو سے صاف ستھرے اور کردے گندے کو ایک کو پر

ع ۹ ۱۸ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

دوسرے پھر ایک ڈھیر بنادے اس کا اکٹھا پھر کردے اس کو میں دوزخ وہ لوگ وہی ہیں جو نقصان میں ہیں (۳۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ تاکہ اللہ ناپاک کو پاک سے جدا کردے اور ناپاک کو ایک دوسرے کے اوپر رکھے، پھر اس کو اکٹھا کر کے ایک ڈھیر بنا دے، پھر اس کو دوزخ میں ڈال دے وہی لوگ ہیں جو نقصان میں ہیں۔(۳۷)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ بری طبیعت کے لوگوں کو صاف ستھرے اور پاک لوگوں سے جدا کردے اور جب اچھے لوگ بروں سے چھٹ کر علیحدہ ہو جائیں تو بروں کو اکٹھا کر کے ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر لکڑیوں کا گٹھا سا بنائے اور سب کو اٹھا کر ایک دم دوزخ میں جھونک دے تاکہ وہ سمجھ جائیں کہ انہوں نے نیک لوگوں کی مخالفت کر کے سراسر نقصان ہی نقصان اٹھایا دنیا میں ذلت و رسوائی پلے پڑی اور آخرت میں دوزخ نصیب ہوئی، سو! الگ اس سے زیادہ نقصان اور کیا ہوگا؟

اس جگہ "خبیث" اور "طیب" دونوں لفظوں سے کافروں کے حرام مال اور مسلمانوں کے حلال مال بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا دستور

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ

کہہ دیجئے ان سے جو کافر ہوئے اگر باز آجاؤ معاف کردیا جائے لئے تمہارے جو تحقیق گزر چکا اور

اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا

اگر پھر وہی کرو تو تحقیق جاری ہو چکا ہے طریقہ پہلے لوگوں کا (۳۸) اور لڑو ان سے یہاں تک کہ نہ

تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

رہے فساد اور ہو جائے دین سب کا سب اللہ کا پس اگر باز آجائیں تو تحقیق اللہ

بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ
اسکو جو وہ کرتے ہیں دیکھنے والا ہے (۳۹) اور اگر منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ ساتھی ہے تمہارا

نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾
اچھا ساتھی ہے وہ اور اچھا مددگار (۴۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کافروں سے کہہ دیں! اگر وہ باز آجائیں تو جو کچھ ہو چکا وہ ان کا معاف کر دیا جائے گا اور اگر پھر وہی کریں گے تو پڑ چکا ہے پہلے لوگوں کا راستہ۔ (۳۸) اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد نہ رہے اور دین فقط اللہ کا رہ جائے، پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ ان کے کام کو جو وہ کرتے ہیں دیکھتا ہے۔ (۳۹) اور اگر وہ نہ مانیں تو جان لو کہ! اللہ تمہارا حمایتی ہے کیا خوب حمایتی ہے اور کیا خوب مددگار۔ (۴۰)

تفسیر

ارشاد ہے کہ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ! تم شرارتوں سے باز آجاؤ تو تمہاری پچھلی نالائقیاں معاف کر دی جائیں گی لیکن اگر تم نے پھر سر اٹھایا تو یاد رکھو! تو پھر وہی سزا ملے گی جس کا تم مزہ چکھ چکے ہو، مسلمانوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ تم ان سے لڑنے کیلئے اس وقت تک پورے طور پر تیار رہو جب تک یہ فتنہ وفساد ختم نہ ہو جائے اور ان کا چال چلن بالکل اسی طرح کا نہ ہو جائے جس کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے خود مقرر کر دیا ہے اگر وہ مان جائیں تو ان کو کچھ نہ کہو اور معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ و اگر نہ مانیں تو ان سے ڈٹ کر مقابلہ کرو اور یاد رکھو! کہ اللہ تعالیٰ تمہارا ساتھی اور مددگار ہے اور اس سے بہتر ساتھی اور مددگار کوئی نہیں ہو سکتا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اس جگہ پر فتنہ سے مراد شرک ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان اس طرح ہے کہ کافروں مشرکوں سے جنگ جاری رکھو حتیٰ کہ کفر وشرک باقی نہ رہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کافروں اور مشرکوں سے جزیہ قبول کر کے انہیں اسلامی حکومت کی پناہ میں رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ امام اعظم امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ: عرب کے

کافر و مشرک سے جزیہ قبول نہیں کیا جاسکتا ان کیلئے حکم یہ ہے کہ وہ یا تو ایمان قبول کرلیں یا وہ اسلام کا مرکز، یعنی: عرب کا خطہ چھوڑ جائیں اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر انہیں ختم کر دیا جائے گا کیونکہ دین کے مرکز میں دو دین اکٹھے نہیں چل سکتے۔

جہاد کی ایک غرض تو یہ ہے کہ زمین پر فتنہ باقی نہ رہے اور دوسری یہ کہ اطاعت سب کی سب اللہ تعالیٰ کیلئے ہوجائے جب کسی قوم، معاشرے یا ملک میں اللہ تعالیٰ کے دین کے علاوہ کوئی دوسرا قانون نافذ ہوگا تو یہ غیر اللہ کی اطاعت ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت نہیں ہوگی، "سورۂ انفال" اور "توبہ" میں صلح و جنگ سے متعلق کل تیرہ اصول اور کچھ ضمنی باتیں بیان کی گئی ہیں اور ان تمام کا مقصد اللہ تعالیٰ کے دین کا غلبہ ہے آگے بتایا جائے گا کہ جہاد سے مراد ملک حاصل کرنا نہیں، نہ محض لونڈیاں اور مال و دولت حاصل کرنا ہے اور نہ کسی قوم کا صرف خاتمہ مقصود ہے بلکہ جہاد کا اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین سربلند و غالب ہو اور اللہ تعالیٰ کی بات ہی اونچی ہو اس کے مقابلے میں شیطان اور غیر اللہ کی بات پست ہوجائے، آگے غنیمت کے مال کی تقسیم کا مسئلہ بھی آئے گا مگر یہ ضمنی بات ہے اصل چیز یہی ہے کہ اللہ کا دین سربلند ہوجائے اور اطاعت ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کیلئے ہو جب تک مسلمان جہاد کرتے رہیں گے ان کو دنیا میں عزت و وقار حاصل رہے گا جب جہاد کو چھوڑ دیں گے تو ذلیل و خوار ہو کر رہ جائیں گے۔

اگر کافر و مشرک لوگ کفر و شرک سے باز آجائیں تو ان کے ہر کام اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس شخص میں کتنا خلوص اور کتنا دوغلا پن ہے اور وہ کفر و شرک سے باز آگیا ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ اس کے اندرونی اور بیرونی حالات سے واقف ہیں اگر وہ اللہ تعالیٰ کی بات سے منہ موڑیں گے تو جان لو کہ! تمہارا کارساز اور آقا اللہ ہی ہے، فرمایا: خدا تعالیٰ بہترین کارساز ہیں اور بہترین مددگار ہیں اگر تم دین کی مدد کیلئے آگے بڑھو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کریں گے یہ اس کا وعدہ ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی تائید، دین کو قائم کرنے اور کفر و شرک کو ختم کرنے کیلئے کمربستہ ہوجاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی مدد ضرور تمہارے ساتھ ہوگی۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... کافروں کے اسلام کے اظہار یا صلح کے معاہدہ کے بعد ان پر ہاتھ اٹھایا گیا تو جہاد کرنے والے مجرم ہوجائیں گے جیسا کہ "بخاری ومسلم" کی ایک حدیث میں پیغمبر ﷺ کا ارشاد ہے کہ: مجھے اس کا حکم دیا گیا ہیکہ میں اسلام کے دشمنوں سے قتال کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کو قبول کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب وہ ایسا کرلیں تو ان کے خون اور مال سب محفوظ ہوجائیں گے سوائے اس کے کہ اسلامی قانون کے ماتحت کسی جرم کے بدلے میں ان کو سزا دی جائے اور ان کے دلوں کا حساب اللہ تعالیٰ پر رہے گا کہ وہ سچے دل سے اس کلمہ اور اسلام کے عملوں کو قبول کر رہے ہیں یا نفاق سے۔

دوسری ایک حدیث جو "ابوداؤد" نے بہت سے صحابہ کرام کی روایت سے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص کسی معاہد (ذمّی) پر، یعنی: اس شخص پر جس نے اسلامی حکومت کی اطاعت ووفاداری کا معاہدہ کرلیا ہو تو کوئی ظلم کرے یا اس کو نقصان پہنچائے یا اس سے کوئی ایسا کام لے جو اس کی طاقت سے زائد ہے یا اس کی کوئی چیز بغیر اس کی دلی رضامندی کے حاصل کرے تو میں قیامت کے دن اس مسلمان کے خلاف معاہد کی حمایت کروں گا۔

غنیمت کی تقسیم

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ

اور | جان لو | کہ جو کچھ | غنیمت لو تم | کسی | چیز کی | پس تحقیق لیے اللہ کے | پانچواں حصہ اسکا | اور | لیے پیغمبر کے

وَ لِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ

اور کے لیے | قریبی رشتہ داروں | اور | یتیموں | اور | محتاجوں | اور | مسافروں | اگر

كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ

ہوتم ایمان لائے پر اللہ اور اس پر جو اتارا ہم نے پر بندے اپنے کے دن فیصلہ کے

يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾

جس دن مل گئیں دو فوجیں اور اللہ اوپر ہر چیز کے قادر ہے (۴۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جان رکھو کہ جو تم کو کسی چیز سے غنیمت ملے ،سو! اس میں پانچواں حصہ اللہ کے واسطے اور پیغمبر کے واسطے اور قریبی رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے ہے اگر تم کو اللہ پر یقین ہے اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن اتاری جس دن دونوں فوجیں بھڑ گئیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔(۴۱)

تفسیر

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ غنیمت کے مال میں پانچواں حصہ اللہ کے نام کا نکال دو اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور تم کو یقین ہے کہ بدر کی لڑائی میں فتح پانا تمہارے بس کا نہ تھا وہ اللہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اس کے خاص بندے ہیں مدد کی اور لڑائی کے دوران انہیں تسلی دی اور اطمینان بخشا، فرشتے مدد کے لیے بھیجے تو فتح نصیب ہوئی اس کا یقین کرتے ہوئے پانچواں حصہ اللہ کے نام کا دینا کچھ مشکل نہیں اس پانچویں حصہ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح خرچ کریں گے:

(۱)....اپنی ذات پر۔

(۲)....اپنے رشتہ داروں پر (جن کو زکوۃ لینا حرام ہے)۔

(۳)....یتیموں پر۔

(۴)....محتاجوں پر۔

(۵)....مسافروں پر۔

باقی کے چار حصے لشکر میں تقسیم کیے جائینگے جن میں سے پیدل کو ایک اور گھوڑ سوار کو دو حصے دیے جائینگے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ کا حصہ اور آپ کے قریبی رشتہ داروں کا حصہ نہیں رہا صرف محتاج مسکین ہی حق دار رہ گئے۔

قرآن پاک میں غنیمت کے مال کے متعلق تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس سورت میں "انفال" اور غنیمت کے الفاظ ہیں جب کہ "سورہ حشر" میں "فئ" کا لفظ آیا ہے جو مال دشمن کے ساتھ جنگ کر کے حاصل کیا جائے وہ غنیمت کا مال کہلاتا ہے اور جو صلح صفائی کے ساتھ کسی معاہدہ کے تحت حاصل ہوا سے "فئ" کہتے ہیں جیسے جزیہ و خراج، اور "انفال" کا لفظ دونوں قسم کے مال کے لیے بولا جاتا ہے۔

پہلی امتوں کے لیے غنیمت کا مال حلال نہیں تھا، صحیح حدیثوں میں آتا ہے کہ اس قسم کے جمع شدہ مال کو ٹھکانے لگانے کا طریق کار یہ تھا کہ اسے کسی ایک جگہ پر ڈھیر کر دیا جاتا جسے آسمان سے ایک آگ آکر جلا ڈالتی اور یہ اس جہاد کے مقبول ہونے کی علامت ہوتی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے غنیمتوں کو حلال قرار دیا ہے، لہٰذا یہ امت اس مال سے فائدہ اٹھا سکتی ہے البتہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تقسیم کا قانون بیان فرمادیا ہے، "فئ" کا مال چونکہ بغیر جنگ کے حاصل ہوتا ہے؛ اس لیے اس میں مجاہدین کا حصہ نہیں ہوتا بلکہ وہ سارے کا سارا اجتماعی اور رفاہی کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے ایسے کاموں میں جہاد بھی شامل ہے، غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرنا بھی سماج کی مشترکہ ذمہ داری ہے اس کے علاوہ مسجدوں اور مدرسوں کی تعمیر، ہسپتال، مسافر خانے اور پانی کا بندوبست وغیرہ پر بھی "فئ" کا مال خرچ کیا جاسکتا ہے۔

غنیمت کے مال کی تقسیم کا قانون اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اس حکم میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اپنی مرضی سے ایک سوئی یا جوتے کا تسمہ بھی نہیں لے سکتا، یہ حرام ہے، غنیمت کے مال میں خیانت کرنے کو چوری سے بھی زیادہ سخت جرم قرار دیا گیا ہے، غنیمت کے مال کی چوری کرنا دوزخ کا ایندھن بننا ہے، فرمایا کہ: غنیمت کے مال کا ایک دھاگہ یا سوئی بھی کسی کے پاس ہو تو وہ لا کر رکھ دے

کیونکہ ایسی معمولی خیانت بھی شرم کی بات ہے اور اس کا بڑا وبال پڑے گا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ غنیمت کے مال میں سے جوتے کا ایک تسمہ یا دو تسمے بھی اٹھائے ہیں تو وہ دوزخ میں لے جائیںگے ایک موقع پر ایک شخص نے غنیمت کے مال میں سے کوئی معمولی چیز اٹھالی اس کے بعد مال تقسیم ہوگیا اس شخص کو بعد میں خیال آیا کی اس سے غلطی ہوئی ہے چنانچہ وہ چیز پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا اس پر آپ نے فرمایا: اب میں اس کا کیا کروں، یہ تو دوزخ کا مال ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے ایک چٹکی جتنے بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس مال میں میرا اتنا حق نہیں، یعنی: میرا ذاتی کوئی اختیار نہیں یہ مال اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک غلام جہاد میں مارا گیا، لوگوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشخبری دی کہ آپ کا غلام دشمن کے تیر سے ہلاک ہوگیا ہے آپ نے فرمایا: وہ شہید نہیں ہے بلکہ وہ تو دوزخ میں پڑا ہے کیونکہ اس نے غنیمت کے مال سے ایک چادر چوری کرلی تھی اب وہی چادر دوزخ میں آگ کا شعلہ بن کر اس کے جسم کے گرد لپٹ رہی ہے، یہ سن کر صحابہ بڑے خوفزدہ ہوئے اور اس کے بعد کسی شخص نے غنیمت کے مال میں سے کوئی چیز تقسیم ہونے سے پہلے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، مال کی تقسیم سے پہلے کوئی چیز حاصل کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے وہ چیز لشکر کے امیر یا حاکم کی اجازت سے حاصل کی جائے۔

غنیمت کے مال کا مسئلہ سب سے پہلے بدر کی جنگ میں پیدا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تقسیم کا یہ قانون بیان فرمایا: "وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ" "خوب جان لو! تمہیں جو چیز بھی غنیمت میں حاصل ہو چاہے وہ جانگ کا سامان ہو یا کھانے پینے کی چیزیں ہوں یا سواری وغیرہ کے جانور ہوں یا اس کے علاوہ اور کوئی چیز ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ کی نیاز ہوگی، اس کا مطلب یہ ہے کہ غنیمت کے مال کے کل پانچ حصے کیے جائیںگے جن میں سے چار حصے تو جہاد میں شریک ہونے والے غازیوں میں تقسیم ہونگے اور پانچواں حصہ ان پر خرچ کیا جائیگا جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: اس آیت میں جن حصہ داروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں اللہ تعالیٰ کا نام سرفہرست ہے مگر یہ محض برکت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کے حقیقی مالک ہیں اور اسے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں، بعض فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کے حصے سے مراد ہے کہ اسے نیکی کے کاموں میں خرچ کیا جائے، اس حصہ کے مال کو خانہ کعبہ پر خرچ کیا جائے کہ وہ اللہ کا گھر ہے اور خانہ کعبہ دور ہو تو دوسری مسجدوں پر خرچ کر دیا جائے تاہم زیادہ فقہائے کرام اس طرف گئے ہیں کہ حقیقت میں اس مال میں اللہ تعالیٰ کا حصہ محض برکت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

فرمایا کہ: غنیمت کے اس مال کا پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ کا حصہ ہے اور اللہ کے پیغمبر کا حصہ ہے، پیغمبر اللہ کا نائب ہے جو اس کے تمام حکم بندوں تک پہنچاتا ہے، لہٰذا ایک حصہ اس کے ذاتی اخراجات کے لیے رکھا گیا ہے، ایک حصہ پیغمبر کے رشتہ داروں کا ہے، آپ کے رشتہ داروں میں سے دو خاندان بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب مراد ہیں، یہ دونوں خاندان اسلام کے دور سے پہلے بھی آپ کے ساتھ متفق تھے اور اسلام کے آنے کے بعد بھی متفق رہے، لہٰذا ان کا حصہ بھی مقرر کیا گیا ہے، اگرچہ ان خاندانوں کے بعض لوگ ایمان نہ لائے مگر وہ آپ کی مدد کرتے تھے خمس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ داروں کا حصہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: زکوٰۃ نہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال ہے اور نہ آپ کی آل کے لیے، اور آپ کی آل میں دو خاندان آتے ہیں تاہم رشتہ داروں کا حصہ اس صورت میں روا ہوگا جب کہ وہ آپ کی مدد کرتے ہوں، اس کے بعد فرمایا کہ: ایک حصہ یتیموں اور مسکینوں کا ہے، اور ایک حصہ مسافروں کا ہے۔

غرضیکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کل غنیمت کے مال کے پانچویں حصے کو ان حصہ داروں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے، یعنی: اللہ تعالیٰ، اس کا پیغمبر، پیغمبر کے رشتہ دار، یتیم، مسکین اور مسافر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اللہ تعالیٰ کا نام تو محض برکت کے لیے لیا گیا ہے، البتہ اللہ کا پیغمبر اپنے ذاتی مصارف کے لیے اس میں سے اپنا حصہ لے سکتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ خمس کے آگے پانچ حصے ہونگے اور مذکورہ افراد پر تقسیم کر دیے جائینگے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حصہ اور آپ کے رشتہ داروں کا حصہ تو آپ کی زندگی تک تھا، آپ کی وفات کے بعد ان حصوں کا کیا کیا جائیگا؟ امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حصہ آپ کی زندگی تک ہی تھا آپ کی وفات کے بعد وہ ختم ہوگیا ہے، اسی طرح آپ کے رشتہ داروں کا حصہ بھی آپ کے ساتھ تعاون کی وجہ سے تھا، چونکہ آپ کے بعد یہ بات بھی ختم ہوگئی، لہٰذا رشتہ داروں کا حصہ بھی ختم ہوگیا، اوراب صرف تین قسم کے افراد رہ گئے، یعنی: یتیم، مسکین اور مسافر، البتہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب میں سے اگر کوئی آدمی یتیم، مسکین اور مسافر کی مدات میں آئے گا تو وہ حقدار ٹھہرے گا اور مذکورہ تین مدات میں آیگا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ کل غنیمت کے مال کا خمس (پانچواں حصہ) نکال کر باقی چار حصے جنگ میں شریک ہونے والے مجاہدین میں تقسیم ہوں گے اس کی واضح مثال خیبر کی ہے جہاں وصول ہونے والا مال پندرہ سو مجاہدین میں تقسیم کیا گیا تھا، بہر حال مجاہدین میں تقسیم کا اصول یہ ہے کہ پیدل آدمی کو ایک حصہ اور گھوڑ سوار کو دو حصے ملیں گے۔

احکام ومسائل

اس آیت میں غنیمت کے مال کے حکم بیان کیے گئے ہیں، یہ بات غور طلب ہے کہ اس آیت میں غنیمت کے مال کے خمس، یعنی: پانچویں حصے کا ذکر ہے باقی چار حصوں کی تقسیم کا کوئی ذکر نہیں، اس میں کیا راز ہے اور باقی چار حصوں کی تقسیم کا کیا قانون ہے، اللہ رب العزت نے جب یہ ارشاد فرمایا کہ: غنیمت کے مال میں سے پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ اور پیغمبر وغیرہ کا ہے تو اس کا نتیجہ صاف یہ نکل آیا کہ باقی چار حصے مجاہدین کے ہیں، پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان اور عمل نے اس پوری تفصیلات کو واضح کر دیا کہ یہ چار حصے مجاہدین میں ایک خاص قانون کے تحت تقسیم کیے جائینگے۔

اللہ تعالیٰ نے غنیمت کے مال کے پانچویں حصے کو خرچ کرنے اور تقسیم کرنے کا حق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمایا جس کا حاصل امام طحاوی کی تحقیق اور "تفسیر مظہری" کی تقریر کے مطابق یہ ہے کہ اگر چہ اس جگہ خمس کے دینے

کے لیے پانچ ناموں کا ذکر ہے لیکن درحقیقت اس میں پورا عمل دخل پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ اپنی صوابدید کے مطابق ان پانچ قسموں میں غنیمت کے پانچویں حصے کو خرچ کریں جیسا کہ "سورۂ انفال" کی پہلی آیت میں پورے غنیمت کے مال کا حکم یہی تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صوابدید کے مطابق جہاں چاہیں خرچ فرمائیں جس کو چاہیں دیں آیت "وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ" نے کل غنیمت کے مال کے پانچ حصے کر کے مجاہدین کا حق قرار دیا مگر پانچواں حصہ بدستور اسی حکم میں رہا کہ اس کا خرچ کرنا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑا گیا صرف اتنی بات کا اضافہ ہوا کہ اس پانچویں حصے کے پانچ حق دار بیان کر دیے گئے مگر جمہور کے نزدیک آپ کے ذمہ یہ لازم نہیں تھا کہ اس خمس کے پانچ حصے برابر کریں اور آیت کے پانچوں قسموں میں برابر تقسیم کریں بلکہ صرف اتنا ضروری تھا کہ غنیمت کے پانچویں حصے، یعنی: خمس کو انہیں پانچ قسموں کے اندر سب کو یا بعض کو اپنی صوابدید کے مطابق عطا فرمائیں۔

مقصود اس آیت کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پابندی عائد کرنا نہیں کہ ان سب قسموں کو ضرور ہی دیں اور برابر دیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ غنیمت کا پانچواں حصہ ان پانچ قسموں میں سے جس قسم پر جتنا خرچ کرنا آپ کی رائے میں مناسب ہو اتنا دیدیں۔

ذوی القربیٰ سے کون لوگ مراد ہیں

"ذوی القربیٰ" یعنی: رشتہ داروں سے مراد "بنو ہاشم" اور "بنو عبدالمطلب" ہیں، بنو ہاشم تو آپ کا اپنا ہی قبیلہ تھا، بنو عبدالمطلب کو بھی ان کے ساتھ اس لیے شامل فرمالیا تھا کہ یہ لوگ بھی جاہلیت واسلام میں کبھی بنو ہاشم سے الگ نہیں ہوئے یہاں تک کہ قریش نے جب بنو ہاشم کا غذائی بائیکاٹ کیا اور ان کو شعب ابی طالب میں بند کر دیا تو بنو عبدالمطلب اپنی مرضی سے اس بائیکاٹ میں شریک ہو گئے، حالانکہ قریش نے ان کو اس بائیکاٹ میں داخل نہیں کیا تھا۔

بدر کی جنگ کو "یوم الفرقان" فرمایا گیا

فرقان کے معنی ہیں "فیصلہ" بدر کے دن کو اس لئے "یوم الفرقان" کہا گیا ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے

کافروں کو عبرتناک شکست دی اور مسلمانوں کو باوجود انتہائی تھوڑی تعداد میں ہونے کے فتح نصیب فرمائی اس طرح اس دن کفر و اسلام کے درمیان ظاہری فیصلہ ہو گیا۔

بدر کی جنگ اللہ تعالیٰ کو منظور تھی

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَ الرَّكْبُ

جب تم تھے اس کنارے پر جو قریب تھا اور وہ اس کنارے پر جو دور تھا اور قافلہ

اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَ لَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَ

نیچے کی طرف سے تم اور اگر وعدہ کرتے تو اختلاف کرتے میں مقرر وقت پر پہنچنے اور

لٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ

لیکن تاکہ پورا کرے اللہ ایک کام جو تھا کئے جانے والا تاکہ مرے سے جو مرے سے

بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۴۲﴾

حق پہچان کر اور جیئے جو جئے سے حق پہچان کر اور تحقیق اللہ البتہ سننے والا جاننے والا (۴۲)

بامحاورہ ترجمہ: جس وقت تم ادھر والے کنارے پر تھے اور پرلے کنارے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے اتر گیا اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے تو وعدہ پر ایک ساتھ نہ پہنچتے لیکن اللہ کو ایک کام جو مقرر ہو چکا تھا کر ڈالنا تھا تاکہ جس کو مرنا ہے قیام حجت کے بعد مرے اور جس کو جینا ہے قیام حجت کے بعد جئے اور بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (۴۲)

تفسیر

بدر کی جنگ میں مسلمان اس جانب تھے جو مدینہ کے قریب تھی اور مکہ کے کافر اس جانب تھے جو مدینہ سے دور تھی اور قریش کا تجارتی قافلہ اس مقام سے سے نیچے کی طرف اتر کر سمندر کے کنارے مکہ کی طرف جا رہا تھا

اسی قافلے پر قبضہ کرنے کے ارادے سے مسلمان مدینہ سے نکلے تھے، وہ تو بچ نکلا، لیکن مکہ کے کافروں سے جو اس کے بچانے کے لیے آئے تھے، مسلمانوں کا آمنا سامنا ہو گیا، اس آیت میں بدر کے مقام پر دونوں جماعتوں اور قافلے کی جگہ کا نقشہ کھینچا گیا ہے، مسلمان بدر کے میدان کے اس کنارے پر تھے جو مدینہ سے قریب تھا، کافر ان کے سامنے اس کنارے پر ڈٹے ہوئے تھے جو مدینہ سے دور تھا اور قافلہ ان دونوں گروہوں سے گذر کر کافروں کے لشکر کے پیچھے محفوظ مقام پر دوسری وادی میں پہنچ چکا تھا، اس طرح کافروں کا لشکر مسلمان اور تجارتی قافلے کے درمیان میں تھا، ارشاد ہے کہ جنگ کا یہ سارا نقشہ اللہ کی مرضی سے قائم ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ اس دن بدر کے مقام پر حق اور باطل کے درمیان فیصلہ ہو جائے اور دنیا جان لے کہ مسلمان حق پر تھے اور کافر باطل پر۔

عُدْوَةِ الْقُصْوٰى: اس کا معنیٰ دور والا کنارہ ہے اور میدان کا یہ حصہ جس پر کا قبضہ تھا نسبتاً مدینہ سے دور تھا اور مکہ معظّمہ کا تو فاصلہ بہت زیادہ تھا، اس زمانے میں اونٹوں کی سواری کے سفر کے لحاظ سے بدر کا مقام مدینہ سے چار منزل پر اور مکہ سے آٹھ منزل پر ہے، بدر کے مقام کچھ اونچی جگہ پر ہے جب کہ اس سے پرلا حصہ جو کہ ساحل سمندر کی طرف واقع ہے نسبتاً نشیبی علاقہ ہے، چونکہ اس میدان میں مشرک لوگ پہلے پہنچے تھے اس لیے انہوں نے نشیبی علاقے کو پسند کیا کیونکہ وہاں پانی بھی تھا اور ریتیلی زمین بھی سخت تھی اس کے برخلاف مسلمانوں نے میدان کے جس حصہ میں پڑاؤ کیا وہ نسبتاً بلندی پر اور ریتیلا علاقہ تھا جس میں سواری کے پاؤں دھنس جاتے تھے اور چلنے پھرنے میں مشکلات پیش آتی تھی، اس صورت حال کی بناء پر مسلمانوں مین کچھ تشویش بھی پائی جاتی تھی، تاہم اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر احسان فرمایا کہ جنگ کی رات کو بارش برسادی جس سے ریتیلا علاقہ پختہ ہو گیا، مجاہدین کو پانی بھی میسر آ گیا اور وہ تازہ دم ہو گئے، ادھر مشرکین کے حصے میں بارش کی وجہ سے دلدل پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے انہیں چلنے پھرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی انعام فرمایا کہ ایک ہزار فرشتے اتارے جنہوں نے ایمان والوں کے دلوں کو مضبوط کیا، مسلمانون پر سکون اتارا اور ان کی

پریشان خیالی کو دور کیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے راتوں رات ایسے اسباب پیدا کر دیے جو ایمان والوں کے حق میں تھے، چنانچہ اگلی صبح جب مکہ کے کافروں کے ساتھ مقابلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بہت بڑی فتح عطا فرمائی۔

وَ لَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ: (اگر تم آپس میں وعدہ کرتے ہو تو اس وعدے کی خلاف ورزی کرتے) مقصد یہ کہ مدینہ سے چلتے وقت اگر تم جنگ کے ارادے سے نکلتے تو تم میں سے بعض لوگ اس کی مخالفت کرتے کیونکہ بظاہر مسلمانوں کی تعداد بھی کم تھی اور ان کے پاس جنگی سامان بھی نہیں تھا، اور پھر یہ بھی کہ اگر جنگ میں حصہ لینے کا وعدہ کر بھی لیتے تو کافروں کی افرادی قوت کو دیکھ کر وعدے کا خلاف بھی ہو سکتا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ تمہیں جنگ کے ارادے سے نہ نکالے بلکہ محض تجارتی قافلے کا پیچھا کرنے کے لیے آمادہ کرے، چنانچہ ایسا ہی ہوا لوگ قافلے کا پیچھے کرنے کے لیے نکلے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بدر کے میدان میں لا کھڑا کیا تاکہ اللہ تعالیٰ اس چیز کا فیصلہ کر دے جو اس کے ہاں طے ہو چکی تھی اور اللہ تعالیٰ کی حکمت میں یہ بات بھی ابتداء ہی میں طے ہو چکی تھی کہ ایمان والوں اور کافروں کو آمنے سامنے کھڑا کر کے مسلمانوں کو غالب اور کافروں کو مغلوب کرنا ہے اس فیصلے کا اور مسلمان بھی دیکھ لیں کہ بے سروسامانی کی حالت میں فتح سے ہمکنار کرنے والی ذات صرف ایک اللہ ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اور وہی سننے والا جاننے والا ہے۔

لڑائی کے سامان

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَ لَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا

جب دکھایا تجھے ان کو اللہ نے میں خواب آپ کے تھوڑا اور اگر دکھاتا تجھے ان کو بہت

لَّفَشِلْتُمْ وَ لَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ

تو بزدلی کرتے تم اور جھگڑتے میں اس معاملہ اور لیکن اللہ نے محفوظ رکھا تحقیق وہ جاننے والا ہے

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾

بات دلوں کی (۴۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جب اللہ نے وہ کافر آپ کو آپکے خواب میں تھوڑے دکھلائے اور اگر وہ آپ کو بہت دکھا دیتا تو تم لوگ بزدلی دکھاتے اور جھگڑا ڈالتے کام میں لیکن اللہ نے بچالیا اس کو خوب معلوم ہے جو دلوں کی بات ہے۔(۴۳)

لفظی تحقیق: فَشِلْتُمْ: (نامردی کرتے تم) ماضی کا صیغہ ہے فشل کے معنی ہیں ڈھیلا پڑ جانا، کام کے وقت سستی دکھانا۔ تَنَازَعْتُمْ: (جھگڑتے) ماضی کا صیغہ تنازع سے۔ اَمْرِ: کے بہت سے معنی ہیں یہاں اس سے مراد وہ کام ہے جو اس وقت درپیش تھا، یعنی: کافروں سے لڑنا۔ ذَاتِ الصُّدُوْر: (ذات کے معنی ہیں والا، صدور، صدر کی جمع ہے سینہ کو کہتے ہیں، دل سینہ میں ہوتا ہے؛ اس لیے اس سے مراد یہاں دل ہے۔ بِذَاتِ الصُّدُوْر: دل کی باتیں، یعنی: وہ باتیں جو لوگوں کے دلوں میں آتی ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ: اللہ کو یہی منظور تھا کہ تمہاری کافروں سے جھڑپ ہو اور تم ان کو نیچا دکھاؤ کیونکہ اللہ سب کی مصلحتوں سے واقف ہے اس نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دکھایا کہ کافروں کی تعداد جن سے مسلمانوں کو مقابلہ کرنا پڑیگا تھوڑی سی ہے، اس میں مصلحت یہ تھی کہ مسلمانوں کی ہمت بندھی رہے اور ارادوں میں کمزوری اور سستی نہ آنے پائے، اگر کہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں دیکھتے کہ کافروں کی تعداد بہت زیادہ ہے جیسا کہ واقعی تھی بھی، اور لوگ آپ کا یہ خواب سنتے تو ان کی ہمت ٹوٹ جاتیں اور ارادے پست ہوجاتے، کوئی کہتا کہ ہم لوگ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں باہر نکلنا ٹھیک نہیں، کوئی کہتا نہیں بلکہ چاہئے جب آپس میں کسی کام کے کرنے نہ کرنے میں اختلاف ہوجائے تو وہ کام ٹھیک نہیں ہوتا اللہ نے ان کو بچانے اور محفوظ رکھنے کا سامان کردیا ہے۔

اللہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دکھایا کہ کافر تھوڑے سے ہیں اس کا مطلب یہ تھا کہ گو دیکھنے میں زیادہ ہیں لیکن یہ تعداد بے کار ہے کیوں کہ ان کو ایسی ہی بری طرح شکست ہوگی جو تھوڑے آدمیوں کو ہوا کرتی ہے۔

بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ اللہ نے پیغمبر کو خواب میں کافروں کی تعداد کم دکھائی گئی جو کہ واقعہ کے خلاف ہے اور پیغمبر کا تو ہمیشہ سچا ہوتا ہے مگر یہاں یہ واقعہ کے خلاف بات کیوں ہوئی؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: پیغمبر کا خواب بلاشبہ سچا ہوتا ہے اور یہاں جو کافروں کی تعداد کم دکھائی گئی وہ بھی حقیقت پر مبنی تھی، کیونکہ بدر کے میدان میں مسلمانوں کے خلاف لڑنے والوں میں سے اکثر بعد میں مسلمان ہو گئے، اس طرح حقیقت میں کافروں کی تعداد کم ہی تھی، اس طرح ایمان والوں کو اگر زیادہ دکھایا گیا تو وہ بات بھی حقیقت سے خالی نہیں تھی کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی مگر اس کے بعد قریبی زمانہ میں اس کی تعداد بہت ہو گئی اور وہ ایک بڑی طاقت بن کر ابھرے، لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب واقعہ کے خلاف نہیں بلکہ حقیقت کے عین مطابق تھا۔

وقت پر تدبیر

وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ

اور جب | دکھائی تم کو وہ فوج | جب | ملے تم | میں | آنکھوں تمہاری | تھوڑی | اور | تھوڑا دکھایا تم کو

فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ

میں | آنکھوں ان کی | تاکہ پورا کرے | اللہ | ایک کام | جو | مقرر ہو چکا تھا | اور | طرف | اللہ کی

تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾

لوٹتے ہیں | سب کام | (۴۴)

ع ۵/۷ ۱

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب مقابلہ کے وقت تم وہ فوج تمہاری آنکھوں میں تھوڑی دکھائی اور تم کو ان کی آنکھوں میں تھوڑا دکھلایا تا کہ اللہ ایک کام جو مقرر ہو چکا تھا کر ڈالے اور ہر کام اللہ تک پہنچتا ہے۔ (۴۴)

تفسیر

اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ بدر کی لڑائی ہو کیوں کہ اس کے ہاں اس کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ اسلام کا بول بالا

کرنا ہے اور کافروں کو نیچا دکھانا ہے اس کے علاوہ مسلمانوں کو یہ سبق بھی دینا تھا کہ فتح تعداد کی زیادتی ظاہری ساز و سامان اور شان و شوکت پر موقوف نہیں، آدمی کا دل مضبوط ہونا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ ہونا چاہیئے کہ اس کی مدد کے آگے دشمن کی تعداد کی زیادتی اور سامان کی زیادتی کام نہیں دیتی، کافر بہت تھے اور ان کے پاس روپیہ پیسہ بہت تھا اس لیے پہلے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دکھایا کہ دشمن کی تعداد بہت تھوڑی ہے اس پر مسلمان ہمت کر کے اٹھ کھڑے ہوئے پھر جب دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو عجیب تماشا ہوا، جس کا اس آیت میں بیان ہے۔

ارشاد ہے کہ: جب تم کافروں کے مقابلے میں ڈٹ کر لڑائی کے میدان میں کھڑے ہوئے تو اللہ نے ان کی صحیح تعداد تم پر پھر بھی ظاہر نہ ہونے دی، تمہاری نگاہ میں وہ کوئی مٹھی بھر آدمی جچے، حالانکہ وہ تم سے تین گنا تھے، اسی طرح جب انہوں نے تم پر نگاہ ڈالی تو انہیں بھی یہی اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے؛ اس لیے دونوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ سامنے والے کو ابھی قابو کر لیتے ہیں اتنے سے آدمیوں کو قابو کرنا کوئی مشکل نہیں ہے، اور لڑائی شروع ہوگئی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بات مقرر ہو چکی تھی کہ یہ لڑائی ضرور ہوگی اور کافروں کا زور اس لڑائی سے ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائیگا۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ: ہر کام کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں اسی کے دربار میں ہر واقعہ پیش ہوتا ہے اور وہ جبھی ہوتا ہے جب وہ اس کے ہونے کا حکم دے، کاش! آج کل مسلمان بھی اس بات کا ایسا ہی یقین کر لیں جیسا کہ پہلے مسلمانوں نے کیا تھا اس یقین سے ایسی قوت دل میں پیدا ہوتی ہے کہ بیان سے باہر ہے مسلمان کافروں کی نگاہ میں جو تھوڑے جچے تو یہ لڑائی کے شروع میں ہوا اور اس کی غرض یہ تھی کہ لڑائی شروع ہو جائے لیکن جب لڑائی ہونے لگی تو کافروں کو معلوم ہوا کہ مسلمان غول کے غول چڑھ آرہے ہیں اور اس قدر کثرت سے ہیں کہ اندازہ بھی مشکل ہے اس سے مسلمانوں کی فتح ہوگئی، "سورۂ آل عمران" میں اس کا ذکر ہے کہ کافروں کو مسلمان اپنے سے دُگنے نظر آنے لگے۔

کامیابی کا راستہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ
اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب لڑو تم کسی جماعت سے تو جمے رہو اور یاد کرو اللہ کو

كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۴۵ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا
بہت تاکہ تم فلاح پاؤ (۴۵) اور اطاعت کرو اللہ کی اور پیغمبر اسکے کی اور نہ

تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
جھگڑو آپس میں بزدل ہو جاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا اور صبر کرو بیشک اللہ

مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۝۴۶
ساتھ ہے صبر کرنے والوں کے (۴۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو جب کسی فوج سے بھڑو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تا کہ تم مراد پاؤ۔(۴۵) اور اللہ کا اور اس کے پیغمبر کا حکم مانو اور آپس میں نہ جھگڑو کہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا جاتی رہے گی اور صبر کرو، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کیساتھ ہے۔(۴۶)

لفظی تحقیق: فَتَفْشَلُوْا:(ماند پڑ جاؤ گے) مضارع کا صیغہ ہے اور فشل سے بنا ہے فشل کے معنی ہیں سست ہو جانا، کمزوری کا احساس ہونا، بزدلی دکھانا۔

تفسیر

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی مدد اس وقت آتی ہے جب آدمی ہمت کھائے اور ثابت قدم کے ساتھ مشکلات کا مقابلہ کرے اللہ کو یاد رکھو ست اور نکمے لوگ، بے صبرے مشکل میں گھبرا جانے والے، رونے پیٹنے والے اس قابل نہیں کہ اللہ ان کی مدد کرے جو اللہ کو بھولے ہوئے ہیں وہ اس کی خاص مدد سے محروم ہیں۔

ارشاد ہے کہ: ایمان والوں کو لازم ہے کہ دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں اور اس وقت میں اللہ کو خوب یاد کریں، حدیث قدسی میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے میرا کامل بندہ وہ ہے جو مجھے اس وقت بھی یاد کرتا ہے جب وہ اپنے دشمن کے ساتھ لڑ رہا ہوتا ہے، اسلام خواہ مخواہ لڑائی نہیں چاہتا، وہ دنیا میں امن کا پیغام ہے اس نے سب سے پہلے انسان کو وہ عام اصول بتائے ہیں جن کو اختیار کر کے اس کا ہر فرد یا گروہ خود بھی زندہ رہ سکتا ہے اور دوسروں کو بھی زندہ رکھ سکتا ہے۔

امن و آمان قائم کرنا اس کا پہلا مقصد ہے لیکن اگر شریر لوگ اپنی شرارت سے باز نہ آئیں اور فساد کے رفع دفع کرنے کے لیے سوا لڑائی کے اور کوئی صورت نہ ہو، اس وقت مسلمانوں کو لازم ہے کہ انتہائی ثابت قدمی دکھائیں، اور اللہ تعالیٰ کو ہر وقت کریں، اللہ کا اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا ماننے کے لیے دل و جان سے تیار ہو جائیں آپس میں ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا بالکل بند کر دیں، آپس میں لڑنے جھگڑنے سے قوم یقیناً کمزور ہو جاتی ہے اور اس کی ہوا اُکھڑ جاتی ہے، دنیا میں رسوائی اور بدنامی حاصل ہوتی ہے، اس کے بعد ان کو چاہیئے کہ سختیوں سے بالکل نہ گھبرائیں اور مشکلات کے سامنے پہاڑ کی طرح ڈٹے رہیں اور یقین رکھیں کہ صابر و شاکر ایمان والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہر وقت موجود ہیں، جنگ کے میدان میں کامیابی کے لیے دو باتیں ہو گئیں۔

تیسرے اور چوتھے نمبر پر فرمایا کہ: "وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ" اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرو اور اس کے پیغمبر کی بھی، اس کا ذکر پہلے سورت کے ابتدائی حصے میں بھی ہو چکا ہے اور اب پھر تاکید کی جا رہی ہے کہ اللہ اور پیغمبر کی اطاعت ہر حال میں کرنی چاہیئے، اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے حکموں پر عمل کرنا ہر ایمان والے پر لازم ہے، "سورہ حشر" میں ہے "وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا" یعنی: جو بات اللہ کا پیغمبر کہہ دے اس پر عمل کرو اور جس چیز سے منع کرے اس سے رُک جاؤ، "سورہ نور" میں ہے "وَ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ" اگر اللہ کے پیغمبر کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے اور بس پیغمبر کے ذمے تو اللہ کے حکموں کو پہنچا دینا ہے یہاں پر اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

کی اطاعت کا ذکر ہے اور "سورہ نساء" میں "وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ" بھی آیا ہے، یعنی: اللہ اور اس کے پیغمبر کے بعد حاکم یا امیر کی اطاعت بھی کرو، البتہ امیر کی اطاعت اللہ اور پیغمبر کی اطاعت کے تابع ہے، اگر امیر اچھی بات کا حکم دیگا تو اس کی اطاعت ہوگی ورنہ نہیں، غلط بات کا حکم دے تو فرمایا: "فلا سمع ولا طاعة" نہ اس کی بات سنی جائیگی نہ مانی جائیگی، جائز کام میں فرمانبرداری ہوگی۔

پانچواں اصول یہ بیان فرمایا "وَلَا تَنَازَعُوْا" آپس میں جھگڑا نہ کرو، اتحاد و اتفاق سے رہو، کیونکہ اتحاد کامیابی کا ذریعہ ہے، اگر جھگڑا کروگے تو "فَتَفْشَلُوْا" کمزور ہوجاؤگے اور تمہار ہوا اُکھڑ جائے گی، اس میں یہ اشارہ ہے کہ تمہاری حکومت ختم ہوجائے گی، آگے فرمایا کہ: صبر کرو بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض جنگوں میں انہیں ہدایات کو یاد دلانے کے لیے عین جنگ کے میدان میں یہ خطبہ دیا، اے لوگوں! دشمن کے مقابلے کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو اور جب مجبوراً مقابلہ ہو ہی جائے تو پھر ثابت قدمی کو لازم پکڑو اور یہ سمجھ لو کہ جنت تلواروں کے سایہ میں ہے۔

کافروں کا چھچھورا پن

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ

اور نہ ہوجاؤ طرح ان کی نکلے جو سے گھروں اپنے اتراتے اور دکھاوے کیلئے

النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ

لوگوں کے اور روکتے تھے سے راستے اللہ کے اور اللہ اس کو جو وہ کرتے تھے

مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾ وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَ قَالَ لَا غَالِبَ

گھیرے ہوئے ہے (۴۷) اور جب خوشنما کردیا لیے ان کے شیطان نے کاموں ان کے کو اور کہا نہیں غالب

لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ

پر تم آج سے کوئی آدمیوں میں اور بیشک میں حمایتی ہوں تمہارا

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور نہ ہو جاؤ ان جیسے جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کے دکھاوے کیلئے نکلے اور اللہ کے راستے سے روکتے تھے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ کے قابو میں ہے۔ (۴۷) اور جس وقت شیطان نے ان کے عملوں کو ان کی نظر میں خوشنما کر دیا اور کہا کہ آج کے دن لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور میں تمہارا حمایتی ہوں۔

لفظی تحقیق: بَطَراً: (اتراتے ہوئے) بَطَرَ کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اچھی چیز پا کر انسان پھول جائے شیخی میں آجائے اور اس کو غلط استعمال کرے۔ رِئَاءً: (دکھاوا) قتال کے وزن پر باب مفاعلہ کا مصدر ہے اس کا مادہ "رؤیۃ" جس کے معنی دیکھنے کے ہیں۔ رِئَاءً: کو ہم بولتے ہیں اس کے معنی ہیں کام کو اس طرح کرنا کہ لوگوں کو اچھا معلوم ہو لیکن حقیقت کچھ نہ ہو، یعنی: دل میں خود اس کام کو اچھا نہ سمجھتا ہو یا وقعت نہ دیتا ہو۔ جَارٌ: (حمایتی) عربی میں جار کے کئی معنی ہیں، پڑوسی، پناہ دینے والا، حمایتی، دوست، مددگار، یہاں پچھلے معنی مراد ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ لڑائی میں طرز عمل وہ بھی ہے جو مکہ کے کافروں نے اختیار کیا، اس طرز عمل کو بیان کر کے حکم دیا کہ تمہیں یہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔

ارشاد ہے کہ: تمہارے مقابلے کے لیے مکہ کے کافر بڑی دھوم سے نقارے اور باجے بجاتے ہوئے نکلے، چنانچہ وہ شیخیاں بگھارتے جاتے تھے، شیطان ان کی ہمت بڑھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ کسی سے مت ڈرو میں تمہارا مددگار ہوں، تم پر آج کوئی غالب نہیں آسکتا۔

کافروں کے لشکر کو ابوجہل لے کر نکلا تھا، راستہ میں اس سے کسی نے کہا کہ جس قافلے کے بچانے کے لیے تم جارہے ہو وہ بچ کر نکل گیا، تم بھی اپنے گھر جاؤ، ابوجہل نے کہا کہ ہم تو بدر پر پہنچ کر تین دن جشن منائیں گے

اسے کیا خبر تھی کہ اس کی شامت اعمال اسے دھکیل کر موت کے منہ میں لے جا رہی ہے۔

ایک طرف تو مکہ کے کافروں کا یہ متکبرانہ طرز عمل تھا دوسری طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑ گڑاتے ہوئے دعا کر رہے تھے کہ: اے کتاب کو اتارنے والے، اے بادلوں کو چلانے والے، اور اے کافروں کو شکست دینے والے ہمیں ان کے مقابلے میں فتح نصیب فرما، کیونکہ ہم آپ کی کتاب کے حکموں کو جاری کرنا چاہتے ہیں اور آپ کے دین کو دنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں، بہر حال اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو فرمایا کہ: تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جانا جو شیخی اور غرور کے ساتھ اور لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: تم ان لوگوں کی طرح بھی نہ ہونا "وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" جو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، یعنی: لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے نہیں دیتے، ابو جہل اور دوسرے بڑے بڑے مشرکوں کا یہی مقصد تھا، وہ چاہتے تھے کہ لوگ توحید کو نہ مانیں اور خدائے وحدہ لاشریک لہ کی عبادت سے ہاتھ کھینچ لے، اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنے کا یہ مطلب ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ" اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے اللہ تعالیٰ نے ان تکبر غرور اور اکڑ کو توڑ کر رکھ دیا اور وہ ذلیل وخوار ہو کر رہ گئے ناکامی اور تباہی ان کا مقدر بن کر رہ گئی اور جو لوگ بچ گئے ان کی اکثریت آگے چل کر اسلام میں داخل ہوگئی اور اس طرح کفر کا مکمل خاتمہ ہوگیا، فرمایا: تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، وہی ہر چیز کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں، لہٰذا اللہ نے کافروں کی تدبیر کو ناکام بنا کر انہیں مغلوب کر دیا اگرچہ ظاہری حالات ان کے حق میں تھے۔

فرمایا: اس بات کو دھیان میں لاؤ! "وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ" جب شیطان نے کافروں کے اعمال کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا، بنی کنانہ جیسا بڑا قبیلہ قریش کے خلاف تھا اور قریش ہمیشہ اس قبیلہ کی طرف سے سہمے رہتے تھے، بدر کی جنگ کے موقع پر قریش کو خطرہ پیدا ہوگیا کہ بنی کنانہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر ہمیں نقصان نہ پہنچائیں، ان خدشہ کو دور کرنے کے لیے شیطان بنی کنانہ کے سردار سراقہ بن مالک کی شکل میں ابو جہل کے پاس آیا اور اس کو حوصلہ دیا کہ وہ قریش کی مخالفت نہیں کرینگے، لہٰذا وہ ان کی طرف سے بے فکر رہیں، یہی

نہیں بلکہ ان کی بوقتِ ضرورت مدد کا وعدہ بھی کیا، ابو جہل اسے سراقہ سمجھ کر مطمئن ہو گیا اور اس کے ذہن سے بنی کنانہ کی طرف سے خطرہ ٹل گیا مگر عین جنگ کے وقت جب سراقہ (جو کہ دراصل شیطان تھا) نے پیچھے ہٹنا چاہا ابو جہل نے کہا اب کیا بات ہے؟ کیوں بھاگتے ہو؟ شیطان کہنے لگا کہ میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور مجھے اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں ہلاک ہی نہ کر دیا جاؤں، دراصل شیطان حضرت جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام کو مسلمانوں کی حمایت میں دیکھ رہا تھا، لہٰذا اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی، چنانچہ وہ کافروں کو چھوڑ کر جنگِ کے میدان سے پیچھے ہٹ گیا۔

غرضیکہ پہلے پہل شیطان نے کافروں کے کرتوتوں کو ان کی نظروں میں اچھا کر کے دکھایا، اور ان سے کہا کہ آج کے دن تم پر کوئی غالب نہیں آئے گا، بلکہ تم ہی غالب اور فتح پانے والے ہو، اور سنو! (گھبراہٹ اور ڈر کی کوئی بات نہیں) کیونکہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔

ان آیتوں میں ایک اور نقصان دہ پہلو پر تنبیہ اور اس سے پرہیز کی ہدایت دی گئی ہے وہ ہے اپنی قوت و کثرت پر ناز، یا کام میں اخلاص کے بجائے اپنی کوئی اور غرض پوشیدہ ہونا، کیونکہ یہ دونوں چیزیں بھی بڑی بڑی طاقتور جماعتوں کو پسپا اور ناکام کر دیا کرتی ہیں۔

اس آیت میں اشارہ قریش کے حالات کی طرف بھی ہے جو اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لیے بھاری تعداد اور سامان لے کر اپنی قوت و کثرت پر اتراتے ہوئے نکلے تھے، اور جب تجارتی قافلہ مسلمانوں سے بچ کر نکل گیا اس وقت بھی اس لئے واپس نہیں ہوئے کہ اپنی دلیری اور بہادری دکھانی تھی۔

مستند روایتوں میں ہے کہ جب ابو سفیان اپنا تجارتی قافلہ لے کر مسلمانوں سے بچ نکلا تو ابو جہل کے پاس قاصد بھیجا کہ اب تمہارے آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں رہی واپس آجاؤ، اور بھی بہت سے قریشی سرداروں کی یہی رائے تھی، مگر ابو جہل اپنے تکبر و غرور اور شہرت پرستی کے جذبہ میں قسم کھا بیٹھا کہ ہم اس وقت تک واپس نہ ہونگے جب تک چند روز بدر کے مقام پر اپنی جشن نہ منالیں۔

جس کے نتیجہ میں وہ اور اس کے بڑے بڑے ساتھی سب وہیں ڈھیر ہوئے اور ایک گڑھے میں ڈالے

گئے، اس آیت میں مسلمانوں کو ان کے طریقہ کار سے پرہیز کرنے کی ہدایت فرمائی گئی۔

"سورۃ انفال" میں شروع سے بدر کی جنگ میں پیش آنے والے واقعات اور حالات کا اور ان سے حاصل ہونے والی نصیحتوں اور عبرتوں کا اور متعلقہ احکام کا بیان چل رہا ہے۔

اسی میں مکہ کے کافروں کو شیطان کے فریب دے کر مسلمانوں کے مقابلے پر ابھارنے کا اور پھر عین جنگ کے میدان میں ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جانے کا واقعہ ہے۔

شیطان کا یہ فریب قریش کے دلوں میں وسوسہ ڈالنے کی صورت سے تھا یا انسانی شکل میں آکر روبرو گفتگو سے؟ اس میں دونوں احتمال ہیں مگر قرآن کریم کے لفظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے مکہ کے کافروں کو انسانی شکل میں سامنے آکر باتوں میں دھوکہ دیا۔

امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب مکہ کے کافروں کا لشکر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے مکہ سے نکلا تو ان کے دلوں پر ایک خطرہ اس کا سوار تھا کہ ہمارے قریب میں قبیلہ بنی کنانہ بھی ہمارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ ہم مسلمانوں کے مقابلے پر جائیں اور یہ دشمن قبیلہ موقع پا کر ہمارے گھروں، عورتوں اور بچوں پر چھاپہ مار دے، قافلہ کا امیر ابوسفیان کی گھبرائی ہوئی فریاد پر تیار ہو کر نکل تو کھڑے ہوئے مگر یہ خطرہ ان کے لیے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی کہ اچانک شیطان سراقہ بن مالک کی صورت میں اس طرح سامنے آیا کہ اس کے ہاتھ میں جھنڈا اور اس کے ساتھ بڑھ کر قریشی جوانوں کے لشکر سے خطاب کیا اور دو طرح سے فریب میں مبتلا کیا۔ اول یہ کہ: "لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ" یعنی: آج تمام لوگوں میں تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں، مطلب یہ تھا کہ مجھے تمہارے مقابل فریق کی قوت کا اندازہ ہے اور تمہاری قوت و کثرت کو بھی دیکھ رہا ہوں اس لیے تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم بے فکر ہو کر آگے بڑھو تم ہی غالب رہو گے کوئی تمہارے مقابلے پر آنے والا نہیں۔

دوسرے یہ کہ "اِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ" یعنی: تمہیں جس بنی کنانہ وغیرہ سے خطرہ لگا ہوا ہے کہ وہ تمہارے پیچھے مکہ پر چڑھ دوڑیں گے، اس کی میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ ایسا نہ ہوگا میں تمہارا حمایتی ہوں، مکہ کے کافر سراقہ بن

مالک اور اس کی بڑی شخصیت اور اثر ورسوخ سے پہلے سے واقف تھے، اس کی بات سن کر ان کے دل جم گئے اور قبیلہ بنوبکر کے خطرہ سے بے فکر ہوکر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔

شیطان کی شیطانی

فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ

پھر جب آمنے سامنے ہوئے دونوں گروہ الٹا پھرا پر ایڑیوں اپنی اور بولا بے شک میں الگ ہوں

مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَ اللّٰهُ

تم سے تحقیق میں دیکھ رہا ہوں جو نہیں تم دیکھتے بیشک میں ڈرتا ہوں اللہ سے اور اللہ

شَدِیْدُ الْعِقَابِ۠ ﴿۴۸﴾ ع ۶/۲

سخت ہے عذاب دینے والا (۴۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پس جب دونوں فوجیں سامنے ہوئیں تو وہ الٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور بولا میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے میں اللہ سے ڈرتا ہوں، اور اللہ کا عذاب سخت ہے۔(۴۸)

تفسیر

نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ: (الٹا پھرا ایڑیوں پر) یہ ایک عربی کا محاورہ ہے جس کا مطلب اپنی زبان میں یہ ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر پیٹھ موڑی، لفظوں کی تشریح یہ ہے کہ "نَكَصَ" ماضی ہے نکوص اور نکص جس کا مصدر ہے، اس کے معنی ہے الٹا پیچھے ہٹ جانا، عقب ایڑی کو کہتے ہیں۔"عَلٰى عَقِبَيْهِ" اپنی دونوں ایڑیوں پر مطلب یہ کہ پیچھے مڑ کر بھاگا جس سے اس کی ایڑیاں وہاں آگئیں جہاں پہلے پنجے تھے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ قریش جب مسلمانوں کو رعب میں ڈالنے کے لیے مکہ سے نکلے تو انہیں اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ تھا، وہ کسی سے نہ ڈرتے تھے، ہاں قبیلہ بنی کنانہ سے ان کی دشمنی تھی، انہیں یہ خوف تھا کہ

کہیں وہ کوئی گڑبڑ نہ کر دیں اور خاصا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیں، شیطان سراقہ بن مالک کی شکل میں جو بنی کنانہ کا سردار تھا، ابوجہل کے اور قریش کے دوسرے سرداروں کے پاس آیا اور کہا کہ بنی کنانہ کی فکر مت کرو میں تمہارے ساتھ ہوں یہ سن کر مکہ کے کافر پھول گئے، جب یہ کافر مسلمانوں کے سامنے آئے اور گھمسان کی لڑائی ہوئی تو شیطان نے فرشتوں کو دیکھا کہ مسلمانوں کی مدد کر رہے ہیں، یہ دیکھتے ہی وہ الٹے پاؤں بھاگا اسی کا اس آیت میں ذکر ہے۔

ارشاد ہے کہ: جب دونوں فوجیں بھڑ گئیں تو شیطان کافروں کو چھوڑ کر یہ کہتا ہوا الٹے پاؤں بھاگا کہ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں، تم جانو تمہارا کام جانے، میں تمہارے ساتھ ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتا، میں اپنی آنکھوں سے وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تمہیں دکھائی نہیں دیتا، میرا ڈر کے مارے دم نکلا جارہا ہے اللہ کے غضب کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا، میری تو کیا مجال ہے، اس کا عذاب بہت ہی سخت ہے، آج میں دیکھتا ہوں کہ وہ تمہارے اوپر غضب ناک ہوا اور اس کے فرشتے اس کے حکم سے تمہیں قتل کر رہے ہیں، یہاں ٹھہرنا میرے بس کا بالکل نہیں۔

اس دوگنے فریب سے شیطان نے ان لوگوں کو اپنے قتل گاہ کی طرف ہانک دیا "فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ" جب مکہ کے کافر اور مسلمانوں کی دونون جماعتیں بدر کے مقام میں آمنے سامنے ہوئیں تو شیطان پچھلے پاؤں لوٹ گیا۔

بدر کی جنگ میں چونکہ مکہ کے کافروں کی پیٹھ پر شیطانی لشکر آ گیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلے میں فرشتوں کا لشکر جبرئیل و میکائیل علیہما السلام کی قیادت میں بھیج دیا، امام ابن جریر وغیرہ نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ شیطان نے جو اس وقت انسانی شکل میں سراقہ بن مالک کی صورت میں اپنے شیطانی لشکر کی قیادت کر رہا تھا، جب جبرئیل امین علیہ السلام اور ان کے ساتھ فرشتوں کا لشکر دیکھا تو گھبرا اٹھا اس وقت اس کا ہاتھ ایک قریشی جوان حارث بن ہشام کے ہاتھ میں تھا فوراً اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا، حارث نے ٹوکا کہ یہ کیا کرتے ہو؟ تو اس کے سینہ پر مار کر حارث کو گرا دیا اور اپنے شیطانی لشکر کو لے بھاگ پڑا، حارث نے اس کو سراقہ سمجھتے

ہوئے کہا کہ اے عرب کے سردار سراقہ تو نے تو یہ کہا تھا کہ میں تمہارا حمایتی اور مددگار ہوں اور عین جنگ کے میدان میں یہ حرکت کر رہے ہو، تو شیطان نے سراقہ کی شکل میں جواب دیا "اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ "یعنی: میں تمہارے معاہدہ سے لاتعلق ہوتا ہوں، کیونکہ میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جو تمہاری آنکھیں نہیں دیکھتیں، مراد فرشتوں کا لشکر تھا، اور یہ کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اس لیے تمہارا ساتھ چھوڑتا ہوں۔

شیطان نے فرشتوں کا لشکر دیکھا، وہ فرشتوں کی قوت سے واقف تھا، چنانچہ شیطان سمجھ گیا کہ اب اپنی خیر نہیں اور یہ جو کہا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں، تفسیر کے امام حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ اس نے جھوٹ بولا اگر وہ اللہ سے ڈرا کرتا تو نافرمانی کیوں کرتا، مگر اکثر حضرات نے فرمایا کہ: ڈرنا بھی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور سخت عذاب کو پوری طرح جانتا تھا؛ اس لیے نہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، البتہ صرف خوف بغیر ایمان وطاعت کے کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔

ابوجہل نے جب سراقہ اور اس کے لشکر کی پسپائی سے اپنے لشکر کی ہمت ٹوٹتے دیکھی تو بات بنائی اور کہا کہ سراقہ کے بھاگ جانے سے تم متاثر نہ ہو اس نے تو خفیہ طور پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ سازش کر رکھی تھی، شیطان کی پسپائی کے بعد ان کا جو حشر ہونا تھا ہو گیا، پھر جب یہ لوگ مکہ واپس آئے اور ان میں سے کسی کی ملاقات سراقہ بن مالک سے ہوئی تو اس نے سراقہ کو ملامت کی کہ بدر کی جنگ میں ہماری شکست اور سارے نقصان کی ذمہ داری تجھ پر ہے تو نے عین جنگ کے میدان سے پیچھے ہٹ کر ہمارے جوانوں کی ہمت توڑ دی، اس نے کہا کہ میں نہ تمہارے ساتھ گیا نہ تمہارے کسی کام میں شریک ہوا، میں نے تو تمہاری شکست کی خبر بھی تمہارے مکہ پہنچنے کے بعد سنی ہے۔

یہ سب روایتیں ہیں امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ: شیطان ملعون کی یہ عام عادت فرمائی ہے۔ "کَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اکْفُرْ فَلَمَّا کَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ "۔

شیطانی فریب اور اس سے بچنے کا طریقہ

اس آیت کے واقعہ سے چند فائدے کی بات معلوم ہوئیں:

(۱)....شیطان انسان کا دشمن ہے اس کو نقصان پہنچانے کے لیے طرح طرح کے حیلے کرتا ہے اور روپ بدلتا ہے، بعض اوقات محض دل میں وسوسہ ڈال کر پریشان کرتا ہے اور بعض اوقات سامنے آکر دھوکہ دیتا ہے۔

(۲)....شیطان کا اللہ تعالیٰ نے اس بات کی قدرت دی ہے کہ وہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوسکتا ہے ایک مشہور حنفی فقیہ کی کتاب "آکام المرجان فی احکام الجان" میں اس کو وضاحت کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے، اسی لیے محققین صوفیائے کرام جو کشف وکرامات والے ہیں انہوں نے لوگوں کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ کسی شخص کو دیکھ کر یا اس کا کلام سن کر بغیر تحقیق حال کے اس کے پیچھے چلنا بڑا خطرناک ہوتا ہے۔

(۳)....جو لوگ کفر وشرک اور دوسرے ناجائز کاموں میں مبتلا ہوتے ہیں اس کا زیادہ تر سبب یہی ہوتا ہے کہ شیطان ان کے برے عملوں کو خوبصورت اور نفع بخش ظاہر کر کے ان کے دل ودماغ کو حق وسچائی اور صحیح نتیجوں سے پھیر دیتا ہے وہ اپنے باطل ہی کو حق اور برے کو بھلا سمجھنے لگتے ہیں اور اہل حق کی طرح اپنے باطل پر جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اسی طرح قریشی لشکر اور اس کے سردار جب بیت اللہ سے رخصت ہو رہے تھے تو بیت اللہ کے سامنے ان الفاظ سے دعا کر کے چلے تھے "اللهم انصر اهدى الطائفتين" یعنی: اے اللہ! ہم دونوں جماعتوں میں سے جو زیادہ ہدایت پر ہے اس کی مدد فرمایئے اور فتح دیجئے، یہ بے خبر لوگ شیطانی فریب میں آکر اپنے آپ ہی کو زیادہ ہدایت پر اور حق پر سمجھتے تھے، اور پورے اخلاص کے ساتھ اپنے باطل کی حمایت ونصرت میں جان ومال قربان کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ صرف اخلاص کافی نہیں جب تک کہ عمل کا رُخ درست نہ ہو۔

دین دھوکا نہیں ہے

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ

جب کہنے لگے منافق اور وہ لوگ میں دلوں جن کے بیماری ہے دھوکا دے رکھا ہے ان کو

دِيْنُهُمْ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۴۹

دین ان کے نے اور جو بھروسا کرے پر اللہ پس تحقیق اللہ زبردست ہے حکمت والا (۴۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جب منافق اور جن کے دلوں میں بیماری ہے کہنے لگے یہ لوگ اپنے دین پر مغرور ہیں اور جو کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو اللہ تعالیٰ قوت والا حکمت والا ہے۔ (۴۹)

لفظی تحقیق: اَلْمُنٰفِقُوْنَ: منافق کی جمع ہے "سورۂ بقرہ" کے دوسرے رکوع میں ان کا ذکر آچکا ہے ایسے لوگ جماعت کے سخت دشمن ہوتے ہیں اور اجتماعی قوت کے لیے گھن کا کام دیتے ہیں، جیسے گھن اندر سے لکڑی کا کھا کھا کر آٹے کی طرح بنا دیتا ہے اور کمزور کر دیتا ہے تو ایسے یہ بھی اندر سے جماعت کو کمزور کر دیتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو ظاہر میں بڑے میٹھے ہوتے ہیں لیکن دل میں جماعت کی بربادی پر تلے رہتے ہیں۔ غَرَّ: (بھلاوا دے رکھا ہے) ماضی کا صیغہ ہے غرور سے، غرور کے معنی ہیں کسی کے بل اترانا، کسی کے بڑھاوے چڑھاوے دینے سے پھول جانا، کسی بے حقیقت شئی کی باتوں میں آجانا، دنیا کا مال، جاہ و جلال، قوت و طاقت وغیرہ سب آنی جانی چیزیں ہین لیکن آدمی ان کی ظاہری ٹیپ ٹاپ دیکھ کر ان پر بھروسہ کر لیتا ہے اور آخر مین خالی خولی رہ جاتا ہے۔

تفسیر

بعض لوگ دین کو بھی ایسی ہی چیز سمجھتے ہیں کہ اس میں رکھا کچھ نہیں یوں ہی بڑھاوے چڑھاوے دے دے کر بعض لوگوں پر اس کا داؤ چل گیا اور وہ لوگ جانے اسے کیا سمجھ بیٹھے ہیں۔

مسلمانوں میں بہت سے منافق ملے ہوئے تھے، ان پر کافروں کی ظاہری شان وشوکت کا بڑا رعب تھا، وہ مسلمانوں کے بارے میں کہا کرتے تھے کی یہ لوگ دین کے دھوکے میں ہر ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں کہ جن کا سر نہ پیر، کہاں یہ مٹھی بھر بھوکے ننگے لوگ اور کہاں مکہ کے طاقتور اور مالدار جتھے، ان کی شامت نے دھوکہ دیا ہے جو ان سے جا کر بھڑ رہے ہیں، اس آیت میں اس کا جواب دیا ہے اور دین کی اصلیت سمجھائی ہے۔

ارشاد ہے کہ: منافق اور کمزور یقین کرنے والے لوگوں کو تم نے دیکھا یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو دین نے دھوکہ دے رکھا ہے ان کو سمجھ لینا چاہئیے کہ دین اسلام کسی کو دھوکہ نہیں دیتا یہ تو اللہ پر بھروسہ کرنا سکھاتا ہے تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کیا ہے وہ سب سے زیادہ زبردست ہے اس کے مقابلے میں سب ہیچ ہیں، جو اس پر بھروسہ کرنا سیکھ جائے، اس کو کس چیز کی کمی ہے، اس کے ساتھ اللہ حکیم بھی ہے وہ ہر بات کی حقیقت سے واقف ہے وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی حکمت کے مطابق کرتا ہے اس کے فرمانبردار بندے اس پر بھروسہ کر کے بےفکر ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے سب کام بنا دیا تا ہے یہ ہے دین کی حقیقت، بتاؤ! اس میں دھوکے کا کیا کام ہے؟

اس کے بعد کی دوسری آیت میں مدینہ کے منافقوں اور مکہ کے مشرکوں کی ایک بات مسلمانوں کے بارے میں نقل کی گئی جو گویا ان پر ترس کھا کر کہا گیا ہے کہ: "غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيۡنُهُمۡ "یعنی: بدر کے میدان میں یہ مٹھی بھر مسلمان اتنے بھاری اور طاقتور لشکر سے ٹکرانے آ گئے ان بے چاروں کو ان کے دین نے فریب میں ڈال کر موت کے منہ میں دیدیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا: "وَمَنۡ يَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ "یعنی: جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کر لیتا ہے تو یاد رکھو کہ! وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہیں اس کی حکمت کے سامنے سب کی عقل ودانش رکھی رہ جاتی ہے مطلب یہ ہے کہ تم لوگ صرف ظاہری اسباب کو دیکھتے ہو اور اسی پر بھروسہ کرنے والے ہو تمہیں اس پوشیدہ طاقت کی خبر نہیں جو ان ظاہری اسباب کے پیدا کرنے والے کے خزانے میں ہے اور یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اعتماد رکھتے ہیں۔

اگر ان میں اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اعتماد پورا ہو تو انہیں اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد کے میدان میں اترے ہیں اور ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ: "وَ مَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ " اور جو کوئی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ مکمل قدرت کے مالک ہیں اور حکمت والے ہیں وہ چاہیں تو اپنی مکمل قدرت سے مٹھی بھر جماعت کو بہت بڑی تعداد پر غالب کر دیں، جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے مایوس نہیں کرتے بلکہ اس کی مدد فرماتے ہیں۔

کافروں کی بری گت

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ

اور اگر تو دیکھیں جب جان کھینچتے ہیں ان کی جنہوں نے کفر کیا فرشتے ضربیں لگاتے ہوئے

وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۚ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ۝۵۰ ذٰلِكَ

پر چہروں ان کے اور پر پیٹھوں ان کی اور چکھو عذاب آگ کا (۵۰) یہ بدلہ ہیں

بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ۝۵۱ۙ

اسکا جو بھیجا ہاتھوں تمہارے نے اور اس لئے کہ اللہ نہیں ہے ظلم کرنے والا پر بندوں اپنے (۵۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر تو دیکھے جس وقت کافروں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں مارتے ہیں ان کے منہ پر اور ان کی پشت پر اور کہتے ہیں دوزخ کا عذاب چکھو۔ (۵۰) یہ بدلہ اس کا ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بھیجا اس واسطے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ (۵۱)

لفظی تحقیق: **یَتَوَفّٰی:** مضارع کا صیغہ ہے جس کا مصدر توفی ہے اور مادہ و، ف، ی ہے اس مادہ سے لفظ وفا و فاۃ وغیرہ بنے ہیں، یہاں جان نکالنا، روح قبض کرنا مراد ہے۔

تفسیر

پچھلی آیتوں میں کافروں کے طرز عمل کا ذکر بہت دور سے چلا آرہا ہے یہ لوگ دنیا کی ظاہری شان و شوکت میں اس قدر فنا ہوتے ہیں کہ وہ اس سے آگے جاتے ہی نہیں، لیکن جس نے یہ سارا جہان بنایا ہے اس کو آدمیوں کی یہ سرکشی، غرور اور تکبر پسند نہیں؛ اس لیے کبھی کبھی ان کو سبق سکھایا جاتا ہے یہ اپنی تدبیریں ہی کرتے رہتے ہیں اور وہاں ان کو آندھی، پانی کے طوفانوں وغیرہ کے ذریعے مٹا دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لشکر کی کوئی انتہاء نہیں، بدر میں ایک مٹھی بھر مسلمانوں سے بہت بڑے بڑے کافر سرداروں کو قتل کرا دیا، ارشاد ہے کہ: عمر بھر تو اکڑتے پھرے لیکن جب موت نے آدبایا تو کچھ بنائے نہ بنی ان کی بے بسی کی وہ حالت دیکھنے کے قابل ہے کہ فرشتے ان کی جان کھینچ رہے ہیں اور ان کے چہروں اور پچھلے حصے پر زبردست چوٹیں لگا رہے ہیں اور ساتھ ہی کہتے جاتے ہیں کہ یہ تو کچھ بھی نہیں آگے جب آگ میں جلنا پڑے گا تب حقیقت کھلے گی یہ کیفیت ان کی ان کے برے عملوں کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: ہمارے ہاں تو ظلم کا کوئی کام نہیں، البتہ قصور کرنے والے کو اس کی سزا ملتی ہے کیونکہ اس کے برے عملوں کا یہی تقاضا ہے اس کے ساتھ "سورۂ مائدہ" کی آیت کو بھی دیکھنا چاہئے جہاں ارشاد ہے کہ اگر تم ایمان لاؤ اور شکر گزار بندے بن جاؤ تو اللہ تمہیں عذاب کر کے کیا کرے گا۔

چہروں اور پیٹھوں پر مارنا بڑی ذلت ناک سزا ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں بعض دوسری جگہوں پر بھی آیا ہے، اس وقت اللہ کے فرشتے کہتے ہیں کہ اے شخص! تیرے پاس اللہ کے پیغمبر آئے، اس کی کتابیں آئیں، اللہ نے ہدایت کے سارے سامان مہیا کر کے تجھے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس وقت کہاں تھے؟ اب تمہارے ساتھ یہی سلوک کیا جائیگا۔

فرمایا: یہ وہی کچھ ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا، یعنی: یہ سزا تمہارے اپنے یہ برے عملوں کا نتیجہ ہے جس کا تم انکار کرتے تھے اور بدر کے میدان میں مشرکوں اور کافروں کا یہی حال ہوا، فرمایا: دیکھو! اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا، اس کی رحمت تو بڑی وسیع ہے مگر یہ خود انسان ہیں جو اپنے کرتوتوں کی وجہ سے

اس کی رحمت سے حصہ نہیں پاتے۔

حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "انما أعمالكم احصيها عليكم" یہ تمہارے عمل ہیں جنہیں ہم نے شمار کر کے رکھا ہے لوگ غلط کام کر کے بھول جاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ تو نہیں بھولتا خدا کے فرشتے انسانوں کے تمام عملوں کو اپنے رجسٹروں میں درج کر رہے ہیں، تمام حرکات وسکنات ہر شخص کے نامہ اعمال میں بھی درج ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی محفوظ ہیں اور پھر قیامت کے دن یہ منظر بھی دیکھنے میں آئے گا، "سورہ بنی اسرائیل" میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: "وَكُلَّ اِنسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ" ہر انسان کا اعمال نامہ موت کے وقت گلے میں لٹکا دیا جائیگا۔ (اور پھر قیامت کو اس کے سامنے رکھ دیا جائیگا) "سورہ کہف" میں ہے کہ: "وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا" اور وہ اپنا ہر عمل اس میں پالیں گے وہ ایسا دفتر ہوگا کہ انسان کہے گا: "مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا" یہ کیسی کتاب ہے کہ چھوٹی بڑی کوئی بھی چیز احاطہ کئے بغیر نہیں چھوڑتی، انسان حیرت زدہ ہوجائینگے کہ ان کے ہر عمل کا ریکارڈ موجود ہے، بہر حال یہ تو آگے منزل ہے، موت کے وقت ہی انسان کو اپنے کئے کا علم ہوجائیگا اور جب فرشتے اس کے چہرے اور پشتوں پر ماریں گے تو ساتھ کہا جائیگا کہ یہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا۔

کافروں کی پٹائی

اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اگر آپ ان کافروں کا حال اس وقت دیکھتے جبکہ اللہ فرشتے ان کی روح قبض کرنے کے وقت ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مار رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ آگ میں جلنے کا عذاب چکھو تو آپ ایک بڑا ہیبت ناک منظر دیکھتے۔

تفسیر کے اماموں میں سے بعض حضرات نے اس کو ان قریش کے کافروں کے متعلق قرار دیا ہے جو بدر کے میدان میں مسلمانوں کے مقابلے پر آئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کے لیے فرشتوں لشکر بھیج دیا

تھا اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ بدر کے میدان میں جو قریشی سردار مارے گئے ان کے مارنے میں فرشتوں کا ہاتھ تھا جو ان کے سامنے سے چہروں اور پیچھے سے ان کی پیٹھوں پر مار کر ان کو ہلاک کر رہے تھے اور ساتھ ہی آخرت میں دوزخ کے عذاب کی خبر سنا رہے تھے۔

اور جن حضرات نے آیت کے لفظوں کے عام ہونے کی وجہ سے مضمون کو عام رکھا ان کے مطابق معنی آیت کے یہ ہیں کہ جب کوئی کافر مرتا ہے موت کا فرشتہ ان کی روح قبض کرنے کے وقت ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتا ہے بعض روایتوں میں ہے کہ آگ کے کوڑے اور لوہے کے ہتھوڑے ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جن سے وہ مرنے والے کافر کو مارتے ہیں، چونکہ اس عذاب کا تعلق اس دنیا سے نہیں بلکہ ایک دوسرے جہاں سے ہے جس کو برزخ کہا جاتا ہے؛ اس لیے یہ عذاب عام طور پر آنکھوں سے نہیں دیکھا جاتا۔

اس لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خطاب کیا گیا کہ اگر آپ دیکھتے تو بڑا اعبرتناک منظر دیکھتے اس سے معلوم ہوا کہ موت کے بعد عالم برزخ میں کافروں کو عذاب ہوتا ہے مگر اس کا تعلق غیبی جہان سے ہے؛ اس لیے عام طور پر دیکھا نہیں جاتا، قبر کے عذاب کا ذکر قرآن کریم کی دوسری آیتوں میں بھی آیا ہے اور حدیثیں تو اس معاملے میں بے شمار ہیں۔

دوسری آیت میں کافروں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ: یہ دنیا اور آخرت کا عذاب تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے چونکہ عام کاروبار ہاتھوں ہی سے وجود میں آتے ہیں اس لئے ہاتھوں کا ذکر کر دیا گیا، مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب تمہارے اپنے عملوں کا نتیجہ ہے۔

شریر پہلے بھی تھے

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ

جیسے دستور تھا والوں کی فرعون اور ان کا سے جو ان کے پہلے تھے انکار کیا انہوں نے آیتوں کا

اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ

اللہ کی پس پکڑ لیا ان کو اللہ نے پر گناہوں ان کے بیشک اللہ قوت والا سخت

الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى

عذاب والا ہے (۵۲) یہ اس لئے کہ اللہ نہیں ہے بدلنے والا کوئی نعمت جو اس نے دی پر

قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾

قوم کسی کو یہاں تک کہ بدلیں وہ جو حالت دلوں اپنے کی اور یہ کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے (۵۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ (ان مکے والوں کی حالت بھی ایسی ہے) جیسے فرعون والوں کا اور ان سے پہلے والوں (عاد وثمود) کی تھی، وہ اللہ کی باتوں سے منکر ہوئے، سو! اللہ نے ان کو ان کے گناہوں پر پکڑا، بیشک اللہ زور آور سخت عذاب کرنے والا ہے۔ (۵۲) اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ اس نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو دی ہرگز بدلنے والا نہیں جب تک قوم کے لوگ اپنے من کی بات یہ بدل ڈالیں (یعنی: دل سے توحید کے بجائے شرک کا اعتقاد نہ کرنے لگے) اور یہ کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (۵۳)

لفظی تحقیق: اٰلِ فِرْعَوْنَ: آل کے معنی گھر والوں، رشتہ داروں، ساتھیوں اور کنبے قبیلے کے ہیں، یہ ان سب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، کسی کے ماننے والے بھی آل کہلاتے ہیں یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم اور اس کے تابعدار بھی اس خصلت کے تھے اور اس کی قوم اور اس کے تابعدار بھی اس خصلت کے تھے اور فرعون ہی پر کیا موقوف ہے اس سے پہلے جتنے بھی کافر سرکش ہوئے ان سب کا یہی رویہ رہا ہے۔

ارشاد ہے کہ: یہ لوگ اسی طریقہ پر چل رہے ہیں جو فرعون کے آدمیوں نے اور ان سے پہلے تمام سرکشوں

اور کافروں نے اختیار کیا تھا، انہوں نے ان باتوں کو جو اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے انہیں بتائیں نہ مانا اور کھلم کھلا اس کے خلاف کرتے رہے، پیغمبروں نے کہا کہ اپنے مال و دولت، قوت، لاؤ لشکر پر مغرور نہ ہوں، انہوں نے کہا کہ واہ ان ہی چیزوں سے تو ہمارے سارے کام بنتے ہیں، انہیں ہم چھوڑ دیں تو کیا کریں، آخر جب ان کی سرکشی بہت بڑھ گئی تو ایک دن اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ان پر عذاب بھیج دیا خوب سمجھ لو کہ! اللہ نے جو نعمتیں اپنے بندوں کو دی ہیں وہ ان سے نہیں چھینتا جب تک بندے خود اس کی نافرمانی نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے راستے سے نہ ہٹ جائیں وہ سب کی باتیں سنتا اور سب کے حالات جانتا ہے ان کے دلوں کے برے خیالات اور ان کے تمام عمل ان کے سروں پر آفتیں لانے کا سبب بنتے ہیں، اس معلوم ہوا کہ سب کچھ نیت اور اعتقاد پر موقوف ہے۔

مکہ کے کافر بھی فرعونیوں کی طرح ہیں

آل فرعون اور ان سے پہلے عاد و ثمود کی قوم ہٹ دھرم، پیغمبروں کے مخالف، کمزوروں پر ظلم ڈھانے والے تھے اور یہ مکہ کے کافر بھی ایسے ہی ہیں، فرعون کی قوم اور ان سے پہلے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کیا تھا، اللہ تعالیٰ کے حکموں اور دلیلوں کو نہیں مانا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے گناہوں کے بدلے میں پکڑ لیا، اللہ تعالیٰ کی پکڑ آئی جس طرح پہلے کافر لوگوں پر اللہ کی پکڑ آئی تھی، اسی طرح مکہ کے کافر بھی عذاب میں مبتلا ہو کر رہیں گے؛ اس لیے بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کو کوئی نعمت دے کر واپس نہیں لیتا یہاں تک کہ وہ خود اپنی دینی حالت تبدیل نہ کریں، مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے کسی نعمت کی واپسی خود انسانوں کے برے عملوں کا نتیجہ ہوتا ہے، جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت پا کر بھی ناشکری کرتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ایسی نعمت کو اٹھا لینے پر بھی قادر ہیں اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہر بات کو سنتے ہیں اور ہر چیز کا علم رکھتے ہیں یہاں تک کہ وہ لوگوں کے دلوں کی بات، نیت اور ارادے کو بھی جانتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق جزا دیتے ہیں۔

"سورۂ ابراہیم" میں: "اَلَمْ تَرَاِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ" کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے انعام کو ناشکری میں بدل دیا اور اپنی قوم کو تباہی کے مقام، یعنی: دوزخ پر لا کھڑا کیا، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ والوں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جیسی بڑی نعمت عطا کی، مگر انہوں نے قدر نہ کی بلکہ ناشکری کی اور دوزخی ہو گئے، یہاں پر بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ مکے والوں نے اس نعمت کی ناقدری کی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت پر مجبور کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلدی ہی اللہ تعالیٰ کی پکڑ آئی اور انہیں تباہ کر کے رکھ دیا، جب مکے والوں کی نیت بدل گئی بدر کی لڑائی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی پکڑ بھی آ گئی۔

اس کے بعد والی آیت میں یہ بتلایا گیا کہ ان مجرموں پر اللہ تعالیٰ کا یہ عذاب کوئی انوکھی چیز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے ان کو عقل و فہم دیتے ہیں، ان کے آس پاس بہت سی ایسی چیزیں موجود ہوتی ہیں جن میں غور و فکر کرنے سے وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت و عظمت کو پہچانیں اور عاجز مخلوق کو اس کا شریک نہ بنائیں، پھر مزید تنبیہ کے لیے اپنی کتابیں اور پیغمبر بھیجتے ہیں، اللہ کے پیغمبر ان کو سمجھانے بجھانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے وہ ان کو اللہ تعالیٰ کی زبردست قوت کے نمونے بھی معجزوں کی شکل میں دکھلاتے ہیں جب کوئی فرد یا قوم ان سب چیزوں سے بالکل آنکھیں بند کر لے اور خدائی تنبیہات سے کسی پر کان نہ دھرے تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں طریقہ یہی ہے کہ دنیا میں بھی ان پر عذاب آتا ہے اور آخرت کے ہمیشہ والے عذاب میں بھی گرفتار ہوتے ہیں۔

مکے والوں نے اللہ کی نعمتوں کو کیسے بدلا؟

اللہ تعالیٰ کی نعمت و رحمت تو اس کے رب العٰلمین اور رحمٰن و رحیم ہونے کے نتیجے میں خود بخود ہے، ہاں! اس نعمت و رحمت کے قائم اور باقی رہنے کا ایک ضابطہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ کوئی نعمت دیتے ہیں اس سے اس وقت تک واپس نہیں لیتے جب تک وہ اپنے حالات اور اعمال کو بدل کر خود ہی اللہ کے

عذاب کو دعوت نہ دے۔

حالات کے بدلنے سے مراد یہ ہے کہ اچھے عملوں اور برے حالات اختیار کر لے یا یہ کہ اللہ کی نعمتیں ملتے وقت جن برے عملوں اور گناہوں میں مبتلا تھا نعمتوں کے ملنے کے بعد ان سے زیادہ برے عملوں میں مبتلا ہو جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جن قوموں کا ذکر پچھلی آیتوں میں آیا ہے، یعنی: قریش کے کافروں اور آل فرعون ان کا تعلق اس آیت سے اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ملنے کے وقت بھی اچھے حالات میں نہیں تھے، سب کے سب مشرک اور کافر ہی تھے، لیکن انعامات کے بعد یہ لوگ اپنی بدعملیوں اور شرارتوں میں پہلے سے زیادہ تیز ہو گئے۔

آل فرعون نے بنی اسرائیل پر طرح طرح کے ظلم وستم کرنے شروع کر دیئے پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ اور مخالفت پر تیار ہو گئے جو ان کے پچھلے جرموں میں ایک شدید اضافہ تھا جس کے ذریعہ انہوں نے اپنے حالات مزید برائی کی طرف ڈالے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی نعمت کو عذاب سے بدل دیا اسی طرح مکہ کے کافر اگرچہ مشرک اور بدعمل تھے لیکن اسکے ساتھ کچھ اچھے اعمال صلہ رحمی، مہمان نوازی، حاجیوں کی خدمت، بیت اللہ کی تعظیم وغیرہ بھی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان پر دین و دنیا کی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے، دنیا میں ان کی تجارتوں کو ترقی بخشی اور ایسے ملک میں جہاں کسی تجارتی قافلہ سلامتی سے نہیں گزر سکتا تھا، ان لوگوں کے تجارتی قافلے ملک شام و یمن میں جاتے اور کامیاب آتے تھے جس کا ذکر قرآن کریم نے سورۂ "لِاِيْلٰفِ" میں "رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ" کے عنوان سے کیا ہے۔

اور دین کے اعتبار سے وہ عظیم نعمت ان کو عطاء ہوئی جو پچھلی کسی قوم کو نہیں ملی تھی کہ پیغمبروں کے سردار اور آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے بھیجے گئے، اور اللہ تعالیٰ کی آخری اور مکمل کتاب ان میں بھیجی گئی۔

مگر ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ان انعاموں کی شکر گزاری اور قدر کرنے اور اس کے ذریعہ اپنے حالات کو درست کرنے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ گندے کر دیئے کہ صلہ رحمی کو چھوڑ کر مسلمانوں ہو جانے والے

بھائیوں اور بھتیجوں پر وحشیانہ ظلم وستم کرنے لگے، مہمان نوازی کے بجائے ان مسلمانوں پر دانہ پانی بند کرنے کے عہد نامے لکھے گئے، حج وعمرہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے گھر آنے والے لوگوں کی خدمت کے بجائے ان کو حرم میں داخل ہونے سے روکنے لگے، یہ وہ حالات تھے جن کو قریش کے کافروں نے بدلا، اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو عذاب کی صورت میں تبدیل کر دیا وہ دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوئے اور جو ذات رحمۃ اللعالمین بن کر آئی تھی اسی کے ذریعہ انہوں نے اپنی موت اور ہلاکت کو دعوت دیدی۔

پچھلوں کی تباہی

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ

جیسے دستور تھا والوں کا فرعون اور ان کا جو سے تھے پہلے ان جھٹلائیں انہوں نے آیتیں

رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ كُلٌّ

رب اپنے کی پس تباہ کیا ہم نے ان کو وجہ سے گناہوں ان کے اور غرق کر دیا ہم نے والوں کو فرعون اور سارے

كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

تھے ظلم کرنے والے (۵۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جیسے فرعون والوں کا اور ان سے پہلے والوں کا دستور تھا، انہوں نے اپنے رب کی باتیں جھٹلائیں، پھر ان کے گناہوں پر ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور فرعون والوں کو ہم نے ڈبو دیا اور وہ سارے ظالم تھے۔ (۵۴)

تفسیر

پچھلی آیتوں میں بیان ہوا ہے کہ پچھلے لوگوں نے اللہ کی نافرمانی کر کے کیا پھل پایا جو یہ پائیں گے، اللہ

اپنے بندوں کی خطاؤں سے درگذر کرتا رہتا ہے اور ان سے اپنی نعمتیں جو اس نے انہیں عطاء کی ہیں نہیں چھینتا، لیکن بندوں کی سرکشی حد سے گذر جائے اور کسی طرح باز آنے کا نام نہ لیں تو پھر اس کا عذاب بھی سخت ہے اس کے بعد ایک قاعدہ بیان کیا تھا جب لوگوں کے عقیدے خراب ہو جاتے ہیں تو اللہ ان سے اپنی نعمتیں چھین لیتا ہے وہ سب کچھ سنتا ہے اور جانتا ہے کوئی اس سے بچ کر نہیں جا سکتا، اس آیت میں اس قاعدے کو واضح کرنے کے لیے دوبارہ پچھلے لوگوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ارشاد ہے کہ: ان کی نیتیں خراب ہوگئی ہیں اور ان کے عقیدے ٹھیک نہیں رہے یہی کیفیت فرعون کی قوم کی اور ان سے پہلے کافروں کی تھی انہوں نے اللہ کے تمام حکموں کو ٹھکرا دیا تھا، چنانچہ تمام کافروں کو ان کے کیے کی سزا ملی، نوح علیہ السلام کی قوم پانی کے طوفان سے ہلاک ہوئی، عاد کو آندھی کے جھکڑے نے پکڑا، ثمود زلزلے اور کڑک سے اوندھے منہ آرہے، غرض! جس نے سرکشی کی آخر کار سزا پائی، فرعون کی قوم شیطانیت پر کمر باندھی اپنے کو بڑا اور دوسروں کو، یعنی: بنی اسرائیل کو ذلیل سمجھا تو ان کو سمندر میں ڈبو دیا، ان میں سے ہر ایک ظالم تھا، انہوں نے خوش حالی کو اپنا حق سمجھا اور دوسرں کو ستانے پر تل گئے، حالانکہ انسان کی بہتری اسی میں ہے کہ عاجزی کے ساتھ آسمان وزمین کے بنانے والے کے سامنے جھکے اور سمجھے کہ میرے پاس جو کچھ ہے سب اسی کا ہے مجھ میں نہ کچھ طاقت ہے نہ اختیار ہے میں اللہ کا بندہ اور خادم ہوں، میرا اس کے سوا کچھ کام نہیں کہ جو اس نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ مجھے حکم دیا ہے اس کو دل وجان سے بجالاؤں اگر میں یہ نہیں کرتا میں اپنی حد سے آگے نکل جانے والا ہوں اور اسی کا نام ظلم ہے۔

سرکش لوگ جو اپنے جیسا کسی کو نہیں سمجھتے اور ہمیشہ دوسروں کے دبانے کے دھن میں رہتے ہیں وہ سب فرعون ہیں مکہ کے کافروں میں یہی عیب تھا؛ اس لیے انہیں فرعون کی قوم کی حالت سنائی جارہی ہے تاکہ اس سے عبرت حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کریں۔

آگے دوبارہ پھر وہی آیت آئی ہے: "كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ" ان کی عادت فرعون کی قوم اور ان سے پہلے لوگوں کی عادت جیسی ہے "كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ" انہوں نے اپنے رب

کی آیتوں کو جھٹلایا جس کا نتیجہ یہ ہوا " فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ " ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا" وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ " اور ہم نے فرعون والوں کو پانی میں ڈبو دیا۔

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے" فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ " فرمایا تھا، یہاں" فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ " ارشاد فرمایا: ارشاد فرمایا: اس میں دوسری آیت سے پہلی آیت کی تشریح ہوگئی، کیونکہ پہلی آیت میں ان کا عذاب میں پکڑا جانا ذکر کیا گیا ہے جس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، زندہ اور باقی رہتے ہوئے مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں یا سرے سے ان کا وجود ہی ختم کر دیا جائے اس آیت میں" فَاَهْلَكْنٰهُمْ " فرما کر واضح کر دیا کہ ان سب قوموں کی سزا سزائے موت تھی ہم نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا، ہر قوم اس کی خدائی کو مانتی تھی اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کر دیا گیا" وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ " یعنی: ہم نے فرعون والوں کو سمندر میں ڈبو دیا، دوسری قوموں کی ہلاکت کی صورتیں یہاں بیان نہیں کی گئیں، دوسری آیتوں میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ کسی پر زلزلہ آیا کوئی زمین کے اندر دھنسا دی گئی، کسی کو بندر اور سور بنا دیا گیا، کسی پر ہوا کا طوفان بھیجا گیا اور آخر میں مکہ کے مشرکوں پر بدر کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے عذاب آیا۔

بدترین خلائق

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾

تحقیق بدترین چلتے پھرتے لوگ نزدیک اللہ کے وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا پس وہ نہیں ایمان لاتے (۵۵)

الَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ

وہ لوگ جس سے تو نے عہد کیا ان میں سے بعض پھر وہ توڑ ڈالتے ہیں عہد اپنا میں ہر دفعہ

وَّ هُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور وہ نہیں ڈر رکھتے (۵۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ سب جانداروں میں بدترین اللہ کے ہاں وہ ہیں جو منکر ہوئے پھر وہ ایمان نہیں لاتے۔(۵۵) جن سے تو نے معاہدہ کیا ان میں سے پھر وہ ہر بار اپنا عہد توڑتے ہیں اور وہ ڈر نہیں رکھتے۔(۵۶)

لفظی تحقیق: **يَنۡقُضُوۡنَ**: (توڑتے ہیں) مضارع کا صیغہ ہے یہ "نقض" سے بنا ہے "نقض" کے معنی توڑنا کسی کے خلاف چلنا یا کرنا نقیض مناقضہ، تناقض اس مادہ سے بنے ہیں، سب میں توڑنے یا خلاف ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں۔

تفسیر

قرآن حکیم ہمیں یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بالکل آزاد نہ سمجھے، اس کے دل میں یہ یقین ہونا چاہیئے کہ وہ ایک سب سے زیادہ قوی اور طاقتور آقا کا فرمانبردار ہے جس نے اسے اور ان سب چیزوں کو جو اس کے ارد گرد نظر آ رہی ہے پیدا کیا ہے، اور ہر چیز اس کے حکم کے مطابق چل رہی ہے مخلوقات میں انسان سب سے زیادہ سرکش نظر آتا ہے ان میں سے بعض تو اللہ اور اس کے قانون ہی کو جو اس نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے نہیں مانتے اور اپنی چلاتے ہیں، اس آیت میں ان لوگوں کو جو اس زمانے میں موجود ہیں اور جن کا اسلام سے اور پیغمبر ﷺ سے واسطہ پڑا ہے ان کے حال کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔

ارشاد ہے کہ: سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جو اللہ کا انکار کرتے ہیں، اور جن کے ایمان لانے کی کوئی امید نہیں ہے، ظاہر بات ہے کہ اللہ کے نہ ماننے والے اپنے عہد و پیمان پر قائم نہیں رہ سکتے بلکہ جب موقع ملتا ہے عہد توڑ ڈالتے ہیں، یہ لوگ تمام مخلوقات میں سے بدتر لوگ ہیں پہلے، فرعون کے لوگ تھے جن کا حال "سورۃ الاعراف" میں گزرا ہے کہ مصیبت میں پھنسے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نیک چلنے کا عہد کیا مصیبت ٹل گئی تو فوراً عہد توڑ ڈالا، پیغمبر ﷺ کے زمانے میں بنو قریظہ کے یہودی بھی ایسے ہی تھے، وہ اپنے بچاؤ کے لیے آپ سے عہد کر لیتے تھے کہ ہم مکہ کے مشرکوں کی مدد نہیں کرینگے لیکن لڑائی میں ان کے طرفدار ہو جاتے اور آپ سے بعد میں کہتے تھے ہمیں یاد نہیں رہا تھا، ہم پھر غیر جانبداری کا عہد کرتے ہیں، لیکن موقعہ آنے پر عہد توڑ ڈالتے، آگے

بتایا گیا ہے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔

جس زمانے میں پیغمبر ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی اس وقت مدینہ کے اردگرد یہودیوں کی بستیاں تھیں، یہ لوگ تجارت اور کھیتی باڑی کیا کرتے تھے، انکے بڑے بڑے باغ تھے، یہ عرب میں علم والے سمجھے جاتے تھے، سودی کاروبار بھی کرتے تھے، اور اس طرح انہیں اس علاقے میں علمی اور معاشی اعتبار سے برتری حاصل تھی، ان کے بڑے قبیلے بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ تھے، مدینے پہنچ کر پیغمبر ﷺ نے اردگرد کا جائزہ لیا تو اس سرزمین میں اسلام کے پودے کی پرورش کے لیے حالات کو کچھ مناسب پایا، تاہم آپ نے مدینہ اور اس کے اردگرد کے تمام قبیلوں سے ایک معاہدہ کیا، اس معاہدہ میں سارے یہودی اور دوسرے قبیلے بھی شامل تھے، معاہدہ یہ تھا کہ تمام قبیلے اور خاندان اپنے دین اور مذہب پر قائم رہینگے اور کسی کو دین تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائیگا، اگر کوئی باہر سے آ کر مدینہ پر حملہ آور ہوگا تو معاہدے میں شریک تمام لوگ مل کر مدینہ کا دفاع کریں گے، اس معاہدہ پر مدینے کے مشہور یہودی کعب بن اشرف، بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ نے بھی دستخط کیئے، تاہم یہودی عام طور پر عہد کی خلاف ورزی کرتے رہتے تھے، ایک دفعہ انہوں نے مکہ کے مشرکوں کو ہتھیار فراہم کیئے، جب پوچھا گیا تو یہ جھوٹا بہانہ پیش کیا کہ ان کو معاہدہ یاد نہیں تھا یہ لوگ مکہ والوں کے ساتھ بھی ساز باز رکھتے تھے، اور دوسرے قبیلوں کو آپس میں لڑانے کی سازش بھی کرتے رہتے تھے، مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور خفیہ تدبیریں انکا معمول بن چکا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کا حال بیان فرما کر ان کو سخت سزا دینے کا حکم دیا ہے۔ عہد کی خلاف ورزی اور غداری منافقوں کی علامت ہے، جماعتی اور حکومتی نظام کو درست رکھنے کے لیے معاہدہ کی پابندی ضروری ہے اسلام میں اس کا بڑا امرتبہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شرپسند یہودیوں کی مثال بدترین جانداروں کے ساتھ دی ہے، ارشاد ہوتا ہے" اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا " زمین پر چلنے والوں میں بدترین جاندار وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا "دَوَآبّ" "دَآبَّةٌ" کی جمع ہے جس کا معنی زمین پر چلنے پھرنے والے جاندار کے ہیں؛ اس لیے انسان جتنے جاندار زمین پر چلتے ہیں سب کو یہ لفظ شامل ہے مگر عام محاوروں میں یہ لفظ خاص چوپائے جانوروں

کے لیے بولا جاتا ہے چونکہ ان لوگوں کا حال جانوروں سے بھی زیادہ گرا ہوا تھا؛ اس لیے اس لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

انسان بھی انہی میں سے ایک جاندار ہے مگر ان سب جانداروں میں سے بدتری جاندار وہ انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا انکار کرتا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمر باندھی ہوئی ہے، توحید کو مٹا کر کفر کو غالب کرنا چاہتا ہے، ایسے لوگ اللہ کی بدترین مخلوق ہیں، "سورۃ البینہ" میں ایسے لوگوں کو "شَرُّ الْبَرِيَّةِ" یعنی: مخلوق میں سے بدترین کہا گیا ہے اور ایمان والوں کو "خَيْرُ الْبَرِيَّةِ" یعنی: مخلوق میں سے بہترین قرار دیا گیا ہے۔

ایک نکتہ

قرآن کریم میں کافروں کو عام جانوروں سے بھی بدتر فرمایا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کا ہر جاندار اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کرتا ہے، اپنے مالک کو پہچاننا اور اس کے حکم کو پورا کرتا ہے اپنے مالک اور پالنے والے کی خواہش کو پورا کرتا ہے، یہاںتک کہ بیل، گھوڑے، گدھے اور بھینس بھی اپنے مالک کی بات سنتے ہیں اور اس کی خدمت بجالاتے ہیں، مگر یہ کافر اور مشرک انسان ہیں جو اپنے مالک کے حکم کے بجائے اپنی خواہش کو آگے رکھتے ہیں، لہٰذا یہ لوگ پوری مخلوق میں سے بدترین ہیں، "سورۃ الاعراف" میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ: "كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ" کہ وہ جانوروں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں ان میں کافر، مشرک سب آجاتے ہیں تاہم اس مقام پر یہودیوں کی خاص طور پر مذمت بیان کی گئی ہے فرمایا "فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ" یہی لوگ ہیں جو ایمان سے خالی ہیں۔

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: یہ آیت یہودیوں کے چھ آدمیوں کے بارے میں آئی ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے پہلے سے خبر دیدی ہے کہ یہ لوگ آخر تک ایمان نہیں لائینگے۔

نیز: اس لفظ میں ان لوگوں کو عذاب کے حکم سے الگ کرنا مقصود ہے جو اگرچہ اس وقت کافروں کے ساتھ لگے ہوئے تھے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف بھرپور کوشش میں مصروف تھے، مگر آئندہ کسی وقت اسلام قبول کر کے اپنی پچھلی بدکاریوں سے توبہ کرلیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان میں سے بہت بڑی جماعت مسلمان ہوکر نہ

صرف خود نیک اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والی ہوگئی بلکہ دنیا کے لیے بھی دین کی طرف بلانے والی بن گئی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے دشمن دو تھے، ایک مکہ کے مشرکین جن کی تنگیوں اور تکلیفوں نے مسلمانوں کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا، دوسرے مدینہ کے یہودی تھے جواب مسلمانوں کے پڑوسی بن گئے تھے، ان میں یہودیوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا جس کا عہد نامہ تفصیل سے لکھا گیا اس معاہدہ کی پابندی مدینہ کے اردگرد سب یہودیوں پر اور دوسری طرف تمام مہاجرین وانصار پر لازم تھی، معاہدہ کی پوری عبارت "البدایہ والنہایہ" ابن کثیر میں اور "سیرت ابن ہشام" وغیرہ میں تفصیل سے موجود ہے اس کا سب سے اہم جزء یہ تھا کہ باہمی اختلاف کے وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو قبول کرنا سب پر لازم ہوگا، دوسرا جزء یہ تھا کہ مدینہ کے یہودی مسلمانوں کے خلاف کسی دشمن کی کھلی یا پوشیدہ مدد نہیں کرینگے، لیکن ان لوگوں نے بدر کی جنگ کے وقت عہد توڑ کر مکہ کے مشرکوں کو اسلحہ اور دوسرے جنگی سامان سے مدد پہنچائی، مگر جب بدر کی جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کی کھلم کھلا فتح اور کافروں کی کھلم کھلا شکست کی صورت میں سامنے آیا تو پھر ان لوگوں پر رُعب چھا گیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہو کر عذر کیا کہ اس مرتبہ ہم سے غلطی ہوگئی اس کو معاف فرمادیں آئندہ عہد نہیں توڑینگے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حوصلہ مندی اور رحمدلی سے ان کو معاف کر دیا اور آئندہ کے لیے نئے سرے سے معاہدہ کر لیا گیا، مگر یہ لوگ اپنی بری خصلت سے مجبور تھے، احد کی جنگ میں مسلمانوں کی ابتدائی شکست اور نقصان کا علم ہو کر ان کے حوصلے بڑھ گئے اور ان کا سردار کعب بن اشرف خود سفر کر کے مکہ پہنچا اور مکہ کے مشرکوں کو اس بات تیار کیا کہ اب وہ پوری تیاری کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کریں مدینہ کے یہودی ان کے ساتھ ہونگے۔

یہ دوسری عہد شکنی تھی جو ان لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف کی، اس آیت میں ان لوگوں کے بار بار عہد توڑنے کا ذکر فرما کر ان لوگوں کی شرارت بیان کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن سے آپ نے معاہدہ کر لیا، مگر یہ لوگ ہر مرتبہ اپنے عہد کو توڑتے رہے، آخری آیت میں ارشاد فرمایا: "وَّ هُمْ لَا يَتَّقُوْنَ" یعنی: یہ لوگ ڈرتے نہیں اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بدنصیب لوگ چونکہ دنیا کی لالچ میں مست اور بے ہوش ہیں، آخرت کی

فکر ہی نہیں؛ اس لیے آخرت کے عذاب سے نہیں ڈرتے، اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ایسے بدکردار عہد توڑنے والوں کا برا انجام اس دنیا میں ہوا کرتا ہے، یہ لوگ اپنی غفلت اور ناسمجھی کی وجہ سے اس سے نہیں ڈرتے۔

پھر ساری دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان لوگوں نے اپنی بدکرداری کی سزا چکھیں، ابوجہل کی طرح کعب بن اشرف بھی مارا گیا اور مدینہ کے یہودیوں کو مدینہ سے جلاوطن کیا گیا۔

عہد توڑنے والوں کی سزا

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ

پس اگر | پائے تو ان کو | میں | لڑائی | تو بھاگ | انکے ذریعہ | انکو | جو انکے پیچھے ہیں | تاکہ وہ

يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ

عبرت پکڑیں (۵۷) اور | اگر | تجھے ڈر ہو | سے | کسی قوم | دغا کا | تو پھینک دے | طرف ان کی

عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ ع ۱۰ ۴

پر | برابر | بیشک | اللہ | نہیں | پسند کرتا | دغابازوں کو (۵۸)

بامحاورہ ترجمہ: سو! اگر آپ ان کو کبھی لڑائی میں پاویں تو ان کو ایسی سزا دے کہ دیکھ کر ان کے پچھلے بھاگ جائیں تاکہ ان کو عبرت ہو۔ (۵۷) اور اگر آپ کو کسی سے دغا کا ڈر ہو تو ان کا عہد ان کی طرف پھینک دیں، اس طرح کہ آپ اور وہ برابر ہو جاوٴ اللہ کو دغاباز پسند نہیں آتے۔ (۵۸)

لفظی تحقیق: **تَثْقَفَنَّهُمْ**: پائیں آپ ان کو۔ مضارع کا صیغہ ہے ثقف سے اس کے ساتھ تاکید کے لیے نون ثقیلہ لگا ہوا ہے ثقف کے معنی ہیں پالینا، اس معنی میں یہ لفظ اور اس سے پہلے "سورۃ النساء" میں آیا ہے اس کے معنی درست اور سیدھا کرنے کے بھی ہیں، اس معنی کے لحاظ سے اس سے ثقافت بنا ہے جو عام طور پر اخلاق کی درستی کے طریقے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ **شَرِّدْ**: بھگا دے۔ امر کا صیغہ ہے جو "تشرید" سے بنا ہے "شَرِّدْ" کے معنی بھاگ جانا تشرید اس کا متعدی ہے جس کے معنی بھگا دینا۔ **اِمَّا**: اگر۔ یہاں یہ لفظ دونوں جگہ

"ان" اور "ما" سے مرکب ہے، "ان" حرف شرط ہے اگر معنی میں اس پر "ما" بڑھا کر اور نون کو میم سے بدل میم کو میم میں ادغام کر کے "اِمَّا" بنالیا ہے "ما" اکثر حرف شرط وغیرہ پر بڑھا دیتے ہیں، جس سے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جیسے: اذ سے اذ ما، اذا سے اذا ما وغیرہ۔ فَانْۢبِذْ: پھینک دے۔ امر کا صیغہ ہے، "نبذ" کے معنی پھینکنے کے ہیں، اور یہی معنی یہاں مراد ہے اس کے اور معنی بھی آتے ہیں جنہیں اس مقام سے کوئی تعلق نہیں۔

تفسیر

شروع رکوع میں کافروں کے رویہ کا بیان تھا کہ دنیا میں فقط اپنی ہی زندگی ضروری سمجھتے ہیں اور دوسرے کو اگر وہ ان سے خلاف رائے رکھتا ہو ناحق ستانے اور تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مدینہ میں بنو قریظہ کے یہودیوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کرلیا تھا کہ وہ آپ کے دشمنوں کی مدد نہ کریں گے، لیکن انہوں نے بارہا اپنا عہد توڑا اور مسلمانوں کے مقابلے میں مکہ والوں کی مدد کی، یہ طرز عمل ان ہی لوگوں سے ملتا جلتا تھا جن کا اوپر بیان ہو؛ اس لیے اس آیت میں ان کے ساتھ سلوک کرنے کا بیان ہے۔

صلح کے معاہدے کو ختم کرنے کی صورت

اگر کسی وقت معاہدہ کے دوسرے فریق کی طرف سے خیانت، یعنی: عہد توڑنے کا خطرہ پیدا ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ مسلمان معاہدہ کی پابندی کو بدستور قائم رکھیں، لیکن یہ بھی جائز نہیں کہ معاہدہ کو صاف طور پر ختم کردینے سے پہلے مسلمان ان کے خلاف کوئی کاروائی کریں، بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ ان کو اطمینان وفرصت کی حالت میں اس سے آگاہ کردیا جائے کہ تمہاری بدنیتی یا معاہدے کی خلاف ورزی ہم پر ظاہر ہوچکی ہے یا یہ کہ تمہارے معاملات مشکوک نظر آتے ہیں؛ اس لیے ہم آئندہ اس معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے تم کو بھی ہر طرح اختیار ہے کہ ہمارے خلاف جو کاروائی چاہو کرو، آیت کے الفاظ یہ ہیں۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ:

مطلب یہ ہے کہ جس قوم کے ساتھ کوئی صلح کا معاہدہ ہو چکا ہے اس کے مقابلے میں کوئی جنگی کارروائی کرنا خیانت میں داخل ہے اور اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے، چاہے وہ کافر کے خلاف ہی ہو، البتہ دوسری طرف عہد توڑنے کا خطرہ پیدا ہو جائے تو ایسا کیا جا سکتا ہے کے کھلے طور پر ان کو اعلان کے ساتھ آگاہ کر دیں کہ ہم آئندہ معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے، مگر یہ اعلان اس طرح ہو کہ مسلمان اور دوسرا فریق اس میں برابر خبردار ہوں، یعنی: ایسی صورت نہ کی جائے کہ اس اعلان وتنبیہ سے پہلے ان کے مقابلہ کی تیاری کر لی جائے اور وہ خبر نہ ہونے کی وجہ سے تیاری نہ کر سکیں، بلکہ جو کچھ تیاری کرنا ہے وہ اس اعلان وتنبیہ کے بعد کریں۔

یہ ہے اسلام کا عدل وانصاف کہ خیانت کرنے والے دشمنوں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے اور مسلمانوں کو ان کے مقابلہ میں اس کا پابند کیا جاتا ہے کہ عہد کو واپس کرنے سے پہلے کوئی تیاری بھی ان کے خلاف نہ کریں۔

عہد پورا کرنے کا ایک عجیب واقعہ

"ابو داؤد، ترمذی، نسائی،" امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے سُلَیم بن عامر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک قوم کے ساتھ ایک مدت کے لیے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ تھا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا کہ: اس معاہدہ کے دنوں میں اپنا لشکر اور جنگ کا سامان اس قوم کی سرحدوں کے پاس پہنچا دیں تا کہ معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی وہ دشمن پر حملہ کر دیں، مگر عین اس وقت جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر اس طرف روانہ ہو رہا تھا یہ دیکھا گیا کہ ایک بڑی عمر کا آدمی گھوڑے پر سوار بڑے زور سے یہ نعرہ لگا رہا ہے کہ "الله أكبر الله أكبر وفاء لاغدر" یعنی: نعرۂ تکبیر کے ساتھ یہ کہا کہ ہم کو معاہدہ پورا کرنا چاہیے اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: جس قوم سے کوئی صلح یا جنگ نہ کرنے کا کوئی معاہدہ ہو جائے تو چاہیئے کہ ان کے خلاف نہ کوئی گرہ کھولیں اور نہ باندھیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر کی گئی دیکھا تو یہ کہنے والے بزرگ حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ صحابی تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنی فوج کو واپسی کا حکم دیدیا تا کہ جنگ نہ کرنے کی مدت میں حملے کی تیاری کر کے خیانت میں داخل نہ ہو جائیں۔

وہ ہم سے بھاگ نہیں سکتے

وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا یُعْجِزُوْنَ ۝۵۹

اور نہ گمان کریں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ وہ بچ گئے یقیناوہ (ہمیں) نہیں عاجز کرسکتے (۵۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور کافر لوگ یہ نہ سمجھیں کہ وہ بھاگ نکلے وہ ہم کو ہرگز نہ تھکا سکیں گے۔ (۵۹)

لفظی تحقیق: سَبَقُوْا: بچ گئے۔ ماضی کا صیغہ ہے، سبق کے معنیٰ ہیں آگے نکل جانا، بھاگ جانا، بچ جانا، اس لفظ کے اور بھی معنیٰ ہیں مگر یہاں یہی معنیٰ مراد ہیں۔ **یُعْجِزُوْنَ:** تھکا دینا، عاجز کر دینا۔ مضارع کا صیغہ ہے اعجاز سے جو عجز سے بنا ہے، عجز کے معنیٰ درماندگی اور بے بسی کے ہیں، اعجاز اس سے متعدی ہے اس کے معنیٰ مقابلہ کے وقت سامنے والے کو عاجز اور بے بس کر دینا، معجزہ اسی سے بنا ہے اس کے معنیٰ ہیں دوسروں کو عاجز کر دینے والی چیز۔

تفسیر

پچھلی آیت میں کہا گیا تھا کہ خیانت اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں؛ اس لیے اگر کوئی قوم تمہاری دشمن بھی ہو اور تمہیں علامتوں سے یقین ہو جائے کہ وہ تم پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں اور عہد و پیمان کی پرواہ نہیں کرتے تو محض علامتوں کی بناء پر ان پر حملہ نہ کرو، کیونکہ وہ عہد کی بناء پر تم سے بے خوف ہیں، پہلے ان کو اطلاع دیدو کہ تم عہد کے خلاف کاروائیاں کر رہے ہو یا تو ان کو چھوڑ دو، ورنہ ہم تم پر حملہ کر دیں گے اب تم اور وہ برابر کے مرتبہ میں ہو جاؤ گے اور تمہارا حملہ نامناسب نہ کہلائیگا، جو لوگ اخلاقی قدروں کو چنداں وقعت نہیں دیتے ان کو یہ بات ہوشیاری کے خلاف معلوم ہوئی کیونکہ اچانک حملہ کرنے سے دشمن کا صفایا آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا تھا، اطلاع دینا گویا ان کو اپنے بچاؤ کا سامان جمع کرنے کی مہلت دینا ہے، اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔

ارشاد ہے کہ: تمہارے دشمن خوش ہوتے ہوں گے کہ مسلمان عہد کا خیال کریں اور لڑنے سے پہلے ان

سے عہد کرنے والے کو اپنے اارادے سے اطلاع دیں گے، اور ہم خوب تیاری کر کے مسلمانوں کو لڑ کر بھگا دیں گے، تم ان کی خوشی کی پرواہ نہ کرو اور ان کو عہد پر قائم نہ رہنے کی اطلاع دے دو یہ اخلاقی فرض ہے، جس کا خیال ضروری ہے اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا، کیونکہ کافر خواہ ہی تیاری کرلیں وہ بچ نہیں سکتے وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے، اللہ ان کو عاجز اور پست کر دے گا، یہ ہدایت ان کے بارے میں ہے جنہوں نے کھلم کھلا عہد نہیں توڑا ہے، مگر علامتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے خلاف تیاری کر رہے ہیں۔

احکام ومسائل

اس آیت میں ارشاد ہے کہ: یہ لوگ یوں نہ سمجھیں کہ ہم بچ نکلے کیونکہ بدر کی جنگ کافروں کے لیے اللہ کی طرف سے ایک عذاب تھا اور اس کی پکڑ سے بچنا کسی کے بس میں نہیں تھا؛ اس لیے فرمایا: "اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ "یعنی: یہ لوگ اپنی چالاکی سے اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے وہ جب پکڑنا چاہیں گے، یہ ایک قدم نہ سرک سکیں گے، ہو سکتا ہے کہ دنیا میں ہی پکڑ لیے جائیں ورنہ آخرت میں تو ان کی گرفتاری ظاہر ہے۔

اس آیت میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ کوئی مجرم گنہگار اگر کسی مصیبت اور تکلیف سے نجات پا جائے اور پھر بھی توبہ نہ کرے بلکہ اپنے جرم پر ڈٹا رہے تو یہ اس کی علامت نہ سمجھو کہ وہ کامیاب ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا بلکہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں ہے اور یہ ڈھیل اس کے عذاب اور مصیبت کو اور بڑھا رہی ہے گو اس کو محسوس نہ ہو۔

اپنی قوت بڑھاؤ

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ

اور تیار رکھو لیے ان کے جو تم سے ہو سکے سے قوت اور سے پلے ہوئے گھوڑوں

تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ

کہ ڈر بٹھاؤ تم سے ان دشمن پر اللہ کے اور پر دشمن اپنے اور اوروں پر سے سوا ان کے

لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۗ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ
نہیں جانتے تم اس کو اللہ جانتا ہے ان کو اور جو تم خرچ کرو سے کسی چیز میں

سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝٦٠
راہ اللہ کی پوری لوٹائی جائیگی طرف تمہاری اور تم نہیں ظلم کئے جاؤ گے (٦٠)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اوران کی لڑائی کے واسطے قوت میں سے اور پلے ہوئے گھوڑوں میں سے جو کچھ جمع کرسکو تیار کررکھو، اس سے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اوران کے سوا دوسروں پر دھاک بیٹھے گی، تم ان کو نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے اور جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تم کو پورا ملے گا، اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا۔ (٦٠)

لفظی تحقیق: اَعِدُّوْا: تیار کرو۔ امر کا صیغہ ہے اعداد سے، اعداد کا مادہ ہے ع، د، د جس سے عدد، معدود استعداد، وغیرہ الفاظ بنتے ہیں، "عدّ" کے بہت سے معنی آتے ہیں، گننا، شمار کرنا، اعداد کے معنی ہیں کسی چیز کو گن کر شمار کرکے حفاظت سے اٹھا رکھنا تا کہ وقت پڑنے پر کام آئے۔ رِبَاطِ: باندھ رکھنا۔ یہ لفظ ربط سے بنا ہے ربط کے معنی جوڑنا ہیں، رباط گھوڑوں کے باندھنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں اور خود بندھے ہوئے گھوڑوں کو بھی کہتے ہیں، گھوڑے اس لیے باندھے جاتے ہیں کہ ان کی حفاظت اور پرورش کی جائے تا کہ لڑائی میں کام آئیں۔ تُرْهِبُوْنَ: تم ڈراؤ۔ مضارع کا صیغہ ہے "ارہاب" سے جو "رھبۃ" سے بنا ہے "رھبۃ" کے معنی ڈر اور خوف کے ہیں "ارہاب" اس کا متعدی ہے، یعنی: دوسرے کو ڈرانا، خوف زدہ کرنا۔ لَا تُظْلَمُوْنَ: نہ ظلم کیے جاؤ گے۔ مضارع مجہول ہے جو ظلم سے بنا ہے، یہ لفظ بہت جگہ آیا ہے اس کے معنی ہیں دوسرے کا حق دبانا۔

تفسیر

اس آیت میں مسلمانوں کو صاف ہدایت کی گئی ہے کہ کبھی اپنے آپ کو ایسا کمزور مت بناؤ کہ جس کا جی چاہے دبالے، بلکہ لڑائی کے ہتھیاروں کا استعمال سیکھو، گھوڑے پالو، سواری سیکھو، تا کہ جو اللہ کے نافرمان کا فرادر

تمہارے دشمن ہیں اور تم کو ستاتے ہیں ان پر تمہارا رُعب اور دبدبہ قائم رہے اور تم سے لڑائی کرنے کی جرأت نہ کریں، تمہارے دشمن یہی نہیں جنہیں تم کھلم کھلا اپنے سے لڑتے دیکھ رہے ہو، بہت سے خفیہ دشمن ہیں جو اللہ کو معلوم ہیں اور تمہیں ان پر شبہ بھی نہیں، مثلاً: منافق یا آئندہ تمہارے مخالف جو قومیں ہونے والی ہیں ان سب کو رُعب میں رکھنا ضروری ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ بدن کی قوت بناؤ اور ہتھیاروں کا استعمال سیکھو، اس پر جو تمہارا خرچ ہوگا اس کا بدلہ تمہیں اللہ کے ہاں سے پورا پورا ملے گا تمہارا حق ذرا سا بھی ضائع نہ جائے گا۔

ان آیتوں میں کافروں کے خلاف تیاری کا اہم اصول بیان کیا گیا ہے کہ ان کافروں کے خلاف جتنی ہو سکے تیاری کرو، جسمانی ورزش، گھوڑ سواری، ڈرائیونگ، نشانہ بازی، اسلحہ بنانے کی تربیت، سائنسی معلومات، الغرض! ہر طرح سے جنگی تربیت حاصل کرنے کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے۔

امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: حدیث میں جو تیر اندازی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد محض تیر اندازی نہیں بلکہ وقت کے جدید ترین ہتھیاروں کا استعمال ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے میں تیر اندازی ہی جنگ کے لیے بہترین ہتھیار سمجھا جاتا تھا مگر آج اس سے ہر قسم کی بندوق، توپ، ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، فضا سے فضا اور زمین سے زمین میں مارے جانے والے میزائل، جنگی کشتیاں اور تباہ کن بحری جہاز، ہوائی جہاز، راکٹ اور آبدوزیں ہیں، مقصد تو یہ ہے کہ دشمن کا صفایا کیا جائے اور ہر وہ ہتھیار استعمال کیا جائے جو ضروری ہو، ظاہر ہے کہ جب دشمن کے پاس جدید قسم کے ہتھیار موجود ہوں گے تو مسلمان صرف تیر و تلوار پر ہی بھروسہ کر کے نہیں بیٹھ سکتے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: دشمن کے مقابلے کے لیے اگر ناخن بھی کام دے سکتا ہے تو بیشک ناخنوں کو بڑھالو، حالانکہ عام حالت میں ناخن کاٹنے کا حکم ہے، تو مقصد یہ کہ دشمن کے خلاف تیاری کے لیے تمام جنگی ساز و سامان اور تمام وسائل کام میں لانا ضروری ہے "مِنْ قُوَّةٍ" میں یہ سب کچھ شامل ہے۔

مالی جہاد ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے دشمن کے مقابلے کے لیے وسائل مہیا کرنا کوئی معمولی بات نہیں اس کے لیے وسیع مالی ذرائع کی ضرورت ہے، توپ کے ایک چھوٹے سے گولے کے لیے بھی ہزاروں روپے

لگتے ہیں، ایک ٹینک لاکھوں روپے میں بنتا ہے اور بمباری کرنے والا جہاز تو کروڑوں میں آتا ہے، جنگی تیاری کے لیے بڑے وسیع سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے جو مالدار مسلمان فراہم کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

دوسری عبادتوں کی طرح جہاد بھی ایک اہم عبادت ہے اور ہر مرد وعورت پر فرض ہے، کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوتا، جہاد ہر عاقل، بالغ اور صحت مند مسلمان پر بلا معاوضہ فرض ہے، جہاد عام حالت میں فرض کفایہ ہوتا ہے، یعنی: مسلمانوں کی ایک جماعت میں سے کچھ آدمی اس میں شریک ہو جائیں تو فرض ادا ہو جاتا ہے، لہٰذا عام حالت میں مجاہدین کی ایک جماعت ہمیشہ تیار رہتی ہے، البتہ جب اعلان عام ہو جائے تو جہاد فرض عین ہو جاتا ہے، جب قوم کو ضرورت ہو تو پھر کوئی ایک شخص بھی پیچھے نہیں رہ سکتا صرف نابینا، لنگڑا، بیمار اور بہت بوڑھا عملی جہاد میں شریک ہونے سے مستثنیٰ ہیں ان کے لیے بھی شرط ہے "اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ" جبکہ وہ اللہ اور پیغمبر کے حق میں خیر خواہ ہوں کوئی غلط پروپیگنڈہ نہ کریں، بلکہ اپنی مجلسوں میں اچھی بات کریں جس سے دوسرے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہو اور اسلام کو قوت پہنچے۔

امام ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ چوتھی صدی ہجری کے مفسر قرآن ہیں آپ نے اپنی تفسیر میں مسلمانوں کی کمزوری کا کئی مقامات پر ذکر کیا ہے آپ اس زمانے میں دیکھ رہے تھے کہ مسلمان عیاشی میں پڑ گئے ہیں اور ملکی سرحدیں کمزور ہو رہی ہیں یہ تو اس زمانے کی بات ہے جو مسلمان اس وقت پھسلنا شروع ہوئے تھے، وہ آج کہاں تک پہنچ چکے ہیں اور مسلسل ضعف کی طرف جا رہے ہیں، اللہ کا کلام برحق ہے پیغمبر کا فرمان سچ ہے، اس کے اصول درست ہیں مگر کمی ہے تو صرف عمل کی آج مسلمان دنیا بھر میں اپنی بے عملی کی وجہ سے ذلت کا شکار ہیں، عمل کرنے کے لیے جان اور مال کو خرچ کرنا پڑتا ہے مگر آج مسلمان حکمران عیش وآرام میں پڑے ہوئے ہیں کھیل تماشے میں مصروف ہیں، مسلمان بھی یورپ والوں کے پیچھے لگ کر اپنے مشن کو بھول چکے ہیں، دین کی تبلیغ، تصنیف و تالیف اور جہاد فرض ہے نئی پودوں کی تربیت انہی چیزوں سے ہوتی ہے اگر تعلیم وتربیت ہی ختم ہو جائے تو فرض کی ادائیگی کیسے ہو سکے گی، لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے اپنے حلقہ اثر میں اپنی اپنی اہلیت اور صلاحیت کے

مطابق اپنے مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی کرے، یہ جہالت کا نتیجہ ہے آج کسی کو نماز روزے، نکاح طلاق اور خرید وفروخت کے چھوٹے چھوٹے مسئلوں کا بھی علم نہیں، اور پھر افسوس کی بات یہ ہے کہ لوگ سیکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے عام دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر طلاق کی نوبت آجائے تو ایسی تحریر کریں گے جس سے کئی پیچیدگیاں پیدا ہوجائیں، حلال وحرام کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنادیا جاتا ہے، یہ سب باتیں ایک عام مسلمان کے سیکھنے کی ہیں مگر اس طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

دنیائے اسلام اس وقت قدرتی وسائل سے مالا مال ہے صرف ان سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے اقتصادی لحاظ سے دنیا میں تیل کو بہت اہمیت حاصل ہے، امن کی حالت میں بھی اس کے بغیر گزارہ نہیں مگر جنگ کی حالت میں تو تیل ایک موثر ہتھیار ہے، مسلمانوں کے پاس یہ چیز وافر مقدار میں موجود ہے، دوسری معدنیات کی بھی کمی نہیں مگر اس کے باوجود ان کو دنیا میں عزت ووقار حاصل نہیں، یہ وجہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے وسائل سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں، ان میں صلاحیت موجود ہے مگر محنت اور قربانی کا جذبہ نہیں ہے، عرب ممالک پچاس ساٹھ سال سے تیل پیدا کر رہے ہیں مگر اس کے لیے ماہرین ابھی تک امریکہ اور جرمنی سے آتے ہیں آج تک اپنے انجینئر پیدا نہیں کر سکے، کہیں نقص پڑ جائے تو اسے درست نہیں کر سکتے اس کے لیے بھی بڑے بھاری معاوضے دے کر ماہرین کو باہر سے بلانا پڑتا ہے، خود تعلیم حاصل کریں، تجربات کریں اور کم از کم اس کام میں تو اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں، اور بیرونی ماہرین کو ادا کی جانے والی بڑی بڑی رقمیں بچا سکیں یہ پستی کی نشانی ہے آرام طلب ہوگئے ہیں اور محنت سے جی چراتے ہیں حالانکہ محنت اور جذبے کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہوسکتی؛ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ: جس قدر ہو سکے اپنے اندر قوت پیدا کرو، وسائل کو کام میں لاؤ، اسلحہ تیار کرو، مجاہدین کی بہترین تربیت کروتا کہ تم دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکو۔

مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور میں خوب محنت کی ان میں قربانی کا جذبہ اور دین کے غلبے کی تڑپ تھی جس کے اثرات سات سو سال تک دنیا میں موجود رہے، اسلام کی بین الاقوامی حیثیت دنیا میں قائم رہی، تمام دنیا

پر مسلمانوں کی سیاست چلتی تھی، مگر جب گراوٹ شروع ہوئی تو تمام وسائل موجود ہونے کے باوجود مسلمان دنیا میں تیسرے درجے کے باشندے بن گئے ہیں دنیا میں ان کی کوئی قدر و منزلت نہیں، اس زمانے میں بھی مسلمانوں میں بڑے بڑے قابل دماغ والے ہیں باصلاحیت نوجوان موجود ہیں، مگر حکومت اور قومی اداروں کی طرف سے حوصلہ افزائی نہیں ہوتی، لائق نوجوان کسی قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں مگر ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے یہی بدقسمتی ہے۔

فرمایا: دشمن کے مقابلے میں حسبِ استطاعت تیاری کرو قوت کے ساتھ گھوڑوں کے ساتھ، یہاں پر اللہ تعالیٰ نے جنگی مقصد کے لیے گھوڑوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، گھوڑا بڑا برکت والا جانور ہے اور اس کی یہ برکت قیامت تک موجود رہے گی، اگرچہ آج کل گھوڑوں کی جگہ جیپوں اور ٹینکوں نے لے لی ہے مگر پھر بھی دنیا میں ایسے ایسے پہاڑی مقامات ہیں جہاں گھوڑے اور خچر ہی کام دے سکتے ہیں، فرمایا: جنگی تیاری کا مقصد یہ ہے "تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ" کہ اس کے ذریعے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کرسکو گے، جنگی تیاری جاری رکھو تاکہ دشمن تم سے ڈرتا رہے اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے مخالف لوگوں کو بھی خوف زدہ کرسکو یہ وہی لوگ ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں، مسلمان ان سے غافل ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، اللہ نے یاد دلایا کہ تمہارے دشمن صرف عرب کے لوگ ہی نہیں بلکہ تمہیں دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں سے مقابلہ کرنا ہوگا، لہٰذا اس کے لیے ابھی سے تیاری شروع کردو، اس وقت مسلمانوں میں کمال درجے کی اطاعت اور جذبہ پایا جاتا تھا، مصر کی فتح کے حالات پڑھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے، قادسیہ کی جنگ میں مسلمانوں نے کتنی عظیم قربانیاں پیش کیں، ایرانی جنگیں کیسے لڑیں، صوبہ خراسان اور پھر بربر تک مسلمان بڑھتے چلے گئے یہ سب ایمان کے جذبہ اور جنگی تیاری کی وجہ سے تھا، مگر افسوس کا مقام ہے کہ اب یہ دونوں چیزیں ناپید ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: عام صدقہ وخیرات کا اجر دس گنا ہے جبکہ جہاد کے لیے خرچ کیے گئے مال کے اجر کی ابتداء سات سو گنا سے شروع ہوتی ہے اور پھر بغیر کسی حد وحساب کے بڑھتی چلی جاتی ہے، ایک شخص

نے جہاد کے لیے ایک اونٹنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی آپ نے فرمایا: تمہیں قیامت کے دن سات سو اونٹنیاں بمعہ پالان ملیں گی، یعنی: پورے ساز وسامان کے ساتھ لدی ہوئی ہوں گی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے: "زروة سنامه الجهاد" یعنی: اسلام کی سر بلندی جہاد میں ہے جہاد کرو گے تو عزت حاصل ہوگی، دشمن مغلوب ہوگا، بد معاشی کا خاتمہ ہوگا اور دنیا امن وامان کا گہوارہ بن جائیگی، حدود قائم ہونگی اور اسلام کو سر بلندی حاصل ہوگی، اگر جہاد کو چھوڑ بیٹھو گے تو پستی کی گہرائیوں میں گر جاؤ گے اگر اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم نہیں کرو گے تو دشمن خفیہ سازشیں کریں گے، پھر تم کہیں غلام بن جاؤ گے اور کہیں مغلوب ہو جاؤ گے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو مسلمان قوم جہاد چھوڑ بیٹھتی ہے وہ ذلیل وخوار ہو کر رہ جاتی ہے اس کو عزت نصیب نہیں ہو سکتی جب تک اپنے دین کی طرف لوٹ کر نہیں آئیگی عزت ووقار حاصل نہیں ہوگا۔

فرمایا "وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ" یعنی: جہاد کی مد میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے "یُوَفَّ اِلَیۡکُمۡ" تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائیگا، جہاد کے لیے ایک کا بدلہ سات سو گنا سے شروع ہوتا ہے، تم اتنے بڑے ثواب کے حق دار ہو جاؤ گے، اور تم پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جائیگی، تمہارا کوئی عمل اور کوئی نیکی رائیگاں نہیں جائیگی، ہر چیز اللہ کے علم میں ہے اور وقت آنے پر تمہیں اس کی قدر دانی ہوگی اور اس کا پورا پورا اجر دیا جائیگا، کسی کی نیکی ضائع کر کے اس پر زیادتی نہیں کی جائیگی۔

جہاد کے لیے اسلحہ اور جنگ کے سامان کی تیاری فرض ہے

دوسری آیت میں اسلام کا دفاع اور کافروں کے مقابلہ کی تیاری کے حکم ہیں، ارشاد فرمایا: "اَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ" یعنی: جنگ کے سامان کی تیاری کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے کرو اس میں جنگ کے سامان کی تیاری کے ساتھ "مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ" کی قید لگا کر یہ اشارہ فرما دیا کہ: یہ ضروری نہیں کہ تمہارے مقابل کے پاس جیسا اور جتنا سامان ہے تم بھی اتنا ہی حاصل کر لو، بلکہ اتنا کافی ہے کہ اپنی طاقت کے مطابق جو سامان ہو سکے کر لو تو، اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔

اسکے بعد اس سامان کی کچھ تفصیل اس طرح فرمائی "مِنْ قُوَّةٍ" یعنی: مقابلہ کی قوت جمع کر و اس میں تمام جنگی سامان اسلحہ سواری وغیرہ داخل ہیں اور اپنے جسم کی ورزش، فنون جنگ کا سیکھنا بھی شامل ہے، قرآن کریم نے اس جگہ کسی قسم کے ہتھیاروں کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ قوت کا عام لفظ اختیار فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ یہ قوت ہر زمانہ اور ہر ملک و مقام کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے اس زمانہ کے اسلحہ، تیر، نیزے تھے اس کے بعد بندوق توپ کا زمانہ آیا، پھر بموں اور راکٹوں کا وقت آ گیا لفظ قوت ان سب کو شامل ہے؛ اس لیے آج کے مسلمانوں کو اپنی حیثیت کے مطابق ایٹمی قوت، ٹینک اور لڑاکا طیارے، آب دوز کشتیاں جمع کرنا چاہیئے کیونکہ یہ سب اسی قوت کے مفہوم میں داخل ہیں اور اس کے لیے جس علم وفن کو سیکھنے کی ضرورت پڑے وہ سب اگر اس نیت سے ہو کہ اس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے دفاع اور کافروں کے مقابلے کا کام لیا جائے تو وہ بھی جہاد کے حکم میں ہے۔

صحیح حدیثوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کا سامان فراہم کرنے اور اس کے استعمال کی مشق کرنے کو بڑی عبادت اور بہت بڑے ثواب کا ذریعہ فرمایا ہے، تیر بنانے اور چلانے پر بڑے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔

اور چونکہ جہاد کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں کا دفاع ہے اور دفاع ہر زمانہ اور قوم کا جدا ہوتا ہے؛ اس لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جاھدوا المشرکین باموالکم وانفسکم والسنتکم" (مشرکوں سے اپنی جان، مال اور زبان سے جہاد کرو)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح دفاع و جہاد ہتھیاروں سے ہوتا ہے اسی طرح بعض اوقات زبان اور قلم سے بھی ہوتا ہے۔

صلح کا حکم

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ

اور اگر وہ مائل ہوں صلح کی طرف تو مائل ہو تو طرف اسکی اور بھروسہ کریں پر اللہ یقیناً وہ

هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦١﴾

وہی ہے　سننے والا　جاننے والا (٦١)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی صلح کے لئے جھکیں، یعنی: اگر وہ صلح پر تیار ہوں تو آپ بھی صلح پر تیار ہو جائیں اور اللہ پر بھروسہ کریں، بیشک وہی سننے والا جاننے والا ہے۔ (٦١)

لفظی تحقیق: **جَنَحُوْا**: وہ جھکیں۔ ماضی کا صیغہ ہے، جنح سے بنا ہے جنح کے معنی ہیں جھکنا، مائل ہونا، اسی سے مادہ سے اجنح امر کا صیغہ ہے جو اسی آیت میں ہے، یعنی: جھک جا، مائل ہو، **لِلسَّلْمِ**: صلح کے لیے، اس مادہ سے بہت سے لفظ بنے ہیں، مسلم، اسلام، سلامت، سلام، تسلیم وغیرہ ان سب میں صلح، آشتی امن، تابعداری، قانون کی پابندی کے معنی پائے جاتے ہیں، یہاں اس سے مراد صلح یعنی لڑائی سے باز رہنے کے ہیں۔

تفسیر

پچھلی آیت میں حکم تھا کہ لڑائی کی تیاری میں مشغول رہو کیونکہ لوگوں میں تمہاری مخالفت کا جوش ہے اور مخالفت کی بنا محض خود غرضی ہے جس سے ساری دنیا میں سارے فساد ہوتے ہیں؛ اس لیے تمہیں لڑائی کے لیے تیار رہنا چاہیے، اسلام میں لڑائی کا مقصد خون ریزی اور ملک گیری نہیں بلکہ امن وامان کے دشمنوں کو دبانا ہے تاکہ دنیا میں امن وامان قائم ہو اور ہر شخص آزادی کے ساتھ حق کی تلاش میں لگ سکے، اور حق کے پالینے کے بعد اسے اس کے اختیار کرنے سے کوئی چیز روکنے والی نہ ہو؛ اس لیے ضروری ہے کہ امن وامان کے حمایتی لڑائی کے سامان کے ساتھ پوری طرح لیس رہیں تاکہ فسادی لوگ دبے رہیں۔

اسی لیے اس آیت میں ارشاد ہے کہ فسادی لوگ اگر صلح کا خیال ظاہر کریں اور اس بات پر تیار ہوں کہ ہم کسی کو زبردستی حق کے اختیار کرنے سے نہ روکیں گے اور فتنہ وفساد نہ پھیلائیں گے تو آپ کو بھی صلح کے لیے تیار ہو جانا چاہیے، کیونکہ جب آپ کا مقصد خون ریزی کے بغیر حاصل ہوتا ہے تو خواہ مخواہ خون ریزی کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ اس کا حکم ہے۔

دھوکے بازوں کا علاج

وَ اِنْ یُّرِیْدُوْۤا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِیْۤ

اور اگر وہ ارادہ کریں کہ دھوکا دیں آپ کو تو کافی ہے آپ کو اللہ وہی ہے جس نے

اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۲﴾ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ

طاقت دی آپ کو ساتھ مدد اپنی کے اور ساتھ مسلمانوں کے (۶۲) اور محبت ڈال دی درمیان دلوں ان کے

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر وہ چاہیں کہ آپ کو دغا دیں تو آپ کو اللہ کافی ہے اور اسی نے آپ کو اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا زور دیا۔(۶۲) اور ان کے دلوں میں الفت ڈال دی۔

تفسیر

پچھلی آیت میں حکم دیا گیا تھا کہ اگر تمہارے مخالف صلح کی خواہش کریں تو تم بھی صلح پر راضی ہو جاؤ، کیونکہ اسلام کا اصل مقصد لڑنا نہیں ہے بلکہ دین کی طرف بلانا ہے اور جو اس مبارک راستے میں رکاوٹ بنیں اس کو ہٹانا ہے، اگر یہ دونوں باتیں باہمی قول وقرار سے ہی حاصل ہو جائیں تو لڑنے کی ضرورت نہیں، اس آیت میں بتایا کہ صلح کی درخواست پر صلح کرنا بہر حال افضل ہے، اور اگر یہ شبہ ہو جائے کہ صلح کی درخواست سے ان کا مقصد صرف دھوکہ دینا ہے اور ان کے دل میں یہ ارادہ ہے کہ مسلمانوں سے صلح کے بہانے اندر اندر لڑنے کی تیاری کرتے رہیں گے اور باہر صلح کا پردہ ڈالے رکھیں گے کیونکہ مسلمانوں کو تو ان کے دین میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ ایمانداری سے صلح کی شرطوں کی پابندی کرو اس لئے وہ تو پابندی کے خیال سے نہ ظاہر میں صلح کی شرطوں کے خلاف کچھ کر سکتے ہیں اور نہ خفیہ طور پر، لیکن ہمیں اس بہانے سے ان کو ستانے کا خوب موقع ملے گا، ارشاد ہے کہ: اگر صلح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں غافل کر کے خود صلح کی شرطوں کی چالاکی سے خلاف ورزی کرتے رہیں گے اور اس

حالت تک پہنچنے کا خوف ہو کہ تم صلح کی وجہ سے کچھ نہ کرسکو گے اور وہ دھڑلے سے تمہیں ستانے پر کمر باندھ لیں تو بھی صلح کرنا ہی بہتر ہے وہ ان دغابازیوں اور چالاکیوں سے تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، تمہاری وفاداری اور ایمانداری اللہ کی خوشنودی کا باعث ہے وہ تمہاری طرف سے ان کی دغابازی کا بدلہ لینے کے لیے کافی ہے ،دیکھو! شروع میں انہوں نے تمہیں کتنا ستایا لیکن اللہ نے اپنے پیغمبر کی خود بھی مدد کی اور مسلمانوں کو بھی ان کی مدد کے لیے تیار کیا، ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت اور الفت ڈال دی اور وہ آپس میں بھائی بھائی ہو گئے، گو پہلے ان کے اندر سخت دشمنی اور لڑائی تھی۔

فرمایا: ایک تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوت بخشی اپنی نصرت اور مسلمانوں کے ذریعے، اور دوسرا انعام یہ دیا کہ ان کہ دلوں میں الفت ڈال دی، اسلام لانے سے پہلے اوس وخزرج کے قبیلے ایک سو بیس سال تک خاندانی جنگ لڑتے رہے، مگر جب مسلمان ہو گئے تو ان کی دشمنی دوستی میں بدل گئی اور یہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے، عرب کے بعض دوسرے قبیلے مثلاً: قریش اور کنانہ کی پرانی دشمنی اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہتے تھے، مگر اسلام لانے کی برکت سے سارے قبیلے والے بھائی بھائی بن گئے، اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ان کے دلوں میں محبت والفت ڈال دی، اور اسی نے اپنی نصرت اور مؤمنوں کے ذریعے آپ کو قوت بخشی اور بدر کی لڑائی میں اللہ تعالیٰ نے خوب مدد فرمائی، آپ کے ساتھ تھوڑی سی جماعت تھی مگر اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو کامیاب کیا اور مشرک مغلوب ہو گئے جس سے کفر کا زور ٹوٹ گیا، مسلمانوں کے دلوں میں اطمینان اور سکون پیدا ہوا، اللہ کی نصرت کا پورا پورا یقین ہو گیا اور پھر مسلمان اللہ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے دین کا پیغام لے کر دنیا کے کونے کونے میں پہنچے؛ اسی لیے فرمایا کہ: جب آپ خالص نیت سے اللہ کے دین کے لیے نکلیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ آپ کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے، بلکہ نصرت کے ساتھ اور مؤمنین کی جماعت کے ساتھ آپ کی تائید فرمائیں گے۔

کافروں کے ساتھ صلح کرنے کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ اور بعد کے زمانہ میں فرق ہے، پیغمبروں کو تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے خصوصی تائید حاصل ہوتی تھی، ان کی حفاظت کی ذمہ داری تو خود اللہ تعالیٰ

پرتھی جیسا کہ فرمایا: "وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" اللہ تعالیٰ آپ کو کافروں سے بچائیں گے۔ مگر آپ کے بعد عام مسلمانوں کے لیے حکم یہ ہے کہ اپنے اطراف کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد صلح کا معاہدہ کریں اور دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان اپنی جماعتی نظم وضبط کو قائم رکھیں، مسلمان دشمن سے دھوکہ اسی وقت کھائیں گے جب ان کا آپس میں اتفاق اور نظم وضبط نہ ہوگا دشمن بھی ایسے موقع کی تلاش میں رہتا ہے جب مسلمانوں کے اندر غدار پیدا ہو کر ان کے اتحاد واتفاق کو کمزور کر دیتے ہوں تو دشمن بھی دلیر ہو جاتے ہیں۔

یہ ملاپ کس نے کرایا

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ

اگر خرچ کر دیتا تو جو کچھ میں ہے زمین سب کچھ نہ الفت ڈالتے آپ درمیان دلوں ان کے اور

لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۶۳﴾ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ

لیکن اللہ نے الفت ڈالدی درمیان انکے تحقیق وہ زبردست حکمت والا ہے (۶۳) اے پیغمبر!

حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۴﴾ ع ۸ / ۴

کافی ہے آپ کو اللہ اور جو تابعداری کرے آپکی میں سے مسلمانوں (۶۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اگر جو کچھ زمین میں ہے تو سارا خرچ کر دیتے (تو بھی) ان کے دلوں میں الفت نہ ڈال سکتا، لیکن اللہ نے الفت ڈالی بیشک وہ زور آور حکمت والا ہے۔ (۶۳) اے پیغمبر! آپ کو اور آپ کے ساتھ جتنے مسلمان ہیں سب کو اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ (۶۴)

تفسیر

پچھلی آیتوں میں کہا گیا ہے کہ مخالف اگر صلح کی درخواست کریں تو آپ بھی صلح پر راضی ہو جاؤ صلح کرتے وقت یہ مت سوچو کہ ممکن ہے کہ مخالفوں کے دل میں دغابازی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ اللہ کی طرف مکمل طور پر

متوجہ ہوجاؤ اور اپنے بارے میں سوچو کہ جب اس نے ہماری ان کے مقابلے میں ایسے مشکل وقت میں مدد کی جب ہمارے مٹانے کے لیے مشرکوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی تو وہ اب بھی ہماری مدد کرے گا اور ان کی چالیں تدبیریں بڑھ بڑھ کے بولنا اور خفیہ سازشیں جب پہلے کچھ نہ بگاڑ سکیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو نیچا دکھایا اور ہم کو اونچا کیا تو یہ کافر اب بھی ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، پھر بتایا گیا کہ تم لوگ آپس میں لڑنے بھڑنے میں مصروف تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے اندر امن قائم کیا اور تم ایک دوسرے کو چاہنے والے اور محبت کرنے والے ہو گئے، اس نعمت کو یاد دلا کر اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ کس قدر مشکل کام تھا جو کہ اللہ کے فضل سے آسان ہو گیا ایسے ہی ساری مشکلیں آئندہ بھی آسان ہو جائیں گی۔

ارشاد ہے کہ: اے ہمارے پیغمبر! ان کو آپس میں ملا دینا آپ کے بس میں نہ تھا اور اگر آپ ساری دنیا کے خزانے بھی خرچ کر دیتے تو بھی ان میں الفت اور میل جول پیدا نہیں کر سکتے تھے یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کے دل ایک دوسرے سے ملا دیئے اور یہ آپس کی دشمنی کو بھول کر ایک دوسرے سے محبت کرنے والے اور چاہنے والے ہو گئے، اس سے یقین کر لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کسی کی کیا حیثیت ہے جو ڈٹ سکے وہ سب پر غالب ہے وہ اگر طاقت دکھانے پر آئے تو پلک جھپکنے میں اچھے اچھوں کا دم نکال کر رکھ دے، وہ ہر چیز اور ہر بات کا مناسب موقع کو جانتا ہے جہاں طاقتور اور قوی ہے تو اس کے ساتھ حکیم بھی ہے جس موقعہ پر جو مناسب سمجھتا ہے کرتا ہے کسی کی مجال نہیں جو اسے روک سکے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہے کہ: اے پیغمبر! آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہیں، اس نے مسلمانوں کو اپنی رحمت سے آپ کے اطاعت گذار اور فرمانبردار بنائے ہیں ان کو غنیمت سمجھیں، یہ مشکل وقت میں آپ کے کام آئیں گے، ان کی مدد کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کافی ہیں۔

حقیقت میں عرب کی حالت بدلنے میں ضرور ایک ایسی زبردست قوت کا ہاتھ ماننا پڑے گا جو مادی اور دنیاوی چیزوں میں نہ کبھی دیکھی گئی اور نہ دیکھی جا سکتی ہے اور یہ قوت اللہ تعالیٰ کی ہے اور اس قدر واضح دلیل کے

بعد ہو نہیں سکتا کہ اس کو نہ مانا جائے۔

فرمایا کہ: مسلمانوں کی آپس کی بھائی چارگی اور دوستی اتنی قیمتی چیز ہے کہ اگر آپ ساری زمین کے تمام خزانے بھی خرچ کر ڈالتے تو ان کے دلوں میں محبت والفت پیدا نہیں کر سکتے، یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانی سے ان کے درمیان محبت کا جذبہ پیدا فرما دیا، جب وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو ایک جاننے اور ماننے کے عقیدے پر پختہ ہو گئے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری پر ایمان لائے تو پھر پیغمبر کی برکت سے ساری جماعت ایک ہوگئی، ہر شخص دوسرے کے نفع نقصان کو اپنا نفع نقصان سمجھنے لگا، ان کی دشمنی محبت میں بدل گئی، اللہ نے ان کے درمیان اتفاق واتحاد پیدا فرمایا، اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے "سورۂ آل عمران" میں اسی طرح بیان فرمایا ہے "وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا" تم تو دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ایمان کی برکت سے تمہیں اس گڑھے میں گرنے سے بچالیا۔

نا سمجھ ٹھہر نہیں سکتے

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ

اے پیغمبر ترغیب دے مؤمنوں کو پر لڑائی اگر ہوں میں سے تم

عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ

بیس (۲۰) جم کر لڑنے والے غالب آئیں وہ پر دو سو (۲۰۰) اور اگر ہوں میں سے تم سو (۱۰۰)

يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾

غالب آئیں وہ ہزار پر میں سے ان لوگوں پر جو کافر ہوئے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ نہیں سمجھ رکھتے (٦٥)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے پیغمبر! مسلمانوں کو لڑائی کا شوق دلا اگر تم میں سے بیس (۲۰) شخص ثابت قدم رہنے والے ہوں تو دو سو (۲۰۰) پر غالب ہوں اور اگر تم میں سے سو (۱۰۰) شخص ہوں تو ہزار (۱۰۰۰) کافروں پر غالب ہوں اس واسطے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ (٦٥)

لفظی تحقیق: حَرِّضِ: ابھارنا، شوق دلانا۔ امر کا صیغہ ہے اور تحریض سے بنا ہے تحریض کا مادہ حرض ہے، جس کے معنی ہیں: رغبت دلانا، ابھارنا۔

تفسیر

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ جس وقت لوگ اتنے ہٹ دھرم ہو جائیں کہ لوگوں کو صرف اپنے ہی طریقہ پر زبردستی چلانا چاہیں اور ان کو سچی اور صحیح بات کے تلاش کرنے اور ہاتھ آجانے کے بعد اس کے ماننے کا موقعہ دینے کے لیے تیار نہ ہوں اور اپنی ضد سے کسی طرح باز نہ آئیں، بلکہ سچ مچ حق تلاش کرنے والوں کو پریشان کریں اور اس کے ماننے والوں کے ستانے پر کمر باندھ لیں تو پھر مسلمانوں کو لڑائی کے بغیر چارہ نہیں وہ اس وقت تک لڑیں گے جب تک کہ دین کے اختیار کرنے کی آزادی نہ حاصل ہو جائے اور فسادی اپنے شر سے باز نہ آجائیں، پچھلی آیت میں اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ جو لوگ ظالموں سے لڑنے کے لیے دل و جان سے تیار ہو جائیں گے اللہ ان کی مدد کرے گا، اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اس وقت یہی موقعہ ہے کہ دشمن تمہیں ناحق ستانے پر تلے ہوئے ہیں اور شرارت سے کسی طرح باز نہیں آتے؛ اس لیے تمہیں لڑنے کے لیے بالکل تیار رہنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قاعدہ ہے کہ وہ انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی کوشش شروع کر دیں۔

ارشاد ہے کہ: اے پیغمبر! ان ایمان والوں سے کہہ دیں کہ اگر تباہی سے بچنا ہے تو لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، کیونکہ اس میں سراسر فائدہ ہے اگر مر گئے تو شہید اور جیت گئے تو غازی اور فاتح؛ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ تم بزدلی کرو، اگر دشمن تم سے دس گنا بھی ہوں تو بھی ان سے ڈٹ کر مقابلہ کرو، کیونکہ تم سمجھ بوجھ کر ایک اعلیٰ مقصد کے لیے لڑ رہے ہو اور ان لوگوں کا کوئی مقصد نہیں ہے، صرف اس لیے لڑ رہے ہیں کہ ان کی سرداری بنی رہے یہ نادانی کی کھلی علامت ہے، اس قدر گھٹیا مقصد والے بلند ترین مقصد رکھنے والوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے۔

مسلمان ایک واضح نظریہ رکھتے ہیں ان کے پاس ایمان کی دولت ہے، انہیں بصیرت حاصل ہے؛ اس

لیے وہ جانتے ہیں کہ اگر انہیں کافروں کے مقابلے میں شکست بھی ہوگئی تو کوئی بات نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو انہیں لازماً کامیابی حاصل ہوگی، اس کے برخلاف کافروں کے پاس کوئی نظریہ نہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں اندھا دھند کرتے جاتے ہیں ان کے پاس کوئی اعلیٰ مقصد نہیں ہوتا، بصیرت والوں کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کھجوریں کھاتا ہوا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کیا، اے اللہ کے پیغمبر! اگر جہاد میں شریک ہوکر مارا جاؤں تو کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: تم ہمیشہ کے لیے کامیاب ہو جاؤ گے، اس شخص نے اس وقت کھجوریں ہاتھ سے پھینک دیں، تلوار کی میان توڑ ڈالی اور جہاد میں شریک ہونے کے لیے چل پڑا، کہنے لگا اتنی کم عمر گھوم پھر کر فضول گنوا دی، یہ سمجھ کی بات تھی جو اس کے ذہن میں آگئی اور ایکدم اس کی کایا پلٹ گئی، مقصد یہ کہ کافر کی طاقت اندھا دھند استعمال ہوتی ہے وہ تو قیامت اور آخرت پر یقین ہی نہیں رکھتے اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا عقیدہ رکھتے ہیں؛ اس لیے فرمایا کہ: یہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔

مصر کی جنگ کے دوران مسلمانوں نے ایک قلعہ کو گھیرے میں لیا ہوا تھا، مگر وہ فتح ہونے کو نہ آتا تھا، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کہنے لگے میں اپنی قربانی پیش کرتا ہوں، ساتھیوں سے کہا کہ مجھے ٹوکرے میں ڈال کر کسی طرح قلعے کے اندر اتار دو اور تم باہر دروازہ کھلنے کے انتظار میں رہو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا کہ آپ کو ٹوکرے میں ڈال کر کسی طرح قلعے کے اندر پھینک دیا گیا، آپ نے اندر جاتے ہی تلوار چلانا شروع کر دی ابھی اندھیرا تھا کافر سمجھے کہ مسلمانوں کی فوج قلعے میں داخل ہوگئی ہے، لہٰذا ان میں افراتفری پھیل گئی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ لڑتے لڑتے قلعے کے دروازے تک پہنچ گئے اور پھر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا مسلمانوں کا لشکر باہر انتظار میں کھڑا تھا فوراً اندر داخل ہوگیا اور اس طرح یہ قلعہ فتح ہوگیا، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کا یہ کارنامہ پوری سمجھ کے ساتھ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اس جنگ میں اگر ان کی جان بھی چلی جائے تو یہ بھی کامیابی ہے اور آخرت میں تو بہر حال کامیابی حاصل ہوگی، یرموک کے محاذ پر بھی کافر لاکھوں کی تعداد میں تھے، جب کہ مسلمان چند ہزار تھے مگر وہاں ایمانی قوت اور سمجھ کی وجہ سے کامیابی حاصل ہوئی، ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور آخرت پر

یقین ہے، لہٰذا وہ دشمن کے مقابلے کے لیے بے خوف وخطر کود پڑتے ہیں اور جان کی بازی لگا کر کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔

چوتھی آیت میں اس حکم کو آئندہ کے لیے ختم کر کے اس کی جگہ تمہارے لیے دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ اب اللہ تعالیٰ نے آسانی کا حکم دیدیا اور اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم ہے کہ تمہارے اندر کمزوری ہے، سو! اگر تم میں سے سو آدمی جم کر لڑنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے۔

یہاں بھی مقصد یہ ہے کہ سو مسلمانوں کو دو سو کافروں کے مقابلے سے بھاگنا جائز نہیں، پہلی آیت میں ایک مسلمان کو دس کے مقابلے سے بھاگنے کو ناجائز قرار دیا تھا، اس آیت میں ایک کو دو کے مقابلے سے بھاگنا منع کیا گیا ہے، اور یہی آخری حکم ہے جو ہمیشہ کے لیے ہے۔

یہاں بھی حکم کو حکم کے عنوان سے نہیں بلکہ خبر اور خوش خبری کے انداز سے بیان فرمایا گیا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ ایک مسلمان کو دو کافروں کے مقابلہ پر جمنے کا حکم معاذ اللہ کوئی بے انصافی یا تشدد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان میں اس کے ایمان کی وجہ سے وہ قوت رکھ دی ہے کہ ان میں سے ایک دو کے برابر رہتا ہے۔

مگر دونوں جگہ اس فتح ونصرت کی خوشخبری کو اس شرط کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ یہ مسلمان ثابت قدم رہنے والے ہوں اور ظاہر ہے کہ جنگ کے میدان میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر جمے رہنا اس کا کام ہو سکتا ہے جس کا ایمان مکمل ہو، کیونکہ مکمل ایمان انسان کو شہادت کے شوق کا جذبہ عطا کرتا ہے اور یہ جذبہ اس کی طاقت کو بہت کچھ بڑھا دیتا ہے۔

دوگنوں سے لڑو

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ

اب | بوجھ ہلکا کر دیا | اللہ نے | سے تم | اور جان لیا | کہ | میں تم | کم ہمتی ہے | پس اگر | ہوں

مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ
میں سے تم سو(۱۰۰) ڈٹنے والے بھاری پڑیں گے دوسو(۲۰۰) پر اور اگر ہوں میں سے تم

اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٦٦﴾
ہزار(۱۰۰۰) غالب ہوں گے دوہزار(۲۰۰۰) پر سے حکم اللہ کے اور اللہ ساتھ ہے صبر کرنے والوں کے (٦٦)

بامحاورہ ترجمہ:۔اب اللہ تعالیٰ نے تم پر سے بوجھ ہلکا کردیا اور جانا کہ تم میں سستی ہے، سو! اگر تم میں سو (۱۰۰) شخص ثابت قدم رہنے والے ہوں تو دوسو(۲۰۰) پر غالب ہوں گے اور اگر تم ہزار (۱۰۰۰) ہوں تو وہ دوہزار (۲۰۰۰) پر غالب ہوں گے اللہ کے حکم سے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کیساتھ ہے۔(٦٦)

لفظی تحقیق: صَابِرَةٌ: صبر کرنے والے۔اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے، صبر سے، اس کا مذکر صابر ہے جس کی جمع صابرین ہے، صبر کے معنی ٹھہرنے اور قائم رہنے کے ہیں، مصیبت میں گھبرائے نہیں اور چیخ وپکار نہ مچائے یہ بھی صبر ہے، کسی چیز کے حاصل کرنے میں برابر لگا رہے اور مشکلات کی وجہ سے جی نہ چھوڑے یہ بھی صبر ہے، اچھے کام اور اچھی باتیں ہمیشہ کرتا رہے اور کبھی جان بوجھ کر ناغہ نہ کرے یہ بھی صبر ہے۔

تفسیر

پچھلی آیت میں شکل تو خبر کی تھی مگر اصل میں حکم دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے سے دس گنوں کے مقابلے سے بھاگنا نہ چاہیئے اس وقت مسلمان بڑے پختہ (ایمان والے) اور جوشیلے تھے، ان کو یہ حکم ماننا آسان تھا، چنانچہ انہوں نے مانا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کا صبر حوصلہ دیکھ کر ان کی مدد کی اور ان کی کوششوں کو پروان چڑھایا، اس کے بعد جب زمانہ گذرنے کی وجہ سے یہ پرانے لوگ ضعیف اور کمزور ہوگئے اور نئے لوگوں میں وہ ولولہ اور جوش جو پہلے لوگوں میں تھا کسی قدر کم ہوگیا تو ان کی حالت کی رعایت کرکے پہلے حکم کو ہلکا کردیا گیا، اس آیت میں اسی کا ذکر ہے۔

ارشاد ہے کہ: چونکہ اب پہلے کی نسبت کچھ کمزور ہوگئے ہو اور تمہاری ہمت بھی پہلے جیسی نہیں رہی اس لیے

تمہیں پہلا حکم کچھ بھاری پڑے گا، خیر! اب تمہیں یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ اپنے سے دو گنے لوگوں کے سامنے سے مت بھاگو ان کے سامنے مردانگی سے ڈٹے رہو، تم نے اپنی ہمت دکھائی تو اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی اور تم ہی غالب ہو گے اور فتح پاؤ گے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بعد سے لیکر آج تک یہی حکم قائم ہے اگر دشمن تعداد میں مسلمانوں سے دو گنے ہوں تو مسلمانوں کو ان کے سامنے سے بھاگنا نہ چاہیئے بلکہ ان سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے، اگر ایسا نہ کیا تو گناہ گار ہوں گے، یہ رعایتی حکم ہے لیکن اگر دشمن دو گنے سے بھی زیادہ ہیں اور مسلمان اللہ کی مدد پر اعتماد کر کے اس سے لڑتا ہے تو اس کا درجہ یقیناً زیادہ بلند ہے۔

آخر آیت میں فرمایا: "اِنَّ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ "یعنی: اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہیں ،اس میں جنگ کے میدان میں جم کر لڑنے والے بھی شامل ہیں اور عام شرعی حکموں کی پابندی پر سختی کے ساتھ عمل کرنے والے حضرات بھی، ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ کی حمایت اور مدد کا وعدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ساتھ ہونا ہی ان کی فتح اور کامیابی کا اصلی راز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھی اور مددگار ہوں اس کو ساری دنیا مل کر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔

پہلے دھاک بٹھاؤ

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ

نہیں ہے لیے پیغمبر کے کہ ہوں پاس اسکے قیدی یہاں تک کہ سختی کرے میں زمین

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَ اللّٰهُ

تم چاہتے ہو سامان دنیا کا اور اللہ ارادہ کرتا ہے آخرت کا اور اللہ

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٧﴾

زبردست حکمت والا ہے (٦٧)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پیغمبر کو نہیں چاہیے کہ اپنے پاس قیدیوں کو رکھے جب تک کہ ملک میں خونریزی نہ کرے تم دنیا کا اسباب چاہتے ہو اور اللہ کے ہاں آخرت چاہیے اور اللہ زورآور حکمت والا ہے۔(۶۷)

لفظی تحقیق: اَسْرٰی: قیدی۔ اَسِیْرٌ کی جمع ہے جو صفت کا صیغہ ہے اور اسر سے بنا ہے، اسر کے معنی قید کرنے کے ہیں، اَسِیْرٌ: قیدی۔ یُثْخِنَ: سختی کرے۔ مضارع کا صیغہ ہے اثخان سے جو ثخن سے بنا ہے، ثخن کے معنی ہیں شدت اور سختی اثخان کے معنی ہیں سختی کرنا، یہاں مراد یہ ہے کہ موقعہ ملنے پر پہلے اپنا خوب رعب بٹھانا چاہیے تاکہ فسادی فساد سے باز آجائیں تاکہ اس سے عبرت پکڑیں اور ضد چھوڑ دیں۔

تفسیر

بدر کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے قریش کے ستر (۷۰) بڑے بڑے سردار مارے گئے اور (۷۰) بڑے بڑے آدمی مسلمانوں نے قید کر لیے، اس وقت ان قیدیوں کے حوالے سے یہ سوال سامنے آیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، مال لے کر چھوڑ دیا جائے یا قتل کر دیا جائے، اس بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشورہ فرمایا کہ بتاؤ مشورہ ہے؟ زیادہ تر رائے اس طرف تھی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے لیکن حضرت عمر اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کی رائے یہ تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں کو بہت ستا چکے ہیں، زندہ چھوڑ دیا جائے تو پھر کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کریں گے، لیکن اکثر نے ان کا قتل کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ ممکن ہے کے بعد میں ان میں سے کوئی مسلمان ہو جائے، بعض نے نرم دلی کی وجہ سے فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا مشورہ دیا، اور بعض نے کہا کہ اس وقت مسلمانوں کو مال کی زیادہ ضرورت ہے، لہٰذا ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ: ہر ایک کو اس کی جان کے بدلے میں مال لے کر چھوڑ دیا جائے، چنانچہ اسی فیصلے پر عمل کیا گیا، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو دوسری بات زیادہ پسند تھی، یعنی: ان کو فدیہ لے کر چھوڑنے کی بجائے قتل کیا جائے؛ اس لیے یہ آیت اتری اور اس کاروائی کے غلط ہونے سے آگاہ کیا گیا۔

بدر کی پہلی جنگ تھی، سیاسی مصلحت کا تقاضہ یہ تھا کہ ایسے اذیت پہنچانے والے دشمنوں کو قتل کیا جائے تاکہ اس سے آئندہ کوئی فسادی دنیا میں امن وامان میں خلل نہ ڈال سکے اور کہا گیا ہے مال و دولت ہاتھ لگنے سے فقط تھوڑا سا وقتی فائدہ ہوسکتا ہے لیکن ان کے چھوڑ دینے کا انجام اچھا نہیں، چنانچہ گو کچھ ان میں سے مسلمان ہو گئے، لیکن ان میں سے زیادہ تر قیدیوں نے دوسرے سال پھر حملہ کیا اور مسلمانوں کے ستر (۷۰) صحابہ کرام شہید ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے مسلمانوں کو کھلی شکست سے بچالیا ورنہ مٹنے میں کچھ کسر نہ رہی تھی۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ بدر کی جنگ میں کافروں کے ستر بڑے بڑے آدمی مارے گئے اور اسی طرح ستر زندہ پکڑ لیے گئے، جب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ ان قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے تو اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آزمانا چاہا، چنانچہ جبرائیل علیہ السلام نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر کہا کہ اس معاملہ میں آپ اپنے ساتھیوں کو اختیار دیدیں کہ وہ چاہیں تو ان قیدیوں کو قتل کر دیں یا ان سے فدیہ لے کر آزاد کر دیں، جبرائیل علیہ السلام نے واضح کر دیا تھا کہ اگر مسلمان فدیہ لینا پسند کریں تو اس کے ساتھ شرط یہ ہوگی کہ آئندہ جنگ میں اتنی ہی تعداد میں مسلمان بھی شہید ہوں گے، غرضیکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دو میں سے کوئی ایک صورت کرنے کی دعوت دیدی، حضرت ابوبکر صدیق اور ان کے ساتھ زیادہ تر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہ رائے تھی کہ قیدیوں میں سے اکثر ہمارے رشتہ دار ہیں، امید ہے کہ یہ لوگ ضرور ایمان لے آئینگے، لہٰذا ان کو قتل کرنے کے بجائے ان سے فدیہ وصول کر کے چھوڑ دیا جائے، اس طرح مسلمانوں کی مالی حالت بھی بہتر ہو جائے گی، تاہم حضرت عبداللہ بن رواحہ، سعد بن معاذ اور بعض دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا کہنا یہ تھا کہ ان لوگوں نے ہم پر بڑے ظلم کیے ہیں اب اللہ تعالیٰ نے ان پر ہمیں غلبہ عطا فرمایا ہے تو ان کو ختم کر دینا ہی بہتر ہے تاکہ ان کا زور ٹوٹ جائے اور ہر طرف سے مسلمانوں کو رُعب اور دبدبہ چھا جائے، ان حضرات نے یہ مشورہ بھی دیا کہ کسی مناسب وادی میں بہت سی لکڑیاں اکٹھی کر کے ان قیدیوں کو زندہ جلا دیا جائے، بہرحال صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک بڑی تعداد فدیہ کے حق میں تھی، اور خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جھکاؤ بھی اسی طرف تھا۔

آخر کار چونکہ زیادہ صحابہ کرام کا مشورہ فدیہ لے کر چھوڑنے کے حق میں تھا؛ اس لیے رائے کے مطابق فیصلہ کیا گیا، لیکن اللہ تعالیٰ کو اس فیصلہ کی بجائے دوسری بات زیادہ پسند تھی؛ اس لیے ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب نازل ہوا، ارشاد ہوتا ہے کہ: "مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ" پیغمبر کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ اس کے لیے قیدی ہوں یہاں تک کہ زمین میں خون بہائے، "اثخان" کا معنی ہے قوت کے ساتھ خون بہانا، اور مطلب یہی ہے کہ کافروں کو قیدی بنانے کی بجائے ان کو قتل کر دینا بہتر تھا، ان آیتوں کے اترنے پر خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی پریشان ہوئے کہ انہوں نے ایسی صورت اختیار کی جو اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ بہتر نہیں تھی، لیکن پھر بھی ایسا کرنا چونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت میں پہلے سے لکھا جا چکا تھا؛ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس لغزش کو معاف فرما دیا۔

مفسرین اور فقہائے کرام بیان کرتے ہیں کہ یہ عتاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی طرف سے زیادہ اچھی صورت اختیار نہ کرنے کی وجہ سے آیا، اس قسم کے اختیاری واقعات پہلے بھی پیش آچکے تھے جن میں بہتر طریقہ اختیار کیا گیا تھا اور اگر اس موقعہ پر بھی بہتر صورت اختیار کی جاتی تو مذکورہ عتاب نہ آتا، اس قسم کے واقعات میں سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج کا واقعہ بھی ہے کہ جب آپ کے سامنے دودھ اور شراب کے دو پیالے پیش کیے گئے اور کوئی ایک پیالہ لینے کا اختیار دیا گیا، اس موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بہتر صورت اختیار کرتے ہوئے دودھ کا پیالہ پسند فرمایا، ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ اگر آپ شراب کا پیالہ پسند فرماتے تو آپ کی امت گمراہ ہوتی۔

تنبیہ!

"سورۂ انفال" کی آیت نمبر ۶۷ میں صاف الفاظ میں کافروں کو قیدی بنانے کی ممانعت نہیں کی گئی، البتہ کہا گیا کہ پیغمبر کی شان نہیں کہ ان کے قبضے میں قیدی ہوں جب تک کہ خوب خون ریزی نہ کر لیں، گویا کہ پوشیدہ طور پر کافروں کی خوب خون ریزی کر لینے سے پہلے ان کو قیدی بنانے سے منع کر دیا گیا ہے آگے "سورۂ محمد" کی آیت نمبر ۴ میں فرمایا گیا ہے کہ: جب تم ان کی خوب خون ریزی کر لو پھر اس کے بعد کافروں کو پکڑو اور جکڑو اور

سخت طریقے سے باندھو اور قیدی بنالو پھر اس کے بعد دو باتوں میں سے کسی ایک کا اختیار دیا گیا ہے کہ چاہو تو ان پر احسان کرتے ہوئے مفت میں رہا کر دو یا چاہو تو فدیہ لے کر چھوڑ دو ان دونوں آیت کے مضامین میں کوئی فرق نہیں، البتہ دونوں آیتوں کے اترنے کے وقت حالات مختلف تھے، چنانچہ جب ”سورۂ انفال“ کی آیت اتری تھی اس وقت کافروں کی خوب خون ریزی نہیں ہوئی تھی، اس وجہ سے اس وقت قیدی بنانا اور ان کو فدیہ لے کر چھوڑنے پر عتاب ہوا تھا لیکن جب کافروں کی خوب خون ریزی ہو چکی تو ”سورۂ محمد“ کی آیت سے قیدی بنانے کا حکم بھی دیدیا گیا اور پھر ان کو فدیہ لے کر یا مفت میں چھوڑنے کا اختیار بھی دیدیا گیا؛ اس لیے کہ اب چاروں طرف مسلمانوں کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔

مال کی حرص باعث عذاب ہے

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ

اگر نہ ہوتا لکھا ہوا طرف سے اللہ کا جو پہلے ہی لکھا جا چکا البتہ پہنچ چکا تم کو میں اس جو لیا تم نے عذاب

عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ

بڑا (۶۸) پس کھاؤ میں اس جو تم نے لے لیا حلال پاکیزہ اور ڈرتے رہو اللہ سے

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾ ع ۹ ۵

تحقیق اللہ بخشنے والا مہربان ہے (۶۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اگر ایک بات جس کو اللہ تعالیٰ پہلے نہ لکھ چکا ہوتا تو تم کو اس کے لینے میں بڑا عذاب پہنچتا۔(۶۸) سو کھاؤ! جو تم کو غنیمت میں ملا حلال پاکیزہ اور اللہ سے ڈرتے رہو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔(۶۹)

تفسیر

اس سے پہلے کہا گیا کہ مسلمانوں کو دنیا کے عارضی فائدہ کا خیال نہ کرنا چاہیئے بلکہ ہر کام کرنے سے پہلے

اس کا انجام سوچنا چاہیے مکہ کے لوگ اسلام کے مقابلے میں جیت جاتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اسلام والے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے، جس کا عملی نتیجہ ہوتا کہ جس کا جی چاہتا ظاہری قوت، مال و دولت، جنگی سامان اور چیلے چاٹے جمع کر کے دوسروں کو زبردستی اپنی ڈگر پر چلانے کا شیوہ اختیار کرتا اور دنیا سے امن و امان ختم ہو جاتا، بس! یہی ایک کام رہ جاتا کہ ہر ایک دوسروں کی دھن میں لگا رہے اور دوسروں کو اپنا تابع بنا کر رکھے، اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اس موقعہ پر قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا اتنی بڑی غلطی تھی کہ اس کی وجہ سے تم پر بڑا سخت عذاب آ سکتا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں اور باغیوں پر رعایت کرنا لازمی طور پر عذاب کا سبب ہے، اگر عذاب نہیں آیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے کچھ فیصلہ فرما چکے ہیں اور وہ اس وقت عذاب کے آڑے آ رہے ہیں، وہ فیصلے یہ ہیں:

(۱)۔۔۔۔ کافر قیدیوں کی رعایت جان بوجھ کر نہیں کی گئی کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے صاف حکم کوئی نہیں دیا تھا کہ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا منع ہے؛ اس لیے یہ اجتہادی غلطی ہے اور اجتہادی غلطی پر عذاب نہیں۔

(۲)۔۔۔۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں عذاب نہیں آئے گا۔

(۳)۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والوں پر عذاب نہیں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کی اس ڈانٹ سے مسلمان بڑے خوفزدہ ہو گئے اور سمجھے کہ اس مال کو ہاتھ نہ لگانا چاہیے؛ اس لیے آگے ارشاد ہوا کہ یہ غلطی جان بوجھ کر نہ تھی اس لیے معاف کر دی گئی، جو مال تم لے چکے ہو وہ تمہارے لیے پاکیزہ اور حلال ہے اس کو اپنے کام میں لاؤ اور آئندہ تقویٰ کو اختیار کرو اور اللہ کے غضب سے ڈرتے رہو، نادانی سے جو غلطی ہو جائے اس کے لیے مغفرت طلب کرو اور اللہ کی رحمت کے امیدوار رہو اور یقین رکھو کہ اللہ توبہ و استغفار کرنے والوں کی خطائیں معاف کر دیتے ہیں اور اپنے فرمانبرداروں کو اپنے رحم و کرم سے نوازتے ہیں۔

مغفرت کا وعدہ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ

اے پیغمبر! کہہ دیجئے سے ان جو میں ہیں ہاتھوں تمہارے سے قیدیوں میں اگر معلوم ہوئی

اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَ

اللہ کو میں دلوں تمہارے بہتری تو دے گا تم کو بہتر اس سے جو لے لیا گیا سے تم اور

يَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷۰ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ

بخش دے گا تمہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے(۷۰) اور اگر ارادہ کیا انہوں نے دغا کا آپ سے

فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱

تو بیشک دغا کر چکے اللہ سے سے پہلے اس پس قابو دے دیا پر ان اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے(۷۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے پیغمبر! جو آپ کے ہاتھ میں قیدی آئیں ان سے کہہ دیں اگر اللہ تمہارے دل میں کچھ نیکی جانے گا تو تم کو اس سے جو چھن گیا بہتر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۷۰) اور اگر وہ آپ سے دغا کرنا چاہیں گے تو وہ اللہ سے اس سے پہلے دغا کر چکے ہیں، پھر اس نے ان کو پکڑوا دیا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔(۷۱)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اے پیغمبر مسلمانوں نے جو بدر کی جنگ میں قیدی پکڑے ہیں اور جن میں سے کچھ اسلام میں داخل ہونا چاہتے ہیں ان سے کہہ دیجیے کہ اس وقت تو تمہیں مال دے کر ہی چھٹکارا مل سکتا ہے اس وقت تمہارے اسلام کی حقیقت معلوم کرنے کا موقعہ نہیں ہے تم مال داخل کرو اور اپنے گھر جاؤ اس کے بعد اللہ تمہیں پرکھے گا، اگر تم واقعی سچے دل سے اسلام میں داخل ہو گئے اور تمہاری نیتیں صاف نظر آئیں تو اللہ تمہیں اتنا کچھ

دے گا جس کے مقابلے میں یہ مال جو تم اب جان بچانے کے لیے دے رہے ہو کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور ساتھ ہی تمہاری پچھلی خطائیں اور گزشتہ گناہ معاف کر دے گا کیوں کہ اللہ تعالیٰ غفور بھی ہے اور رحیم بھی اور اسے بخشتے دیر نہیں لگتی، اور اگر اے پیغمبر ان کے دل میں کھوٹ ہے اور وہ آپ کو دھوکا دے کر اس وقت اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، وہ اس لیے کہ اس سے پہلے اللہ کو دھوکا دے چکے ہیں اور اس قول وقرار سے پھر چکے ہیں، جو ان کی روحوں نے عالم ارواح میں کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کو اپنا رب ماننے سے انکار کر دیا، اور کفر وشرک میں مبتلا ہو گئے، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی بات جانتا ہے اور اس کو ہر ایک کے ساتھ معاملہ کرنے کا ڈھنگ معلوم ہے وہ ان سے نبٹ لے گا اللہ کا یہ وعدہ پورا ہوا جو ان میں سے مسلمان ہوئے ان کی اولاد نے دنیا میں بادشاہت کی اور جو نہ ہوئے وہ خراب اور تباہ ہوئے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: ہر قیدی کا فدیہ چار سو دینار مقرر ہوا، قیدیوں کے رشتہ داروں نے انہیں چھڑانے کی کوشش کی جس قیدی کا فدیہ وصول ہو جاتا اسے چھوڑ دیا جاتا، بعض قیدیوں کے رشتہ دار مالی اعتبار سے کمزور تھے وہ ان کا فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے ان میں سے جو پڑھے لکھے تھے ان کو کہا گیا کہ وہ اتنے آدمیوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں تو یہی ان کا فدیہ ہوگا، چنانچہ بعض قیدی اس شرط پر بھی رہا کیے گئے تاہم قیدیوں کی اکثریت نے فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بھی جنگی قیدیوں میں شامل تھے، اگر چہ وہ دل سے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے مگر ابو جہل کے مجبور کرنے پر کافروں کے لشکر میں شریک ہو کر قیدی بنے، قیدیوں میں حضرت علی کے بھائی عقیل اور حضرت عباس کے دوسرے بھتیجے حارث بن نوفل بھی شامل تھے۔

حضرت عباس مالدار تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ: اپنے علاوہ دونوں بھتیجوں کا فدیہ بھی تم ہی ادا کرو انہوں نے کہا کہ میرے پاس تو فدیہ کے لیے کوئی مال نہیں، لہٰذا میں مجبور ہوں، اس دوران میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی اطلاع دی کہ مکے سے چلتے وقت حضرت عباس نے اپنی بیوی ام فضل کو کچھ مال

دیا تھا جو زمین میں دبا دیا گیا، آپ کی وصیت یہ تھی کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی حادثہ پیش آجائے تو اس صورت میں یہ مال میرے بچوں کے کام آئیگا اس واقعہ کا علم حضرت عباس اور ان کے بیوی کے سوا کسی کو نہ تھا جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کا راز حضرت عباس پر کھول دیا تو آپ نے اسی وقت کھلے دل سے مسلمان ہونے کا اقرار کرلیا، کہنے لگے کہ آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں کیونکہ اس راز کو میرے اور میری بیوی کے سوا کوئی تیسرا شخص نہیں جانتا تھا مگر آپ نے اس کی پوری خبر دیدی۔

بہر حال حضرت عباس اور بعض قیدیوں نے ایک تو مالی مجبوری ظاہر کی اور دوسرا اپنے مسلمان ہونے اقرار بھی کیا، اس کے ساتھ یہ بھی التماس کیا کہ ان سے فائدہ نہ لیا جائے، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى" "اے پیغمبر! اس وقت جو قیدی آپ کے ہاتھوں میں ہیں ان سے کہہ دیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں کچھ نیکی جانے گا تو تم کو اس شے جو چھن گیا ہے بہتر عطا فرمائیں گے، یعنی: اے پیغمبر! ان قیدیوں میں سے جو مسلمان ہوگئے ان سے کہہ دیں کہ اگر تم نے اسلام قبول کرلیا اور اخلاص کے ساتھ مؤمن ہوگئے تو کچھ مال فدیہ میں خرچ کیا ہے اس سے بہتر اللہ تعالیٰ تم کو عطا فرمائیں گے۔

احکام ومسائل

بدر کی جنگ کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا اسلام اور مسلمانوں کے وہ دشمن جنہوں نے ان کے ستانے، مارنے قتل کرنے میں کسی وقت بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور جب موقع مل گیا بے انتہا ظلم وزیادتی کی، مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہوجانے کے بعد ان کی جان بخشی کر دینا کوئی معمولی بات نہ تھی ان کے لیے بڑی غنیمت اور اعلیٰ درجے کی مہربانی تھی، فدیہ میں جو رقم ان سے لی گئی وہ بھی انتہائی معمولی تھی۔

اللہ تعالیٰ کی مہربانی دیکھئے کہ اس معمولی رقم کے دینے سے جو ایک قسم کی تکلیف ان کو پیش آئی اس کو بھی کس طرح دور فرمادیا، گذشتہ آیت میں ارشاد ہے کہ: اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں کوئی خیر پائیں تو جو کچھ تم

سے لیا گیا ہے اس سے تمہیں بہتر دیدیں گے، اور اس پر مزید یہ کہ تمہارے پچھلے گناہ بخش دیں گے، "خیر" سے مراد ایمان اور اخلاص ہے مطلب یہ ہے کہ آزاد ہونے کے بعد ان قیدیوں میں جو لوگ ایمان و اسلام کو اخلاص کے ساتھ اختیار کر لیں گے تو جو کچھ فدیہ میں دیا ہے اس سے زیادہ بہتر ان کو مل جائے گا، قیدیوں کو آزاد و خود مختار کر دینے کے ساتھ اس طرح دعوت دی گئی کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے نفع نقصان پر غور کریں، چنانچہ واقعات اس بات کے گواہ ہیں کہ ان لوگوں میں سے جو مسلمان ہو گئے اللہ تعالیٰ نے ان کی بخشش اور جنت کے وعدہ کے علاوہ دنیا میں بھی ان کو اتنا مال و دولت دے دیا جو ان کے فدیہ سے بہت زیادہ تھا۔

اکثر مفسرین کرام نے فرمایا کہ: یہ آیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتری تھی کیونکہ وہ بھی بدر کے قیدیوں میں شامل تھے اور ان سے بھی فدیہ لیا گیا تھا، ان کی خصوصیت اس معاملہ میں یہ تھی کہ بدر کی جنگ میں یہ مکہ سے اپنے ساتھ تقریباً سات سو گنی سونا لے کر چلے تھے تا کہ وہ کافروں کے لشکر پر خرچ کیا جائے اور ابھی یہ خرچ ہونے نہیں پایا تھا کہ وہ اس سانے سمیت گرفتار کر لیے گئے۔

جب فدیہ دینے کا وقت آیا تو انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے ساتھ جو سونا تھا اس کو میرے فدیہ کی رقم میں لگا لیا جائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جو مال آپ کفر کی امداد کے لیے لائے تھے وہ تو مسلمانوں کو غنیمت کا مال بن گیا، فدیہ اس کے علاوہ ہونا چاہیئے، اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ: اپنے دو بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ بھی آپ ادا کریں، عباس نے عرض کیا کہ اگر اتنا مالی بوجھ مجھ پر ڈالا گیا مجھے قریش سے بھیک مانگنا پڑے گی، میں بالکل فقیر ہو جاؤں گا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں کیا آپ کے پاس وہ مال موجود نہیں جو مکہ سے روانگی کے وقت آپ نے اپنی زوجہ ام فضل کے حوالہ کیا ہے حضرت عباس نے پوچھا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا جب کہ وہ میں نے رات کی تاریکی اور تنہائی میں اپنی بیوی کے حوالہ کیا تھا، اور کوئی تیسرا آدمی اس سے واقف نہیں تھا، آپ نے فرمایا کہ: مجھے میرے رب نے اس کی پوری تفصیل بتلادی، حضرت عباس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دل سے عقیدت مند تھے مگر کچھ شبہات تھے جو اللہ تعالیٰ نے اس وقت دور فرما دیا اور وہ درحقیقت اسی وقت مسلمان ہو گئے مگر بہت سارو پیہ مکہ کے قریش کے ذمہ قرض تھا، اگر یہ اسی وقت اپنے مسلمان

ہونے کا اعلان کر دیتے تو وہ سارا روپیہ مارا جاتا؛ اس لیے اعلان نہیں کیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی سے اظہار نہیں کیا، مکہ مکرمہ فتح ہونے سے پہلے انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آجائیں مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہی مشورہ دیا کہ ابھی ہجرت نہ کریں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی گفتگو پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھلی آیت میں جو وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا تھا وہ بھی ان کو بتلا دیا کہ اگر آپ نے اسلام قبول کر لیا اور اخلاص کے ساتھ مؤمن ہو گئے تو جو کچھ فدیہ میں خرچ کیا ہے اس سے بہتر اللہ تعالیٰ آپ کو عطا فرمائیں گے، چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنے مسلمان ہونے کو ظاہر کرنے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ میں تو اس وعدہ کا پورا ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، کیونکہ مجھ سے بیس اوقیہ سونا فدیہ میں لیا گیا تھا (ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے اور ایک درہم کا وزن تین ماشہ 1/5-1 رتی کا ہوتا ہے) اسوقت میرے بیس غلام مختلف جگہوں میں تجارت کا کاروبار کر رہے ہیں اور کسی کا کاروبار بیس درہم سے کم کا نہیں ہے اور اس پر مزید یہ انعام ہے کہ مجھے حاجیوں کو زمزم کا پانی پلانے کی خدمت مل گئی ہے جو میرے نزدیک ایسا قیمتی کام ہے کہ سارے مکہ والوں کے مال و دولت بھی اس کے مقابلے میں میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

یہاں تک کافروں کے ساتھ جنگ اور ان کے قید کرنے آزاد کرنے اور ان سے صلح کرنے اور فدیہ لے کر چھوڑنے کے حکموں کا بیان ہو رہا تھا، اگلی آیتوں میں سورت کے آخر تک اسی سلسلہ کی ایک خاص بات کا ذکر ہے اور اس کے حکموں کی کچھ تفصیل کا ذکر ہے اور وہ ہجرت کے احکام ہیں، کیونکہ کافروں کے ساتھ مقابلہ میں کبھی ایسے حالات بھی پیش آسکتے ہیں کہ نہ مسلمانوں کو ان کے مقابلے پر جنگ کی طاقت ہے اور نہ وہ صلح پر راضی ہیں ایسی کمزوری کی حالت میں اسلام اور مسلمانوں کی نجات کی راہ ہجرت ہے کہ اپنے شہر اور ملک کو چھوڑ کر کسی دوسری زمین میں جا کر جہاں اسلام کے حکموں پر آزادی کے ساتھ عمل ہو سکے۔

اسلامی برادری

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ

تحقیق وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا سے مالوں اپنے اور سے جانوں

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ

میں راستے اللہ کے اور جن لوگوں نے ٹھکانا دیا اور مدد کی وہ سب لوگ ایک ان میں سے

اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ

دوست ہیں دوسرے کے

بامحاورہ ترجمہ:۔ جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑا اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے جگہ دی اور مدد کی وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔

لفظی تحقیق: اٰوَوْا: ٹھکانہ دیا۔ ماضی کا صیغہ ہے جس کا مادہ: ا، و، ی ہے، جس سے بنا ہو لفظ ماوٰی مشہور ہے، ماوٰی ٹھکانے کو کہتے ہیں، ایواء: کے معنی ہیں کسی کو ٹھکانہ دینا، رہنے کی جگہ دینا۔

تفسیر

مسلمان اس وقت دو جگہ بٹے ہوئے تھے، کچھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ ہجرت کر کے چلے آئے تھے، اور کچھ ابھی مکہ میں ہی تھے اور مکہ کے کافروں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے، آیت کے اس حصہ میں ان کے تعلقات کا ذکر ہے جو مدینہ کے مسلمانوں کے اندر آپس میں ہونے چاہئیں۔

ارشاد ہے کہ: جن لوگوں نے ایمان لا کر ہجرت بھی کر لی اور گھر چھوڑ کر مدینہ چلے آئے اور اپنا مال اور جانیں دونوں اللہ کی راہ میں وقف کر دیں اور وہ لوگ جنھوں نے مدینہ میں ان کو جگہ دی اور ان کے رہنے کا سامان کر دیا یہ دونوں ایک دوسرے کے دوست اور ساتھی ہیں، پہلے لوگ مہاجر ہیں جو مکہ سے مدینے کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ چلے آئے، دوسرے لوگ مدینے کے اصل باشندے ہیں جو انصار کہلائے۔

مہاجرین اور انصار اسلام کے ابتدائی اور مرکزی گروہ ہیں، ان کی وجہ سے دنیا میں اسلام کو ترقی حاصل ہوئی، انہوں نے بے شمار قربانیاں دیں تھیں، اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کی تعریف بیان فرمائی ہے کہ: بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، ایمان تو بنیادی حقیقت ہے اور بعض اوقات ہجرت بھی ضروری ہوجاتی ہے، ان لوگوں نے مکے میں بڑی تکلیفیں سہی ہیں، اور بالآخر ہجرت پر مجبور ہوئے اس سے پہلے کچھ لوگ حبشہ کی طرف بھی ہجرت کر گئے تھے اس کے بعد ان حضرات نے مدینہ کی طرف ہجرت کی، جس کے لیے ان کو ہر چیز قربان کرنا پڑی تو فرمایا: جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا اور اس سلسلہ میں ذرا بھی سوچ وبچار میں نہیں پڑے، ان کے علاوہ مدینے کے وہ انصار بھی ہیں جنہوں نے مہاجرین کو ٹھکانہ مہیا کیا اور ان کی مدد کی، جب مہاجرین ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو مدینہ کے انصار نے ان کی ہر طرح سے مدد کی، ان کو اپنے مکانات میں جگہ فراہم کی، اور ان کو اپنے باغات اور کاروبار میں شریک یا، یہاں تک کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک انصاری اور ایک ایک مہاجر کو ایک دوسرے کا بھائی بنادیا، بھائی چارے کا یہ سلسلہ اتنا گہرا تھا کہ اگر ایک بھائی فوت ہوجاتا تو دوسرا اس کا وارث بن گیا، "سورۂ حشر" میں اللہ تعالیٰ نے انصار کی اس طرح تعریف بیان فرمائی ہے "وَ الَّذِیْنَ تَبَوَّءُ الدَّارَ وَ الْاِیْمَانَ" جن لوگوں نے مہاجرین کو اپنے گھروں میں اور ایمان کو اپنے دلوں میں جگہ دی مدینے پہنچنے کے بعد ان مہاجرین کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کو فقراء کہا "لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ" (الحشر)، مگر انصار نے انہیں اپنے گھر پیش کردیئے، بعض ان میں سے بڑے دولت مند تھے مگر مہاجر ہوکر آئے تو بالکل مفلس اور غریب تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں انصار کے ذریعہ ٹھکانہ عطا کیا، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جیسے بڑے بڑے تاجر بھی تھے جو خالی ہاتھ ہوچکے تھے، آپ نے لوگوں سے کہا کہ مجھے بازار کا راستہ بتاؤ میں محنت کر کے اپنی روزی تلاش کروں گا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے کاروبار

میں اتنی برکت ڈالی ان کو اتنا مالدار کیا کہ تیس ہزار غلام رزق حلال سے خرید کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں آزاد کیے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو باغات، مکان اور زمین بھی دی اور پھر آپ نے دل کھول کر غریبوں اور مسکینوں کو مالی امداد فراہم کی، حالانکہ آپ خود ایک دن مسکین بن کر مدینہ میں داخل ہوئے تھے۔

انصار کا لفظ نصرت سے بنا ہے اور چونکہ مدینہ کے مسلمانوں نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے آنے والے بھائیوں کی ہر طرح سے نصرت کی تھی؛ اسی لیے ان کو انصار کہا جاتا ہے، ان کی اس ایثار و قربانی کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے: "اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ" ان میں سے بعض لوگ دوسروں کے دوست ہیں، یعنی: مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے حقیقی دوست ہیں۔

جنہوں نے ہجرت نہ کی

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّ لَا يَتِهِمْ

اور جولوگ ایمان لائے اور نہیں ہجرت کی نہیں لیے تمہارے سے اور نہیں رفاقت ان کی

مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ

کوئی چیز یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر مدد طلب کریں وہ تم سے میں دین

فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَ

تم پر ضرور ہے مدد ان کی مگر خلاف اس قوم کے کہ تم میں اور ان میں عہد ہو اور

اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾

اللہ جو تم کرتے ہو دیکھنے والا ہے (۷۲)

بامحاورہ ترجمہ: اور جو ایمان لائے اور گھر نہیں چھوڑا تم کو ان کی رفاقت سے کچھ کام نہیں جب تک وہ گھر نہ چھوڑیں، اور اگر وہ تم سے دین میں مدد چاہیں تو ان کی مدد کرنا تم کو لازم ہے مگر ان لوگوں کے مقابلہ میں کہ تم میں اور ان میں عہد ہو، اور اللہ جو تم کرتے ہو اس کو دیکھتا ہے۔ (۷۲)

تفسیر

اس آیت میں ان مسلمانوں کو ذکر ہے جو ہجرت کر کے مدینہ نہ آسکے بلکہ مکہ ہی میں رہے جہاں کافروں کا زور تھا اور انہی کی بات چلتی تھی، ان کی صلح و جنگ میں مدینہ کے لوگ شامل نہیں، یعنی وہ اگر مصلحتاً مکہ کے کافروں سے کوئی سمجھوتہ کرلیں تو مدینے کے مسلمانوں پر اس کی پابندی لازم نہیں اور نہ وہ ان کے ہاں بیٹھے بیٹھے وارث ہوسکتے ہیں، جب تک ہجرت کر کے مدینہ نہ چلے آئیں۔

ارشاد ہے کہ: جو ایمان والے کسی وجہ سے مکہ میں ہی رہ گئے اور ہجرت کر کے مدینہ نہ آسکے ان کے معاملات میں تمہیں دخل دینے کی ضرورت نہیں، ہاں! اگر دینی باتوں میں انہیں مدد کی ضرورت پڑے مثلاً: کافر انہیں زبردستی مرتد کرنے پر تل جائیں اور ان پر صرف اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں، ظلم وستم کریں اور وہ تنگ آکر تم سے مدد مانگیں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے، لیکن اگر وہ ان لوگوں کے مقابلے میں تمہاری مدد طلب کریں جن سے تمہارا عہد و پیمان پہلے ہی ہو چکا ہے تو جب تک وہ عہد و پیمان کی پابندی کریں اور اس کی شرطوں میں سے کوئی شرط نہ توڑیں، تم ان کے مقابلے میں مکہ کے مسلمانوں کی مدد نہیں کرسکتے اس کا خیال رکھو کہ جو کچھ کرو اس میں اپنا ظاہر و باطن یکساں رکھو اور یہ مت سمجھو کہ اللہ سے کوئی بات چھپائی جاسکتی ہے جو کچھ تم کررہے ہو وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور تمہارے ظاہر اور باطن دونوں سے یکساں واقف ہے۔

صلح حدیبیہ کے وقت ایسا ہی وقعہ پیش آیا جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کے کافروں سے صلح کرلی اور صلح کی شرطوں میں یہ بھی داخل تھا کہ مکہ سے جو شخص اب مدینہ جائے اس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم واپس کردیں، عین صلح کے دوران حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ جن کو مکہ کے کافروں نے طرح طرح کی تکلیفوں میں ڈالا ہوا تھا، ان کی کمر پر گرم پتھر کی سل رکھنے سے جسم کی چربی پگل کر کمر ٹیڑھی ہوگئی تھی، کسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حدیبیہ میں پہنچ گئے اور اپنی مظلومیت کا اظہار کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد مانگی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے تھے ایک مظلوم مسلمان کی فریاد سے کتنا متاثر ہوئے ہوں گے اس کا اندازہ کرنا بھی ہر شخص کے لیے آسان نہیں مگر

اس تأثر کے باوجود مذکورہ آیت کے حکم کے مطابق ان کی مدد سے عذر فرما کر واپس کر دیا۔

ان کی یہ واپسی سبھی مسلمانوں کے لیے انتہائی دلی دکھ کا باعث تھی مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت گویا اس بات کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اب ان پر یہ ظلم و زیادتی زیادہ دیر تک نہیں رہے گی، اور چند دن صبر کا ثواب ابو جندل رضی اللہ عنہ کو اور ملنا تھا، اس کے بعد بہت جلد مکہ مکرمہ فتح ہو کر یہ سارے قصے ختم ہونے والے ہیں، بہر حال قرآن کریم کے اس حکم کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کے ساتھ صلح کے معاہدے کو برقرار رکھا اور معاہدے کے مطابق حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو ان کے حوالہ کر دیا، یہی دین اسلام کی وہ خاص بات ہے جس سے ان کو دنیا میں عزت اور فتح نصیب ہوئی، ورنہ عام طور پر دنیا کی حکومتیں معاہدوں کا ایک کھیل کھیلتی ہیں جس کے ذریعہ کمزور کو دبانا اور قوت والے کو دھوکہ دینا مقصد ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب یہ لوگ کسی بھی وقت اپنا ذرا سا بھی فائدہ دیکھتے ہیں تو الٹی سلٹی باتیں بنا کر معاہدوں کو توڑ ڈالتے ہیں اور خلاف ورزی کا الزام دوسروں کے سر لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان آیتوں میں جتنے حکم بیان کیے جا رہے ہیں یہ فقط اس وقت کے مکہ اور مدینہ والوں کے لیے ہیں کیونکہ ان میں لڑائی محض اس وجہ سے چھڑی تھی کہ مکہ والے مسلمانوں کو بے جا دباتے تھے، یعنی: اس کو نہ مانتے تھے کہ ہر عاقل و بالغ کو اختیار ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر جو دین اختیار کرنا چاہیے اختیار کرے اس آزادی کا انکار فساد کی اصل جڑ ہے اور جب تک یہ جڑ نہ کٹ جائے گی مسلمان ان کے ظلم کے نیچے رہیں گے۔

"وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا" (اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت نہیں کی) بلکہ اپنے وطن میں ہی رہے، ان پر کافروں کا غلبہ تھا اور ہجرت کرنا ان کے بس میں نہ تھا ان کے متعلق فرمایا: "مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا" ان کے ساتھ تمہاری کوئی دوستی نہیں جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں، چونکہ ایسے حالات میں ہجرت فرض عین ہو جاتی ہے، لہٰذا کافروں کے ملک میں رہنے والوں سے اس وقت تک پکی دوستی نہیں ہو سکتی جب تک وہ ہجرت نہ کر جائیں اور دشمن کے غلبے سے آزاد نہ ہو جائیں۔

اس جگہ قرآن کریم نے لفظ ولی اور ولایت استعمال فرمایا، جس کے اصلی معنی دوستی اور گہرے تعلق کے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حسن رحمۃ اللہ علیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، وغیرہ نے فرمایا کہ: اس جگہ ولایت سے مراد وراثت اور والی سے مراد وارث ہے اور بعض حضرات نے ولایت کے لغوی معنی، یعنی: دوستی اور امداد واعانت ہی مراد لیے۔

فساد کو دباؤ

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ

اور | وہ لوگ جو | کافر ہوئے | بعض ان کے | مددگار ہیں | بعض کے | اگر | یوں نہ کروگے تم | یہ تو ہوگا

فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيْرٌ ؕ﴿۷۳﴾

شور وشر | میں | زمین | اور | فساد | بڑا (۷۳)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اگر تم یوں نہ کروگے تو ملک میں فتنہ پھیلے گا اور بڑی خرابی ہوگی۔ (۷۳)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: جو لوگ کفر پر تلے ہوئے ہیں وہ ایک دوسرے کی مدد کے لیے فوراً تیار ہو جاتے ہیں، اگر ایمان والوں نے ایک دوسرے کی مدد نہ کی تو زمین فساد کا اکھاڑہ بن جائے گی اور فساد برپا ہو جائے گا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن کریم مکہ مکرمہ میں اترنا شروع ہوا اور اسی وقت سے اسلام کی ابتدا ہوئی تیرہ سال تک آپ مکہ میں ہی رہے اور اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ مکہ کے لوگوں کو اسلام سکھائیں اور قرآن کریم کی آیتوں کو سنائیں اور اس کے بعد جس کا جی چاہے اسلام قبول کرکے اس کے حکموں کی پیروی کرا اور اپنی زندگی بالکل اس کے حکموں کے مطابق ڈھال لے، مکہ والوں نے آپ کی بات نہ مانی، بلکہ دوسروں کو زبردستی اسلام قبول کرنے سے روکنا شروع کر دیا اور فقط نہ ماننا اسلام میں لڑائی کا سبب نہیں بن سکتا، ان کا کہنا تھا کہ اسلام سچا

مذہب بھی کیوں نہ ہو تب بھی ہم نہ خود مانیں گے اور نہ کسی کو ماننے دیں گے، یہ لڑائی کی ناحق وجہ تھی، لیکن پھر بھی مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے لڑنے کی اجازت نہیں دی گئی، اور فرمایا کہ: صبر کرو! چنانچہ مسلمانوں نے صبر کیا، کچھ وطن چھوڑ کر حبشہ چلے گئے، لیکن کافر اپنی ضد سے باز نہ آئے، ان کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت کر کے مدینہ چلے جانے کا حکم ہوا، مکہ والوں کا پھر بھی وہی رویہ رہا کہ اسلام اچھا ہی سہی لیکن ہم کسی کو اس کے قبول کرنے کی اجازت نہیں دیں گے، آخر مسلمانوں کو لڑنے کی اجازت ہوئی اور کہا گیا کہ کفر تو انہوں نے خیر کیا ہی تھا لیکن دوسروں کو دین اسلام اختیار کرنے سے زبردستی روکنے کے کیا معنی؟ یہ فساد کی جڑ ہے اس کو مٹانا چاہئے، تلوار سونتو جب تک اس فساد کو نہ مٹا ڈالو دوبارہ مت رکھو، ان کو جہاں پاؤ مارو، لوٹو، تباہ کرو کیونکہ یہ لوگ دنیا میں فساد مچاتے ہیں اور انسانیت کو ختم کرنے کے درپے ہیں، اور لوگوں کو اسلام سے زبردستی روک کر اپنی غلط بات منوانا چاہتے ہیں، ان کی کافرانہ ضد کو مٹانا ہے۔

یہاں جتنے حکم کافروں اور مسلمانوں کے بیان ہوئے ہیں ان سے وہ کافر مراد ہیں جو دوسروں کو زبردستی اسلام سے روکنا چاہتے ہیں جو لوگ فسادی نہیں مگر وہ اسلام کو نہیں مانتے ہوں ان سے تعلقات کی صورت اور جگہ بیان ہوئی ہے یہاں نہیں۔

سچے ایماندار

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ

اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کر گئے اور جہاد کیا میں راستے اللہ کے اور جن لوگوں نے

اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ

ٹھکانہ دیا اور مدد کی یہ لوگ وہی ایمان والے ہیں درحقیقت لیے ان کے بخشش ہے

وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۷۴

اور روزی عزت کی (۷۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اپنے گھر چھوڑے اور اللہ کی راہ میں لڑے اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی سچے مسلمان ہیں ان کیلئے بخشش اا ور عزت کی روزی ہے۔(۷۴)

تفسیر

اسلام کے معنی اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں، جس وقت جو حکم ملے اسے فوراً بجالانے والا مسلمان ہے، اس کے دل کی حالت سے ہمیں بحث نہیں جو کوئی اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ماننے والا اور فرمانبردار ہو وہ مسلمان ہے، اس سے یہ بات نکلی کہ جو مسلمانوں کی طرح ہے اور اپنی زندگی کے طور طریق مسلمانوں جیسے رکھے جس سے بظاہر اس میں اور دوسرے مسلمانوں میں فرق محسوس نہ ہو اس کو ہم بھی ظاہری حالت کے مطابق مسلمانوں میں شمار کریں گے، اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں گے، "مسلم" معاشرہ کی ذمہ داری اس پر ہے، دل سے ماننے والے اور اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبری پر پورا یقین رکھنے والے کو مؤمن کہا جاتا ہے، یہ یقین کامل کبھی کسی کو شروع میں ہی نصیب ہو جاتا ہے، لیکن اکثر لوگوں کو اسلام کے اعمال پر چلتے چلتے یقین پر اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کو چند نشانیوں اور علامتوں سے جن کا احادیث میں ذکر ہے پہچان سکتے ہیں، اسی مکمل یقین کو ایمان کہتے ہیں، بعض لوگ ایسے خوش قسمت ہیں کہ جن کے مؤمن ہونے کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، اور ان کے ایمان کی تصدیق کی ہے اس کے علاوہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانے سے بعض لوگوں کا یقینی مؤمن اور جنتی ہونا ثابت ہے، لہٰذا جس میں اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتائی ہوئی ایمان کی علامتیں دیکھیں اس کو ایماندار گمان کر سکتے ہیں اور بس!

اس آیت میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آنے والے مہاجروں اور مدینہ کے رہنے والے انصار کو یقینی طور پر مؤمن کہا گیا ہے کیونکہ مہاجروں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا اور انصار نے ان کو اپنے اندر رہنے کی جگہ دی اور ان کو ہر طرح کی مدد دی۔

جولوگ کہتے ہیں کہ ایمان سب کا ایک سا ہے گھٹتا بڑھتا نہیں، ان کی ایمان سے مراد اسلام ہے جس کا تعلق اعمال سے ہے جو کم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔

مذہب اسلام کی اصل جڑ ایمان ہے، ایمان ہی انسان کو دنیا اور آخرت میں کامیاب کرتا ہے اور پھر ایمان کی حفاظت کے لیے جنہوں نے ہجرت کی اپنے وطن کو چھوڑا، مکان، زمین، کاروبار کو قربان کیا محض ایمان کی سلامتی کی خاطر، جب کسی جگہ ایمان غیر محفوظ ہو جائے، کافر اور مشرکوں کی طرف سے دین کو چھوڑنے کا مطالبہ ہو یا اس کی وجہ سے جان کا خطرہ پیدا ہو جائے تو ایسے موقع پر ایمان والوں کے لیے ہجرت فرض ہو جاتی ہے،" سورۂ نساء" میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے" اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا " کیا اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر کے اپنا ایمان بچا لیتے اور دین کے حکموں پر عمل کر سکتے، جب کسی ملک میں دین کے حکموں پر عمل کرنے میں کافر اور مشرکوں کی طرف سے جگہ جگہ رکاوٹیں ہوں تو پھر ہجرت فرض ہو جاتی ہے اسلام کے شروع زمانے میں مکے میں یہی حالات پیدا ہو چکے تھے، لہٰذا ایمان والوں کو وہاں سے ہجرت کر جانے کا حکم ہوا۔

" وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ " اسلام میں جہاد ایک مقدس فریضہ ہے، اس کے سبب مسلمانوں کو عزت حاصل ہوتی ہے حکومت اور اقتدار نصیب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی حدود قائم ہوتی ہیں، دشمن مغلوب ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے دین اسلام کو قائم اور باقی رکھا جاتا ہے۔

" وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا " اس سے مراد مدینہ کے انصار ہیں، جنہوں نے مہاجرین کو خوش آمدید کہا، اور انہیں اپنے گھروں میں اور ایمان کو اپنے دلوں میں جگہ دی، انہوں نے مہاجرین کو محبت کا تحفہ پیش کیا انہوں نے اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کی اور انہیں اپنی جانوں سے زیادہ عزیز رکھا، جب مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم ہوا تو اس وقت مہاجر اور انصار ہی ایک دوسرے کے وارث بنتے تھے، یہ ابتدائی زمانے کی بات ہے جب مسلمانوں کی جماعت کمزور تھی، انصاری صحابہ کی انہی بے لوث خدمات کی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے " حُبُّ الْاَنْصَارِ اٰيَةُ الْاِيْمَانِ " فرمایا: یعنی مدینے کے انصار سے محبت رکھنا ایمان کی نشانی

ہے، اور ان سے بغض رکھنا منافقت کی علامت ہے، مکے میں اسلام کی مرکزیت قائم نہ ہو سکی تو دین کی اشاعت وتبلیغ کے لیے مدینہ کے انصار نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اسی وجہ سے مدینہ اسلام کا مرکز بنا، اور یہیں سے دین کے پودے کی شاخیں پوری دنیا میں پھیلیں، حتی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: آخری وقت میں جب دجال آئیگا تو اسلام مدینہ میں ہی سمٹ کر رہ جائے گا، اس جگہ کے لوگوں کی تعریف میں فرمایا کہ: یہ اتنے عظیم لوگ ہیں "یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ" (الحشر) کہ مدینہ کے انصار مہاجرین کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، اگر چہ خود ان پر فاقہ ہو مگر اپنے مہاجر بھائیوں کو کھلاتے پلاتے تھے؛ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف بیان فرمائی۔

مدینہ کے انصار نے نہ صرف مہاجرین کی خدمت کی بلکہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد میں بھی بڑھ کر حصہ لیا، بدر کی جنگ، احد، فتح مکہ، تبوک، حنین، خیبر غرضیکہ ہر جنگ میں مدینہ کے انصار مہاجرین کے کندھوں سے کندھا ملا کر لڑے بلکہ اکثر جگہوں پر انصاری مجاہدین کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی، مہاجرین اور انصار پر مشتمل یہی جماعت تھی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم رکھنے اس کو قوت بخشنے اور اس باقی رکھنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی، اسی جماعت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا" اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا" یہی پکے اور سچے مؤمن ہیں جو ایمان لائے، ہجرت کی، اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا اور جنہوں نے مہاجرین کو جگہ فراہم کی اور ان کی مدد کی یہ دونوں گروہ دین کی تائید کے مورچے میں سینہ سپر رہے۔

"لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ" یعنی: ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی اور بخشش مقرر ہے، جیسا کہ صحیح حدیثوں میں ہے، الإسلام يهدم ما كان قبله، وان الهجرة تهدم ما كان قبلها، یعنی: اسلام ان تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے جو مسلمان ہونے سے پہلے کئے گئے ہوں اور ہجرت ان تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے جو اس پہلے کئے گئے ہوں۔

بعد کے مہاجر

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ
اور جولوگ ایمان لائے اس کے بعد اور ہجرت کی اور جہاد کیا ساتھ تمہارے پس وہ

مِنْكُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ
میں سے ہیں تم ہی اور رشتہ دار بعض ان کے قریب تر ہیں بعض کے میں حکم

اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۷۵ ع ۱۰
اللہ کے تحقیق اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے (۷۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جولوگ اس کے بعد ایمان لائے اور گھر چھوڑ آئے اور تمہارے ساتھ ہوکر لڑے وہ لوگ بھی تم ہی سے ہیں اور رشتہ دار، آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں اللہ کے حکم میں، تحقیق اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔(۷۵)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ: اس کے بعد جتنے بھی لوگ ایمان لاکر ہجرت کر کے تم میں شامل ہوتے رہیں اور تمہارے دینی کاموں میں تمہارا ہاتھ بٹائیں اور تمہاری محنت اور کوشش میں تمہارے ساتھ شریک ہوں تو وہ تمہارے بھائی ہیں، ان کے اندرونی اور بیرونی تعلقات وہ ہیں جو تمہارے ہیں، ہاں! اگر پہلے مہاجروں کے قریبی رشتہ دار مسلمان ہوکر ہجرت کر کے چلے آئیں تو پھر وہ اپنے رشتہ داروں کے وارث ہونگے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں جو رشتہ داروں کا حصہ میراث میں مقرر کیا گیا ہے اس کے مطابق میت کا مال تقسیم ہوگا، نئے بھائی چارے کی وجہ سے وہ محروم نہ کئے جائیں گے، بھائی چارے کی وجہ وراثت اس وقت ملے گی جب تک اصلی رشتہ دار ہجرت کر کے اپنے رشتہ داروں سے نہیں آملتے، جب وہ آملیں تو پہلے ان کا حق ہے اور میت کی وراثت

انہی میں تقسیم ہوگی، اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر چیز ہے، اسے یہ بھی معلوم ہے کہ وراثت کس طرح تقسیم ہونی چاہیے اور اس میں کس کا حق پہلے ہے اس نے اپنے علم کی بناء پر مہاجرین اور انصار کو بھائی چارہ کی رو سے ایک دوسرے کا وارث قرار دیا، پھر جب مہاجروں کے رشتہ دار ہجرت کر کے ان سے آملے تو وراثت کا اصل قانون جاری فرمادیا، چنانچہ اس کے مطابق میت کا مال تقسیم کیا جائیگا اور اب کسی کو میت کی میراث میں کمی زیادتی کا اختیار نہ رہا، البتہ مرنے والا اگر وارثوں کے سوا کسی اور کے لیے اپنے مال میں سے دینے کی وصیت کرے تو ایک تہائی تک اس کو اختیار ہے باقی دو تہائی مال شرعی حکم کے مطابق اس کے وارثوں میں تقسیم کر دیا جائیگا۔

اُولُوا الْاَرْحَامِ: ذورحم کی جمع ہے، رحم کے معنی قرابت ورشتہ داری کے ہیں یہاں "اُولُوا الْاَرْحَامِ" سے مراد وہ ہیں جن کو ذوی الارحام بھی کہتے ہیں، مراد وہ سب قریبی رشتہ دار ہیں جن کا حصہ میت کے مال میں مقرر ہے اور جنہیں حصے داروں کو دے کر بچا ہوا مال ملتا ہے، پہلوں کو ذوی الفروض اور دوسروں کو عصبہ کہتے ہیں، اس آیت میں یہی رشتہ دار مراد ہیں۔

اس آیت نے یہ بات بتادی کہ وراثت کی تقسیم رشتہ داری کی بنیاد پر ہونی چاہئے اور لفظ "اُولُوا الْاَرْحَامِ" رشتہ داروں کے لیے بولا جاتا ہے ان میں خاص خاص رشتہ داروں کے حصے تو خود قرآن کریم نے "سورۂ نساء" میں متعین فرمادئے ہیں جن کو میراث کے علم کی اصطلاح میں اہل فرائض یا ذوی الفروض کہا جاتا ہے، ان کو دینے کے بعد جو مال بچے وہ اس آیت کی رو سے دوسرے رشتہ داروں میں تقسیم ہونا چاہئے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سب رشتہ داروں میں کسی مال کا تقسیم کرنا کسی کی قدرت میں نہیں، کیونکہ دور کی رشتہ داری تو ساری دنیا کے انسانوں کے درمیان بلاشبہ موجود ہے کہ سب ایک ہی باپ اور ماں آدم وحوا علیہما السلام سے پیدا ہوئے ہیں؛ اس لیے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے میں عملی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ قریبی رشتہ داروں کے ہوتے ہوئے دور کے رشتہ داروں کو میراث نہیں ملے گی، جیسے کہ باپ اور دادا میں باپ کا رشتہ زیادہ قریب ہے؛ اس لیے باپ کے ہوتے ہوئے دادا کو میراث میں سے حصہ نہیں ملے گا، اسی طرح بیٹا اور پوتے میں بیٹے کا رشتہ زیادہ قریب ہے، بھائی اور بھتیجے میں بھائی کا رشتہ زیادہ قریب ہے، چچا اور چچا کے بیٹے میں چچا کا رشتہ زیادہ قریب ہے، چونکہ پہلے

درجے کے (قریبی رشتہ دار) کی موجودگی میں دوسرے درجے (دور کے رشتہ دار) کو میراث نہیں ملتی، لہٰذا بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو، بھائی کے ہوتے ہوئے بھتیجے کو اور چچا کے ہوتے ہوئے چچا کے بیٹے کو میراث کا حصہ نہیں ملے گا، ہاں! اگر باپ نہ ہو تو دادا کو، بیٹا نہ ہو تو پوتے کو، بھائی نہ ہو تو بھتیجے کو، چچا نہ ہو تو چچا کے بیٹے کو میراث کا حصہ ملے گا، اس قسم کے رشتہ داروں کو علم میراث میں عصبہ کہا جاتا ہے۔

جس کا تفصیلی بیان حدیث کی کتابوں میں اس طرح موجود ہے کہ ذوی الفروض کو ان کے حصے دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ میت کے عصبات، یعنی: جدی رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ دیا جائے گا، یعنی: قریب کے عصبہ کے ہوتے ہوئے دور کے عصبہ کو میراث نہیں ملے گی، جیسا کہ ابھی اوپر مثالوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ہاں! عصبات میں سے اگر کوئی زندہ موجود نہیں تو پھر باقی رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے۔

یہ یاد رہے کہ! قرآن کریم میں "اُولُوا الْاَرْحَامِ" کا لفظ لغوی معنی کے مطابق تمام رشتہ داروں کو شامل ہے جس میں ذوی الفروض اور عصبات اور ذوی الارحام سب ہی داخل ہیں، پھر خاص خاص رشتہ داروں کے حصے اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرمائے جن کو میراث کی اصطلاح میں ذوی الفروض کہتے ہیں، اور باقی کے بارے میں حدیث پاک میں ہے کہ جن کے حصے قرآن کریم نے متعین کر دیئے ہیں وہ پورے ان کو دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ ان لوگوں کو دیئے جائیں جو میت کے قریب تر مرد ہوں۔

ان کو میراث کی اصطلاح میں عصبات کہا جاتا ہے، اگر کسی میت کے عصبات میں کوئی موجود نہ ہو تو حدیث پاک کے مطابق پھر دوسرے ننھیالی رشتہ داروں کو دیا جاتا ہے جن کو اصطلاح میں ذوالارحام کہتے ہیں جیسے: ماموں خالہ وغیرہ۔

مکہ فتح ہونے کے بعد جب مسلمانوں کی تعداد میں بے شمار اضافہ ہو گیا، مہاجر اور انصاری مسلمانوں کے رشتہ دار بھی ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: مہاجر اور انصار کی دوستی کا رشتہ تو ہمیشہ قائم رہے گا، البتہ وراثت وفات پانے والے شخص کے قریبی رشتہ داروں کا حق ہی ہوگا، بھائی چارے کی بنا پر وراثت کا قانون باقی نہیں رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ" اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تم سے بعض رشتہ دار بعض سے زیادہ قریب ہیں، یعنی: وراثت کا قانون یہ ہوگا کہ میراث دینی بھائی کی بجائے حقیقی رشتہ داروں کو ملے گی، یعنی: جب کوئی مہاجر یا انصار فوت ہوگیا تو اس کی وراثت کا حقدار اس کا باپ، بیٹا، بھائی، چچا، تایا وغیرہ ہوگا، بشرطیکہ وہ مسلمان ہو، کیونکہ مسلم اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے، اس نے تمام حکم اپنے علم اور حکمت کے مطابق جاری فرمائے ہیں انسانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ان قوانین پر عمل کریں ہر کام کی مصلحت اللہ تعالیٰ کے بہترین علم میں ہے۔

ایاتہا - ۱۲۹ | سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ | رکوعاتہا - ۱۶

سورۃ التوبہ مدنی ہے، اس میں ایک سو انتیس آیتیں اور سولہ رکوع ہیں۔

عہد کے خاتمہ کا اعلان

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ
بری الذمہ ہونے کا فیصلہ طرف سے اللہ کی اور پیغمبر اس کے کی طرف ان کے جن سے تم نے عہد کیا میں سے

الْمُشْرِكِيْنَ ۝١ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْٓا
مشرکوں (۱) پس پھر چلو میں اس سرزمین چار مہینے اور سمجھ رکھو

اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝۲

کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ کو اور یہ کہ اللہ ذلیل وخوار کرنے والا ہے کافروں کو (۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اللہ کی طرف سے اور اس کے پیغمبر کی طرف سے ان مشرکوں کو صاف جواب ہے جن سے تمہارا عہد ہوا تھا۔(۱) سو! اس ملک میں چار مہینے پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ کو نہ تھکا سکو گے اور یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔(۲)

سورۂ توبہ کا تعارف

یہ سورت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں اتری، اس کی ایک سو انتیس (۱۲۹) آیتیں اور سولہ (۱۶) رکوع ہیں۔

اس سے پہلے "سورۂ انفال" میں کافروں کے ساتھ جنگ کرنے اور صلح کرنے کے حکم بیان کئے گئے ہیں، اس سورت میں بھی اسی کا بیان ہے، ان دونوں سورتوں میں بارہ تیرہ اصول اور کچھ دوسرے حکم بیان کئے گئے ہیں، جن پر مسلمانوں کو عمل کرنا ضروری ہے، اس سورت کی ابتدائی آیتوں میں کافروں اور مشرکوں کے خلاف جنگ کا اعلان ہے اور آگے اس کی مزید تشریح ہے اسلام کے سیاسی نظام کا بھی ذکر ہے اور خاص طور پر اسلامی ملک کے دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات کا بھی ذکر ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سورت میں اسلام کے فارن پالیسی، یعنی: ملک کے خارجہ تعلقات کے بارے میں بھی حکم موجود ہیں، جس میں جزیہ وغیرہ داخل ہیں۔

جہاد کے سلسلے میں اس سورت میں حنین اور احد کی جنگ کا ذکر ہے اور تبوک کی جنگ سے متعلق کچھ تفصیلات بھی موجود ہیں، اس دوران منافقوں نے اپنی منافقت کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا، ایک تو جہاد سے الگ ہو گئے اس کے علاوہ مسلمانوں کے مقابلے میں مسجد ضرار تعمیر کی جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے، چنانچہ اس سورت میں منافقوں کو دی گئی رعایتوں کو ختم کیا گیا ہے، اور ان کی رسوائی کا ذکر ہے۔

اس سورت کے شروع میں کافروں اور مشرکوں سے بیزاری اور براءت کا اظہار کیا گیا ہے اور ان لوگوں کو

جن سے مسلمانوں نے عہد کر رکھا تھا ایک مخصوص مدت تک کے لیے مہلت دیدی گئی ہے کہ اس دوران یہ کافر اور مشرک لوگ غور وفکر کر کے یا تو اسلام لے آئیں یا ملک چھوڑ کر چلے جائیں ورنہ سب قتل کر دیے جائیں گے، چونکہ کافر اور مشرک معاہدوں کی بار بار خلاف ورزی کرتے تھے اور ایسے معاہدے عملی طور پر بے معنی ہو کر رہ گئے تھے؛ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ان کو غور وفکر کے لیے چار مہینے کی مہلت دیدیں اس دوران اگر یہ لوگ چاہیں تو اسلام کی سچائی کو قبول کر کے اس کے حکموں کو مان لیں یا پھر اپنے دین پر ہی رہتے ہوئے مسلمانوں کے ملک میں ذمی بن کر رہیں، اگر چار مہینے کے اندر اندر دو باتوں میں سے کوئی بات بھی انہوں نے نہیں مانی تو پھر ان کے خلاف جنگ شروع ہو جائے گی اور ان کو مزید مہلت نہیں دی جائے گی۔

اس کے بعد آگے معاہدوں کی بعض صورتوں کا بیان ہے، مثلاً: یہ کہ جن لوگوں کے ساتھ لمبی مدت کے معہدے ہیں وہ اگر ان معاہدوں کی پابندی کرتے ہیں اور خلاف ورزی نہیں کرتے تو ایسے معاہدوں کو پورا کیا جائے گا، مگر جن لوگوں نے معاہدے کی پابندی نہ کی وہ شکست کھا گئے جس کی بہترین مثال مکہ کی فتح ہے یہودی قبیلے بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں، نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ جلا وطن ہوئے ان کی جائیداد پر قبضہ کر لیا گیا اور جو زیادہ شر پسند تھے ان کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا گیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔

اس سورت کو "توبہ" اور "براءت" کا نام کیوں دیا گیا؟

اس مبارک سورت کا نام "سورۂ توبہ" ہے اس نام کو رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے تبوک کی جنگ میں شامل نہ ہونے کی کوتاہی ہو گئی تھی اس پر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے مسلمانوں کو ان سے بائیکاٹ کا حکم دیدیا تھا، بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان صحابہ کرام کی توبہ قبول فرمائی جس کا ذکر اس سورت میں موجود ہے؛ اس لیے اس سورت کو "سورۂ توبہ" کہا جاتا ہے۔

اس سورت کا دوسرا نام "سورۂ براءت" ہے کیونکہ اس میں مشرکوں اور کافروں سے براءت، یعنی: بیزاری

کا اظہار کیا گیا ہے اور انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ چار مہینے کی مدت میں یا تو اسلام قبول کر لیں یا پھر ملک چھوڑ جائیں۔

اس سورت کے شروع میں "بسم اللہ" نہ لکھنے کی وجہ

قرآن کریم کی تمام سورتوں کے شروع میں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" لکھی جاتی ہے البتہ صرف اس سورت کے شروع میں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" نہیں لکھی جاتی، اس کی وجہ معلوم کرنے سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ قرآن مجید تیئیس سال کے عرصہ میں اترا ہے، ایک ہی سورت کی مختلف آیتیں مختلف اوقات میں اتریں، جبرئیل امین علیہ السلام جب وحی لے کر آتے تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ بھی بتلاتے تھے یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد رکھی جائے، اسی کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی لکھنے والے صحابہ کرام کو ہدایت فرما کر لکھوا دیتے تھے۔

اور جب ایک سورت ختم ہو کر دوسری سورت شروع ہوتی تھی تو سورت شروع ہونے سے پہلے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" اترتی تھی جس سے یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ پہلی سورت ختم ہو گئی اب دوسری سورت شروع ہو رہی ہے، قرآن کریم کی تمام سورتوں میں ایسا ہی ہوا، "سورۂ توبہ" اترنے کے اعتبار سے بالکل آخری سورتوں میں سے ہے، اس کے شروع میں عام دستور کے مطابق نہ "بِسْمِ اللّٰهِ" اتری اور نہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی لکھنے والے صحابہ کرام کو اس کی ہدایت فرمائی، اسی حال میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہو گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے معلوم کیا کہ قرآن کریم کو آپ نے جمع فرمایا ہے، آپ نے "سورۂ انفال" اور "سورۂ توبہ" کو آپس میں جوڑ دیا ہے اور درمیان میں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم" نہیں لکھی اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کے جواب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: انہوں نے اس مقام پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "بِسْمِ اللّٰهِ" پڑھتے نہیں سنا؛ اس لیے میں نے یہاں پر "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" نہیں لکھی، قرآن کریم کی تلاوت کے درمیان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" تلاوت فرماتے تو پتہ چلتا تھا کہ یہ دونوں سورتوں کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے اور

اب نئی سورت شروع ہو رہی ہے، چونکہ آپ نے اس موقع پر "بِسْمِ اللّٰهِ" نہیں پڑھی، لہٰذا یہ بھی امکان ہے کہ "سورۂ انفال" اور "توبہ" ایک ہی سورت ہوں کیونکہ ان دونوں کے مضمون ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ان دونوں سورتوں کو قرینتین، یعنی: ملی ہوئی کہا جاتا تھا۔

لفظی تحقیق: بَرَآءَةٌ: چھٹکارا، خلاصی، اظہار بیزاری۔ یہ مصدر ہے جو مادہ: ب، ر، ء سے بنا ہے بَرْءٌ کے معنی الگ ہو جانا، بیزاری کا اظہار کرنا۔

سِيْحُوْا: چلو، پھرو۔ اس کا مادہ: س، ی، ح ہے اور مصدر سیاحۃ سے بنا ہے اور یہ اسی سے امر کا صیغہ ہے، ہماری زبان میں سیاحۃ کو سیاحت کر لیا گیا ہے اور ہم اسے خوب استعمال کرتے ہیں کسی ملک میں سیر سپاٹے کے لیے جانا اور آزادی سے ادھر ادھر گھومنا، سیاحت کرنے والے کو سیاح کہتے ہیں جو اسی مصدر سے صفت کا صیغہ ہے یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ آزادی کے ساتھ چلو پھرو۔

مُخْزِی: رسوا کرنے والا۔ اسم فاعل ہے "اِخْزَاءٌ" سے جو "خِزْیٌ" سے بنا ہے یہ لفظ "سورۂ بقرہ" میں بھی گزر چکا ہے "اِخْزَاءٌ" "خِزْیٌ" کا متعدی ہے "خِزْیٌ" "رسوائی" "اِخْزَاءٌ" "رسوا کرنا۔

الْكٰفِرِيْنَ: کافر کی جمع ہے اور کفر سے اسم فاعل ہے جا بجا استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے والا ہے، لیکن اس سے مراد ایسا کافر ہے جو خود ہی انکار نہ کرے بلکہ دوسروں سے بھی زبردستی انکار کرائے، اس کے مقابل کا لفظ مومن ہے جو اللہ کے ماننے والے کو کہتے ہیں، مومن اللہ کا اقرار کرتا ہے اور دوسروں کو بھی مشورہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ماننا بہتر بلکہ ضروری ہے، لیکن کسی کو زبردستی منوانا نہیں چاہتا، کافر بھی اگر زبردستی ایمان سے نہ روکے تو اس سے کوئی لڑائی نہیں، لڑائی تب ہوتی ہے جب وہ زبردستی ایمان سے لوگوں کو روکنا شروع کر دیتا ہے، ان آیتوں میں یہ فیصلہ سنایا گیا ہے کہ آئندہ ان مشرکوں سے جن سے کوئی عہد نہیں چار مہینے کی مہلت ہے کہ وہ اس ملک میں آزادی کے ساتھ چل پھر سکیں، اس کے بعد اگر جزیرۂ عرب میں رہنا ہے تو مسلمان ہونا پڑے گا، ورنہ یہاں سے نکل جانا ہوگا، ورنہ قتل کر دیئے جائیں گے، اللہ تعالیٰ کافروں کو دونوں

جہاں میں رسوا اور ذلیل کرنے والا ہے۔

تفسیر

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ: پہلے بیان ہو چکا ہے کہ "سورۂ توبہ" ۹ھ میں تبوک کی جنگ کے بعد اتری اس سے پہلے ۸ھ میں مکہ فتح ہو چکا تھا، اس سال پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بیت اللہ شریف کا حج کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی، آپ کے متعین کردہ گورنر عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ مکہ میں موجود تھے، اب یہ شہر اسلام کا مرکز بن چکا تھا، مگر ایک برائی ابھی تک باقی تھی اور وہ یہ کہ عرب کے مشرکوں کو بیت اللہ شریف کے حج کرنے پر ابھی تک کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی، انہوں نے شرکیہ رسوم جاری کر کے ملت ابراہیمی کو بگاڑ دیا تھا اور دین کی اس بگڑی ہوئی شکل کو ہی دین ابراہیمی سمجھے بیٹھے تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والے اصلی مسلمانوں کو صابی، یعنی: بے دین کہتے تھے، اب حالات میں ۹ھ میں خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے لیے جانا پسند نہ فرمایا، اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی خاص مصلحت تھی کہ شرک کی خباثت کے دوران پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہاں جانا منظور نہ تھا، چنانچہ اس سال آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں حج کا وفد مکہ مکرمہ سے روانہ کیا اس دوران یہ سورت اتری تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی آیت نمبر ۳۲، ۳۷، اور ۴۰ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے کر کے مکہ مکرمہ بھیجا تاکہ حج کے موقع پر مختلف اجتماعات میں ان کا عام اور کھلا اعلان کیا جا سکے۔

اس سفر کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی اونٹنی سواری کے لیے دی، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی پر سوار ہو کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ شاید ان کو حج کا نیا امیر بنا کر بھیجا گیا ہے، انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ "أمیر أو مأمور" یعنی: امیر بنا کر بھیجے گئے ہو یا مامور، یعنی: میرے ماتحت بن کر آئے ہو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں آپ کا ماتحت بن کر آیا ہوں اور آپ کی سربراہی میں ہی حج ادا کروں گا۔

بیزاری کے اعلان کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کیوں بھیجا؟

مفسرین کرام نے یہاں ایک نکتہ اٹھایا ہے کہ مطلوبہ اعلان تو حج کے امیر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی کر سکتے تھے اس کے باوجود حضرت علی کو خاص طور سے ان کے پیچھے بھیجنے کا کیا مقصد تھا؟ اس بارے میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: عربوں کے قبائلی نظام میں یہ دستور تھا کہ جب کسی معاہدہ کو ختم کرنا ہوتا تھا یا کسی دوسرے قبیلے سے بائیکاٹ کرنا ہوتا تو قبیلے کے سردار یا اس کا کوئی قریبی رشتہ دار یہ کام انجام دیتا، حضرت علی رضی اللہ عنہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچیرے بھائی اور داماد تھے؛ اس لیے آپ نے قبائلی دستور کے مطابق حضرت علی کا بھیجا تاکہ لوگوں کو پوری طرح یقین ہو جائے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے بھیجنے سے یہ مقصد تھا کہ آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مددگار بن جائیں اور تمام مومن بھی خوش ہو جائیں، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں بھیجنے سے یہ بھی مراد تھی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا امیر ہونا پختہ ہو جائے اور بعد میں کسی قسم کا کوئی جھگڑا نہ ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ بنے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کے امیر ہونے کو مانا اور آپ کی سربراہی میں حکومتی کاموں میں آپ کی مدد فرمائی، رافضیوں نے خلافت کا جھگڑا پیدا کیا ہے ان کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ خلافت کے حقدار حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور یہ کہ ان سے خلافت چھین لی گئی، حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ کا اشارۃً فیصلہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں حضرت علی کو صدیق اکبر کا ماتحت بنا کر کر دیا تھا۔

الغرض! پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے مطابق بیزاری کا اعلان حج کے دنوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ہر اجتماع کے موقع پر کیا، مکہ کی گلیوں، عرفات، مزدلفہ اور خاص طور پر عرفات کے میدان میں جہاں حاجی تین دن ٹھہرا کرتے ہیں بڑے اہتمام سے اعلان کیا گیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اس براءت میں یہ چار اعلان شامل تھے۔

(۱)....پہلا اعلان یہ تھا کہ" ان لا یطوفن بالبیت عریانا "یعنی: آئندہ کسی شخص کو بھی ننگا بیت اللہ کے طواف کی اجازت نہیں ہوگی، جاہلیت کے زمانے میں یہ لوگ بالکل ننگے بھی طواف کرتے تھے وہ اس غلط خیال میں پڑے ہوئے تھے کہ اپنے جس لباس میں وہ گناہ کرتے ہیں اس لباس کے ساتھ اللہ کے پاک گھر کا طواف بے ادبی ہے؛ اس لیے یا تو وہ کعبہ کے متولیوں سے عارضی طور پر کپڑے مانگ کر ان کے ساتھ طواف کرتے تھے اور اگر ان کو کپڑے نہیں ملتے تو پھر ننگے ہی طواف کرتے تھے، جب مشرکوں سے اس گندے کام کی وجہ پوچھی جاتی تو کہتے" وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا " (اعراف)، اللہ نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ "(اعراف)، اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ ایسی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیتا یہ تو عقلاً بھی محال ہے۔

(۲)....حج اکبر کے دن دوسرا اعلان یہ تھا کہ: "اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا "(التوبہ)، مشرک لوگ ناپاک ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد انہیں مسجد حرام کے قریب آنے کی، یعنی: حج کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

(۳)....پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق تیسرا اعلان یہ تھا" لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مُؤْمِنٌ " مومن کے سوا جنت میں کوئی شخص داخل نہیں ہو سکے گا، لہٰذا ہر شخص کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہئے کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہو، ورنہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔

(۴)....چوتھا اعلان یہ تھا کہ جس قوم کے ساتھ صلح کا معاہدہ ہو چکا ہے ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے اس دوران وہ سوچ و بچار کر کے ایمان قبول کر لیں یا ملک چھوڑ جائیں، ورنہ ان کے خلاف جنگ ضروری ہو جائے گی، اس اعلان کی تشریح آگے پندرہ آیتوں تک چلی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا۔

احکام ومسائل

جو شخص اوپر سے "سورۂ انفال" کی تلاوت کرتا آیا ہو اور" سورۂ توبہ" شروع کر رہا ہو وہ " بِسْمِ اللّٰهِ " نہ

پڑھے، لیکن جب کوئی شخص اسی سورت کے شروع یا درمیان سے تلاوت شروع کر رہا ہو تو اس کو چاہئے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ" کے ساتھ شروع کرے۔

بعض لوگ یہ سمجھے ہیں کہ "سورۂ توبہ" کی تلاوت میں کسی حال میں "بِسْمِ اللّٰهِ" پڑھنا جائز نہیں یہ غلط ہے اور اس پر دوسری غلطی یہ ہے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ" پڑھنے کی بجائے لوگ اس کے شروع میں "أعوذ بالله من النار" پڑھتے ہیں جس کا کوئی ثبوت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام سے نہیں ہے۔

اعلانِ عام

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ

اور اعلان ہے طرف سے اللہ کی اور پیغمبر اس کے کی طرف لوگوں کی دن حج اکبر کے

اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ

کہ اللہ کو سروکار نہیں سے مشرکوں اور نہ پیغمبر اس کے کو پس اگر باز آجاؤ تم تو وہ

خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ ؕ

بہتر ہے واسطے تمہارے اور اگر منہ موڑو تم تو سمجھ لو کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ کو

وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳﴾

اور خوشخبری دے ان کو جو کافر ہوئے عذاب دردناک (۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اعلان ہے اللہ کی اور اس کے پیغمبر کی طرف سے لوگوں کے سامنے بڑے حج کے دن کہ اللہ اور اس کا پیغمبر مشرکوں سے بالکل الگ ہیں، سو! اگر تم توبہ کر و وہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر نہ مانو تو جان لو کہ تم اللہ کو نہ تھکا سکو گے اور کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔ (۳)

لفظی تحقیق: اَذَانٌ: پکار کر سنانا۔ یہ "تَاذِيْنٌ" کا حاصل مصدر ہے، جو اَذَنٌ سے بنا ہے حاصل مصدر

اس کا نام ہے جس کا کرنا مصدر سے ظاہر ہو مثلاً: سَلَامٌ، تَسلِیمٌ کا اور کَلَامٌ ،تَکلِیمٌ کا حاصل مصدر ہے، "اَذَانٌ" کے معنی ہیں سننا "تَاذِینٌ" کے معنی ہیں: سنانا، "اَذَانٌ" وہ بات جو سنائی جائے اسی مادہ سے "اِذنٌ" بھی بنا ہے جس کے معنی اجازت کے ہیں لیکن یہاں اس سے کوئی تعلق نہیں، اسی سے "اَذَنٌ" بھی ہے جس کے معنی کسی کے کان پر مارنا۔

اَلْحَجِّ الْاَکْبَرِ: بڑا حج۔ حج کے معنی ہیں جان بوجھ کر کہیں جانا، "حج اکبر" سے کون سا دن مراد ہے؟ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: "حج اکبر" سے "یوم النحر" یعنی: دسویں تاریخ مراد ہے۔

حج اکبر کے مقابلے میں "حج اصغر" کا لفظ بولا جاتا ہے اور "حج اصغر" عمرے کو کہتے ہیں اور عمرہ کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں، حج کے پانچ دنوں کے علاوہ پورے سال میں کسی بھی وقت عمرہ ہو سکتا ہے، مگر حج اس کے خاص دنوں میں کیا جا سکتا ہے اور یہ دن ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ سے لے کر تیرھویں تاریخ ہیں۔

تو گویا حج دو قسم کے ہیں ایک بڑا جس کے لیے ذی الحجہ کی خاص تاریخیں مقرر ہیں، یعنی: ۸، ۹، ۱۰ ذی الحجہ اور ایک چھوٹا حج جس کو عمرہ بھی کہتے ہیں، اس کے لیے کوئی تاریخ مقرر نہیں اور نہ کہیں جمع ہونا ضروری ہے۔

تفسیر

ایک غلط فہمی کا ازالہ

مشہور ہے کہ "حج اکبر" وہ ہوتا ہے جب "۹" ذی الحجہ، یعنی: عرفات کا دن جمعہ کو آئے جیسا کہ ۱۹۸۳ء میں آیا تھا، جمعہ تو ویسے ہی مبارک دن ہے اور ذی الحجہ کی نویں تاریخ بھی اسی دن آجائے تو یہ مزید خوشی کی بات ہوگی کہ دو عیدیں اکٹھی ہو گئیں، تاہم "حج اکبر" سے مراد خواہ نویں تاریخ جمعہ کا دن ہو یا نہ ہو۔

بعض چیزیں غلط مشہور ہو جاتی ہیں، جن کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، مثلاً: یہ کہ جس نے عقیقہ نہ کیا ہو اس کی

قربانی قبول نہیں ہوتی یا جس نے پہلے ماں باپ کی طرف سے قربانی نہ کی ہو اس کی قربانی قبول نہیں ہوتی اس قسم کے مسئلے لوگوں نے خود گھڑے ہوئے ہیں، ان میں ”حج اکبر“ کا غلط مفہوم بھی شامل ہے۔

”اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ“ اس کی پہلی آیتوں میں مشرکوں سے وہ مشرک مراد ہیں جن سے بغیر کسی مدت کے مقرر کیے معاہدہ ہو گیا تھا کہ ہم آپس میں نہ لڑیں گے، نیز: انہی میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا، دونوں کو سنا دیا گیا کہ چار مہینوں کی مہلت ہے اس میں تم مسلمان ہو جاؤ یا جزیرۂ عرب سے نکل جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔

اس آیت میں مشرکوں سے وہ مکہ والے اور ان کے ساتھی مراد ہیں جن سے دس سال کے لیے حدیبیہ کی جگہ میں صلح کا معاہدہ ہوا تھا، یہ معاہدہ قریش نے توڑ ڈالا اور اسی وجہ سے مکہ فتح کر لیا گیا، لیکن مکہ کے فتح ہونے ایک سال بعد ۹ ھ میں حج کے موقع پر جس کے امیر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے مدینہ منورہ میں ”سورۂ توبہ“ کی یہ آیتیں اتریں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو لے کر مکہ روانہ ہوئے اور حج کے اجتماع میں اس کا اعلان بھی کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم شرک کرنے والوں سے بیزار ہیں اب ہماری مشرکوں سے کوئی صلح نہیں ہے، مشرک اگر توبہ کر لیں اور اسلام میں داخل ہو جائیں تو بہتر ہے ورنہ جزیرۂ عرب کو غیر مسلموں سے پاک کر لیا جائے گا اور مشرک اللہ تعالیٰ کو عاجز اور بے بس نہیں کر سکتے اور انہیں دردناک عذاب دیا جائے گا۔

کچھ لوگ ابھی بچ رہیں گے

اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْـًٔا وَّ

مگر | وہ لوگ جن سے | عہد کیا تم نے | میں سے | مشرکوں | پھر | نہ | کوتاہی کی انہوں نے تم سے | کچھ | اور

لَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ

نہ | مدد کی | خلاف تمہارے | کسی کی | پس پورا کرو | ساتھ ان کے | عہد ان کا | تک | مدت ان کی

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝۴

تحقیق اللہ دوست رکھتا ہے بچ کر چلنے والوں کو (۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کچھ قصور نہ کیا اور تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد نہ کی، سو! ان سے ان کا عہد ان کے وعدہ تک پورا کرو، بیشک اللہ کو احتیاط والے پسند ہیں۔ (۴)

لفظی تحقیق: لَمْ یَنْقُصُوْکُمْ: نہ کمی کی انہوں نے تم سے۔ مضارع کا صیغہ ہے "نقص" کے معنی ہیں کم کر دینا، گھٹا دینا، کوتاہی کرنا، یہاں کوتاہی کرنے سے مراد ہے کہ معاہدہ کی شرطوں میں سے کسی کی خلاف ورزی نہ کی۔ لَمْ یُظَاهِرُوْا: نہ پیٹھ ٹھونکی۔ مضارع کا صیغہ ہے اس کا مصدر "مظاهر" ہے جو "ظهر" سے بنا ہے، جس کے معنی پیٹھ اور کمر کے ہیں، "مظاهر" سے مراد کسی کی کمر تھاپنا، مدد کرنا، "مظاهر" کسی بات کو کھلم کھلا سب کے سامنے کرنے کے بھی ہیں، لیکن وہ "ظهور" سے بنا ہے جس کے معنی ظاہر ہونا ہیں، بہرحال یہاں پہلے معنی مراد ہیں جس کا مطلب ہے پشت پناہی کرنا اور وہ "ظهر" سے بنا ہے جس کے معنی: پیٹھ کے ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے ساتھ ایک مقررہ وقت تک صلح کا معاہدہ تھا اور انہوں نے اس معاہدہ کو نبھایا اور اس کے خلاف کوئی کام نہ کیا، ارشاد ہے کہ: جن مشرکوں سے تم نے ایک مدت تک کے لیے معاہدہ کیا ہوا ہے اور انہوں نے اس معاہدہ کی خود بھی کوئی خلاف ورزی نہیں کی اور تمہارے دشمنوں میں سے بھی کسی کی مدد نہیں کی ان کے ساتھ معاہدہ کی مدت ختم ہونے تک معاہدہ جاری رکھو اور ان کو ابھی تو ان کے حال پر چھوڑ دو جب معاہدہ کی مدت ختم ہو جائے گی ان کے ساتھ بھی اسی اعلان کے مطابق سلوک کیا جائے گا، آیت کو اس پر ختم کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ احتیاط سے چلنے والوں کو پسند کرتا ہے جو اپنے طرز عمل سے اپنے اوپر کسی طرح کا الزام عائد نہیں ہونے کا موقع نہ دیں اور کوئی کام ایسا نہ کریں جن سے ان کی نیک نامی اور شہرت کو دھبہ لگے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو عہد و پیمان کا پورا کرنا ضروری ہے کیونکہ اگر غدار مشہور ہو گئے تو اسلام کا نام بدنام ہوگا، اور مسلمانوں کو لوگ کہنے لگیں گے کہ وہ بات کہہ کر مکر جاتے ہیں؛ اس لیے اس قابل نہیں کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔

باقی لوگوں سے سلوک

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْ

پھر جب گزر جائیں مہینے حرمت کے تو قتل کرو مشرکوں کو جہاں پاؤ تم

تُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ

ان کو اور پکڑو ان کو اور گھیرو ان کو اور بیٹھو لیے ان کے ہر گھات کی جگہ میں

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۚ

پھر اگر وہ کرلیں توبہ اور قائم کریں نماز اور دیں زکوۃ چھوڑ دو راستہ ان کا

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے (۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر جب پناہ کے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو مارو جہاں پاؤ اور پکڑ داور گھیر واور ہر جگہ ان کی تاک میں بیٹھو پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم رکھیں اور زکوۃ دیا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔(۵)

لفظی تحقیق: اِنْسَلَخَ: گذر جائیں۔ ماضی کا صیغہ ہے "اِنْسِلَاخٌ" سے جس کا مادہ: س، ل، خ ہے، "سُلْخٌ" کے ایک معنی ختم ہو جانے کے اور گذر جانے کے ہیں، "اِنْسِلَاخٌ" کے معنی کسی چیز کے اندر سے نکل کر چلے جانا جس کو ہماری زبان میں کھسک جان کہتے ہیں یہاں اس سے مراد گذر جانا ہے۔ اَلْاَشْهُرُ الْحُرُمُ: وہ

مہینے جن میں لڑنا حرام ہے، "اَشْهُرٌ شَهْرٌ" کی جمع ہے عربی میں مہینہ کو کہتے ہیں. حُرُمٌ: حرام کی جمع ہے "حرام" حرمة سے بنا ہے اس سے مراد وہ جگہ یا وہ زمانہ جس کا احترام کیا جائے اور جس میں لڑنا بھڑنا بند رکھا جائے عرب لڑاکا لوگ تھے لیکن سب نے مل کر ایک دستور بنالیا تھا کہ سال میں چار مہینے کوئی کسی سے نہ لڑے گا، اسلام نے ان کے اس دستور کو قائم رکھا، کیونکہ وہ اپنی طرف سے صلح سے متعلق ہر چیز کو باقی رکھتا ہے "سورۂ بقرہ" میں شہر حرام کا ذکر گذر چکا ہے اور آگے اس صورت میں بھی تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: جن لوگوں سے عہد کیا تھا اور انہوں نے عہد کو نبھایا بھی تو ان کو چھوڑ کر تمام مشرکوں سے مسلمانوں کا عہد ٹوٹ چکا اور اس کا اعلان ہو گیا لیکن اتنی رعایت دی جاتی ہے حرمت والے مہینے گذر جانے دئے جائیں، پھر اس کے بعد جزیرۂ عرب کو فسادی لوگوں سے خالی کرنے کا کام شروع کر دو، یہ لوگ نہ خود چین سے رہیں گے اور نہ تمہیں رہنے دیں گے، آئندہ ان کو امن وامان میں خلل ڈالنے کا موقع نہ دیا جائے، اب سے جزیرۂ عرب میں صرف وہ لوگ رہیں گے جو اسلامی زندگی اختیار کریں گے، اسلامی زندگی سراسر امن وامان ہے ان میں جو لوگ سچے دل سے اپنی پچھلی حرکتوں کو چھوڑ دیں نماز باقاعدہ پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ شوق سے رہیں ان کو ہر طرح کی آزادی حاصل رہے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے کرتوتوں کے باعث ان کو مصیبت میں نہ ڈالے گا کیونکہ وہ توبہ کرنے والوں کے قصور معاف کر دیتا ہے اور ان پر رحمت کرتا ہے۔

پچھلی آیتوں میں مشرکوں سے بیزاری کا اعلان تھا پھر معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے چار مہینے کی مدت مقرر فرمائی کہ اگر وہ اس عرصہ میں کفر وشرک کو چھوڑ کر ایمان قبول کر لیں تو ٹھیک ہے ورنہ وہ ملک بدر ہو جائیں، چار مہینے کی مدت میں اگر وہ ایمان نہ لائیں اور نہ ملک چھوڑیں تو پھر انکے خلاف جہاد ہوگا، البتہ جو لوگ معاہدے کی پابندی کر رہے ہیں ان کے متعلق فرمایا کہ: مقررہ مدت تک ان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی جائے اور انہیں سوچ و بچار کا موقع دیا جائے۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ: (جب حرمت والے مہینے گذر جائیں)، یہاں پر حرمت والے مہینوں سے مراد یہی چار مہینے ہیں جن کی کافروں اور مشرکوں کو مہلت دی گئی کہ وہ اس دوران سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرلیں ان حرمت والے مہینوں میں وہ حرام مہینے مراد نہیں ہیں جن کا ذکر آگے اسی سورت میں آرہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین پیدا فرمائے اس کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ہے جن میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں، ملت ابراہیمی میں ان چار مہینوں کے دوران لڑائی ممنوع ہے، ان مہینوں کی تشریح پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک ارشادات میں موجود ہے ان میں سے تین مہینے اکٹھے ہیں، یعنی: ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم اور چوتھا مہینہ رجب ہے ان کا حکم آگے آرہا ہے تاہم اس مقام پر چار مہینے سے وہ مدت مراد ہے جو کسی کافر ومشرک کو سوچ وبچار کے لیے دی گئی ہو، تاہم ان حرمت والے مہینوں کا حکم بھی یہی ہے کہ مسلمان خود لڑائی کی ابتداء نہ کریں اور اگر مشرک لوگ چھیڑ خانی کریں تو پھر ان کے خلاف جوابی کاروائی کرنا مسلمانوں کے لیے منع نہیں ہے، چونکہ یہ اعلان ۹ھ میں دس ذی الحجہ کو کیا گیا، لہٰذا چار مہینے کی یہ مدت دس ربیع الثانی کو ختم ہوجائے گی اور پھر مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کے خلاف کاروائی کرنے کی اجازت ہوگی۔

فرمایا: مہلت کی یہ مدت ختم ہوجانے کے بعد مسلمانوں کو اجازت ہے کہ ان سے جنگ کریں ان کو پکڑ کر قیدی بنالیں اور اگر وہ کسی قلعے یا وادی میں ہوں تو ان کا جینا حرام کردیں، اگر کسی شہر میں ہوں تو ان کا گھیراؤ کرلیں اور ان کے لیے گھات لگا کر بیٹھیں اور کسی کمین گاہ میں ہوں یا انتظار گاہ میں تو ان کی تاک میں بیٹھو اور جونہی اپنے ٹھکانے سے نکلیں تو انہیں دبوچ لو، مطلب یہ ہے کہ مدت گذر جانے کے بعد انہیں ہر طرف سے گھیر لو اور ہر صورت میں ان کو ان کے برے کرتوتوں کا مزہ چکھاؤ۔

یاد رہے کہ! اس آیت میں کس لڑائی کی تلقین کی جارہی ہے اس سے کوئی دنیاوی فائدہ مقصود نہیں، نہ تو محض اقتدار کی خواہش ہے اور نہ ہی کسی کے ملک پر قبضہ کرنے کی لالچ، بلکہ اس جنگ کا واحد مقصد اللہ کے دین کو غالب بنانا ہے جہاد کے متعلق "سورۂ بقرہ، آل عمران، مائدہ، انفال" اور خود اس سورت میں بھی وضاحت کردی گئی ہے کہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کے دین کو بلند کرنا ہے نہ کہ مال ودولت حاصل کرنا یا انسانی قتل، جہاد کا مطلب یہ ہے کہ

زمین میں فتنہ وفساد کو ختم کیا جائے تاکہ دین کے حکموں پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

فَاِنْ تَابُوْا: (اگر وہ توبہ کرلیں)، فرمایا کہ: وہ لوگ کفر وشرک سے باز آجائیں، دین کے راستے میں رکاوٹ نہ بنیں، اپنا عقیدہ اور عمل درست کرلیں، تمام غلط عقیدوں کو چھوڑ کر اللہ کے ایک ہونے پر ایمان لے آئیں تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ بھی تمہاری جماعت کے آدمی ہیں پھر ان کو بھی وہ تمام حقوق حاصل ہوجائیں گے جو تمہیں حاصل ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو تم پر عائد ہیں، توبہ میں یہ تمام باتیں آجائیں گی۔

فرمایا کہ: اگر یہ توبہ کرکے کفر وشرک چھوڑ کر ایمان قبول کرلیں اور پھر اس کے ثبوت میں نماز ادا کرنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو پھر ان کا راستہ چھوڑ دو، یعنی: اگر محاصرہ میں ہیں تو محاصرہ اٹھالو اور جنگ کا ارادہ ہے تو اسے ترک کردو اور ان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کرو، کیونکہ اگر انہوں نے سچے دل سے توبہ کرلی ہے تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے، وہ ان کی سابقہ غلطیوں کو معاف فرمادیگا کیونکہ اب وہ سیدھے راستے پر آگئے ہیں اور اصل مقصد حاصل ہوگیا ہے لہٰذا اب لڑائی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

ان پانچ آیتوں سے متعلق چند مسئلے اور فائدے

مسئلہ (۱):..... یہ کہ مکہ فتح ہونے کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش اور دوسرے دشمن قبیلوں کے ساتھ جو معاملہ نرمی اور معاف کرنے کا فرمایا، اس نے عملی طور پر مسلمانوں کو یہ اخلاقی سبق دیا کہ جب تمہارا کوئی دشمن تمہارے قابو میں آجائیں اور تمہارے سامنے عاجز ہوجائیں تو اس سے گذشتہ دشمنیوں اور تکلیفوں کا بدلہ نہ لو بلکہ معاف کرکے اسلامی اخلاق کا ثبوت دو اگرچہ ایسا کرنے میں انسان کی طبیعت نہیں چاہتی لیکن اس میں چند بہت بڑے فائدے ہیں۔

(۱)..... فائدہ یہ ہے کہ خود اپنا بدلو لے کر اپنا غصہ اتار لینے سے وقتی طور پر اگرچہ اپنے جی کو کچھ راحت محسوس ہو لیکن یہ راحت فنا ہونے والی ہے اور اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کے بلند درجے جو اس کو ملنے والے ہیں وہ اس سے ہر حیثیت میں بھی زیادہ ہیں اور ہمیشہ رہنے والے بھی اور عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ

ہمیشہ رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دے۔

(۲)…. فائدہ یہ ہے کہ دشمن پر قابو پانے کے بعد اپنے غصہ کے جذبات کو دبا دینا اس کا ثبوت ہے کہ ان کی لڑائی اپنے نفس کے لیے نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے لیے تھی اور یہی وہ اعلیٰ عقیدہ ہے جو اسلامی جہاد اور عام بادشاہوں کی جنگ میں فرق کرنے والا ہے کہ جو لڑائی اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کے حکموں کو جاری کرنے کے لیے ہو وہ جہاد ہے ورنہ فساد۔

(۳)…. فائدہ یہ ہے کہ دشمن جب مغلوب ہونے کے بعد ان بلند اخلاق کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا تو شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں سے محبت پیدا ہوگی جو اس کے لیے کامیابی کی بنیاد ہے اور یہی جہاد کا اصل مقصد ہے۔

کافروں کو معاف کر کے ان کے مکر سے غافل نہیں ہونا چاہئے

مسئلہ (۲):…. جو مذکورہ آیتوں سے سمجھا گیا ہے یہ ہے کہ کافروں کو بخشنے اور درگذر کرنے کے یہ معنی نہیں کہ دشمنوں کے شر سے اپنی حفاظت نہ کرے اور ایسا آزاد چھوڑ دے کہ وہ پھر ان کو نقصان پہنچا سکیں، بلکہ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ پچھلے تجربوں سے آئندہ زندگی کے لیے سبق حاصل کرے اور دشمنوں سے ہر طرح ہوشیار رہے؛ اس لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا دانشمندانہ ارشاد ہے کہ: عقلمند آدمی ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا، جس سوراخ سے ایک مرتبہ کسی زہریلے جانور نے اس کو کاٹا ہے اس میں دوبارہ ہاتھ نہیں دیتا۔

مسئلہ (۳):…. "سورۂ توبہ" کی ابتدائی آیتوں سے یہ معلوم ہوا کہ کمزور قوموں کو مہلت دیئے بغیر کسی جگہ سے نکل جانے کا حکم دینا یا ان پر یکبارگی حملہ کر دینا بزدلی اور غیر شریفانہ کام ہے جب ایسا کرنا ہو تو پہلے سے اعلان کر دیا جائے اور ان کو اس کی پوری مہلت دی جائے کہ وہ اگر ہمارے قانون کو تسلیم نہیں کرتے تو آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں سہولت کے ساتھ جا سکیں کہ مذکورہ آیتوں میں ۹ھ کے اعلان عام اور اس کے بعد تمام جماعتوں کو مہلت دینے کے حکموں سے واضح ہوا۔

مسئلہ (۴):.... مذکورہ آیتوں سے یہ معلوم ہوا کہ کسی قوم کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لینے کے بعد اگر مقررہ وقت سے پہلے اس معاہدہ کو ختم کر دینے کی ضرورت پیش آجائے تو اگر چہ چند شرطوں کے ساتھ اس کی اجازت ہے مگر بہتر یہی ہے کہ معاہدہ کو اسی مقررہ مدت تک پورا کر دیا جائے جیسا کہ "سورۂ توبہ" کی چوتھی آیت میں بنوضمرہ اور بنومدلج کا معاہدہ نو مہینہ تک پورا کرنے کا حکم آیا ہے۔

مسئلہ (۵):.... ان مذکورہ آیتوں سے یہ معلوم ہوا کہ دشمنوں کے ساتھ ہر معاملہ میں اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں کی دشمنی ان کی ذات کے ساتھ بلکہ ان کے کافرانہ عقائد اور خیالات کے ساتھ ہے جو ان کے لیے دنیا و آخرت کی بربادی کے سبب ہیں؛ اس لیے جنگ اور صلح کے ہر موقع پر ان کو نصیحت اور خیر خواہی کرتے رہنا چاہئے، جیسا کہ ان آیتوں میں جگہ جگہ اس کا ذکر ہے کہ اگر تم اپنے برے خیالات کو چھوڑ دو گے تو یہ تمہارے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی ہے، اور اس کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ اگر توبہ نہ کی تو صرف یہی نہیں کہ تم دنیا میں قتل کر دیے جاؤ گے جس کو بہت سے کافر اپنا قومی کارنامہ سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں بلکہ یہ بھی سمجھ رکھو کہ مرنے کے بعد بھی عذاب سے نجات نہ پاؤ گے مذکورہ آیتوں میں براءت کے اعلان کے ساتھ ہمدردانہ نصیحت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

مسئلہ (۶):.... یہ ہے کہ چوتھی آیت میں جہاں مسلمانوں کو صلح کی مدت ہونے تک عہد کو پورا کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے اس کے ساتھ آیت کو اس جملہ پر ختم کیا گیا ہے "اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ" یعنی: بے شک اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں جس میں اشارہ ہے کہ معاہدہ پورا کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیں عام قوموں کی طرح اس میں خلاف ورزی کرنے کے لیے حیلے ڈھونڈیں۔

مسئلہ (۷):.... پانچویں آیت کی تفصیلات سے یہ معلوم ہوا کہ جب صحیح مقصد کے لیے کسی قوم سے جنگ چھڑ جائے تو پھر ان کے مقابلے کے لیے ہر طرح کی قوت پورے طور پر استعمال کرنا چاہئے اس وقت رحم دلی یا نرمی در حقیقت رحم دلی نہیں بلکہ بزدلی ہوتی ہے۔

مسئلہ (۸):.... مذکورہ پانچویں آیت سے یہ ثابت ہوا کہ کسی غیر مسلم کے مسلمان ہو جانے پر اعتماد تین

چیزوں پر موقوف ہے جب تک اس پر عمل نہ ہو محض کلمہ پڑھ لینے سے ان کے ساتھ جنگ بندی نہ کی جائے گی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا ان کے مقابلہ پر صدیق اکبر نے جہاد کرنے کے لیے اسی آیت سے استدلال فرما کر تمام صحابہ کو مطمئن کر دیا تھا۔

چونکہ عمرہ کو "حج اصغر" یعنی: چھوٹا حج کہا جاتا ہے اس سے ممتاز کرنے کے لیے حج کو "حج اکبر" کہا گیا اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی اصطلاح میں ہر سال کا حج "حج اکبر" ہی ہے، عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ جس سال عرفہ جمعہ کے دن واقع ہو صرف وہی "حج اکبر" ہے اس کی اصلیت اس کے سوا نہیں ہے کہ اتفاقی طور پر جس سال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع ہوا ہے اس میں عرفہ جمعہ کے دن ہوا تھا یہ اپنی جگہ ایک فضیلت ضرور ہے مگر آیت مذکورہ کے مفہوم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے "احکام القرآن" میں فرمایا ہے کہ: حج کے دنوں کو "حج اکبر" فرمانے سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ حج کے دنوں میں عمرہ نہیں ہوسکتا کیونکہ ان دنوں کو قرآن کریم نے "حج اکبر" کے لیے خاص فرمادیا ہے۔

مزید رعایت

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ

اور اگر کوئی میں سے مشرکوں پناہ مانگے آپ سے تو پناہ دیجئے اسے یہاں تک کہ سن لے وہ

كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ ۶ ع ۶/۷

کلام اللہ کا پھر پہنچا دے اسکو حفاظت کی جگہ اسکی یہ اس لئے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو نہیں جانتے (۶)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور اگر کوئی مشرک آپ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دیجئے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچا دیں یہ اس واسطے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے ۔(۶)

لفظی تحقیق: اِسْتَجَارَ: پناہ مانگے۔ ماضی کا صیغہ ہے جس کا مصدر "اِسْتِجَارَۃٌ" ہے اور مادہ: ج، و، ر

ہے۔ اَجِرْ: پناہ دے۔ امر کا صیغہ ہے اِجَارَۃٌ سے بنا ہے اور اوپر کے لفظ کی طرح جِوَارٌ ہی سے نکلا ہے اس کے معنی ہیں: پناہ دینا۔

تفسیر

پچھلی آیت میں کہا گیا تھا کہ مشرکوں کو جہاں پاؤ مار ڈالو، لیکن جو لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں اور زندگی تمہارے طریقے سے بسر کرنے پر تیار ہوں ان کو چھوڑ دو لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اسلام سے ناواقف ہوں گے ان میں سے اگر کوئی شخص مسلمانوں کے پاس اسلام کے سمجھنے کے لیے آنا چاہے ان سے پناہ مانگے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اسے اپنی پناہ میں لے لیں اس آیت میں اس کا بیان ہے۔

ارشاد ہے کہ: جو مشرک تم سے کہے کہ مجھے قتل مت کرو میں تمہارے اندر اس لیے رہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کو سمجھوں کیونکہ مجھے معلوم نہیں وہ کیا چیز ہے اور کیا چاہتا ہے تو ایسے آدمی کو اپنے اندر رہنے کی اجازت دو اور اس کی حفاظت کرو اور اس کو قرآن کریم کی آیتیں پڑھ کر سناؤ اور اسلام کے طریقے سمجھاؤ، اگر سب کچھ سن کر اور سمجھ سمجھا کر وہ یہی فیصلہ کرے کہ میں اسلام میں داخل نہیں ہوں گا تو اس کو قتل مت کرو بلکہ جہاں جانا چاہے اور سمجھتا ہو کہ وہ امن چین سے رہ سکے گا تو اسے وہاں پہنچا دو یہ حکم اس واسطے دیا جاتا ہے کہ یہ مشرک لوگ چونکہ اپنے ہی طریقے سے زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں اور اس بات سے بے خبر ہیں کہ ان کے دین سے بہتر ایک بہتر دین بھی ہے جس کا نام اسلام ہے؛ اس لیے اگر وہ چاہیں تو ان کو اپنے پاس رکھ کر سمجھنے کا موقعہ دو اور قرآن کریم کا پیغام ان تک پہنچا دو، اگر سمجھنے کے بعد بھی نہ ماننے کا فیصلہ کریں تو وہ جائیں ان کا کام، محض نہ ماننا ایسا قصور نہیں جس کی بناء پر قتل جائز ہو۔

اس آیت سے صاف سمجھ آ رہا ہے کہ مشرکوں کے قتل کرنے کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اسلام قبول نہ کرتے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ اسلام کو خواہ کچھ ہی ہو اندھا دھند مٹانے پر تلے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو محض دشمنی اور ضد کی بناء پر دنیا ہی سے مٹانا چاہتے تھے۔

احکام ومسائل

اس آیت سے چند مسئلے اور فائدے کی چیزیں حاصل ہوئیں جن کو امام ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مسئلہ (۱):.... یہ کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی کافر مسلمانوں سے اس کا مطالبہ کرے کہ مجھے اسلام کا حق ہونا دلیل سے سمجھاؤ تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کا مطالبہ پورا کریں۔

مسئلہ (۲):.... یہ کہ جو شخص اسلام کی تحقیق اور معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس آئے تو ہم پر واجب ہے کہ اس کو اجازت دیں اور اس کی حفاظت کریں اس کو کسی قسم کی تکلیف یا نقصان پہنچانا جائز نہیں، "تفسیر قرطبی" میں ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ اس کے آنے کا مقصد اللہ کا کلام سننا اور اسلام کی تحقیق کرنا ہو اور اگر کوئی دوسرا مقصد ہو تو مسلمان حاکم کو اختیار ہے کہ مناسب سمجھے تو اجازت دیں ورنہ نہ دیں۔

مسئلہ (۳):.... یہ کہ کافر حربی جس کے ساتھ ہمارا کوئی معاہدہ نہ ہو اس کو ضرورت سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے، کیونکہ اس آیت میں پناہ دینے اور ٹھہرانے کی یہ حد مقرر کردی گئی ہے کہ "حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ" یعنی: اس کو اپنے یہاں اتنا ٹھہراؤ کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔

مسئلہ (۴):.... یہ کہ مسلمان حاکم کی ذمہ داری ہے کہ جب کوئی کافر حربی کسی ضروت کی وجہ سے مسلمانوں سے اجازت (ویزا) لے کر ہمارے ملک میں داخل ہو تو اس کے حالات پر نظر رکھے اور جب وہ اپنا کام پورا کر چکے اس کو حفاظت کے ساتھ واپس کردے۔

عہد کی کوئی صورت ہی نہیں

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا

کیسے ہو ساتھ مشرکوں کے قول قرار نزدیک اللہ کے اور نزدیک پیغمبر اسکے کے سوا

الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ
ان لوگوں کے جن سے عہد کیا تم نے پاس مسجد حرمت والی کے پس جب تک سیدھے رہیں وہ تم سے

فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ⑦
سیدھے رہو تم ان سے تحقیق اللہ دوست رکھتا ہے بچ کر چلنے والوں کو (۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ مشرکوں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اس کے پیغمبر کے نزدیک عہد کیسے ہو مگر جن لوگوں نے تم سے عہد کر لیا تھا مسجد حرام کے پاس سو! جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو تحقیق اللہ کو احتیاط والے پسند ہیں۔ (۷)

لفظی تحقیق: مَااسْتَقَامُوْا: جب تک سیدھے رہیں۔ "مَا" کے معنی بہت سے ہیں یہاں جب تک کے معنی میں استعمال ہوا ہے اس کا "مَا" ظرفیہ کہتے ہیں جو کہ "مَا دَامَ" کے معنی میں ہیں۔ اِسْتَقَامُوْا: ماضی کا صیغہ ہے "اِسْتِقَامَةٌ" جس کا مصدر ہے اس کا مادہ: ق، و، م ہے اس مادے سے بہت سے لفظ ہماری زبان میں استعمال کئے جاتے ہیں، جیسے: قوم، مقام، اقامت، مستقیم، قیامت وغیرہ "اِسْتِقَامَةٌ" کے معنی سیدھا اسی سے مستقیم بنا ہے جس کے معنی سیدھے کے ہیں اس کے آگے کا لفظ "اِسْتَقِيْمُوْا" اسی مصدر سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی سیدھے رہو۔

تفسیر

پہلے رکوع کا شروع جو سورت کا بھی شروع تھا لفظ "براءت" سے کیا گیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے مشرکوں کے ساتھ عہد کے پابندی کے آئندہ ذمہ دار نہیں اور نہ کوئی ان سے نیا عہد کریں گے، یہاں سے دوسرا رکوع شروع ہوتا ہے اور اس میں اس کی وجہ بتائی گئی ہے کہ ان سے عہد کیوں نہیں کیا جا سکتا۔

ارشاد ہے کہ: ان مشرکوں سے آئندہ اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد و پیمان کی کوئی صورت نہیں، ہاں جولوگ حدیبیہ کے مقام پر صلح کے زمانے میں مسجد حرام کے پاس دس سال تک لڑائی نہ کرنے کا عہد کر چکے ہوں وہ عہد ختم ہونے تک پورا کیا جائے گا بشرطیکہ تمہاری طرف سے عہد کی کوئی خلاف ورزی سامنے نہ آئے اور تم صلح کی شرطوں کے پابند رہو جب تک وہ صلح کی ان شرطوں کے پورا کرنے کا خیال رکھیں اور سیدھے رہیں تو تم بھی اس عہد کا خیال رکھو جو ان سے ہو چکا ہے اور ان کے ساتھ سیدھی طرح کا برتاؤ کرو۔

پیچھے گزر چکا ہے کہ یہ معاہدہ قریش نے توڑا اور بنوبکر کی مدد کی جنہوں نے معاہدہ کے خلاف مسلمانوں کے دوست بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا تھا، چنانچہ مسلمانوں نے اس کے جواب میں مکہ پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔ ۹ھ میں "حج اکبر" کے موقعہ پر یہ اعلان ہوا کہ آئندہ کسی عہد کی پابندی نہ کی جائے گی، چار مہینے کی مہلت ہے اس کے بعد مشرک جزیرۂ عرب میں نہیں رہ سکتے، اعلان کے وقت کچھ قبیلے ایسے تھے جو صلحِ حدیبیہ کے عہدنامے میں داخل تھے اور مقررہ مدت ختم ہونے میں نو مہینے ابھی باقی تھے ان لوگوں نے وفاداری سے عہد کی پابندی کی اس لئے مدت کے ختم ہونے تک ان سے کچھ نہ کیا گیا۔

گزشتہ آیتوں میں جو "براءت" کے اعلان کا ذکر ہے یہاں اس کی حکمت کی بیان کیا گیا ہے اس آیت میں عہد توڑنے والے مشرکوں سے سخت دشمنی کو بیان کر کے یہ بتلایا گیا ہے کہ ان سے عہد نبھانے کی امید رکھنا غلط ہے ارشاد فرمایا کہ: چند لوگوں کے سوا جن سے مسجد حرام کے پاس تمہارا معاہدہ ہوا تھا ان مشرکوں کا کوئی عہد اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے نزدیک قابل اعتبار ہو سکتا ہے جب کہ ان یہ حال ہے کہ اگر ان کو کسی وقت بھی ذرا موقع مل جائے تو وہ تمہارے بارے میں نہ کسی رشتہ داری کا خیال کریں نہ معاہدہ کا، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ لوگ معاہدہ کرنے کے وقت بھی دل میں اس کے پورا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے بلکہ صرف باتوں سے تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں اور ان میں سے اکثر لوگ فاسق، یعنی: عہد توڑنے والے غدار ہیں۔

قرآن کریم کے اس بیان نے مسلمانوں کو یہ ہدایت دی کہ اپنے مخالف دشمنوں کے معاملہ میں بھی جب

کوئی گفتگو آئے سچائی اور انصاف کو ہاتھ سے جانے نہ دیں اور ان کے خلاف بڑھا چڑھا کر بولنے سے کام نہ لیں، جیسا کہ ان آیتوں میں مکہ کے مشرکوں کے بارے میں اس کی پوری رعایت رکھی گئی ہے کہ اگر چند لوگوں کے سوا سبھی نے عہد توڑنے کا جرم کیا تھا اور ایسے حالات میں کہنے والے سبھی کو برا کہا کرتے ہیں، مگر قرآن کریم نے اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرما کر ان لوگوں کو اس حکم سے الگ کر دیا اور یہ حکم دیا کہ جب تک وہ سیدھے راستے میں رہیں اور عہد کو نبھائیں تو تم پر بھی عہد کو پورا کرنا ضروری ہے دوسرے لوگوں کی خیانت سے متأثر ہو کر ان کے عہد کو نہ توڑو۔

صلح کیسے ہو؟

كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ
کیسے ہو اور اگر وہ غالب آجائیں اوپر تمہارے نہ لحاظ کریں تم میں رشتہ کا اور نہ عہد کا

يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸
راضی کرتے ہیں تمہیں ساتھ اپنے منہ سے اور نہیں مانتے دل ان کے اور اکثر ان میں بدکار ہیں (۸)

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ
لے لیا انہوں نے اللہ کی آیتوں کے بدلے مول تھوڑا پھر روکنے لگے اس کے راستے سے تحقیق وہ لوگ

سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹
برا ہے جو ہیں وہ کر رہے (۹)

بامحاورہ ترجمہ: صلح کیسے رہے اور اگر وہ تم پر قابو پاویں تو تمہاری قرابت کا لحاظ کریں اور نہ عہد کا تم کو اپنے منہ کی بات سے راضی کر دیتے ہیں اور ان کے دل نہیں مانتے اور ان میں سے اکثر بدعہد ہیں۔ (۸) انہوں نے اللہ کے حکم تھوڑی قیمت میں بیچ ڈالے پھر اس کے راستہ سے روکا برے کام ہیں جو وہ لوگ کر رہے ہیں۔ (۹)

لفظی تحقیق: اِنْ يَّظْهَرُوْا: اگر قابو پالیں۔مضارع کا صیغہ ہے،"ظھر "سے،"ظھر "کے معنی ہیں کسی کے اوپر غالب آجانا،"ظھر "پیٹھ کو بھی کہتے ہیں یہ معنی بھی غالب کے مناسب ہیں کیونکہ کسی جانور کی پیٹھ پر بیٹھ جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر قابو پالیا۔اِلًّا: قرابت، نزدیکی۔عربی میں قرابت، رشتہ، گہری دوستی عہدو پیمان اور قریبی کو"اِلًّا" کہتے ہیں۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: ان مشرکوں سے عہدو پیمان کی صورت ہی نہیں یہ جب تک دبے رہتے ہیں تو بظاہر عہدو پیمان بھی کر لیتے ہیں لیکن جہاں تم پر کسی قدر قابو پاتے ہیں تو نہ قرابت اور میل جول کا خیال کرتے ہیں نہ قول اقرار کی پابندی ضروری سمجھتے ہیں، جہاں تک بس چلتا ہے تمہارے ستانے میں کسر نہیں رکھتے ان کی دلی دشمنی اپنا رنگ لاتی ہے اور وہ ہر طرح سے ایذاءرسانی پر کمر کس لیتے ہیں، دل میں تمہاری طرف سے وہی کدورت، وہی عداوت اور وہی دشمنی بھری ہوئی ہے جو انہوں نے اول دن سے اختیار کر لی ہے اور جس کے باعث سوا اس کے کچھ نہیں کہ وہ تمہیں فقط اپنے طریقے پر چلانا چاہتے ہیں اور اس کو برداشت نہیں کر سکتے کہ تم کوئی نیا طریقہ اختیار کرو، خواہ عقل کے نزدیک بہترین طریقہ ہی کیوں نہ ہو،ان کے دل میں ضد بیٹھ گئی ہے ان کا دل نہیں مان سکتا کہ وہ تمہارے ساتھ مل جل کر رہیں اور پھر ان میں اکثر ایسے ہیں کہ انہیں برائی سے روکنے والی کوئی چیز نہیں، ان کی خصلت ہی بری ہے،ان کے ہاں اخلاقی معیار موجود نہیں ان کو برے بھلے کی تمیز ہی نہیں وہ مردہ ضمیر ہیں؛اس لئے کھلم کھلا جرم و گناہ کرتے ہیں اللہ کی طرف سے جو ہدایت کی باتیں انسان کی طرف آئی ہیں ان کو دنیا کے عارضی فائدے پر قربان کر چکے ہیں اور سوا اس کے کہ دوسروں کو بھی اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے راستے سے روکیں اور ان کا کوئی مقصد نہیں اپنی ہی باتوں پر اڑے ہوئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کر رہے ہیں برا کر رہے ہیں اور اس کا بدلہ ایسا ہی بدلہ پائیں گے۔

اس کے بعد عہد شکنی کرنے والوں کا جہاں یہ حال بیان فرمایا کہ ان لوگوں کے دلوں میں شروع ہی سے

خیانت تھی، عہد نبھانے کا ارادہ ہی نہ تھا یہاں بھی "اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ" فرما کر اشارہ کر دیا کہ ان میں بھی سب کا یہ حال نہیں بعض شریف لوگ ایسے بھی ہیں جو عہد پر قائم رہنا چاہتے تھے مگر دوسروں کے سامنے ان کی بات نہ چلی۔

یہ وہی مضمون ہے جس کی ہدایت قرآن کریم نے دوسری جگہ صاف لفظوں میں اس طرح دی ہے "لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا" یعنی: کسی قوم کی عداوت تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم انصاف کو چھوڑ بیٹھو۔

اس کے بعد نویں آیت میں ان غدار مشرکوں کی غداری کی وجہ اور ان کے مرض کا سبب بیان فرما کر ان کو بھی ایک ہدایت نامہ دے دیا کہ اگر یہ غور کریں تو اپنی اصطلاح کر لیں اور عام مسلمانوں کو بھی متنبہ کر دیا کہ جس سبب سے یہ لوگ خیانت میں مبتلا ہوئے اس سبب سے پورے طور پر پرہیز کو اپنا شعار بنالیں اور وہ سبب ہے دنیا کے مال کی لالچ اور اس لالچ نے ان کو اندھا کر دیا ہے تھوڑے سے پیسوں کے بدلہ میں اللہ کی آیتوں اور اپنے ایمان کو بیچ ڈالتے ہیں اور ان کا یہ کردار نہایت برا ہے۔

مل کر رہنا نہیں جانتے

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ

نہیں خیال رکھتے بارے میں مؤمن کے رشتہ داری کا اور نہ عہد کا اور یہی لوگ تو وہی

الْمُعْتَدُوْنَ ⑩ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ

حد سے نکل جانے والے ہیں (۱۰) پس اگر توبہ کریں اور قائم کریں نماز اور دیں زکوٰۃ

فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ⑪

تو وہ بھائی ہیں تمہارے میں دین اور کھولتے ہیں ہم آیتوں کو واسطے ایسے لوگوں کے جو جانتے ہیں (۱۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ کسی مسلمان کے حق میں نہ رشتہ داری کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ عہد کا، زیادتی کرنے

والے یہی لوگ ہیں۔(۱۰) سو! اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیتے رہیں تو وہ تمہارے بھائی ہیں شریعت کے حکم سے، اور ہم جاننے والوں کے واسطے حکموں کو کھول کر بیان کرتے ہیں۔(۱۱)

لفظی تحقیق: لَا يَرْقُبُوْنَ: نہیں رعایت کرتے۔ مضارع کا صیغہ ہے ر،ق،ب سے اس کا مصدر "رقابۃ" اور "رقوب" ہے، اس کے معنی ہیں: نگہبانی کرنا، رعایت کرنا، مراقبہ اسی سے بنا ہے جو مشہور لفظ ہے اور جس کے معنی ہیں کسی خاص چیز پر دھیان جمانا۔ اَلْمُعْتَدُوْنَ: زیادتی کرنے والے۔ اسم فاعل ہے "اِعْتِدَاءٌ" سے جو "عَدْوٌ" سے بنا ہے "عَدْوٌ" کے معنی ہیں: تیز دوڑنا، "اِعْتِدَاءٌ" کے معنی ہیں: حد سے آگے بڑھ جانا، سرکشی کرنا، زیادتی کرنا۔

تفسیر

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً: یعنی: صرف یہی نہیں کہ ان لوگوں نے عہد کرنے والے مسلمانوں سے غداری کی اور ان کی رشتہ داری اور عہد و پیمان کو پیچھے ڈال دیا بلکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر کسی کے بارے میں سن لیں وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا ہے تو جبھی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں نہ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ ہمارا اپنا رشتہ دار ہے، مدتوں سے ہمارا اس کا ساتھ رہا ہے اور ہم سب مل کر رہتے سہتے چلے آئے ہیں اور نہ اس کا خیال کرتے ہیں کہ یہ تو اس قبیلہ کا ہے جس سے مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہمارا قول و قرار ہو چکا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے نہ لڑیں گے۔

مشرکین کے ان حالات کا تقاضہ تو یہ ہو سکتا تھا کہ مسلمان ان سے ہمیشہ کے لئے بیزار ہو جائیں اور کسی حالت میں بھی ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں؛ اسی لئے قرآنی عدل وانصاف نے اس آیت میں یہ ہدایت دیدی۔

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ: یعنی: اگر یہ لوگ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں تو اب یہ بھی تمہارے دینی بھائی ہیں۔

اس میں یہ بتلادیا کہ کوئی کیسا ہی دشمن ہو اور کتنی ہی تکلیفیں اس نے پہنچائیں ہو جب وہ مسلمان ہوگیا تو جس طرح اللہ تعالیٰ اس کے سب پچھلے گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں، مسلمانوں پر بھی لازم ہے کہ پچھلے سب معاملات کو دل سے بھلادیں اور آج سے ان کو اپنا دینی بھائی سمجھیں اور برادرانہ تعلق کے حقوق ادا کریں۔

اسلامی برادری میں داخل ہونے کی تین شرطیں

اس آیت نے یہ واضح کردیا کہ اسلامی برادری میں داخل ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں۔ اول: کفر وشرک سے توبہ، دوسرے نماز قائم کرنا، تیسرے زکوۃ ادا کرنا، کیونکہ ایمان وتوبہ تو ایک پوشیدہ معاملہ ہے جس کی حقیقت عام مسلمانوں کو معلوم نہیں ہوسکتی؛ اس لئے اس کی دو ظاہری علامتوں کو بیان کردیا گیا، یعنی: نماز اور زکوۃ۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: اس آیت نے اہل قبلہ کے خون کو حرام کردیا ہے، یعنی: جو لوگ نماز، زکوۃ کے پابند ہوں اور اسلام کے خلاف کوئی قول وفعل ان کا ثابت نہ ہو وہ تمام حکموں میں مسلمان سمجھے جائیں گے اگرچہ ان کے دل میں صحیح ایمان نہ ہو یا نفاق ہو ان کا یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ ہے۔

عہد توڑنے والوں سے لڑو

وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ

اور اگر توڑ ڈالیں قسمیں اپنی پیچھے عہد کرنے ان کے کے اور زبان درازی کریں میں دین تمہارے

فَقَاتِلُوْۤا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾

تو لڑو سرغنوں سے کفر کے ایسے لوگ ہیں وہ نہیں ہے کچھ قسمیں ان کی شاید کہ وہ باز آجائیں (۱۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر وہ اپنی قسمیں توڑ دیں عہد کرنے کے بعد اور تمہارے دین میں عیب نکالیں تو کفر کے سرداروں سے لڑو، بیشک ان کی قسمیں کچھ نہیں تاکہ وہ باز آجائیں۔ (۱۲)

لفظی تحقیق: نَکَثُوْا: توڑ ڈالیں۔ ماضی میں صیغہ ہے "نکث" کے معنی ہیں کسی چیز کو بنا کر توڑ ڈالنا، قول وقرار سے پھر جانا۔ طَعَنُوْا: برائی نکالیں۔ ماضی کا صیغہ ہے طعن سے، طعن کے معنی ہیں: کسی تیز چیز مثلاً: نیزے وغیرہ کی نوک سے کچو کے لگانا، یہاں مراد ہے زبان درازی کرنا، برا کہنا، دل دکھانے کی باتیں کرنا۔ اَئِمَّۃَ: سردار۔ امام کی جمع ہے، امام اس کو کہتے ہیں جو کسی بات میں اوروں سے آگے ہو یا خود لوگوں نے آگے کر دیا ہو، امام بھلائی کا ہوتا ہے اور برائی کا بھی، یہاں برائی کے امام مراد ہیں جن کو اردو میں عام طور پر سرغنہ کہتے ہیں۔ اَیْمَانٌ: قسمیں۔ یمین کی جمع ہے یہ لفظ "سورۂ بقرہ" میں آچکا ہے اس کے معنی قسم کے ہیں یہاں عہد و پیان، قول وقرار مراد ہے جو بڑے زور وشور سے کیا جاتا ہے۔

تفسیر

قریش مکہ جن سے ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر ایک خاص مدت تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہوا تھا ان کے متعلق "سورۂ توبہ" کی شروع کی آیتوں میں بطور پیشین گوئی کے یہ اطلاع دیدی گئی تھی کہ یہ لوگ اپنے معاہدہ پر قائم نہ رہیں گے، جس کا ذکر "سورۂ توبہ" میں "کَیْفَ یَکُوْنُ لِلْمُشْرِکِیْنَ عَھْدٌ" کے لفظوں سے گزر چکا ہے اور پھر آٹھویں، نویں اور دسویں آیتوں میں ان کے عہد کو توڑنے کے سبب کا بیان ہے گیارہویں آیت میں اس کا بیان آیا کہ عہد شکنی کے اس بڑے گناہ کے بعد اگر یہ لوگ مسلمان ہو جائیں اور اپنے اسلام کا اظہار نماز روزہ کے ذریعہ کرنے لگیں تو پھر مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان کی پچھلی غلطیوں کا کوئی اثر اپنے معاملات میں باقی نہ رکھیں بلکہ ان کو اپنا دینی بھائی سمجھیں اور آپس میں بھائی چارے کا معاملہ کریں، اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پیش گوئی کے مطابق جب یہ لوگ عہد شکنی کر ہی ڈالیں تو پھر ان کے ساتھ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔

ارشاد ہے کہ: جو لوگ پہلے عہد کر چکے ہیں اور وہ اسے توڑ ڈالیں اور تمہارے دین کو برا کہیں تو وہ کافروں کے سرغنہ ہیں ان سے لڑو، کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے، یہ دغاباز بے ایمان ہیں، ان کے نزدیک زبان دے کر پھر جانا کوئی بات نہیں، البتہ اگر تم ان کا سر کچل دو تو شاید اپنی شرارت سے باز آجائیں۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ! یہ ہدایتیں ان لوگوں کے مقابلہ میں دی جارہی ہیں جو اپنی بات کے سوا چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو دوسرے کی چلنے نہیں دیتے اور اس کے لڑنے مرنے اور مارنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کافروں سے مراد ایسے لوگ ہیں جیسے مکہ والے تھے ان میں ایسا جذبہ ہی نہیں جو ہٹ دھرمی اور ضد سے پاک صاف ہیں اور مل کر رہنا چاہتے ہیں۔

آخر آیت میں فرمایا: لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ: (تاکہ وہ باز آجائیں) اس آخری جملہ میں بتلادیا کہ مسلمانوں کی جنگ اور جہاد کا مقصد عام دنیا کے لوگوں کی طرح دشمنی ستانا اور ان سے بدلہ لینا یا عام بادشاہوں کی طرح اپنی بادشاہت کو بڑھانے کے لئے دوسروں کے ملکوں پر قبضہ کرنا نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان کی جنگ کا مقصد شریر کافروں کو دبانا اور ان کے شر وفساد کا خاتمہ کرنا ہے تاکہ وہ لوگ اپنے غلط کاموں سے باز آجائیں۔

احکام و مسائل

طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ: کے لفظ سے بعض حضرات نے کہا ہے کہ مسلمانوں کے دین کو خراب اور برا کہنا معاہدہ کے خلاف ورزی میں شامل ہے، جو شخص اسلام اور شریعت کو برا کہے گا وہ مسلمانوں سے معاہدہ کرنے والا نہیں ہو سکتا، مگر اس بات میں تمام فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ یہاں دین کو خراب اور برا کہنے سے مراد وہ ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی تحقیر اور اہانت کے طور پر ہو، دین کے کسی حکم اور مسئلہ کی تحقیق میں کوئی علمی تنقید کرنا ہو تو وہ اس حکم میں شامل نہیں اور لغت میں اس کو طعن و تشنیع کہتے ہیں؛ اسی لئے مسلمانوں کے ملک میں کافر باشندوں کو علمی تنقید کی تو اجازت دی جاسکتی ہے مگر اسلام پر طعنہ زنی اور تحقیر و توہین کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

لڑائی کن سے ہے

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ

کیا نہیں لڑتے تم ان لوگوں سے کہ توڑ ڈالیں جنہوں نے قسمیں اپنی اور ارادہ کیا نکالنے کا پیغمبر کو

وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ

اور انہی نے چھیڑ خانی کی تم سے پہلے پہل کیا ڈرتے ہو تم ان سے سو! اللہ زیادہ حقدار ہے

اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

اس کا کہ ڈرو اس سے اگر ہو تم ایمان لانے والے (۱۳)

بامحاورہ ترجمہ: ۔کیا تم ایسے لوگوں سے نہ لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑیں اور پیغمبر کے نکالنے کی فکر میں رہے اور انہوں نے پہلے تم سے چھیڑ خانی کی، کیا ان سے ڈرتے ہو، سو! اللہ کا ڈر تم کو زیادہ ہونا چاہئے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ (۱۳)

تفسیر

اس آیت میں ان مسئلوں کو بالکل صاف کر دیا گیا ہے کہ مسلمان کیوں لڑیں؟ اور ان کو کس سے خوف کھانا چاہئے، اور آئندہ کے لئے لڑائی کا کیا قاعدہ ہوگا۔ اس آیت پر غور کرنے سے اسلام اور جنگ کا مسئلہ صاف سمجھ میں آجائے گا، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس قدر سخت حکم کن حالات میں دیئے گئے اور آئندہ یہ حکم کس طرح جاری ہوں گے۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ: کیا تم ایسے لوگوں سے نہ لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑیں۔ یہاں پر قوم سے مراد مدینہ کے یہودی ہیں جنہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نکالنے کا منصوبہ بنایا تھا، اور کہا تھا کہ ایسا ضرور ہوگا کہ عزت اور قوت والے کمزور اور ذلیل کو مدینہ سے نکال دے گا، ان کے نزدیک عزت والے وہ خود تھے اور مسلمانوں کو کمزور اور ذلیل سمجھتے تھے جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس کہنے کو اس طرح پورا کر دکھایا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان کو مدینہ سے نکال کر یہ ثابت کر دیا کہ عزت والے مسلمان ہی ہیں اور کمزور اور ذلیل یہودی ہیں۔

ارشاد ہے کہ: ان لوگوں سے لڑنا اوران پر سختی کرنا تمہارے لئے اس واسطے ضروری ہوگیا کہ انہوں نے تم سے عہد کر کے انہیں توڑا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن سے نکالنے کے پیچھے پڑ گئے، ستانے اور دکھ دینے لگے اور اس کے بعد لڑنے میں بھی پہل کی ان سے ہرگز کچھ خوف مت کرو تم لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لا چکے ہو تمہیں فقط اسی سے ڈرنا چاہئے ہرگز ان کافروں کے رعب میں نہ آنا چاہئے آدمی اپنے سے طاقتور کے سامنے فطرتاً جھکتا ہے لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو طاقتور مانتے ہی نہیں، ظاہر ہے کہ وہ کسی کے آگے کیوں جھکیں گے، یہی ایمان کے معنی ہیں کہ سوا اللہ تعالیٰ کے کسی کا خوف نہ رہے اور نہ اس کے سوا کسی سے کچھ امید ہو۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے لڑنے کا حکم ہے جو مکہ کے کافروں کی طرح اپنے سوا کسی کو آزادی کے ساتھ جینے کا حق دینے کے لئے تیار نہ ہوں اور نہ اپنے برابر کسی کو مانیں، سچی بات کہنے والے کو چین سے بیٹھنے دیں، یہاں تک کہ وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں، عہد و پیمان صلح و آشتی جس پر اس دنیا کی زندگی کا دارومدار ہے ان کے نزدیک کوئی وقعت نہ رکھتی ہو، آج اقرار کریں کل توڑ ڈالیں، یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ ان کو اپنا وقتی نفع نظر آرہا ہے گو دوسرے لوگ تباہی میں پھنس جائیں، لڑائی شروع کرنے میں پہل کریں اور دوسروں کو خواہ مخواہ الزام دیں، یہ لوگ انسانیت کے دشمن ہیں مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے لڑنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

اُن سے جنگ کرو

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ

لڑو تم ان سے | عذاب دے گا ان کو | اللہ | ساتھ ہاتھوں تمہارے کے | اور | ذلیل کرے گا ان کو | اور | مدد کریگا تمہاری

عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ

خلاف ان کے | اور | شفا دے گا | دلوں کو | اس قوم کی | جو مؤمن ہیں (۱۴) | اور | دور کرے گا | غصہ

قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۱۵

دلوں ان کے کا | اور توجہ کرے گا | اللہ | اوپر | جس کے | چاہے گا | اور | اللہ | جاننے والا | حکمت والا ہے (۱۵)

بامحاورہ ترجمہ: ۔ان سے لڑو! اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں عذاب دے گا اور رسوا کرے گا اور تم کو ان پر غالب کرے گا اور مسلمانوں کے دل ٹھنڈے کرے گا۔(۱۴) اور ان کے دل کی جلن نکالے گا اور اللہ جس کو چاہے گا توبہ نصیب کرے گا اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔(۱۵)

تفسیر

مکہ کے اندر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ٹھہرنے کے زمانے میں مسلمانوں نے جو صبر کیا اور جس طریقے سے مشرکوں کی اذیتیں سہیں، اس کی مثال پوری دنیا میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں، دنیا میں زیادہ تر یہی طرز عمل دیکھا جاتا ہے جب کسی نے کسی کو ستایا اس کی پلٹ کر اس کی خوب خبر لی، زبردست ہوا تو چت کر دیا، کمزور ہوا تو دب گیا، جو لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے وہ آخر عرب تھے ان پر حکمرانی عادت کے خلاف صبر کرنا کس قدر مشکل ہوگا، لیکن ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی حکم تھا کہ کافروں کی ساری مصیبتوں کو برداشت کرو اور اُف تک نہ کرو، گھر بار چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دو، لیکن جوابی کاروائی نہ کرو، آخر یہ سب کس لئے تھا پہلی غرض تو یہ تھی کہ اسلام جو لڑاکوں کو ملانے کے لئے آیا تھا اس کی شروع لڑائی سے نہیں صلح وصفائی سے ہو تو اچھا ہے دوسری غرض یہ تھی اگر مشرکوں نے صلح وصفائی کا طریقہ نہ مانا اور اپنی ٹیڑھی چال پر اڑ گئے تو بہر حال ان سے لڑنا پڑے گا مسلمانوں کو صبر کا حکم دے کر اس کے لئے سدھایا جا رہا تھا کہ تمہیں جاہلوں اور ضدیوں کی طرح نہیں لڑنا ہے بلکہ خوب سوچ سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے تحت لڑنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح اور صفائی اور امن دامان کی مکہ میں انتہائی کوشش کر لی لیکن مغرور ضدی کافروں نے آپ کی ایک نہ چلنے دی آخر مدینہ میں آکر حکم ہوا کہ یہ لوگ یوں نہ مانیں گے تمہیں ان سے الگ ہو کر اپنا راستہ بنانا پڑے گا۔

جو اس بات پر غور کرے گا کہ مسلمانوں نے بلا کے ستم سہے اور ستانے والوں سے ۱۳ سال تک کچھ نہ کہا اور ساری تلخیاں جھیلیں اسے ذرا بھی شبہ نہیں رہے گا کہ اسلام جنگ نہیں صلح و صفائی چاہتا ہے۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ: ان سے لڑو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے ان کو عذاب دے گا۔ یعنی: اگر تم ان کافر اور مشرکوں سے جنگ کے لئے تیار ہو گئے تو تمہارے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد ہوگی، اور یہ قوم اپنے برے عملوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی حقدار ہو چکی ہے، مگر ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب پچھلی قوموں کی طرح آسمان یا زمین سے نہیں آئے گا بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے عذاب دیں گے، اور اللہ تعالیٰ اس جنگ کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کو عذاب دے کر ان کے غم و غصہ کو دور فرما دیں گے۔

پچھلی آیت میں مسلمانوں کو اس بات کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کسی قوم سے اپنا غصہ اتارنے کے لئے نہ لڑیں بلکہ ان کی اصلاح اور ہدایت کو مقصد بنائیں، اس آیت میں یہ بتلا دیا کہ جب وہ اپنی نیت کو اللہ کے لئے صاف کر لیں اور خالص اللہ تعالیٰ کے لئے لڑیں تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ایسی صورتیں پیدا فرما دیں گے کہ ان کے غم و غصہ کا انتقام بھی خود بخود ہو جائے گا۔

وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ: اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا توبہ نصیب کرے گا۔ یعنی: اس میں سے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا اس کی توبہ قبول فرما لیں گے۔

جس سے معلوم ہوا کہ اس جہاد کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دشمن کی جماعت میں سے بہت سے لوگوں کو اسلام کی توفیق ہو جائے گی وہ مسلمان ہو جائیں گے، چنانچہ مکہ کی فتح میں بہت سے فسادی اور سرکش ذلیل و خوار ہوئے اور بہت سے لوگ اسلام کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔

کام ایک جانچ ہے

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا

کیا ۔ تم گمان کرتے ہو کہ چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ اب تک معلوم نہیں کیا اللہ نے ان کو جنہوں نے کوشش کی

مِنۡكُمۡ وَ لَمۡ يَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَ لَا رَسُوۡلِهٖ وَ لَا
میں سے تم اور نہیں بنایا سوا اللہ کے اور نہ پیغمبراس کے کے اور نہ

الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَلِيۡجَةً ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝۱۶
ایمان والوں کے گہرا دوست اور اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو (۱۶)

ع ۱۰ / ۸

بامحاورہ ترجمہ:۔ کیا تم گمان کرتے ہو کہ یوں ہی چھوڑ دیئے جاؤ گے اور حالانکہ ابھی معلوم نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا اور اللہ اور اس کے پیغمبر اور مؤمنین کے سوا کسی کو بھیدی نہیں بنایا اور اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔(۱۶)

تفسیر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم صرف اسلام کا کلمہ زبان سے کہہ لینے اور اسلام کا دعویٰ کر لینے پر آزاد چھوڑ دیئے جاؤ گے، جب تک اللہ تعالیٰ ظاہری طور پر ان سچے اور پکے مسلمانوں کو نہ دیکھ لیں جو تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں، اور اللہ اور پیغمبر اور مسلمانوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار اور دوست نہیں بناتے۔

اسی آیت میں ان عام لوگوں کو خطاب ہے جو مسلمان سمجھے جاتے تھے، اگرچہ ان میں سے بعض منافق، بعض کمزور ایمان والے بھی تھے اور بعض ایسے حضرات بھی تھے جو اسلام تو لے آئے تھے مگر ان کو اسلام کے بارے میں کچھ کچھ بے اطمینانی بھی تھی، ایسے ہی لوگوں کا حال یہ تھا کہ اپنے غیر مسلم دوستوں کو مسلمانوں کے راز بتادیا کرتے تھے؛ اس لئے اس آیت میں مخلص مسلمان کی دو علامتیں بتلادی گئیں، اول یہ کہ اللہ کے واسطے کافروں سے جہاد کریں، دوسرے یہ کہ کسی غیر مسلم کو اپنا راز دار، دوست نہ بنائیں، آخر آیت میں فرمایا: "وَ اللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ" یعنی: تم جو کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہیں، ان کے آگے کسی کا حیلہ وتاویل نہیں چل سکتی۔

یہی مضمون قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے: "اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ" "یعنی: کیا لوگوں نے یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف زبانی اپنے آپ کو مؤمن کہنے پر آزاد چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کا کوئی امتحان نہ لیا جائے گا"۔

مسجدوں کی آبادی

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى
نہیں ہے — واسطے مشرکوں کے — تا کہ — آباد کریں — مسجدیں — اللہ کی — گواہ رہتے ہوئے — پر

اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَ فِي النَّارِ
اپنے آپ — ساتھ کفر کے — یہ وہ ہیں — کہ بے کار ہیں — اعمال ان کے — اور — میں — آگ

هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾
وہ — ہمیشہ رہنے والے ہیں (۱۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ مشرکوں کا کام نہیں کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں جب کہ وہ اپنے اوپر کفر کو تسلیم کر رہے ہوں ان لوگوں کے اعمال اکارت گئے اور وہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۱۷)

لفظی تحقیق: اَنْ يَّعْمُرُوْا: آباد کریں۔ مضارع کا صیغہ ہے جو مادہ: ع، م، ر سے بنا ہے، اس کا مصدر "عِمَارَةٌ" اور "عُمْرَانٌ" ہے جس کے معنی کسی جگہ کا آباد کرنا ہے، اس کے معنی گھر بنانا بھی ہے اسی سے تعمیر بنا ہے جس کے معنی دونوں ہیں آباد کرنا اور گھر بنانا، اور ہماری زبان میں گھر بنانے کے معنی میں زیادہ استعمال ہوتا ہے، یہاں اس سے آباد کرنا اور بنانا دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ حَبِطَتْ: بیکار ہو گئے۔ یہ ماضی کا صیغہ ہے اور "حَبْطٌ" سے بنا ہے جس کے معنی: خراب ہو جانا، بگڑ جانا، اکارت ہو جانا ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ مکہ کے مشرک جو کعبہ کے ارد گرد مسجد حرام پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے وہ اس قابل نہیں کہ مسجد حرام کی حفاظت اور دیکھ بھال کر سکیں، وہ اس پر اس لئے قبضہ جمائے بیٹھے تھے کہ سارے عرب میں ان کی دھاک بیٹھے، کیونکہ عرب لوگ کعبہ کی اور مسجد حرام کی تعظیم کرتے تھے اس لئے ان کے سرپرستوں کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ارشاد ہے کہ: مشرکوں کی مسجدوں کو محافظ، متولی اور بانی ہونے کا حق نہیں پہنچتا مسجد حرام مکہ میں ہے، اللہ کے نام پر بنائی گئی ہے، مگر انہوں نے اس میں جا بجا بت کھڑے کر دیئے ہیں اور ان کے پجاری بن کر بیٹھ گئے ہیں حالانکہ مسجدیں صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے ہوتی ہیں، یہ کافر لوگ خواہ مسجدوں کی کتنی ہی دیکھ بھال، مرمت اور خدمت کریں، ان کے عمل کا ان کو کوئی پھل نہیں ملے گا؛ اس لئے ان کی ساری خدمتیں بیکار اور لاحاصل ہیں یہ لوگ اپنے کفر کی وجہ سے ہمیشہ دوزخ میں جلتے رہیں گے۔

احکام و مسائل

ایمان عمل کی روح ہے، اس کے بغیر کیسا ہی اچھا عمل ہو وہ بے فائدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہونے کے قابل نہیں ہے، آخرت کی پکڑ سے چھٹکارا پانے میں اس کا کوئی دخل نہیں، البتہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بے انصافی نہیں؛ اس لئے کافروں کے اچھے اور نیک کام بھی بالکل بیکار نہیں کئے جاتے بلکہ ان کو ان کا بدلہ دنیا میں آرام، راحت، مال و دولت کی زیادتی کی صورت میں دے دیا جاتا ہے، جس کا ذکر قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں آچکا ہے۔

مسجد کے متولّی

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ

بات یہی ہے کہ آباد کرتا ہے مسجدیں اللہ کی وہ جو ایمان لایا اللہ پر اور دن پر آخرت کے اور قائم کیا

الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ
نماز کو اور دیتا رہا زکوٰۃ اور نہ ڈرا مگر اللہ سے بس توقع ہے ان لوگوں سے کہ

يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿١٨﴾
ہوں وہ میں سے ہدایت پانے والوں میں (۱۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور نماز کو قائم کیا اور زکوٰۃ دیتا رہا اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا، سو! وہ لوگ امیدوار ہیں کہ ہدایت والوں میں سے ہوں۔ (۱۸)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: مشرکوں کا کیا منہ ہے جو مسجد پر قبضہ جمائے بیٹھیں، ان کے قبضہ کا نتیجہ اس وقت تک یہ ہوا کہ سینکڑوں بت وہاں رکھ دیئے گئے اور دھڑا دھڑ ان کی پوجا ہونے لگی، حالانکہ مسجد صرف اللہ کی عبادت کے لئے تعمیر کی جاتی ہے، اس لئے قاعدے سے مسجد کا متولی وہی ہو سکتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کو مانتا ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا جو خاص طریقہ اپنی کتابوں اور پیغمبروں کے ذریعے بندوں کو بتایا ہے اس کی پیروی کرتا ہو اور اس کے ساتھ آخرت کے دن پر یقین رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ادا کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کے حکم کے مطابق خرچ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنے کی پابندی کے ساتھ دیتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو، مشرک تو اللہ تعالیٰ سے منہ موڑ چکے اور سیدھے راستے سے بھٹک چکے، اب ان کے سیدھے راستے پر آنے کی کیا امید ہے وہ سوا اس کے کہ وہ مسجد حرام کو خراب کریں اور کیا کریں گے، البتہ وہ لوگ جن کی خوبیاں اوپر بتائی گئیں، یعنی: اللہ تعالیٰ کو اور آخرت کے دن کو ماننے والے، نمازیں باقاعدہ پڑھنے والے، زکوٰۃ دینے والے اور صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے یہی لوگ سیدھے راستے پر ہونے کے امیدوار ہو سکتے ہیں

اوران سے امید بھی کی جاتی ہے کہ مسجدوں کو باقاعدہ ٹھیک طریقے سے آباد رکھیں گے۔

عبادت خانے ہر مذہب والے بناتے ہیں، لیکن یہ کیوں کر درست ہوسکتا ہے کہ جو جگہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنی ہو اس پر اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو پوجنے والے قبضہ کرلیں، اللہ تعالیٰ کے نام سے اس کی عبادت کے لئے جو جگہ بنائی گئی ہو اس پر ان کا قبضہ رکھنا کسی حال میں مناسب نہیں ورنہ پھر اس کا اصل مقصد فوت ہوجاتا ہے۔

آیت میں پیغمبر پر ایمان لانے کے ذکر نہ کرنے کی وجہ

اس آیت میں صرف اللہ تعالیٰ پر اور روز آخرت پر ایمان کا ذکر کیا گیا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی کوئی صورت اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتی کہ پیغمبر پر ایمان لائے اور اس کے ذریعہ جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے اس کو دل سے قبول کرلے؛ اس لئے اللہ پر ایمان لانے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان خود بخود فطری طور پر آجاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کیا چیز ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا اللہ اور اس کا پیغمبر زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ پر ایمان یہ ہے کہ آدمی دل سے اس کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر ہیں، اس حدیث نے بتلادیا کہ پیغمبر پر ایمان لانا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں داخل اور شامل ہے۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے معاملہ میں کسی کے خوف سے اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہ چھوڑے ورنہ خطرناک چیزوں سے ڈرنا اور دہشت کھانا تو انسان کی طبیعت ہے، درندے اور زہریلے جانوروں سے چور ڈاکو سے طبعی طور پر ڈرنا اس کے خلاف نہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جادوگروں نے رسیوں کے سانپ بنا کر دکھلائے تو وہ ڈر گئے، اس لئے تکلیف اور نقصان پہنچانے والی چیزوں سے طبعی ڈر نہ قرآن حکیم کے خلاف ہے اور نہ پیغمبری اور ولی ہونے کے، ہاں! اس ڈر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حکموں پر عمل کرنے کو نہیں چھوڑنا چاہئے، یہی اس جگہ مراد ہے۔

احکام ومسائل

اس آیت میں مسجدوں کو آباد کرنے سے مراد مسجدوں کی انتظامی ذمہ داری ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی کافر کو وقف کی کسی چیز کا ذمہ دار بنانا جائز نہیں، ہاں! البتہ تعمیرات میں کسی کافر سے مستری مزدور کے طور پر کام لے لیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی کافر یا مشرک ثواب سمجھ کر مسجد بنادے یا مسجد کے بنانے کے لئے مسلمانوں کو چندہ دیدے تو اس کا قبول کر لینا بھی اس شرط سے جائز ہے کہ اس سے دینی یا دنیاوی نقصان یا الزام کا یا آئندہ اس پر قبضہ کر لینے کا یا احسان جتلانے کا خطرہ نہ ہو۔

اس آیت میں مسجد کو آباد کرنے کی ذمہ داری صرف مسلمانوں ہی کا کام کہا گیا ہے، اس سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ جو شخص مسجدوں کی حفاظت، صفائی اور دوسری ضرورتوں کو پوری کرتا ہے، اور جو عبادت اللہ تعالیٰ کے ذکر، دین کے علم اور قرآن پڑھنے پڑھانے کے لئے مسجد میں آتا جاتا ہے اس کے یہ اعمال اس کے مکمل مسلمان ہونے کی نشانی ہے۔

امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد میں پابندی سے حاضری دیتا ہے تو اس کے ایمان کی گواہی دو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اللہ کی مسجدوں کو ایمان والے ہی آباد کرتے ہیں۔

"بخاری" اور "مسلم شریف" کی حدیث میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: جو شخص صبح وشام مسجد میں حاضر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا ایک درجہ تیار فرمادیتے ہیں، اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: جو شخص مسجد میں آیا وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنے والا مہمان ہے اور میزبان پر حق ہے کہ مہمان کا اکرام کرے۔

مسجدوں کی ظاہری چہل پہل

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ
کیا کر دیا تم نے پانی پلانا حاجیوں کو اور بسانا مسجد حرام کا برابر اسکے جو ایمان لایا

بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ
ساتھ اللہ کے اور دن آخرت کے اور کوشش کی میں راستے اللہ کے نہیں یہ برابر نزدیک

اللّٰهِ ۚ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾
اللہ کے اور اللہ نہیں ہدایت کرتا قوم ظالموں کو (۱۹)

وقف لازم

بامحاورہ ترجمہ: کیا تم نے حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد حرام کا بسانا اس کے برابر کر دیا جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں لڑا، اللہ کے نزدیک وہ برابر نہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو راستہ نہیں دکھاتا۔ (۱۹)

لفظی تحقیق: سِقَايَةٌ: پانی پلانا۔ مصدر ہے اس کے معنی ہیں جو "سَقْیٌ" کے ہیں یہاں یہی مراد ہیں، بعد میں "سِقَايَةٌ" کے معنی اس جگہ کے بھی ہو گئے جہاں پانی پلایا جائے اور اس برتن کو بھی سقایۃ کہہ دیتے ہیں جس میں پانی پلایا جائے مثلاً: کٹورہ، پیالہ وغیرہ۔ سِقَايَةٌ: عربی میں وہ ظرف یا چھوٹا حوض ہے جس میں پانی جمع ہو اور برتنے کے کام آئے ہم لوگوں نے اپنی زبان میں اسے "سِقَاوَةٌ" بنالیا ہے۔ عِمَارَةٌ: بسانا۔ اس لفظ کی تشریح پہلے گزر چکی ہے یہاں اس سے مراد ہے ظاہری چہل پہل قائم رکھنا۔

تفسیر

مشرکوں کو اس بات پر فخر تھا کہ ہم کعبہ کی زیارت کے لئے آنے والوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں ان کو کھلاتے پلاتے ہیں ان کے آرام کا خیال کرتے ہیں ایسی جگہ کے لئے انہی باتوں کی ضرورت ہے کہ آنے جانے

والوں کے لئے آرام ملے، رونق اور چہل پہل ہو۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اصل کام جو کرنے کے ہیں وہ اور ہیں جو لوگ ان کاموں کو کرتے ہیں وہ ان سے اچھے ہیں جو ظاہری نمائش اور دھوم دھڑ لے ہی کو سب کچھ سمجھے بیٹھے ہیں۔

اصل کام یہ ہیں کہ آدمی اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، آخرت کے دن پر یقین کرے جس دن ہر شخص کے اعمال کا حساب کتاب لیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان اور مال کے ساتھ کوشش شروع کردے اور عمر بھر اسی میں لگا رہے، جو لوگ حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام میں ظاہری رونق ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاکر اپنی عمر اللہ تعالیٰ کے کام کے لئے وقف کردیتے ہیں یہ دونوں برابر نہیں، انہیں برابر سمجھنے والے لوگ اپنے اور اللہ کی مخلوق پر ظلم کررہے ہیں اللہ تعالیٰ ظالموں کو سیدھی بات نہیں سمجھاتا اور نہ سیدھی راہ دکھاتا ہے ان لوگوں کو جو مسجدوں کی ظاہری ٹیپ ٹاپ میں وقت خرچ کرتے ہیں، اس آیت سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص محض مسجد کی عمارت کھڑی کردیتا ہے اور اس کے اصلی مقصد کو پورا نہیں کرتا تعریف کے قابل نہیں ہے جب تک قرآن کریم پر عمل نہ ہو، مسجدوں میں درس وتدریس کا کام نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا ذکر نہ ہو اس شخص کی طرح جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ ظالم قوم کی رہنمائی نہیں کرتا، کفر اور شرک سب سے بڑا ظلم ہے اور کافر ومشرک سے بڑے ظالم ہیں، ایسے ظالموں کی آخرت میں کوئی بخشش نہیں ہوتی۔

یہ آیتیں ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے وہ مکہ کے بہت سے مشرک مسلمانوں کے مقابلے میں اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ ہم مسجد حرام کی آبادی کا اور حاجیوں کو پانی پلانے کا انتظام کرتے ہیں اس سے بڑھ کر کسی کا کوئی عمل نہیں ہوسکتا، اسلام لانے سے پہلے حضرت عباس رضی اللہ عنہ بدر کی جنگ میں گرفتار ہوکر مسلمانوں کی قید میں آئے اور ان کے مسلمان رشتے داروں نے ان کو اس پر ملامت کی کہ آپ ایمان کی نعمت سے محروم ہیں تو انہوں نے بھی یہی کہا تھا کہ آپ لوگ ایمان والے ہجرت کو اپنے لئے بڑی فضیلت سمجھتے ہیں، مگر ہم بھی مسجد حرام کی آبادی اور

حاجیوں کو پانی پلانے کی اہم خدمت انجام دیتے ہیں، جس کے برابر کسی کا عمل نہیں ہوسکتا، اس پر یہ آیتیں اتریں۔

اور "مسند عبدالرزاق" کی بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ مسلمان ہوجانے کے بعد طلحہ بن ابی شیبہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آپس میں گفتگو ہورہی تھی، طلحہ نے کہا مجھے وہ فضیلت حاصل ہے جو تم میں سے کسی کو حاصل نہیں کہ بیت اللہ کی چابی میرے ہاتھ میں ہے، میں اگر چاہوں تو بیت اللہ کے اندر جاکر رات گزار سکتا ہوں، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میں حاجیوں کو پانی پلانے کا انتظام کرتا ہوں، اور مسجد حرام میں میرے اختیارات ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ حضرات کس چیز پر فخر کررہے ہیں میرا تو حال یہ ہے کہ میں نے سب لوگوں میں چھ مہینہ پہلے بیت اللہ کی طرف نمازیں پڑھی ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک رہا ہوں، اس پر یہ آیتیں اتریں، جن میں واضح کردیا گیا کہ کوئی عمل کتنا ہی اعلیٰ اور فضیلت والا ہو ایمان کے بغیر اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں اور نہ شرک کی حالت میں عمل کرنے والا اللہ کے نزدیک مقبول ہے۔

اور "صحیح مسلم" میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ ایک روز جمعہ کے دن مسجد نبوی میں چند حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر کے پاس جمع تھے، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ اسلام اور ایمان کے بعد میرے نزدیک حاجیوں کو پانی پلانے سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں اور مجھے اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے عمل کی پرواہ نہیں، ایک دوسرے صاحب نے ان کے جواب میں کہا کہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد سب سے بڑا عمل ہے ان دونوں میں بحث ہونے لگی، تو حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دونوں کو ڈانٹ کر کہا کہ منبر نبوی کے پاس شور وشرابہ نہ کرو، مناسب بات یہ ہے کہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد یہ بات خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معلوم کرلو، اس تجویز کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معلوم کیا گیا، اس پر یہ آیتیں اتریں جن میں جہاد کو مسجد حرام کی آبادی اور حاجیوں کو پانی پلانے کے عمل سے زیادہ فضیلت والا عمل بتلایا گیا ہے۔

اور یہ بات بھی عقل سے دور نہیں ان آیتوں کا اترنا بنیادی طور پر مشرکوں کے فخر اور غرور کے جواب میں ہوا ہو، پھر اس کے بعد جو واقعات مسلمانوں کے سامنے آئے ان میں بھی انہی آیتوں کو دلیل کے طور پر پیش کر دیئے گئے ہوں، جس سے سننے والوں کو یہ محسوس ہوا کہ یہ آیتیں اس واقعہ کے بارے میں اتریں۔

بہر حال ان آیتوں میں دونوں قسم کے واقعات کا یہ جواب ہے کہ شرک کے ساتھ کوئی عمل کتنا ہی بڑا ہو مقبول اور فخر جتلانے کے لائق نہیں؛ اس لئے کسی مشرک کو مسجد کی آبادی یا حاجیوں کے پانی پلانے کی وجہ سے کوئی فضیلت و بزرگی مسلمانوں کے مقابلہ میں حاصل نہیں ہوسکتی اور ایمان و جہاد کا درجہ مسجد حرام کی آبادی اور حاجیوں کو پانی پلانے سے بھی افضل ہے، جو مسلمان ایمان اور جہاد میں آگے آگے رہے وہ ان مسلمانوں سے افضل ہیں جنہوں نے جہاد میں شرکت نہیں کی صرف مسجد حرام کی تعمیر اور حاجیوں کے پانی پلانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اس تمہید کے بعد ان آیتوں کے لفظوں اور ترجمہ پر پھر ایک نظر ڈالتے ہیں، ارشاد فرمایا کہ: کیا تم حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے عمل کے برابر قرار دیتے ہو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا ہو یہ لوگ اللہ کے نزدیک برابر نہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ ایمان اور جہاد میں سے ہر ایک افضل ہے، حاجیوں کی خدمت اور مسجد کی تعمیر سے، یعنی: ایمان بھی دونوں سے افضل ہے اور جہاد بھی ایمان کے افضل ہونے سے مشرکین کی بات کا جواب ہو گیا، اور جہاد کے افضل ہونے سے مسلمانوں کی بات کا جواب ہو گیا، جو مسجد حرام کی آبادی اور حاجیوں کی خدمت کو جہاد سے افضل کہتے تھے۔

یاد رہے کہ! مسجد کو آباد کرنے سے مراد انتظامات ہیں اللہ تعالیٰ کا ذکر، نماز یا اور کوئی عبادت مراد نہیں، یعنی: مکہ کے مشرک اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے بغیر مسجد حرام کی صرف ظاہری تعمیر اور انتظامات کی وجہ سے مسلمانوں پر فخر اور غرور کرتے تھے جو کہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ فضیلت والا عمل نہیں ہوسکتا؛ اسی لئے یہاں ایمان اور جہاد کو زیادہ فضیلت والا بتلایا گیا ہے۔

آخر آیت میں فرمایا کہ: یہ کوئی باریک اور پیچیدہ بات نہیں بلکہ بالکل صاف اور واضح ہے کہ ایمان سارے نیک اعمال کی بنیاد ہے اور ان سب سے افضل ہے اور یہ کہ جہاد مسجد حرام اور حاجیوں کی خدمت سے زیادہ فضیلت والا ہے مگر اللہ تعالیٰ بے انصاف لوگوں کو سمجھ نہیں دیتا؛ اس لئے وہ ایسی کھلی اور ظاہری باتوں میں بھی فضول بحث کرتے ہیں۔

احکام و مسائل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ گناہ اور نافرمانی سے انسان کی عقل بھی خراب ہو جاتی ہے اور اچھے کو برا اور برے کو اچھا عمل سمجھنے لگتا ہے، اس آیت کے آخر میں "وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ" فرما کر اسی طرف اشارہ فرما دیا ہے۔

کامیابی کی راہ

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ
جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا میں راستے اللہ کے ساتھ مالوں اپنے کے

وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝۲۰
اور جانوں اپنی سے بہت بڑے ہیں درجہ میں نزدیک اللہ کے اور وہ لوگ وہی کامیاب ہیں (۲۰)

یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ
خوشخبری دیتا ہے ان کو رب ان کا رحمت کی طرف سے اپنی اور خوشنودی کی اور باغوں کی واسطے ان کے

فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ۝۲۱ ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ
میں ان نعمت ہے پائیدار (۲۱) رہیں گے میں ان ہمیشہ تحقیق اللہ پاس اس کے

اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٢﴾
اجر ہے بڑا (۲۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جولوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے مال اور جان سے، ان کے لئے اللہ کے ہاں بڑا درجہ ہے اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔(۲۰) ان کا پروردگار ان کو اپنی طرف سے خوشخبری دیتا ہے مہربانی کی اور رضامندی کی اور باغوں کی کہ جن میں ان کو ہمیشہ کا آرام ہے۔(۲۱) ہمیشہ رہا کریں اس میں، بیشک اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔(۲۲)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ پر ایمان والے اس کے لئے ہجرت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں جان و مال کے ساتھ، اللہ کے نزدیک بڑے درجہ کے لوگ ہیں دونوں جہاں کی کامیابی انہیں لوگوں کے لئے لکھ دی گئی ہے ان کا رب انہیں خوشخبری سناتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے رحمت کرے گا اور ان سے راضی ہوگا اور ان کو ہمیشہ رہنے کے لئے باغ عنایت کرے گا، وہاں کا آرام وراحت، ناز ونعمت، کبھی ختم ہونے والا نہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے، یاد رکھو! جو کوئی اللہ کا کام کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بڑا درجہ دیتے ہیں جو اس کی فرمانبرداری کے لئے جان و مال سے حاضر ہوتا ہے اس کے لئے کسی چیز کی کمی نہیں یہ روحانی سکون اور خوشی جس کی سمجھ میں آجائیں، خوشی کے مارے جھومنے لگتا ہے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے تین عملوں کے نتیجہ میں تین انعاموں کا ذکر فرمایا ہے ایمان کے بدلے اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال ہوگی، جہاد کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی اور ہجرت کے عوض میں جنت میں مقام نصیب ہوگا، اللہ تعالیٰ نے ان کو خوشخبری سنائی ہے، فرمایا: یہ خوش قسمت لوگ ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے، اور وہاں سے نکالے جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور نہ ہی عطا کی گئی کوئی نعمت چھینی جائے گی، بے شک اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے جو ایمان والوں اور اس کے حکم کی فرمانبراری کرنے والوں کو

عطا فرمائیں گے۔

اس آیت میں اس مضمون کی تفصیل ہے جو پہلی آیت میں "لَا يَسْتَوٗنَ" کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے، یعنی: ایمان لانے والے مجاہد اور صرف مسجد حرام کے انتظام سنبھالنے والے اور حاجیوں کی خدمت کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر نہیں ہیں اس میں ارشاد فرمایا: "اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ" یعنی: وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجہ میں بڑے ہیں اور پورے کامیاب یہی لوگ ہیں۔

کیونکہ ان کے مقابلے میں جو مشرک ہیں ان کو تو کامیابی کا کوئی درجہ حاصل ہی نہیں ہوگا اور جو مسلمان ہیں اگرچہ کامیاب ہونے میں وہ بھی برابر ہیں مگر ان کی کامیابی ان سے بڑھی ہوئی ہے؛ اس لئے پورے کامیاب یہی لوگ ہیں۔

احکام و مسائل

یہاں یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ سارے نیک عمل فضیلت میں ایک جیسے نہیں بلکہ کوئی زیادہ فضیلت والے ہیں اور اسی کی مناسبت سے عمل کرنے والوں کے مرتبے میں فرق ہوتا ہے، یہ سب عمل کرنے والے ایک درجہ میں نہیں رکھے جاتے اور اس کا مدار زیادہ عمل پر نہیں، بلکہ کسی عمل کو نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ کرنے پر ہے، خواہ تھوڑا ہی ہو، "سورۂ ملک"، میں آیا ہے کہ "لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" یعنی: اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائیں گے کہ کون زیادہ اچھا عمل کرنے والا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ: تم میں سے کون زیادہ عمل کرنے والا ہے۔

یہاں سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوا کہ راحت اور نعمت کے ہمیشہ رہنے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ وہ نعمتیں کسی وقت ختم نہ ہو جائیں، دوسرے یہ کہ کسی وقت ان لوگوں کو ان نعمتوں سے جدا نہ کیا جائے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کے لئے دونوں چیزوں کی یقین دہانی کرا دی گئی کہ نہ تو نعمتیں ختم ہونگی اور نہ ہی

ان کو جنت اور اس کی نعمتوں سے نکالا جائے گا، "نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ" فرما کر نعمتوں کا دائمی ہونا بیان فرمادیا اور "خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا" فرما کر ان لوگوں کو کبھی ان نعمتوں سے الگ نہ کرنے کا اطمینان دلادیا۔

ایمان والوں کی صفت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو مت بناؤ باپوں اپنے کو اور بھائیوں اپنے کو ساتھی

اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ

اگر وہ اختیار کریں کفر کو اوپر ایمان کے اور جو ان کو ہجولی بنائے گا میں سے تم

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

تو وہ لوگ وہی ظالم ہیں (۲۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو رفیق مت گردانو، اگر وہ ایمان چھوڑ کر کفر اختیار کریں اور جو تم میں ان کی دوستی کرے پس وہ لوگ گناہ گار ہیں۔ (۲۳)

لفظی تحقیق: لَا تَتَّخِذُوْۤا: مت بناؤ۔ نہی کا صیغہ ہے اور اس کا مصدر "اِتِّخَاذٌ" ہے جو "اَخْذٌ" سے بنا ہے "اَخْذٌ" کے اصل معنی ہیں پکڑنا، "اِتِّخَاذٌ" کے معنی محاورہ کے لحاظ سے ہیں بنانا، اختیار کرنا، گردانا۔ اسْتَحَبُّوا: پسند کریں۔ ماضی کا صیغہ ہے "اِسْتِحْبَابٌ" سے جو "حُبٌّ" سے بنا ہے "اِسْتِحْبَابٌ" کے معنی ہیں کسی چیز کو محبت کے لئے اختیار کرنا، یعنی: فیصلہ کرنا کہ اس سے محبت کی جائے گی۔ اَوْلِيَآءُ: دوست۔ "وَلِيٌّ" کی جمع ہے، یہ لفظ پہلے کئی جگہ گذر چکا ہے اس سے قریبی رشتہ دار، رفیق، بے تکلف دوست وغیرہ مراد ہیں۔

تفسیر

پچھلی آیتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ جو ایمان لے آئے اور صرف اللہ کے ہو رہے وہ کبھی اس کی مرضی کے

خلاف نہیں چل سکتے، اللہ تعالیٰ ان کا ساتھی اور مددگار ہے، یہ مضمون قرآن مجید میں کئی بار دہرایا گیا ہے ''سورۂ بقرہ'' میں ہے" اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا "اللہ ایمان والوں کا دوست ہے، ''سورۂ آل عمران'' میں کہا ہے کہ ایمان والوں کو جو اللہ کے حکموں کو بجالاتے ہیں وہ لوگ پسند کریں گے جو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہی نہیں اس لئے مومن بھی ان کو اپنا قریبی، بے تکلف دوست، رفیق اور ساتھی نہ بنائیں ان کی دوستی کے لئے ایمان والے کافی ہیں، ان کو قریبی بے تکلف دوست بنانے ان کے ساتھ ہنسی، دل لگی، کھیل کود، تفریح مزاح وغیرہ میں شامل ہونے کے بجائے ایک ایسے آقا کے اطاعت گزار بنیں جو ان کو ان سب بے ہودہ باتوں سے روکتا ہے اور اپنے ہی حکموں پر عمل کرتے ہیں مشغول دیکھنا چاہتا ہے۔

اس آیت میں اسی کو اور زیادہ تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے، ارشاد ہے کہ: غیر تو غیر اگر اپنے ماں، باپ، بھائی وغیرہ بھی اللہ تعالیٰ کو نہ مانتے ہوں تو وہ آدمی کو دنیا کے کام دھندوں ہی میں پھنسانا چاہیں گے؛ اس لئے ان سے ایسے تعلقات مت رکھو کہ ان کی خاطر تمہیں اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرنے میں سستی ہو، ان کی دکھ مت دو، ان کو آرام پہنچاؤ ایسے گہرے تعلقات مت رکھو جو اللہ تعالیٰ کے کاموں میں رکاوٹ ہوں، کیونکہ ایمان لانے کے بعد پہلا کام اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی فرمانبرداری ہے۔

پچھلی آیت میں ہجرت اور جہاد کی فضیلتوں کا بیان آیا ہے جن میں وطن، رشتہ داروں، دوستوں اور مال وجائیداد سب کو چھوڑنا پڑتا ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعت پر یہ کام زیادہ مشکل ہے؛ اس لئے اگلی آیت میں ان چیزوں کے ساتھ حد سے زیادہ تعلق اور محبت کی مذمت فرما کر مسلمانوں کے ذہنوں کو ہجرت اور جہاد کے لئے آمادہ کیا گیا ہے، ارشاد فرمایا: اے ایمان والو! تم اپنے باپ دادا اور بھائیوں کو دوست مت بناؤ اگر ان کو ایمان کے بجائے کفر سے زیادہ پیار ہو اور تم میں سے جو شخص ان میں سے باوجود ان کے کفر کے دوستی رکھے گا سو! ایسے لوگ بڑے نافرمان ہیں۔

ماں باپ بہن اور تمام رشتہ داروں سے تعلق رکھنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایت سے سارا

قرآن بھرا ہوا ہے، مگر اس آیت میں یہ بتلا دیا کہ ہر تعلق کی ایک حد ہے ان میں سے ہر تعلق خواہ ماں باپ اور اولاد کا ہو یا حقیقی بھائی بہن کا، اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے مقابلے میں ترک کرنے کے قابل ہیں جس موقع پر یہ دونوں رشتے ٹکرا جائیں تو پھر اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق ہی کو قائم رکھنا ہے اس کے مقابلے میں سارے تعلقات چھوڑنا فرض ہے۔

احکام و مسائل

ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ رشتہ داری اور دوستی کے سارے تعلقات پر اللہ رب العزت اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کو ترجیح دینا ضروری ہے، جو تعلق اس سے ٹکرائے وہ چھوڑنے کے قابل ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا وہ عمل جس کی وجہ سے وہ ساری امت سے افضل اور اعلیٰ قرار پائے یہی چیز تھی کہ انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان اور مال اور ہر رشتہ و تعلق کو قربان کر دیا۔

زبردست دھمکی

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ

کہہ دیجئے اگر ہیں باپ تمہارے اور بیٹے تمہارے اور بھائی تمہارے اور بیویاں تمہاری اور

عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا

کنبہ تمہارا اور مال کمائے ہیں تم نے جو اور سوداگری کہ ڈرتے ہو ٹھپ ہوجانے سے اس کے

وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ

اور مکانات تمہیں پسند ہیں جو زیادہ پیارے نزدیک تمہارے سے اللہ اور سے پیغمبر اس کے اور جہاد

فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي

میں راہ اس کی تو ٹھہرو! یہاں تک کہ بھیجے اللہ فیصلہ اپنا اور اللہ نہیں ہدایت کرتا

ع ۸ ۳ ۹

الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۴﴾

ان لوگوں کو جو فاسق ہیں (۲۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے ماند پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جنہیں تم پسند کرتے ہو زیادہ محبوب ہیں تمہیں اللہ سے اور اس کے پیغمبر سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے اور اللہ نافرمان لوگوں کو راستہ نہیں دکھاتا۔ (۲۴)

لفظی تحقیق: اٰبَآؤُ: اَبٌ کی جمع ہے باپ، "اَبْنَآؤُ" اِبْنٌ کی جمع ہے بیٹا "اِخْوَانٌ" اَخٌ کی جمع ہے بھائی "اَزْوَاجٌ" زَوْجٌ کی جمع ہے بیوی، "عَشِیْرَۃٌ" کنبہ، برادری کو کہتے ہیں۔ اِقْتَرَفْتُمُوْھَا: کمایا تم نے جو۔ ماضی کا صیغہ ہے اِقْتِرَافٌ سے جو قَرْفٌ سے بنا ہے قَرْفٌ کے معنی ہیں کمانا، "اِقْتِرَافٌ" محنت سے کمانا، "کَسَادٌ" سرد بازاری اور مندی اردو میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں تجارت نہ چلنا، آمدنی کا نہ ہونا۔

تفسیر

یہ آیت بہت غور طلب ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ آدمی ان چیزوں کے جھگڑوں میں پھنس کر جو اس آیت میں گنوائی ہیں اللہ تعالیٰ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے کو بھول جاتا ہے ایسے آدمی کو چاہے ڈھیل دے دی جائے مگر غفلت کی سزا بھی نہ کبھی مل کر ہی رہے گی۔

جہاد کے معنی کوشش کرنے کے ہیں لیکن اس آیت کے اترنے کے وقت کوشش کی یہی صورت آ پڑی تھی کہ فسادی لوگوں سے جنگ کی جائے اس وقت اگر فسادیوں سے مقابلہ آ پڑے اور ساری تدبیریں ان کے سمجھانے کی بیکار ثابت ہوں تو جنگ ضروری ہو جاتی ہے، آخر میں ارشاد ہے کہ: جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہی کی ٹھان چکے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں سیدھا راستہ نہیں دکھاتا۔

''سورہ توبہ'' کی یہ آیت اصل میں ان لوگوں کے بارے میں اتری جنہوں نے مکہ سے ہجرت فرض

ہونے کے وقت ہجرت نہیں کی، ماں باپ بھائی بہن اولاد اور بیوی اور مال وجائیداد کی محبت نے ان کو ہجرت کرنے سے روک دیا ان کے بارے میں حق تعالیٰ شانہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس میں مندی ہونے کا اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں، اور اللہ تعالیٰ نافرمانی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتے، اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ: یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: اس جگہ حکم سے مراد عذاب ہے کہ دنیا کے تعلقات پر آخرت کے تعلقات کو قربان کر کے ہجرت نہ کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا جلد یا دیر سے، آیت میں اس جگہ ہجرت نہ کرنے کے نتیجے میں عذاب سے ڈرانا مقصود ہے، مگر یہاں پر ہجرت کے بغیر جہاد کا ذکر کیا گیا جو ہجرت کے بعد کا اگلا قدم ہے اس میں اشارہ کر دیا گیا کہ ابھی تو صرف ہجرت، یعنی: وطن چھوڑنے کا حکم ہوا ہے اس میں کچھ لوگ ہمت ہار بیٹھے آگے جہاد کا حکم آنے والا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر ساری محبتوں کو اور خود اپنی جان کو قربان کرنا پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ ہجرت ہی کو جہاد کہا گیا ہو کیونکہ وہ بھی حقیقت میں جہاد ہی کی ایک شاخ ہے۔

اور آخر آیت میں "وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ" فرما کر یہ بھی بتلا دیا کہ جو لوگ ہجرت کے حکم کے باوجود اپنے دنیاوی تعلقات کو ترجیح دے کر اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور اپنے مال وجائیداد سے چمٹے رہے ان کا یہ عمل دنیا میں بھی ان کے لئے نقصان کا ذریعہ ہوگا اور ان کا یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا کہ ہمیشہ اپنے اہل وعیال اور مال ومکان میں امن وچین سے بیٹھیں رہیں بلکہ جہاد کا حکم شروع ہوتے ہی یہ سب چیزیں ان کے لئے وبال جان بن جائیں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرمانبرداری نہ کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتے۔

احکام ومسائل

(۱)....جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرض کردی گئی تو وہ صرف فرض ہی نہیں بلکہ مسلمان ہونے کی علامت بھی تھی جو قدرت رکھنے کے باوجود ہجرت نہ کرتے وہ مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا یہ حکم مکہ فتح ہونے کے بعد منسوخ ہوگیا۔

(۲)....دراصل حکم باقی رہ گیا کہ جس زمین پر انسان کو اللہ تعالیٰ کے حکم نماز روزہ کی تعمیل ممکن نہ ہو وہاں سے ہجرت کرنا ہمیشہ کے لئے فرض ہے بشرطیکہ ہجرت پر قدرت ہو۔

(۳)....اس آیت میں براہِ راست تو خطاب ان لوگوں سے ہے جنہوں نے ہجرت فرض ہونے کے وقت دنیاوی تعلقات کی محبت کی وجہ سے ہجرت نہیں کی لیکن آیت کا لفظ تمام مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اس درجہ ہونا ضروری ہے کہ دوسرا کوئی تعلق اور کوئی محبت اس پر غالب نہ آئے۔

(۴)....حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: کوئی آدمی اس وقت تک پورے طریقے سے مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔

ان حدیثوں سے یہ بھی ثابت ہوئی کہ ایمان کے مکمل ہونے کا دارومدار اس بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سب محبتوں پر غالب ہو اور انسان کی دوستی دشمنی دینا نہ دینا خدا تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تابع ہو۔

(۵)....”قاضی بیضاوی“ نے کہا کی اس جگہ محبت سے مراد اختیاری محبت ہے غیر اختیاری اور طبعی محبت مراد نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ کا پابند نہیں کرتے جیسے کوئی بیمار دوا کی تلخی یا آپریشن کی تکلیف سے طبعاً گھبراتا ہے مگر عقلاً اس کو اپنی نجات اور سلامتی کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کرتا ہے تو وہ کسی کے نزدیک

قابل ملامت نہیں اور نہ عقل سلیم اس کی اس کو مجبور کرتی ہے کہ طبعی اور غیر اختیاری گھبراہٹ اور کراہت کو بھی دل سے نکال دے اسی طرح اگر کسی کو مال و اولاد وغیرہ کی محبت کے سبب بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کے حکموں پر عمل کرنے میں غیر اختیاری طور پر تکلیف محسوس ہو مگر اس کے باوجود اس تکلیف کو برداشت کر کے اللہ تعالیٰ کے حکموں کو بجالائے تو وہ بھی قابل ملامت نہیں بلکہ قابل تعریف ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کو اس آیت کے مطابق غالب رکھنے والا کہلائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی مدد

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ

البتہ مدد کی تمہاری اللہ نے پر موقعوں بہت سے اور دن حنین کے جب

اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ

خوش کیا تم نے کثرت تمہاری نے پس نہ فائدہ دیا اس نے تمہیں کچھ اور تنگ ہو گئی اوپر تمہارے

الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

زمین باوجود کشادہ ہونے کے پھر منہ موڑا تم نے پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہو (۲۵)

بامحاورہ ترجمہ: اللہ تعالیٰ مدد کر چکا ہے بہت سے میدانوں میں اور حنین کے دن جب تم اپنی کثرت پر خوش ہوئے پھر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئے اور تم پر زمین باوجود اپنی کشادگی کے تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ دے کے ہٹ گئے۔ (۲۵)

لفظی تحقیق: مَوَاطِنَ: موقع۔ "مَوْطِن" کی جمع ہے جس کا مادہ "و، ط، ن" ہے وطن اسی سے بنا ہے جس کے معنی رہنے کے بھی ہیں اور رہنے کی جگہ کے بھی ہیں اور اس جگہ کے بھی جہاں کوئی چیز واقع ہو؛ اس لئے یہ جنگ کے میدان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ يَوْمَ حُنَيْنٍ: حنین کا دن۔ یوم کے معنی دن کے ہیں اور

حنین ایک زمین کا نام ہے جو پہاڑوں کے نیچے واقع ہے اور ایسی زمین کو وادی کہتے ہیں یوم حنین سے مراد وہ دن ہے جس میں حنین کی جنگ ہوئی یہ جگہ مکہ کے قریب طائف کے راستے میں ہے۔

تفسیر

ان آیتوں میں حنین کی جنگ کے واقعات ہار جیت اور اسی طرح بہت سے اصولی اور فرعی مسئلوں اور فائدوں کا بیان ہے جیسا کہ اس سے پہلی سورت مکہ کی فتح اور اس کے متعلق باتوں کا ذکر تھا، شروع آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے اس انعام واحسان کا ذکر فرمایا جو مسلمانوں پر ہر حالت میں رہا، ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد فرمائی بہت سی جگہوں میں، اسی تمہید کے بعد خاص طور پر فرمایا "وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ" یعنی: حنین کی جنگ کے دن بھی اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچی۔

مکہ کی فتح کے وقت مسلمانوں کی فوج دس ہزار تھی مکہ کی فتح کے بعد خبر ملی کہ طائف کے قبیلہ ہوازن اور ثقیف وغیرہ کے سرداروں نے اپنی ساری عورتوں اور بچوں کو جمع کر کے اور سارا پیسہ اکٹھا کر کے مسلمانوں سے فیصلہ کن جنگ کی تیاری کر لی ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دس ہزار آدمیوں کو لے کر جن میں ان کے علاوہ مکہ کے دو ہزار ایسے مجاہدین بھی شامل ہو گئے تھے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، فوراً طائف کی طرف روانہ ہوئے، دشمن کی کل چار ہزار فوج تھی اور مسلمان اس وقت بارہ ہزار تھے اور بہت خوش تھے کہ جاتے ہی میدان مار لیں گے ادھر مکہ کے قبیلوں کی طرف بڑھ رہے تھے کہ مکہ سے تھوڑی دور حنین کے میدان میں دونوں کا آمنا سامنا ہوا اور مسلمانوں نے کافروں کو شکست دی اور ان کا مال لوٹنے لگ گئے۔

اتنے میں کافروں کے تیراندازوں نے جو اپنے فن میں مشہور تھے پہاڑوں پر سے تیر برسانے شروع کر دیئے اور مسلمان پریشان ہو کر بھاگ نکلے یہاں تک کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کل دس آدمی رہ گئے، آخر عباس رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو پکارا اور وہ ان کی آواز پر لوٹے اور کافروں کو شکست ہوئی۔

اس آیت میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مقابلہ کے وقت فتح صرف اللہ تعالیٰ کی مدد سے ملتی ہے آدمی اور سامان کی کمی اور زیادتی سے کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ بدر کی جنگ نے ثابت کر دیا۔

حنین کی اس جنگ کو خاص طور پر بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بہت سے واقعات اور حالات توقع کے خلاف عجیب انداز سے ظاہر ہوئے جن میں غور کرنے سے انسان کے ایمان میں قوت اور عمل میں ہمت پیدا ہوتی ہے؛ اس لئے ان آیتوں کی لفظی تفسیر سے پہلے اس جنگ کے ضروری واقعات جو تاریخ کی معتبر کتابوں میں ہیں کسی قدر تفصیل سے بیان کر دینا مناسب ہے تا کہ ان آیتوں کو سمجھنے میں آسانی ہو، اور جس مقصد کے لئے یہ واقعات بیان فرمائے گئے ہیں وہ سامنے آجائیں، ان واقعات کا زیادہ تر حصہ "مظہری" سے لیا گیا ہے جس میں حدیث اور تاریخ کی کتابوں کے حوالے سے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔

حنین کا پس منظر

حنین مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے دس میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر واقع ہے رمضان ۸ھ میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور قریش نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو عرب کا ایک بہت مشہور بہادر لڑاکا اور مالدار قبیلہ "ہوازن" جس کا کچھ حصہ طائف کے رہنے والے "بنو ثقیف" بھی تھے، ان میں ہلچل مچ گئی انہوں نے جمع ہو کر یہ کہنا شروع کیا کہ مکہ فتح ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو بہت زیادہ قوت حاصل ہو گئی ہے اس سے نمٹنے کے بعد لازمی طور پر یہ ہم پر چڑھائی کر دیں گے اس لئے عقلمندی کی بات یہ ہے کہ ان کے حملہ کرنے سے پہلے ان پر حملہ کر دیں اس کام کے لئے قبیلہ "ہوازن" نے اپنی سب جماعتوں کو جو مکہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھیں جمع کر لیا چند لوگوں کے سوا اس قبیلہ کے سب بڑے چھوٹے جن کی تعداد سو سے بھی کم تھی سب ہی جمع ہو گئے۔

اس تحریک کے لیڈر مالک بن عوف تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے، اور اسلام کے بڑے زبردست مجاہد ثابت ہوئے اس وقت مسلمانوں کے خلاف حملہ کا سب سے زیادہ جوش انہی میں تھا، قبیلہ کی بھاری اکثریت نے

ان کی رائے سے اتفاق کر کے جنگ کی تیاریاں شروع کردیں، اس قبیلہ کی چھوٹی چھوٹی دوشاخیں بنو کعب اور بنوکلاب اس رائے سے متفق نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کو کچھ بصیرت دیدی تھی انہوں نے کہا کہ اگر مشرق اور مغرب تک ساری دنیا بھی محمد کے خلاف ہوجائے گی تو وہ ان سب پر بھی غالب آئیں گے ہم خدائی طاقت کے ساتھ جنگ نہیں کرسکتے باقی سب کے سب نے معاہدے کئے، اور مالک بن عوف نے ان سب کو پوری قوت سے جنگ پر قائم رہنے کی ایک تدبیر یہ کی کہ ہر شخص کے سارے کے سارے بیوی بچے بھی ساتھ چلیں گے اور اپنا پورا مال بھی ساتھ لے کر نکلیں جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ میدان سے بھاگنے لگیں تو بیوی بچوں اور مال کی محبت ان کے پاؤں کی زنجیر بن جائے، میدان سے بھاگنے کا ان کے لئے کوئی موقع نہ رہے ان کی تعداد کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں مختلف باتیں ہیں۔

حافظ حدیث علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو زیادہ صحیح قرار دیا کہ چوبیس یا اٹھائیس ہزار کا مجمع تھا اور بعض حضرات نے چار ہزار کی تعداد بیان کی ہے، یہ ممکن ہے کہ سب اہل وعیال عورتوں بچوں سمیت تعداد چوبیس ہزار یا اٹھائیس ہزار ہو اور لڑنے والے جوان ان میں چار ہزار ہوں۔

بہر حال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ میں ان کے خطرناک ارادوں کی خبر ملی تو آپ نے ان کے مقابلہ پر جانے کا ارادہ فرمالیا، مکہ مکرمہ پر حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ لوگوں کو اسلامی تعلیمات سکھانے کے لئے چھوڑا، اور قریش سے اسلحہ اور جنگی سامان مانگنے کے طور پر لیا صفوان بن امیہ جو قریش کا سردار تھا بول اٹھا کہ کیا آپ یہ جنگی سامان ہم سے چھین کر اس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: نہیں! بلکہ مانگنے کے طور پر لیتے ہیں جس کی واپسی ہمارے ذمہ ہوگی، یہ سنکر اس نے سو زرہیں دیں، اور نوفل بن حارث نے تین ہزار نیزے اسی طرح پیش کردیئے، امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چودہ ہزار صحابہ کرام کا لشکر لے کر اس جہاد کی طرف متوجہ ہوئے جن میں بارہ ہزار مدینہ کے انصاری صحابہ تھے، جو مکہ کی فتح کے لئے آپ کے ساتھ آئے تھے جن کو "**طلقاء**" کہا جاتا ہے، شوال کی چھٹی تاریخ ہفتہ

کے دن آپ ﷺ اس جنگ کے لئے نکلے اور فرمایا کہ: کل انشاء اللہ تعالیٰ ہمارا پڑاؤ خیف بنی کنانہ کے اس مقام پر ہوگا جہاں جمع ہوکر قریش مکہ نے مسلمانوں کے خلاف بائیکاٹ کے لئے عہد نامہ لکھا تھا۔

یہ چودہ ہزار مجاہدین کا لشکر تو جہاد کے لئے نکلا ان کے ساتھ مکہ کے زیادہ تر لوگ مرد وعورت تماشائی بن کر نکلے جن کے دلوں میں عام طور یہ تھا کہ اگر اس موقع پر مسلمانوں کو شکست ہو تو ہمیں بھی اپنا انتقام لینے کا موقع ملے گا، اور یہ کامیاب ہوں تو ہمارا بھی کوئی نقصان نہیں۔

اسی قسم کے لوگوں میں ایک شیبہ بن عثمان بھی تھے، جنہوں نے بعد میں مسلمان ہوکر خود اپنا واقعہ بیان کیا کہ بدر کی جنگ میں میرا باپ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے اور چچا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا جس کے بدلہ لینے کا جوش میرے دل میں تھا میں اس موقع کو غنیمت جان کر مسلمانوں کے ساتھ ہولیا کہ جب کہیں موقع پاؤں پیغمبر ﷺ پر حملہ کردوں میں ان کے ساتھ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہا، یہاں تک کے اس جہاد کے ابتدائی وقت میں جب کچھ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑے اور وہ بھاگنے لگے تو میں موقع پا کر پیغمبر ﷺ کے قریب پہنچا مگر دیکھا کہ داہنی طرف حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ کی حفاظت کررہے ہیں اور بائیں طرف حضرت ابوسفیان ابن حارث رضی اللہ عنہ؛ اس لئے میں پیچھے پہنچ کر ارادہ کرہی رہا تھا کہ یکبارگی حملہ کردوں کہ اچانک آپ کی نظر مجھ پر پڑی اور آپ نے مجھے آواز دی کہ شیبہ یہاں آؤ! اپنے قریب بلا کر میرے سینہ پر اپنا مبارک ہاتھ رکھ دیا اور دعا کی کہ یا اللہ! اس سے شیطان کو دور کردے، اس کے بعد جب میں نظر اٹھاتا ہوں تو پیغمبر ﷺ میرے نزدیک اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہوجاتے ہیں، پیغمبر ﷺ نے مجھے حکم دیا کی جاؤ! کافروں کا مقابلہ کرو، اب تو میرا یہ حال تھا کہ میں اپنی جان کی آپ پر قربان کررہا تھا اور بڑی بے جگری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا جب پیغمبر ﷺ اس جہاد سے واپس آئے تو میں خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے میرے دل کے تمام خیالات کی نشاندہی فرمادی کہ تم مکہ سے اس نیت سے چلے تھے اور میرے گرد میرے قتل کے لئے گھوم رہے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ تم سے نیک کام لینے کا تھا جو ہوکر رہا۔

اسی طرح کا واقعہ نظر بن حارث کا پیش آیا کہ وہ بھی اسی نیت سے حنین گئے تھے وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معصومیت اور محبت ڈال دی اور ایک مرد مجاہد بن کر دشمنوں کی صفوں سے ٹکرائے۔

اس سفر میں ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ مقام اوطاس پر پہنچ کر دیکھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک درخت کے نیچے تشریف رکھتے ہیں اور ایک اور شخص آپ کے پاس بیٹھا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذکر فرمایا کہ: میں سو گیا تھا یہ شخص آیا اور میری تلوار اپنے قبضہ میں لے کر میرے سر پر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ اے محمد! اب بتلاؤ تمہیں کون میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ: اللہ تعالیٰ ہی بچا سکتا ہے، یہ سن کر تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی، ابو بردہ نے عرض کیا کہ اے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر! آپ اجازت دیجئے کہ میں خدا کے اس دشمن کی گردن مار دوں یہ دشمن کا جاسوس معلوم ہوتا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ابو بردہ خاموش رہو! جب تک کہ میرا دین سارے دینوں پر غالب نہ آجائے اللہ تعالیٰ میری حفاظت کرنے والا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کو کچھ برا بھلا نہیں کہا اور آزاد چھوڑ دیا۔

حنین کی جگہ پہنچ کر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تو حضرت سہیل بن حنظلہ رضی اللہ عنہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یہ خبر لے کر حاضر ہوئے کہ گھڑ سوار آدمی دشمن کی طرف سے آیا ہے وہ بتلا رہا ہے کہ قبیلہ ’’ھوازن‘‘ پورا کا پورا اپنے سب سامان سمیت مقابلہ پر آ گیا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سن کر مسکرایا اور کہا کہ پرواہ نہ کرو یہ سارا سامان مسلمانوں کے لئے غنیمت کا مال بن کر ہاتھ آئے گا۔

اس جگہ ٹھہر کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن عدرد کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ دشمن کے حالات کا پتہ چلائیں وہ ان کی قوم میں جا کر دو دن رہے سب حالات دیکھتے سنتے رہے ان کے لیڈر اور کمانڈ مالک بن عوف کو دیکھا کہ وہ اپنے لوگوں کو کہہ رہا ہے کہ محمد کو اب تک کسی بہادر تجربہ کار قوم سے واسطہ نہیں پڑا ہے، مکہ کے بھولے بھالے قریشیوں کا مقابلہ کر کے انہیں اپنے طاقتور ہونے کا گمان ہو گیا ہے، اب ان کو پتہ چلنے لگے گا تم سب لوگ

صبح ہوتے ہی اس طرح صف بندی کرو کہ ہر ایک کے پیچھے بیوی بچے اور مال ہو اور اپنی تلواروں کی نیام کو توڑ ڈالو، اور سب مل کر یکبارگی ہلہ بولو، یہ لوگ جنگ کے بڑے تجربہ رکھنے والے تھے، انہوں نے اپنی فوج کے چند دستوں کو مختلف گھاٹیوں میں چھپادیا تھا۔

اس طرف کافروں کے لشکر کی تیاریاں تھیں دوسری طرف مسلمانوں کا یہ پہلا جہاد تھا جس میں چودہ ہزار سپاہی مقابلہ کے لئے نکلے تھے اور جنگی سامان بھی ہمیشہ سے زیادہ تھا اور یہ لوگ بدر اور احد کے میدانوں میں یہ دیکھ چکے تھے کہ صرف تین سو تیرہ نہتے لوگوں نے ایک ہزار کے زبردست لشکر پر فتح پائی تو آج اپنی تعداد کی زیادتی اور تیاری پر نظر کر کے کچھ لوگوں کی زبان سے ایسے الفاظ نکل گئے کہ آج تو یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم کسی سے ہار جائیں آج تو مقابلہ کی دیر ہے کہ دشمن فوراً بھاگے گا۔

جنگ کے میدان کی حالت

اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ اپنی طاقت پر کوئی بھروسہ کیا جائے، چنانچہ مسلمانوں کو اس کا سبق اس طرح ملا کہ جب قبیلہ ''ہوازن'' نے اپنے طے شدہ پروگرام کے تحت یکبارگی ہلہ بولا اور گھاٹیوں میں چھپے ہوئے دستوں نے چار طرف سے گھیرا ڈال دیا گرد و غبار نے دن کو رات بنادیا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنے لگے، صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر سوار پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ رہے تھے اور بہت تھوڑے سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کی تعداد تین سو اور بعض نے ایک سو یا اس سے بھی کم بتلائی ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمے رہے اور وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے نہ بڑھیں۔

یہ حالت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ بلند آواز سے صحابہ کرام کو پکارو کہ وہ لوگ کہاں ہیں؟ اور وہ انصار کہاں ہیں؟ جنہوں نے جان کی بازی لگانے کا عہد کیا تھا سب کو چاہئے کہ واپس آئیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ہیں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ایک آواز بجلی کی طرح دوڑ گئی اور اچانک سب بھاگنے والوں کو شرمندگی ہوئی اور واپس آکر بڑی دلیری سے دشمن کا پورا مقابلہ کیا، اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مدد بھیج دی ان کا کمانڈر مالک بن عوف اپنے بیوی بچوں اور سب مال کو چھوڑ کر بھاگا، اور طائف کے قلعہ میں جا چھپا اور پھر باقی پوری قوم بھاگ کھڑی ہوئی ان کے ستر سردار مارے گئے، بعض مسلمانوں کے ہاتھ سے کچھ بچے زخمی بھی ہو گئے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا، پہلی اور دوسری آیت میں اسی مضمون کا بیان ہے، ارشاد فرمایا کہ: جب تم کو اپنی تعداد کی زیادتی پر گھمنڈ تھا پھر تمہاری وہ زیادتی تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین کشادہ ہونے کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی تسلی اتاری اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور مسلمانوں پر اور فرشتوں کے ایسے لشکر اتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو تمہارے ہاتھ سے سزا دلوائی۔

دل کا اطمینان

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ

پھر اتارا اللہ نے اطمینان اپنی طرف سے پر پیغمبر اپنے اور پر ایمان والوں اور اتارے

جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ عَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ

لشکر کہ نہیں دیکھا تم نے انہیں اور عذاب دیا ان کو جو کافر ہوئے اور یہی بدلہ ہے

الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ

کافروں کا (۲۶) پھر توبہ نصیب کرے گا اللہ بعد اس کے پر جسے چاہے

وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾

اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے (۲۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر اللہ نے اپنی طرف سے اپنے پیغمبر پر ایمان والوں پر اطمینان اتارا اور فوجیں

اتاریں کہ جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو عذاب دیا اور یہی بدلہ ہے منکروں کا۔(۲۶) پھر اس کے بعد اللہ جس کو چاہے توبہ نصیب کرے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔(۲۷)

لفظی تحقیق: **سِكِّيْنَةٌ**:اطمینان،تسلی۔یہ لفظ:س،ک،ن سے بنا ہے جس سے سکون،ساکن،مسکن وغیرہ بنے ہیں اور ہماری زبان میں استعمال ہوتے ہیں،یہ لفظ"سورۂ بقرہ"میں گذر چکا ہے مسکن کے معنی ٹھہرنے کی جگہ،سکینہ وہ چیز جس سے دل کو سکون واطمینان حاصل ہو اور پریشانی جاتی رہے۔

تفسیر

احد کے بعد حنین کا دوسرا موقعہ تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کافروں کے نرغہ میں آئے اس موقعہ پر دشمنی پر تلے ہوئے چار ہزار کافروں نے آپ کو گھیر لیا تھا اکثر مسلمان کافروں کی تیز اندازی سے پریشان ہو کر تتر بتر ہو گئے تھے،ایک روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف دس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رہ گئے تھے،جن میں آپ کے چچا حضرت عباس،شیخین،یعنی: حضرت ابوبکر وعمر،حضرت علی،آپ کے چچازاد بھائی ابوسفیان بن حارث اور ان کا بیٹا جعفر بن ابوسفیان،ربیعہ بن حارث،فضل بن عباس،اسامہ بن زید اور حضرت ایمن بن عبید رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے،جن میں سے حضرت ایمن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی شہید ہو گئے اور باقی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مسلسل آپ کی حفاظت کرتے رہے،چاروں طرف سے تیر برس رہے تھے لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ذرا سا بھی خوف نہیں تھا اللہ تعالیٰ نے آپ کا دل مضبوط کر دیا تھا،آخر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو پکارا کہ کہاں جاتے ہو ادھر آؤ،مسلمان آواز سن کر بے تحاشا دوڑتے آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں اطمینان اور سکون پیدا کر دیا۔

ارشاد ہے کہ: تھوڑی دیر میں بہت پریشانی کی حالت میں بھاگتے پھرے،لیکن آخر کار وہی سکون واطمینان جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو حاصل تھا مسلمانوں کے دل میں اتر گیا اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کے لئے آسمان

سے فرشتوں کا لشکر بھیجا جن کو انہوں نے آنکھوں سے نہیں دیکھا، لیکن دل میں ان کا اثر محسوس کیا کافروں کو شکست ہوئی، مارے گئے، لوٹے گئے، بے شک فسادیوں کی یہی سزا ہونی چاہئے تھے، اس کے بعد جب لڑائی جھگڑے ختم ہو چکے تو ان کافروں میں سے بہت سے قسمت والے مسلمان ہو گئے اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا اور ان کے گناہ معاف کر دیئے، ان آیتوں میں سکھایا گیا ہے کہ گو ہر کام کے لئے کوشش اور تدبیر ضروری ہے لیکن بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہئے۔

فرمایا: ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ: (پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر اور سب مسلمانوں پر اپنا اطمینان اتارا) مطلب یہ ہے کہ حنین کی جنگ کے ابتدائی ہلہ میں جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اپنا اطمینان اتار دیا جس سے ان کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے اور بھاگنے والے پھر لوٹ آئے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور ان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر جو مضبوطی کے ساتھ محاذ پر جمے رہے اطمینان اتارنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنی فتح قریب نظر آنے لگی اور چونکہ اطمینان کی یہ دو قسمیں تھیں ایک بھاگنے والوں کے لئے دوسری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جمے رہنے والوں کے لئے اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے "عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ" کو علیحدہ علیحدہ بیان فرمایا۔

اس کے بعد وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا: یعنی: ایسے لشکر اتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا۔

پھر فرمایا: وَ عَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ: (کافروں کو اللہ تعالیٰ نے سزا دیدی اور کافروں کی یہی سزا تھی) اس سزا سے مراد ان کا مسلمانوں کے ہاتھوں ہارنا اور بے بس ہونا ہے جو کھلی آنکھوں دیکھا گیا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی سزا تھی جو فوری طور پر مل گئی۔

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: (پھر خدا تعالیٰ جس کو چاہیں توبہ نصیب کر دیں اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے ہیں) اس میں ارشاد فرمایا ہے کہ: اس جہاد میں جن لوگوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں سزا مل چکی ہے اور ابھی تک وہ اپنے کفر پر قائم ہیں ان میں سے کچھ لوگوں کو

ایمان کی توفیق نصیب ہوگی، چنانچہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس کی تفصیل یہ ہے۔

حنین کی جنگ

حنین میں قبیلہ ''ہوازن'' اور ''ثقیف'' کے کچھ سردار مارے گئے کچھ بھاگ کھڑے ہوئے ان کے ساتھ جو ان کے بیوی بچے تھے وہ مسلمانوں کے غلام اور باندی بنالئے گئے اور جو مال تھے وہ مسلمانوں کے لئے غنیمت کا مال بن گئے جس میں چھ ہزار قیدی چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زائد بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی جس کے تقریباً چار من ہوتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کو غنیمت کے مالوں کا نگران مقرر فرمایا۔

پھر ہارے ہوئے ''ہوازن'' اور ''ثقیف'' نے مختلف جگہوں پر مسلمانوں کے خلاف اجتماع کیا مگر ہر جگہ پر ان کو شکست ہوتی گئی، وہ سخت مرعوب ہوکر طائف کے نہایت مضبوط قلعہ میں بند ہوگئے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پندرہ بیس روز اس قلعہ کا گھیراؤ کیا، یہ قلعہ بند دشمن اندر ہی سے تیر برساتے رہے، سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ: اے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر! ان لوگوں کے لئے بددعا فرمایئے، مگر آپ نے ان کے لئے ہدایت کی دعا فرمائی اور بالآخر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشورہ فرما کر واپسی کا ارادہ فرمایا اور ''جعرانہ'' کے مقام پر پہنچ کر ارادہ فرمایا کہ پہلے مکہ مکرمہ جاکر عمرہ ادا کریں، پھر مدینہ طیبہ کو واپسی ہو، مکہ والوں کی بڑی تعداد جو تماشائی بن کر مسلمانوں کی فتح اور شکست کا تماشہ دیکھنے آئی تھی اس جگہ پہنچ کر ان میں سے بہت لوگوں نے مسلمان ہونے کا اعلان کردیا۔

اسی جگہ پر پہنچ کر غنیمت کے مالوں کی تقسیم کا انتظام کیا گیا غنیمت کے مال ابھی تقسیم ہو ہی رہے تھے کہ اچانک ''ہوازن'' کے چودہ سرداروں کی ایک جماعت زہیر بن صرف کی سربراہی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی جن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رضاعی چچا ابویرقان بھی تھے، انہوں نے حاضر ہوکر عرض کیا کہ ہم مسلمان ہوچکے ہیں اور یہ درخواست کی کہ ہمارے بیوی بچے اور مال ہمیں واپس دیدیئے جائیں، اس درخواست میں عرض

کیا گیا اے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر! ہم آپ کے رضاعت کے ذریعے رشتہ دار ہیں اور جو مصیبت ہم پر آپڑی ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں آپ ہم پر احسان فرمائیں، وفد کا سردار ایک شاعر آدمی تھا، اس نے کہا کہ اے اللہ کے پیغمبر! اگر ہم روم کے بادشاہ یا عراق کے بادشاہ سے اپنی مصیبت کی بنیاد پر کوئی درخواست کرتے تو ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ بھی ہماری درخواست کو نہ ٹھکراتے، اور آپ تو بہت بلند اخلاق والے ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ موقع دوہری مشکل کا تھا کہ ایک طرف ان لوگوں پر رحم کا تقاضہ یہ تھا کہ ان کے سب قیدی اور مال ان کو واپس کردیئے جائیں، دوسری طرف یہ غنیمت کے مال میں تمام مجاہدوں کا حق ہوتا ہے، ان سب کو ان کے حق سے محروم کردینا انصاف کی بات نہیں؛ اس لئے ''صحیح بخاری'' کی روایت کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جواب میں فرمایا:

میرے ساتھ کس قدر مسلمانوں کا لشکر ہے جو ان مالوں کے حق دار ہیں میں سچی اور صاف بات کو پسند کرتا ہوں؛ اس لئے آپ لوگوں کو اختیار دیتا ہوں کہ یا تو اپنے قیدی واپس لے لو یا غنیمت کے مال، ان دونوں میں جس کو تم انتخاب کرو تمہیں دیدیئے جائیں گے، سب نے قیدیوں کی واپسی کو اختیار کیا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جمع فرما کر ایک خطبہ دیا جس میں حمد و ثناء کے بعد فرمایا کہ:

> ''یہ تمہارے بھائی توبہ کرکے آئے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ان کے قیدی ان کو واپس دیدیئے جائیں تم میں سے جو لوگ خوشی سے اپنا حصہ واپس دینے کے لئے تیار ہوں تو وہ احسان کریں اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں تو ہم ان کو آئندہ غنیمت کے مال میں سے اس کا بدلہ دیدیں گے۔''

حقوق کے معاملے میں انتہائی احتیاط کرنی چاہئے

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ خطبہ دیا تو مختلف اطراف سے یہ آواز اٹھی کہ ہم خوشی کے ساتھ سب قیدی واپس کرنے کے لئے تیار ہیں، مگر عدل وانصاف اور حقوق کے معاملہ میں احتیاط کی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی مختلف آوازوں کو کافی نہ سمجھا اور فرمایا کہ: میں نہیں جانتا کہ کون لوگ اپنا حق چھوڑنے کے لئے تیار ہوئے اور

کون ایسے ہیں جو شرما شرمی میں خاموش رہے، معاملہ لوگوں کے حقوق کا ہے اس لئے ایسا کیا جائے کہ ہر جماعت اور خاندان کے سردار اپنی اپنی جماعت کو لوگوں سے الگ الگ صحیح بات معلوم کر کے مجھے بتائیں۔

اس کے مطابق سرداروں میں سے ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ اجازت حاصل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ سب خوشی سے اپنا حق چھوڑنے کے لئے تیار ہیں، تب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب قیدی ان کو واپس کر دیئے۔

یہی لوگ تھے جن کے توبہ کرنے کو اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے، حنین کی لڑائی میں واقعات کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس کا کچھ حصہ تو خود قرآن کریم میں ہے اور باقی حدیث کی کتابوں سے لیا گیا ہے۔

احکام ومسائل

ان واقعات سے بہت سی ہدایتیں، فائدے اور حکم معلوم ہوئے ہیں اور یہی چیزیں ان واقعات کے بیان کرنے کا اصل مقصد ہے۔

ان آیتوں سے سب سے پہلی ہدایت تو یہ دی گئی کہ مسلمانوں کو کسی وقت بھی اپنی جماعت اور طاقت پر غرور نہیں کرنا چاہئے، جس طرح کمزوری اور بے سروسامانی کے وقت ان کی نظر اللہ تعالیٰ کی مدد پر رہتی ہے اسی طرح قوت اور طاقت کے وقت بھی ان کا مکمل اعتماد صرف اللہ تعالیٰ کی امداد ہی پر ہونا چاہئے۔

حنین کی جنگ میں مسلمانوں کی تعداد کی زیادتی اور جنگی سامان کے کافی ہونے کی وجہ سے بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زبان پر جو بڑا بول آ گیا تھا کہ آج تو کسی کی مجال نہیں جو ہم سے بازی لے جا سکے اللہ تعالیٰ کو اپنی اس پیاری جماعت کی زبان سے ایسے الفاظ پسند نہ آئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی حملہ کے وقت مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنے لگے، پھر اللہ تعالیٰ ہی کی غیبی امداد سے یہ میدان فتح ہوا۔

دوسری ہدایت اس واقعہ سے یہ حاصل ہوئی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کی جنگ کے لئے مکہ کے کافروں سے جو جنگی سامان زرہیں اور نیزے وغیرہ لئے تھے یہ ایسا موقع تھا کہ ان سے زبردستی بھی یہ چیزیں لی جا سکتی تھیں،

مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مانگے کی چیز کہہ کر لیا اور پھر سب کو ان کی چیزیں واپس کر دیں۔

تیسری ہدایت اس ارشاد نبوی سے حاصل ہوئی جو کہ حنین کی طرف جاتے ہوئے خیف بن کنانہ میں پڑاؤ کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: کل ہم ایسی جگہ پڑاؤ ڈالیں گے جس میں بیٹھ کر ہمارے دشمن مکہ کے قریش نے مسلمانوں کے خلاف بائیکاٹ کے فیصلہ پر عہد کیا تھا، اس میں اشارہ ہے کہ جب مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے فتح اور قوت عطا فرمادی تو اپنے پچھلے مصیبت کے دور کو نہ بھلا دیں تا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا ہو سکے۔

چوتھی ہدایت یہ حاصل ہوئی کہ ''ہوازن'' کے ہارے ہوئے لوگوں کے بار بار حملہ کرنے اور برسانے کے جواب میں رحمۃ للعالمین کی مبارک زبان سے بددعا کے بجائے ان کے لئے ہدایت کی دعا مسلمانوں کو یہ سبق دے رہی ہے کہ مسلمانوں کی جنگ و جہاد کا مقصد صرف دشمن کی نیچا کرنا نہیں بلکہ ان کو ہدایت پر لانا ہے؛ اس لئے اس کی کوشش سے کسی وقت غفلت نہیں ہونی چاہیے۔

پانچویں ہدایت یہ حاصل ہوئی کہ اگر کافر مقابلہ میں ہار جائیں تو ان سے بھی مایوس نہ ہوں؛ اس لئے کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کو پھر اسلام اور ایمان کی ہدایت دیدیں، جیسا کہ ''ہوازن'' کے وفد کے اسلام لانے سے ثابت ہوا۔

''ہوازن'' کے وفد کی درخواست پر ان کے جنگی قیدیوں کی واپسی کے وقت جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوال کیا اور ان کی طرف سے یہ آوازیں آئیں کہ ہم سب ان کی واپسی پر خوشی سے تیار ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو کافی نہ سمجھا بلکہ جدا جدا ہر ایک کی اجازت معلوم کرنے کا اہتمام فرمایا۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ حقوق کے معاملہ میں جب تک خوش دلی کا اطمینان نہ ہو جائے کسی کا حق لینا جائز نہیں، لوگوں کی زیادتی کے رعب میں آکر یا شرم کی وجہ سے خاموش رہنا رضامندی کے لئے کافی نہیں، اسی سے حضرات فقہاء کرام نے فرمایا کہ: کسی شخص پر اپنا ذاتی رعب ڈال کر کسی دینی مقصد کے لئے چندہ کرنا بھی درست نہیں کیونکہ ایسے حالات میں بہت سے شریف آدمی محض شرماشرمی کچھ دیدیتے ہیں پوری رضامندی نہیں ہوتی اس طرح کے مال میں برکت بھی نہیں ہوتی۔

پاکیزگی ایمان ہے

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ
اے لوگوجو! ایمان لائے ہو بات یہی ہے کہ مشرک لوگ سراسر گند ہیں سو! نہ آئے قریب مسجد

الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ
حرام کے بعد سال اپنے اس کے اور اگر ڈرتے ہوتم محتاجی سے توعنقریب مالدار کردے گا تم کو

اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٨﴾
اللہ سے فضل اپنے اگر چاہے تحقیق اللہ جاننے والا حکمت والا ہے(۲۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! مشرک جو ہیں وہ سراسر گند ہیں، سو! مسجد حرام کے نزدیک اس سال کے بعد نہ آنے پائیں اور اگر تم تنگدستی سے ڈرتے ہو تو عنقریب اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے تمہیں بے نیاز کردے گا اگر چاہے، بیشک اللہ سب جاننے والا حکمت والا ہے۔(۲۸)

لفظی تحقیق: نَجَسٌ: گند۔ صفت کا صیغہ ہے: ن، ج، س سے جس کا مصدر نَجَاسَةٌ ہے نَجَاسَةٌ کا معنی گندا ہونا، ناپاک ہونا۔"نَجَسٌ" جیم کے زبر کے ساتھ گند، پاخانہ، پیشاب، گوبر وغیرہ کو کہتے ہیں اور "نَجِسٌ" جیم کے زیر کے ساتھ اس چیز کو کہتے ہیں جو گند لگنے سے گندی ہوجائے، مثلاً: کپڑا وغیرہ اگر پاخانہ یا پیشاب لگ جائے تو اس کو"نَجِسٌ" کہتے ہیں، یادرہے کہ! یہاں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو"نَجَسٌ" جیم کے زبر کے ساتھ کہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مشرک سراسر گند ہیں اور یہ بھی یادرہے کہ! مشرکوں کو گند کہنا ان کے کفریہ اور شرکیہ گندے عقیدوں اور گندے عملوں کی وجہ سے ہے۔ عَيْلَةً: فقر، تنگ دستی۔ مصدر ہے، یعنی: تنگدستی ہماری زبان میں بھی عیال دار ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے ذمہ بہت سے لوگوں کا پالنا ہو اور اس وجہ سے تنگدستی سے زندگی بسر کرتا ہو، عربی زبان میں ایسے شخص کو"عائل" کہتے ہیں، جب مکہ کے کافروں نے شروع ہی میں اپنی چال چلن سے ظاہر کردیا کہ مسلمانوں کو ان کا بس چلے تو زندہ نہ رہنے دیں گے تو ان کے ساتھ مل کر زندگی

بسر کرنے سے مایوسی ہوگئی مکہ فتح ہونے کے بعد ۹ھ میں حج کے موقعہ پر اعلان کر دیا گیا کہ مسجد حرام کے اندر کوئی مشرک آئندہ داخل نہ ہونے پائے بلکہ قریب بھی نہ آنے پائے، یہاں اب مسلمانوں کا عمل دخل ہوگا مشرکوں نے ان سے دشمنی کر کے ظاہر کر دیا کہ ان کے دل حسد اور دشمنی سے بھرے ہوئے ہیں اور وہ بھی بلاوجہ، کیونکہ ان کے ساتھ اور خوش اخلاقی کی دشمنی ہے اور دنیا میں صرف یہی دو چیزیں ہیں جو آدمی کو پاک وصاف کر سکتی ہیں، اس لئے مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ مشرکوں کو مسجد حرام کے قریب بھی مت پھٹکنے دو۔

تفسیر

۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا اور اس سے اگلے سال ۹ھ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں مدینہ منورہ سے مسلمانوں کا ایک وفد حج کے لئے بھیجا اسی دوران ''سورۂ توبہ'' کی براءت سے متعلقہ آیتیں اتریں تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام دیکر مکہ مکرمہ بھیجا تا کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حج کے موقع پر مشرکوں سے بیزاری اور ان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیں ان حکموں میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ آئندہ کوئی مشرک بیت اللہ شریف کا حج اور طواف نہیں کر سکے گا، اعلان عام کیا گیا "لَا يَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ" یعنی: کوئی مشرک اس سال کے بعد حج کے لئے نہیں آئے گا" وَلَا يَطُوْفَنَّ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ" اور نہ کوئی ننگا ہرگز بیت اللہ شریف کا طواف کرے گا۔

ارشاد ہوتا ہے کہ: اے ایمان والو! بیشک مشرک صرف گند ہیں؛ اس لئے اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آئیں، گویا ۹ھ کے بعد مشرکوں کو حرم شریف سے بالکل بے دخل کر دیا گیا، چنانچہ اگلے سال جب ۱۰ھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خود حجۃ الوداع کے لئے تشریف لائے تو اس سال کوئی مشرک حج کرنے کے لئے نہیں آیا۔

امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ ''تفسیر احکام القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ نجاست دو قسم کی ہوتی ہے۔ اس کی پہلی قسم نجاست عین ہے اور اس میں ظاہری طور پر ناپاک چیزیں شامل ہیں، جیسے: پیشاب، پاخانہ، سور کا گوشت، بہنے والا خون وغیرہ، اور نجاست کی دوسری قسم حکمی ہے گناہ کو بھی نجاست سے تعبیر کیا گیا ہے خاص طور پر اللہ تعالیٰ

نے بتوں کو گندگی کا نام دیا ہے ''سورہ حج ''میں ہے "فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ " بت پرستی کی نجاست سے بچو تو گویا مشرکوں کی گندگی باعتبار ان کے گندے عقیدے اور عمل کے ہے اور اسی گندگی کی وجہ سے انہیں مسجد حرام سے روک دیا گیا ہے۔

"سورۂ توبہ" کے شروع میں کافروں اور مشرکوں سے براءت، یعنی: بیزاری کا اعلان کیا گیا تھا، آیت میں اس اعلان سے متعلق کچھ حکموں کا ذکر ہے براءت کے اعلان کا حاصل یہ تھا کہ سال بھر کے عرصہ میں تمام کافروں کے معاہدوں کو ختم یا پورے کر دیئے جائیں اور اعلان کے ایک سال بعد کوئی مشرک حرم کے حدود میں نہ رہنے پائے۔

اس آیت میں اسی کا بیان ایک خاص انداز میں کیا گیا ہے جس میں اس حکم کی وجہ بھی بتلا دی اور اس کے حکموں پر عمل کرنے میں جو بعض مسلمانوں کو خطرات تھے ان کا بھی جواب دیدیا۔

مسجدِ حرام کا مطلب

مسجد حرام کا لفظ عام طور پر تو مسجد کی اس جگہ کے لئے بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کے گرد چہار دیواری سے گھری ہوئی ہے، لیکن قرآن وحدیث میں بعض اوقات یہ لفظ پورے حرم مکہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جو کئی میل مربع کا رقبہ ہے، جس کو عام طور پر حدود حرم کہا جاتا ہے، جیسا کہ معراج کے واقعہ میں "مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ " سے سب نے یہی مراد لیا ہے، کیونکہ معراج کا واقعہ خاص مسجد حرام کے اندر سے نہیں بلکہ حضرت امہانی رضی اللہ عنہا کے مکان سے ہوا ہے جو کہ مسجد حرام سے باہر ہے اسی طرح آیت "اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ "میں مسجد حرام سے پورا حرم ہی مراد ہے کیونکہ جس صلح کے واقعہ کا اس میں ذکر ہے وہ حدیبیہ کے مقام پر ہوا ہے جو حرم کے حدود سے باہر اس کے ساتھ ملا ہوا ہے، اور حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت مروان بن حکم رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق حدیبیہ کا کچھ حصہ حرام اور کچھ حل میں ہے۔

اس سال سے کون سا سال مراد ہے؟

اوپر حرم کا جو مطلب بیان ہوا ہے اس سے معنیٰ آیت کے یہ ہوگئے کہ اس سال کے بعد مشرکوں کا حرم کے حدود میں داخل ہونا منع ہے، اس سال سے مراد کونسا سال ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ ۱۰ھ مراد ہے، مگر جمہور مفسرین کے نزدیک ۹ھ زیادہ صحیح ہے، کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں سے بیزاری کا اعلان حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ موسم حج میں اسی ۹ھ میں کرایا ہے اس لئے ۹ھ سے ۱۰ھ تک مہلت کا سال ہے، ۱۰ھ کے بعد اس قانون پر عمل ہوا۔

مشرکوں کے لئے خاص مسجد حرام میں داخلہ منع ہے

یا سب مسجدوں میں؟

یہاں جو یہ حکم دیا گیا ہے ۱۰ھ کے بعد سے کوئی مشرک مسجد حرام کے پاس نہ جانے پائے اس کے متعلق تین باتیں غور طلب ہیں کہ یہ حکم مسجد حرام کے ساتھ خاص ہے یا دنیا کی دوسری مسجدوں کے بارے میں بھی یہی حکم ہے، اور اگر مسجد حرام کے ساتھ خاص ہے تو کسی مشرک کا داخل ہونا مسجد حرام میں بالکل منع ہے یا صرف حج اور عمرہ کے لئے داخل ہونا منع ہے، ویسے جاسکتا ہے، تیسرے یہ کہ یہ حکم مشرکوں کے لئے بیان کیا گیا ہے اہل کتاب کافر بھی اس میں شامل ہیں یا نہیں؟

ان باتوں کے بارے میں چونکہ قرآن کریم کے الفاظ خاموش ہیں؛ اس لئے قرآنی اشارات اور حدیثوں کو سامنے رکھ کر مجتہدین کرام نے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق حکم بیان فرمائے۔

''تفسیر قرطبی''میں ہے کہ مدینہ کے عالموں اور خاص طور پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: مشرک ہر اعتبار سے ناپاک اور گندے ہیں، ظاہری نجاست سے بھی عام طور پر نہیں بچتے اور جنابت وغیرہ کے بعد غسل بھی نہیں کرتے، اور کفر وشرک کی باطنی نجاست تو ان میں ہے ہی؛ اس لئے یہ حکم تمام مشرکوں اور تمام مسجدوں کے لئے عام

ہے، اس لئے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور خلافت (حکومت) میں شہر کے ذمہ داروں کو یہ ہدایت کی تھی کہ مسجدوں میں داخل نہ ہونے دیں، اس فرمان میں یہ آیت بھی لکھی گئی تھی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: یہ حکم مشرکوں اور اہل کتاب کافروں کے لئے عام ہے مگر مسجد حرام کے لئے خاص ہے، دوسری مسجدوں میں ان کا داخلہ ممنوع نہیں، اور دلیل میں ثمامہ بن اثال کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ مسلمان ہونے سے پہلے جب یہ گرفتار ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا تھا۔

امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آیت میں مشرکوں کو مسجد حرام کے قریب جانے سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ سال ان کو مشرکانہ انداز سے حج و عمرہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی اور دلیل یہ ہے کہ جس وقت حج کے موسم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ بیزاری کا اعلان کر دیا گیا تو اس میں اعلان اسی کا تھا کہ "لَا يَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ" جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کر سکے گا، اس لئے اس آیت میں "فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ" کے معنی بھی اس اعلان کے مطابق یہی ہے کہ ان کو حج وعمرہ کی ممانعت کر دی گئی اور کسی ضرورت سے امیر المؤمنین (وقت کے مسلمان حکمران) کی اجازت سے داخل ہو سکتے ہیں، وفد ثقیف کا واقعہ اس پر گواہ ہے کہ مکہ فتح ہونے بعد جب ان کا وفد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا حالانکہ یہ لوگ اس وقت کافر تھے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض بھی کیا: کہ اے اللہ کے پیغمبر! یہ نجس، یعنی: ناپاک لوگ ہیں تو آپ نے فرمایا کہ: مسجد کی زمین پر ان لوگوں کی نجاست کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس حدیث سے یہ بات بھی کھل گئی کہ قرآن کریم میں مشرکوں کو نجس کہنے سے ان کی کفر و شرک کی نجاست مراد ہے جیسا کہ امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے اسی طرح حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: کوئی مشرک مسجد کے پاس نہ جائے سوائے اس کے کہ وہ کسی مسلمان کا غلام یا کنیز ہو تو اس کو ضرورت کی بناء پر داخل کر سکتے ہیں۔

یہ حدیث بھی اسی کی دلیل ہے کہ ظاہری نجاست کو سبب قرار دے کر مشرکوں کو مسجد حرام سے نہیں روکا گیا ورنہ اس میں غلام اور باندی کی کوئی شرط نہیں تھی بلکہ اصل وجہ کفر وشرک اور ان کے غالب ہوجانے کا خطرہ ہے، غلام اور باندی میں یہ خطرہ نہیں، ان کو اجازت دیدی گئی اس کے علاوہ ظاہری نجاست کے اعتبار سے تو مسلمان بھی اس میں داخل ہیں کہ ناپاکی کی حالت میں اس کے لئے بھی مسجد حرام بلکہ ہر مسجد میں داخل ہونا منع ہے۔

نیز: جمہور کی تفسیر کے مطابق مسجد حرام سے اس جگہ جب پورا احرام مراد ہے تو اس کا بھی تقاضہ یہ ہے کہ یہ ممانعت ظاہری نجاست کی بنیاد پر نہیں بلکہ کفر وشرک کی نجاست کی بناء پر ہے؛ اس لئے صرف مسجد حرام میں ان کا داخلہ ممنوع نہیں کیا گیا بلکہ پورے حرم محترم میں ممنوع قرار دیا گیا کیونکہ وہ اسلام کا ایک قلعہ ہے اس میں کسی کافر کو رکھنا گوارا نہیں کیا جاسکتا۔

امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحقیق کا حاصل یہ ہے اگرچہ نجاستوں سے مسجدوں کو پاک کرنا بھی ایک مستقل مسئلہ ہے جو قرآن کریم اور حدیثوں سے ثابت ہے لیکن اس آیت کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں بلکہ اسلام کے اس سیاسی حکم سے ہے جس کا اعلان ''سورۂ توبہ'' کے شروع میں کیا گیا ہے کہ جتنے مشرک مکہ میں موجود تھے ان سب سے حرم محترم کو خالی کرانا مقصود تھا لیکن عدل وانصاف اور رحم وکرم سے تقاضے سے مکہ فتح ہوتے ہی سب کو ایک دم نکال دینے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ جن لوگوں سے کسی خاص وقت تک معاہدہ تھا اور وہ لوگ اس معاہدہ پر قائم رہے تو ان کے معاہدہ کی مدت پوری کر کے اور باقیوں کو کچھ مہلت دے کر سال بھر کے اندر اس حکم کو پورا کرنا مقصد تھا، اس آیت میں اسی کا بیان ہے کہ اس سال کے بعد مشرکوں کا داخلہ حرم کے حدود میں ممنوع ہوجائے گا وہ حج وعمرہ نہ کرنے پائیں گے۔

اور جس طرح ''سورۂ توبہ'' کی آیتوں میں واضح طور پر یہ بیان کردیا گیا ہے کہ ۹ھ کے بعد کوئی مشرک حرم کی حدود میں داخل نہ ہوسکے گا، حدیثوں میں ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی کہ مشرکوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دو، لہٰذا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں اس وصیت پر عمل فرمایا۔

جب کافروں اور مشرکوں کا داخلہ حرم میں منع کردیا گیا تو مسلمانوں کے سامنے ایک روزی روزگار کا مسئلہ

سامنے آ گیا کہ مکہ میں تو کوئی پیداوار نہیں باہر کے آنے والے ہی اپنے ساتھ ضروریات لاتے تھے اور حج کے موسم میں مکہ والوں کے لئے سب ضروریات لاتے تھے اور حج کے موسم میں مکہ والوں کے لئے سب ضروریات جمع ہو جاتی تھیں، اب ان کا داخلہ ممنوع ہو جانے کے بعد کام کیسے چلے گا؟ اس کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا" وَاِنۡ خِفۡتُمۡ عَيۡلَةً فَسَوۡفَ يُغۡنِيۡكُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖۤ اِنۡ شَآءَ "یعنی: اگر تمہیں روزی روزگار میں پریشانی اور مشکلات کا اندیشہ ہو تو سمجھ لو کہ تمام مخلوق کو روزی پہنچانے کا نظام اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اگر وہ چاہیں گے تو تمہیں ان سب کافروں سے بے نیاز کر دیں گے، اور یہاں اگر چاہیں گے کہ قید لگانے کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں کوئی شک وشبہ ہے، بلکہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف مادی اسباب پر نظر رکھنے والوں کے لئے اگرچہ یہ بات بہت مشکل نظر آتی ہے کہ حج کے موسم میں تجارت کا ذریعہ یہی کافر و مشرک تھے، ان کا داخلہ بند کرنا اپنے لئے روزی روزگار کو ختم کرنے کی طرح ہے مگر ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان مادی اسباب کا محتاج نہیں، جب ان کا ارادہ کسی کام سے متعلق ہو جائے تو سب اسباب مطابق ہوتے چلے جاتے ہیں بس چاہنے کی دیر ہے اور کچھ نہیں اس لئے" اِنۡ شَآءَ "فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

اسلام کے دوسرے مخالفین

قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوۡنَ

لڑو ان سے جو نہیں ایمان لاتے پر اللہ کے اور نہ پر دن آخرت کے اور نہ حرام کرتے ہیں

مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَلَا يَدِيۡنُوۡنَ دِيۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِيۡنَ

اس کو جسے حرام کیا اللہ اور پیغمبر اس کے نے اور نہ مانتے ہیں دین سچا سے ان لوگوں میں

۴ ع ۵ ۱۰ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حَتّٰى يُعۡطُوا الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۲۹﴾

دی گئی جنہیں کتاب یہاں تک کہ دیں وہ جزیہ سے ہاتھ اور وہ ماتحت ہو کر ہیں (۲۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ ان لوگوں میں سے جو اہل کتاب ہیں ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ جس کو اللہ نے اور اس کے پیغمبر نے حرام کیا، حرام جانتے ہیں ان لوگوں میں سے جنہیں دی گئی کتاب نہ سچا دین قبول کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں ذلیل ہو کر۔ (۲۹)

لفظی تحقیق: لَا يَدِيْنُوْنَ: نہیں چلتے۔ مضارع کا صیغہ ہے جو دین سے بنا ہے دین کے معنی مقرر طریقہ اور یہی مصدر بھی جس کے معنی ہیں مقررہ طریقے پر چلنا اس "لَا يَدِيْنُوْنَ" بنا ہے "لَا" کے معنی ہے نہیں "لَا يَدِيْنُوْنَ" کے معنی طریقہ پر نہیں چلتے سچے طریقے پر نہیں چلتے۔ جِزْيَةٌ: اسم ہے، اس مال کو کہتے ہیں جسے دیکر کافر مسلمانوں کی حفاظت میں رہ سکتا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ لیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے بارے میں حکم دیا کہ ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ ماتحت ہو کر جزیہ ادا کریں۔

تفسیر

چنانچہ یہود و نصاریٰ اگر مسلمانوں کی عملداری میں رہنا چاہیں تو جزیہ ادا کر کے رہ سکتے ہیں اس صورت میں ان کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی اور ان سے کوئی قومی خدمت نہ لی جائے گی، اور ان کا درجہ مسلمانوں کے درجہ سے نیچے ہوگا، یعنی: کوئی حکومتی ذمہ داری ان کو نہیں سونپی جائے گی، اور ان کو جزیہ ادا کرتے رہنے کی شرط منظور نہ ہو تو عرب سے باہر نکال دیئے جائیں گے۔

اس سے پہلے مکہ کے مشرکوں سے جنگ کرنے کا ذکر تھا ان آیتوں میں اہل کتاب کافروں سے جنگ کرنے کا بیان ہے، یہ گویا تبوک کی جنگ کی تمہید ہے جو کہ اہل کتاب کے مقابلہ میں پیش آیا، مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیتیں تبوک کی جنگ کے بارے میں اتریں۔

یہاں اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا لیکن حقیقت میں یہ اس کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ حکم تمام کافروں کے لئے عام ہے کیونکہ آیت میں جن چیزوں کی بناء پر جہاد کا حکم ہوا ہے وہ سب کافروں میں پائی جاتی ہیں، البتہ اہل کتاب کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا ہے کہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کو ان کے مقابلہ میں جہاد کرنے

میں اس وجہ سے جھجک ہو کہ یہ لوگ کسی درجہ میں ایمان رکھتے ہیں، "تورات، انجیل" اور حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے؛ اس لئے ان کے ساتھ جہاد وقتال کو خاص طور پر ذکر کیا گیا۔

ان لوگوں کو چونکہ "تورات اور انجیل" کے ذریعے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا برحق ہونا معلوم تھا اس کے باوجود ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے اسلام سے انکار اور کفر پر جمے رہنے کی وجہ سے ان کا حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور اللہ تعالیٰ کی کتاب "تورات اور انجیل" پر ایمان کچھ معتبر نہیں؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ان سے لڑو اس لئے کہ ان کو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر کوئی ایمان نہیں۔

یعنی: وہ اللہ تعالیٰ کو اس طرح نہیں مانتے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اور آخرت پر جس طرح کا ایمان مطلوب ہے وہ بھی ان میں باقی نہیں رہا تھا کیونکہ ان میں بہت سے غلط عقیدے اور خراب نظریات آگئے تھے، جیسے کہ ان میں سے بہت سے لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ قیامت میں انسانی جسم کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا بلکہ وہاں ایک روحانی زندگی ہوگی، اور جنت ودوزخ بھی کوئی خاص جگہ نہیں بلکہ روح کی خوشی کا نام جنت اور پریشانی کا نام دوزخ ہے، ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں خدا تعالیٰ کے ارشادات کے سراسر خلاف ہے؛ اس لئے آخرت پر ان کا ایمان ایمان نہ ہوا، یہ لوگ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام بتلایا ہے، چوتھے یہ کہ سچے دین کو قبول نہیں کرتے تھے ان سے لڑنے کا حکم دیا گیا اور ان لوگوں سے لڑتے رہنے کی ایک حد بتلائی گئی ہے "حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ" یعنی: یہ حکم قتال کا اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک وہ ماتحت ہو کر رعیت بن کر جزیہ دینا منظور نہ کرلیں۔

احکام ومسائل

"جزیہ" کا لفظی معنیٰ بدلہ کے ہیں شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ مال ہے جو کافروں سے مسلمانوں کے ملک میں امن وسلامتی کی ضمانت کے ساتھ رہنے کے بدلہ میں لیا جاتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ کفر وشرک اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بغاوت ہے جس کی اصلی سزا قتل ہے مگر

اللہ تعالیٰ نے اپنی پوری رحمت سے ان کی سزا میں نرمی کردی کہ اگر وہ اسلامی حکومت کی رعیت بن کر عام اسلامی قانون کے ماتحت رہنا منظور کریں تو ان سے ایک معمولی رقم سی ''جزیہ'' لے کر چھوڑ دیا جائے اور اسلامی ملک کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے ان کی جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت اسلامی حکومت کی ذمہ ہوگی، ان کی مذہبی رسموں میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی اسی رقم کو ''جزیہ'' کہا جاتا ہے۔

(۱)۔۔۔۔''جزیہ'' کا تعین اگر باہمی مصالحت اور رضامندی سے ہو تو شرعاً اس کی کوئی حد بندی نہیں، جتنی مقدار اور جس چیز پر آپس میں صلح کا معاہدہ ہوجائے وہی ان سے لیا جائے گا، جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نجران کے عیسائیوں کے ساتھ معاملہ فرمایا کہ ان کی پوری جماعت سے سالانہ دو ہزار حلے (کپڑے کے جوڑے) دینے پر معاہدہ ہوگیا حلہ دو کپڑوں کے جوڑے کو کہتے ہیں ایک تہبند ایک چادر، ہر حلہ کی قیمت کا اندازہ یہ طے کردیا گیا تھا کہ ایک اوقیہ چاندی کی قیمت کا ہوگا اوقیہ چالیس درہم، یعنی: ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے گیارہ تولہ چاندی ہوتی ہے۔

(۲)۔۔۔۔اسی طرح بنی تغلب کے نصرانیوں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ معاہدہ ہوا کہ ان کا ''جزیہ'' اسلامی زکوٰۃ کے حساب سے وصول کیا جائے مگر زکوٰۃ سے دوگنا۔

(۳)۔۔۔۔اور اگر مسلمانوں نے کسی ملک کو جنگ کے ذریعہ فتح کیا، پھر وہاں کے باشندوں کی جائیداد کو انہی کی ملکیت پر برقرار رکھا اور وہ رعیت بن کر رہنے پر رضامند ہوگئے تو ان کے ''جزیہ'' کی مقرر شرح یہ ہوگی جو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں نافذ فرمائی کہ سرمایہ دار اور امیر سے چار درہم اور درمیانے درجے کے لوگوں سے اس کا آدھا دو درہم اور غریب سے جو تندرست اور محنت مزدوری یا صنعت و تجارت وغیرہ کے ذریعہ کماتا ہے اس سے اس کا بھی آدھا، یعنی: ایک درہم، یعنی: ساڑھے تین ماشہ چاندی یا اس کی قیمت لی جائے، اور جو بالکل مفلس یا معذور ہیں ان سے کچھ نہ لیا جائے اسی طرح عورتوں، بچوں اور بوڑھوں سے اور ان کے راہبوں، یعنی: درویشوں اور مذہبی رہنماؤں سے کچھ نہ لیا جائے۔

اتنی تھوڑی سی مقدار لینے کے لئے بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایتیں یہ تھیں کہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے اور جو شخص کسی کافر باشندہ پر ظلم کرے گا تو میں قیامت کے دن ظالم کے مقابلے میں اس کافر کی حمایت کروں گا۔

(۴)....اسی طرح کی روایتوں سے بعض فقہاء کرام کا مذہب یہ ہے کہ دراصل ''جزیہ'' کی کوئی خاص شرح مقرر نہیں ہے بلکہ وقت کے حکمران کی صوابدید پر ہے کہ ان لوگوں کے حالات کا جائزہ لے کر اس کے مناسب تجویز کریں۔

(۵)....اس بیان سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ جزیہ کافروں سے قتل کی سزا معاف کرنے اور امن وسلامتی کی ضمانت کا بدلہ ہے اسلام کا بدلہ نہیں؛ اس لئے یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ تھوڑے سے دام لے کر اسلام سے اعراض اور کفر پر قائم رہنے کی اجازت کیسے دیدی گئی اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اسلامی حکومت پر رہنے کی اجازت بہت سے ان لوگوں کو بھی ملتی ہے جن سے ''جزیہ'' نہیں لیا جاتا، مثلاً: عورتیں، بچے، بوڑھے، مذہبی پیشوا، معذور اگر ''جزیہ'' اسلام کا بدلہ ہوتا تو ان سے بھی لیا جانا چاہئے تھا۔

سچے دین کے خلاف باتیں

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ

اور کہا یہود نے عزیز بیٹا ہے اللہ کا اور کہا عیسائیوں نے مسیح ہے

ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ

بیٹا اللہ کا یہ کہنا ہے ان کا ساتھ منہ اپنے ریس کرتے ہیں بات ان لوگوں کی جو

كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾

کافر ہوئے سے پہلے ان کے ناس کرے ان کا اللہ کیوں کر پھرے جاتے ہیں (۳۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ باتیں

اپنے منہ سے کہتے ہیں پہلے کافروں کی بات کی ریس کرنے لگے اللہ ان کو ہلاک کرے، کہاں پھرے جاتے ہیں۔ (۳۰)

لفظی تحقیق: یُضَاهِئُوْنَ: ریس کرتے ہیں۔ مضارع کا صیغہ ہے جس کا مصدر "مُضَاهَاةٌ" اور مادہ ض، ہ، ی ہے اس سے "ضَهْيٌ" مصدر ہے جس کے معنی ہیں کسی کے ہم شکل ہونا "مُضَاهَاةٌ" کے معنی ہم شکل بنانا، نقل کرنا، ریس کرنا۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ یہود نے عزیر کو جوان کی طرح انسان تھے اتنا چڑھایا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہنے لگے اس میں شک نہیں کہ وہ اس زمانہ میں علم میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور ان کی ایک مناسب حد تک عزت اور وقار بے جانہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہنا نہایت غلط تھا، اس سے اللہ تعالیٰ کی توہین لازم آتی ہے اللہ کا تصور ہی اس بات کو چاہتا ہے کہ وہ سب سے ممتاز، اکیلا، سارے اقتدار کا مالک، باپ اور بیٹا ہونے سے پاک ہو ان کے اس عقیدے سے ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ کو جیسا ماننا چاہئے نہیں مانتے، یہی دھوکا عیسائیوں کو لگا اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہنے لگے، یہ باتیں تو کافروں کی سی ہیں، جو ان کے پہلے سے رومی یونانی اور دوسرے کافروں میں چلی آرہی ہیں اور یہ بھی دیکھا دیکھی ان کی ریس کرنے لگے ہیں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ناس کرے یہ حق دین سے پھر کر کہاں چلے جارہے ہیں۔

حق دین کی ایک پہچان اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ اس میں کسی انسان کو اس کی زندگی میں یا اس کے مرنے کے بعد اس کے بت کو اتنا ہرگز نہیں بڑھایا جاسکتا کہ وہ اللہ کے اقتدار میں اور اس کی مخصوص صفتوں میں اس کا شریک یا ساتھی بن جائے۔

دوسری پہچان حق دین کی یہ ہے وہ آخرت کو برحق ماننے پر زور دیتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کو پورا اقتدار والا ماننے کا ضروری نتیجہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور پوچھ گچھ پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

”رب“ صرف اللہ تعالیٰ ہیں

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ
بنالیاانہوں نے عالموں اپنے کو اور درویشوں اپنے کو رب سے سوا اللہ کے اور مسیح

ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا
بیٹے مریم کے اور نہیں حکم تھا ان کو مگر یہ کہ بندگی کریں معبود ایک کی نہیں کوئی معبود مگر

هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾
وہی پاک ہے وہی اس سے جو وہ شریک کرتے ہیں (۳۱)

با محاورہ ترجمہ:۔ اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو پروردگار ٹھہرالیا اور مریم کے بیٹے کو بھی حالانکہ ان کو یہی حکم ہوا تھا کہ ایک معبود کی بندگی کریں اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں وہ پاک ہے ان کے بنائے ہوئے شریکوں سے۔(۳۱)

لفظی تحقیق: اَحْبَارٌ: عالم۔ حِبْرٌ کی جمع ہے، حِبْرٌ عالم، عقلمند، دانشور کو کہتے ہیں، یہاں احبار سے مراد یہودیوں کے علماء ہیں۔ رُهْبَانٌ: درویش۔ صفت کا صیغہ ہے جو رھب سے بنا ہے رھب کے معنی ڈر اور خوف کے ہیں رھبان خوف کرنے والا اس کے لئے دوسرا لفظ راہب ہے، دونوں کے معنی ہیں اللہ کے خوف سے دنیا کی لذتیں ترک کرنے والا عیسائیوں میں درویشوں کو راہب یا رہبان کہتے ہیں۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: یہود نے اپنے علماء اور عیسائیوں نے اپنے راہبوں کو اتنا چڑھایا کہ انہی کو اپنا رب اور داتا ماننے لگے اور مسیح ابن مریم علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور اس کا شریک ٹھہرانے لگے اور ان کی پوجا کرنے لگے یہ ان کی

نہایت نازیبا حرکت تھی کیوں کہ ایک انسان اپنے جیسے انسان کو جو مادی چیزوں سے پیدا ہوا ہو معبود کیسے ٹھہرا سکتا ہے، اور پھر ان کو صاف صاف حکم بھی سنا دیا گیا تھا کہ تم ایک ہی معبود کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل ہے ہی نہیں، پھر کوئی دوسرا معبود کیسے ہوسکتا ہے یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہیں اور ان کی ہستی اسی کے دم سے ہے، چاہے تو ایک دم میں سب کو فنا کر دے اس کا شریک کسی کو ٹھہرانا انسان کی انتہائی نادانی ہے اور اللہ تعالیٰ کی معاذ اللہ سخت توہین ہے کیونکہ شریک اس کا ہوتا ہے جسے اپنے کام کے لئے دوسروں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ایک عیب ہے جس سے اللہ تعالیٰ پاک ہے۔

یہی وہ توحید کا سبق ہے جو ہر زمانے میں ہر پیغمبر اپنی اپنی قوم کو سکھاتے چلے آئے ہیں قرآن کریم نے اس کو بالکل صاف کر دیا کہ اسلام میں اس کی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی خاص صفتوں میں کسی اور کو حصہ دار یا شریک ٹھہرایا جائے، اس کا پہلا حکم یہ ہے کہ اس کو ذات وصفات میں اکیلا مانو اور کسی کے آگے نہ سر جھکاؤ اور نہ کسی سے مرادیں مانگو۔

فرمایا کہ: اہل کتاب کی ایک خرابی یہ ہے کہ پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ کے بیٹے کہنے کی غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں اور دوسری یہ کہ انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ رب بنالیا، اور مسیح ابن مریم کو بھی کبھی انہیں خدا کہا اور کبھی خدا کا بیٹا کہا، یہ عقیدہ رکھنے لگے کہ ان کو بھی خدائی اختیارات حاصل ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں کو رب بنالیا غیر اللہ کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنے لگے اور انہی کی حلال وحرام کی ہوئی چیزوں کو خدائی فیصلہ ماننے لگے۔

حاتم طائی بڑا مشہور آدمی گزرا ہے اس کی سخاوت دنیا بھر میں مشہور تھی، عیسائی مذہب رکھتا تھا اس کے بیٹے عدی اور بیٹی نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ پایا ہے شروع میں اسلام کے خلاف تھا اور اسلام کے خلاف جنگ میں بھی حصہ لیا مگر آخر میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت عطا فرمائی اور خود چل کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، ''ترمذی شریف'' اور ''مسند احمد'' کی روایت میں آتا ہے کہ جب عدی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کے گلے میں صلیب لٹک رہی تھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: "اَلْقِ عَنْكَ هٰذَا الْوَثْنَ" اس بت کو اپنی گردن سے

اتار پھینکو، عدی نے وہ صلیب فوراً اتار پھینکی، صنم اس بت کو کہتے ہیں جو کسی شکل وصورت پر بنایا گیا ہو اور ''وثن'' ان گھڑت بت کو کہتے ہیں، بہر حال آپ نے وہ صلیب گلے سے اتروا دی اور یہی آیت پڑھی ''اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ.....الآیة ''یعنی: یہود ونصاریٰ نے اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنالیا ہے، اس پر عدی نے عرض کیا، اے اللہ کے پیغمبر! ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے اور نہ ان کی رب بناتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ: تم ان عالموں اور درویشوں کو ان کی مرضی سے حلال کی ہوئی چیزوں کو حلال اور حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے؟ کہا ایسا تو ہے، فرمایا کہ: یہی رب بنانا ہے۔

صرف سجدہ کرنے سے ہی رب نہیں بنتا بلکہ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے حلال وحرام کرنے کا اختیار مان لیا جائے تو یہ بھی رب بناتا ہے کسی چیز کو حلال وحرام ٹھہرانے کا سارا کا سارا اختیار رب تعالیٰ کے پاس ہے اگر ایسا کوئی فعل پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز قطعی طور پر حلال یا حرام ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حلال وحرام کرنے کو بیان کرنے والا ہے کسی عالم یا درویش کے اختیار میں نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے جس چیز کو چاہے حلال یا حرام کرے۔

شاہ عبد القادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: عالم کا قول عوام کے لئے سند کی حیثیت رکھتا ہے بشرطیکہ وہ شرع سے سمجھ کر کہا گیا ہو اور اگر وہ قول قرآن وسنت کے بجائے خود اپنی طرف سے بنا کر کہا جائے تو وہ سند نہیں ہوگا ، یہودیوں میں یہی بیماری تھی کہ وہ اپنی طرف سے حکم لگا کر اسے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے تھے انہوں نے خنزیر کو خود اپنی طرف سے حلال قرار دیا پھر ان پڑھ لوگوں کے ناحق مال کھانے کو جائز قرار دیا، کہتے تھے کہ : ہمارے لئے امیوں، یعنی: عربوں کا مال کھانے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ مشہور تابعی ہیں آپ امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے بڑے فقیہ، محدث، غازی، مجاہد اور مجتہد تھے آپ کا مصرعہ مشہور ہے ''وهل افسد الدين الا الملوك وأحبار سوءورهبانها ''یعنی: دین کو بگاڑنے والے یا تو بادشاہ ہیں جو اپنی طاقت اور مال ودولت کے بل بوتے پر دین کو اپنی مرضی کا بناتے ہیں، یا پھر برے عالم اور برے درویش ہیں جنہوں

نے دین میں بگاڑ پیدا کیا ہے اگر بادشاہ بگڑیں گے تو مسلمانوں کی دنیا تباہ ہوگی اور اگر عالم بگڑیں گے تو دین تباہ ہوگا اور اگر پیر صاحبان بگڑیں گے تو اخلاق تباہ ہو جائے گا، اگر یہ تینوں طبقے بگڑ جائیں تو پھر قوم پستی کی گہرائیوں میں جا کر گری گی، انہیں تو صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ ایک اللہ کی عبادت کریں اور عبادت کے لائق اس کے سوا کوئی نہیں، مگر لوگوں نے علماء اور درویشوں کو رب بنالیا ہے یہ ان کو حرام حلال کا حکم دیتے ہیں، فرمایا: اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہر چیز کو جاننے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اس کے سوا کوئی پیدا کرنے والا اور کام بنانے والا نہیں ان یہود ونصاریٰ نے علماء اور درویشوں کو حلال وحرام کے اختیارات کا مالک سمجھ رکھا ہے اور عزیر اور مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنادیا، ان کی عقلوں پر پردہ پڑ گیا ہے اور یہ دینی اعتبار سے تباہ ہو گئے ہیں۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ذات تو پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ خدا کا شریک بناتے ہیں اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک ہے نہ کوئی اس کا ذات میں شریک ہے نہ صفات میں نہ علم نہ قدرت میں اور نہ ارادے میں توبہ نہیں کی تو پھر اس کی بخشش ہرگز نہیں ہوگی۔

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ

ارادہ کرتے ہیں کہ بجھادیں روشنی اللہ کی ساتھ منہ اپنے کے اور نہ مانے گا اللہ دیگر یہ کہ

يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝۳۲

پورا کرے روشنی اپنی کو اور اگرچہ ناراض ہوں کافر لوگ (۳۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی اپنے منہ سے بجھادیں اور اللہ اپنی روشنی پوری کئے بغیر نہ رہے گا کافر پڑے برا مانیں۔(۳۲)

لفظی تحقیق: اَنْ يُّطْفِـُٔوْا: بجھادیں۔ مضارع کا صیغہ ہے جس کے آخر کا نون "اَنْ" کی وجہ سے گر پڑا ہے اس کا مصدر "اطفاء" ہے جو ط، ف، ء سے بنا ہے "طفء" سے مصدر "طفوء" ہے جس کے معنی آگ کا بجھ

جانا، مدہم پڑ جانا" اطفاء "اسی کا متعدی ہے جس کے معنی پچھاڑ دینا، ٹھنڈا کر دینا ہے۔یَأْبَیٰ: نہ مانے گا۔ مضارع کا صیغہ ہے،ا،ب،ی سے اس کا مصدر "اِبَاءٌ " ہے جس کے معنی ہیں کسی کا کہنا ماننے سے انکار کر دینا اپنی بات پر اڑ کر دوسرے کی بات کو ٹھکرا دینا شیطان نے اللہ تعالیٰ کا حکم نہ مانا تھا؛ اس لئے اس کی بابت "سورۂ بقرہ" میں" اَبیٰ " کالفظ آیا ہے۔

تفسیر

اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو پھیلانے کا پکا ارادہ فرمالیا ہے اگرچہ یہ کافروں کو ناگوار گزرے، یہ نور اور روشنی قرآن کریم ہے عقل جب اس روشنی میں اپنے اردگرد نظر ڈالے گی تو اس کو صحیح راستہ صاف نظر آنے لگے گا اور وہ سب راستوں کو چھوڑ کر اسی صحیح راستہ کو اختیار کرے گا، اس راستہ کا نام دین حق ہے قرآن مجید انسانی عقل کے لئے روشنی اور ہدایت ہے، اس روشنی میں عقل تمام راستوں کے بیچ میں سچے راستے دین حق کو نمایاں اور غالب دیکھے گی۔

مشرک لوگ جو اس روشنی سے کام لینا نہیں چاہتے بلکہ اس کو گل کرنا چاہتے ہیں، اندھیرے میں ہیں انہیں یہ راستہ نہیں سوجھتا ان کی عقل ٹٹول ٹٹول کر اِدھر اُدھر کے راستے ان کے لئے نکال کر رکھ دیتی ہے اور وہ انہیں راستوں میں سے کسی نہ کسی کو پسند کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ہدایت، یعنی: قرآن مجید کو قبول نہیں کرتے لیکن ان کے قبول کرنے اور ناپسند کرنے سے کیا ہوتا ہے دیکھنے والے اس روشنی میں وہ کچھ دیکھتے ہیں جو اور لوگوں کو اندھیرے میں اپنی مصنوعی روشنیوں سے کبھی سوجھ ہی نہیں سکتا، حق دین اللہ تعالیٰ کی روشنی ہے اور قرآن مجید میں محفوظ ہے حدیث اس کے پھیلانے کا ذریعہ ہے۔

پچھلی آیت میں تو ان باطل کی اتباع اور غیر اللہ کی ناجائز اطاعت کا ذکر تھا اس آیت میں ان کی ایک اور گمراہی کا ذکر ہے کہ یہ لوگ صرف اسی پر بس نہیں کرتے کہ خود گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں بلکہ ہدایت اور حق دین کے مٹانے اور رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی مضمون کو بطور مثال کے اس طرح فرمایا کہ: یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ تعالیٰ کے اس نور کو بجھانا چاہتے ہیں حالانکہ یہ ان کے بس کی بات نہیں اللہ تعالیٰ یہ طے

کر چکے ہیں کہ وہ اپنے نور، یعنی: دین اسلام کو مکمل اور پورا ہی کریں گے خواہ کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی تدبیر

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى
وہی ہے　جس نے　بھیجا　پیغمبر اپنے کو　ساتھ ہدایت کے　اور　دین　سچے کے　تاکہ غالب کرے اس کو　پر

الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾
دین　کل پر　اور　اگر چہ　ناک بھوں چڑھائیں　مشرک لوگ　(۳۳)

با محاورہ ترجمہ: ۔اسی نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تاکہ اس کو ہر دین پر غالب کریں اور مشرک پڑے برا مانیں۔(۳۳)

تفسیر

اس آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ہدایت کا سامان، یعنی: قرآن اور دین حق، یعنی: اسلام دے کے بھیجا ہے تاکہ اس کو دنیا کے تمام بقیہ دینوں پر غالب کر دے، تقریباً انہی لفظوں کے ساتھ قرآن کریم میں بہت سی آیتیں آئی ہیں جن میں وہ وعدہ ہے کہ دین اسلام کو دنیا کے دینوں پر غالب کیا جائے گا۔

"تفسیر مظہری" میں ہے کہ دین اسلام کو تمام دینوں پر غالب کرنے کی یہ خوشخبری اکثر زمانوں اور اکثر حالات کے اعتبار سے ہے جیسا کہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: روئے زمین پر کوئی کچا مکان باقی نہ رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے عزت داروں کی عزت کے ساتھ اور ذلیل لوگوں کی ذلت کے ساتھ، جن کو اللہ تعالیٰ عزت دیں گے وہ مسلمان ہو جائیں گے اور جن کو ذلیل کرنا ہوگا وہ اسلام کو قبول تو نہ کریں گے مگر اسلامی حکومت کے تابع ہو جائیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا

ہوا، ایک ہزار سال کے قریب اسلام کی شان وشوکت پوری دنیا پر چھائی رہی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سلف صالحین کے مبارک زمانہ میں ساری دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ نور پورا ہوا، اور آئندہ بھی دلیل اور حقیقت کے اعتبار سے ہر زمانہ میں دین اسلام ایسا مکمل دین رہے گا کہ کسی انصاف پسند انسان کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا؛ اس لئے کافروں کی مخالفتوں کے باوجود یہ دین حق اپنی حجت اور دلیل کے اعتبار سے ہمیشہ غالب ہے اور جب مسلمان اس دین کی پوری پیروی کریں تو ان کا ظاہری غلبہ اور حکومت وسلطنت کا حاصل ہونا بھی اس کو لازم ہے جیسا کہ اسلامی تاریخ کا تجربہ اس پر گواہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے قرآن وسنت پر عمل کیا تو کوئی چیز بھی ان کے پختہ ارادوں میں رکاوٹ نہیں بن سکی، اور یہ پوری دنیا پر غالب آکر رہے اور جب بھی کہیں وہ مغلوب ہوئے تو یہ قرآن وسنت کے احکام سے غفلت اور خلاف ورزی کا برا نتیجہ تھا جو ان کے سامنے آیا، دین حق پھر بھی اپنی جگہ کامیابی اور نصرت ہی کا ذریعہ رہا۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام صرف دلیل کے اعتبار سے اسے ضائع کردیا، اسلام کے شروع کے پچاس سالوں میں مسلمانوں کو آدھی دنیا پر سیاسی غلبہ حاصل ہو چکا تھا، اس زمانے میں قیصر وکسریٰ کی دو بڑی طاقتیں تھیں مگر دونوں مسلمانوں کے ہاتھ میں آگئی تھیں، اس وقت بڑی بڑی جنگیں لڑی گئیں، قادسیہ کے مقام پر کسریٰ کے خلاف بہت بڑی جنگ ہوئی اور یرموک کے مقام پر رومیوں کے ساتھ تاریخی جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی، عیسائیوں کے بڑے بڑے گڑھ مصر اور شام فتح ہوگئے، روم والے عیسائی بھی بالکل کمزور ہوگئے اس دوران عیسائی اور مسلمانوں کے مقابلے سینکڑوں سالوں تک ہوتے رہے۔

اسلام کے شروع زمانے میں شرک کے دو بڑے گڑھ روم اور ایران تھے (روم کے بادشاہ کو قیصر اور ایران کے بادشاہ کو کسریٰ کہتے تھے) کسریٰ تقریباً آدھی دنیا پر چھایا ہوا تھا اس زمانے میں ایران، ترکستان، زادلستان وغیرہ کسریٰ کے ماتحت تھے، اور ادہر قیصر کے ماتحت مصر، حبشہ، روم، جرمنی اور دوسرے علاقے تھے اللہ تعالیٰ نے عرب کے خطے سے اپنے آخری پیغمبر کو بھیج کر ان دونوں بڑی طاقتوں کو مات دی، ہندوستان کے مشرک کسریٰ کے ماتحت تھے اور صابی لوگ رومی عیسائیوں کے باجگزار تھے اسلام نے ان دونوں مرکز کا خاتمہ کیا

اور اس طرح سیاسی غلبہ بھی حاصل ہوگیا، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ: صحیح بات یہ ہے کہ دین کا سیاسی غلبہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک زندگی میں نہیں ہوا کیونکہ اس وقت تک صرف عرب کے خطہ پر مسلمانوں کی مکمل حکومت قائم ہوچکی تھی تاہم بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاء کے ذریعے مکمل فتح عطا فرمائی، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک مسلمانوں نے کافروں کے خلاف زبردست فتوحات حاصل کیں اس طرح اسلام کو دنیا میں غلبہ حاصل ہوگیا اور باقی دوسرے مذہب مغلوب ہوگئے۔

اہل کتاب کے علماء اور درویش

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تحقیق بہت سے یہود کے عالموں اور عیائی درویش البتہ کھاتے ہیں

اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

مال لوگوں کے ناحق اور روکتے ہیں سے راستے اللہ کے

بامحاورہ ترجمہ: ۔اے ایمان والو! اہل کتاب کے بہت سے عالم اور درویش لوگوں کے مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔

لفظی تحقیق: اَحْبَارٌ: حِبْرٌ کی جمع ہے جس کے معنی علم والا ہے یہودیوں میں اہل علم شخص کو "حِبْرٌ" کہتے ہیں اور رُهْبَانٌ: "رَاهِبٌ" کی جمع ہے، جس کے معنی: پیر، عبادت گزار، درویش یا گوشہ نشین کے ہیں۔

تفسیر

پچھلی آیت میں دین حق کو سب دینوں پر غالب کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا کہ ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کا ارادہ پورا کرنے میں جان و مال سے کوشش کرنی چاہئے، اس آیت میں بتایا ہے کہ ایمان والوں کو خبردار رہنا چاہئے کہ حق دین کے غلبہ کو روکنے کے کون سے راستے ہیں دین کی راہ میں کون کون سی رکاوٹیں ہیں ان رکاوٹوں کو

دور کرنا ان کا فرض ہے دین حق آپ ہی چمک اٹھے گا یہ رکاوٹیں پہلی امتوں، یعنی: یہود و نصاریٰ میں اپنا کام کرتی رہی ہیں؛ اس لئے ان کے حال کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

ارشاد ہے کہ: تم لوگ اللہ پر ایمان لا چکے ہو اللہ کے دین کا پھیلانا تمہارا فرض ہے، یہی فرض پہلے لوگوں کا اپنے اپنے وقت میں تھا لیکن وہ اس کو پورا نہ کر سکے اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ انکے پڑھے لکھے بااثر لوگ دنیا کی لالچ میں پھنس گئے جب وہ دین کی خدمت کے لئے دنیا سے منہ موڑ بیٹھے تھے تو ان کو چاہئے تھا کہ دنیا کی طرف رُخ نہ کرتے، لیکن انہوں نے دیکھا کہ لوگ ہمیں مانتے ہیں اور ہمارے کہنے پر چلتے ہیں کیوں کہ ہم دین کے عالم مانے جاتے ہیں؛ اس لئے ان سے اس خدمت کے انجام دینے کے عوض روپیہ پیسہ وصول کرو، جب لوگ نذرانے دینے لگے تو اس کے ساتھ ہی ان کا تقاضہ یہ ہوا کہ ان کا کام ان کی مرضی کے مطابق ہو جائے اور ہمیں منہ مانگا معاوضہ مل جائے اور اس سے اچھی اور کیا بات ہے اس طرح انہوں نے اپنا تو پیٹ بھر لیا لیکن اللہ تعالیٰ کا راستہ دنیا میں قائم نہ کر سکے اور دین کا ستیاناس ہو گیا۔

مسلمانوں کی برادری میں یہ بات نہ پھیلنی چاہئے عالموں درویشوں اور پیروں کا فرض ہے کہ دنیا کہ لالچ میں آکر شریعت کے احکام کو نہ بدلیں اور لوگوں کو وہی باتیں بتائیں جو دین میں ان کے لئے مقرر کر دی گئی ہیں۔

یہود و نصاریٰ اہل کتاب تھے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو جانتے اور اس کے پیغمبروں کو پہچانتے تھے مگر جب ان میں نفسانی خرابیاں پیدا ہو گئیں دنیا کے عہدوں اور مال کی محبت آگئی تو انہوں نے صحیح عقیدہ چھوڑ دیا دین میں بگاڑ پیدا کر لیا اور اس میں نئی نئی باتیں نکال لیں افسوس کہ اس دور کے بعض علماء اور مشائخ بھی اس بیماری میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے کہ: اے ایمان والوں! بیشک بہت سے عالم اور درویش جو لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں ظاہر ہے کہ جو آدمی غلط کام کرے گا بے ہودہ رسموں کو ادا کرے گا اور ان کی طرف دعوت دے گا وہ دراصل صحیح راستے سے روک رہا ہے جو کوئی شخص بدعت کی طرف بلا رہا ہے وہ اللہ

کے راستے سے روک کر ہی غلط راستے کی طرف دعوت دے رہا ہے جو عالم صحیح کردار کے نہیں ہوتے ان کی یہ عادت رہی ہے کہ لوگوں کو سیدھے راستے کو چھوڑ کر بدعات اور بے ہودہ رسموں میں پھنساتے ہیں تاکہ ان کا پیٹ بھرتا رہے ان کو نذرانے آتے رہیں اور یہ کاروبار چلتا رہے، لوگ دوزخ میں جاتے ہیں تو جائیں پیر صاحب کی نذر و نیاز پہنچنی چاہیے؛ اسی لئے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: جو آدمی شریعت کے خلاف کام کر رہا ہے وہ اپنے عمل کے ذریعے لوگوں کو سیدھے راستے سے روک رہا ہے ایمان والوں کو بہت زیادہ احتیاط کرنی چاہئے کہ ان سے کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جو دین حق سے دوری یا نفرت کا ذریعہ بنے، بہر حال باطل کی طرف دعوت دینا اور اس کو مشہور کرنا اللہ کے راستے سے روکنا ہے۔

حرام خوری بہت بڑا جرم ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے بار بار منع فرمایا ہے، ''سورۂ بقرہ'' اور ''سورۂ نساء'' میں واضح حکم موجود ہے ''لَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ'' ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ، یہود کے علماء کے بل بوتے پر ان پڑھ لوگوں کا مال کھا جاتے تھے اور کہتے تھے کہ امیوں، یعنی: عربوں کا مال کھانے میں ہمیں کوئی گناہ نہیں ان کا مال جس طریقے سے بھی ہاتھ لگے کھا جاؤ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ بڑی بیہودہ اور ظالمانہ بات ہے کہ کوئی شخص اپنے علم کی بناء پر جاہل کا مال ناحق طریقے سے کھا جائے اور پھر اس حلال اور پاکیزہ سمجھ کر یہ بھی کہے کہ ان کا مال کسی بھی طریقے سے کھانے میں کوئی گناہ نہیں۔

یہودیوں کے عالم، جج، قاضی، مجسٹریٹ بھی رشوت لے کے غلط فیصلے کرتے تھے قاتل کو رشوت لے کر بری کر دیتے تھے وہ اندر ہی اندر حرام کا یہ کاروبار کرتے تھے حرام کھانے کی ایک صورت ان میں یہ بھی رائج تھی۔

مال جمع کرنے کی سزا

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ

اور جو لوگ اکٹھا رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور نہیں خرچ کرتے اس کو میں راستے

اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾

اللہ کے سنا دیجئے خوشخبری ان کو عذاب دردناک کی (۳۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جولوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیں۔ (۳۴)

لفظی تحقیق: يَكْنِزُوْنَ: اکٹھا کرتے ہیں۔ مضارع کا صیغہ ہے "کنز" کے معنی ہے جمع کرنا، اکٹھا کرنا، سمیٹ کر رکھنا، روپیہ خواہ الماریوں میں ہو یا بنکوں میں ہو یا زمین میں گاڑا جائے سب "کنز" میں داخل ہے، "کنز" کے معنی خزانہ کے بھی ہیں، یعنی: وہ جگہ جہاں روپیہ اکٹھا کیا جائے۔

تفسیر

وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ: (اور جولوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں) یعنی: جولوگ دولت اکٹھی کرنے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور خزانوں اور تجوریوں میں بے تحاشا اکٹھا کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو سنا دیں کہ تمہارے لئے بس یہی خوشخبری ہے کہ تم دردناک عذاب دیا جائے گا اس عذاب کا ذکر آگے آرہا ہے۔

یہ تو ان لوگوں کی سزا ہے جو حلال کی کمائی سے روپیہ جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے اور جو حرام طریقوں سے جمع کرتے ہیں ان کو جمع کرنے کا عذاب تو یہی ملے گا لیکن اس کے علاوہ حرام کام اختیار کرنے کی سزا الگ ملے گی۔

روپیہ جمع کرنے ہر وہ طریقہ جس سے دوسروں کی حالت بگڑتی ہو یا جس میں کسی کی حاجت اور مصیبت سے بے جا فائدہ اٹھایا جا رہا ہو حرام ہو جاتا ہے اور حرام میں سے زکوٰۃ بھی مقبول نہیں، کیونکہ مال تو خیر ہے اور اس کو اچھے کاموں پر لگایا جانا چاہیے، جو شخص مال کو اس کے صحیح مقام سے روک کر جمع کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتا ہے اور اسی کی سزا پائے گا۔

اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کا مطلب

قرآن کریم کی اس آیت میں جس ''کنز'' (جمع کیا ہوا مال) کے بارے میں دردناک عذاب کی وعیدہ آئی ہے، اس سے مراد وہ جمع کئے ہوئے مال ہیں جس کی زکوۃ ادا نہ کی جاتی ہو، ویسے شریعت میں مال جمع کرنا منع نہیں ہے، جیسا کہ ''سنن ابی داؤد اور مسند احمد'' میں ہے کہ جس مال کی زکوۃ ادا نہ کی جائے وہ ''کنز'' کہلائے گا، اور امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرنے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ وہ زکوۃ نہیں دیتے، بلکہ مال میں جو بھی کسی کا حق بنتا ہے اگر وہ ادا نہیں کیا گیا تو وہ مال اس آیت کی رُو سے ''کنز'' خیال کیا جائے گا، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے بیوی بچوں اور محتاج ماں باپ کو لازمی خرچہ نہ دے کر مال بچا کر جمع کرتا ہے وہ بھی ''کنز'' ہے، لہٰذا جو لوگ اپنے مال کی زکوۃ دیتے ہیں اور جہاں خرچ کرنا شرعی لحاظ سے ضروری ہے وہاں خرچ کرتے ہیں تو ان کا باقی مال ''کنز'' نہیں جس پر آخرت میں دردناک عذاب دینے کی خبر دی گئی ہے معلوم ہوا کہ زکوۃ اور دوسرے حقوق ادا کرنے کے بعد جو مال باقی رہا اس کا جمع رکھنا کوئی گناہ نہیں۔

مال کو وبال

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ

اس دن کہ آگ دھکائی جائے گی اوپر ان کے میں آگ دوزخ کی پھر داغا جائے گا ذریعے اس کے پیشانیوں ان کی کو اور

جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا

پہلوؤں ان کے کو اور پیٹھوں ان کی کو یہ ہے جو جوڑتے تھے تم واسطے جانوں اپنی کے پس چکھو تم جو

كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

تھے تم جوڑتے (۳۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جس دن کہ اس مال پر دوزخ کی آگ دہکادیں گے، پھر اس سے ان کے ماتھے

اور پہلو اور پیٹھیں داغیں گے (اور کہا جائے گا) یہ ہے جو تم نے اپنے واسطے گاڑ کر رکھا تھا اب اپنے گاڑنے کا مزہ چکھو۔ (۳۵)

لفظی تحقیق: **یُحْمٰی**: دہکائی جائے گی۔ مضارع مجہول ہے "حمی" کے معنی ہیں آگ کا بہت تیز ہو جانا، بعد میں "عَلَیْ" آنے سے متعدی ہو گیا، یعنی: تیز کی جائے گی مال پر دوزخ کی آگ۔ **تُکْوٰی**: داغا جائے گا۔ مضارع مجہول ہے، اس کا مادہ: و، ی ہے اور مصدر "کَیّ" ہے، جس کے معنی ہیں: آگ میں چیز کو سرخ کر کے بدن پر رکھ دینا جس سے بدن جل کر اس پر داغ پڑ جائے۔

تفسیر

اس آیت کا خلاصہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ قول ہے جو اکثر جمعہ کے خطبوں میں دہرایا جاتا ہے یعنی:

"اَلْكَنْزُ كَيٌّ مِنَ النَّارِ"۔

مطلب یہ ہے کہ اس وقت تو روپیہ جمع کرنا ہر ایک نے اپنے سب سے بڑا شغل بنا رکھا ہے اور اس کی محبت میں پھنس کر کچھ لوگ بظاہر عیش و آرام بھی کرتے نظر آتے ہیں اگر چہ در اصل تکلیفیں جھیلتے ہیں مگر روپیہ کے مقابلہ میں ان کو خاطر میں نہیں لاتے، سچ مچ اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو دنیا میں بھی روپیہ پیسہ مال و دولت بہت سے لوگوں کے لئے بہت سی پریشانیوں کا باعث ہوتا ہے، یہاں تک کہ کبھی اس کی فکر میں بھوک پیاس اور نیند تک غائب ہو جاتی ہے، بلکہ جان تک کے لالے پڑ جاتے ہیں، لیکن مرنے کے بعد تو یہ سوا دکھ پہنچانے کے اور کسی کام نہ آئے گا۔

آدمی ایک پیسہ ہی کو آگ پر لال کر کے ہتھیلی پر رکھ کر دیکھ لے کہ کیا حالت بنتی ہے اس کے بعد غور کرے کہ یہ سارا سونا چاندی معمولی آگ میں نہیں دوزخ کی آگ میں تپا کر مالدار کے بدن پر رکھ دیا جائے گا اور پھر ٹھنڈا ہونے تک ہلایا نہ جائے گا ٹھنڈا ہونے کے بعد پھر گرم کر کے رکھا جائے گا اور اسی طرح برابر ہوتا رہے گا اس وقت کیا حال ہوگا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ بخیل سے روپیہ کسی اچھے کام کے واسطے دینے کے لئے کہو تو پہلے اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں اور زیادہ کہو تو پہلو بدل کے منہ پھیر لیتا ہے اور اگر اصرار کرو تو پیٹھ موڑ کر چل دیتا ہے؛ اس لئے انہی تین چیزوں، یعنی: پیشانی، پہلو اور پیٹھ پر داغ دیا جائے گا، اگر عذاب سے بچنا ہے تو اپنے مال میں سے اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔

''سورۂ آل عمران'' میں آتا ہے کہ جس مال میں بخل کیا حق ادا نہیں کیا اس کے گنجے سانپ کی شکل میں گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا جو بخیل کو ڈسے گا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہے گا ''اَنَا كَنْزُكَ اَنَامَالُكَ'' میں تیرا خزانہ ہوں اور میں تیرا مال ہوں، جسے تو نے دنیا میں اپنے لئے جمع کر رکھا تھا اب اس کا مزا چکھو سونے چاندی کا حق ادا نہیں کیا تو اسے گرم کر کے جسم کو داغا جائیگا اور اگر جانوروں میں سے ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کی اور دوسرے حقوق ادا نہیں کئے، مثلاً: مسافر مہمان کو باوجود بھوک پیاس کے ان کو کنجوسی کی وجہ سے جانوروں کا دودھ نہیں دیا تو پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ: قیامت کے دن مالک کو نیچے لٹایا جائے گا اور اس کے جانور اسے روندیں گے اور منہ سے کاٹیں گے اور سینگ ماریں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے گا، بہر حال اس کی تفصیلات قرآن وسنت میں موجود ہیں۔

فرمایا کہ: وہ مال ہے جو تم نے جمع کیا تھا کہ دنیا میں اس سے فائدہ اٹھاؤ گے، تم نے حلال وحرام میں تمیز کی، بس! مال جمع کرنے کی دھن میں لگے رہے اب اس کا مزہ چکھو جو کچھ تم اپنے لئے کرتے رہے تم نے دنیا میں اس مال کا حق ادا نہ کیا آج یہی مال تمہارے لئے وبال جان بن گیا ہے۔

زمانے کی تقسیم

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ

تحقیق گنتی مہینوں کی نزدیک اللہ کے بارہ ماہ ہے میں کتاب اللہ کی

يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ

جس دن پیدا کئے اس نے آسمان اور زمین سے ان میں چار ادب کے ہیں یہی دین ہے

الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً

سیدھا پس مت ظلم کرو تم بیچ ان میں اوپر اپنے اور لڑو مشرکوں سے پورے طور پر

كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۶

جیسا کہ وہ لڑتے ہیں تم سے پورے طور پر اور جان لو کہ بیشک اللہ ساتھ ہے بچ کر چلنے والوں کے (۳۶)

بامحاورہ ترجمہ: مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہے، اللہ کے حکم میں جس دن اس نے آسمان اور زمین پیدا کئے ان میں چار مہینے ادب کے ہیں، یہی ہے سیدھا دین سو ان میں اپنے اوپر ظلم مت کرو اور سب مشرکوں سے ہر حال میں لڑو، جیسے: وہ تم سے ہر حال میں لڑتے ہیں اور جان لو کہ! اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔(۳۶)

لفظی تحقیق: اَلْقَيِّمُ: سیدھا، استوار۔ یہ لفظ مادہ: ق، و، م سے اسی طرح بنا ہے، جیسے: س، و، د سے سید اور دونوں کے معنی بھی ملتے جلتے ہیں، ق، و، م سے مصدر قوم ہے، جس کے معنی: سیدھا کھڑا ہو جانا، آدمیوں کی جماعت کو بھی قوم کہتے ہیں، کیوں کہ جماعت، حالات کے قائم اور سیدھا کرنے کا ذریعہ ہے قیم صفت کا صیغہ ہے اس کے معنی سیدھی اور مضبوط چیز کے بھی ہیں اور دوسری چیز کو سیدھا اور مضبوط بنانے والے کے بھی ہیں، یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔ كَآفَّةً: پورے طور پر۔ یہ لفظ "سورۂ بقرہ" میں آچکا ہے کہ ہر ایک آدمی ایک دوسرے کا سہارا اور جماعت کا جزو بن لینا، روک لینا، جب کسی جماعت میں ایسا ایکا ہو جائے کہ ہر ایک آدمی ایک دوسرے کا سہارا اور جماعت کا جزو بن جائے اور پھر وہ مل کوئی کام کریں تو اس کو مجموعی طاقت سے اکٹھے ہو کر کرنا کہتے ہیں، عربی میں اسی حالت کا "كَآفَّةً" کہہ کر ظاہر کیا جاتا ہے۔

تفسیر

پچھلی آیتوں میں بہت پہلے یہ بیان ہورہا ہے کہ یہود ونصاریٰ نے اپنے دین کو بگاڑ ڈالا ہے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے راستے کو چھوڑ کر اپنے بڑا آدمیوں کا مقرر کیا ہوا راستہ اختیار کرتے ہیں، ایک حکم یہ ہے کہ جسے انہوں نے توڑا۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے چار حرمت والے مہینوں کا ذکر کیا ہے اور مشرکوں کی اس بری حرکت کا ذکر کیا ہے جس کے ذریعے وہ حرمت والے مہینوں سے ازخود تبدیل کر لیتے تھے، جیسا کہ گزر چکا ہے ہے، اہل کتاب مختلف چیزوں کے حلال اور حرام ہونے میں دخل اندازی کرتے تھے، جب کہ مشرکین اللہ کے مقرر کئے ہوئے حرمت والے مہینوں میں ادلا بدلی کرتے تھے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ "الحَلَالُ مَا أَحَلَّ اللهُ فِي كِتَابِهِ، وَالحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللهُ فِي كِتَابِهِ... الخ" (ترمذی: جلد ۴، ص: ۲۲۰: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر) حلال وہ ہے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، کوئی انسان ازخود کسی چیز پر حلال یا حرام کرنے کا اختیار نہیں رکھتا، حضرت نعمان بن نوفل رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا، حضور! اگر میں اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے اور آپ کے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہونے پر ایمان رکھتا ہوں تو کیا مجھے نجات مل جائے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! تو نجات کو پائے گا مقصد یہ ہے کہ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے جو کوئی یہ صفت غیر اللہ میں مانے گا وہ مشرک ہوگا اور مجرم بنے گا۔

یہاں مختلف مہینوں کے حلال یا حرام ہونے کے متعلق ارشاد ہوتا ہے "اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ" بے شک اللہ تعالیٰ کے ہاں مہینوں کی گنتی بارہ ہے اور یہ کوئی نیا حکم نہیں بلکہ اس دن سے یہی کیلنڈر مقرر ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا ہے، مطلب یہ ہے کہ جب

سے اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا پیدا کی ہے سال بھر کے مہینوں کی تعداد بارہ مقرر کی ہے اور پھر ان بارہ مہینوں میں چار مہینے حرمت والے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان چاروں مہینوں کو ادب والے مہینے قرار دے کر ان کے دوران جنگ کرنے کو منع فرمایا ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے لے کر یہ ایک اہم اصول رہا ہے کہ ان حرمت والے مہینوں میں ہر ایک کو امن و امان حاصل ہوگا اور کوئی ایک دوسرے کے خلاف چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں یہ اصول ڈیڑھ ہزار سال تک قائم رہا ان مہینوں کی حرمت کو برقرار رکھا جاتا رہا مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا میں تشریف لانے سے چار یا ساڑھے چار سو سال پہلے ان مہینوں کی حرمت میں گڑبڑ واقع ہونی شروع ہوگئی اور لوگ ان میں ادل بدل کرنے لگے، مثلاً: دو قبیلوں کی لڑائی کے دوران اگر کوئی حرمت والا مہینہ شروع ہو جاتا مثلاً: شوال میں لڑتے لڑتے ذی قعدہ کا چاند نظر آجاتا تو جو طاقتور قبیلہ ہوتا وہ لڑائی نہ روکتا بلکہ یہ کہتا کہ اس مرتبہ ذی قعدہ کا مہینہ نہیں آیا بلکہ یہ اس مرتبہ صفر کا مہینہ پہلے آگیا ہے تاکہ وہ جنگ کو جاری رکھ کر کمزور قبیلہ پر فتح پالے، یا مثلاً: جمادی الاخری میں جنگ کرتے کرتے رجب کا چاند نظر آجاتا تو طاقتور قبیلہ یہ کہہ کہ جنگ جاری رکھتا کہ اس مرتبہ جمادی الثانیہ کے بعد رجب کا مہینہ آیا بلکہ شعبان کا مہینہ ہے رجب اس کے بعد آئے گا۔

تمام قوموں اور مذہبوں والے سال بھر کے بارہ مہینے مانتے ہیں اور یہ نظام اس وقت سے قائم ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کر کے نظام شمسی قائم کیا ہے، کیلنڈر، دنوں، ہفتوں، مہینوں اور پھر سالوں کے ذریعہ بنتا ہے، البتہ یہ حساب دو طریقے سے رائج ہے ایک چاند کے حساب سے اور دوسرا سورج کے حساب سے۔

ان دونوں میں کونسا حساب آسان ہے؟ آپ دیکھتے ہیں کہ چاند والا حساب فطری ہے، کوئی جاہل آدمی اگر کسی جنگل یا سمندر کی سطح پر ہے جہاں اس کے پاس مہینوں کو معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تو وہ ہر نئے چاند کے نکلنے پر معلوم کرلے گا کہ پچھلا مہینہ ختم ہو کر نیا مہینہ شروع ہو گیا ہے، برخلاف اس کے محض سورج کو دیکھ کر کوئی شخص ازخود اندازہ نہیں لگا سکتا کہ مہینہ کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا جب تک کہ مہینے کے شروع ہونے

اور ختم ہونے کا کوئی ذریعہ اس کے پاس نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ چاند والا حساب زیادہ آسان اور فطرت کے مطابق ہے۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سال بھر میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں کہ ان کا ادب واحترام کیا جاتا ہے، یعنی: ان میں جنگ نہیں کی جاتی، ان چار مہینوں کے نام قرآن کریم میں تو نہیں البتہ ان کی تشریح حدیث شریف میں موجود ہے ان چار میں سے تین مہینے تو اکٹھے آتے ہیں، یعنی: ذی قعدہ، ذی الحجہ، اور محرم اور چوتھا مہینہ رجب ہے، جو جمادی الاخری اور شعبان کے درمیان آتا ہے ان چار میں سے حج کا موسم بھی شروع کے تین مہینوں میں پڑتا ہے چونکہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہ مہینے قابل احترام سمجھے جاتے تھے اور اس طرح حج کا سفر بھی بخیر وخوبی انجام پاتا تھا، فرمایا: یہی سیدھا دین ہے ملت ابراہیمی کا، یہ اصل اصول ہے کہ حرمت والے مہینوں میں سے کسی سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی، فرمایا: پس! ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو، جان پر ظلم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کی خلاف ورزی کر کے اس کے حکم کو توڑ کر گناہ میں نہ پڑو اصل میں گناہ میں پڑ کر عذاب کا حق دار ہو جانا اپنے اوپر ظلم کرنے کی طرح ہے اور اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی جان پر ظلم کرتا ہے اس کو جسمانی ذہنی یا مالی نقصان پہنچاتا ہے تو وہ بھی دراصل اس کی جان پر ظلم کرتا ہے کیونکہ اسے بالآخر اس ظلم کا بدلہ چکانا ہوگا۔

مفسرین کرام نے یہاں پر یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ ظلم تو ہر حال میں حرام ہے، پھر یہاں پر ان چار مہینوں کو خاص کرنے کی کیا وجہ ہے کہ ان مہینوں میں ظلم نہ کیا جائے، فرماتے ہیں کہ: اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے گناہ کرنا کسی وقت اور کسی جگہ پر بھی حرام ہے مگر حرم شریف میں گناہ کرنا زیادہ سنگین جرم ہے، اس کی ایک مثال ''سورۂ بقرہ'' میں یوں بھی آتی ہے: "اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ" حج کے مہینے معلوم ہیں "فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ" پس جو کوئی ان مہینوں میں حج کا احرام باندھ لے پھر وہ نہ کوئی شہوت کی باتیں کرے نہ گناہ کرے اور نہ جھگڑا فساد کرے، یہاں بھی یہی بات ہے کہ جھگڑا فساد اور

گناہ کرنا خاص طور پر منع کرنے کی تو ہر وقت حرام ہے، پھر احرام کی حالت میں اس کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان دنوں میں گناہ کی سنگینی اور بڑھ جاتی ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معلوم کیا حضور! بڑا گناہ کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ: بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بناؤ، حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے، عرض کیا اس کے بعد بڑا گناہ کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ: تو پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کرے، زنا بذاتِ خود ایک بڑا گناہ ہے مگر جب اپنی پڑوسن کے ساتھ یہ ناشائستہ حرکت کی جائے تو اس کی سنگینی میں کئی گناہ اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ پڑوسی کا ایک دوسرے پر بڑا حق ہوتا ہے اگر ایک پڑوسی دوسرے کی غیر حاضری سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کی عزت کی حفاظت کے بجائے اسے برباد کرتا ہے تو عام حالات کے مقابلے میں اس کے جرم کی نوعیت بڑھ جاتی ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: حرمت والے مہینوں میں جنگ کر کے اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔

حرمت والے مہینوں کا تعلق چاند کے حساب پر ہے؛ اس لئے یہاں یہ بات کی جاسکتی ہے کہ حساب کتاب کے اعتبار سے چاند والے حساب کو آگے رکھنا چاہئے یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے تمام شرعی حکم کا دارومدار چاند والے حساب پر ہے، مثلاً: روزہ، زکوٰۃ، حج اور عدت وغیرہ چاند کے مہینوں کے حساب سے پورے کئے جاتے ہیں؛ اس لئے چاند کے مہینوں کو بالکل چھوڑ کر سورج کے مہینوں پر ہی عمل کرنا ہرگز درست نہیں، ایسا کرنے والے مسلمان گنہگار ہوں گے، انگریزی کیلنڈر کے علاوہ ہندوؤں کا بکرمی، پارسیوں کا فصلی سن اور رومیوں کا اپنا کیلنڈر بھی چلتا ہے، پھر بھی ان سب میں چاند والے حساب کو سب سے آگے رکھنا ہے اور یہی فطری حساب ہے، لیکن دنیاوی کاموں، مثلاً: تجارت، ملازمت وغیرہ میں انگریزی (شمسی) کیلنڈر استعمال کیا جائے تو شرعاً اس میں کوئی مضائقہ نہیں البتہ دینی کاموں کو چاند کے کیلنڈر کے مطابق کرنا ضروری ہے، جیسے: اوپر بیان ہوا ہے۔

فرمایا: یہ چار مہینے حرمت والے ہیں ان میں لڑائی بالکل حرام ہے اور اگر مشرکین ان مہینوں کا احترام نہ کریں پھر تم بھی مشرکوں کے ساتھ پوری قوت کے ساتھ ٹکراؤ جس طرح وہ پوری قوت کے ساتھ جنگ کرتے ہیں،

اگر وہ لڑائی پر آمادہ ہوں تو پھر مسلمانوں کو بھی اجازت ہے کہ وہ بھی پوری قوت کے ساتھ جنگ کریں "سورۂ بقرہ" میں ہے کہ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینوں کے مقابل ہے اور تمام حرمتیں برابر ہیں پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اس کے مطابق زیادتی کرو مقصد یہ ہے کہ حرمت والے مہینوں کا احترام تو سب کے لئے برابر ہے تمہارے بھی ان کے بھی پھر اگر وہ احترام نہیں کرتے تو تمہارے اوپر بھی ان مہینوں کا احترام ضروری نہیں، اگر وہ اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو تم سے بھی لڑائی نہ کرنے کی پابندی اٹھ جائے گی، فرمایا کہ: خوب جان لو کہ! اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور مدد اس سے ڈرنے والوں کے ساتھ ہے جو شخص جس قدر اللہ تعالیٰ کے احکام کا احترام کرے گا، اسی درجے میں اسے اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہوگی۔

بارہ مہینوں کو ادل بدل کرنے کی پوری تفصیل

قدیم زمانے سے تمام پیغمبروں کی شریعتوں میں سال کے بارہ مہینے مانے جاتے تھے اور ان میں سے چار مہینے بڑی حرمت، یعنی: ادب واحترام کے مہینے سمجھے جاتے تھے تین مہینے ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم تو لگا تار ہیں اور چوتھا رجب کا مہینہ الگ ہے۔

تمام پیغمبروں کی شریعتوں میں یہ بات ہے کہ ان چار مہینوں میں ہر عبادت کا ثواب زیادہ ہوتا ہے، اور ان میں کوئی گناہ کرے تو اس کا عذاب بھی زیادہ ہے پچھلی شریعتوں میں ان مہینوں کے اندر جنگ کرنا بھی منع تھا۔

مکہ مکرمہ کے عرب چونکہ اسماعیل علیہ السلام کے واسطہ سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی اولاد ہیں، اس لئے یہ سب لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نبی اور رسول ہونے کو اور ان کی شریعت کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے اور چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں بھی ان حرمت والے چار مہینوں میں جنگ کرنا منع تھا، عرب کے جاہلوں پر اس حکم پر عمل کرنا اس لئے زیادہ مشکل تھا کہ وہ جاہلیت کے زمانہ میں جنگ کرنا ہی ان کے لئے طرح طرح کے حیلے نکالے کبھی حرمت والے مہینوں میں سے کسی مہینہ میں جنگ کی ضرورت پیش آتی یا لڑتے لڑتے حرمت والا کوئی مہینہ آجاتا تو کہہ دیتے کہ اس سال یہ مہینہ حرمت والا ہوگا، اور مزید ضرورت پڑتی تو کہتے کہ ربیع الاول

حرمت والا مہینہ ہوگا یا یہ کہتے کہ اس سال صفر کا مہینہ آ گیا محرم بعد میں آئے گا اس طرح محرم کو صفر بنا دیا، غرض! سال بھر میں چار مہینے تو پورے کر لیتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی متعین کی ہوئی ترتیب کا لحاظ نہ کرتے تھے جس مہینہ کو چاہیں ذی الحجہ کہہ دیں اور جس کو چاہیں رمضان کہہ دیں جس کو چاہیں پہلے کر دیں جس کو چاہیں پیچھے کر دیں اور کبھی زیادہ ضرورت پڑتی، مثلاً: لڑتے لڑتے دس مہینے گزر گئے اور سال کے صرف دو ہی مہینے باقی رہ گئے تو ایسے موقع پر سال کے مہینوں کی تعداد بڑھا دیتے اور کہتے کہ اب کے برس سال چودہ مہینوں کا ہوگا، اسی طرح باقی بچے ہوئے چار مہینوں کو حرمت والے مہینے بنا لیتے تھے۔

غرض! ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کا اتنا احترام کرتے تھے کہ سال میں چار مہینوں کا احترام کرتے اور ان میں لڑائی اور قتل وغارتگری سے رُکے رہتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے جو ترتیب مہینوں کی مقرر فرمائی اور اسی ترتیب سے چار مہینوں کو حرمت والے مہینے قرار دیا، اس میں طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے اپنے ناجائز مقاصد کو پورا کرتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں اس بات کو جاننا ہی مشکل ہو گیا تھا کہ کونسا مہینہ رمضان یا شوال کا ہے اور کونسا ذی قعدہ، ذی الحجہ یا رجب کا ہے، ہجرت کے آٹھویں سال جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور نویں سال میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حج کے موسم میں تمام کافروں اور مشرکوں سے بیزاری کا اعلان کرنے کے لئے بھیجا تو یہ مہینہ حقیقی حساب سے ذی قعدہ کا تھا اور اس سال ان کے نزدیک حج کا مہینہ ذی الحجہ کے بجائے ذی القعدہ مقرر تھا، پھر ۱۰ھ میں جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لئے تشریف لے گئے تو قدرتی طور پر ایسا نظام بن گیا کہ وہ مہینہ اصلی ذی الحجہ کا تھا، کافروں کے جاہلانہ حساب میں بھی وہ ذی الحجہ ہی قرار پایا؛ اس لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منیٰ کے خطبے میں ارشاد فرمایا کہ: زمانہ پھر پھرا کر پھر اپنی اصل شکل میں آ گیا جس پر اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو پیدا کرتے وقت رکھا تھا، یعنی: جو مہینہ اصلی ذی الحجہ کا تھا جاہلیت والوں کے نزدیک بھی اس سال وہی مہینہ ذی الحجہ کا مہینہ قرار پایا۔

یہ جاہلیت کی وہ رسم تھی جو مہینوں کی تعداد اور ترتیب اور تعیین کی کمی زیادتی اور ادل بدل کر کے کی جاتی تھی جس کے نتیجہ میں ان تمام شرعی حکموں میں خلل آتا تھا جو کسی خاص مہینہ یا اس کے کسی خاص تاریخ سے متعلق ہیں یا جو سال کے شروع یا ختم سے متعلق ہیں، مثلاً: عشرۂ ذی الحجہ میں شرعی احکام اور محرم کے شروع کے دس دنوں کے روزے اور سال ختم ہونے پر زکوۃ وغیرہ کے حکم۔

بات تو مختصر سی تھی کہ مہینہ کا نام بدل کر آگے پیچھے کر دیا کہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم بنا دیا، لیکن اس کے نتیجہ میں سینکڑوں شرعی حکموں پر عمل کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا، قرآن کریم کی آیتوں میں جاہلیت کی اس رسم کی خرابی اور مسلمانوں کے اس سے بچنے کی ہدایت ہے۔

مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ: یعنی: ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، حرمت کا لفظ حرام کے معنی میں بھی آتا ہے، اور احترام کے معنی میں بھی آتا ہے ان چار مہینوں کو ان دونوں معنی کے لحاظ سے حرمت والے مہینے کہا جاتا ہے، اگر حرمت کو حرام کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس مہینہ میں لڑنا حرام ہے، اور اگر حرمت سے احترام مراد ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مہینے برکت والے اور احترام والے ہیں، ان میں عبادتوں کا ثواب زیادہ ملتا ہے، ان میں سے پہلا حکم تو شریعت اسلام میں ختم ہو گیا مگر دوسرا حکم احترام اور ادب اور ان میں عبادتوں کا اہتمام اسلام میں باقی ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مہینوں کی تشریح یہ فرمائی کہ تین مہینے مسلسل ہیں ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور ایک مہینہ رجب ہے۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ: یہ ہی سیدھا دین ہے، یعنی: مہینوں کی تعیین اور ترتیب اور ان میں ہر مہینہ خاص طور پر حرمت والے مہینوں کے متعلق شریعت کے جو حکم ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق رکھنا ہی سیدھا دین ہے اس میں اپنی طرف سے کمی زیادتی اور ادل بدل کرتے ٹیڑھے پن کی علامت ہے۔

فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ: یعنی: ان مقدس مہینوں میں تم اپنا نقصان نہ کر بیٹھنا کہ ان کے مقرر

کئے ہوئے حکموں کے احترام کی خلاف ورزی کر دیا ان میں عبادت گزاری میں کوتاہی کرو۔

امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے ''احکام القرآن'' میں فرمایا کہ: اس میں ارشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان مبارک مہینوں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں جو کوئی شخص عبادت کرتا ہے اس کو باقی مہینوں میں بھی عبادت کی توفیق اور ہمت ہوتی ہے اسی طرح جو شخص کوشش کر کے ان مہینوں میں اپنے آپ کو گناہوں اور برے کاموں سے بچالے تو باقی سال کے مہینوں میں اس کو ان برائیوں سے بچنا آسان ہو جاتا ہے؛ اس لئے ان مہینوں میں فائدہ نہ اٹھانا بہت بڑا نقصان ہے، یہاں مکہ کے مشرکوں کی ایک خاص جاہلانہ اور اس کا رد کا ذکر تھا آخر آیت میں پھر اس حکم کو دہرایا ہے۔

حکم توڑنا

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

بات یہی ہے کہ مہینے کا ہٹا دینا بڑھائی ہوئی بات ہے میں کفر کے زمانے بہکائے جاتے ہیں ذریعہ اس کے وہ لوگ جو کافر ہوئے

یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ یُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ

حلال کرتے ہیں اسے ایک سال اور حرام کر لیتے ہیں اسے ایک سال تا کہ برابری کر لیں گنتی ہے اس کو جو حرام کئے اللہ نے

فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ

پس حلال کر لیتے ہیں اس کو جو حرام کیا اللہ نے مزین کر دیئے گئے واسطے ان کے بُرے اعمال ان کے اور اللہ

ع ۵ ۸ ۱۱ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ۟ (۳۷)

نہیں راہ دکھاتا ان لوگوں کو جو کفر کرنے والے ہیں (۳۷)

بامحاورہ ترجمہ: - یہ جو مہینے کا پیچھے ہٹا دینا ہے، سو! یہ کفر کے عہد میں بڑھائی ہوئی بات ہے اس سے کافر گمراہی میں پڑتے ہیں اس مہینہ کو ایک سال حلال کر لیتے ہیں اور دوسرے سال حرام رکھتے ہیں تا کہ ان

مہینوں کی گنتی پوری کرلیں جو اللہ نے ادب کے لئے رکھے ہیں، پھر حلال کرلیتے ہیں وہ مہینہ جو اللہ نے حرام کیا ان کے بُرے کام ان کی نظر میں بھلے کردیئے گئے اور اللہ کافروں کو راستہ نہیں دکھاتا۔ (۳۷)

لفظی تحقیق: نَسِیۡٓءُ: مصدر ہے اس کے معنی جگہ سے پیچھے ہٹا دینا، ملتوی کردینا، یہاں اس سے مراد وہ رسم ہے جو اسلام سے پہلے عرب کے بااثر سرداروں نے جاری کی تھی، یعنی: وہ حرام مہینے کو جگہ سے ہٹا کر پیچھے کردیتے تھے، مثلاً: محرم کے مہینہ کو جو حرمت والا ہے ہٹا کر صفر میں لے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سال محرم کے بجائے صفر کا مہینہ پہلے آگیا ہے اور محرم اس کے پیچھے آئیگا۔ **یُوَاطِئُوا**: پوری کرلیں۔ مضارع کا صیغہ ہے "مواطاۃ" سے جس کا مادہ: و، ط، ء ہے وطا کے معنی ہیں کسی چیز کو کسی کے موافق کردینا یہاں یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سال میں چار مہینے حرمت والے مقرر کردیئے ہیں انہوں نے ان کی گنتی تو چار ہی رکھی لیکن جب چاہتے ان کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے، گو حرمت والے مہینوں کی گنتی چار ہی رکھتے۔

تفسیر

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی مہینوں کی گنتی بتادی گئی، ان میں چار مہینے ایسے تھے جن میں لڑائی، دنگا فساد، خاص طور پر منع تھا، ان کو حرمت والے مہینے کہتے تھے، یہ مہینے رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ، اور محرم تھے۔

کبھی عرب کا بڑا سردار اٹھ کر حکم دیتا کہ اس سال محرم میں لڑنا حلال ہے اس کے بدلے صفر کا مہینہ حرام ہوگا، اسی طرح سرداروں کے کہنے سے حرام مہینے اپنی جگہ ہٹتے رہتے، اس کا مطلب یہ ہوا کافروں نے اپنے سرداروں کا حکم اللہ کے حکم سے زیادہ قرار دیا۔

اس آیت میں ارشاد ہے کہ: یہ مہینوں کا ہٹانا کافروں کی اپنی پیدا کی ہوئی بات ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکموں کی خلاف ورزی ہے۔

حرمت والے مہینوں کا ادب واحترام بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی اس خرابی کا ذکر فرمایا

جو وہ اس سلسلے میں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: بلاشبہ حرمت والے مہینوں کو پیچھے ہٹا دینا کفر میں زیادتی ہے کافر لوگ اسی طرح، یعنی: حرمت والے مہینوں کو پیچھے ہٹانے کی وجہ سے گمراہی میں پڑے، یعنی: اللہ کے مقرر کئے ہوئے حرمت والے مہینوں میں ادل بدل کر کے کافر لوگ مزید گمراہ ہو چکے ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک تو حرمت والے مہینوں کا پوری طرح احترام کیا جاتا رہا مگر اس کے بعد مشرکوں نے گڑبڑ کرنی شروع کر دی اگر وہ کسی حرمت والے مہینے میں جنگ کرنا چاہتے تو حج کے موقعہ پر متعلقہ قبیلہ کے سردار اعلان کر دیتے کہ اس سال حرمت کا فلاں مہینہ فلاں مہینہ کے ساتھ بدل جائے گا، اس طرح وہ اصل محترم مہینے کو پامال کر کے اسی میں لڑائی لڑتے اور اس حرمت کو کسی بعد میں آنے والے کسی مہینہ پر ڈال دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ایسا کرنا ان کے کفر میں اضافہ کا سبب ہے کافر تو پہلے ہی کافر ہیں اب ان کے کفر میں مزید اضافہ ہو گیا، فرمایا: یہ کافر لوگ حرمت والے مہینوں کو آگے پیچھے کر کے ایک ہی مہینہ کو کسی ایک سال حلال ٹھہرا لیتے ہیں اور دوسرے سال حرام قرار دے لیتے تھے، حلال و حرام قرار دینے کا اختیار تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے مگر انہوں نے اس کو از خود اپنے ہاتھ میں لے لیا، یہ بالکل ایسا ہی کام ہے جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے حلال و حرام کرنے کا اختیار اپنے عالموں اور درویشوں کو دید یا تھا۔

لِّيُوَاطِئُوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ: (تاکہ اس گنتی کو پورا کر لیں جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے پس وہ حلال کر لیتے ہیں اس چیز کو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے) اللہ تعالیٰ نے رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے مہینوں کو حرمت والا قرار دیا ہے تو انہوں نے ان کی بجائے بعض دوسرے مہینوں کو حرمت والا قرار دیا اور ان مہینوں کی حرمت کو گول کر گئے، فرمایا: یہ بات کفر میں زیادتی کا سبب ہے۔

زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ: (ان کے بُرے اعمال ان کے لئے خوشنما دبنا دیئے گئے) وہ غلط کام کر رہے ہیں مگر سمجھتے ہیں کہ نیکی کا کام کر رہے ہیں انہوں نے ملت ابراہیمی کو بگاڑ دیا حلال کو حرام اور حرام کو حلال

ٹھہرالیا، اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کی، اس کی منشاء کے خلاف کام کیا، پھر بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی، بلکہ چار حرمت والے مہینوں کی بجائے چار دوسرے مہینوں کو مقرر کر کے انہوں نے گنتی پوری کردی ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے حکموں پر بھی پورا عمل کرلیا ہے، ''سورۂ انعام'' میں بھی ہے کہ وہ جو کچھ الٹا سیدھا کام کرتے تھے شیطان اس کو خوشنما کر کے دکھاتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم بہت اچھا اور نیکی کا کام کر رہے ہیں آج بھی بزرگوں کے ادب واحترام کے نام پر شیطان کتنے ہی شرکیہ کام لوگوں سے کرواتا ہے قبروں پر سجدے ہو رہے ہیں، مرادیں مانگی جارہی ہیں، چادریں چڑھائی جاتی ہیں، قبروں کو غسل دیا جاتا ہے یہ سب بزرگوں کے ادب واحترام کے نام پر شیطان کرواتا ہے اور لوگ اسے ثواب کا کام سمجھ کر کر رہے ہیں اسی چیز کے متعلق فرمایا کہ: ان کے اعمال ان کے لئے خوبصورت کردیئے گئے، اور وہ انہی میں مگن ہیں اور نہیں جانتے کہ کتنے بڑے بڑے جرم کر رہے ہیں۔

وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ: کافر لوگوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب نہیں کرتا جو کفر میں بڑھ جاتے ہیں ان کی واپسی کے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور پھر وہ زندگی بھر کفر میں پڑے رہتے ہیں۔

احکام ومسائل

مذکورہ آیتوں سے ثابت ہوا کہ مہینوں کی جو ترتیب اور مہینوں کے جو نام اسلام میں مشہور ہیں وہ انسانوں نے نہیں رکھے، بلکہ رب العالمین نے جس دن آسمان اور زمین پیدا کئے اسی دن یہ ترتیب اور یہ نام اور ان کے ساتھ خاص خاص مہینوں کے خاص خاص حکم مقرر فرمادیئے تھے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرعی حکموں میں چاند کے مہینوں کا اعتبار ہے اسی چاند کے حساب پر تمام شرعی حکم روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں لیکن قرآن حکیم نے تاریخ وسال معلوم کرنے کے لئے جیسے چاند کو علامت قرار دیا ہے اسی طرح سورج کو بھی اس کی علامت فرمایا ہے "لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ" اس لئے تاریخ وسال کا حساب چاند اور سورج

دونوں سے جائز ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم کے لئے چاند کے حساب کو پسند فرمایا ہے اور شریعت کے حکموں کا دارومدار اسی پر رکھا ہے؛ اسی لئے چاند والے حساب کا محفوظ رکھنا فرض کفایہ ہے، اگر ساری امت قمری تاریخ کو چھوڑ دیں تو سب گنہگار ہونگے، اور اگر وہ محفوظ رہے تو دوسرے حساب کا استعمال بھی جائز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت اور سلف صالحین کی سنت کے خلاف ہے؛ اس لئے بغیر کسی سخت ضرورت کے اس کو اختیار کرنا اچھا نہیں۔

ایک حسابی نکتہ

قمری سال شمسی سال سے دس دن چھوٹا ہوتا ہے اور اس طرح تین سال میں ایک پورے مہینے کا فرق پڑ جاتا ہے، دونوں سالوں میں اس فرق کو پورا کرنے کے لئے بعض لوگ ہر تین قمری سالوں کے بعد قمری حساب میں ایک سال کا اضافہ کر لیتے ہیں تا کہ شمسی اور قمری سال برابر رہیں دوسرے لفظوں میں ہر تین قمری سال بعد ایک ماہ لیپ کا بڑھایا جاتا ہے، یہاں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ کیا ایسا کرنا کافروں کا حرمت والے مہینوں کو آگے پیچھے کرنے کی طرح تو نہیں ہوگا؟ جس کو اللہ تعالیٰ نے کفر میں زیادتی فرمایا ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے مفسرین ایسا کرنے کو بھی ''نسیٔ'' (یعنی: حرمت والے مہینوں میں زیادتی کی طرح) قرار دیتے ہیں، لیکن حق بات یہ ہے کہ ایسا کرنا محض حساب کتاب کو مکمل کرنا ہے، اور اس میں کسی مہینہ کے حلال اور حرام ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، لہذا اس قسم کا اہتمام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اس انتظام کو ''کوکبیہ'' کہتے ہیں اور یہ قدیم یونانیوں اور ایرانیوں کے ہاں بھی رائج تھا، لہذا عام مفسرین کے نزدیک یہ ''نسیٔ'' میں داخل نہیں۔

وقت پر کاہلی بُری ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! کیا ہوا تمہیں جب کہا جائے تم سے چل پڑو میں راستہ

اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ

اللہ کے تو گر جاتے ہو تم طرف زمین کی کیا پسند کر بیٹھے زندگانی دنیا کی سے

الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾

آخرت پس نہیں سامان زندگانی دنیا کی میں آخرت (کے مقابلہ) مگر تھوڑا (۳۸)

با محاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو تم زمین پر گرے جاتے ہو کیا آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگانی پر خوش ہو گئے، سو! آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگانی کا کچھ نفع نہیں مگر تھوڑا۔ (۳۸)

لفظی تحقیق: اِنْفِرُوْا: نکل پڑو۔ امر کا صیغہ ہے نفر سے، نفر کے معنٰی اٹھ کر روانہ ہونا، پھرتی سے چلنے کے لئے تیار ہو جانا۔ اِثَّاقَلْتُمْ: گرے پڑتے ہو۔ ماضی کا صیغہ ہے جس کا مصدر "اثاقل" ہے جو "ثاقل" کی بدلی ہوئی شکل ہے اس کا مادہ: ث، ق، ل، ہے ثقل مشہور لفظ ہے جس کے معنٰی بوجھ کے ہیں "اثاقل" کے معنی ہیں بوجھل ہو کر گر جانا۔ مَتَاعُ: ساز و سامان۔ سونے چاندی کے سوا آرام کی جتنی چیزیں دنیا میں ہیں سب متاع کہلاتی ہیں۔

تفسیر

جو کچھ اس سورت میں ہے اور اس سے پہلے والی سورت میں بیان ہوا ہے اس سے جہاد کے معنٰی غور کرنے والوں کی سمجھ میں بالکل آ جاتے ہیں اور انہیں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ جہاد کا مطلب اللہ تعالیٰ کو اپنا سب سے بڑا آقا مان کر اس کے حکموں کے مطابق انسان کی اصلاح کی کوشش کرنا ہے اور ساتھ ہی اپنے آپ کو انسان کے لئے اعمال و اخلاق کا نمونہ بن کر دکھانے کی جدوجہد ہے، لڑائی اس وقت ضروری ہوتی ہے جب کوئی غرور و تکبر کے گھمنڈ میں اس اصلاح انسانی کی راہ میں کھنڈت ڈالے۔

چنانچہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ایلچی اسلام پہنچانے شام کی سرحد کے عرب عیسائی حاکم کے پاس روانہ ہوا تو راستہ میں عیسائیوں میں سے کسی نے اس ایلچی کو شہید کر دیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے جا حرکت کا بدلہ لینے کے

لئے مسلمانوں کی فوج کا ایک دستہ عیسائیوں کی تنبیہ کے لئے بھیجا، اس سے لڑنے کے لئے شام کے سارے عیسائی اور قیصر روم کے لوگ جس کے تحت شام کے یہ عیسائی عرب کے حاکم تھے جمع ہو گئے، اور ایک لاکھ سپاہی میدان میں اتر آئے مسلمانوں کی فوج تین ہزار سپاہی تھے موتہ کے مقام پر مقابلہ ہوا۔

یہ سن ۸ھ کا واقعہ ہے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اس سے پہلے اسی سال اسلام میں داخل ہو چکے تھے، اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس فوج میں شامل تھے۔

غزوۂ تبوک کا پس منظر

۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہونے کے بعد شوال میں غزوۂ حنین پیش آیا اس کے بعد مسلمانوں نے طائف کا گھیراؤ کیا اور پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سے لوٹے تو ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے لئے اعلان فرمادیا، اس جنگ کی ضرورت اس لئے پیش آئی کی رومیوں کے بادشاہ ہرقل کے خوشامدیوں نے یہ مشہور کردیا کہ عرب کا مدعی نبوت فوت ہو چکا ہے ملک میں افراتفری پھیلی ہوئی ہے ملک میں قحط سالی کا دوردورہ ہے، لہذا سرزمین عرب پر حملہ کرنے کا بہترین موقع ہے اس زمانے میں مصر، شام، فلسطین، حمص اور ایشائے کوچک کے اطراف میں رومیوں کا تسلط تھا اور وہ سرزمین عرب پر بھی اپنا تسلط جمانا چاہتے تھے، یہ وہی ہرقل ہے جس کی طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کا دعوت نامہ بھی بھیجا تھا مگر اس کی بدبختی تھی کہ اپنی بادشاہت کے تحفظ کی خاطر ایمان قبول نہ کیا۔

طائف سے واپسی کے وقت مدینہ شریف کے جو حالات تھے، ان کا پتہ "مسلم شریف" کی روایت سے چلتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: اس وقت ہم پر کچھ دہشت طاری تھی کیونکہ رومیوں کی طرف سے جنگی تیاریوں کی مسلسل خبریں آرہی تھیں، چنانچہ ہرقل نے کبادنامی ایک شخص کی کمان میں چالیس ہزار کا ایک لشکر عرب کا حملہ کرنے کے لئے دیدیا، شام کے علاقے میں عربوں کے بعض قبیلے مثلاً: عاملہ، غسان اور جذام وغیرہ آباد تھے، ان میں غسان کے بادشاہ بڑے مشہور تھے، بادشاہ ہرقل نے ان سے بھی مدد حاصل کی اور جنگی تیاریاں پورے زوروشور سے کرنے لگا، چنانچہ اس سے پہلے کہ دشمن مدینہ پر حملہ کردے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف سے

واپسی پر اعلان کر دیا کہ دشمن کے ساتھ اس کی سرحد پر جا کر جنگ لڑی جائے گی۔

غزوۂ تبوک سے پہلے جتنی بھی جنگیں لڑی گئیں پیغمبر ﷺ کسی خاص مقام کی طرف کوچ کرنے کا صراحت کے ساتھ اعلان نہیں فرماتے تھے، بلکہ صرف اس قدر بتاتے تھے کی جہاد کے لئے جانا ہے، تبوک کا معرکہ پہلا واقعہ ہے جب آپ ﷺ نے روانگی سے کئی مہینے پہلے ہی تیاری کا حکم کر کے منزل مقصود کی وضاحت فرمادی، آپ نے اطراف کے قبائل کی طرف بھی آدمی بھیج کر جنگ کی تیاری کا پیغام بھیجا جس کے جواب میں جنگ کی تیاری زور وشور سے شروع ہوگئی، چونکہ قحط سالی کا زمانہ تھا لوگوں کی مالی حالت کمزور تھی، اس لئے مجاہدین کے لئے مطلوبہ سواریاں میسر نہیں آرہی تھیں، روایت میں آتا ہے کہ چھ چھ یا دس دس آدمیوں کے حصے میں ایک ایک سواری آئی تھی، جنگ اور کھانے پینے کے سامان کی بھی کمی تھی، تاہم پیغمبر ﷺ نے اس جہاد کے لئے پختہ ارادہ فرمالیا۔

چونکہ اس جہاد پر روانگی کے ایام مسلمانوں کے تنگی کے دن تھے؛ اس لئے غزوہ کو "جیش ذات العسرۃ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، یعنی: تنگی والا لشکر کہتے ہیں، اس جہاد کے لئے پیغمبر ﷺ نے تیس ہزار مجاہدین کا لشکر تیار کیا بعض مؤرخین نے چالیس ہزار اور اکسٹھ ہزار کا ذکر بھی کیا ہے، تاہم اس لشکر کی تعداد تیس ہزار سے کم نہ تھی۔

اس واقعہ میں منافقین کی کمزوری اور ان کی رسوائی کا بیان بھی آیا ہے؛ اس لئے غزوہ کا ایک نام غزوہ فاضحہ ہے، چنانچہ یہاں سے لے کر واقعہ کے آخر تک منافقین کا حال بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے یہ لوگ حیلے بہانے سے جنگ سے گریز کرنے کی کوشش کرتے رہے آپ ﷺ نے ان سے تعرض نہیں کیا مگر تمام مخلص مسلمانوں کو حکم دیا وہ جنگ میں ضرور شریک ہوں اس جنگ میں پیچھے رہنے والوں میں صرف معذور آدمی تھے یا وہ تین توانا آدمی بھی تھے، پھر ان لوگوں کی توبہ بڑی مشکل کے ساتھ قبول ہوئی اس سورت کا نام ''توبہ'' اسی مناسبت کے ساتھ ہے، بہر حال اس موقع پر جو لوگ کمزوری دکھا رہے تھے یا تنگی کی وجہ سے گھبراتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو

تنبیہ فرمائی ہے کہ اگر تم اپنے پیغمبر کے ساتھ جہاد میں شریک نہیں ہوگے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کا کوئی دوسرا ذریعہ پیدا فرمادے گا، اور تمہارا حشر بہت بُرا ہوگا، آگے اللہ تعالیٰ نے منافقین کی صریح طور پر ملامت کی ہے اور ان کی فضیحت (ذلت) کی گئی ہے۔

الغرض! غزوۂ تبوک کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے بات کی تمہید یوں فرمائی کہ اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تمہیں جہاد کے لئے نکلنے کا کہا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں نکلو تو تم زمین کی طرف بوجھل ہوئے جاتے ہو جیسا کہ پہلے عرض کیا غزوۂ تبوک کے اعلان کے وقت حالت یہ تھی کہ مسلمان قحط سالی کا شکار تھے، لمبا سفر سامنے تھا، وسائل کی بھی کمی تھی، کھجور کی فصل بھی پک چکی تھی جس کے لئے فصل اٹھانا بھی ضروری تھا، مگر مسلمانوں کے لئے روانگی کا اعلان ہو چکا تھا، دوسری طرف ایک بڑی، مستقل اور منظّم سلطنت کے ساتھ ٹکر تھی، جس کی وجہ سے بعض ذہنوں میں ناکام ہونے کا خوف پیدا ہو رہا تھا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی ہے ایمان والو! ظاہری حالتوں کو دیکھتے ہوئے بددل نہ ہو جاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے جہاد کے لئے نکل کھڑے ہو، فتح مکہ کے بعد ہجرت تو منسوخ ہوگئی تھی کیونکہ خود مکہ معظّمہ دارالاسلام بن چکا تھا البتہ جہاد کے لئے ہر وقت تیار رہنے کی ضرورت تھی، اس ضمن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا عام حکم تھا کہ جب بھی تم سے جہاد کا مطالبہ کیا جائے تو فوراً چل پڑو اور کوئی حیلے بہانے نہ کرو یہاں پر فرمایا کہ: جہاد کے نام سن کر تم زمین کی طرف بوجھل ہوئے جاتے ہو جیسے: کوئی شخص زیادہ بوجھ پڑ جانے کی وجہ سے نیچے جھک رہا ہو۔

فرمایا: کیا تم آخرت کی زندگی کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر راضی ہو چکے ہو، ادھر دنیا کا چندروزہ گھٹیا معمولی سا سامان ہے اور ادھر آخرت کی نعمتوں والی ہمیشہ کی زندگی ہے، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ ایک مؤمن اور مسلمان کے نزدیک اولیت آخرت کی زندگی کو حاصل ہے جب کہ اس دنیا کے تمام فائدے دوسرے نمبر پر آتے ہیں، جہاد کے ذریعے دنیاوی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں لیکن اصل مقصود آخرت کی کامیابی ہوتی ہے مؤمن دنیا میں جو کام بھی کرتا ہے اس کا اصل مقصد یہی ہونا چاہیے کہ کسی طرح آخرت کی ہمیشہ

والی زندگی بن جائے، نماز کی مثال بھی ایسی ہی ہے اگر چہ اس کے ذریعے اس دنیا میں بھی وقت کی پابندی، انسانی ہمدردی اور اجتماعیت جیسے فائدے حاصل ہوتے ہیں مگر اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی کامیابی ہے۔

فرمایا کہ: اگر تم دنیا کی زندگی پسند کرتے ہو تو سن لو کہ! دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلے میں بالکل معمولی سا ہے کوئی شخص سو سال کی عمر بھی پالے اور دنیا کا کتنا بھی سامان جمع کرلے، اس کی حیثیت بہرحال عارضی ہے، زندگی بھی فنا ہونے والی ہے اور مال بھی ختم ہوتے والا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستر سال کے درمیان ہیں اور بہت کم لوگ ہیں جو اس سے آگے جاتے ہیں، تو فرمایا: تم اتنی معمولی سی زندگی کو آخرت کی ہمیشہ والی زندگی پر ترجیح دیتے ہو، یاد رکھو! آخرت کے مقابلے میں اس زندگی کی کوئی حیثیت نہیں۔

تبوک کی جنگ کی وجہ

ان آیتوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کافروں کے ساتھ جنگوں میں سے ایک اہم جنگ غزوۂ تبوک کا ذکر ہے اور یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ، یعنی: آخری جنگ ہے۔

تبوک مدینہ کے شمال میں شام کی سرحد پر ایک جگہ کا نام ہے، شام اس وقت رومی عیسائیوں کی حکومت کا ایک صوبہ تھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ۸ھ میں جب فتح مکہ اور غزوۂ حنین سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ پہنچے تو اس وقت جزیرۃ العرب کے اہم حصے اسلامی حکومت میں شامل ہو چکے تھے، اور مکے کے مشرکین کی آٹھ سالہ لگاتار جنگوں کے بعد اب مسلمانوں کو ذرا سکون کا وقت ملا تھا۔

مگر جس ذات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" فرما کر سارے جہاں کی فتح اور کامیابیاں اور اس میں اپنے حق دین کو غالب کرنے کی جو خوشخبری دیدی تھی اس کو اور اس کے ساتھیوں کو فرصت کہاں؟ مدینہ پہنچتے ہی ملک شام سے آنے والے تجارت پیشہ لوگوں نے مدینہ میں یہ خبر پہنچائی کہ روم کے بادشاہ ہرقل نے اپنی فوجیں تبوک کے مقام میں شام کی سرحد پر جمع کردی ہیں اور فوجیوں کو پورے ایک سال کی تنخواہیں پیشگی دے کر مطمئن اور خوش کردیا اور عرب کے بعض قبیلوں سے بھی ان کی ساز باز ہے ان کا ارادہ

یہ ہے کہ مدینہ پر یکبارگی حملہ کردیں۔

جب پیغمبر ﷺ کو اطلاع پہنچی تو آپ نے ارادہ فرمالیا کہ ان کے حملہ کرنے سے پہلے خود آگے بڑھ کر وہیں مقابلہ کیا جائے جہاں ان کی فوجیں جمع ہیں۔

یہ زمانہ اتفاق سے سخت گرمی کا زمانہ تھا، جس پر ان کے روزگار اور پورے سال کے گزر بسر کا مدار تھا، اور یہ بھی معلوم ہے کہ جس طرح ملازمت پیشہ لوگوں کی جیبیں مہینہ کے آخری دنوں میں خالی ہوجاتی ہیں اسی طرح کھیتی باڑی کرنے والے فصل کے ختم پر خالی ہاتھ ہوتے ہیں ایک طرف غربت دوسری طرف نئی فصل سے قریب میں ملنے والی آمدنی کی امید، اس پر مزید سخت گرمی کا موسم، اس قوم کے لئے جس کو ابھی ابھی ایک دشمن کے ساتھ آٹھ سال مسلسل جنگوں کے بعد ذرا سانس لینے کا موقع ملا تھا ایک نہایت مشکل امتحان تھا۔

مگر وقت کا تقاضا تھا اور یہ جہاد اپنی نوعیت میں پہلی جنگوں سے اس لئے بھی مختلف تھا کہ پہلے تو اپنی ہی طرح کے عوام سے جنگ تھی، اور یہاں روم کے بادشاہ ہرقل کی تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ تھا؛ اس لئے پیغمبر ﷺ نے مدینہ طیبہ کے پورے مسلمانوں کو اس جہاد کے لئے نکلنے کا حکم دیدیا اور کچھ آس پاس کے دوسرے قبیلوں کو بھی جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔

یہ عام اعلان اسلام کے فدائیوں کا ایک سخت امتحان تھا اور اسلام کے دعویٰ کرنے والے منافقوں کی آزمائش بھی، اس کے علاوہ لازمی نتیجہ کے طور پر اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کے مختلف حالات ہوگئے تھے، قرآن کریم نے ان میں سے ہر حالت کے متعلق جدا جدا ارشادات فرمائے ہیں۔

ایک حالت ان صحابہ کرام کی تھی جو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جہاد کے لئے تیار ہوگئے، دوسرے وہ لوگ جو شروع میں تو ہچکچا رہے تھے، بعد میں مجاہدوں کے ساتھ شامل ہوگئے، ان دونوں قسم کے حضرات کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا: "الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ "یعنی: وہ لوگ تعریف کے قابل ہیں جنھوں نے سخت تنگی کے وقت پیغمبر ﷺ کی فرمانبرداری کی بعد اس کے کہ ان میں سے ایک فریق کا دل ڈگمگانے لگا تھا۔

تیسری حالت ان لوگوں کی تھی جو کسی صحیح مجبوری کی وجہ سے اس جہاد میں نہ جاسکے اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے: "لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى" یعنی: کمزوروں اور بیماروں پر جہاد میں شریک نہ ہونے میں کوئی گناہ نہیں، اس آیت میں ان کے عذر قبول ہونے کا اظہار فرمادیا۔

چوتھی قسم ان لوگوں کی تھی جو باوجود کوئی عذر نہ ہونے کی صرف سستی کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہوئے، ان کے متعلق کئی آیتیں نازل ہوئیں "اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ" اور "اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ" اور "وَ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا" یہ تینوں آیتیں ایسے ہی حضرات کے بارے میں نازل ہوئیں جس میں ان کی سستی پر تنبیہ بھی ہے اور بالآخر ان کی توبہ قبول ہونے کی خوشخبری بھی۔

پانچواں طبقہ ان منافقوں کا تھا جو جاسوسی اور فساد کرنے کے لئے مسلمانوں کے ساتھ ہوگئے تھے ان کی حالت کا ذکر قرآن کریم کی ان آیتوں میں ہے۔ "وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ" "وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ" "وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا"۔

لیکن اس ساری سختی اور تکلیف کے باوجود جہاد میں شریک ہونے سے رکے رہنے والوں کی مجموعی تعداد پھر بھی برائے نام تھی، زیادہ تر تعداد انہی مسلمانوں کی تھی جو اپنے سارے فائدے اور آرام وسکون کو قربان کر کے اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار ہوگئے؛ اس لئے اس جہاد میں نکلنے والے اسلامی لشکر کی تعداد تیس ہزار تھی جو اس سے پہلے کسی جہاد میں نظر نہیں آئی۔

نتیجہ اس جہاد کا یہ ہوا کہ جب روم کے بادشاہ ہرقل کو مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت کے آنے کی خبر پہونچی تو اس پر رعب اور خوف چھا گیا، مقابلہ پر نہیں آیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام کے لشکر کے ساتھ چند محاذ جنگ پر رکنے کے بعد جب یقین ہوگیا کہ دشمن مقابلہ پر نہیں آئے گا تو واپس تشریف لے آئے۔

تم نہیں تو اور

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ

اگر نہ | نکلے تم | عذاب دے گا تم کو | عذاب | دکھ دینے والا | اور بدلے میں لے آئے گا | اور قوم | سوا تمہارے

وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۳۹﴾

اور نہ بگاڑو گے تم اس کا کچھ اور اللہ اوپر ہر چیز کے قدرت والا ہے (۳۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اگر تم نہ نکلو گے تو تم کو دردناک عذاب دے گا اور بدلے میں تمہارے سوا اور لوگ لا دے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۳۹)

تفسیر

واقعی تبوک کی جنگ کے لئے تیاری کا حکم مسلمانوں کا بڑا سخت امتحان تھا، لوگ حنین اور طائف سے لڑتے تھکے ماندے واپس آئے تھے، گرمی بلا کی پڑ رہی تھی، سفر لمبا تھا اور جس علاقے میں سے گزرنا تھا وہاں تپتی ہوئی ریت کے میدانوں کے سوا اگر کچھ تھا تو وہ گرم ہوا کے سخت جھونکے تھے اور پانی کی کمی تھی اور دوسری طرف مدینہ میں اس وقت بڑی چہل پہل تھی کھجوریں پک کر تیار ہوگئی تھیں کھانے پینے کی کمی نہ تھی تیز دھوپ پناہ لینے کے لئے سایہ دار درخت تھے، یہ سب آرام وراحت کے اسباب چھوڑ کر جنگل بیابان میں دور دراز کا سفر اختیار کرنا لو کے جھلس دینے والے تھپیڑے کھانا، چلچلاتی دھوپ میں چلنا، حقیقت میں اللہ کے ان ہی بندوں کے بل بوتے کا تھا جن کے دلوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت اور عظمت تھی، انہوں نے اس دنیا کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھ لیا تھا اور اسے آخرت کے مقابلے میں بالکل بھی کچھ نہیں سمجھتے تھے، ذرا اس آیت کو دیکھئے کیا کہتی ہے ارشاد ہے کہ: اگر تم اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر پوری ہمت کے ساتھ کمر باندھ کر باہر نہ نکلے تو سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے، یہ آرام وچین سب رکھا رہ جائے گا اگر تم نہ اٹھے تو تمہارے بدلے اس کام کے لئے اور لوگ مقرر کر دیئے جائیں گے اللہ کے کام رکے نہیں رہ سکتے، تم سستی کرو گے تو دنیا میں اور اس کے بندے بہت ہیں، تمہیں عذاب دیتے اور دوسروں سے تمہارے بدلے کام لیتے اسے کیا دیر لگ سکتی؟ اس کی قدرت کے تحت سب کچھ ہے جو چاہے کر دے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: تمہیں تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم اللہ کی راہ میں نہیں نکلو گے، جہاد کے لئے نہیں نکلو گے

تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا، مفسرین کرام کے بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جو قوم جہاد کو چھوڑ دیتی ہے وہ ذلت ورسوائی کا شکار ہو جاتی ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے خطبے میں یہی فرمایا کہ: جہاد چھوڑنے کے نتیجے میں ایک سزا غلامی کی صورت میں آتی ہے اور غلامی سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی سزا نہیں ہے۔

فرمایا: اگر تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے لئے نہیں نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دیں گے اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں سے لے لیگا، اور تمہارے حصہ میں ذلت کے سوا کچھ نہیں آئے گا، تاریخ گواہ ہے جب عربوں میں کمزوری آئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ ترکوں کو کھڑا کر دیا، اور دین کی خدمت کے لئے ان ترکوں کو منتخب کیا جب عرب قوم بادشاہت، شہنشاہیت اور عیاشی میں پڑ کر کمزور ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بجائے ترکوں کو دین کی خدمت کو توفیق عطا فرمائی۔

فرمایا: یاد رکھو! اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہے چونکہ تبوک کا سفر بڑا لمبا تھا، راستے کی مشکلات پیش نظر تھیں، سامان کی کمی تھی ایسے حالات میں مسلمانوں کا دل ٹوٹنا قدرتی بات تھی؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے خبردار کر دیا کہ کمزوری نہ دکھانا، اس سے اللہ تعالیٰ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، بلکہ تمہیں ہی الٹا نقصان ہوگا، پہلے دور کے مسلمانوں نے بڑی بے جگری کے ساتھ یہ منزلیں طے کی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح نصیب فرمائی، جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں خیمہ لگایا تو رومیوں پر دہشت طاری ہوگئی روم کے بادشاہ ہرقل کانپ اٹھا کہ جو لوگ ایک ہزار میل کا کٹھن سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے ان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا یہ مسلمانوں کے سچے اور پکے ایمان کا نتیجہ تھا کہ رومیوں پر ان کا خوف چھا گیا اور وہ مقابلہ پر نہ آئے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہاں پر فرمایا ہے کہ: کمزوری نہ دکھانا ورنہ ذلیل ہو جاؤ گے اور اپنی حیثیت کو گم کر دو گے ایسی صورت میں ہم دوسرے لوگوں کو تمہاری جگہ کھڑا کر کے ان سے کام لیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ

اگر نہ مدد کروگے تم اس کی تو ابھی ابھی مدد کی ہے اس کی اللہ نے جب نکالا اس کو ان لوگوں نے جو کافر ہوئے دوسرا

اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ

دو میں کا جب وہ دونوں میں تھے غار جب وہ کہتا تھا ساتھی اپنے کو مت کڑھیں تحقیق اللہ ساتھ ہیں ہمارے

بامحاورہ ترجمہ:۔ اگر تم پیغمبر کی مدد نہ کرو گے تو اللہ نے اس کی مدد کی ہے جس وقت کافروں نے اس کا کو نکالا تھا کہ جب وہ اپنے رفیق سے کہہ رہے تھے کہ تو غم نہ کھا بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

تفسیر

اس سے پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا اصل دین ہے، اور دنیا میں اس کا قائم مقام رہنا اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق ضروری ہے یہ کسی خاص فرقے یا خاص قوم کا دین نہیں ہے، اگر کسی خاص قوم کو اس کی مدد کا موقعہ ملے تو اس بات کو اپنی خوش قسمتی سمجھے جو حسنِ اخلاق سے اسے مل رہا ہے، مدینہ کے مسلمانوں کو سمجھایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس وقت یہ کام تم سے لینا منظور ہے، اگر تم نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کے اس موقعہ پرستی سے کام لیا تو یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کے لئے کوئی اور قوم کھڑی کردے گا اور تم ایک بڑی سعادت سے محروم رہ جاؤ گے، اور عذاب کے مستحق ٹھہرو گے۔

اس آیت میں ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ کو اس دین کے قائم رکھنے کے لئے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، اگر وہ کسی سے اس سلسلہ میں کام لیتا ہے تو یہ اس لئے ہے کہ وہ اس کے ذریعے اس کے درجے بڑھائے اور اس کو اپنے انعام واکرام سے نوازیں، اگر تمہیں اس میں کچھ شک ہو کہ اللہ تعالیٰ تنہا کسی کی مدد کرسکتا ہے تو ہجرت کے واقعات پر غور کرو اور دیکھو کہ جب مکہ کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کردیں اور اس ارادہ سے سارے

قبیلوں کے چنے ہوئے لوگوں نے آپ کے گھر کے دروازے کو گھیر لیا کہ آپ جب نکلیں گے تو سب لوگ ایک دم حملہ کر کے نعوذ باللہ آپ کا کام تمام کردیں گے، آپ اندر تشریف رکھتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ چھوڑ کر گھر سے باہر نکلے اور ان سب کے سامنے سے ان کی آنکھوں میں خاک جھونک کر صاف نکل گئے، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کے گھر سے ساتھ لے کر مکہ سے باہر نکلے اور پاس ہی کے ''ثور'' نامی ایک غار کے اندر چھپ گئے، کافر تلاش میں نکلے اور اس غار کے دروازے تک پہنچ گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھبرائے کہ اگر انہوں نے دیکھ لیا تو مشکل بنے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: گھبراؤ نہیں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

جہاد کی دو قسمیں ہیں: فرض عین اور فرض کفایہ، عام حالتوں میں جب کہ دشمن کے مقابلے کے لئے مجاہدین کافی تعداد میں موجود ہوں تو باقی لوگوں کا جہاد میں شریک ہونا ضروری نہیں ہوتا، مجاہدین کی شمولیت باقیوں کو بھی کفایت کرجاتی ہے، البتہ جب دشمن ہجوم کرجائے اور محض مجاہدین سے دفاع ممکن نہ ہو تو پھر عام مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہوجاتا ہے، ایسے حالات میں اگر ایک عاقل، بالغ مسلمان پیچھے رہ جائے تو وہ گنہگار ہوتا ہے، تبوک کی جنگ کے لئے بھی اعلانِ عام کردیا گیا تھا تو اس آیت میں جہاد سے جی چرانے والوں کو سخت تنبیہ کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے مسلمانو! اگر تم اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی مدد نہیں کروگے، اس موقع پر جانی و مالی قربانی پیش نہیں کروگے تو اللہ تعالیٰ کو بھی تمہاری کچھ پرواہ نہیں اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی پہلے بھی مدد کی تھی جب کہ کافروں نے آپ کو نکال دیا تھا، یہ ہجرت کی طرف اشارہ ہے، جب مسلمان دلیل اور حجت کے اعتبار سے مشرکین مکہ پر غالب آرہے تھے اور وہ لوگ دین کی تبلیغ کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے سے عاجز آچکے تھے تو قصی بن کلاب کے مکان ''دارالندوۃ'' میں جمع ہوئے تاکہ اسلام کے راستے میں بند باندھنے کا کوئی حتمی پروگرام طے کرسکیں، چنانچہ بڑے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہر قبیلے کا ایک ایک جوان رات کو محمد کے مکان کا گھیراؤ کرلے اور جس وقت آپ گھر سے باہر نکلیں، سب لوگ یکبارگی حملہ کر کے آپ کا کام تمام کردیں ان کی اسکیم یہ تھی کہ جب اس قتل میں تمام قبیلے شامل ہوں گے تو آپ کا خاندان قصاص کا مطالبہ نہیں کرسکے گا اور اس کے بجائے مشترکہ طور پر دیت ادا کریں گے، اس پروگرام کے تحت رات کو منتخب آدمیوں نے مکان کا گھیراؤ کرلیا

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس منصوبے کی خبر دیدی اور ساتھ ہی ہجرت کی اجازت بھی عطا فرمادی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کے وقت اٹھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹایا اور حکم دیا کہ صبح تمام لوگوں کی امانتیں واپس کردیں اور پھر مناسب وقت پر مدینہ طیبہ آجائیں، آپ گھر سے باہر نکلے، شاہت الوجوہ کہتے ہوئے اور مٹی کی مٹھی گھیراؤ پر موجود لوگوں کی طرف پھینکتے ہوئے چل دیئے، آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے اور ان کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ سے پندرہ سولہ میٹر دور غارِ ثور میں جا ٹھہرے۔

''غارِ ثور''، جبلِ ثور کے آخری سرے پر ہے، راستہ بہت سخت ہے یہ غار پہاڑ کی چوٹی پر ہے، غار میں داخلے کا راستہ اتنا تنگ ہے کہ آدمی بیٹھ کر بھی داخل نہیں ہوسکتا بلکہ لیٹ کر داخلہ ممکن ہوتا ہے، پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غار میں داخل ہوئے، غار کو صاف کیا اس کے سوراخوں کو بند کیا، صرف ایک سوراخ رہ گیا جسے بند کرنے کے لئے کچھ نہ ملا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار کے اندر تشریف لائے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زانو پر سر رکھ آرام فرمانے لگے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آخری سوارخ بند کرنے کے لئے اپنا پاؤں اس کے آگے رکھ دیا، تھوڑی دیر بعد کسی سانپ وغیرہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاؤں کو کاٹ لیا، آپ کو بڑی تکلیف ہوئی مگر آپ نے اپنی جگہ سے بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہ ہوئے کہ کہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آرام میں خلل واقع نہ ہو، جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیدار ہوئے تو آپ کو علم ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ تکلیف پہنچی ہے آپ نے اپنا لعاب مبارک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاؤں پر لگایا تو تکلیف فوراً دور ہوگئی، زہر کا اثر ختم ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفا عطا فرمائی۔

اِدھر جب صبح ہوئی تو گھیراؤ کرنے والوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے مکان میں نہ پایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ موجود تھے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ انہیں معلوم نہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہاں گئے ہیں مشرکوں نے جب اپنا منصوبہ ناکام ہوتے دیکھا تو فیصلہ کیا کہ محمد کو تلاش کیا جائے اور جو بھی آپ کو زندہ یا مردہ حالت میں لائے گا ایک سو اونٹ انعام کا حق دار ہوگا، انعام کی لالچ میں بہت سے لوگ تلاش کے لئے بھاگ کھڑے ہوئے، انہوں نے ماہر کھوج لگانے والوں کی خدمت بھی حاصل کیں، جو انہیں پاؤں کے نشانات کے ساتھ ساتھ جبلِ ثور کے دامن تک

لے گئے پھر اوپر چڑھائی شروع ہوئی حتی کہ مشرک ''غارِ ثور'' کے منہ تک پہنچ گئے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس مدد کی طرف اشارہ ہے جو اس مشکل جگہ پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہوئی، ''طبرانی'' اور بعض دوسری حدیث کی کتابوں میں یہ روایت موجود ہے کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غار کے اندر چلے گئے تو مکڑی نے جالا تن دیا اور وہاں دہانے کے قریب ہی جنگلی کبوتروں نے گھونسلہ تیار کیا اور انڈے دے دیئے جب یہ صورت حال دیکھی تو مشرکوں نے کھوجی کی بات پر اعتبار نہ کیا، کہنے لگے یہ جالا تو محمد کی پیدائش سے بھی پہلے کا معلوم ہوتا ہے وہ اس غار کے اندر کدھر جاسکتے ہیں۔

غار کے اندر سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مشرکوں کے پاؤں دیکھے تو آپ کو سخت پریشانی ہوئی کیونکہ وہ غار کے دہانے تک پہنچ چکے تھے، یہاں پر یہ بات توجہ طلب ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پریشانی اپنی ذات کے لئے نہ تھی بلکہ آپ کو فکر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس کی تھی کہ دشمن آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچادیں، انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر یہ لوگ پاؤں کی طرف جھک کر اندر دیکھیں تو ہمیں پالیں گے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اے ابوبکر! تمہارا ان دونوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ تعالیٰ ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ ہم دونوں کا مددگار ہے تو ہمیں کیا ڈر ہوسکتا ہے؟ ہم اسی کے حکم سے مکہ مکرمہ سے نکلے ہیں اب وہی دشمن سے بچائے گا۔

یہاں پر یہی بات بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی مدد فرمائی "ثَانِيَ اثْنَيْنِ" وہ دو میں سے دوسرے تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہر ایک دوسرے کے اعتبار سے ثانی ہیں، جب کہ وہ دونوں غار کے اندر تھے؛ اسی لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یارِ غار اور مخلص ساتھی کہا جاتا ہے کہ وہ اتنے کٹھن وقت میں بھی آپ کے ساتھ رہے، بہر حال اس سخت خطرے کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی فکر زیادہ پریشان کررہی تھی، یہ دونوں حضرات صرف اسی مقام پر اکٹھے نہیں ہوئے بلکہ ہر موقع اور محل پر یہ دونوں ساتھی اکٹھے نظر آتے تھے، زمانہ امن کا ہو یا جنگ کا، اور سفر کا ہو یا حضر کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں بھی جاتے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ ہوتے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو نمایاں کام انجام دیئے وہ

آپ ہی کا حصہ تھے۔

اب غار کے اندر کی کیفیت بتائی جارہی ہے کہ جب وہ دونوں ساتھی غار کے اندر تھے جب ان میں سے اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر اپنے ساتھی، یعنی: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہہ رہے تھے قرآن کریم میں لفظ صاحب سے حضرت صدیق اکبر مراد ہیں گویا آپ کا صحابی ہونا قرآن کریم کی آیت سے ثابت ہے، بہرحال صدیق اکبر کی پریشانی کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر نے فرمایا کہ: آپ غم نہ کھائیں فکر نہ کریں، مفسرین کرام یہاں پر یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ یہاں پر لفظ ''حزن'' بتلا رہا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنی جان کی فکر نہیں تھی بلکہ آپ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے متعلق فکر مند تھے؛ اس لئے کہ خوف کا لفظ اپنی جان کے متعلق ہوتا ہے اور لفظ ''حزن'' دوسرے کی جان کے متعلق ہوتا ہے۔

فرمایا: غم نہ کریں! اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں یہاں پر جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں کے ساتھ ہیں اور جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہو وہ یا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا یا ولی، ان دونوں حضرات میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ پیغمبر ہے اور دوسرا برگزیدہ ولی ہے، فرمایا: اے صدیق! تم غم نہ کھاؤ، اللہ تعالیٰ ہم دونوں کے ساتھ ہیں اور جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہو جائے اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں آتا ہے کہ جب آپ اپنی قوم بنی اسرائیل کو لے کے نکل کھڑے ہوئے تو آگے قلزم کا سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر تھا، اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے کہا "کَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ" (الشعراء) ہرگز نہیں! بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے وہی رہنمائی کرے گا، مقصد یہ ہے کہ وہاں واحد کا لفظ ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے صرف موسیٰ علیہ السلام تھے، اور یہاں دو ہیں اور جمع کا لفظ ہے کیونکہ دونوں برگزیدہ تھے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے ایمان والو! اگر تم اپنے پیغمبر کی مدد نہیں کروگے اس کے ساتھ جہاد کے لئے نہیں نکلوگے تو کوئی بات نہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی ہمیشہ مدد کی ہے اور وہ آئندہ بھی کرتا رہے گا، جہاد سے پیچھے رہ کر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کا تو کچھ نقصان نہیں ہوگا بلکہ اس میں تمہارا ہی نقصان ہے کہ تم بہت بڑے ثواب سے محروم ہو جاؤ گے۔

اطمینان وسکون

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَ جَعَلَ
پس اتارا اللہ نے سکون اپنا اوپراس کے اور مدد کی اس کی ساتھ لشکروں کے نہیں دیکھے تم نے جو اور کر دی

كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَ اللّٰهُ
بات ان کی کفر کیا جنھوں نے نیچی اور بات اللہ کی ہی اونچی ہے اور اللہ

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾
زبردست حکمت والا ہے (۴۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پس اللہ نے اپنی طرف سے اس پر سکون اتارا اور اس کی مدد کو وہ فوجیں بھیجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور کافروں کی بات نیچے ڈالی اور اللہ کی بات ہمیشہ اوپر ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ (۴۰)

تفسیر

اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا سکون اتارا اور فرشتوں کے لشکر بھیج دیے، جنہیں انسان نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن ان کا اثر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر پڑ رہا تھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں بالکل کسی قسم کا خوف و ہراس نہ تھا، عین اس وقت جب مکے کے کافر غار کے منہ پر کھڑے موقعہ کا جائزہ لے رہے تھے انہوں نے اپنے ساتھی سے کہا: ڈرو نہیں! اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، چنانچہ ساتھی کے دل پر بھی آپ کی بات کا اثر پڑا جیسا کہ گھبراہٹ کا نام و نشان تک نہ رہا، کافر اپنے برے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے اور ان کو ناکام لوٹنا پڑا، اللہ کا ارادہ غالب رہا اور جو اس نے چاہا تھا وہ ہو کر رہا وہ بڑی قوت والا ہے اور جانتا ہے کہ کس وقت کس طریقے سے مدد پہنچانی مناسب ہے اس وقت کے سمجھ دار مسلمان ان آیتوں کو سن کر سمجھ گئے کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس وقت اسلام کے بول بالا کرنے

کا ذریعہ بنایا ہے اور یہ اس کا ہم پر بڑا فضل ہے اگر ہم اس کے حکم پر کمر کس کر نکلنے کے لئے تیار ہو گئے تو وہ ہر مشکل میں ہماری مدد کرے گا اور اگر ہم نے اس وقت سستی کی تو اللہ تعالیٰ اپنا کام اپنی قدرت سے انجام دے ہی رہا ہے۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس مشکل موقع پر بھی اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد فرمائی اور اس پر اپنا سکون اتارا آپ کا ساتھی بہت غمگین ہو رہا تھا اللہ تعالیٰ نے اپنی تسلی اور اس کی مدد ایسے لشکر سے کی جس کو تم نہیں دیکھ سکے، اللہ تعالیٰ نے بدر اور حنین کے موقعوں پر بھی اپنے فرشتے بھیج کر مدد فرمائی تھی اور اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے فرشتے اتار کر مشرکوں کے خیالات ہی پلٹ دیئے اور وہ سوچ بھی نہ سکے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی اس غار کے اندر بھی ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فرشتوں نے جبل ثور پر اتر کر یہ ساری تدبیر کر دی، فرشتوں کے ذریعے مدد کرنے کا یہی مطلب ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کی بات کو نیچا کر دیا اور اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہے، یہ کلمہ توحید اور ایمان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے غالب کر دیا اس شدید ترین موقع پر اپنے پیغمبر اور صدیق کی مدد کی، دشمن پیچھے لگے ہوئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام تدابیر ناکام کر دیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی ہمیشہ غالب آتا ہے، لہٰذا تمہارا جہاد میں شامل نہ ہونا تمہارے ہی حق میں برا ہوگا۔

وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: خدا تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے اور وہی بہت بڑی حکمت والا ہے وہ اپنی حکمت سے دوسرے موقعوں پر بھی اپنے پیغمبر اور دین کی مدد کر سکتا ہے۔

عام تیاری کا حکم

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ

نکل کھڑے ہو ہلکے اور بوجھل اور کوشش کرو ساتھ مالوں اپنے کے اور جانوں اپنی کے میں

سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

راستے اللہ کے یہ بہتر ہے واسطے تمہارے اگر ہو تم جانتے (۴۱)

بامحاورہ ترجمہ: نکلو ہلکے اور بوجھل اور جہاد کرو اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم میں سمجھ ہے۔ (۴۱)

لفظی تحقیق: خِفَافٌ: ہلکے۔ خفیف کی جمع ہے، جو خفة سے بنا ہے خفة کے معنی ہلکا ہونا، خفیف اس سے صفت کا صیغہ ہے ہلکا وہ آدمی جو بوجھل نہ ہو یا جس کے پاس ساز و سامان نہ ہو ہلکا پھلکا، یہاں یہی مراد ہے۔

ثِقَالٌ: بوجھل۔ ثقیل کی جمع ہے جو صفت کا صیغہ ہے اور ثقل سے بنا ہے جس کے معنی بوجھل ہونے کے ہیں اور خود بوجھ کو بھی کہتے ہیں، ثقیل جو بوجھل ہو یا جس کے پاس ساز و سامان ہو یہاں یہی مراد ہے۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ کوئی پیدل ہو یا سوار ہو، غریب ہو یا مالدار ہو، غرض! جس حالت میں ہو فوراً اٹھ کھڑا ہو جس کے پاس صرف جان ہو وہ جان اور جس کے پاس مال بھی ہو وہ جان اور مال دونوں لے کر حاضر ہو اس وقت کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔

یہ ان باتوں کے سوچنے کا موقعہ نہیں ہے کہ گرمی سخت ہے ساز و سامان نہیں ہے یا تیار فصلیں کاٹنی ہیں اس وقت اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا اعتماد کرو اور یقین رکھو کہ اس جہادی سفر میں تمہارے لئے بہتری ہی بہتری ہے۔

آگے چل کر تمہیں خود معلوم ہو جائے گا گو اس وقت تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس سفر میں مسلمانوں کے ہاتھ کیا آئے گا، بظاہر تو نقصان ہی نقصان نظر آ رہا ہے گھر کے آرام اور ٹھنڈک چھوڑنا، گرمی کی سختی برداشت کرنا، خشک جنگلوں میں بھوکے پیاسے تیز تیز چلنا، پھر فصلوں کا نقصان الگ رہا۔

اس حکم کو سن کر تمام مسلمان تیار ہو گئے، البتہ منافقوں نے طرح طرح کے حیلے بہانے کرنے شروع

کردیئے آگے ان بیان ہے۔

جہاد کے سلسلے میں تبوک کی جنگ کا ذکر ہورہا ہے، شروع کی آیتوں میں جہاد کی ترغیب دی گئی تھی اور پھر جہاد میں شریک نہ ہونے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے ایمان والوں کو خبردار کیا گیا کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی مدد نہیں کریں گے، یعنی: آپ کے ساتھ جہاد میں شامل نہیں ہونگے تو یہ نہ سمجھیں کہ جہاد محض انہی پر موقوف ہے بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارے بغیر بھی اپنے پیغمبر کی مدد کرنے پر قادر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یاد دلایا کہ اس نے ہجرت کے مشکل ترین موقع پر بھی مدد فرمائی تھی جب مشرکوں نے پیغمبر ﷺ کے قتل کا پختہ ارادہ کرلیا تھا اور مسلح نوجوانوں نے رات کے وقت آپ کے گھر کا محاصرہ کرلیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے ساتھ آپ کو وہاں سے نکال کر ''غار ثور'' میں پہنچا دیا تھا جہاں آپ تین دن رہے اور پھر آگے مدینہ طیبہ کے لئے روانہ ہوگئے۔

تبوک کی جنگ کے موقع پر جہاد میں نکلنے کے لئے عام اعلان کا حکم ہوا تھا اور پیغمبر ﷺ نے تمام مسلمانوں کو جہاد میں شرکت کا حکم دیدیا تھا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی بشیر بن الخصاصیہ پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا اے اللہ کے پیغمبر! آپ کس چیز پر بیعت لیتے ہیں، فرمایا: سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ''اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّیْ عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ'' کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اس کا بندہ اور رسول ہوں، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ: تمہیں دن میں پانچ نمازیں ادا کرنا ہوگی، رمضان کے روزے رکھنا ہوں گے، مال ہے تو ہر سال زکوٰۃ دینا ہوگی، اور استطاعت ہے تو بیت اللہ کا حج کرنا ہوگا، پیغمبر ﷺ نے فرمایا: میں ان چھ باتوں پر بیعت لیتا ہوں، اس پر بشیر کہنے لگا کہ اے اللہ کے پیغمبر! عقیدہ تو درست رکھوں گا، نماز اور روزے بھی ادا کرسکوں گا مگر میرے پاس زیادہ مال نہیں؛ اس لئے نہ تو میں زکوٰۃ ادا کرسکوں گا اور نہ حج کے لئے جاسکوں گا اس کے علاوہ میں کمزور دل آدمی ہوں، لہذا جہاد میں شریک نہیں ہوں گا، اس پر پیغمبر ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک بیعت سے پیچھے ہٹالیا اور فرمایا کہ: اگر تم جہاد میں شامل نہیں ہوگے اور

صدقہ نہیں دو گے تو جنت میں کیسے داخل ہو گے، یہ سن کر بشیر نے تمام ارکان پورا کرنے کا وعدہ کر کے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ: عقیدے کی اصلاح کے بعد پانچ عبادات ہیں، ان میں سے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ فرض عین ہیں اور پانچویں عبادت جہاد ہے جو کبھی فرض عین ہوتی ہے اور کبھی فرض کفایہ جیسا کہ آگے احکام و مسائل میں آئے گا۔

فرمایا: مال اور جان دونوں کے ذریعے جہاد میں حصہ لو، جس کے پاس دونوں چیزیں ہیں وہ دونوں کام میں لائے، جو خود شریک نہیں ہو سکتا معذور ہے وہ مال دے اور جس کے پاس مال نہیں وہ اپنی جان پیش کرے اور اگر دونوں چیزوں سے معذور ہے تو نصیحت کی بات ہی کر دے، مجاہدین کی حوصلہ افزائی اور دشمن کی حوصلہ شکنی کی بات کر دے تو اس کے لئے یہ بھی جہاد ہے، فرمایا: ہر صورت میں جہاد میں شامل ہونا ہی تمہارے لئے بہتر ہے، کیونکہ اگر اس میں سستی دکھاؤ گے تو پھر ذلت کا منہ دیکھنا پڑے گا، پہلے گزر چکا ہے کہ اگر کمزوری دکھاؤ گے تو پھر اللہ کے حکم کا انتظار کرو، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک ارشاد بھی ہے کہ: اگر جہاد سے منہ موڑ دگے کمزوری کا اظہار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دیگا، پھر تمہارا دین بھی ذلیل ہوگا غلام بن جاؤ گے جو کسی قوم کے لئے بدترین سزا ہے۔

احکام و مسائل

جہاد کبھی فرض عین ہوتا ہے اور کبھی فرض کفایہ، پھر فرض عین ہونے کی دو صورتیں ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ دشمن مسلمانوں کے شہر میں یکدم ہلہ بول دے جیسا کہ عرب کا کافروں اور مشرکوں کو خندق کی جنگ میں مدینہ پر ہلہ بول دیا تھا، تو اس وقت جہاد فرض عین ہو گیا تھا، اور جہاد کے فرض عین ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ حاکم کی طرف سے جہاد میں نکلنے کے لئے (نفیر عام) اعلان عام کر دیا گیا ہو، جیسا کہ تبوک کی جنگ میں آپ نے جہاد میں نکلنے کے لئے اعلان عام کر دیا تھا ان دو صورتوں کے سوا جہاد فرض کفایہ ہے۔

منافقوں کے حیلے بہانے

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلٰكِنْ بَعُدَتْ

اگر ہوتا مال (غنیمت کا) قریب اور سفر آرام کا تو پیچھے ہولیتے آپ کے اور لیکن دور لگا

عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ

ان کو فاصلہ اور اب قسم کھائیں گے وہ ساتھ اللہ کی اگر بس میں ہوتا ہمارے تو ضرور نکلتے ہم ساتھ آپ کے

يُهْلِكُونَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ﴿۴۲﴾ ع ۱۲

تباہ کر رہے ہیں وہ اپنے آپ کو اور اللہ جانتا ہے کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں (۴۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اگر مال نزدیک ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ لوگ یقیناً آپ کے ساتھ ہو لیتے لیکن ان کو مسافت لمبی نظر آئی اور اب اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم سے ہوسکتا تو ہم آپ کے ساتھ ضرور چلتے وہ لوگ اپنی جانوں کو وبال میں ڈالتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ (۴۲)

لفظی تحقیق: عَرَضٌ: مال۔ یہ لفظ پہلے آچکا ہے ہر قسم کے سامان اور مال و متاع کو کہتے ہیں، یہاں اس سے مراد مال غنیمت ہے۔ قَاصِدٌ: آرام اور ہلکا۔ یہ لفظ قصد سے اسم فاعل ہے قصد درمیانی سیدھی راہ، بیچ کی حالت جس میں کمی زیادتی نہ ہو، قاصد سیدھا چلنے والا کوئی چیز یا حالت جس میں دکھ تکلیف کوئی نہ ہو، یہاں یہی معنی مراد ہیں اسی سے اقتصاد بنا ہے، جس کے معنی ہیں اعتدال کی راہ جس میں بیچ کی حالت کا خیال رکھا جائے، قصد کے معنی کسی طرف توجہ نہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں اس لفظ کے معنی کسی جانب توجہ کرنے والا ہوں گے، قاصد: پیغام رساں کو بھی کہتے ہیں۔ شُقَّةٌ: مسافت۔ دشوار گزار لمبا راستہ دو چیزوں کا درمیانی فاصلہ، یہ اسم ہے جو: ش، ق، ق، سے بنا ہے، شق کے معنی ہیں: توڑ ڈالنا، ایک چیز کو چیر پھاڑ کر دو ٹکڑے کر دینا، اسی سے شقاق بنا ہے، جس کے معنی: آپس کی ناچاقی کے ہیں، یہ لفظ "سورۂ بقرہ" میں آچکا ہے اسی مناسبت سے دو چیزوں کے درمیانی فاصلہ کو "شقة" کہتے ہیں۔

تفسیر

تبوک کی جنگ کی تیاری کا حکم ایسا کڑا امتحان تھا جس میں کمزور ایمان والے پاس نہیں ہوسکتے تھے، ارشاد ہے کہ: اگر تھوڑی سی دور چل کر غنیمت کا مال ملنے کی امید ہوتی اور سفر میں تکلیفیں اور مشکلیں نہ ہوتیں تو یہ لوگ خوشی خوشی آپ کے ساتھ چل پڑتے لیکن اتنے بڑے دور دراز کا سفر اختیار کرنے سے ان کی جان نکلتی ہے یقیناً جنگی مرحلہ میں شامل نہ ہونے کے لئے یہ بہانہ بازیاں کریں گے، ان میں کچھ تو پہلے ہی اور کچھ تمہاری واپسی کے بعد آکر قسمیں کھائیں گے کہ ہم ضرور آپ کے ساتھ چلتے لیکن کچھ کام ایسے پیش آگئے کہ ہم شامل نہ ہوسکے ان حرکات سے یہ اپنا نقصان کررہے ہیں یہ دنیا و آخرت دونوں میں تباہ ہوں گے، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کا حال بیان فرمایا ہے اور یہ آگے دور تک چلا جائے گا جیسا کہ اگلے رکوع میں آرہا ہے تبوک کی جنگ کے موقع پر بعض منافق بہانے سے پیچھے رہ گئے تھے، اور پھر پیغمبر ﷺ کی واپسی پر عذر پیش کئے، اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں ایسے منافقوں کی قلعی کھول کر ان کو رسوا کیا ہے ان کے جھوٹ کو ظاہر کیا ہے اور آئندہ کے لئے خبردار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ چال بالکل پسند نہیں، تبوک کی جنگ کے لئے پیغمبر ﷺ نے روانگی سے کئی مہینے پہلے تیاری کا حکم دیدیا تھا کیونکہ مدینہ سے تقریباً ایک ہزار میل کا سفر طے کرنا تھا؛ اس لئے وہ جہاد سے پیچھے رہ گئے تھے، اللہ تعالیٰ یہاں ان کی منافقانہ حالتوں کو واضح فرمارہے ہیں۔

کہ اگر اس سفر میں زیادہ غنیمت کا مال ملنے کی توقع ہوتی اور سفر بھی درمیانہ ہوتا تو ضرور آپ کے پیچھے جاتے، یعنی: جہاد میں شریک ہوتے، لیکن ان کو یہ سفر لمبا لگا اور زیادہ مشقت والا نظر آیا؛ اس لئے وہ جہاد میں شریک نہ ہونے کے لئے مختلف حیلے بہانے کرنے لگے، بہرحال مسلمانوں کا یہ لشکر تبوک میں ایک مہینہ پڑاو لے رہا مگر دشمن کو سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان پر دہشت طاری کردی اور وہ پسپائی پر مجبور ہوگئے،

علاقے بھر کی طاقتوں نے وفاداری قبول کر لی، آپ نے ان سے جزیہ کا معاہدہ کیا، نیز: انہوں نے یہ بھی عہد کیا کہ آئندہ کے لئے وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے اور رومیوں کی طرفداری نہیں کریں گے، بہرحال اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو فتح عطا فرمائی اور وہ کامیاب واپس لوٹے یہ اتنا کٹھن سفر تھا کہ آج بھی جب واقعات پڑھتے ہیں تو ایمان والوں کے صبر اور عظیم قربانی پر حیرت ہوتی ہے۔

منافقوں کا پول

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ

معاف کردیا اللہ نے آپ کو کیوں اجازت دی آپ نے واسطے ان کے یہاں تک کہ ظاہر ہوجاتے واسطے آپ کے وہ لوگ جو

صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

سچ بولتے ہیں اور جان لیتے آپ جھوٹوں کو (۴۳)

بامحاورہ ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف کردیا آپ نے ان کو رخصت کیوں دے دی یہاں تک کہ آپ پر ظاہر ہوجاتے سچ کہنے والے اور آپ جھوٹوں کو جان لیتے۔ (۴۳)

لفظی تحقیق: عَفَا: معاف کردیا۔ ماضی کا لفظ ہے ''عَفْوٌ'' سے، ''عَفْوٌ'' کے معنی ہیں خطا معاف کرنا۔

تفسیر

پچھلی آیت میں بیان ہوا کہ بعض لوگ جن کے ایمان درست نہیں آسان آسان مرحلوں میں تو بڑے شوق سے شریک ہوجاتے ہیں جن میں برائے نام مشقت سے ڈھیر سا مال ہاتھ لگنے کی امید ہوتی ہے، لیکن دشوار راستوں کے طے کرنے اور کڑی مشقتوں کے جھیلنے سے کتراتے ہیں، اس آیت میں انہی منافقوں کے حال کو اور زیادہ واضح کیا گیا ہے، ارشاد ہے کہ: یہ مکار لوگ فیصلہ کر چکے ہیں کہ تبوک کی جنگ میں شامل نہ ہوں گے، لیکن دکھانا یہ چاہتے ہیں کہ آپ مضبوط عذر کی بناء پر اجازت لے کر شامل نہیں ہو رہے آپ ان کی جھوٹی باتوں میں آ کر

ان کو اجازت دیدیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف کر دیا، لیکن آپ نے ان کو اتنی جلدی کیوں اجازت دیدی حالانکہ یہ تو جب بھی شامل نہ ہوتے جب انہیں اجازت نہ دیتے، لیکن اجازت نہ دینے میں یہ فائدہ ہوتا کہ ان کا بھرم کھل جاتا اور یہ کھلم کھلا نافرمان اور جھوٹے ثابت ہوجاتے، اور اپنے آپ کو سچے اور فرمانبردار لوگوں میں کبھی نہ گنوا سکتے اور مسلمانوں کو بھی کھل کر معلوم ہوجاتا کہ ذرا ذرا سی بات پر بہانہ بنانا نفاق کی علامت ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس منافق آتے اور کہتے کہ ہم اس جنگ میں شرکت ضرور کرتے، لیکن اس وقت ہم مجبور ہیں کیونکہ حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ ہم شامل نہیں ہوسکتے آپ یہ دیکھ کر ان کا شامل ہونا نہ ہونا برابر ہے ان کا عذر قبول فرمالیتے اور انہیں گھر ٹھہرنے کی اجازت دے دیتے۔

اس آیت میں کہا گیا کہ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو جھوٹے سچوں میں تمیز ہوجاتی اور یہ کوئی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈانٹ ڈپٹ نہیں بلکہ ایک مشفقانہ انداز میں منافقوں کی اندرونی پلیدی کو ظاہر کرنا ہے جس سے منافق بھی سمجھ جائیں کہ ان کا فریب چھپا ہوا نہیں ہے سب لوگ انہیں ان کے عمل سے پہچانتے ہیں۔

ایمان والوں کا رویہ

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ

نہیں اجازت مانگتے آپ سے وہ لوگ جو ایمان لے آئے اللہ پر اور پر دن آخرت کے کہ

يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾

جہاد پر بیٹھ رہنے کی ساتھ اپنے مالوں کے اور جانوں اپنی کے اور اللہ جانتا ہے ڈرنے والوں کو (۴۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ سے رخصت وہ لوگ نہیں مانگتے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے؛ اس لئے کہ اپنے مال اور جان سے جہاد کریں اور اللہ ڈرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ (۴۴)

تفسیر

پچھلی آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تھا کہ بہانہ باز لوگ جو پاس دوڑ دوڑ کر آرہے ہیں یہ فقط ظاہری طور پر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ آپ کے بڑے فرمانبردار اور خادم ہیں، اور آپ جو حکم دیتے ہیں وہ اس کو بے چون و چرا بجالاتے ہیں درحقیقت یہ مکار لوگ پختہ ارادہ کر چکے ہیں کہ اس جنگ میں کبھی شریک نہ ہوں گے، لیکن دکھاوے کے لئے جھوٹے عذر بنا کر کے آپ سے پیچھے رہ جانے کی رخصت چاہتے ہیں تا کہ لوگوں میں رسوا نہ ہوں، اس موقعہ رخصت طلب کرنا سچے اور ایمان والوں کا کام نہیں ہے، پختہ ایمان والے تو ایسے موقعوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ جان توڑ محنت سے کام کر کے اللہ عزوجل کے سامنے سرخرو ہوں اور آخرت میں انعام واکرام کے حق دار ہوں۔

جہاد سے بیٹھے رہنے کے لئے بہانے تلاش کرنا اور رخصت کی درخواست کرنا اور درجہ کی بے ایمانی کی نشانی ہے، کیونکہ ایمان اس کی اجازت ہی نہیں دیتا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بچنے کے لئے عذر تلاش کئے جائیں، اس آیت میں اسی کا بیان ہے ارشاد ہے کہ: جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی جان و مال کو اللہ تعالیٰ کی حکم برداری سے بڑھ کر عزیز نہیں رکھتے، وہ انتظار کرتے رہتے ہیں کہ کب موقعہ آئے اور کب ہم اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی جان و مال پیش کریں اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت پر پورے یقین کی علامت یہ ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف اللہ کو راضی کریں، اور دنیا کی عیش وآرام کو آخرت کے عیش وآرام کے لئے چھوڑ آنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے ہم میں سے ہر ایک کو چاہئے کہ اس کسوٹی پر اپنے ایمان کو گھس گھس کر گھڑی گھڑی دیکھتا رہے اگر دنیا میں جی لگتا ہے اور آخرت کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تو اس آیت کے مطابق ایمان میں کچھ خلل ہے، اللہ تعالیٰ پر اور اس کے وعدوں پر اطمینان نہیں ہے روپیہ پیسہ اور دنیا کی شان وشوکت زیادہ محبوب ہے، اللہ بچائے۔

فرمایا: یہ تو منافقوں کی حالت ہے کہ حیلے بہانے سے جہاد سے جان کتراتے ہیں مگر مؤمنوں کا حال یہ

ہے کہ جولوگ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ آپ سے ہرگز رخصت طلب نہیں کرتے جن لوگوں کے دلوں میں ایمان کی روشنی مضبوط ہوچکی ہے وہ کیسے برداشت کرسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر تو سفر برداشت کرے اور وہ پیچھے بیٹھے رہیں، فرمایا: وہ نہیں رخصت طلب کرتے اس بات سے کہ وہ جہاد کریں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ، مقصد یہ ہے کہ ایمان والے لوگ اپنے مالوں اور جانوں کی قربانی کے لئے ہروقت تیار رہتے ہیں، سورت کے آخر میں آرہا ہے وہ لوگ اپنی جان پیغمبر کی جان پر ترجیح نہیں دیتے جب اللہ کا پیغمبر خود مشقت برداشت کررہا ہے تو مؤمن کیسے سکون پکڑ سکتے ہیں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کن لوگوں کے دل میں خدا تعالیٰ کا خوف ہے اور کن کے دلوں میں کفر، شرک اور نفاق بھرا ہوا ہے۔

تبوک کی جنگ کے جو حالات تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان نہایت ہی کٹھن حالات میں سخت تکلیفوں کو برداشت کرکے پیغمبر ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے، پھر جو لوگ کسی وجہ سے قافلے سے پیچھے رہ گئے وہ بھی نہایت ہی مشکل حالتوں میں مجاہدین سے جا ملے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا اونٹ سفر کے دوران چلنے سے معذور ہوگیا انہوں نے اونٹ کو وہیں چھوڑا اور سفر کا سامان اپنی گردن پر اٹھا کر چل دیئے، منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے قافلے سے جا ملے، جب پیغمبر ﷺ نے ان کو دور سے آتا ہو دیکھا تو فرمایا کہ: ابوذر دنیا میں بھی منفرد ہے اور آخرت میں بھی منفرد ہوگا۔

ابوخیثمہ صحابی رضی اللہ عنہ نے رات بھر مزدوری کی اور ایک صاع کھجور لاکر پیغمبر ﷺ کی خدمت میں پیش کردیں اور عرض کیا کہ میری طرف سے جہاد کے لئے قبول فرمالیں، منافقین نے فوراً طعن کیا کہ یہ شخص انگلی پر لہو لگا کر شہیدوں میں نام لکھوانا چاہتا ہے، بھلا! اتنے بڑے معرکے کے لئے ایک صاع کھجوروں کی کیا حیثیت ہے؟ ادھر عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے اس جنگ کے لئے چار ہزار درہم یا دینار پیغمبر ﷺ کی خدمت میں پیش کئے منافقوں نے یہاں بھی اپنے دل کی پلیدی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اتنی بڑی رقم دکھلاوے کے لئے دے رہا ہے۔

اسی ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے کہ وہ بھی قافلے سے پیچھے رہ گئے تھے اور پھر اکیلے ہی پیچھے پیچھے چل

پڑے، جب قافلے کے قریب پہنچا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دور سے غبار اٹھتا ہوا دیکھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں ڈال دیا کہ یہ ابوخیثمہ ہے، چنانچہ وہ قافلے میں پہنچ گئے تو مجاہدین نے دیکھا کہ وہ واقعی ابوخیثمہ ہی تھا آگے تین دوسرے آدمیوں کا ذکر بھی آرہا ہے جو اگرچہ پکے سچے مسلمان تھے مگر کسی طرح تبوک کی جنگ میں شامل نہ ہوسکے انہوں نے کوئی جھوٹا حیلہ بنانے کے بجائے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا اور پھر ان پر بڑی سخت آزمائش آئی، بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: مؤمنوں کا شیوہ ہے کہ وہ اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرتے ہیں اور اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کے پیغمبر سے رخصت طلب نہیں کرتے، انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں جو بھی تکلیف پہنچے اسے خوشی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔

اس آیت میں اور اس سے اگلی آیت میں مؤمنین اور منافقین کا یہ فرق بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ پر صحیح ایمان رکھنے والے ایسے موقع پر کبھی اپنی جان و مال کی محبت میں جہاد سے جان چرانے کے لئے آپ سے رخصت نہیں مانگا کرتے، بلکہ یہ کام صرف انہی لوگوں کا ہے جن کا اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان صحیح نہیں اور اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کو خوب جانتے ہیں۔

بہانے بازوں کو کھوٹ

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ

وہی اجازت مانگتے ہیں آپ سے جو نہیں ایمان رکھتے پر اللہ اور پر دن آخرت کے اور

ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

شک کر رہے ہیں دل ان کے پس وہ میں شک اپنے بھٹک رہے ہیں (۴۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ سے وہی لوگ اجازت مانگتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لائے اور ان کے دل شک میں پڑے ہیں، سو! وہ اپنے شک میں ہی بھٹک رہے ہیں۔ (۴۵)

لفظی تحقیق: یَسْتَأْذِنُ: رخصت مانگنا۔ یہ لفظ پچھلی آیت میں بھی آیا ہے اس کا مادہ: أ، ذ، ن ہے۔ اذن: مشہور لفظ ہے اس کے معنی اجازت اور رخصت کے ہیں اسی سے "استیذان" بنا ہے جس کے معنی اذن چاہنا اور اس سے "یستاذن" مضارع ہے۔ ارتابت: شک میں ہیں۔ ماضی کا لفظ ہے جس کا مصدر "تردّد" ہے جو "ردّ" سے بنا ہے "ردّ" کے معنی مشہور رد کر دینا ہم بھی بولتے ہیں، "تردّد" کے معنی ہچکچاہٹ ہیں جب کہ دل کسی بات کے ہر مطلب کو رد کر دیتا ہے اور کسی پر اطمینان نہیں کرتا۔

تفسیر

اس سے پہلی آیت میں کہا کہ جن لوگوں کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے اور آخرت کے دن کو برحق مانتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ اور پیغمبر کے حکم کے آگے بہانہ بازیوں کی نہیں سوجھتی وہ تو راہ ہی دیکھتے رہتے ہیں کہ کب حکم آئے اور کب ہم اپنی جان اور اپنا مال سب کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوں۔

اس آیت میں ارشاد ہے کہ: بہانہ بازیاں وہ لوگ کرتے ہیں جو زبانی تو بہت کچھ کہتے رہتے ہیں لیکن دل میں نہ تو وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور نہ آخرت کو، کچھ گردانتے ہیں ان کا دل شک وشبہ میں گرفتار رہتا ہے وہ دنیا کے نفع وآرام کو سب کچھ سمجھتے ہیں اس سے اونچی ان کی نظر اٹھتی ہی نہیں، کبھی مسلمانوں سے اور ان کے کاموں سے فائدہ پہنچ گیا تو ان کی سی کہنے لگے اور جہاں کچھ سختیاں برداشت کرنے اور مصیبتیں جھیلنے کا موقعہ آیا تو طرح طرح کے بہانے بنا کر کھسک گئے اور ظاہرداری کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہنے کے جھوٹے بہانے بیان کئے۔

معلوم ہوا ہے کہ ایمان کی علامت یہ ہے اللہ اور پیغمبر کا حکم ملتے ہی فوراً اس کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو جائے جو اس پر عمل کرنے سے حیلے بہانے کر کے پیچھے رہا وہ اصل ایمان سے محروم ہے۔

نفاق کا ثبوت

اللّٰهُ	كَرِهَ	وَّ لٰكِنْ	وَّ	عُدَّةً	لَاَعَدُّوْا لَهٗ	الْخُرُوْجَ	وَ لَوْ اَرَادُوا
اللہ نے	ناپسند کیا	لیکن	اور	کچھ سامان	ضرور تیار کرتے واسطے اس کے	نکلنے کا	اور اگر ارادہ کرتے بھی وہ

انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَ قِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

اٹھنا ان کا | پس روک دیا ان کو | اور | کہہ دیا گیا کہ | بیٹھو | ساتھ | بیٹھنے والوں کے (۴۶)

بامحاورہ ترجمہ: اور اگر وہ نکلنا چاہتے تو ضرور اس کا کچھ سامان تیار کرتے لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا پسند نہ کیا، سو! ان کو روک دیا اور حکم ہوا کہ بیٹھے رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ (۴۶)

لفظی تحقیق: اَعَدُّوْا: تیاری کرتے۔ ماضی کا صیغہ ہے جس کا مصدر "اعداد" ہے اور مادہ: ع، د، د ہے، "عد" کے معنی شمار کرنا اعداد سامان تیار کرنا، ضرورت کی چیز مہیا کرنا گن گن کر، کام کے وقت کے لئے رکھنا، یہ چیزیں سامان کہلاتی ہیں جس کی عربی "عدة" ہے۔ انبعاث: اٹھ کھڑا ہونا۔ مصدر ہے جو "بعث" سے بنا ہے اسی سے "انبعاث" بنا ہے اور یہ لازم ہے اس کا معنی اٹھ کھڑا ہونا اور "بعث" متعدی ہے جس کے معنی ہیں دوسرے کو اٹھانا، تیار کر کے کہیں چل دینا۔ "ثبط": روک دینا۔ ماضی کا صیغہ ہے جس کا مصدر "تثبیط" ہے اور مادہ: ث، ب، ط ہے "ثبط" اور "تثبیط" دونوں کے معنی کسی کام سے روک دینے کے ہیں لیکن "تثبیط" میں زیادہ زور ہے کسی کو اصل کام سے روکنے کے لئے اور مشغلوں میں پھنسا دینا۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اے پیغمبر! جو لوگ آپ سے آ آ کر کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ چلنے کو تیار تھے لیکن کچھ کام ایسا آپڑا کہ جا نہیں سکتے، ان کا جھوٹ تو یہاں سے ظاہر ہے کہ انہوں نے چلنے کی تیاری ہی نہیں کی، کہتے تو یہ ہیں کہ ہم تیار تھے مگر کام کی مجبوری سے رُک گئے، لیکن ان کے گھروں میں جا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ سفر کی تیاری کی کوئی علامت نہیں، بات یہ ہے کہ اللہ عزوجل کو منظور ہی نہیں کہ یہ اس غزوے میں شرکت کریں ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ ہمیں بھی سب کے ساتھ اٹھ کھڑا ہونا چاہئے اور جنگ میں حصہ لینا چاہئے اللہ تعالیٰ نے اس خیال سے ان کے دل پھیر دیئے؛ اس لئے انہیں چلنے کا خیال نہیں، بلکہ بیٹھ رہنے کا پختہ ارادہ ہے یہ ہمیشہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور نقصان پہنچانے کی عادت میں گرفتار رہے ہیں؛ اس لئے یہ اس کی شامت ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے ان کو جنگ میں شریک ہونے کی فضیلت سے محروم کردیا اور کہہ دیا جاؤ! اور بیٹھنے والوں کے ساتھ تم بھی مل کر بیٹھے رہو، مسلمان اس سفر سے سرخ رو ہو کر واپس آئیں گے اور تم اپنی شامت اعمال کی وجہ سے بیٹھ کر ہمیشہ کے لئے ذلیل وخوار ہو جاؤ گے۔

چوتھی آیت میں ان کے عذر غلط ہونے کا ایک قرینہ بتلایا گیا ہے کہ " وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً "یعنی: اگر واقعی یہ لوگ جہاد کے لئے نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لئے ضروری تھا کہ کچھ تیاری بھی کرتے لیکن انہوں نے کوئی تیاری نہیں کی جس سے معلوم ہوا کہ عذر کا بہانہ غلط تھا، درحقیقت ان کا ارادہ ہی جہاد کے لئے نکلنے کا نہیں تھا۔

معقول اور غیر معقول میں فرق

اس آیت سے ایک اہم اصول معلوم ہوا جس سے معقول اور غیر معقول میں فرق کیا جاسکتا ہے وہ یہ عذر انہی لوگوں کا قابل قبول ہوسکتا ہے جو حکم ماننے کے لئے تیار ہوں، پھر کسی اتفاقی حادثہ کے سبب معذور ہو گئے معذوروں کے تمام معاملات کا یہی حکم ہے، جس نے حکم ماننے کے لئے کوئی تیاری ہی نہیں کی اور ارادہ ہی نہیں کیا پھر کوئی عذر بھی پیش آ گیا تو یہ عذر گناہ بدتر از گناہ کی ایک مثال ہوگی صحیح عذر نہ سمجھا جائے گا، جو شخص جمعہ کی نماز کی حاضری کے لئے تیاری مکمل کر چکا ہے، اور جانے کا ارادہ کر رہا ہے کہ اچانک کوئی ایسا عذر پیش آ گیا جس کی وجہ سے نہ جاسکا تو اس کا عذر معقول ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اس کی عبادت کا پورا اجر عطا فرماتے ہیں، اور جس نے کوئی تیاری کی ہی نہیں، پھر اتفاقاً کوئی عذر سامنے آ گیا تو وہ محض ایک بہانہ ہے۔

صبح کو سویرے نماز کے لئے اٹھنے کی تیاری پوری کی، گھڑی میں الارم لگایا، یا کسی کو مقرر کیا جو وقت پر جگائے، پھر اتفاق سے یہ تدبیر غلط ہوگئیں جس کی وجہ سے نماز قضاء ہوگئی، جیسے: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ التعریس میں پیش آیا کہ وقت پر جاگنے کے لئے یہ انتظام فرمایا کہ حضرت بلال کو بٹھا دیا کہ وہ صبح ہوتے ہی سب کو جگا دیں مگر اتفاق سے ان پر بھی نیند غالب آ گئی، اور سورج نکل آنے کے بعد سب کی آنکھ کھلی، تو یہ عذر صحیح اور معقول ہے جس

کی بناء پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ: نیند میں آدمی معذور ہوتا ہے کوتاہی وہ ہے جو جاگتے ہوئے کی جائے، وجہ یہ تھی کہ اپنی طرف سے وقت پر جاگنے کا انتظام مکمل کرلیا گیا تھا، خلاصہ یہ ہے کہ حکم پورا کرنے کے لئے تیاری کرنے یا نہ کرنے ہی سے کسی عذر کے معقول اور نامعقول ہونے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے محض زبانی جمع خرچ سے کچھ نہیں ہوتا۔

تفسیر

پچھلی آیت میں کہا گیا تھا کہ یہ لوگ جو تمہارے ساتھ اس جنگ میں جانے کی تیاری نہیں کررہے اور بیٹھے رہنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے، وہ پسند نہیں فرماتا کہ یہ اس جنگ میں شریک ہوں اور تم میں مل کر سفر کریں؛ اس لئے اس نے ان کا دل ہی اس کی طرف پھیر دیا ہے اور ان کو جانے سے روک دیا ہے اور انہیں اس پر آمادہ کردیا ہے کہ بیٹھنے والے اپاہج لوگوں کے ساتھ ملکر بھی یہ بیٹھے رہیں، اس آیت میں اس کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ انہیں اس جنگ میں تمہارے ساتھ شامل کرنا کیوں نہیں چاہتا۔

ارشاد ہے کہ: ان کو اسلام سے اور جہاد سے کوئی دلچسپی نہیں اگر تم میں مل کر یہ بھی نکلتے تو تمہیں بھی تمہارے فرض سے غافل کرنے کی کوشش کرتے، فرض کو فرض سمجھ کر نہ کرنا اور اس میں کوئی اور غرض مثلاً: تفریح، دل لگی، ناموری، دنیا کا نفع وغیرہ شامل کرلینا تباہی کی نشانی ہے یہ سوا اس کے کہ تمہارے اندر پھوٹ ڈالیں اور کسی کام نہ آتے، تمہارے اندر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کی سنتے ہیں اور تمہارے راز ان کو بتادیتے ہیں ان ظالموں سے اللہ خوب واقف ہے۔

اس آیت میں دھوکہ سے اجازت لینے والے منافقوں کا یہ حال بھی بتلادیا گیا کہ ان کا جہاد میں نہ جانا ہی بہتر تھا اگر یہ جاتے تو سازشوں اور جھوٹی خبروں سے فساد ہی پھیلاتے "وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ" یعنی: تم میں کچھ بھولے بھالے مسلمان ایسے بھی ہیں جو ان کی جھوٹی باتوں کا اثر لے سکتے ہیں۔

پرانے فتنہ باز

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَ قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى
یہ تو ڈھونڈتے رہتے ہیں فتنے کو سے پہلے اور الٹ پلٹ کرتے رہے ہیں واسطے آپ کے کاموں کے یہاں تک کہ

جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾
آگیا حق اور چھاگیا حکم اللہ کا اور وہ بڑبڑاتے ہی رہے (۴۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔وہ بگاڑ کی تلاش پہلے سے کرتے رہے ہیں اور آپ کے کام الٹتے رہے ہیں یہاں تک کہ وعدہ پہنچا اور اللہ کا حکم غالب ہوا اور وہ ناخوش ہی رہے۔(۴۸)

لفظی تحقیق: اِبْتَغَوْا: تلاش کرتے رہے ہیں۔ماضی کا صیغہ ہے" اِبْتَغَاءٌ" سے یہ لفظ" سورہ بقرہ" میں گزرچکا ہے،اس کا مادہ"بَغْيٌ" ہے"بَغْيٌ" کے معنی تلاش کرنا،اس معنی میں ابتغاء خاص طور پر استعمال ہوتا ہے۔

قَلَّبُوْا: الٹ پلٹ کرتے ہیں۔ماضی کا صیغہ ہے"تقلیب" سے جو قلب سے بنا ہے،قلب کے معنی الٹنا،"تَقْلِيْبٌ" میں مبالغہ ہے،یعنی:بار بار الٹ پلٹ کرنا،قلب دل کو بھی کہتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنے فیصلے بدلتا رہتا ہے۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ:یہ لوگ تو وہی ہیں جو پہلے ہی سے تمہارے کام خراب کرنے کی فکر میں لگے رہے ہیں اور جب موقع ملا ہے کبھی تمہیں نقصان دینے سے نہیں چوکے،یہ تو اللہ تعالیٰ کے ارادے سے اور اس کے حکم کے آگے بے بس ہوگئے ورنہ اپنی طرف سے ارادے تباہ کرنے میں انہوں نے کسر اٹھا نہیں رکھی،جب دیکھا کہ اسلام جمتا معلوم ہوتا ہے اور اب کسی کے ہلائے نہ ہلے گا اور جھٹ مسلمانوں کا کلمہ پڑھنے لگے مگر دل میں یہی سوچتے رہے کہ یہ تو اچھا نہ ہوا اور رنگ رلیاں منانے کے پرانے بہانے غائب ہی ہوگئے،زندگی باقاعدہ ہوگئی نماز، روزے کا دور دورہ ہوگیا وہ عیش وعشرت کی آزادی نہ رہی کہ جو چاہا سو کیا،مرتے کو اور مارتے رہے،زبردستوں

کے آگے جھکتے رہے، غرض! جس طرح ہوا اپنا الو سیدھا کیا اور مونچھوں پر تاؤ دے کر مزے سے دندناتے پھرے، اب قدم قدم پر پکڑ دھکڑ ہے، یہ کرو یہ نہ کرو، یہاں بیٹھو، یہاں سے اٹھو کسی کو نہ ستاؤ چوری کرو تو ہاتھ کاٹا جائے عورتوں سے منہ کالا کرو تو درے پڑیں، شراب پیو تو کوڑے کھاؤ، غرض! ہر طرح جان عذاب میں ہے، القصہ! جب تک اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسلام کا غلبہ پورا ہوگیا یہ اپنی شیطانیت سے باز نہ آئے اسلام کا بول بالا ہوا تو حسد کرنے لگے، مرتا کیا نہ کرتا، مگر دلوں میں خباثت اب بھی بھری ہوئی ہے شروع کی جنگوں میں منافقین نے جو کچھ کیا اس کا ذکر آل عمران آچکا ہے ''سورۂ نساء'' میں بھی ان کی روزمرہ کی زندگی میں سازشوں کا ذکر گزر چکا ہے۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ: یعنی: یہ لوگ اس سے پہلے بھی ایسا فتنہ وفساد پھیلا چکے ہیں جیسے احد کی جنگ میں پیش آیا تھا۔

وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ: یعنی: غالب آیا حکم اللہ کا منافق لوگ اس سے پہلے غصے سے سخت رنج وغم میں تھے اس سے ارشاد فرمادیا کہ: غلبہ اور فتح حق تعالیٰ شانہ کے قبضہ میں ہے، جیسا کہ پہلے واقعات میں آپ کو فتح دی گئی، اس جہاد میں بھی ایسا ہی ہوگا اور منافقوں کی سب چالیں ناکام ہوجائیں گی۔

نہ کرنے کے سو بہانے

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَ لَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ

اور میں سے ان بعض وہ ہیں کہ کہتے ہیں اجازت دے مجھے اور نہ پھنسا برائی میں مجھے آگاہ رہو میں برائی

سَقَطُوْا ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

وہ پھنسے ہوئے ہیں اور تحقیق دوزخ گھیرنے والی ہے کافروں کو (۴۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور بعض ان میں کہتے ہیں مجھ کو رخصت دے اور گمراہی میں نہ ڈال، سنتا ہے وہ گمراہی میں پڑ چکے ہیں اور بیشک دوزخ کافروں کو گھیر رہی ہے۔ (۴۹)

لفظی تحقیق: لَا تَفْتِنِّیْ: گناہ میں نہ پھنسا مجھ کو۔ نہی کا صیغہ ہے جو "ف، ت، ن" سے بنا ہے، اس کا مادہ مشہور لفظ فتنہ سے ہے، جس کے معنی آزمائش، گمراہی، کفر، گناہ، رسوائی، باہمی اختلاف بہت سے ہیں یہاں پر سب معنی ٹھیک بیٹھتے ہیں یہ لفظ "سورۂ بقرہ" میں آچکا ہے۔

تفسیر

اوپر سے ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو اسلام میں دنیاوی غرض سے داخل ہو گئے ہیں لیکن ان کا دل انہی جہالت اور انسانیت کے خلاف باتوں کو پسند کرتا ہے جن میں وہ اسلام سے پہلے پھنسے ہوئے تھے، ایسے لوگ محنت اور مشقت کے وقت جان چراتے ہیں، مدینہ میں ایسے لوگ شروع میں تھے اور ہر موقعہ پر مسلمانوں کو ہمت اور مشقت کے کاموں سے روکتے تھے، پختہ ایمان والے لوگ تو ان کی شرارتیں سب سمجھتے تھے لیکن عوام میں سے بعض پر ان کی سازشوں کا اثر پڑتا تھا، اس موقعہ پر ایک خاص شخص کی طرف اشارہ ہے جس کا نام جد بن قیس تھا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جنگ میں شریک ہو کر شام چلنے کی دعوت دی۔

اس گھٹیا انسان نے یہ بہانہ کیا کہ اے اللہ کے پیغمبر! خوبصورت عورتوں کو دیکھ کر میرا دل قابو میں نہیں رہتا، رومی عورتیں بہت حسین ہوتی ہیں کہ میں وہاں جا کر گناہ میں پھنس جاؤں گا؛ اس لئے مجھے یہیں رہنے کی رخصت دیدیجئے، البتہ مال سے میں حاضر ہوں، آپ نے فرمایا کہ: اچھا تم جاؤ! ہمیں ایسی ضرورت نہیں ہے دیکھا آپ سے پرہیزگاری جتا کر سفر کی مشقتوں سے بچنا چاہتا ہے، کیونکہ اسلام کا دل پر ذرا اثر نہیں ہے، اس آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے عام منافقوں کی حالت پر تبصرہ کیا ہے، ارشاد ہے کہ: کچھ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتے ہیں مجھے تو اپنے ساتھ لے جانے سے معاف رکھئے کہیں ایسا نہ ہو میں وہاں جا کر عورتوں کے ساتھ گناہ کی آفت میں پھنس جاؤں، کیونکہ میرا دل انہیں دیکھ کر بے قابو ہو جاتا ہے، آگے ارشاد ہے کہ: یہ رکا تو اس لئے ہے کہ یہ اور اس کے ساتھی پہلے ہی بہت سی آفتوں میں پھنسے ہوئے ہیں جھوٹے بہانے، عذر، دغا اور فریب ان کی گھٹی

میں پڑے ہوئے ہیں، ان کو تو آخرت میں دوزخ کی آگ چاروں طرف گھیر لے گی۔

جب غزوۂ تبوک کے لئے تیاری کا اعلان ہوا تو یہ شخص پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میں ایک عشقیہ مزاج آدمی ہوں بلکہ ایک روایت میں آتا ہے کہ خود پیغمبر ﷺ نے جد بن قیس سے پوچھا تھا "هل لك في جهاد بني الاصفر" کیا تو چاہتا ہے کہ بنی اصفر (رومیوں) کے ساتھ جہاد کیا جائے؟ تو اس نے جواب میں کہا تھا کہ میں ایک عشقیہ آدمی ہوں رومیوں کی عورتیں بڑی گوری چٹی اور خوبصورت ہیں، دل خواہ مخواہ ان کی طرف مائل ہوتا ہے وہ لباس بھی نیم عریاں پہنتی ہیں؛ اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ میں ان کے حسن میں گرفتار ہو کر وہیں کا ہو کر رہ جاؤں گا، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے اس جہاد میں شرکت سے رخصت دیدیں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس منافق کے اس بے ہودہ عذر کی مذمت بیان فرمائی ہے۔

وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ: یعنی: دوزخ ان سب کافروں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے جس سے نکل نہیں سکتے اس کی مراد یا تو یہ ہے کہ آخرت میں دوزخ ان کو گھیرے میں لے لیگی اور یا یہ کہ دوزخ میں پہونچنے کے اسباب جو اس وقت ان کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہیں انہیں کو دوزخ سے تعبیر فرمادیا، اس معنی کے اعتبار سے گویا فی الحال بھی یہ لوگ دوزخ ہی کے گھیرے میں ہیں۔

دوست نما دشمن

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ

اگر　پہنچے آپ کو　کوئی بھلائی　غمگین کرتی ہے ان کو　اور　اگر　پہنچے آپ کو　مصیبت　تو کہتے ہیں　تحقیق

اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ يَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۰

سنبھال لیا تھا ہم نے　کام اپنا　سے　پہلے ہی　اور چل دیتے ہیں　اور　وہ　خوشی سے پھولے نہیں سماتے (۵۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اگر آپ کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو ان کو بری لگتی ہے اور اگر کوئی مصیبت پہنچے تو کہتے

ہیں ہم نے اپنا کام پہلے ہی سنبھال لیا تھا اور پھر جاتے ہیں خوشیاں کرتے۔(۵۰)

لفظی تحقیق: حَسَنَةٌ: بھلائی، خوشی۔"حَسَنَةٌ" اسم ہے"ح،س،ن" سے، جس کے معنی ہیں ہر وہ چیز جو دل کو خوش کرے یہاں اس سے مراد دشمنوں کے مقابلے میں کامیابی ہے اسی طرح مصیبت سے مراد شہید ہوجانا، زخمی ہوجانا، شکست پانا ہیں۔اَخَذْنَآ: سنبھال لیا۔ ماضی کا صیغہ ہے اخذ سے اخذ کے معنی ہیں پکڑنا، قابو میں کرلینا، یہاں اس سے مراد ہے دوراندیشی کرکے نقصان سے بچ جانا۔

تفسیر

مدینہ کے منافقوں کا طرزِ عمل بیان ہورہا ہے یہ لوگ مدینہ میں رہتے تھے جہاں مسلمانوں کا پورا عمل دخل ہوچکا تھا لیکن ان کی ہمدردیاں مکہ والوں کے ساتھ تھیں اور مسلمانوں کا عروج دیکھ کر جلتے تھے، ان کا کچھ ذکر پچھلی سورتوں میں آچکا ہے یہ مسلمانوں سے کھلم کھلا بگاڑ نہیں کرسکتے تھے؛ اس لئے بظاہر ملے جلے رہتے تھے، اور اندر پوری بدخواہی پر کمر باندھ رکھی تھی، ہمیشہ اسی دھن میں لگے رہتے تھے کہ مسلمانوں کو کسی طرح تکلیف پہنچے اس آیت میں مسلمانوں کی بابت ان کا عام رویہ بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہے کہ: یہ تو ہمیشہ سے ایسے لوگ ہیں کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو فتح اور کامیابی نصیب ہوتی ہے تو ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ جاتی ہیں اور بہت غمگین اور اداس ہوجاتے ہیں، اور اگر کہیں مسلمانوں کو کوئی صدمہ پہنچتا ہے بہت شدید یا زخمی ہوجاتے ہیں تو بہت خوشیاں مناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے پہلے ہی اپنا بندوبست کرلیا تھا کہ کہیں ہم پر آنچ نہ آئے، ہمیں پہلے معلوم تھا کہ مسلمان شکست کھائیں گے یہ جیت نہیں سکتے، اتفاق سے کبھی جیت بھی گئے تو اس سے کیا ہوتا ہے "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی"، آخر ایک دن جو ہونا ہے وہ ہوکر رہے گا، اسی طرح کی ڈینگیں مارتے، مجلسوں سے اُٹھ کر اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں، خوشی چھپائے نہیں چھپتی، منافق لوگ قوم کے لئے بغلی گھونسہ ہوتے ہیں ان سے بڑھ کر امن وامان کے لئے کسی چیز سے خطرہ نہیں یہ تو اللہ عزوجل نے وحی بھیج کر ان کا پردہ فاش کردیا ہے ورنہ کسی کی کیا مجال کہ ان سے کچھ کہہ سکے۔

اس آیت میں ان کی ایک اور کم ظرفی کا بیان ہے کہ یہ لوگ اگر چہ ظاہر میں مسلمانوں کے ساتھ ملے ہوئے رہتے ہیں لیکن حال یہ ہے کہ "اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ" یعنی: اگر آپ کو کوئی فتح اور کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو سخت ناگوار ہوتا ہے، اور اگر آپ کو مصیبت پہنچتی ہے تو یہ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رہے ہیں؛ اسی لئے ہم نے اپنی مصلحت کو اختیار کیا ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے اور یہ کہہ کر وہ خوشی خوشی گھروں کو واپس ہوجاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰنَا ۚ وَ عَلَى

کہہ دیجئے ہرگز نہ پہنچے گا ہمیں مگر وہ جو لکھ دیا اللہ نے واسطے ہمارے وہی مددگار ہے ہمارا اور اوپر

اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾

اللہ کے بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو (۵۱)

بامحاورہ ترجمہ: آپ کہہ دیجئے ہمیں ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھ دیا وہی ہمارا کام بنانے والا ہے اور چاہئے کہ مسلمان اللہ پر بھروسہ کریں۔(۵۱)

تفسیر

منافقوں کی انتہائی نادانی یہ تھی کہ وہ دوسرے مسلمانوں کی مصیبت سے خوش ہوتے اور اپنے آپ کو اس مصیبت سے بچا ہوا پا کر خوشی سے بغلیں بجانے لگتے، اور اپنی جھوٹی تدبیر کی اچھائی کا راگ گانے لگتے، ان کا یہ رویہ ان کو دین کے کاموں کے لئے جرأت کا اظہار کرنے سے روک دیتا تھا اور انجام کار وہ جن مصیبتوں سے اپنی احتیاط کی بدولت بچنا چاہتے تھے، ان سے کہیں زیادہ سخت بلاؤں میں اپنی حد سے زیادہ احتیاط اور بزدلی کی وجہ سے مبتلا ہوجاتے تھے، قرآن شریف دنیا کے آرام وراحت کو کچھ زیادہ ہی اہمیت نہیں دیتا، وہ کہتا ہے کہ تم

اللہ تعالیٰ کے حکم بجالانے پر تیار ہوجاؤ، دنیا کا آرام وراحت عارضی چیز ہے ایسے ہی یہاں کی مصیبت اور مشقت زیادہ ڈر کی بات نہیں، دنیا کی زندگی میں راحت ومصیبت دونوں سے ہر ایک انسان کو کسی نہ کسی شکل میں واسطہ پڑتا ہے، دونوں حالتوں میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا چاہئے اسی کی اطاعت کو اپنا اصل مقصد قرار دینا چاہئے، اس آیت میں مسلمانوں کو ایک ایسا گر بتایا گیا ہے جس سے وہ منافقوں کے برعکس دنیا کی مصیبتوں کو ہیچ سمجھنے لگتے ہیں اور مسلمان ایسے کام میں لگ جاتے ہیں کہ جس میں نہ راحت خواہش ہوتی ہے اور نہ مصیبت کی پرواہ ہوتی ہے۔

ارشاد ہے کہ: ان منافقوں سے کہہ دیجئے کہ راحت اور مصیبت جو آنی ہے وہ تو آکر ہی رہے گی، ہمیں ان دونوں سے زیادہ اونچا خیال دل میں جمانا چاہئے تاکہ ان کا اثر کام کی باتوں سے روک ہی نہ سکے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمارا نگہبان اور مددگار ہے اس کی طرف سے جو ہمیں ملے گا اس میں سراسر ہماری ہی بہتری ہوگی؛ اس لئے مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے سارے معاملات اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردیتا ہے اور پورے طور پر اس کی اطاعت اور فرمانبرداری میں لگ جاتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردیتا ہے اور پورے طور پر اس کی اطاعت اور فرمانبرداری میں لگ جاتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ساری قوتیں اور طاقتیں اللہ تعالیٰ کے حکموں پر عمل کرنے میں لگا دیتا ہے، اور مصیبتوں سے اس کی ہمت کمزور نہیں ہوتی، کیونکہ اسے پورا یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو منافقوں کی باتوں سے اثر نہ لینے اور اصل حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنے کی ہدایت ان الفاظ میں دی "قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ "یعنی: آپ ان ظاہری اسباب پر بھروسہ کرنے والوں کو بتلادیجئے کہ تم دھوکہ میں ہو یہ ظاہری اسباب محض ایک پردہ ہیں ان کے اندر کام کرنے والی قوت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے ہمیں جو حال پیش آتا ہے وہ سب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے اور وہی ہمارا مولیٰ اور مددگار ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ اسی پر اصل بھروسہ رکھیں ظاہری اسباب کو صرف اسباب وعلامات ہی کی

حیثیت سے دیکھیں ان پر کسی بھلائی یا برائی کا مدار نہ جانیں۔

تدبیر کرے اور تقدیر پر یقین کرے

اس آیت نے تقدیر اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے مسئلے کی اصل حقیقت بھی واضح کردی کہ تقدیر پر یقین رکھنے یا یہ مطلب نہ ہونا چاہئے کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، اور یہ کہے کہ جو کچھ قسمت میں ہوگا وہ ہوجائیگا بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ جو اسباب اپنے اختیار میں ہوں ان کے لئے اپنی پوری قوت اور اہمیت خرچ کی جائے اور اپنی طاقت کے مطابق جمع کرنے کے بعد معاملہ کو تقدیر اور توکل کے حوالہ کریں نظر صرف اللہ تعالیٰ پر رکھیں کہ ہر کام کا انجام اور نتیجہ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

تقدیر کے مسئلہ میں دو طرح کے لوگ ہیں جو بے راہ روی کا شکار ہیں، کچھ بے دین لوگ تو وہ ہیں جو سرے سے تقدیر کو مانتے ہی نہیں اور نہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کو مانتے ہیں، بس! انہوں نے ظاہری اسباب کو ہی سب کچھ سمجھا ہوا ہے، اور کچھ ناسمجھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے تقدیر اور توکل کو اپنی کم ہمتی اور بیکاری کا بہانہ بنا لیا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جہاد کے لئے پوری تیاری اور اس کے بعد اس آیت نے اس بے راہ روی کو ختم کرکے صحیح راہ دکھلائی، اختیاری اسباب بھی اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی نعمت ہیں ان سے فائدہ نہ اٹھانا ناشکری اور بے وقوفی ہے، البتہ اسباب کو اسباب کے درجہ سے آگے نہ بڑھاؤ، اور عقیدہ یہ رکھو کہ نتیجہ اور انجام ان اسباب کے تابع نہیں بلکہ حق جل شانہ کے حکم کے تابع ہے۔

پھر دیکھو کیا ہوتا ہے؟

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ

کہہ دیجئے کیا انتظار کرتے ہو تم ہمارے بارے میں مگر ایک کا دونوں خوبیوں میں سے اور ہم انتظار میں ہیں

بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ڮ

تمہارے لئے کہ پہنچائے تمہیں اللہ کوئی عذاب سے پاس اپنے یا ساتھ ہاتھوں ہمارے

فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ﴿۵۲﴾

(اچھا!) انتظار کرو ہم بھی ساتھ تمہارے انتظار کر رہے ہیں (۵۲)

بامحاورہ ترجمہ: ۔آپ کہہ دیجئے تم ہمارے حق میں کیا امید کرو گے مگر وہ خوبیوں میں سے ایک کی اور ہم تمہارے حق میں امیدوار ہیں کہ تم پر اللہ اپنے پاس سے کوئی عذاب ڈالے یا ہمارے ہاتھوں، سو! منتظر رہو ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔ (۵۲)

لفظی تحقیق: **تَرَبَّصُوْنَ:** انتظار کرتے ہو۔مضارع کا صیغہ ہے "تَرَبُّصٌ" سے جو "رَبْصٌ" سے بنا ہے "ربص" کے معنی ہیں کسی کے لئے بھلائی یا برائی کا انتظار کرنا "تربص" اس کے ہم معنی ہیں۔ **اَلْحُسْنَیَیْنِ:** دو بھلائیاں) الحسنی کا تثنیہ ہے جو حسن سے افعل التفضیل ہے اور احسن کا مؤنث ہے، یعنی: سب سے اچھی چیز۔

تفسیر

منافق ہمیشہ اسی انتظار میں رہتے تھے کہ مسلمانوں کو شکست ہو اور ان پر کوئی مصیبت پڑے اس کا جواب پہلی آیت میں دیا جاچکا ہے کہ مسلمانوں کو نہ دنیا کی تکلیفوں کی کوئی پرواہ ہے اور نہ اس کی خوشیوں کے پیچھے پڑتے ہیں، ان کا کام صرف اللہ تعالیٰ کے حکموں کو بجالانا ہے، دنیاوی تکلیفیں تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ پہنچتی ہیں، مسلمان ان کو اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی تقدیر سمجھتا ہے اس کے مطابق انسان کو کبھی راحت نصیب ہوگی کچھ دکھ پہنچے گا۔

ارشاد ہے کہ تم ہماری بابت دو ہی باتیں سوچ سکتے ہو یا فتح یا شکست، ہمارے لئے دونوں اچھی ہیں، کامیاب ہو گئے تو غازی ہوئے، غنیمت کا مال ہاتھ لگا، اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار لقب ملا، اور اگر قتل ہو گئے تو شہید ہوئے اور شہید کے لئے آخرت میں وہ نعمتیں تیار ہیں جو یہاں کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہے تم تو اللہ تعالیٰ کے نافرمان بندے ہو اس کی سزا تمہیں مل کر رہے گی یا تم پر کوئی سخت مصیبت ویسے ہی آپڑے گی اور یا ہمارے ہاتھوں سے تمہیں تباہی اور بربادی نصیب ہوگی، دنیا دیکھ چکی ہے کہ اسلام کا اور مسلمانوں کا آخر میں بول بولا ہوا اور مشرک، کافر، منافق ذلیل وخوار ہو کر رہے یہ سب قرآن حکیم اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل کا نتیجہ

تھا جب یہ دونوں باتیں نہ رہیں، مسلمان اصلی معنوں میں مسلمان ہی نہ رہے اور مخالفوں کی بن آئی۔

فرمایا: "قُلْ " اے پیغمبر! آپ ان کو یہ فرمادیں" هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ " تم نہیں انتظار کرتے ہمارے بارے میں مگر دو اچھائیوں میں سے ایک کا، ہمارے لئے فتح یا شکست اور راحت یا تکلیف ہر بات میں نیکی ہے اگر فتح ہوگئی اور زندہ رہے تو مال بھی مل گیا اور غازی بھی بنے، اس کے برخلاف اگر مارے گئے تو بھی شہادت نصیب ہوگئی، دنیا میں ناکامی بھی ہمارے لئے آخرت میں ہمیشہ راحت کا سبب ہوگا، لہذا جو بھی صورت حاصل ہوئی ہمیں دو میں سے ایک اچھائی تو بہر حال حاصل ہوجاتی ہے، اے منافقو! تم ہمارے شکست کے انتظار میں ہو مگر ہمارے لئے یہ بھی بھلائی ہے کیونکہ اس طرح ہمارے لئے آخرت کی کامیابی یقینی ہوجاتی ہے، توجس چیز کو تم ہمارے حق میں تکلیف دہ سمجھ رہے ہو ہمیں اس سے کوئی خطرہ نہیں، کیونکہ ہمارے لئے اس میں بھی بھلائی ہے۔

فرمایا: تم ہمارے بارے میں نہیں انتظار کرتے مگر دو خوبیوں میں سے ایک خوبی کا" وَ نَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ " اور ہم بھی تمہارے بارے میں منتظر ہیں کہ دو چیزوں میں سے ایک ضرور ہو پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں سزا دی جائے گی، اللہ تعالیٰ تم پر کوئی مصیبت ڈال دے گا اور تم براہِ راست اس کی پکڑ میں آجاؤ گے،" اَوْ بِاَيْدِيْنَا " یا ہمارے ہاتھوں سے اللہ تمہیں سزا دے گا تمہاری ذلت ورسوائی ہمارے ہاتھوں بھی ہوسکتی ہے، آگے اسی صورت میں آرہا ہے" يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ " اے نبی! ان کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کریں اور اس پر سختی کریں منافقوں کے ساتھ زبانی طور پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کی خرابیوں کو لوگوں کے سامنے ظاہر کر کے انہیں ذلیل وخوار کیا جائے اس معاملے میں ان کے ساتھ رعایت نہ کی جائے، فرمایا:" فَتَرَبَّصُوْٓا " تم بھی انتظار کرو" اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ " ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں، پھر دیکھیں گے کہ کیا صورت پیش آتی ہے، اللہ تعالیٰ یا تو خود تمہیں سزا دیگا یا پھر تمہیں ہمارے ہاتھوں سزا دے گا تم مغلوب ہوجاؤ گے اور سخت رسوا ہو گے۔

اس آیت نے مؤمن مرد کی ایک انوکھی شان کا ذکر کرکے ان کی مصیبت پر خوش ہونیوالے منافقوں کو یہ جواب دیدیا کہ تم جس چیز کو ہمارے لئے مصیبت سمجھ کر خوش ہوتے ہو ہمارے نزدیک وہ مصیبت بھی مصیبت نہیں بلکہ راحت و کامیابی ہی کی ایک دوسری صورت ہے کیونکہ مؤمن مرد اپنے عزم میں ناکام ہوکر بھی ہمیشہ اجر وصلہ کا حق دار بنتا ہے جو ساری کامیابیوں کا مقصود اصلی ہے؛ اس لئے وہ ناکام ہوکر بھی کامیاب رہتا ہے اور بگڑنے میں بھی بنتا ہے۔

نہ شوخی چل سکی بادصبا کی ۔۔۔ بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

مذکورہ آیت میں "هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ" کا یہ مطلب ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتلادیا کہ کافروں کا حال اس کے بالکل برعکس ہے کہ ان کو کسی عذاب مصیبت سے چھٹکارا نہیں یا تو دنیا ہی میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان پر خدا کا عذاب آجائیگا، اور اس طرح دنیا و آخرت کے عذاب سے خلاصی کا کوئی امکان نہیں۔

منافقوں کی صدقے کے بے وقعتی

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ

کہہ دیجئے خرچ کرو راضی سے یا ناراضی سے ہرگز نہ قبول کیا جائے گا سے تم بیشک تم ہو

قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ

لوگ نافرمان (۵۳) اور نہیں کوئی مانع اس سے کہ قبول کئے جائیں سے ان صدقے ان کے مگر یہی کہ

اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ وَ لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ

انہوں نے کفر کیا اللہ کا اور پیغمبر اس کے کا اور نہیں آتے وہ نماز کو مگر اس طرح کہ وہ

كُسَالٰى وَ لَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾

ست ہیں اور نہیں مال دیتے مگر اس طرح کہ وہ بیزار ہیں (۵۴)

بامحاورہ ترجمہ: ۔ کہہ دیجئے کہ! مال خرچ کرو خوشی سے یا ناخوشی سے ہرگز قبول نہ ہوگا تم سے، بیشک تم نافرمان لوگ ہو۔ (۵۳) اور ان کے خرچ کا قبول ہونا موقوف نہیں ہوا مگر اسی بات پر کہ وہ اللہ سے اور اس کے پیغمبر سے منکر ہوئے اور نماز کو نہیں آتے مگر ہارے جی سے اور خرچ نہیں کرتے مگر برے دل سے۔ (۵۴)

لفظی تحقیق: نَفَقٰتُ: خرچ۔ "نَفَقَةٌ" کی جمع ہے آدمی جو مال خرچ کرے وہ نفقہ ہے، خواہ ضرورت میں خرچ کرے یا رفاہِ عام کے کاموں میں یہ لفظ "سورۃ البقرۃ" میں آچکا ہے یہاں اس سے مراد صدقے اور خیرات ہیں۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ تمہارے مال کا محتاج نہیں، اپنا مال اپنے پاس رکھو تمہاری نیتوں کا حل کھل گیا اس کے بعد تم مسلمانوں کی مدد کے لئے خوشی سے دو یا زور زبردستی کس طرح قبول نہ کیا جائے گا، جب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر بیٹھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر کان نہ دھرا نماز میں تھکے گرتے پڑتے دکھاوے کو شامل ہو گئے، مال دینا پڑا تو بادل نخواستہ دیدیا تو تم اس قابل نہیں چاہئے اللہ تو دل دیکھتا ہے جب دل میں کھوٹ ہے تو مال کا خرچ کرنا بے کار ہے، اس کا کوئی ثواب نہیں۔

بعض منافق جہاد میں شامل ہونے سے معذرت کا اظہار کر کے مالی تعاون کی پیش کش کرتے تھے، جد بن قیس بھی انہی میں سے تھا جس نے عملی طور پر جہاد میں شامل ہونے سے جھوٹی معذرت کر لی مگر جہاد کے لئے کچھ مال کی پیش کش کی، اللہ تعالیٰ نے اسے قبول نہ فرمایا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ: اے نبی! آپ ان سے کہہ دیں کہ! چاہے تم خوشی سے دو یا ناخوشی سے یہ مال ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، بیشک تم ایسے لوگ ہو جو نافرمانی کرنیوالے ہو، چونکہ تمہارے نظریات ہی غلط ہیں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کو اس وقت قبول کیا جاتا ہے جب فکر صحیح ہوگی، جہاد مال اور جان دونوں ذریعوں سے لازمی ہے اگر ذاتی طور پر جہاد میں شریک نہ ہو کر جان بچانا چاہتے ہیں تو پھر ان کا مال بھی قابل قبول نہیں ہے۔

ان کے مال اور اولاد قابل رشک نہیں

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ
پس نہ تعجب میں ڈالیں مال ان کے اور نہ اولاد ان کی بات یہی ہے کہ چاہتا ہے اللہ

لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ
یہ کہ عذاب دے ان کے ذریعے میں زندگانی دنیا کی اور نکلے جان ان کی اس حال میں کہ وہ

كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَ مَا هُمْ مِّنْكُمْ
کفر میں مبتلا ہوں (۵۵) اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ میں سے ہیں تم اور نہیں وہ میں سے تم

وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ
اور لیکن وہ لوگ ہیں جو ڈرتے ہیں (۵۶) اگر پائیں وہ جائے پناہ یا غار یا

مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَ هُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾
گھسنے کی جگہ تو پھر جائیں وہ طرف اس کہ اس حال میں کہ وہ سب موہ زوری کرتے ہوئے (۵۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ سو! آپ ان کے مال اور اولاد سے تعجب نہ کریں اللہ ہی چاہتا ہے کہ ان کو ان چیزوں کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں عذاب میں رکھے اور وہ اس وقت تک کہ ان کی جان نکلے کافر ہی رہیں۔(۵۵) اور اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ بیشک وہ تم سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ ڈرپوک لوگ ہیں۔(۵۶) اگر کوئی پناہ کی جگہ پائیں یا غار یا سر گھسانے کی جگہ تو الٹے اسی طرف بھاگیں رسیاں تڑاتے۔(۵۷)

لفظی تحقیق: تَزْهَقُ: ڈرتے ہیں۔ مضارع کا صیغہ ہے جو "زھق" کے معنی میں مٹ جانا، باطل ہو جانا، جگہ چھوڑ کر چل دینا۔ يَفْرَقُوْن: ڈرتے ہیں۔ مضارع کا صیغہ ہے جو فرق سے بنا ہے، فرق کے ایک معنی ڈرنا بھی ہے، یہاں یہی معنی مراد ہے۔ مُدَّخَلًا: گھسنے کی جگہ۔ یہ اسم ظرف ہے جس کا مصدر "ادخال" اور مادہ

"د، خ، ل" ہے دخل کے معنی اندر گھس جانا۔ يَجْمَحُوْنَ۔ سرکشی کرتے۔ مضارع کا صیغہ ہے جو "جمع" سے بنا ہے "جمع" کے معنی ہیں سرکشی کرنا، سب بندشیں توڑ کر بھاگنا۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: ان بے دین منافقوں کے ڈھیر سارے مال اور ہٹی کٹی اولاد ان کے لئے ایک جنجال ہے جس میں پھنس کر وہ طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں سہتے ہیں، اسی طرح وہ یہ بھی جھوٹ کہتے ہیں کہ وہ تمہارے ساتھی ہیں یہ ڈرپوک لوگ ہیں ان کو جہاد سے بڑا ڈر لگتا ہے، آج اگر انہیں کوئی سر چھپانے کی ذرا بھی جگہ مل جائے تو اس کی طرف رسیاں تڑا کر بھاگ جائیں۔

اس آیت میں عام ذہنوں میں آنے والی ایک بات کا جواب دیا گیا ہے، بعض اوقات ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کافر اور منافق اللہ تعالیٰ کے نزدیک واقعی بُرے ہیں تو ان کو اس دنیا میں مال و دولت اور آرام و راحت کیوں حاصل ہوتا ہے، مدینے کے منافقوں میں بھی بڑے بڑے مال اور اولاد والے لوگ تھے، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں واضح فرمایا ہے کہ کسی انسان کے لئے دنیا میں اچھا ہونے کا معیار ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کے پاس مال و دولت، اولاد، بڑا کنبہ اور قبیلہ ہو بلکہ یہ چیزیں تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق اچھوں بروں سب کو ملتی ہیں "كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ" (ہم ہر ایک کو بڑھاتے پھیلاتے ہیں ان کو بھی اور ان کو بھی) یعنی: نافرمانوں اور سرکشوں کو بھی اللہ تعالیٰ بہت کچھ دیتا ہے اس دنیا کی زندگی میں کافروں منافقوں اور فاسقوں کو بھی ملتا ہے اور بعض اوقات ایمان والے غربت اور تنگی میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھائی کا معیار عیش و عشرت کی زیادتی نہیں بلکہ نیکی کا حقیقی معیار، ایمان و عبادت، پاکیزگی، اخلاق اور نیک عمل ہیں اگرچہ کوئی انسان مالی لحاظ سے کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو اس لئے فرمایا: "فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ" ان کے مال اور اولاد آپ کی تعجب میں نہ ڈالیں کہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کو یہ چیزیں اتنی زیادہ دی ہیں ان کو نعمتیں ملنے کی حکمت یہ ہے "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" بے شک اللہ تعالیٰ انہی چیزوں کے ذریعے ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دے گا،" وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ "اور ان کی جانیں اس حالت میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں اور آگے چل کر بڑی سزا کے مستحق ٹھہریں، غرضیکہ پیغمبر ﷺ کی تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ ان منافقوں کی ظاہری شان و شوکت کو دیکھ کر غم نہ کریں بلکہ یہی چیزیں ان کے لئے دنیا و آخرت میں سزا کا سبب بننے والی ہے۔

پیغمبر ﷺ کا ارشاد ہے کہ: زندگی بھر انسان مالی مالی (میرا مال میرا مال) کہتا رہتا ہے مگر اسے کچھ نفع نہیں پہنچتا اور وہ مال کی فکر میں ہی دنیا سے چلا جاتا ہے، پیغمبر ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ: کسی نافرمان آدمی کی دنیاوی نعمت کو دیکھ کر دھوکہ نہ کھانا کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہے ایسا شخص عنقریب اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آجائے گا۔

لالچی

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا

اور میں سے بعض ان وہ ہیں جو طعنے دیتے ہیں آپ کو میں صدقوں (کے بانٹنے) پس اگر دیئے جائیں وہ میں سے ان تو راضی ہو جائیں

وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَ لَوْ اَنَّهُمْ

اور اگر نہ دیئے جائیں وہ میں سے ان تو اسی وقت وہ بگڑ جاتے ہیں (۵۸) اور اگر وہ

رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۙ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا

راضی ہو جاتے اس پر جو دیا انہیں اللہ نے اور پیغمبر اس کے نے اور کہتے کافی ہے ہمیں اللہ دے گا ہمیں

ع ۱۷ ۱۳ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

اللہ سے فضل اپنے اور پیغمبر اس کا ہم تو طرف اللہ ہی کی رغبت کرتے ہیں (۵۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور بعض ان میں وہ ہیں جو آپ کو خیرات بانٹنے میں طعنے دیتے ہیں، سو! اگر ان کو اس

میں سے ملے تو راضی ہوں اور نہ ملے تو جبھی وہ ناخوش ہوجائیں۔(۵۸) اور کیا اچھا ہوتا اگر وہ اسی پر راضی ہوجاتے جو ان کو اللہ نے اور اس کے پیغمبر نے دیا اور کہتے ہم کو اللہ کافی ہے وہ ہم کو اپنے فضل سے دے گا اور اس کا پیغمبر، ہم کو تو اللہ ہی چاہئے (تو یہ ان کے لئے زیادہ بہتر ہوتا)۔(۵۹)

لفظی تحقیق: یَلْمِزُكَ: طعنے دیتے ہیں۔مضارع کا صیغہ ہے، "لَمْزٌ" سے "لَمْزٌ" کے معنی ہیں کچوکنا، تیز نوک کسی میں چبھونا، پھر اس کے معنی کسی کے کام میں عیب نکالنا، کام کی بُرائی کرنا، طعن و تشنیع ہو گئے۔

تفسیر

ان آیتوں میں خودغرض منافقوں کی ایک اور عادت کا بیان ہے، پچھلی آیتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کو تمہاری خوشامد اس لئے کرنی پڑتی ہے کہ کہیں تمہیں ان کا اصلی حال نہ معلوم ہوجائے تو پھر کہیں کہ نہ رہیں گے، اگر انہیں کوئی اور سر چھپانے کی جگہ نظر آجائے تو تم سے منہ موڑ کر فوراً اس میں جا چھپیں اس کے بعد ان کی ایک اور عادت بیان ہے۔

ارشاد ہے کہ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خیرات وصدقات بانٹتے دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ تو اپنے ہی اپنوں کو دیتے ہیں، سب کا برابر خیال نہیں رکھتے، لیکن اگر انہیں اس میں سے جی بھر کر مل جاتا ہے تو پھر راضی رہتے ہیں، اگر نہ ملا تو پھر آپ کے خلاف باتیں بنانے لگتے ہیں، بہتر تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے انصاف پر بھروسا رکھتے، اور جو وہ انہیں دیدیتے اس پر راضی ہوجاتے، لیکن یہ تو اس بات سے کوسوں دور ہیں ایمان والوں کی شان تو اس سے کہیں اعلیٰ ہے وہ تو بہرحال اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور اسی کی طرف رغبت کرتے ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیئے ہوئے کو خوشی سے قبول کر کے راضی رہتے ہیں۔

صدقوں کے حق دار

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِينِ وَ الْعٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَ

بات یہ ہے کہ زکوٰۃ ہیں واسطے مفلسوں کے اور محتاجوں کے اور جو کام کریں پر ان اور

الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِينَ وَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ

پر جائے جائیں دل جن کے اور میں بندیاں چھڑانے اور تاوان بھرنے والوں کے اور میں راستے اللہ کے

وَ ابْنِ السَّبِيلِ ؕ فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۶۰﴾

اور مسافروں کے مقرر دیا ہوا ہے طرف سے اللہ کی اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے (۶۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں اور محتاجوں کا، اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پر جانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے راستے میں اور راہ کے مسافر کو اللہ کا ٹھہرایا ہوا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (۶۰)

تفسیر

پچھلی آیتوں میں بیان ہوا کہ بعض منافق چاہتے ہیں کہ زکوٰۃ کی ساری چیزیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بانٹیں اور انہی کو ملیں، دوسرے کو کچھ نہ ملے، اس سلسلے میں زکوٰۃ کے مال کا پورا قاعدہ اس آیت میں بتا دیا، تا کہ معلوم ہو جائے کہ کسی کا حق صدقات، یعنی: زکوٰۃ میں من مانے دعووں اور خواہشوں سے قائم نہیں ہوتا، زکوٰۃ ذیل کے مقصدوں کے لئے خرچ کی جاتی ہے جو لوگ ان مستحقین کے زمرہ میں جن کا اس آیت میں بیان ہے نہیں آتے، انہیں زکوٰۃ و صدقات میں سے کچھ نہیں ملے گا، ارشاد ہے: کہ زکوٰۃ آٹھ قسم کے لوگوں کے لئے ہے۔

زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں منافقین اعتراض کرتے تھے: اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں زکوٰۃ کے آٹھ قسم کے حق دار بیان کر دیئے ہیں، تا کہ آئندہ کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ رہے، گویا زکوٰۃ کی تقسیم کا کام اللہ تعالیٰ نے

اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اپنے پیغمبر کو بھی اختیار نہیں دیا کہ وہ مرضی سے تقسیم کرے۔

(۱،۲)....اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِينِ: (بے شک زکوٰۃ فقیر اور مسکین کے لئے ہے)، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: فقیر وہ ہے جس کے پاس چاندی کے نصاب سے کم مال ہو، اور مسکین وہ ہے جس کے پاس بالکل کچھ نہ ہو، ''سورۂ بلد'' میں آتا ہے"اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ" یعنی: مسکین جو مٹی میں ملا ہوا ہو، اس کے پاس کچھ نہ ہو، بہر حال یہاں یہ فرمایا کہ: زکوٰۃ کے حقدار فقراء اور مساکین ہیں، لہذا زکوٰۃ کا مال ان کو دیا جائے۔

(۳)....وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا: (اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کے لئے) حکومت کی طرف سے جو لوگ مالدار مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کر کے بیت المال میں جمع کرانے کے لئے مقرر ہوتے ہیں چونکہ یہ لوگ اپنا سارا وقت اس خدمت میں خرچ کرتے ہیں؛ اس لئے ان کی ضروریات کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر ہے قرآن کریم کی اس آیت میں بتادیا کہ ان کو ان کی خدمت کا معاوضہ زکوٰۃ کے مال سے دینا جائز ہے، اگر چہ وہ مالدار کیوں نہ ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو صدقات وصول کرنے کے لئے مختلف جگہوں پر بھیجا اور اس آیت کی ہدایت کے موافق زکوٰۃ ہی کی حاصل شدہ رقم میں سے ان کو خدمت کا معاوضہ دیا ہے ان میں وہ حضرات صحابہ بھی شامل ہیں جو مالدار تھے۔

رہا یہ مسئلہ کہ عاملین صدقہ کو زکوٰۃ میں سے کتنی رقم دی جائے، سو! اس کا حکم یہ ہے کہ ان کی محنت اور عمل کی حیثیت کے مطابق دی جائے گی۔

البتہ ضروری ہوگا کہ عاملین کی تنخواہیں نصف زکوٰۃ سے بڑھنے نہ پائیں، اگر زکوٰۃ وصول کرنے کے بعد مال ہی اتنا کم ہے کہ عاملین کی تنخواہیں دے کر نصف بھی باقی نہیں رہتی تو پھر تنخواہوں میں کمی کی جائے، نصف سے زیادہ خرچ نہیں کیا جائے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ جو کچھ زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو زکوٰۃ میں سے دی جاتی ہے وہ درحقیقت

زکوٰۃ کے مصرف کے طور پر نہیں بلکہ ان کی خدمت کے معاوضہ کے طور پر دیا جاتا ہے، ورنہ زکوٰۃ نام ہی اس عطیہ کا ہے جو غریبوں کو بغیر کسی معاوضہ کے دیا جائے اور اگر کسی غریب فقیر سے کوئی خدمت لے کر زکوٰۃ کا مال دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ جس کو امیر کہا جاتا ہے یہ قدرتی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورے ملک کے فقراء اور مساکین کا ولی اور وکیل ہوتا ہے، کیونکہ ان سب کی ضروریات کی ذمہ داری اس پر ہوتی ہے اور ملک کا حاکم جس جس کو زکوٰۃ وصول کرنے والے کارکنوں نے جیسے ہی مسلمان مالداروں سے زکوٰۃ وصول کرلی اس کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، اس کے بعد یہ پوری رقم فقراء اور مساکین کی ہوگئی، اب جو رقم ان زکوٰۃ وصول کرنے والوں کی خدمت کے معاوضے میں ملے گی وہ مالداروں کی طرف سے نہیں بلکہ فقراء کی طرف سے ہوئی اور فقراء کو تو اس مال میں اختیار ہے کہ جو چاہے کرے، لہٰذا ان کو یہ بھی حق ہے کہ جب اپنا کام ان لوگوں سے لیتے ہیں تو اپنی رقم میں سے ان کو خدمت کا معاوضہ بھی دیں۔

معلوم ہوا زکوٰۃ وصول کرنے والے کارکنوں کو جو کچھ دی جاتی ہے وہ درحقیقت زکوٰۃ نہیں دی جاتی بلکہ زکوٰۃ جن فقراء کا حق ہے ان کی طرف سے خدمت کا معاوضہ دیا جاتا ہے، جیسے: کوئی غریب فقیر کسی کو اپنے مقدمہ کا وکیل بنادے اور اس کی خدمت کا معاوضہ زکوٰۃ سے ملنے والی رقم سے دے تو دینے والا نہ بطور زکوٰۃ کے دے رہا ہے اور نہ لینے والا زکوٰۃ کی حیثیت سے لے رہا ہے۔

فائدہ: اوپر کی تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر اور کارکن صدقات، زکوٰۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لئے وصول کرتے ہیں، ان کا وہ حکم نہیں جو زکوٰۃ وصول کرنے والوں کا اس آیت میں مذکور ہے، کہ زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ نہیں دی جاسکتی، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں ہیں بلکہ زکوٰۃ ادا کرنے والے مالداروں کے وکیل ہیں ان کی طرف سے زکوٰۃ کے مال کو مصرف پر لگانے کا ان کا اختیار دیا گیا ہے اسی لئے ان کے قبضہ ہوجانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کریں۔

فقراء کا وکیل نہ ہونا اس لئے ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں اور امیر المؤمنین کی ولایت عامہ کی بناء پر جو خود بخود وکالت فقراء حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں؛ اس لئے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ان کو زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل قرار دیا جائے اور جب تک یہ اس مال کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہو۔

اس معاملہ میں عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے بہت سے ادارے زکوٰۃ کا فنڈ وصول کر کے اس کو سالہا سال رکھے ہوتے ہیں اور زکوٰۃ دینے والے حضرات سمجھتے ہیں کہ ہماری زکوٰۃ ادا ہوگئی، حالانکہ ان کی زکوٰۃ اس وقت ادا ہوگی جب ان کی رقم زکوٰۃ کے مصرف میں خرچ ہو جائے۔

اسی طرح بہت سے لوگ ناواقفیت کی وجہ سے ان لوگوں کو زکوٰۃ وصول کرنے والے سرکاری کارکنوں کے حکم میں داخل سمجھ کر زکوٰۃ ہی کی رقم سے ان کی تنخواہ دیتے ہیں، یہ نہ دینے والوں کے لئے جائز ہے نہ لینے والوں کے لئے۔

(۴)....**وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ**: (اور جن کی دل جوئی کرنا (منظور) ہے) زکوٰۃ کے حق دار لوگوں میں سے ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کے دلوں کو الفت دلائی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ اسلام تو لے آئے تھے، مگر مالی لحاظ سے کمزور تھے، ایسے لوگوں کی دل جوئی کے لئے ان کو زکوٰۃ دی جاتی تھی، اگر چہ وہ فقیر اور مسکین نہ بھی تھے، تاکہ دوسرے مذہب والے اسے لالچ دے کر اپنی طرف مائل نہ کر سکیں۔

عام خیال یہ ہے کہ ''مولفۃ القلوب'' میں مسلمان اور کافر دونوں طرح کے لوگ تھے، کافروں کی دلجوئی اسلام کی طرف مائل کرنے کے لئے اور نئے نئے مسلمان ہونے والوں کی دل جوئی اسلام میں جمے رہنے کے لئے کی جاتی تھی، لیکن تحقیقی اور صحیح بات یہ ہے کہ کافروں کو زکوٰۃ وغیرہ سے کبھی بھی حصہ نہیں دیا گیا اور نہ وہ ''مولفۃ القلوب'' میں داخل ہیں، جن کا ذکر زکوٰۃ کے مصرفوں میں آیا ہے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ان سب لوگوں کے نام تفصیل کے ساتھ شمار کئے ہیں، جن کی دل جوئی کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زکوٰۃ سے حصہ دیا ہے اور یہ سب شمار کرنے کے بعد فرمایا کہ: "وبالجملة فكلهم

مومن ولم یکن فیھم کافر" خلاصہ یہ ہے کہ "مولفۃ القلوب" سب کے سب مسلمان ہی تھے ان میں کوئی کافر شامل نہیں تھا۔

اسی طرح "تفسیر مظہری" میں ہے کہ یہ بات کسی روایت سے ثابت نہیں کہ پیغمبر ﷺ نے کسی کافر کو زکوٰۃ کے مال میں سے اس کی دل جوئی کے لئے حصہ دیا ہو، اس کی تائید "تفسیر کشاف" کی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مصارفِ صدقات کا بیان یہاں ان کافروں اور منافقوں کے جواب میں آیا ہے جو پیغمبر ﷺ پر زکوٰۃ کی تقسیم کے بارے میں اعتراض کیا کرتے تھے کہ ہم کو صدقات نہیں دیتے، اس آیت میں مصارفِ صدقات کی تفصیل بیان فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ ان کو بتلا دیا جائے کہ کافر کا کوئی حق زکوٰۃ کے مال میں نہیں ہے اگر "مولفۃ القلوب" میں کافر بھی داخل ہوں تو اس جواب کی ضرورت نہ تھی۔

"تفسیر مظہری" میں اس غلط فہمی کو بھی اچھی طرح واضح کر دیا ہے جو بعض روایتوں کے سبب لوگوں کو پیش آئی ہے، جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پیغمبر ﷺ نے بعض کافروں کو کچھ عطیات دیئے تھے، چنانچہ "صحیح مسلم" اور "ترمذی" کی حدیث میں جو ذکر کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے صفوان بن امیہ کو کافر ہونے کے زمانہ میں کچھ عطیات دیئے اس کے متعلق امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ: یہ عطیات زکوٰۃ کے مال سے نہ تھے، حنین کی جنگ کی غنیمتوں کے خمس (پانچواں حصہ) میں سے دیئے گئے تھے، اور ظاہر ہے کہ بیت المال کی اس مد سے مسلمان اور کافر دونوں پر خرچ کرنا جائز ہے، پھر فرمایا کہ: امام بیہقی، ابن سید الناس، امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہم نے یہی قرار دیا ہے کہ پیغمبر ﷺ کا بعض کافروں کو مال دینا زکوٰۃ کے مال سے نہیں بلکہ غنیمت کے خمس سے تھا۔

ایک عظیم فائدہ

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خود پیغمبر ﷺ کے مبارک زمانہ میں زکوٰۃ کے مال اگرچہ بیت المال میں

جمع کئے جاتے تھے مگر ان کا حساب بالکل جدا ہوتا تھا، اور بیت المال کی دوسری مدات جیسے غنیمت کا خمس، یا معادن (معدنیات کی کانیں) وغیرہ کے خمس کا حساب جدا اور ہر ایک کا مصرف جدا تھا۔

اس فائدہ کے بعد پھر اصل مسئلہ ''مؤلفۃ القلوب'' کو سمجھیے، محققین اور فقہاء کرام کی واضح عبارتوں سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ ''مؤلفۃ القلوب'' کا حصہ کسی کافر کو کسی وقت بھی نہیں دیا گیا، نہ پیغمبر ﷺ کے مبارک زمانہ میں اور نہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں، اور جن کافروں کو دینا ثابت ہے وہ زکوٰۃ سے نہیں بلکہ غنیمت کے خمس میں سے دیا گیا تھا جس میں سے ہر حاجت مند و غیر مسلم کو دیا جاسکتا ہے تو ''مؤلفۃ القلوب'' صرف مسلم رہ گئے۔

(۵)....وَفِی الرِّقَابِ: (اور گردن چھڑانے میں) ''رِقَابِ'' رقبة کی جمع ہے رقبة سے مراد وہ غلام ہے جس کے ساتھ اس کے آقا نے تحریری طور پر معاہدہ کرلیا ہو کہ اتنے عرصے میں اتنا مال کما کر دو تم آزاد ہو، تو تحریری معاہدہ کرنے والے ایسے غلام کو چھڑانے کے لئے زکوٰۃ دینا جائز ہے، بعض فرماتے ہیں کہ: اس زکوٰۃ سے مستقل غلاموں کو بھی خرید کر آزاد کیا جاسکتا ہے، یا اگر کوئی مسلمان کافروں کی قید میں ہو تو ان کا فدیہ ادا کر کے انہیں رہائی دلائی جاسکتی ہے، یہ سب گردن چھڑانے کے مطلب میں داخل ہیں۔

(۶)....وَالْغٰرِمِیْنَ: (تاوان بھرنے والوں کے لئے) ''غٰرِمِیْنَ'' غارم کی جمع ہے جس کے معنی قرض دار کے ہیں، یعنی: مقروض لوگوں کے لئے یا تاوان بھرنے والوں کو بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، جیسے: کسی شخص پر کسی وجہ سے تاوان پڑ گیا ہے، مثلاً: ضمانت دے کر پھنس گیا ہے تو ایسے لوگوں کی امداد بھی زکوٰۃ کے مال سے کی جاسکتی ہے، مثال کے طور پر ایک آدمی کے پاس دس ہزار روپے موجود ہیں مگر اس نے گیارہ ہزار روپے قرض دینا ہے تو اس کے قرض کی ادائیگی کے لئے اس کی مدد کی جاسکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ قرض کسی جائز مقصد کے لئے لیا گیا ہو اور پھر اس کی ادائیگی کی طاقت نہ رکھتا ہو اگر فضول رسم و رواج کی ادائیگی یا کسی حرام کام جوا وغیرہ کے لئے قرضہ لیا ہے تو ایسے شخص کی امداد نہیں کی جائے گی۔

(۷)....وَفِی سَبِیْلِ اللّٰهِ: (اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں) مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: ''فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ'' میں تین قسم کے لوگ آتے ہیں، ایک تو وہ غازی جو اپنا سارا ساز و سامان لے کر اللہ تعالیٰ کے

راستے میں جہاد کرنے کے لئے نکلا، لیکن راستے میں کسی حادثے سے اس کی سواری یا سامان ضائع ہوگیا ایسے مجاہد کو فقہی اصطلاح میں ''منقطع الغزاۃ'' کہا جاتا ہے۔

دوسرا وہ حاجی جو گھر سے حج کے لئے مکمل تیاری کر کے نکلا مگر راستے میں کسی حادثے میں اس کا سامان اور سفر کے اخراجات وغیرہ ضائع ہوگئے، مثلاً: چوری ہوگئی یا کسی اور طریقے سے مال ضائع ہوگیا اور اس کا خرچہ ختم ہوگیا ہے ایسے شخص کو فقہی اصطلاح میں ''منقطع الحاج'' کہتے ہیں، یہ بھی زکوٰۃ کا مال لے سکتا ہے۔

تیسرا دینی تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم ہیں جنہوں نے دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں، یہ لوگ ''الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' کے تحت زکوٰۃ لینے کا حق دار ہیں۔

''صاحب بدائع'' نے فرمایا کہ: ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہے اور اس کی ادائیگی میں مال کی ضرورت ہے تو وہ ''فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' میں داخل ہے، بشرطیکہ اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کام کو پورا کر سکے، جیسے: دین کی تعلیم اور تبلیغ اور ان کی نشر و اشاعت کہ اگر کوئی مستحق زکوٰۃ یہ کام کرنا چاہے تو اس کی امداد زکوٰۃ کے مال سے کر دی جائے مگر مال دار صاحبِ نصاب کو نہیں دیا جا سکتا، اس میں بھی دوہرا اجر و ثواب ہے ایک صدقہ کا اور دوسرا دینی علم میں تعاون کا۔

تنبیہ!

جو لوگ حدیث اور تفسیر سے ہٹ کر محض لفظی ترجمہ کے ذریعہ قرآن کریم سمجھنا چاہتا ہے یہاں ان کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ ''فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' کا لفظ دیکھ کر زکوٰۃ کے مصارف میں ان تمام کاموں کو داخل کر دیا ہے جو کسی حیثیت سے نیکی یا عبادت ہے، مسجدوں، مدرسوں، شفاخانوں، مسافر خانوں وغیرہ کی تعمیر، کنویں اور پل اور سڑکیں بنانا اور ان رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں اور تمام دفتری ضروریات ان سب کو انہوں نے ''فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' میں داخل کر کے زکوٰۃ کا مصرف قرار دیدیا جو سراسر غلط ہے، اور شریعت کے خلاف ہے صحابہ کرام جنہوں نے قرآن کریم کو براہِ راست پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا اور سمجھا ہے ان کی اور تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ

کے بارے میں ہیں اور ان میں سے لفظ کو حاجیوں اور مجاہدوں کے لئے خاص قرار دیا ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنے ایک اونٹ کو ''فِي سَبِيْلِ اللهِ'' وقف کر دیا تھا، تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو فرمایا کہ: اس اونٹ کو حاجیوں کے سفر میں استعمال کرو۔

امام ابن جریر اور امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہم قرآن کریم کی تفسیر، روایات حدیث سے کرنے کی پابندی کرتے ہیں، ان سب نے لفظ ''فِي سَبِيْلِ اللهِ'' کو ایسے مجاہدوں اور حاجیوں کے لئے خاص کیا ہے جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو، اور جن حضرات فقہاء نے طالب علموں کو اس میں شامل کیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کیا ہے کہ وہ فقیر و حاجت مند ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ فقیر اور حاجت مند تو خود ہی زکوٰۃ کا پہلا مصرف ہے، ان کو ''فِي سَبِيْلِ اللهِ'' کے مفہوم میں شامل نہ کیا جاتا جب بھی وہ زکوٰۃ کے مستحق تھے، لیکن چاروں اماموں اور دوسرے فقہاء کرام میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ رفاہِ عام کے اداروں اور مسجدوں اور مدرسوں کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات زکوٰۃ کے مصارف میں داخل ہیں، بلکہ اس کے برخلاف صاف صاف یہ فرمایا ہے کہ: زکوٰۃ ان کاموں میں لگانا جائز نہیں، معلوم ہوا کہ ''فِي سَبِيْلِ اللهِ'' کے لفظی ترجمہ سے جو ناواقفوں کو عموم سمجھ میں آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے بلکہ مراد وہ ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان اور صحابہ کرام اور تابعین کی واضح ارشادات سے ثابت ہے۔

(۸)....وَابْنِ السَّبِيْلِ: (اور مسافروں کے لئے) ''سَبِيْلِ'' کا معنی راستہ اور ''ابْنِ'' کا لفظ اصل میں تو بیٹے کے لئے بولا جاتا ہے لیکن عربی محاورات میں ''ابن'' اور ''اب'' اور ''أخ'' وغیرہ کے الفاظ ان چیزوں کے لئے بھی بولے جاتے ہیں جن کا گہرا تعلق کسی سے ہو اسی محاورہ کے مطابق ''ابْنِ السَّبِيْلِ'' راہ گیر اور مسافر کو کہا جاتا ہے، کیوں کہ راستہ سے ان کو گہرا تعلق ہوتا ہے اس سے مراد وہ مسافر ہے جس کے پاس سفر میں ضرورت کے مطابق مال نہ ہو، اگر چہ اس کے وطن میں اس کے پاس کتنا ہی مال ہو، ایسے مسافر کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اس سے یہ نہیں کہا جائیگا تو اپنے گھر سے مال منگوالے بلکہ وہ زکوٰۃ کا حق دار ہے، لہذا اس کی مدد کی جائے گی تاکہ وہ اپنے سفر کی ضروریات پوری کرلے اور وطن واپس جاسکے۔

اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ دینے کے یہ آٹھ قسم کے لوگ بیان فرمائے ہیں کہ زکوٰۃ ان آٹھ قسم کے لوگوں میں سے کسی کو بھی دے سکتے ہو اس کے علاوہ کسی دوسری جگہ زکوٰۃ کا مال خرچ نہیں کر سکتے۔

فَرِيضَةً مِنَ اللّٰهِ: (اللہ کا ٹھہرایا ہوا ہے)، یعنی: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے یہ کسی انسان کا مقرر کیا ہوا نظام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم، حکمت اور مصلحت کے تحت یہ تقسیم کر دی ہے ان میں سے کسی کو دخل دینے کی اجازت نہیں ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر بھی اپنی مرضی سے زکوٰۃ تقسیم نہیں کر سکتا تھا بلکہ آپ ﷺ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کے اس قانون کی پابندی لازمی تھی۔

پیغمبر ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کو مانتے ہوئے زکوٰۃ وغیرہ کی تقسیم فرماتے تھے، اپنی رائے اور مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے تھے، ایک حدیث میں آیا ہے کہ کوئی شخص پیغمبر ﷺ کی خدمت میں کچھ سوال کرنے کے لئے حاضر ہوا، آپ نے اس کو یہ جواب دیا۔

زکوٰۃ وغیرہ کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر کے بھی حوالہ نہیں کیا بلکہ خود ہی اس کے خرچ کی آٹھ جگہیں مقرر فرما دیں اگر تم ان آٹھ میں داخل ہو تو تمہیں دے سکتا ہوں۔

وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ: (اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا حکمت والا ہے) وہ ظاہری اور پوشیدہ ہر چیز سے باخبر ہے، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کون مالدار ہے، کون غریب اور زکوٰۃ کا مستحق ہے، اور وہ جو بھی فیصلہ کرتا ہے اس میں حکمت پوشیدہ ہوتی ہے خواہ انسانوں کو اس کی سمجھ آئے یا نہ آئے، حکیم خدا تعالیٰ کی صفت ہے، لہذا اس کی حکمت کے تحت دیئے گئے حکموں کو ماننے میں ہی کامیابی ہے، اس میں اپنی عقل کے گھوڑے نہیں دوڑانا چاہئے یعنی: اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو نہ ماننے کے لئے یا اس میں اپنی طرف سے کسی قسم کی کمی زیادتی کے لئے عقل کی بیچ میں نہیں لانا چاہئے۔

فائدہ: مالداروں کے مال سے جو صدقہ نکالنے کا حکم دیا گیا ہے یہ کوئی ان کا احسان نہیں بلکہ فقراء کا ایک حق ہے، جس کی ادائیگی ان کے ذمہ ضروری ہے اور یہ حق اللہ تعالیٰ کے نزدیک متعین ہے یہ نہیں کہ جس کا جی چاہے جب چاہے اس میں کمی زیادتی کر دے، اللہ تعالیٰ نے اس معین حق کی مقدار کو بتلانے کا کام بھی پیغمبر

صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ فرمایا، اور اسی لئے آپ نے اس کا اس قدر اہتمام فرمایا کہ صحابہ کرام کو صرف زبانی بتلا دینے کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ اس معاملہ کے متعلق تفصیلی احکام لکھوا کر حضرت فاروق اعظم اور عمرو بن حزم رضی اللہ عنہما کے حوالہ کردی، جس سے واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ زکوٰۃ کے نصاب اور ہر نصاب میں سے مقدار زکوٰۃ کو ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے واسطہ سے متعین کرکے بتلا دیئے ہیں، اس میں کسی زمانہ اور کسی ملک میں کسی کو کمی بیشی یا ردوبدل کا کوئی حق نہیں۔

زکوٰۃ اسلام کے شروع شروع زمانے میں ہی فرض ہوچکی تھی، جیسا کہ امام تفسیر ابن کثیر نے ''سورۂ مزمل'' کی آیت ''وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ'' سے استدلال فرمایا ہے، کیونکہ یہ سورت اسلام کے شروع زمانے کی سورتوں میں سے ہے اس میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم بھی ہے، البتہ حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے شروع زمانے میں زکوٰۃ کے لئے کوئی خاص مقدار مقرر نہ تھی، بلکہ جو کچھ ایک مسلمان کی اپنی ضرورتوں سے بچ رہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا جاتا تھا، زکوٰۃ کا نصاب اور اس کی مقدار مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد بیان ہوئی تھی، اور پھر زکوٰۃ وصدقات کو وصول کرنے کا محکمہ جاتی نظام مکہ کی فتح کے بعد عمل میں آیا ہے۔

کلمہ ''اِنَّمَا'' ذکر کرنے کا ایک علمی نکتہ

اس آیت کو لفظ ''اِنَّمَا'' سے شروع کیا گیا ہے یہ لفظ علم معانی کی اصطلاح میں حصر وانحصار کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس لفظ نے یہ بتلا دیا کہ صدقات کے جو آٹھ مصارف آگے بیان ہو رہے ہیں صرف انہیں میں خرچ ہونی چاہئے ان کے علاوہ کسی دوسرے مصرف میں زکوٰۃ خرچ نہیں ہوسکتی۔

احکام ومسائل

لفظ ''صَدَقٰتُ'' زکوٰۃ اور خیرات پر بولا جاتا ہے لیکن یہاں پر ''صَدَقٰتُ'' سے مراد زکوٰۃ ہے اور یہ

صرف مسلمانوں کے لئے ہے اور نفلی صدقات، یعنی: خیرات تو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو بھی دیئے جاسکتے ہیں، زکوٰۃ کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: زکوٰۃ کا مال مسلمانوں کے مالداروں سے لے کر ان کے غریبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، لہٰذا اگر زکوٰۃ کا مال کسی ہندو، سکھ، عیسائی، دہریہ، مرزائی وغیرہ کو دیا جائے گا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ کن کن لوگوں کو دی جائیگی اور کن کن جگہوں میں خرچ کی جائے گی، ان کے سوا کسی دوسری جگہ زکوٰۃ خرچ کرنے کا کسی کو اختیار نہیں، لہٰذا ان جگہوں اور ان لوگوں کے سوا زکوٰۃ کہیں اور خرچ کرنا جائز نہیں، ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صدقات کو کسی پیغمبر کی مرضی سے تقسیم کرنے کا حکم نہیں دیا۔

ایک علمی نکتہ

"لِلْفُقَرَآءِ" میں لام تملیک کے لئے ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے حنفی فقہاء کہتے ہیں کہ اس آیت میں مستحقین کے نام سے پہلے جو حرف لام آیا ہے، یعنی: "لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ" الخ یہ ان مستحقین کی تملیک کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو زکوٰۃ وصدقات کا مال دیا جائے اسے اس مال کا مالک بنا کر دینا ضروری ہے اور حقیقی ملکیت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کوئی چیز کسی کے قبضے میں نہ چلی جائے، لہٰذا زکوٰۃ کا مال نقدی کی صورت ہو یا جنس یا جانور کی صورت میں اس چیز کا زکوٰۃ لینے والے کے قبضے میں جانا ضروری ہے؛ اسی لئے فقہاء کرام نے اس سے یہ مسئلہ لیا ہے کہ زکوٰۃ وصدقات کا مال کسی میت کے کفن دفن کے لئے استعمال نہیں ہوسکتا، کیونکہ مردہ کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا، اسی طرح یہ مال نہ مسجد پر خرچ ہوسکتا ہے اور نہ مدرسے کی عمارت پر، نہ ہسپتال یا مسافر خانہ تعمیر کرنے پر اور نہ ہی دوسرے رفاہِ عامہ کے کام پر، کیونکہ یہ چیزیں کسی مال کی مالک نہیں بن سکتیں، لہٰذا زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے؛ اس لئے زکوٰۃ ادا کرتے وقت ماہر علماء اور

مفتیوں سے پوچھ پوچھ کر ادا کرنا چاہئے۔

احکام ومسائل

اب سوال یہ ہے کہ کم از کم کتنے مال پر، اور کس قسم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟ تو اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں "کتاب الزکوٰۃ" کے عنوان کے تحت دیکھی جاسکتی ہے تا، ہم زکوٰۃ کے مصرف کے بارے میں کچھ اہم اور ضروری مسئلے تحریر کئے جاتے ہیں۔

مسئلہ (۱):.... وہ شخص جس کے پاس کچھ چاندی یا کچھ پیسے نقد ہیں اور تھوڑا سا سونا ہے تو سب کی قیمت لگا کر اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو وہ بھی نصاب والا ہے اس کے لئے زکوٰۃ کا مال لینا جائز نہیں اور کوئی آدمی ایسے شخص کو زکوٰۃ دے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی؛ اس لئے یہ شخص زکوٰۃ کا حق دار نہیں ہے۔

مسئلہ (۲):.... جو شخص نصاب والا تو نہیں البتہ تندرست، طاقتور اور کمانے کے قابل ہے اور ایک دن کا گزارہ اس کے پاس موجود ہے اس کو اگرچہ زکوٰۃ دینا جائز ہے مگر یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں سے سوال کرتا پھرے اس میں بہت سے لوگ غفلت برتتے ہیں سوال کرنا ایسے لوگوں کے لئے حرام ہے ایسا شخص جو کچھ سوال کر کے حاصل کرتا ہے اس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دوزخ کا انگارہ فرمایا ہے۔

مسئلہ (۳):.... زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مال اس کے حق دار کو مالکانہ طور پر دیدیا جائے، اگر کوئی مال انہی لوگوں کے فائدے کے لئے خرچ کر دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

مسئلہ (۴):.... اسی وجہ سے چاروں اماموں اور دوسرے فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کی رقم مسجدوں، مدرسوں، شفا خانوں اور یتیم خانوں کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں لگانا جائز نہیں، اگرچہ ان تمام چیزوں سے فائدہ ان فقراء اور دوسرے حضرات کو پہنچتا ہو جو کہ زکوٰۃ کے مصرف ہیں، مگر ان کا مالکانہ قبضہ ان چیزوں پر نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ اس سے ادا نہیں ہوتی۔

مسئلہ (۵):.... شفاخانوں میں جو دوا ضرورت مند غریبوں کو مالکانہ طور پر دیدی جائے اس کی قیمت زکوٰۃ میں شمار ہوسکتی ہے۔

مسئلہ (۶):.... فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ: لاوارث میت کا کفن زکوٰۃ کی رقم سے نہیں لگایا جاسکتا، کیونکہ میت میں مالک ہونے کی صلاحیت نہیں، ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کسی غریب حق دار کو دیدی جائے، اور اس رقم کو وصول کرنے کے بعد اپنی خوشی سے لاوارث میت کے کفن پر خرچ کردے، اسی طرح اگر اس میت کے ذمہ قرض ہے تو اس قرض کو زکوٰۃ کی رقم سے براہِ راست ادا نہیں کیا جاسکتا، ہاں! اس کے وارث غریب اور زکوٰۃ کے حق دار ہوں تو ان کو مالکانہ طور سے دیا جاسکتا ہے پھر وہ اس رقم کے مالک ہوکر اپنی مرضی سے چاہے تو میت کا قرض ادا کرسکتے ہیں۔

مسئلہ (۷):.... رفاہی کام، جیسے: کنویں یا سڑک وغیرہ کی تعمیر اگر چہ ان کا فائدہ زکوٰۃ کے حق داروں کو بھی پہنچتا ہے مگر ان کا مالکانہ قبضہ نہ ہونے کے سبب اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی۔

مسئلہ (۸):.... اموال باطنہ، یعنی: وہ مال جس کو انسان اپنی حفاظت میں رکھتا ہے اس کے لئے حکم یہ ہے کہ اس مال کی زکوٰۃ بلاضرورت ایک شہر یا بستی سے دوسرے شہر یا بستی میں نہ بھیجی جائے بلکہ اسی شہر اور بستی کے فقراء اس کے زیادہ حق دار ہیں، البتہ اگر کسی شخص کے قریبی رشتہ دار غریب ہیں اور وہ کسی دوسرے شہر میں ہیں تو اپنی زکوٰۃ ان کو بھیج سکتا ہے۔

مسئلہ (۹):.... اگر دوسری بستی کے لوگ فقر و فاقہ میں مبتلا ہوں اور اپنے شہر کے لوگوں سے وہ زیادہ ضرورت مند معلوم ہوں تو زکوٰۃ وہاں بھیجی جاسکتی ہے، کیونکہ مقصد صدقات دینے کا فقراء کی حاجت کو پوری کرنا ہے اسی وجہ سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یمن کے صدقات میں اکثر کپڑے لیا کرتے تھے، تا کہ فقراء مہاجرین کے لئے مدینہ طیبہ بھیج دیں۔

مسئلہ (۱۰):.... جس مال کی زکوٰۃ واجب ہے اس کی ادائیگی کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ اس مال کا

چالیسواں حصہ نکال کر مستحقین کو دیدے، جیسے: تجارتی کپڑا، برتن، فرنیچر وغیرہ اور یہ بھی ہے کہ جتنی مقدار زکوٰۃ بنتی ہے، مثلاً: تجارتی غلہ میں دو بوری زکوٰۃ بنتی ہے تو زکوٰۃ ادا کرنے والے کے لئے جائز ہے کہ یا تو دو بوری گندم دے یا اس کی قیمت دیدے، صحیح حدیثوں سے ایسا کرنا ثابت ہے لیکن اس زمانہ میں نقد قیمت دینا زیادہ ہی بہتر ہے، کیونکہ فقیروں کی ضرورتیں مختلف اور زیادہ ہیں، نقد پیسوں کو کسی بھی ضرورت کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔

مسئلہ (۱۱):..... اگر اپنے ہی ددھیالی اور ننھیالی رشتہ دار، مثلاً: چچا، پھوپھی اور ان کی اولاد اور ماموں اور خالہ اور ان کی اولاد زکوٰۃ کے حق دار ہیں تو ان کو دینا زیادہ بہتر ہے اور دوہرا اجر وثواب کہے ایک ثواب صدقہ کا دوسرا صلہ رحمی کا، زکوٰۃ کے حق دار علماء کو بھی دینا دوہرا اجر وثواب ہے ایک صدقہ کا دوسرا علم دین میں تعاون کا۔

مسئلہ (۱۲):..... زکوٰۃ کی ادائیگی میں یہ ضروری نہیں کہ یہ بتلا کردے کہ صدقہ یا زکوٰۃ دے رہا ہوں کسی تحفہ یا ہدیہ کے نام سے بھی دیا جاسکتا ہے تاکہ لینے والے شریف آدمی کو شرمندگی نہ ہو، تاہم دل میں زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت ہونا ضروری ہے۔

مسئلہ (۱۳):..... اگر کسی شخص کی زبانی بیان اور ظاہری حالت سے معلوم ہو کہ یہ شخص واقعی حق دار ہے تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، البتہ جہاں آسانی کے ساتھ تحقیق کرنا ممکن ہو تو وہاں تحقیق کر لینا چاہئے۔

مسئلہ (۱۴):..... بیوی شوہر اور شوہر بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا، اسی طرح والدین اولاد کو اور اولاد والدین کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔

مسئلہ (۱۵):..... اگر کسی شخص نے کسی کو اپنے گمان کے مطابق حق دار سمجھ کر زکوٰۃ دیدی، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تو کافر تھا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، دوبارہ دینی چاہئے؛ اس لئے کہ کافر زکوٰۃ کا حق دار نہیں۔

اس کے علاوہ اگر بعد میں یہ ثابت ہوا کہ جس کو زکوٰۃ دی گئی ہے وہ تو مالدار شخص تھا یا سید، ہاشمی یا اپنا باپ یا بیٹا یا بیوی یا شوہر ہے تو زکوٰۃ دوبارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، یہاں تک صدقات دینے کے متعلق ضروری ضروری مسئلے اور آیت کی تفسیر کچھ تفصیل کے ساتھ آگئی ہے۔

مخالفت کا نتیجہ

وَ مِنْهُمُ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ النَّبِیَّ وَ یَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَیْرٍ
اور میں سے ان وہ لوگ ہیں ایذا دیتے ہیں جو پیغمبر کو اور کہتے ہیں وہ تو کان ہے کہہ دیجئے کان ہے بھلائی کا
لَّكُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ یُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
واسطے تمہارے یقین رکھتا ہے ساتھ اللہ کے اور یقین کرتا ہے واسطے مؤمنوں کے اور رحمت ہے واسطے ان کے جو ایمان لائے
مِنْكُمْ ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۶۱﴾
میں سے تم اور جو لوگ ستاتے ہیں پیغمبر کو اللہ کے واسطے ان کے عذاب ہے دردناک (۶۱)

بامحاورہ ترجمہ: اور بعض ان میں سے پیغمبر کی بدگوئی کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ شخص تو کان ہے آپ کہہ دیجئے کہ! کان ہے تمہارے بھلے کے واسطے اللہ پر یقین رکھتا ہے اور مسلمانوں کی بات کا یقین کرتا ہے اور تم میں سے ایمان والوں کے لئے رحمت کا باعث ہے، اور جو لوگ اللہ کے پیغمبر کی بدگوئی کرتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (۶۱)

تفسیر

پچھلی آیتوں میں بعض منافقوں کی لالچی اور مطلب خور ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، اسی سلسلہ میں زکوٰۃ کے مال کا قاعدہ بھی بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مال چند قسم کے لوگوں کے دینے کے لئے فرض کر دیا ہے، اسے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے سے تقسیم کرنا چاہئے، ان کے علاوہ اور کوئی شخص اس مال میں کوئی حق نہیں رکھتا، اس آیت میں منافقوں کی ایک اور بری عادت کا ذکر بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہے کہ: بعض منافق اپنے مل بیٹھنے کی جگہوں میں آپس کی بات چیت کے اندر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی برائیاں بیان کرتے ہیں اور اس پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے ہیں، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی خبر پیغمبر

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچے گی تو انہیں رنج ہوگا اور دکھ پہنچے گا، تو کہتے ہیں کہ ہم حیلے بہانے کر کے انہیں راضی کر لیں گے، کیوں کہ وہ تو صرف کان ہیں، یعنی: (جو کوئی ان سے کچھ کہتا ہے وہ سن کر اس کا یقین کر لیتے ہیں) ارشاد ہے: اے پیغمبر! ان کو جواب دید یجئے کہ پیغمبر کا اخلاق تمہاری ہی بہتری کے لئے ہے ورنہ اگر پیغمبر ذرا ذرا اسی بات میں جوش میں آجایا کرتے تو تم تو کبھی کے مٹ چکے ہوتے، بھلا! پیغمبر کے اخلاق سے پیغمبر کی ہمدردی اور عنایت حاصل کرنا چاہے تو وہ خوش قسمت ہے اور جو اس نرمی اور بردباری سے غلط فائدہ اٹھا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برائیاں اور غیبتیں کرتا پھرے تو اس کے لئے سخت مصیبت والا عذاب تیار ہے، ایسے لوگوں کو دونوں جہاں میں سخت سزا ملے گی۔

جب مسلمان تبوک کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو منافقین اس قسم کی طعنہ زنی کرتے تھے کہ دیکھو جی! یہ رومی بادشاہت کے ساتھ مقابلہ کے لئے جا رہے ہیں، انہوں نے رومیوں کو بھی عرب سمجھ لیا ہے، اس قسم کی باتیں آگے آرہی ہے اور بعض لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف غلط قسم کا پراپیگنڈہ کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ان میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو دکھ پہنچاتے ہیں، یعنی: یہ کہ آپ انصاف نہیں کرتے اور ہمیں ہمارا حق نہیں دیتے، اللہ کے پیغمبر کو دکھ پہنچانا تو کفر کی بات ہے، پیغمبر کو ناراض کرنا اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنا ہے، اس قسم کی باتیں کافر اور منافق لوگ ہی کر سکتے ہیں اس چیز کو اللہ تعالیٰ نے "سورۂ احزاب" میں بھی بیان فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے خلاف دکھ پہنچانے والی بیہودہ باتیں کرنے والا سخت لعنت کا حق دار بنتا ہے اور اگر کوئی شخص بے گناہ مسلمانوں کے خلاف بھی ایسی بات کریگا تو مجرم بنے گا اور خدا تعالیٰ کے ہاں لعنتی شمار ہوگا، بہر حال فرمایا کہ: منافقین میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ اول فول کہہ دیں گے، وہ ہماری بات مان جائیں گے، کیونکہ وہ کان کے کچے ہیں۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ وہ کان ہیں مگر تمہاری بہتری کے لئے ہے، آپ کے اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تم میں سے ہر ایک کی بات سن لیتے ہیں اس میں تمہاری بہتری ہے،

پیغمبر ﷺ تو اخلاق کی بلند ترین منزل پر تھے، اللہ تعالیٰ نے اس بات کی گواہی دی ہے" وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ " (القلم) یعنی: آپ بہت ہی بلند اخلاق کے مالک ہیں، پھر آپ ﷺ کا اپنا ارشاد مبارک بھی ہے: "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ "یعنی: اللہ تعالیٰ نے مجھے بلند اخلاق کی اچھی اچھی باتوں پر پورا کرنے کے لئے بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:" وَاخْفِضْ لِلَّذِيْنَ آمَنُوا مِنْكُمْ " اپنے شفقت کے بازو ایمان والوں کے لئے نیچا کرلیں، یعنی: ان سے شفقت اور مہربانی کے ساتھ پیش آئیں، اسی سورۃ کے آخر میں آپ کو" بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ " بھی کہا گیا ہے، یعنی: آپ ایمان والوں کے لئے نہایت شفقت والے اور مہربان ہیں، گویا پیغمبر ﷺ انہی خوبصورت اخلاق کی وجہ سے ہر ایک کی بات سن لیتے تھے، مگر منافق سمجھتے تھے کہ وہ آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

فرمایا: یاد رکھو! جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو دکھ پہنچاتے ہیں دردناک عذاب کے حق دار ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچ سکیں گے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو ذہنی طور پر دکھ پہنچایا ہے اور آپ کو پریشان کیا ہے؛ اس لئے وہ سخت سزا کے حق دار ہیں، پیغمبر ﷺ کا مہربان اور نرم مزاج ہونا تو یقینی بات ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجرم لوگ سزا سے بچ جائیں گے، نہیں! بلکہ انہیں دردناک عذاب کا مزا چکھنا ہوگا۔

منافقوں کی چال

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ
قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی سامنے تمہارے بسبب راضی کرنے تمہیں اور اللہ اور پیغمبر اس کا زیادہ حقدار ہیں کہ

يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ
راضی کریں وہ ان کو اگر ہیں وہ ایمان والے (۶۲) کیا نہیں جانا انہوں نے کہ وہ جو مقابلہ کرے

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ
اللہ کا اور پیغمبر اس کے کا پس بیشک واسطے اس کے آگ ہے دوزخ کی ہمیشہ رہیں گے میں اس یہی ہے

الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٣﴾

رسوائی بڑی (۶۳)

با محاورہ ترجمہ: تمہارے آگے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تمہیں راضی کریں، حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر زیادہ حق دار ہیں اس بات کہ وہ ان کو راضی کریں اگر ایمان والے ہیں۔ (۶۲) کیا وہ جان نہیں چکے کہ جو اللہ سے اور اس کے پیغمبر سے مقابلہ کرے تو اس کے واسطے دوزخ کی آگ ہے اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہی بڑی رسوائی ہے۔ (۶۳)

لفظی تحقیق: یُحَادِدِ: مقابلہ کرے۔ مضارع کا صیغہ ہے جو "مُحَادَّۃٌ" سے بنا ہے اور جس کا مادہ: ح، د، د ہے "حَدٌّ" کے معنی ایک طرف اور کنارے کے ہیں "مُحَادَّۃٌ" کسی کے سامنے کے کنارے پر لڑنے کے لئے ڈٹ کر کھڑا ہو جانا، منافقوں کی عادت یہ تھی کہ جب موقع ملتا اور میدان خالی پاتے تو مسلمانوں کی خوب برائیاں کرتے، گویا بظاہر ان کے ساتھ بڑا گہرا بھائی چارہ بنائے رکھتے تھے، جب ان کی یہ دغابازی کھل جاتی تو دوڑے ہوئے مسلمانوں کے پاس آتے اور کہتے ہماری بابت افواہوں کا یقین نہ کرو اور قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ ہماری نیتیں تمہاری طرف سے صاف ہیں ہم کسی طرح تمہاری برائی اور نقصان کے خواہش مند نہیں ہمارا تمہارا دوستانہ بہت اچھا ہے، اسی طرح کی باتیں بنا بنا کر مسلمانوں کو منانے اور راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس آیت میں ان کی چالبازی کا حال بیان کیا گیا ہے۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: یہ لوگ بھانڈا پھوٹ جانے پر تمہارے پاس دوڑے ہوئے آتے ہیں، اور قسمیں کھا کھا کر تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ تمہارے خیر خواہ ہیں، حالانکہ تمہارے راضی کر لینے سے کوئی فائدہ نہیں، اصل چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اور اس کے پیغمبر کو راضی کریں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اصلی حالات سے اچھی طرح واقف ہیں، اور اپنے پیغمبر کو بھی ان کے ہتھکنڈوں سے واقف کرتا رہتا ہے، اتنی بات ہر ایک سچے ایمان والے کو معلوم

ہونی چاہئے اگر ان میں ایمان ہے تو اللہ تعالیٰ اور پیغمبر کو راضی کرنے کی کوشش کریں ورنہ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ اور پیغمبر کے مخالف چلنے والا دوزخ کی آگ میں ہمیشہ جلتا رہے گا اور یہ اتنی بڑی رسوائی اور ذلت ہے کہ اس کے مقابلے میں دنیا کے سارے عارضی نفعے ہیچ ہیں۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ: (یہ منافق لوگ تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کی قسمیں اٹھاتے ہیں) بات بات پر قسمیں اٹھانا ان کی عادت ہے "سورۂ منافقون" میں ہے کہ منافق لوگ قسمیں اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے، مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ" یہ جھوٹے ہیں ان کی قسموں کا کچھ اعتبار نہیں جب کوئی مؤمن اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھائے گا، تو وہ قابل تسلیم ہوگی کیونکہ مؤمن اللہ تعالیٰ کی قسموں کا کچھ تعظیم کرتا ہے مگر منافق کو نہ اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق ہے اور نہ ایمان والوں سے، لہذا وہ جھوٹی قسمیں کھائے جاتے ہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: میں اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم کرتے ہوئے تمہاری قسم پر اعتبار کرتا ہوں اور اپنی آنکھوں کو جھٹلاتا ہوں جنہوں نے تجھے چوری کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایک مؤمن کو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہئے اور اس کے بعد اس کے پیغمبر کی خوشنودی چاہئے جو اللہ تعالیٰ کا نائب اور اس کے حکموں کو دنیا میں پورا کرنے والا ہے، مگر ان منافقوں کی حالت یہ ہے کہ خدا کو تو ناراض کر رہے ہیں مگر تمہیں راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یعنی: مسلمانوں کو تو راضی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کو ناراض کر رہے ہیں یہ تو دوزخ میں جانے کے حق دار ہیں۔

فرمایا: اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا (کیا ان کو علم نہیں) کیا یہ لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی مخالفت یا مقابلہ کرے گا تو اس شخص کے لئے دوزخ کی آگ تیار ہے وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب بھی ہوگا اور اس کی لعنت بھی برسے گی۔

منافقوں کی پریشانی

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾

ڈرتے رہتے ہیں منافق یہ کہ اتاری جائے پر مسلمانوں کوئی سورت جو خبردار کردے ان کو وہ جو میں ہے دلوں ان کے کہہ دیجئے ٹھٹے کیے جاؤ تحقیق اللہ کھولنے والا ہے جس سے تم ڈرتے ہو (۶۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ منافق اس بات سے ڈرا کرتے ہیں کہ مسلمانوں پر ایسی سورت اترے کہ ان کو خبردار کردے جو ان کے دل میں ہے آپ کہہ دیجئے ٹھٹھے کرتے رہو، تحقیق اللہ اس چیز کو جس کا تمہیں ڈر ہے کھول کر رہے گا (یعنی: بیان کر کے چھوڑ دے گا)۔ (۶۴)

تفسیر

منافقوں کی حالت واقع عجیب تھی ان کا دل تو بالکل نہ چاہتا تھا کہ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانبردار ہوتے چلے جائیں، اور اسلام کا بول بالا ہو، کیوں کہ اس میں انہیں اپنی سرداری اور بڑے پن کی موت صاف نظر آرہی تھی، لیکن واقعات سے مجبور تھے کیونکہ ان کی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کی تعداد دن دوگنی رات چوگنی بڑھ رہی تھی، لیکن واقعات سے مجبور تھے، اور مسلمانوں کے ساتھ بنائے رکھنا روز بروز زیادہ ضروری ہوتا جاتا تھا؛ اس لئے جہاں تک ہوسکتا یہ لوگ ظاہر میں مسلمانوں کی خوشامد کرتے لیکن دل سے مجبور ہو کر تنہائی میں برائی سے بھی نہ چوکتے اور دل یوں بہلاتے کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی خبر پہنچ گئی تو بڑے بردبار اور حوصلے والے ہیں، باتیں بنا کر انہیں سمجھا بجھا لیں گے، لیکن وحی کا انکار بھی مشکل تھا کیوں کہ اس کی سچائی میں اب ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہ تھی اس لئے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کوئی ایسی سورت مسلمانوں پر نہ اتر جائے جس سے ہمارا کچا چٹھا کھل جائے اس

آیت میں اسی کا بیان ہے۔

ارشاد ہے کہ: یہ دو غلے ظاہر دار لوگ گھبراتے ہیں کہ کہیں مسلمانوں پر ایسی سورت نہ اتر جائے جس میں ہمارے دلی بھید سارے ظاہر ہو جائیں اگر ایسا ہوا تو ہماری پوری شامت ہی آجائے گی، آگے ارشاد ہے کہ: تم اپنی دھو کے بازی کا جال بچھاتے رہو، اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کی اور ان کی ہنسی اڑانے کی عادتیں جاری رکھو، اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

آہستہ آہستہ تمہارے سارے بھید کھول کر رکھ دے گا، اور تم اپنا سامنہ لے کر رہ جاؤ گے، تمہارا ڈر تمہارے سامنے آجائے گا، یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہارے شرارتی ہتھکنڈے سے دین حق کی ترقی رک جائے اور دنیا پھر سے تاریکی میں جا پڑے جس میں ایک مدت سے ٹھوکریں کھا رہی ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی ذہنی کیفیت کی بھی بیان فرمایا ہے، منافق جانتے ہیں کہ ان کی بے ایمانی کی باتوں کو وقتاً فوقتاً ظاہر کر دیا جاتا ہے، وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو آگاہ کر دیتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ان کا حل عام لوگوں کے لئے بیان کر دیتا ہے، منافقوں کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں ہمارا راز اللہ تعالیٰ کے وحی کے ذریعے کھل نہ جائے اسی بناء پر سال میں ایک دو مرتبہ رسوا بھی ہوتے تھے، مگر یہ باز نہیں آتے تھے۔

فرمایا: اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ! تم مذاق اڑا لو، مشرک اور منافق کمزور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے کہ دیکھو! نہ ان کے پاس لباس ہے نہ مکان اور نہ سواری اور یہ جنت کے مالک بنے پھر رہے ہیں، مکی سورتوں میں ایسا ہی حال مشرکوں کا بیان ہو چکا ہے اور اب منافقوں کا بھی ہو رہا ہے، منافق کہتے تھے کہ ملک روم فتح کرنے جا رہے ہیں حالانکہ نہ کھانے کو ہے نہ پہننے کو، نہ فوج ہے نہ اسلحہ، اور روم کی طاقتور فوج سے مقابلہ کرنے جا رہے ہیں، اس قسم کا مذاق اڑاتے تھے، جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اب تو مذاق اڑا لو مگر اللہ تعالیٰ تمہارے رازوں کو ضرور کھول دیں گے، چنانچہ یہ باتیں بھی اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرما دیں جس سے وہ خوب رسوا ہوئے اس کے علاوہ تبوک کی جنگ کے راستہ میں انہوں نے جو سازش پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی کی تھی، اللہ تعالیٰ

نے اسے بھی وحی کے ذریعے ظاہر فرمادیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس راستے سے ہٹ گئے جہاں یہ منافقین اس کام کے لئے جمع ہوئے تھے اور تمام سازشیں کرنے والے ذلیل وخوار ہوئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اللہ رب العزت نے ستر منافقوں کے نام مع ان کی ولدیت اور پورے نشان پتے کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلادیئے تھے، مگر رحمۃ للعالمین نے ان لوگوں پر ظاہر نہیں فرمایا۔

منافقوں کا عذر لنگ

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ اَ

اور اگر پوچھیں آپ ان سے تو کہیں گے وہ کچھ نہیں تھے ہم بات چیت کرتے اور دل لگی کرتے کہہ دیجئے کیا

بِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ۝۶۵ لَا تَعْتَذِرُوْا

ساتھ اللہ کے اور احکام اس کے اور پیغمبر اس کے تھے تم ٹھٹھا کرتے (۶۵) مت عذر کرو تم

قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ

تحقیق کافر ہوگئے ہو تم بعد ایمان لانے تمہارے کے اگر ہم معاف کردیں سے ایک گروہ کو میں سے تم

ع ۸ ۱۴ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ۝۶۶

تو عذاب دیں گے ایک گروہ کو اس لئے کہ وہ تھے مجرم (۶۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر آپ ان سے پوچھیں تو وہ کہیں گے ہم تو بات چیت اور دل لگی کرتے تھے آپ کہہ دیجئے! کیا تم اللہ، اس کے حکموں اور اس کے پیغمبر سے ٹھٹھا کرتے تھے۔ (۶۵) بہانے مت بناؤ! تم تو ایمان لانے کے بعد کافر ہوگئے، اگر ہم تم میں سے بعض کو معاف کردیں تو البتہ بعض کو سزا بھی دیں گے۔ (۶۶)

تفسیر

جب انسان کے دل میں کسی چیز کی حقیقت وقعت نہیں ہوتی تو وہ اس کی بناوٹی وقعت قائم رکھنے میں ہر

وقت کامیاب نہیں ہوسکتا، اس کے دل کی اصلی حالت کھل جاتی ہے، کچھ منافق جو مسلمانوں کے ساتھ ناچاہتے ہوئے تبوک کی جنگ میں نکل پڑے تھے، راستہ میں کہنے لگے کہ اس شخص (محمد) کو دیکھو کہ تھوڑے سے عرب پر قابو پاکر اتنا اترا گیا کہ شام اور روم کے شاندار اور لوگوں کو فتح کرنے چلا ہے، کہاں یہ تھوڑے سے ناتجربہ کار مسلمان جو ہر وقت قرآن اور نمازیں پڑھتے رہتے ہیں، جنہیں کسی بڑی قوم سے لڑائی کا واسطہ نہیں پڑا اور کہاں وہ شامی اور رومی بہادر جو رات دن باقاعدہ لڑائیوں میں ملک کے ملک فتح کرتے رہتے ہیں، ان کی اس شرارت کی خبر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے بلا کر پوچھا کہ اپنے لوگوں کی ہمت ایسی باتوں سے پست کرنے کے کیا معنی ہیں؟ اس آیت میں اسی کا ذکر ہے۔

ارشاد ہے کہ: اے پیغمبر! آپ کے پوچھنے پر وہ منہ پر جواب دیتے ہیں کہ حضرت! یہ باتیں کوئی ہم دل سے تھوڑی ہی کہتے ہیں یہ تو محض راستہ میں دل بہلانے کے لئے خوش گپیاں ہیں، اے پیغمبر! اس سے کہہ دیجئے کہ! کیا ہنسی اور دل لگی کرنے کے لئے تمہیں اللہ تعالیٰ اور پیغمبر اور اس کے احکام ملے ہیں، یہ تمہارے عذر اور بہانے بیکار ہیں، تم تو ایمان والے بنتے تھے، ایسی کفریہ باتوں سے کیا تم مسلمان رہ سکتے ہو؟ اس کی سزا تمہیں مل کر رہے گی، جن منافقوں نے ایسی اعلانیہ گستاخیاں اور شرانگیزیاں نہیں کیں انہیں تو چند دن اور ڈھیل مل بھی جائے گی، مگر جو لوگ بالکل کھلم کھلا فساد کا بیج بو رہے ہیں انہیں ان کے جرموں کی سزا ملنی یقینی ہے، وہ کبھی بچ کر نہیں جائیں گے۔

احکام و مسائل

فرمایا: تم لوگ حیلے بہانے مت بناؤ تم نے ایمان کو ظاہر کرنے کے بعد کفر کا راستہ اختیار کیا ہے، مفسرین، محدثین اور فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ: جو کوئی اللہ تعالیٰ کے کسی حکم یا اس کے پیغمبر کا مذاق اڑائے گا تو وہ کافر ہو جائے گا، چاہے اس نے ایسی بات سنجیدگی سے کی ہو یا محض دل لگی سے۔

نفاق کی علامتیں

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ
منافق مرد اور منافق عورتیں بعض ان کے میں سے بعض کرنے کو کہتے ہیں بری بات

وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ
اور روکتے ہیں سے بھلی بات اور بھینچتے ہیں ہاتھ اپنے بھول گئے وہ اللہ کو

فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۶۷
پس وہ بھول گیا ان کو تحقیق منافق وہی ہیں نافرمان (۶۷)

بامحاورہ ترجمہ: منافق مرد اور منافق عورتیں سب کی ایک چال ہے، بری بات کرنے کو کہتے ہیں اور بھلی بات سے روکتے ہیں اور (اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے) اپنی مٹھی بند رکھتے ہیں وہ اللہ کو بھول گئے ہیں، سو! اللہ تعالیٰ بھی ان کو بھول گئے، تحقیق منافق ہی نافرمان ہیں۔ (۶۷)

تفسیر

منافقوں کا ذکر بہت دور سے چلا آرہا ہے یہ گروہ مدینہ میں آنے کے بعد ظاہر ہوا، اس سے پہلے مکہ میں دو ہی قسم کے لوگ تھے، کھلم کھلا مسلمان یا کھلم کھلا کافر، مدینہ میں کچھ لوگوں نے اس میں اپنا فائدہ سمجھا کہ بظاہر مسلمان بنے رہیں اور جب موقع آئے تو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کو کوشش کریں، چنانچہ یہ لوگ مسلمانوں میں آستین کے سانپ بن کر رہے، احد کی لڑائی میں انہوں نے سخت تکلیف دی لیکن مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے بلکہ اپنا ہی کچھ بگاڑ لیا، اللہ تعالیٰ نے ہر موقعہ پر ان کی شرارتوں سے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے ساتھیوں کو آگاہ کیا، لیکن آپ کی بردباری اور خوش اخلاقی کی وجہ سے یہ لوگ دلیر ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ تبوک کی جنگ کے لئے تیاری کا حکم ہوا، اس میں ان کی خباثت کا پورے طور پر بھانڈا پھوٹ گیا اور یہ لوگ اس کے

وقف لازم

بعد سر نہ اٹھا سکے۔

اس آیت میں ان کی عام نشانیاں بیان کر دی گئی ہیں، ارشاد ہے کہ: منافق مرد ہوں یا عورتیں، سب کا ایک سا رویہ ہے یہ ظاہر میں دوست بنتے ہیں اور چھپ کر وار کرتے ہیں ان سب کی عادت اور خصلت ہے کہ جن باتوں کو سب لوگ برا اقرار دے چکے ہوں یہ انہیں کرنے کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور جن باتوں کو سب اچھا جان چکے ہوں ان کے چھوڑ دینے کو کہتے ہیں، پرلے درجے کے کنجوس ہوتے ہیں، مال جمع کرنا ان کی نشانی ہے اور خرچ کرنے سے مٹھی بھینچتے ہیں اور ناک بھوں چڑھاتے ہیں، انہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو بھلا دیا ہے، اصل بے دین اور نافرمان یہی لوگ ہیں کیونکہ دین کے قانون کا زبان سے اقرار کرتے ہیں لیکن موقع پا کر اس کے خلاف چلتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ گناہوں سے وہی بچ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر مانتا ہو اور اس کی پکڑ سے ڈرتا ہو، ورنہ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کو نہ مانتا ہو اور اس کو کوئی طاقت خالص سچا مسلمان اور دیانتدار نہیں بنا سکتی۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی ایک صفت بیان فرمائی کہ وہ اپنے ہاتھوں کو سکیڑتے ہیں، یعنی: بخل سے کام لیتے ہیں ''تفسیر قرطبی'' میں ہے کہ ہاتھ بند کرنے اور سکیڑنے سے مراد جہاد نہ کرنا اور اس میں مال خرچ نہ کرنا ہے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیا ہے، یعنی: اللہ تعالیٰ کے حکموں کو اس طرح چھوڑ دیا جیسے بھول گئے ہوں، تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو بھول گئے، یعنی: اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیا ہے آخرت کے معاملہ میں ایسا ہی چھوڑا کہ نیکی اور ثواب میں کہیں ان کا نام نہ رہا۔

یہ منافق لوگ جہاں مال خرچ کرنے کا موقع آتا ہے، جہاد کی تیاری ہوتی ہے یا زکوٰۃ وصدقات کی ادائیگی کا موقع ہوتا ہے تو ہاتھ روک لیتے ہیں، حالانکہ کنجوسی کو بدترین بیماری کہا گیا ہے، پیغمبر ﷺ کے سامنے ایک شخص کا ذکر کیا گیا کہ اس میں ایسی ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں مگر وہ کنجوس ہے، آپ نے فرمایا کہ: بخل (کنجوسی) سے بڑھ کر کوئی بیماری ہو سکتی ہے؟ جو شخص بخیل ہے وہ کسی تعریف کے قابل نہیں، ''ترمذی شریف'' میں ہے کہ

بخیل آدمی اللہ تعالیٰ سے دور، مخلوق سے دور اور جنت سے دور ہوتا ہے اور ایسا شخص دوزخ سے قریب ہوتا ہے، فرمایا کہ: منافق لوگ ہی نافرمان ہیں، فاسق بھی قرآنی اصطلاح ہے اور اس سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جو ایمان لانے کے باوجود اچھی بات پر عمل نہیں کرتا، بلکہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور جو شخص مانتا بھی نہیں اور نافرمانی بھی کرتا ہے وہ کافر بھی ہے اور فاسق بھی، گویا فاسق کا لفظ عام ہے۔

کافروں اور منافقوں کی سزا

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ

مقرر کردی اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں کیلئے آگ دوزخ کی رہا کریں گے ہمیشہ

فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾

میں اس وہی کافی ہے ان کو اور رحمت سے دور کردیا ان کو اللہ نے اور واسطے ان کے عذاب ہے ہمیشہ رہنے والا (۶۸)

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ

جس طرح وہ لوگ سے جو پہلے تھے تم وہ تھے زیادہ تم سے بڑھے ہوئے زور میں اور بڑھے ہوئے تھے

اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ

مال میں اور اولاد میں

بامحاورہ ترجمہ:۔ اللہ نے منافق سرداروں اور منافق عورتوں کو اور کافروں کو دوزخ کی آگ کا وعدہ دیا ہے اس میں پڑے رہیں گے، ان کی یہی کچھ ہے اللہ نے ان کو پھٹکار دیا اور ان کے لئے برقرار رہنے والا عذاب ہے۔ (۶۸) جس طرح تم سے اگلے لوگ زور میں زیادہ تھے اور مال اور اولاد تم سے زیادہ رکھتے تھے۔

تفسیر

پچھلی آیت میں منافقوں کی مشترکہ علامتیں بیان کردیں، کافروں کی بھی یہی عادتیں ہیں، لیکن وہ کھلم کھلا

مقابلے میں آکر ستاتے ہیں، اور منافق موقعہ تاکتے رہتے اور چھپ کردار کرتے ہیں، بہر حال ان کے مشترکہ رویہ کا عذاب بھی مشترکہ ہے، ہاں! منافقوں کو دھوکے اور دغا بازی کا بدلہ الگ ملے گا، اس آیت میں اس عذاب کا بیان ہے جو منافقوں اور کافروں دونوں کے لئے ان کی اسلام کی مخالفت کی وجہ سے تیار ہے۔

ارشاد ہے کہ: یہ چھپے اور کھلے اسلام کے دشمن، یعنی: منافق اور کافر دونوں اپنے برے کرتوتوں کی وجہ سے دوزخ میں جانے کے لائق ہیں وہ اسی میں پڑے جلا کریں گے، گو منافقوں کے لئے جو دوزخ کا طبقہ مقرر ہے، وہ بہت زیادہ دکھ درد سے بھرا ہوگا، جیسا کہ "سورۂ نساء" میں گزر چکا ہے، یہ دوزخ کا عذاب ان کے کرتوتوں کی سزا کے لئے کافی ہوگا، اور انہیں صاف معلوم ہوتا رہے گا کہ یہ فلاں جرم کی سزا ہے یہ فلاں گناہ کا بدلہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی فریاد نہ سنے گا، کیونکہ وہ دنیا کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کر دیئے گئے ہیں، اور یہ عذاب ہر وقت ان سے چمٹا رہے گا چاہے نوعیت بدل جائے، لیکن تکلیف اسی طرح کی اسی طرح رہے گی۔

آگے ارشاد ہے کہ: ان لوگوں کے کرتوت ویسے ہی ہیں جیسے تم سے پہلے زمانے کے لوگوں کا تھا جو ان سے جسمانی قوت میں بھی کہیں بڑھے ہوئے تھے، مال بھی ان کے پاس ان سے زیادہ تھا اور اولاد کی کثرت میں بھی ان سے بازی لے گئے تھے، جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور طاقت کو بھولے ہوئے ہیں ان کو پچھلی قوموں کی حالات کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جو ان سے ہر لحاظ سے بڑھے ہوئے تھے۔

پہلی قوموں سے عبرت

فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ

پھر فائدہ اٹھایا انہوں نے | حصے اپنے سے | پس فائدہ اٹھایا تم نے | ساتھ حصے اپنے سے | جیسے فائدہ اٹھایا انہوں نے

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ

جو | سے | پہلے تم سے | ساتھ حصے اپنے کے | اور | گھسے تم بھی | جیسے وہ لوگ | گھسے تھے

اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ
یہ لوگ ہیں اکارت ہوئے اعمال جن کے میں دنیا اور آخرت میں اور وہی لوگ ہیں

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾
تنہا نقصان اٹھانے والے (۶۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر فائدہ اٹھا گئے اپنے حصے سے، پھر تم نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا جیسے تم سے پہلے والے حصے سے فائدہ اٹھا گئے اور تم بھی انہی کی سی چال چلتے ہو وہ اور ان کے عمل دنیا اور آخرت میں مٹ گئے اور وہی لوگ نقصان میں پڑے۔ (۶۹)

تفسیر

پچھلی آیت میں اگلے وقتوں کے لوگوں کے حال سے عبرت حاصل کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، اس آیت میں ان کے اور ان کے طرز عمل کے ایک جیسا ہونے کا حال بیان کیا گیا ہے پہلے زمانے کے لوگ جتنی دنیا ان کے حصے میں آئی تھے اس سے جی بھر کر لطف اٹھاتے رہے اور انجام کا کبھی خیال نہ کیا، اب تم اپنی طرف دیکھو کہ تم کیا کرر ہے ہو، دنیا جو تمہارے حصے میں آئی ہے وہ ان سے زیادہ نہیں ہے جو ان کے حصے میں آئی تھی، وہ جسمانی طاقتوں میں تم سے بڑھے ہوئے تھے اور ساز وسامان اور دنیا کے مال واسباب بھی ان کے پاس تم سے زیادہ تھا تم ہر بات میں ان سے کم ہوتے ہوئے بھی انہی کی طرح غافل اور بدمست ہوکر رنگ رلیاں منارہے ہو اور چال چلن کا بالکل وہی انداز ہے جو ان کا تھا، وہ اپنے ساز وسامان اور قوت وطاقت میں مست ہوکر اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت کو بھولے ہوئے تھے، تم بھی انہی کی طرح دنیا ہی میں پھنسے ہوئے ہو، ذرا سوچو کہ! جب دنیا کے بڑھے ہوئے سامان بھی ان کو تباہی سے نہ بچا سکے تو تم کو یہ تھوڑا سا سامان عذاب الٰہی سے کس طرح بچا سکتا ہے۔

ان کا کیا کرایا یقیناً سب اکارت ہوگیا نہ دنیا ہی میں اس نے کچھ کام دیا اور نہ آخرت میں، وہ ان کے کسی کام آئے گا اگر نقصان اور گھاٹے میں پھنسے ہوئے لوگوں کو دیکھنا چاہتے ہو تو ان کو دیکھو ان کے حالات سے عبرت

حاصل کرو اپنا چال چلن درست کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

دنیا میں جس چیز کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے منافقت کا راستہ اختیار کیا، کیا وحی کے ظاہر کر دینے کی وجہ سے وہ اپنے اس ناپاک مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور ان کی ساری کارگزاری ضائع ہو گئی اور آخرت میں بھی کفر اور نفاق انہیں کوئی فائدہ نہیں دے گا، ان کو نجات نصیب نہیں ہوگی، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں جائیں گے۔

تنبیہ!

اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: تم بھی وہی طریقے اختیار کرو جو تم سے پہلی امتیں کر چکی ہیں، ہاتھ در ہاتھ اور بالشت در بالشت، یعنی: ہو بہو ان کی نقل اتارو گے، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کے بل میں گھسا ہے تو تم بھی گھسو گے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا کہ: اس حدیث کی تصدیق کے لئے تمہارا جی چاہے تو قرآن کریم کی یہ آیت پڑھ لو "كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ"۔

حدیث شریف کا مقصد واضح ہے کہ آخر زمانے میں مسلمان بھی یہودیوں اور عیسائیوں کے طریقوں پر چلنے لگیں گے، اور منافقوں کا عذاب بیان کرنے کے بعد اس کا بیان کرنا اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے طریقوں کا اتباع کرنے والے مسلمان وہی ہوں گے، جن کے دلوں میں مکمل ایمان نہیں، نفاق کے جراثیم ان میں پائے جاتے ہیں۔

پہلوں کی خبریں

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ

کیا نہیں آئی ان تک خبر ان لوگوں کی جو پہلے تھے ان سے قوم نوح کی اور عاد اور

ثَمُوْدَ ۙ۬ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ
ثمود اور قوم ابراہیم کی اور والے مدین اور الٹی ہوئی بستیاں

اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ
آئے پاس ان کے پیغمبران کے لے کر صاف احکام پس نہ تھا اللہ کہ ظلم کرتا ان پر اور لیکن

كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۷۰
تھے وہی جانوں اپنی پر ظلم کرتے (۷۰)

محاورہ ترجمہ:۔ کیا ان کو ان لوگوں کو خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے تھے، نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیم کی قوم اور مدین والے اور بستیاں جو الٹ دی گئی تھی، ان کے پاس ان کے پیغمبر صاف حکم لے کر پہنچے، سو! اللہ تو ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہ اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔ (۷۰)

تفسیر

اس سے پچھلی آیت میں بیان ہوا کہ ان منافقوں کی آخرت سے غفلت اور محض دنیا ہی کے عیش وعشرت میں پھنسے رہنے کا وہی حال ہے جو پہلے زمانے کے نافرمان لوگوں کا تھا آج ان لوگوں کا بھی وہی حال ہے، حالانکہ دنیا کا جتنا حصہ انہیں ملا ہے اور وہ یقیناً اس سے کم ہے جو ان سے پہلے لوگوں کو ملا تھا، مگر طرزِ زندگی ان کا وہی ہے جو ان کا تھا، دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنا اور اسی کی اُلجھنوں میں پھنسے رہنے کو زندگانی کا حاصل قرار دینا بالکل ویسا ہی ہے جیسے ان سے پہلے لوگوں کا تھا، آخر ان کو سوچنا چاہئے کہ ان کا انجام کیا ہوا، بھلا! یہ اس بات سے کس طرح نڈر ہو گئے کہ ان کے اوپر بھی آفتیں آسکتی ہیں جیسے ان پر آئیں، اس بات میں پہلے زمانوں کی خاص قوموں کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی گئی ہے۔

ارشاد ہے کہ: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان کے پاس ان قوموں کا حال نہ آچکا ہو جو ان کے اطراف قرب

وجوار میں گذار چکی ہیں قوم نوح نے سرکشی کی اور طوفان سے تباہ ہوئی، اور حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں صرف وہی لوگ بچے جو ایمان لے آئے تھے، عاد نے غرور اور تکبر سے کام لیا وہ آندھی سے فنا ہوئی، ثمود خود سر ہو گئے اور ایک غیبی چنگھاڑ (چیخ) سے ہلاک ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم پر بھی نظر کریں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے خلیل کے ساتھ سخت بدسلوکی کی یہاں تک کہ انہیں آگ میں پھینک کر مارنے کی کوشش کی، آپ کو ہجرت پر مجبور کیا مگر کیا وہ ظالم بادشاہ صحیح سلامت رہا؟ تاریخی کتابوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر مچھر مسلط کر دیا جو اس کی ناک میں گھس گیا، اللہ تعالیٰ نے ایسی سزا میں مبتلا کیا کہ مچھر کی تکلیف سے بچنے کے لئے سر پر جوتے مروانے پڑتے، ان کی قوم کا حال بھی ایسا ہی ہوا، اگرچہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا تفصیلی ذکر نہیں ملتا تاہم تباہ شدہ قوموں کی فہرست میں ان کا نام بھی موجود ہے۔

مدین والے جنہیں اصحاب الایکہ بھی کہتے ہیں زلزلہ اور گرج سے اوندھے منہ آرہے، ان سب کا ذکر ''سورۂ اعراف'' میں گذر چکا ہے اور آگے بھی آئے گا، ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر ''سورۂ بقرہ، آل عمران'' اور ''سورۂ انعام'' میں گزرا اور آگے بھی آئے گا ''**مُؤْتَفِكٰت**'' قوم لوط کی بستیوں کا نام ہے ان کو الٹ کر ان پر پتھر برسائے گئے ''سورۂ اعراف'' میں ان کا ذکر گزرا ہے۔

ارشاد ہے کہ: یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی اور آخرت سے غافل ہونے کی وجہ سے ہلاک ہوئے، ان پر ہم نے ظلم نہیں بلکہ خود انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا منافقوں کو ڈرنا چاہئے کہ ان کا حشر بھی کہیں ویسا ہی نہ ہو۔

مؤمنوں کی خصوصیتیں

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ

اور | مؤمن مرد | اور | مؤمن عورتیں | بعض ان کے | مددگار ہیں | بعض کے | حکم دیتے ہیں

وقف لازم

بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ

نیک کام کا | اور | روکتے ہیں | سے | برے کام | اور | قائم رکھتے ہیں | نماز | اور

يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ
دیتے ہیں زکوٰۃ اور فرمانبردار ہیں اللہ کے اور پیغمبراس کے کے یہی لوگ ہیں کہ رحم کرے گا ان پر

اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾
اللہ تحقیق اللہ زبردست حکمت والا ہے(۷۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، نیک بات سکھلاتے ہیں اور بری بات سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے پیغمبر کے حکم پر چلتے ہیں، وہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا، بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔(۷۱)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: ایمان والے مرد ہوں یا عورتیں سب کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے غمخوار ہمدرد اور مددگار رہوتے ہیں، جن باتوں میں سب کا بھلا ہے ان کے کرنے کا حکم کرتے ہیں اور جو باتیں انسان کے لئے تباہ کرنے والی ہیں، ان کو چھوڑ دینے کے لئے کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہر وقت یاد رکھتے ہیں اور اس کی یاد کے لئے وقت پر مل کر نماز ادا کرتے ہیں، کنجوسی نہیں کرتے بلکہ محتاجوں کی مدد کے لئے مال کا مقرر حصہ، یعنی: زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، سرکشی اور نافرمانی نہیں کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے اور اس کے پیغمبر کے حکم کے آگے سر جھکاتے ہیں، غرض! ان کی ہر عادت منافقوں کی عادت کا الٹ ہے؛ اس لئے یقیناً ان کا انجام بھی ان کے بالکل مخالف ہوگا، منافقوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی، اور ان پر اللہ تعالیٰ رحم کرے گا، اللہ تعالیٰ کی قوت سب سے بڑی ہے اور وہ ہر ایک کو اس کے مناسب بدلہ اور سزا دے گا۔

ایمان والے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور اخلاق وعادات میں ایک دوسرے کی مشابہت رکھتے ہیں جس طرح کافر کافر کا، منافق منافق کا اور بے دین بے دین کا رفیق ہوتا ہے، اسی طرح مؤمن مؤمن کا رفیق ہوتا ہے، کسی مؤمن کا دوست اور سرپرست کوئی کافر نہیں ہوسکتا، تو فرمایا: مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں اپنے اپنے دائرہ

کار میں رہتے ہوئے آپس میں مشابہت رکھتے ہیں اور ان میں بعض امور یہ ہیں کہ وہ نیکی کی تلقین کرتے ہیں، اور برائی کے کام سے منع کرتے ہیں، مؤمن مرد اور عورتوں کو جب بھی موقع ملتا ہے وہ اچھی بات کرتے ہیں، لہذا مؤمن مرد اور عورتیں ایمان کی دعوت دیتے ہیں مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں فرض کی تلقین کرتے اور شریعت سے ثابت اچھائی کی باتوں کا حکم کرتے ہیں اور جو چیزیں عقل اور شریعت کے نزدیک بری ہیں مثلاً: شرک، بدعت، نفاق، ظلم، وغیرہ ان سے روکتے ہیں، بداخلاقی، دھاندلی، فتنہ وفساد، جھوٹ، فریب اور فراڈ سے منع کرتے ہیں۔

آخر میں مؤمنوں کے بارے میں کہا گیا ہے "سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ" کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے گا۔

مؤمنوں کا انعام

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

مقرر کردیئے اللہ نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کیلئے ایسے باغات بہتی ہونگی سے نیچے ان کے

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَ

نہریں ہمیشہ رہیں گے میں اس اور مکانات صاف ستھرے میں باغوں جو ہمیشہ رہنے کے ہیں اور

رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾

ع ۹ ۱۵ خوشنودی کی اللہ سب سے بڑی ہے یہی وہ کامیابی ہے بڑی (۷۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اللہ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو باغوں کا وعدہ دیا ہے کہ ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں انہی میں رہا کریں اور ستھرے مکانوں کا رہنے کے باغوں میں اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی ہے یہی بڑی کامیابی ہے۔ (۷۲)

لفظی تحقیق: عَدْنٍ: ہمیشہ رہنے کی جگہ۔ عدن اس جگہ یا اس مکان کو کہتے ہیں جو آدمی کی اپنی مستقل رہائش گاہ ہو، کوئی سرائے ہوٹل، عارضی اقامت گاہ نہ ہو، آدمی کو اصلی خوشی جبھی ہوتی ہے جب آرام کی جگہ اس کی اپنی ہی مستقل رہنے کی ہو، ورنہ ہوٹلوں اور سراؤں میں عیش ہو بھی تو کتنے دن۔

تفسیر

اللہ تعالیٰ کے سچے دل سے ماننے والے مرد اور عورت اس دنیا کی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے اور اس کے پیغمبر کے حکم کے مطابق بسر کرنے کا پختہ ارادہ کر چکے اور دل میں ٹھان لی کہ کوئی کام جس کی اجازت شرع میں نہ ہو ہرگز نہ کریں گے، آپس میں ایک دوسرے کے نیک کاموں میں مدد کریں گے، لوگوں کو نیک کام کرنے کے لئے کہیں گے، برے کام سے روکیں گے، نماز کو وقت کی پابندی سے ادا کریں گے، ناداروں کی مدد کے لئے باقاعدہ زکوٰۃ ادا کریں گے، ان سب کا صلہ مؤمنوں کو یہ ملے گا کہ ہرے بھرے سایہ دار اور سیراب باغ انہیں ہمیشہ کے لئے دے دیئے جائیں گے، ان کے رہنے کے لئے صاف ستھرے سجے سجائے مکان اور محل ہوں گے، اور سب سے بڑھ کر یہ انعام ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انہیں یقین دلائے گا کہ میں تم سے راضی اور خوش ہوں اس سے بڑھ کر سعادت اور کامیابی کوئی نہیں، اور یہ صرف اس کا صلہ ہوگا کہ آدمی ایمان لاکر اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی فرمانبرداری کے لئے ہر طرح تیار ہوجائے جو کہنے میں تو آسان ہے لیکن کرتے وقت اس سے زیادہ مشکل کوئی چیز نہیں اگر دل میں اس کا سچا شوق نہ ہو۔

جنت کے ان پاکیزہ رہائش گاہوں میں اخلاق وعادات اور شکل وصورت کے اعتبار سے نہایت پاکیزہ بیویاں ہوں گی، وہ شخص کتنا سعادت مند ہوگا جس کو پاکیزہ بیوی، پاکیزہ مکان اور پاکیزہ کھانا پینا نصیب ہوگا، بہشت میں ان ظاہری نعمتوں کے علاوہ ایسی روحانی نعمتیں بھی نصیب ہوں گی جو سکون، راحت اور روحانی خوشی کا ذریعہ ہوں گی وہ کیا ہے؟ وہ اللہ تعالیٰ کو خوشنودی ہوگی، جو سب سے بڑی نعمت ہے، ظاہری نعمتیں عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ جنتیوں سے فرمائے گا، کیا میں تمہیں کچھ مزید عطا کروں؟ لوگ تعجب سے کہیں گے، کہ اے مولا کریم! آپ نے ہمیں وہ نعمتیں دی ہیں جو کسی کو نہیں دی ہوں گی اب اور کون سی نعمت باقی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں تمہیں اپنی خوشنودی اور رضا کی نعمت عطا کرتا ہوں اور یہ نعمت تم سے کبھی نہیں چھینی جائے گی میں تم سے آئندہ کبھی ناراض نہیں ہوں گا، چنانچہ ایمان والوں کی جتنی خوشی اس بات سے ہوگی کسی اور چیز سے نہیں ہوگی۔

جہاد کی ضرورت

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَ
اے　پیغمبر!　جہاد کریں　کافروں سے　اور　منافقوں سے　اور سختی کریں　پر ان　اور

مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ
ٹھکانا ان کا　دوزخ ہے　اور　برا ہے　وہ ٹھکانا　(۷۳)　قسمیں کھاتے ہیں　اللہ کی　نہیں　کہا انہوں نے

وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَ هَمُّوْا
اور　البتہ ضرور　کہا انہوں نے　کلمہ　کفر کا　اور　منکر ہو گئے　بعد　اسلام لانے ان کے کے　اور　قصد کر بیٹھے

بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ
اس کا جو　نہیں　پا سکے وہ

با محاورہ ترجمہ: اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں سے جہاد کریں اور ان پر سختی کریں اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔ (۷۳) اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے نہیں کہا اور بیشک انہوں نے کفر کا کلمہ کہا اور مسلمان ہو کر منکر ہو گئے اور اس چیز کا قصد کر لیا جو انہیں نہ ملی۔

تفسیر

اس آیت میں کافروں اور منافقوں کے ساتھ سختی کے برتاؤ کا حکم ہے، یعنی: ان کے ساتھ نرمی سے پیش نہیں آنا چاہئے بلکہ سختی کا معاملہ اختیار کرنا چاہئے، اسلام میں باہمی میل جول اور خوش اخلاقی کی فضا چاروں طرف سے چھائی ہوئی ہوتی ہے، اس میں ہر شخص ایک دوسرے کے لئے خوش اخلاقی اور وسعت ظرفی پر عمل پیرا ہوتا ہے، اور یہ ماحول پیغمبر ﷺ اپنے ارشادات اور طرزِ عمل سے عرب میں اور ان کے ذریعہ ساری دنیا میں قائم کرنا چاہتے تھے، مگر اس کے باوجود شریر لوگوں کو سختی سے اور ضرورت پڑے تو لڑائی کرکے دبانے کی

ضرورت ہے؛اس لئے ارشاد ہے کہ: شریر کافر جوکھلم کھلا دشمن ہیں، یوں نہ مانیں گے، یہ زیادہ شرارت کرنے پر دلیر ہوتے ہیں، ان کو ہر طرح سے رُعب میں رکھو، تا کہ یہ دبے رہیں اور جو کھلم کھلا نہیں لڑتے، ان سے لڑنے کی ضرورت نہیں لیکن اپنے برتاؤ سے ثابت کردو کہ وہ بدترین لوگ ہیں ان کی سزا آخرت میں دوزخ ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ: (سورۃ المنافقون: آیت:۱، پارہ :۲۸) اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں کہ منافق جھوٹے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں کئی موقعوں پر منافقوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی، یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: وہ قسمیں اٹھاتے ہیں، کہ انہوں نے یہ بات نہیں کی، حالانکہ انہوں نے کفر کا کلمہ بولا ہے اور اسلام لانے کے بعد کفر کیا ہے، گویا ایک غلط بات کہہ کر اس سے انکار کفر کے برابر ہے۔

اس سے پہلی آیت "يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ" میں پھر منافقوں کا ذکر ہے وہ اپنی مجلسوں میں کفریہ کلمات کہتے رہتے ہیں، پھر اگر مسلمانوں کو اس کی اطلاع ہوگئی تو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے کو بری الذمہ ثابت کرتے ہیں، اس آیت کے شان نزول میں بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک کی جنگ کے موقع پر ایک خطبہ دیا، جس میں منافقوں کی بدحالی اور برے انجام کا ذکر فرمایا، حاضرین میں ایک منافق جلاس بھی موجود تھا، اس نے اپنی مجلس میں جا کر کہا کہ محمد جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ سچ ہے تو ہم گدھوں سے بھی زیادہ بدتر ہیں، اس کا یہ کلمہ ایک صحابی عامر بن قیس رضی اللہ عنہ نے سن لیا تو کہا بے شک! پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ سچ ہے اور تم واقعی گدھوں سے بھی زیادہ بدتر ہو۔

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک کی جنگ کے سفر سے واپس مدینہ طیبہ پہونچے تو عامر بن قیس نے یہ واقعہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنایا اور جلاس اپنے کہے سے مکر گیا اور کہنے لگا کہ عامر بن قیس نے مجھ پر تہمت باندھی ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں کو حکم دیا کہ منبر نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کھڑے ہو کر قسم کھائیں، جلاس نے بے دھڑک جھوٹی قسم کھالی کہ

میں نے ایسا نہیں کہا، عامر جھوٹ بول رہے ہیں، حضرت عامر کا نمبر آیا تو انہوں نے بھی قسم کھائی اور پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے کہ یا اللہ! آپ اپنے پیغمبر پر وحی کے ذریعہ اس معاملے کی حقیقت کو واضح فرمادیں، ان کی دعا پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں نے آمین کہی، ابھی یہ لوگ اس جگہ سے ہٹے بھی نہیں تھے، جبرئیل امین وحی لے کر حاضر ہو گئے جس میں یہ آیت تھی۔

جلاس نے جب آیت سنی تو فوراً کھڑا ہو کر کہنے لگے کہ اے اللہ کے پیغمبر! اب میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ غلطی مجھ سے ہوئی تھی، اور عامر بن قیس نے جو کچھ کہا وہ سچ تھا، مگر اسی آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے مجھے توبہ کا بھی حق دیدیا ہے، میں اب اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو توبہ قبول فرمائی۔

فرمایا: "وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا" انہوں نے ایسی چیز کا ارادہ کیا جسے پا نہیں سکے، اس جملے کے پس منظر کے بارے میں مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ تبوک کی جنگ کے موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دو صحابہ عمار بن یاسر اور حذیفہ رضی اللہ عنہما کے ہمراہ قافلے سے الگ جا رہے تھے، راستے میں ایک تنگ درّہ آتا تھا، منافقوں کی ایک ٹولی نے منصوبہ بنایا کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس تنگ درّے میں داخل ہوں تو آپ کا کام تمام کر دیا جائے، رات کا وقت تھا وہ لوگ منہ لپیٹ کر ایک نالے پر بیٹھ گئے کہ جب آپ ادھر آئیں گے تو آپ پر پتھروں کی بارش کر دی جائے گی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعہ اس سازش کی خبر دیدی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ: اس قسم کے لوگ جہاں ملیں ان کو پکڑ لو، چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ان کو پالیا، ان کے اونٹوں کو مارا اور انہیں بھی بھاگنے پر مجبور کر دیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس واقعہ کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ان میں سے بارہ آدمی ہمیشہ کے لئے دوزخی ہیں، تین آدمیوں کو معذور قرار دیا اور آٹھ کے متعلق فرمایا کہ: ان کے جسموں میں ایسے پھوڑے نکلیں گے کہ اگر وہ سینے میں ظاہر ہوں تو ان کی جلن پیٹھ تک محسوس ہوگی، اس واقعہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: انہوں نے ایک کام کا ارادہ کیا مگر وہ پورا نہ کر سکے، اس آیت میں مذکورہ واقعہ کا پس منظر "سورۂ منافقون" میں بھی بیان کیا گیا ہے، کسی جہاد کے موقع پر ایک منافق اور ایک مہاجر صحابی آپس میں اُلجھ پڑے، جھگڑا لمبا ہو گیا، اور منافق کہنے لگا کہ واپس جا کر ہم ان ذلیل لوگوں کو مدینے سے نکال باہر کریں گے،

یہ ممکن نہ تھا وہ شخص خود ہی ذلیل ہوا اس کا اپنا بیٹا پکا سچا مسلمان تھا، اور باپ کی مخالفت کرتا تھا، یہ اس کے لئے بڑی اذیت ناک بات تھی، پھر یہ بھی کہ منافق لوگ عبد اللہ بن ابی کو اپنا سردار بنانا چاہتے تھے، مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان والوں کی موجودگی میں وہ اپنے ناپاک منصوبے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ناشکری کی سزا

وَ مَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ

اور نہیں بدلہ دیا انہوں نے مگر اس کا کہ مالدار کر دیا ان کو اللہ نے اور پیغمبر اس کے نے سے فضل اپنے پس اگر

يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا

باز آجائیں وہ ہوگا اچھا واسطے ان کے اور اگر پیٹھ موڑیں تو عذاب دے گا ان کو اللہ عذاب

اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ

دردناک میں دنیا اور آخرت میں اور نہیں واسطے ان کے میں ساری زمین سے ساتھی

وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

اور نہ مددگار (۷۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور انہوں نے صرف اس بات کا بدلہ دیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اور اس کے پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کے فضل (رزق) سے دیا، سو! اگر توبہ کریں تو ان کے حق میں بھلا ہے اور اگر نہ مانیں گے تو اللہ ان کی دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور روئے زمین پر کوئی ان کا نہ حمایتی ہے اور نہ مددگار۔ (۷۴)

تفسیر

پچھلی آیت میں جو حکم ہوا تھا یہاں ان آیتوں میں اسی مضمون کو پورا کر دیا گیا ہے، ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے فضل اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت ان کی حالت مالی اعتبار سے پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ درست ہوگئی

ہے، مال و دولت ان کے طفیل میں بہت کچھ مل گیا ہے اور امن و امان سے اسلام کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے ہیں، اس کے بدلے میں یہ احسان فراموش، مسلمانوں کو اور پیغمبر ﷺ کو اس قدر ستاتے ہیں ان حالات میں یہ کسی رعایت کے حق دار نہیں، ان کو امن و امان سے رہنے کی قدر معلوم ہونی چاہئے، اگر اپنی شرارتوں سے باز آجائیں تو خیر! ورنہ دنیا اور آخرت میں ان کو ایسا سخت عذاب ملے گا کہ چیخ چیخ اٹھیں گے اور روئے زمین پر ان کا کوئی دوست ہوگا نہ مددگار۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: یہاں فضل سے مراد غنیمت کا مال ہے کہ پیغمبر ﷺ نے بڑی مقدار میں غنیمت کا مال مسلمانوں میں تقسیم کیا، اس کے علاوہ وہ مسلمانوں کی تجارت میں بھی بڑی ترقی ہوئی، انہوں نے بڑا نفع کمایا اور مالدار بن گئے۔

فرمایا: منافقوں کی ان ساری حرکتوں کے باوجود "فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ" اگر توبہ کرلیں تو یہ ان کے لئے بہتر ہوگا، اب بھی سنبھل جائیں اور منافقت چھوڑ کر کے صحیح ایمان اختیار کرلیں تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمادیگا، اور اگر منہ موڑے تو اللہ تعالیٰ انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور وہ عذاب ایسا ہوگا، جو اس دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں تو بہرحال ہے ہی، چنانچہ لوگوں نے دیکھا کہ منافقین اس دنیا میں ہی اپنی کرتوتوں کی وجہ سے بار بار ذلیل و خوار ہوئے اور اپنی کسی بھی سازش میں کامیاب نہ ہوسکے، فرمایا: آخرت کا عذاب تو ہمیشہ کے لئے ہے اگر مرتے وقت منافقت ہی ساتھ لے کر گئے تو کافروں کی طرح ہمیشہ کی طرح دوزخی ہونگے، اس کے لئے زمین میں کوئی حمایتی اور مددگار نہیں ہوگا اب تو یہ لوگ سازشیں کرتے ہیں، کبھی کسی فریق کی طرفداری کرتے ہیں اور کبھی کسی کی، مگر بالآخر ایسی صورت حال پیدا ہونے والی ہے جب ان کا کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا، اگر یہ منافقت کو نہیں چھوڑیں گے تو ان کا یہی حال ہوگا، لہذا بہتر یہ ہے کہ اب بھی توبہ کرلیں اور اسلام میں پورے پورے داخل ہوجائیں۔

نفاق کی جڑ کنجوسی

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنۡ اٰتٰنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ
اور بعض ان میں سے وہ ہیں کہ عہد کیا اللہ سے البتہ اگر دے وہ ہم کو سے فضل اپنے توصدقہ دیں ہم اور

لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝۷۵ فَلَمَّاۤ اٰتٰهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا
ضرور ہو جائیں گے ہم میں سے نیک لوگوں (۷۵) پھر جب دیا ان کو سے فضل اپنے تو بخل کیا

بِهٖ وَ تَوَلَّوۡا وَّ هُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ۝۷۶ فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا فِىۡ
اس میں اور پیٹھ پھیر گئے اس حال میں کہ وہ ٹلا کرتے تھے (۷۶) پس بھر دیا (اللہ نے) نفاق میں

قُلُوۡبِهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَ بِمَا
دلوں ان کے تک کہ اس دن ملیں وہ اس سے بوجہ خلاف کرنے کے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا انہوں نے اور اس وجہ سے کہ

بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ۝۷۷
اس وجہ سے کہ تھے وہ جھوٹ بولتے (۷۷)

بامحاورہ ترجمہ: اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر وہ اپنے فضل سے ہمیں دے تو ہم ضرور خیرات کریں اور نیکوں میں ہوں۔ (۷۵) پھر جب اس نے انہیں اپنے فضل سے دیا تو اس میں کنجوسی کی اور پھر گئے ٹلا کر۔ (۷۶) اس کے اثر نے ان کے دلوں میں نفاق رکھ دیا اس دن تک کہ وہ اس سے ملیں گے؛ اس لئے کہ انہوں نے جو وعدہ اللہ کے ساتھ کیا تھا اس کے خلاف کیا۔ (۷۷)

لفظی تحقیق: اَعۡقَبَ: پیچھے لایا۔ ماضی کا صیغہ ہے جس کا مصدر "اَعۡقَاب" ہے، جو "عَقَب" سے بنا ہے "عَقَب" کے معنی پیچھے کے ہیں، "اَعۡقَاب" ایک بات کے پیچھے دوسری بات پیدا کرنا۔

تفسیر

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ: (اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا) یہ آیت

ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے، جو ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابوامامہ باہلی کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص ثعلبہ بن ابی حاطب نے پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر یہ درخواست کی کہ آپ دعا کریں کہ میں مال دار ہوجاؤں، آپ نے فرمایا کہ: کیا تمہیں میرا طریقہ پسند نہیں، قسم ہے! اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میں چاہتا تو مدینہ کے پہاڑ سونا بن کر میرے ساتھ پھرا کرتے، مگر مجھے ایسی مالداری پسند نہیں، یہ شخص چلا گیا مگر دوبارہ پھر آیا اور پھر یہی درخواست اس وعدے کے ساتھ پیش کی کہ اگر مجھے مال مل گیا تو ہر حق والے کو اس کا حق پہنچاؤں گا، پیغمبر ﷺ نے دعا کردی جس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ اس کی بھیڑ بکریوں میں بے پناہ زیادتی شروع ہوئی یہاں تک کہ مدینہ کی جگہ اس کے لئے تنگ ہوگئی تو باہر چلا گیا اور ظہر عصر کی دو نمازیں مدینہ میں آکر آپ کے ساتھ پڑھتا تھا، باقی نمازیں جنگل میں جہاں اس کا یہ مال تھا وہیں ادا کرتا تھا۔

پھر انہی بھیڑ بکریوں میں اور زیادتی اتنی ہوگئی کہ یہ جگہ بھی تنگ ہوگئی اور شہر مدینہ سے دور جا کر کوئی جگہ لی، وہاں سے صرف جمعہ کی نماز کے لئے مدینہ میں آتا، پنجگانہ نمازیں وہیں پڑھنے لگا، پھر اس کے مال میں اور زیادتی ہوگئی تو یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی اور مدینہ سے بہت دور چلا گیا، جہاں جمعہ اور جماعت سب سے محروم ہوگیا۔

کچھ عرصہ کے بعد پیغمبر ﷺ نے لوگوں سے اس کا حال دریافت کیا تو لوگوں نے بتلایا کہ اس کا مال اتنا زیادہ ہوگیا کہ شہر کے قریب میں اس کی گنجائش ہی نہیں؛ اس لئے کسی دور جگہ پر جا کر اس نے قیام کیا ہے، اور اب یہاں نظر نہیں آتا، پیغمبر نے یہ سن کر تین مرتبہ فرمایا "ویح ثعلبة" یعنی: ثعلبہ پر افسوس ہے! ثعلبہ پر افسوس ہے!

اتفاق سے اسی زمانہ میں زکوٰۃ کا حکم ہوگیا، جس میں پیغمبر ﷺ کو مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیا گیا "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" (سورۃ التوبۃ: آیت نمبر: ۱۰۲) آپ نے جانوروں کی زکوٰۃ کا مکمل قانون لکھوا کر دو شخصوں کو صدقہ کے عامل کی حیثیت سے مسلمانوں کے جانوروں کی زکوٰۃ وصول کرنے کے

لئے بھیج دیا، اور ان کو حکم دیا کہ ثعلبہ بن حاطب کے پاس بھی پہونچیں اور بنی سلیم کے ایک اور شخص کے پاس جانے کا بھی حکم دیا۔

یہ دونوں جب ثعلبہ کے پاس پہونچے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان دکھایا تو ثعلبہ کہنے لگا کہ یہ تو جزیہ ہو گیا، جو غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے اور پھر کہا کہ اچھا اب تو آپ جائیں جب واپس ہوں تو یہاں آجائیں یہ دونوں چلے گئے۔

اور دوسرے شخص سلیمی نے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان سنا تو اپنے جانوروں میں سے جو بہتر جانور تھے لے کر خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان دونوں قاصدوں کے پاس پہنچ گئے، انہوں نے کہا کہ ہمیں تو حکم یہ ہے کہ جانوروں میں اعلیٰ چھانٹ کر نہ لیں بلکہ درمیانہ وصول کریں؛ اس لئے ہم تو یہ نہیں لے سکتے، سلیمی نے اصرار کیا کہ میں اپنی خوشی سے یہی پیش کرنا چاہتا ہوں یہی جانور قبول کر لیجئے۔

پھر یہ دونوں حضرات دوسرے مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرتے ہوئے واپس آئے تو پھر ثعلبہ کے پاس پہنچے تو اس نے کہا کہ لاؤ زکوٰۃ کا وہ قانون مجھے دکھلاؤ، پھر اس کو دیکھ کر یہی کہنے لگا کہ یہ تو ایک قسم کا جزیہ ہو گیا، جو مسلمانوں سے نہیں لینا چاہئے، اچھا اب تو آپ جائیں میں غور کروں گا پھر کوئی فیصلہ کرونگا۔

جب یہ دونوں حضرات واپس مدینہ طیبہ پہنچے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے حالات پوچھنے پر پہلے ہی پھر وہ کلمہ دہرایا جو پہلے فرمایا تھا "یاویح ثعلبة! یاویح ثعلبة! یاویح ثعلبة!" یعنی: ثعلبہ پر سخت افسوس ہے، یہ جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا، پھر سلیمی کے معاملہ پر خوش ہو کر اس کے لئے دعا فرمائی، اس واقعہ پر یہ آیت اتری "وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ" یعنی: ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کو مال عطا فرمادیں گے تو وہ صدقہ خیرات کریں گے اور امت کے نیک لوگوں کی طرح سب حق داروں، رشتہ داروں اور غریبوں کا حق ادا کریں گے، پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے مال دیا تو بخل کرنے لگے، اور اللہ تعالیٰ اور پیغمبر کی اطاعت سے پھر گئے۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ: یعنی: اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بدعملی اور بدعہدی کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں نفاق اور پختہ کر دیا کہ اب ان کو توبہ کی توفیق ہی نہ ہوگی۔

فائدہ:۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض برے عملوں کی نحوست ایسی ہوتی ہے کہ توبہ کی توفیق چھن جاتی ہے "نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْهُ"۔

ابن جریر نے حضرت ابوامامہ کی تفصیلی روایت جو ابھی ذکر کی گئی ہے اس کے آخر میں لکھا ہے کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ثعلبہ کے لئے "یاویح ثعلبۃ!" تین مرتبہ فرمایا تو اس مجلس میں ثعلبہ کے رشتہ دار بھی موجود تھے، یہ سن کر ان میں سے ایک آدمی فوراً سفر کر کے ثعلبہ کے پاس پہنچا، اور اس کو ملامت کی اور بتلایا کہ تمہارے بارے میں قرآن کریم کی آیت اتر گئی ہے، یہ سن کر ثعلبہ گھبرایا اور مدینہ حاضر ہو کر درخواست کی کہ میری زکوٰۃ قبول کر لی جائے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مجھے حق تعالیٰ نے تمہاری زکوٰۃ قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے یہ سن کر ثعلبہ اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ تو تمہارا اپنا عمل ہے میں نے تمہیں حکم دیا تھا تم نے نہیں مانی، اب تمہاری زکوٰۃ قبول نہیں ہو سکتی، ثعلبہ ناکام واپس ہو گیا اور اس کے کچھ دن بعد ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو ثعلبہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میری زکوٰۃ قبول کر لیجئے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں کی تو میں کیسے قبول کر سکتا ہوں۔

پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ثعلبہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہی درخواست کی اور وہی جواب ملا جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا، پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مر گیا" نعوذ باللہ من سیئات الاعمال" (اللہ تعالیٰ ہمیں برے عملوں سے اور اس کے برے انجام سے بچائے) آمین۔

احکام و مسائل

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ثعلبہ توبہ تائب ہو کر حاضر ہو گیا تو اس کی توبہ کیوں قبول نہیں کی گئی، وجہ

ظاہر ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کے ذریعہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ اب بھی اخلاص کے ساتھ توبہ نہیں کر رہا ہے، اس کے دل میں منافقت موجود ہے محض وقتی طور پر مسلمانوں کو دھوکہ دے کر راضی کرنا چاہتا ہے؛ اس لئے قبول نہیں اور جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو منافق قرار دیدیا تو بعد کے خلفاء کو اس کی زکوٰۃ قبول کرنے کا حق نہیں رہا، کیونکہ زکوٰۃ کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے، البتہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد چونکہ کسی شخص کے دل کا نفاق قطعی طور پر کسی کو معلوم نہیں ہوسکتا؛ اس لئے آئندہ کا حکم یہی ہے کہ جو شخص توبہ کر لے اور اسلام وایمان کا اعتراف کر لے اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے خواہ اس کے دل میں کچھ بھی ہو۔

نفاق کی علامت

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ

کیا نہیں جانا انہوں نے کہ اللہ جانتا ہے بھید ان کے اور مشورے ان کے اور یہ کہ اللہ خوب جانتا ہے

الْغُيُوْبِ ﴿٧٨﴾ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي

چھپی ہوئی باتوں کو (۷۸) وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں ان پر جو فراخ دلی کرتے ہیں میں سے مسلمانوں اندر

الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ

صدقات کے اور ان پر جو نہیں پاتے مگر مزدوری اپنی پس ہنسی کرتے ہیں

مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٩﴾

میں سے ان ہنسی کی ہے اللہ نے ان سے اور واسطے ان کے عذاب ہے دردناک (۷۹)

بامحاورہ ترجمہ:- کیا وہ نہیں جان چکے کہ اللہ ان کے بھید اور ان کے مشورے جانتا ہے اور اللہ چھپی ہوئی باتوں کو خوب جانتا ہے۔ (۷۸) وہ لوگ طعنے دیتے ہیں ان مسلمانوں کو جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور ان کو جو نہیں پاتے مگر اپنی محنت کا، پھر ان سے ٹھٹھا کرتے ہیں اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (۷۹)

لفظی تحقیق: اَلْمُطَّوِّعِیْنَ: کشادہ دلی کرتے ہیں۔ "مُطَّوِّعٌ" کی جمع ہے "اَطَّوَّعٌ" سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اس کا مادہ: ط،و،ع ہے "طوع" کے معنی کوئی کام دل سے اور خوشی سے کرنا، گوفرض نہ ہو "اَطَّوَّعٌ تطوع" کی دوسری شکل ہے اور یہ لفظ "سورۂ بقرہ" میں گذر چکا ہے۔

تفسیر

منافقوں کی پہچان یہ ہے کہ ظاہر برتاوا اچھا رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ اس سے سب خوش رہیں اور وہ ظاہر میں سب کو خوش رکھ کر دل میں کسی کی بابت انتہائی برائی کے منصوبے تیار کرتے رہیں، ظاہر ہونے پر چکنی چپڑی باتیں بنا کر مخالف کو منالیں، لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے ایسا کر کے الّو بنا رکھا ہے ان کے دل کے بھید کوئی نہیں جانتا ایک فقط اللہ تعالیٰ چھپی ہوئی باتوں سے واقف ہے۔

اس آیت میں ارشاد ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے؛ اس لئے کہ یہ بے خوف ہیں کہ ان کے دل کے بھید کوئی نہیں جانتا ایک صرف اللہ تعالیٰ چھپی ہوئی باتیں جانتا ہے جب اس کا انکار کر بیٹھے پھر اب کس کا ڈر، پیٹھ پیچھے ہر ایک کی برائی ان کا شیوہ ہونا ہی چاہئے، چنانچہ جو دل کھول کر پیسہ دے اسے کہتے ہیں کہ لہو لگا کر شہیدوں میں نام کرتا ہے کہ ہم بھی ہیں پانچویں سوار۔

یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ڈھیل دے رکھی ہے وہ ان کے بھید جانتا ہے اور انجام کار وہ سخت عذاب میں پکڑے جائیں گے، لیکن دنیا کے ظاہری حال سے دھوکہ کھائے ہیں اور انہیں جانتے کہ وہ اپنی جڑ آپ کاٹ رہے ہیں۔

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک کی جنگ کے لئے اعلان فرمایا تو بعض مالدار مسلمانوں نے بہت زیادہ مال آپ کی خدمت میں پیش کیا، بعض کمزور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین محنت مزدوری کر کے گزر اوقات کرتے تھے، انہوں نے اپنی حیثیت کے مطابق مالی تعاون کیا، حضرت عبدالرحمن بن عوف جلیل القدر صحابی ہیں آپ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، یعنی: ان دس صحابہ کرام میں سے ہیں جن کو ایک ہی حدیث میں جنت کی خوشخبری دی گئی ہے، آپ کا

تعلق قریش خاندان سے ہے، وسیع تجارت تھی، اور اللہ تعالیٰ نے بڑا مال و دولت عطا فرمایا تھا، آپ نے تبوک کی جنگ کے لئے چار ہزار دینار پیش کئے، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اس وقت میرے پاس کل آٹھ ہزار دینار تھے جن میں سے آدھے آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے، مالدار صحابہ میں سے عاصم بن عدن عجلانی کا تعلق مدینہ کے انصار سے تھا، آپ کے کھجوروں کے بہت سے باغات تھے، انہوں نے ایک موقعہ پر بطور صدقہ ایک سو وسق کھجوریں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں پیش کیں کہ یہ صدقہ ہے آپ اسے ضرورت مندوں میں تقسیم فرمادیں، یادرہے کہ! ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے، اور ایک صاع چار کلو ہے، اس حساب سے وہ کھجوریں چھ سو من تھیں دوسری طرف ابوعقیل انصاری تھے انہوں نے بیوی سے پوچھا گھر میں کچھ ہے؟ کہا کچھ بھی نہیں، انہوں نے رات بھر مزدوری کر کے ایک صاع کھجوریں حاصل کی جن میں سے آدھی گھر میں دیدیں اور آدھی لا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیں۔

اب منافقوں نے اپنی خباثت کا اظہار شروع کیا، جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر مال پیش کیا، ان کے متعلق کہنے لگے کہ یہ لوگ دکھاوا کر رہے ہیں اور اپنا نام پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور جس غریب آدمی نے صرف آدھا صاع کھجور پیش کیں اس کے متعلق کہنے لگے کہ یہ تو لہو لگا کر شہیدوں میں نام لکھوانا چاہتا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابوعقیل سے فرمایا: تم نے سخت محنت کر کے یہ کھجوریں مزدوری حاصل کی ہیں؛ اس لئے یہ بڑی بابرکت ہیں انہیں پورے ڈھیر پر بکھیر دو تا کہ سارا مال برکت والا ہو جائے، بہر حال پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ میں نہ تو دکھاوا اور نہ ان کی نیت میں کوئی خرابی تھی بلکہ وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اپنی طاقت کے مطابق خرچ کرتے تھے، مگر منافقین ان پر طرح طرح سے طعن کرتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان فرمائی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ: وہ لوگ جو دل کھول کر صدقہ کرنے والے مؤمنوں پر طعن کرتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کا مذاق اڑاتے ہیں، یعنی: ان کے اس مذاق اڑانے کی سزادیں گے اور یہ منافق لوگ ان غریب اور نادار مسلمانوں پر بھی طعنہ بازی کرتے ہیں جن کے پاس سوائے اپنی مزدوری کے کچھ نہیں ہوتا، تو یہ منافق ان کو بھی طعنہ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان منافقوں کو ان ناداروں کے مذاق اڑانے کی بھی سزادیں گے۔

"سورۂ بقرہ" میں بھی گذر چکا ہے کہ منافق جب مؤمنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں مگر جب اپنے منافق ساتھیوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں ہم دل سے تو ایمان نہیں لائے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بھی ان کے ساتھ مذاق کرتا ہے، یعنی: ان کے مذاق اڑانے کی سزا دیتا ہے۔

بخشش کے لئے ایمان شرط ہے

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ

بخشش مانگ واسطے ان کے یا نہ بخشش مانگ واسطے ان کے اگر تو بخشش مانگے گا واسطے ان کے ستر

مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ

بار تو بھی ہرگز نہ بخشے گا اللہ ان کو یہ اس لئے کہ وہ کافر ہوئے اللہ سے اور

۱۰ ع ۸ ۱۶ رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

پیغمبر اس کے سے اور اللہ نہیں راہ دکھاتا ان لوگوں کو جو نافرمان ہیں (۸۰)

با محاورہ ترجمہ:۔ آپ ان کے لئے بخشش مانگیں یا نہ مانگیں اگر آپ ان کے لئے ستر بار بخشش مانگیں گے تو بھی اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا یہ اس واسطے کہ وہ اللہ سے اور اس کے پیغمبر سے منکر ہوئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو راستہ نہیں دکھاتا۔(۸۰)

تفسیر

منافقوں نے مدینہ کے اندر مسلمانوں کو بہت ستایا، یہ بدنصیب لوگ اسلام کے خلاف لوگوں کو اکساتے پھرتے، لیکن جب پوچھ گچھ ہوتی تو صاف مکر جاتے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے بعید تھا کہ وہ کسی کو بغیر ثبوت

صرف شبہ پر سزا دیں، آخر جب ان کی چالبازیاں حد سے گزر گئیں تو قرآن حکیم کی آیتوں میں ان کی بدکرداریوں سے آگاہ کیا گیا، چنانچہ اس سے پہلی آیتوں میں مسلسل انہیں کی دھوکہ بازیوں کا بیان چلا آرہا ہے، اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اشارتاً ان کے ساتھ میل جول کم کرنے کو کہا گیا ہے۔

ارشاد ہے کہ: ان کی خراب عادتیں حد سے گزر چکی ہیں ان کے لئے مغفرت کی دعا بے سود ہے، ان پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار پڑ چکی ہے، اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں تو بھی اللہ تعالیٰ ان کو بخشنے والے نہیں، یہ آپ کے سامنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو کیا ہے؟ ان کے دل میں ذرا بھی ایمان نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں نہ اس کے پیغمبر کو کچھ سمجھتے ہیں، جب ان کا دل اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کو مانتا ہی نہیں تو انہیں ان کی شان میں گستاخیاں کرنے سے روکنے والی کون سی چیز ہوسکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سیدھا راستہ نہیں دکھاتا، جو بے دھڑک اس کی نافرمانی کرتے ہیں۔

مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ: اس آیت سے آپ سمجھ گئے کہ منافقوں سے میل جول کم کرنے کی طرف اشارہ ہے، پھر بھی مدینہ طیبہ میں اس آیت کے اترنے کے بعد عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو آپ نے اس کے لئے بخشش کی دعا فرمائی، نماز جنازہ پڑھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو اس آیت کی طرف توجہ دلائی تو آپ نے فرمایا: بخشانہ بخشا اللہ تعالیٰ کا کام ہے مجھے صاف طور پر منع نہیں کیا گیا؛ اس لئے مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں اس کے بعد ایک اور آیت اتری جس میں آپ کو صاف طور پر منع کردیا گیا، پھر آپ نے کبھی بھی منافقوں کے لئے دعائے مغفرت نہ کی۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ: (آپ منافقوں کے لئے بخشش کریں یا نہ کریں) یعنی: اگر آپ ستر مرتبہ بھی ان کے لئے استغفار کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا، مطلب یہ ہے کہ آپ کتنی زیادہ دفعہ بھی ان منافقوں کے لئے بخشش کی دعا کریں، اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔

امام ابوبکر ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر "احکام القرآن" میں لکھا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا کرنے سے منع نہیں فرمایا تھا؛ اس لئے مصلحت اسی میں تھی کہ آپ ان کے لئے مغفرت کی دعا کرتے، منافقوں

کے حق میں دعا کی قطعی ممانعت بعد میں آئی تھی جس کا ذکر اگلے رکوع میں آرہا ہے، لہٰذا اس موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازہ پڑھنے اور دعا کرنے کا اثر یہ ہوا کہ عبداللہ بن ابی کے قبیلہ کے ایک ہزار افراد مسلمان ہوگئے، انہوں نے جان لیا کہ اتنے کریمانہ اخلاق کا مالک ایک پیغمبر ہی ہوسکتا ہے جس نے اپنے ایسے دشمن پر مہربانی فرمائی جو ہمیشہ آپ کی عیب جوئی کرتا تھا اور دین کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا تھا۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے پیغمبر! اگر آپ ان منافقوں کے لئے ستر مرتبہ بھی بخشش کی دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہرگز قبول نہیں کرے گا، کیونکہ انہوں نے کفر کیا ہے، انہوں نے خدا کے ایک ہونے کو تسلیم نہیں کیا، اس کے پیغمبر پر ایمان نہیں لائے، بخشش کا مدار تو ایمان ہے اگر ایمان ہی نہیں تو بخشش کی امید کیسے کی جاسکتی ہے؟ جو شخص اللہ تعالیٰ کے فرشتوں، اس کی اتاری ہوئی کتابوں، اچھی اور بری تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا، وہ نجات کا حق دار کیسے ہوسکتا ہے؟ تو فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا، کیونکہ انہوں نے کفر کیا، اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو راہ نہیں دکھاتا جو فسق پر اڑے ہوئے ہیں، انہیں سیدھا راستہ نصیب نہیں ہوسکتا، جب یہ دنیا سے جاتے ہیں تو کفر کی حالت میں جاتے ہیں اور بالآخر دوزخ کا شکار ہوجاتے ہیں ان کے حصے میں ہمیشہ کے لئے ناکامی آتی ہے تو کفر کی حالت میں جاتے ہیں اور بالآخر دوزخ کا شکار ہوجاتے ہیں، ان کے حصے میں ہمیشہ کے لئے ناکامی آتی ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کی نافرمانی کرنے والے ہدایت کے حقدار نہیں بنتے۔

یہاں منافقوں کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمایا گیا کہ آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں برابر ہے، اور کتنا ہی استغفار کریں ان کی مغفرت نہیں ہوگی، اس کا پورا بیان آگے آنے والی آیت " لَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ " کے تحت آئے گا۔

منافقوں کی پرکھ جہاد ہے

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْٓا اَنْ

خوش ہوئے | پیچھے رہنے والے | بیٹھ رہنے سے اپنے | خلاف | پیغمبر | اللہ کے | اور ناپسند کی یہ بات | کہ

يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا
جہاد کریں سے مالوں اپنے اور جانوں اپنی سے میں راہ اللہ کی اور کہا انہوں نے مت

تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ
ہلو جگہ سے میں گرمی

بامحاورہ ترجمہ:۔ پیچھے رہنے والے اپنے پیغمبر سے جدا ہو کر بیٹھے رہنے سے خوش ہو گئے اور اس سے گھبرائے کہ اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں لڑیں اور بولے مت سفر کرو گرمی میں۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: ان کا دل تو مسلمانوں کے ساتھ کبھی ہوا ہی نہ تھا تبوک کی جنگ کے اس موقعہ پر جان اور مال دونوں لے کر جہاد کے لئے نکلنے کا حکم ہوا تو انہوں نے دل چھوڑ دیا اور بہانے گھڑ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر پر ٹھہرنے کی اجازت مانگنے آ کھڑے ہوئے، آپ نے انہیں سچا قرار دے کر اجازت دیدی تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اور لوگوں سے کہنا شروع کیا، بھلا! ایسی شدت کی گرمی میں جنگلوں میں سفر کرنا کس نے بتایا ہے۔

ذرا غور فرمایئے! سارے مسلمان اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے حکم پر جہاد کے لئے مل کر کوشش اور تیاری کر رہے ہیں، اور منافق لوگ مختلف حیلے بہانے بنا کر پیچھے رہ گئے۔

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخلص ساتھیوں کے ساتھ تبوک کی جنگ کے لئے روانہ ہو گئے تو منافق لوگ بڑے خوش ہوئے کہ وہ حیلے بہانے بنا کر کے اس سفر سے بچ گئے ہیں جو چلے گئے ہیں ان کا تو صحیح سلامت واپس لوٹنا مشکل ہے، لہٰذا ہم اچھے رہے جو ان کے ساتھ نہیں گئے۔

سورت کے آخری حصہ میں آتا ہے کہ ایمان والوں کے لئے کسی طرح مناسب نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر تو جنگلوں اور صحراؤں کی مشکلات برداشت کرے اور وہ گھروں میں آرام سے ٹھہرے رہیں ایسا کرنے والا مؤمن نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ منافق ہوگا، اور یہ لوگ اس منافقت کی وجہ سے دنیا میں ذلیل ورسوا ہوئے اور آخرت

میں عذاب کے حق دار ٹھہرے۔

دوزخ کی آگ بہت سخت اور تیز ہے

قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَلْيَضْحَكُوْا
کہہ دیجئے آگ دوزخ کی زیادہ تیز ہے گرمی میں اگر ہوتے وہ سمجھ رکھتے (۸۱) پس! اب ہنس لیں وہ
قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾
تھوڑا اور پھر روئیں بہت بدلہ اس کا جو تھے وہ کمائی کرتے (۸۲)

بامحاورہ ترجمہ: آپ کہہ دیجئے دوزخ کی آگ بہت سخت گرم ہے اگر ان کو سمجھ ہوتی۔(۸۱) سو! وہ ہنسیں تھوڑا اور روئیں بہت، بدلہ اس کا جو وہ کماتے تھے۔(۸۲)

تفسیر

مدینے کے منافق ہر طرح سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے تیار رہتے تھے، وہ مسلمانوں کی بیرونی دشمنوں سے ساز باز کر کے مسلمانوں کو مٹانا چاہتے تھے، ان کی یہ تمنا تھی کہ شام والے ہمارے ملک میں چڑھائی کر کے مسلمانوں کو ملیامیٹ کر دیں اور پھر ہماری بن آئے اور ہم ان کے بل پر مزے سے دندناتے پھریں، اسلام نے اس وقت ان منافقوں کا ایسا علاج پیش کیا جس کو آج کل ساری دنیا مان رہی ہے بلکہ اس پر عمل کر رہی ہے، وہ علاج یہ تھا کہ منافقوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور مخلصوں اور خیر خواہوں کو ایک مرکز پر متحد کر کے جمع کر لیا جائے، منافق آگے چل کر خود بخود بیٹھ رہیں گے۔

ارشاد ہے کہ: یہ گرمی کی وجہ سے جنگ کے لئے نکلنا نہیں چاہتے، اچھا انہیں چھوڑ و اور مخلص لوگوں سے کہو کہ مالی اور جانی قربانی کا یہی وقت ہے تیار ہو جاؤ! اور منافقوں سے کہو کہ اچھا تم اس موسمی گرمی سے بچ لو اور سایوں میں آرام کرلو، اپنا مال اپنے پاس رکھو ہمیں نہ تمہارے مال کی ضرورت ہے نہ تمہاری، لیکن یہ یاد رکھو کہ! یہ

آرام عارضی ہے آگے چل کر تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، آج تمہارے لب پر جو ہنسی ہے یہ تھوڑی دیر کی ہے، اس کے بدلے آگے چل کر تمہارے لئے سوا رونے کے کچھ نہیں، رہی گرمی، سوائے عقل کے دشمنو! دوزخ کی آگ کی گرمی اس سے کہیں زیادہ سخت ہے، یہ گرمی تو عارضی ہے ختم ہوجائے گی لیکن وہ ہمیشہ کی ہے اور کبھی نہ چھوڑے گی، ذرا سوچو تو کہ! اس دنیا کی تپش برداشت کر لینا آسان ہے یا دوزخ کی گرمی میں جھونک دیا جانا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: دوزخ کی آگ اس دنیا کی آگ سے ستر گناہ زیادہ گرم ہے ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ابتداء میں دوزخ کو ایک ہزار سال تک بھڑکایا گیا تو اس کا رنگ سرخ ہوگیا، پھر اس کو مزید ایک ہزار سال تک بھڑکایا گیا تو یہ سفید ہوگئی، جب تیسری دفعہ اسے ہزار برس تک جلایا گیا تو اس کی رنگت سیاہ ہوگئی، چنانچہ جنت اور دوزخ اس وقت بھی موجود ہیں اور دوزخ کی رنگت سیاہ ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دوزخ کی آگ سے اس آگ سے ستر گنا تیز ہے اگر جہاد جیسی عبادت دوزخ کی آگ اتنی تیز ہے کہ آج کوئی انسان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا، فرمایا: اگر دوزخ کی آگ کا ایک انگارہ مشرق میں پڑا ہو تو مغرب والے بھی اس سے جل اٹھیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلص کام کرنے والوں کو اپنی طاقت بڑھانے کی تدبیریں کرنی چاہئیں، مخالفوں سے اُلجھ کر سوا وقت ضائع کرنے کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، اگر مخلص لوگ متحد ہوگئے تو منافق خود بخود بیٹھ جائیں گے۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا الخ: (پس چاہئے کہ یہ منافق تھوڑی مدت کے ہنس لیں اور بہت زیادہ روئیں) مراد یہ ہے کہ اس دنیا کی ہنسی خوشی کا وقت بہت تھوڑا ہے، یہ جلد ہی ختم ہوجائے گا اور آگے چل کر رونے کا مقام آئے گا، اور یہ اس لئے کہ یہ بدلہ ہے اس چیز کا جو وہ برائیاں کماتے تھے، یعنی: انہیں اپنے برے عملوں کی وجہ سے دوزخ کی آگ میں جلنا ہوگا، ''مسند ابویعلیٰ'' کی روایت میں آتا ہے کہ دوزخ والے اتنا روئیں گے کہ ان کے آنسوؤں کی وجہ سے آنکھوں پر گڑھے پڑ جائیں گے، اور چہرے پر نالیاں بن جائیں گی، جب آنکھوں کا پانی ختم ہوجائے گا تو خون بہنے لگے گا، ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ دوزخ والے لمبے عرصے تک روتے رہیں گے،

یہاں تک کہ آنسوؤں کی جگہ پیپ جاری ہو جائیگی، اور دوزخ کے داروغے ان سے کہیں گے، اے بدبختو! رونے کا مقام تو دنیا میں تھا، اگر وہاں روتے تو آج بچ جاتے، چونکہ وہاں تم ہنستے رہے لہذا آج روتے ہو۔

پھر دوزخ والے جنتیوں کو پکار کر کہیں گے کہ اے جنت والو! ہم نے حشر کا پورا عرصہ پیاس کی شدت میں گزارا ہے اور آج بھی سخت پیاس میں ہیں، خدا کے لئے پانی کا ایک گھونٹ ہی دیدو، مگر دوزخ کے داروغے کہیں گے، تمہیں اسی حالت میں رہنا ہوگا، روایت میں آتا ہے کہ دوزخ والے چالیس سال تک مدد کے لئے پکارتے رہیں گے، اور بالآخر مایوس ہو جائیں گے، یہ بات پہلے ''سورۂ اعراف'' میں بھی گزر چکی ہے۔

وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا: یہ لفظ اگرچہ امر کے صیغہ کے ساتھ لایا گیا ہے مگر مفسرین کرام نے اس کو خبر کے معنی میں قرار دیا ہے اور امر کے صیغہ کے ساتھ ذکر کرنے کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ ایسا ہونا حتمی اور یقینی ہے، یعنی: یہ بات یقینی طور پر ہونے والی ہے کہ ان لوگوں کی یہ خوشی وہنسی صرف چند دن کی ہے، اس کے بعد آخرت میں ہمیشہ کے لئے رونا ہی ہوگا۔

منافقوں سے قطع تعلق

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ

پس اگر لوٹا لائے آپ کو اللہ طرف کسی گروہ کی میں سے ان پھر وہ اجازت چاہیں آپ سے نکلنے کی کہہ دیجئے آپ

لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ

ہرگز نہ نکلو گے تم ہو کر ساتھ میرے کبھی اور ہرگز نہ لڑو گے ہو کر ساتھ میرے دشمن کسی سے بیشک تم کو

رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

پسند آیا بیٹھ رہنا پہلی بار پس بیٹھ رہو ساتھ پیچھے رہ جانے والوں کے (۸۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ سو! اگر اللہ آپ کو ان میں سے کسی فرقہ کی طرف پھیر لائے، پھر آپ سے نکلنے کی اجازت چاہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ تم ہرگز نہ نکلو گے کبھی میرے ساتھ اور نہ کسی دشمن سے لڑو گے میرے ساتھ تم کو

پہلی بار بیٹھنا پسند آیا، سو! بیٹھ رہو پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ۔ (۸۳)

تفسیر

لوگوں کے مفاد کے لئے کوئی بڑا کام کرنا پڑے تو عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ان میں سے اس کی مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں، اب اگر ہمیں سچ مچ کام کرنا ہی ہے تو صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ مخالفوں سے بالکل نہ الجھیں، بلکہ اپنے ہم خیالوں اور ہمدردوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کریں، اور اپنی مجموعی طاقت بڑھائیں، مخالفوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، اور جو وہ کریں کرنے دیں، اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ پہلے مرحلے میں تمہارے مخالفت کر کے آگے چل کر اپنی کسی وقتی غرض کے ماتحت آپ سے گھلنا ملنا چاہیں تو اس وقت ان پر بھروسہ کرنے اور ان سے مل کر کام کرنے میں پوری پوری احتیاط برتنی چاہئے، اگر تمہارے ساتھی مضبوط ہیں تو یہ برتاؤ ان کی جڑیں ہلا دینے کے لئے کافی ہے، اپنی طرف سے تو ان سے نہ کچھ کہو نہ سنو، بلکہ مکمل طور پر اپنی جماعت کو متحد اور مضبوط کرنے میں لگ جاؤ، لیکن اے پیغمبر! اگر کبھی اتفاق سے ان کی طرف آپ کا گذر ہو اور مسلمانوں کو کوشش کامیاب ہوتا دیکھ کر ان میں سے کچھ زیادہ سمجھ دار لوگ آگے بڑھیں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ کے لئے نکلنے کی اجازت مانگیں تو ان کہہ دیں کہ جب تمہاری ضرورت نہیں ہے تو تم کیوں خواہ مخواہ ہم پر احسان کررہے ہو، دغاباز لوگوں سے ایسی ہی احتیاط برتنی مناسب ہے ان سے نہ الجھا جائے بلکہ اپنے کام سے کام رکھا جائے۔

یاد رہے کہ! یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ یہ لوگ اگر آئندہ کسی جہاد میں شرکت کا ارادہ کریں تو چونکہ ان کے دلوں میں ایمان نہیں؛ اس لئے وہ ارادہ بھی اخلاص سے نہ ہوگا، جب نکلنے کا وقت آئے گا اس وقت پہلے کی طرح حیلے بہانے کر کے ٹل جائیں گے؛ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ جب وہ کسی جہاد میں شریک ہونے کو خود بھی کہیں تو آپ یہ حقیقت حال ان کو بتلادیں کہ تمہاری کسی بات پر اعتماد نہیں، تم نہ جہاد کو نکلو گے نہ میرے ساتھ کسی دشمن سے لڑو گے۔

اکثر حضرات مفسرین کرام نے فرمایا ہے کہ: یہ حکم ان کے لئے بطور دنیاوی سزا کے نافذ کیا گیا تھا کہ اگر وہ

سچ مچ کسی جہاد میں شرکت کو کہیں تو بھی انہیں شریک نہ کیا جائے۔

فاسقوں کا علاج

وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ

اور نہ نماز پڑھیں پر کسی ان میں سے جو مر گیا ہو کبھی اور نہ کھڑے ہوں پر قبر اس کی

اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾

بیشک وہ کافر ہوئے ساتھ اللہ کے اور پیغمبر اس کے کے اور مر گئے اس حال میں کہ وہ نافرمان تھے (۸۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ان میں کسی پر جو مر جائے کبھی نماز نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں وہ اللہ سے اور اس کے پیغمبر سے منکر ہوئے اور نافرمانی کی حالت میں مر گئے۔ (۸۴)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: ان فسادی شریر منافقوں سے رسمی سا میل جول رکھیں تا کہ انہیں صاف طور پر معلوم ہو جائے کہ ان کا رویہ مسلمانوں کے نزدیک سخت اعتراض کے قابل ہے، اور وہ اپنی غلطی کو محسوس کر کے اپنا طریقہ درست کریں، اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو اے پیغمبر! اس کے جنازے کی نماز مت پڑھائیں اور مرنے کے بعد اس کی قبر پر مت کھڑے ہوں کہ اس سے بھی ان کے ساتھ کچھ لگاؤ ظاہر ہوتا ہے، سارے مسلمانوں کو ان سے بے رخی برتنی چاہئے، پہلے گذر چکا ہے کہ عبداللہ بن ابی منافق کا جب انتقال ہو گیا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جنازے کی نماز پڑھائی اور کفن کے لئے اپنی قمیص مبارک بھی عنایت فرمائی، دفن کے وقت بخشش کی دعا بھی کی، لیکن جب یہ آیت اتری تو اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی منافق کے کفن دفن میں شرکت نہیں فرمائی، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقوں کے نام بتادیئے تھے؛ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی کے جنازے میں شریک ہوتے وقت دیکھ لیا کرتے تھے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس میں شریک ہیں یا نہیں اگر وہ نہ

ہوتے تو آپ بھی شریک نہ ہوتے۔

فرمایا: یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ کفر کیا، منافق نہ تو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، اور نہ پیغمبر کو سچا سمجھتے ہیں اور وہ لوگ نافرمان ہونے کی حالت میں مر گئے، جو شخص کفر، شرک یا نفاق کی حالت میں مر گیا وہ ہمیشہ کے لئے دوزخی ہو گیا، اس کے لئے صدقہ خیرات بھی مفید نہیں ہوگا اس کا جنازہ پڑھنے اور دعا استغفار کرنے کی بھی اجازت نہیں۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ابی ایک ایسا منافق تھا جس کا نفاق مختلف اوقات میں ظاہر ہو چکا تھا اور سب منافقوں کا سردار مانا جاتا تھا اس کے ساتھ پیغمبر ﷺ کا یہ خصوصی برتاؤ کیسے ہوا کہ کفن کے لئے اپنی قمیص مبارک عطا فرمائی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں ایک یہ ہے کہ اس کے صاحبزادے جو مخلص صحابی تھے ان کو درخواست پر محض ان کی دلجوئی کے لئے ایسا کیا گیا اور دوسری یہ ہے کہ غزوۂ بدر کے موقعہ پر جب کچھ قریشی سردار گرفتار کئے گئے تو ان میں پیغمبر ﷺ کے چچا عباس بھی تھے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ ان کے بدن پر کرتا نہیں ہے تو صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ: ان کو قمیص پہنا دیا جائے حضرت عباس رضی اللہ عنہ لمبے قد کے تھے عبداللہ بن ابی کے سوا کسی کی قمیص ان کے بدن پر درست نہ آئی تو عبداللہ بن ابی کی قمیص لے کر پیغمبر ﷺ نے اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کو پہنا دی تھی اس کے اسی احسان کا بدلہ ادا کرنے کے لئے پیغمبر ﷺ نے اپنی قمیص ان کو عطا فرما دی۔

اور پیغمبر ﷺ جانتے تھے کہ میرے قمیص دینے یا نماز پڑھانے سے اس کی تو بخشش نہیں ہوگی، مگر اس سے مسلمانوں کے لئے کچھ فائدہ حاصل ہونے کی امید تھی کہ اس کے خاندان کے لوگ اور دوسرے کافر جب پیغمبر ﷺ کا یہ معاملہ اس کے ساتھ دیکھیں گے تو وہ اسلام کے قریب آ جائیں گے اور مسلمان ہو جائیں گے اور پیغمبر ﷺ کو ان کی نماز پڑھنے سے صاف طور پر منع نہیں کیا گیا تھا بلکہ آیت بعد میں اتری اور پیغمبر ﷺ نے

فرمایا کہ: میرا کُرتا اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچاسکتا، مگر میں نے یہ کام اس لئے کیا کہ مجھے امید ہے کہ اس عمل سے اس کی قوم کے ہزار آدمی مسلمان ہو جائیں گے، چنانچہ مغازی اور بعض تفسیر کی کتابوں میں ہے کہ اس واقعہ کو دیکھ کر خزرج قبیلہ کے ایک ہزار آدمی مسلمان ہو گئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس سے پہلی والی آیت سے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ ہمارے کسی عمل سے اس منافق کی مغفرت نہیں ہوگی، مگر چونکہ آیت کے ظاہر الفاظ میں اختیار دیا گیا تھا اور کسی دوسری آیت سے بھی اس کی ممانعت اب تک نہیں آئی تھی، دوسری طرف ایک کافر کے احسان سے دنیا میں نجات حاصل کرنے کا فائدہ بھی تھا، اور اس معاملہ میں دوسرے کافروں کے مسلمان ہونے کی توقع بھی؛ اس لئے آپ نے نماز پڑھنے کو ترجیح دی اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھا کہ جب اس آیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ مغفرت نہیں ہوگی تو اس کے لئے نماز جنازہ پڑھ کر بخشش کی دعا کرنا ایک بے کار کام ہے، جو شان نبوت کے خلاف ہے، اسی کو انہوں نے ممانعت سے تعبیر فرمایا، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر چہ اس فعل کو فی نفسہ مفید نہ سمجھتے تھے، مگر دوسروں کے اسلام لانے کا فائدہ پیش نظر تھا؛ اس لئے یہ بے کار کام نہ رہا، اس طرح نہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل پر کوئی اشکال رہتا ہے نہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے قول پر۔

البتہ جب آیت " لَا تُصَلِّ " میں صاف طور پر نماز جنازہ سے منع کر دیا گیا تو معلوم ہوا کہ اگر چہ نماز پڑھنے میں ایک دینی مصلحت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تھی، مگر اس میں ایک خرابی تھی جس کی طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دھیان نہیں ہوا، وہ یہ کہ خود مخلص مسلمانوں میں اس عمل سے ایک بے دلی پیدا ہونے کا خطرہ تھا کہ ان کے یہاں مخلص مسلمان اور منافق ایک پلے میں تولے جاتے ہیں اس خطرہ کے پیش نظر منع والی آیت اتری اور پھر کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

احکام ومسائل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کافر کے جنازہ کی نماز اور اس کے لئے بخشش کی دعا کرنا جائز نہیں ہے۔

اسی آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی کافر کے اعزاز و اکرام کے لئے اس کی قبر پر کھڑا ہونا یا اس کی زیارت کے لئے جانا حرام ہے عبرت حاصل کرنے کے لئے ہو یا کسی مجبوری کے لئے تو وہ اس کے منافی نہیں، جیسا کہ "ہدایہ" میں ہے کہ اگر کسی مسلمان کا کافر رشتہ دار مر جائے اور اس کا کوئی ولی وارث نہیں تو مسلمان رشتہ دار اس اسی طرح سنت طریقہ اختیار کئے بغیر کسی کپڑے میں لپیٹ کر ایسے ہی گڑھے میں دبا سکتا ہے۔

ان کی خوشحالی جنجال ہے

وَ لَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ

اور نہ تعجب میں ڈالے آپ کو مال ان کے اور اولاد ان کی بات یہی ہے کہ چاہتا ہے اللہ یہ کہ عذاب دے ان کو

بِهَا فِي الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

ذریعہ اس کے میں دنیا اور نکلے جان ان کی اس حال میں کہ وہ کافر ہوں (۸۵)

بامحاورہ ترجمہ: اور ان کے مال اور اولاد سے تعجب نہ کریں اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کو دنیا میں ان چیزوں کے ذریعے عذاب میں رکھے اور ان کی جان ایسی حالت میں نکلے کہ وہ کافر ہی رہیں۔ (۸۵)

تفسیر

آج کل فریبیوں اور دغا بازوں کی ہر جگہ زیادہ تر اس وجہ سے چل رہی ہے کہ وہ مالدار ہیں اور ان کے پاس مال و دولت کی زیادتی ہے اور اپنے لوگوں کو دیتے دلاتے بھی ہیں اپنے طرف داروں کی آؤ بھگت بھی خوب کرتے ہیں یہ دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ان کا طریقہ ہی کچھ اچھا ہوگا، جو یہ اس قدر خوش حال نظر آتے ہیں۔

اس آیت میں بھی انہی منافقوں کا حال بیان کیا گیا ہے جو تبوک کی جنگ میں شریک ہونے سے بہانے کر کے رُک گئے تھے، ان منافقوں میں بعض مالدار اور خوش حال لوگ بھی تھے ان کے حال سے مسلمانوں کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ جب یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مردود اور نا مقبول ہیں تو ان کو دنیا میں ایسی نعمتیں کیوں ملیں،

اوران کو مال و دولت اور دوسری نعمتیں کیوں ملیں۔

اس کے جواب میں پہلی آیت میں فرمایا گیا کہ اگر غور کرو گے تو ان کے مال اور اولاد ان کے لئے رحمت ونعمت نہیں بلکہ دنیا میں بھی عذاب ہی ہیں، آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے، دنیا میں عذاب ہونا اس طرح ہے کہ مال کی محبت، اس کی حفاظت کی اور پھر اس کے بڑھانے کی فکریں ان کو ایسی لگی رہتی ہیں کہ کسی وقت کسی حال چین نہیں لینے دیتیں، ان کے پاس راحت کا ساز وسامان کتنا ہی ہو مگر راحت نہیں ہوتی، جو دل کے سکون واطمینان کا نام ہے، اس کے علاوہ یہ دنیا کے مال و دولت چونکہ ان کو آخرت سے غفلت میں ڈالنے کا سبب بن رہا ہے؛ اس لئے عذاب کے سبب ہونے کی وجہ سے بھی اس کو عذاب کہا جاسکتا ہے ؛اسی لئے قرآن کریم میں "لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا" فرمایا کہ:اللہ تعالیٰ دنیا کی ان نعمتوں ہی کے ذریعہ ان کو سزا دینا چاہتا ہے۔

ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں

وَ اِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ جَاهِدُوْا مَعَ

اور جب اتاری جاتی ہے کوئی سورت کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور لڑائی کرو ساتھ(مل کر)

رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَ قَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ

رسول اس کے کے تو اجازت چاہتے ہیں والے دولت سے ان میں اور کہتے ہیں چھوڑ دیں ہم کو کہ ہو جائیں

مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾

ساتھ بیٹھنے والوں کے(۸۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ ہوکر لڑائی کرو تو آپ سے ان کے دولت والے رخصت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو چھوڑ دیں کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہ جائیں۔(۸۶)

تفسیر

اس آیت میں مدینہ کے منافقوں کے عام رویہ کو بیان کیا گیا ہے ان لوگوں سے اس زمانے میں قرآن کریم کی زیر ہدایت جو مسلمانوں نے برتاؤ اختیار کیا، اس سے ان کی دال نہ گلنے پائی ورنہ وہ اپنے ہی جھگڑوں میں پھنسا کر مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک دیتے، قرآن حکیم کی آیتوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ تم خلوص کے ساتھ اپنی طاقت اور جماعت بڑھاؤ، منافقوں کی خوشحالی اور ظاہری بناؤ سے دھوکہ نہ کھاؤ، ہمیشہ ان کو کمزور اور نہتا بنا کر رکھنے کی تدبیر میں مصروف رہو، ورنہ ان کے چال چلن سے ظاہر ہے کہ یہ تم کو اگر ان کا بس چلا پنپنے نہ دیں گے، اس کے بعد اس آیت میں ان کے عام رویہ کی طرف پھر خاص طور سے توجہ دلائی گئی ہے۔

ارشاد ہے کہ: یہ لوگ بظاہر آپ سے کیسے گھلے ملے رہتے ہیں، لیکن جب کام کرنے کے لئے کہا جاتا ہے تو کیسے کیسے بہانے تراش کر نکل بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں، جب کسی سورت میں حکم اترتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوپر اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ اور جب پیغمبر اپنے بچاؤ کے لئے دشمنوں سے لڑنے کے لئے نکلے تو تم ہر طرح اس کا ساتھ دو اور اس کے ساتھ مل کر جان اور مال کی بازی لگادو، تو اس وقت تم دیکھتے ہو کہ ان لوگوں میں سے صاحب استطاعت، ہٹے کٹے، کھاتے پیتے اور مالدار لوگ رونے والی شکل بنا کر منہ لٹکائے ہوئے آتے ہیں اور مصیبت زدوں کا سامنہ بنا کر کہتے ہیں، کہ کیا کریں صورت کچھ ایسی آپڑی ہے کہ ہم اس وقت آپ کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے، ہم دل وجان سے چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوں، لیکن حالات اجازت نہیں دیتے؛ اس لئے ہمیں رخصت عطا فرمایئے کہ انہیں لوگوں میں بادل نخواستہ رہنے کے لئے ہمیں بھی چھوڑ دیا جائے جو باہر نہیں نکل سکتے، جیسے: عورتیں، بوڑھے اور اپاہج حالانکہ یہ سب جھوٹے بہانے ہیں اصل بات یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نہیں گردانتے۔

یہ حال تو منافقوں کے دولت مندوں کا تھا اور جو دولت مند نہیں تھے، ان کا حال بخوبی معلوم ہو سکتا ہے،

کہ وہ بھی جہاد میں شریک نہ ہونے کے لئے یہ کہتے کہ ہمارے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لئے مال و دولت نہیں ہے۔

تندرست ہوکر اپاہج بنتے ہو

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَ طُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

راضی ہوئے اس پر کہ رہ جائیں ساتھ پیچھے رہنے والیوں کے اور مہر کردی گئی پر دلوں ان کے

فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ﴿۸۷﴾

پس وہ نہیں سمجھتے (۸۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔خوش ہوئے کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور ان کے دلوں پر مہر کردی گئی،سو! وہ نہیں سمجھتے۔(۸۷)

تفسیر

جب آدمی کی عقل اس کی بے جا خواہشوں کی غلام بن کر رہ جاتی ہے تو وہ اصل بات کو سمجھ ہی نہیں سکتا اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے عقل کی روشنی اس کے اندر پہنچ ہی نہیں سکتی،اسی وجہ سے اسلام میں بڑے زور سے ہدایت کی گئی ہے کہ دیکھو! خراب خواہشوں سے دل کو پاک رکھو ان کا اثر دل پر نہ جمنے پائے ورنہ کوئی سیدھی بات اس کے اندر جانے نہ پائے گی۔

آرام طلبی، نکمے پن، بدمعاشی وغیرہ کو صحیح اور درست دل والا کبھی اچھا نہیں سمجھ سکتا،لیکن اگر دل پر کمینی باتوں اور خراب عادتوں کا اثر جم چکا ہے تو وہ اپنی ہی دھن میں رہتا ہے اور اپنی ہی سی کرنا چاہتا ہے،مدینے کے منافقوں کو دیکھئے اسلام کی دشمنی اور جاہلانہ رسم ورواج کی محبت ان کی رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے؛اس لئے انہیں بہت سی بری اور کمینہ خصلتوں سے بھی کوئی عار نہیں آتی۔

ارشاد ہے کہ: دل بگڑ جانے اور عقل کے بے کار ہو جانے کی مثال اگر دیکھنی ہے تو ان منافقوں کا حال دیکھو، کمزوروں، عورتوں اور بچوں کے ساتھ رہ جانے میں شامل ہونے سے انہیں کوئی شرم نہیں آتی بلکہ وہ بیٹھ رہنے سے بہت خوش ہیں، کیونکہ ان کو بزدل اور نامرد بننا منظور ہے اور مسلمانوں کا آگے بڑھنا ان کو ایک آنکھ نہیں بہاتا، مسلمانوں کی دشمنی ان کے دل میں ایسی جم گئی ہے کہ اب کوئی اچھی عقل کی بات اس میں جا ہی نہیں سکتی، سمجھدار سمجھتے ہیں کہ ان کی عقل ماری گئی ہے لیکن ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، یہ بالکل ایسی بات ہے کہ ان کے دل میں اسلام کی دشمنی بھر کر باہر سے اس پر مہر لگادی گئی ہے اب نہ وہ دشمنی نکل سکتی ہے اور نہ کوئی سمجھ کی بات ان کے دل کے اندر جاسکتی ہے، اس آیت سے اشارتاً یہ بات بھی سمجھی جاتی ہے کہ دل کے اندر کسی بات کے بیٹھ جانے سے آدمی عقل کی باتیں سمجھنے کے قابل نہیں رہتا؛ اس لئے بری صحبتوں اور خراب عادتوں سے دل کو بچانا چاہئے، ورنہ اس کی تباہی میں کوئی شک نہیں۔

مؤمنوں کی شان

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ
لیکن پیغمبر اور وہ لوگ جو ایمان لائے ساتھ اس کے لڑے وہ مالوں اپنے سے اور

اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾
جانوں اپنی سے اور وہ واسطے انہی کے خوبیاں ہیں اور وہی اکیلے کامیاب ہیں (۸۸)

بامحاورہ ترجمہ: لیکن پیغمبر اور اس کے ساتھ جو لوگ ایمان لائے وہ اپنے مال اور جان سے لڑتے ہیں اور انہی کے لئے خوبیاں ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔ (۸۸)

تفسیر

منافقوں کے بارے میں پچھلی آیت میں کہا گیا کہ یہ لوگ اسلام کو اور مسلمانوں کو کچھ اہمیت نہیں دیتے،

نہ ان کے آگے بڑھنے کوشش قرار دیتے ہیں، اور نہ ان کی قربانیوں کو قربانیاں سمجھتے ہیں، ان میں سے مالدار اور بااثر لوگ رسمی طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے ہیں، اور ادھر ادھر کی باتیں بنا کر جنگ میں شامل نہ ہونے کی رخصت طلب کرتے ہیں، اور معذور لوگوں میں مل کر گھروں میں بیٹھ رہنا چاہتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ واقعی کسی طرح معذور ہیں، بلکہ اصلی وجہ یہ ہے کہ ان کی سمجھ پر پردہ پڑا ہوا ہے اور دل کی گمراہی کی مہر لگی ہے کہ ان میں کوئی معقول بات سما ہی نہیں سکتی، یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا کاموں کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے اور بے پروائی سے کہتے ہیں کہ ابھی انہیں کسی واقعی لڑاکا قوم سے واسطہ نہیں پڑا ہے اور اب شام اور روم سے ٹکر لینے چلے ہیں، امید ہے کہ اسی مرحلہ میں جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گے ورنہ انجام کار تو وہ ان کو دبا ہی لیں گے اور اس میں کچھ دیر نہیں لگے گی کیونکہ وہ لوگ دنیا کو فتح کئے بیٹھے ہیں ان کے سامنے ان کی کیا چل سکتی ہے اور اگر بالفرض چلی بھی تو کتنے دن؟ ان کے برخلاف اس آیت میں اسلام کے طرف داروں کی حالت بیان کی گئی ہے جو دین کی خدمت کرنے میں کسی قربانی سے بھی ہچکچاتے نہیں۔

ارشاد ہے کہ: منافقوں کا حال تو تم نے سنا اب سچے ایمان والوں کا حال سنو، یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے اور اسکے ساتھ اسلام کی ترقی کی ہر کوشش میں دل وجان سے حصہ لینے والے ہیں، ان کی اور خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان ہے کہ کہ جب موقعہ ہاتھ آتا ہے اپنی جان اور مال لے کر حاضر ہو جاتے ہیں اور جو حکم ہوتا ہے بلا جھجک بجالاتے ہیں ان اطاعت گذاروں اور فرمانبرداروں کا انجام کیا ہوگا، اس کا فیصلہ کرنے والے یہ منافق لوگ کون ہوتے ہیں اس کا فیصلہ ہم سے سنو، دونوں جہاں کی کامیابی اور بہترین زندگی انہی کے لئے ہے اور یہ ہر جگہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں گے اور ان کا اچھا پھل پائیں گے۔

دنیا کی کامیابی تو ابھی ظاہر ہو جائے گی اور آخرت میں جو ان کو اجر ملے گا، اس کا بیان آگے کی آیت میں آتا ہے۔

آخرت کا بدلہ

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ

تیار کررکھے ہیں اللہ نے واسطے ان کے باغ بہتی ہیں سے نیچے ان کے نہریں ، ہمیشہ رہیں گے

فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۸۹﴾

بیچ ان کے یہی ہے کامیابی بڑی (۸۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اللہ نے ان کے واسطے باغ تیار کرر کھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہا کریں گے یہی ہے بڑی کامیابی۔(۸۹)

تفسیر

غزوۂ تبوک کی تیاری کا جس حالت اور جس زمانے میں حکم ہوا ہے اس کا کچھ حال پہلے بیان ہو چکا ہے مسلمان تھکے ماندے لڑائی سے اسی وقت واپس آئے تھے فوراً انہیں دوسری جنگ کے لئے تیار ہو جانے کا حکم ہوا، گرمی بلا کی تھی، آدمی کا دل خواہ مخواہ سایہ کی جگہوں میں آرام سے پڑے رہنے کو چاہتا تھا، خاص کر تھکے ماندے لوگ جو ابھی ابھی دھوپ میں سفر کر کے آئے ہوں کسی طرح آرام کے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے، لیکن اس موقعہ پر مسلمانوں نے جو پھرتی دکھائی، خلوص اور اسلامی ہمدردی کا ثبوت دیا، اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، حکم ملتے ہی تمام مسلمان اس حکم کو پورا کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے، اور سوائے تین آدمیوں کے کوئی بھی جنگ کی قدرت رکھنے والا اس غزوہ میں شامل ہونے سے نہ بچا، اپنی جان لے کر اس کو اسلام پر قربان کرنے کے لئے سب حاضر ہو گے، جو مالدار تھے انہوں نے اپنی اپنی حیثیت سے زیادہ دیا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنا سارا سامان لے آئے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آدھا مال دیدیا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے دل کھول کر مدد کی، اور یہ سب کسی دنیاوی لالچ کے لئے نہیں، بلکہ سچے دل سے اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل کرنے

کے لئے کیا، پھر ان کو جو کامیابی نصیب ہوئی وہ یقیناً وہ اس کے حق دار تھے۔

پچھلی آیت میں ان کے لئے دونوں جہاں میں کامیابی کی خوشخبری دی گئی جو دنیا میں پورا ہوا کہ غزوۂ تبوک سے کامیاب واپس ہوئے اور چاروں طرف ان کی دھاک بیٹھ گئی اور سب ان کے نام سے کانپنے لگے، اس آیت میں اس آرام وآسائش کا ذکر ہے جو ان کے لئے آخرت میں تیار ہے، انہوں نے اس غزوے میں شامل ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی خاطر سایہ دار درخت، ٹھنڈا پانی، گھر کا آرام سب کچھ چھوڑا ان کے لئے آخرت میں سرسبز لہلہاتے میووں سے لدے ہوئے باغ تیار ہے، وہاں سے انہیں کوئی نکالنے والا نہیں، ہمیشہ آرام وسکون کے ساتھ رہیں گے اس سے بڑھ کر اور کامیابی کیا ہوگی، دنیا کے چندروزہ عارضی آرام کو اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چھوڑ کر اور ان کی فرمانبرداری میں یہاں کی دھوپ گرمی اور پیاس سہہ کر آئندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آرام کا تمام سامان حاصل کر لینا واقعی انتہائی خوش قسمتی ہے، اور آج بھی جو خوش نصیب یہ ہمیشہ ہمیشہ کی نعمتیں حاصل کرنا چاہتا ہے ان کے لئے وہی قربانی کا راستہ کھلا ہے۔

دیہاتیوں کا حال

وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَ قَعَدَ

اور آئے بہانے باز میں سے دیہاتیوں تاکہ رخصت دی جائے واسطے ان کے اور بیٹھ رہے

الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ

وہ جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اللہ سے اور پیغمبر اس کے سے عنقریب پہنچے گا ان کو جو کافر ہوئے سے ان میں

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

عذاب دردناک (۹۰)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور بہانہ کرنے والے گنوار آئے تا کہ ان کو رخصت مل جائے اور بیٹھ رہے جنہوں نے اللہ سے اور اس کے پیغمبر سے جھوٹ بولا تھا، اور اب جو ان میں سے کافر ہیں ان کو دردناک عذاب پہنچے گا۔ (۹۰)

تفسیر

پچھلی آیتوں میں ان منافقوں کا ذکر ہوا جو شہر مدینہ میں آباد تھے، یہ لوگ تبوک کی جنگ کی تیاری کو کچھ اہمیت نہ دے کر اپنے اپنے بہانے لے کر حاضر ہوئے اور گھر بیٹھ رہنے کی رخصت طلب کی، اس آیت میں جہاد میں نہ جانے کے لئے بہانہ باز منافقوں کا ذکر ہے، انہوں نے جب سنا کہ مسلمانوں کو شام کی طرف لڑائی کے ارادے سے سفر کرنے کا حکم مل چکا ہے اور لوگ اس کے لئے تیاری کر رہے ہیں، تو ان میں سے بعض تو ظاہری تعلقات کی بنا پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اس موقعہ پر ہماری شرکت مشکل ہوگی، فصل کی تیاری، اور سخت گرمی کے علاوہ ہمیں یہ خطرہ ہے کہ آس پاس کے دشمن ہماری غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر ہمارے گھر بار، مال ودولت سب لوٹ لیں گے؛ اس لئے ہمیں اجازت مل جائے کہ ہم گھر ہی ٹھہریں، یہ لوگ بہانہ باز تھے، کچھ ایسے تھے کہ انہوں نے جنگ کی تیاری نہ کی، خبر اس کان سے سنی اور اس کا کان سے نکال دی اور گھر سے ہلے ہی نہیں، یہ لوگ "قَاعِدُون" یعنی: پیچھے بیٹھ رہنے والے کہلائے، اس آیت میں ان دونوں کا بیان ہے، ارشاد ہے کہ: دیہات والوں میں سے کچھ تو ظاہری بھرم بنائے رکھنے کے لئے گھر پر ٹھہرنے کی اجازت حاصل کرنے مدینہ آئے اور کچھ یوں ہی بیٹھ رہے، اور ظاہرداری کی بھی پرواہ نہ کی، یہ دونوں قسم کے لوگ قابل الزام ہیں، اب اگر انہیں آگے چل کر توبہ نصیب نہ ہوئی، بلکہ کافر ہی جئے اور کافر ہی مرے تو ان کے لئے آخرت میں بہت درد پہنچانے والا عذاب تیار ہے، باقی جھوٹے بہانے باز دنیا میں بھی پچھتائیں گے اور آخرت میں بھی عذاب کے مستحق ہوں گے، جب تک وہ سچے دل سے توبہ نہ کریں۔

مفسرین کرام نے ان دیہاتیوں کے نام لکھے ہیں، ان کے ناموں کا جاننا نہ جاننا برابر ہے، غرض تو یہ ہے کہ! اس قسم کے لوگوں کا انجام معلوم ہو جائے تا کہ ہر ایک اپنی جگہ پر ڈرے اور اچھی طرح سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا، وہاں تو خلوص اور سچے ایمان کی پوچھ ہے باتیں بنانے والے کسی گنتی میں نہیں، ان کی بری نیتوں کا انہیں بدلہ مل کر رہے گا، اگر موقعہ ہوا تو دنیا میں بھی ورنہ آخرت میں تو ضرور بالضرور اور

ان کی یہ سزا مسلمانوں کے لئے عبرت کا سامان ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے یونہی بہانے بنا کر منہ نہیں موڑیں گے۔

قابلِ قبول عذر

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى وَ لَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا
نہیں ہے پر ضعیفوں اور نہ پر مریضوں اور نہ پر ان لوگوں نہیں

يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ مَا
پاتے جو وہ خرچ کریں کوئی گناہ جب کہ خیرخواہ ہوں واسطے اللہ کے اور پیغمبراس کے کے نہیں

عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ﴿۹۱﴾
پر نیکی کرنے والوں سے راہ (الزام کی) اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے (۹۱)

بامحاورہ ترجمہ: نہیں ضعیفوں پر اور نہ مریضوں پر اور نہ ان پر جن کے پاس خرچ کرنے کو نہیں کچھ گناہ جب کہ اللہ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ دل سے صاف ہوں نیکی کرنے والوں پر الزام کی کوئی راہ نہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۹۱)

تفسیر

پچھلی آیت میں جھوٹے عذر کرنے والوں اور جھوٹ موٹ کے بہانے گھڑنے والوں کا ذکر ہوا، اس آیت میں ان لوگوں کو گنوایا ہے جن کے عذر قابلِ قبول ہیں، وہ عذر یہ ہیں، کمزوری، بیماری، تنگ دستی، ان کے علاوہ ایک عذر اور بھی ہے جس کا ذکر آگے کی آیت میں آئے گا۔

ارشاد ہے کہ: عورتیں، بچے، بوڑھے کمزوری کی وجہ سے معذور ہیں، یہ اگر لڑائی میں شامل نہ ہوں تو کوئی حرج نہیں، اسی طرح وہ لوگ بیماری کی وجہ سے جسمانی تکلیف برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں، وہ بھی

غیر حاضر ہیں، مفلس لوگ بھی معذور رکھے جاسکتے ہیں، کیوں کہ سفر کے واسطے سفری اخراجات اور لڑائی کے واسطے ہتھیار اور بچاؤ کے سامان کی ضرورت ہے اس کے بغیر شامل ہونا اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا ہے، یہ تین قسم کے لوگ اگر جنگ میں شامل نہ ہوں تو ان کا عذر قبول کیا جاسکتا ہے یہ واقعی معذور ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ دل سے مسلمانوں کے ساتھ رہیں، اور ان کے اخلاقی مدد کریں، تندرست مالدار لوگوں کو جنگ میں شامل ہونے کی ترغیب دیں، ایسی کوئی بات اپنے قول وفعل سے ظاہر نہ ہونے دیں، جس سے دوسروں کی ہمت ٹوٹے، اپنی ہر بات سے نیکی اور خلوص کا ثبوت دیں، اور مسلمانوں کی بھلائی اور ان کی اس مرحلے میں ہر طرح مدد جوان کے بس کی ہے کریں۔

ایسے لوگ جو ہر قدم پر اپنے نیک ہونے کا ثبوت دیں ہر الزام سے بری ہیں، یہ سب اچھے لوگوں میں داخل ہیں اور اچھا رویہ اختیار کرنے والے پر کوئی الزام نہیں، اگر انسان ہونے کی حیثیت سے چھوٹی موٹی غلطیاں ہوجائیں تو اللہ تعالیٰ معاف کرے گا وہ غفور رحیم ہے۔

آگے جہاد ہی کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس میں بعض مخلص مسلمان سواری نہ ملنے کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہوسکے، چونکہ وہ خلوص دل سے جہاد میں شرکت کرنا چاہتے تھے؛ اس لئے انہیں محروم رہنے کی وجہ سے بہت صدمہ ہوا۔

واقعہ یہ ہے کچھ غریب صحابہ کرام ایسے تھے جن کا دل جہاد میں جانے کے جذبے سے بھرا ہوا تھا، مگر ان کے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لئے سواری نہیں تھی، انہوں نے اپنی اس مجبوری کا ذکر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور درخواست کی کہ ہمارے لئے سواری کا کوئی انتظام ہوجائے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں تو ان سے فرمایا کہ: ہمارے پاس سواری کا کوئی انتظام نہیں ہے، یہ سن کر یہ صحابہ بڑے غمگین ہوئے اور روتے ہوئے واپس ہوئے اور روتے رہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسا سامان کردیا کہ چھ اونٹ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسی وقت آ گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ اونٹ دیدیئے، اور ان میں سے تین آدمیوں کے لئے سواری کا انتظام حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کردیا، حالانکہ وہ اس سے پہلے بہت بڑی تعداد کا انتظام اپنے خرچ سے کرچکے تھے۔

صحابہ کرام میں سے بعض وہ صحابہ بھی تھے جن کو آخر تک سواری نہ ملی، اور مجبور ارہ گئے، ان آیتوں میں انہی سب حضرات کا ذکر آیا ہے جن کا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔

سواری نہ ہونا عذر ہے

وَّ لَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ

اور نہ پر ان لوگوں جب پاس آئے آپ کے تاکہ سواری دے آپ ان کو کہا آپ نے نہیں پاتا میں وہ چیز کہ

اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا

سوار کروں تمہیں جس پر الٹے پھرے وہ اس حال میں کہ آنکھیں ان کی بہہ رہی ہیں سے آنسوؤں اس غم میں کہ

اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾

نہیں پاتے وہ وہ چیز کہ خرچ کریں (۹۲)

بامحاورہ ترجمہ: اور نہ ان لوگوں پر کہ جب آپ کے پاس آئے کہ آپ ان کو سواری دیں تو آپ نے کہا میرے پاس کوئی چیز نہیں جس پر تمہیں سوار کروں تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے اس غم میں کہ نہیں پاتے وہ کوئی چیز جسے وہ خرچ کریں۔ (۹۲)

تفسیر

واقعی ایک شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، کبھی بھی ایسے معاملے میں پیچھے نہیں رہ سکتا جس میں اسلام کی خاطر جان و مال کی قربانی کا مطالبہ ہو، ایسے موقعہ پر وہ ضرور اپنی جان و مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے، اس کا دل کبھی نہیں مان سکتا ہے کہ وہ ایسے موقعہ پر کسی کونے میں دبک کر بیٹھ رہے اور اگر اس ک پاس شامل ہونے کے لئے کافی سامان نہیں ہے اور نہ کہیں سے دستیاب ہوسکتا ہے تو اس کے دل پر ایسا صدمہ ہوگا، جیسے اپنے کسی ذاتی نقصان سے کسی کو ہوسکتا ہے۔

ارشاد ہے کہ: کچھ اللہ کے بندے جہاد کے شوق میں آپ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے ضرورت کے مطابق سفری سامان کا بندوبست کرلیا ہے مگراتنی وسعت نہیں کہ سواری کے لئے گھوڑے وغیرہ کا بندوبست کریں، آپ اس کا ہمارے لئے بندوبست کردیں، اور جب آپ ان کو یہ جواب دیتے ہیں کہ میرے پاس جوسامان جمع ہوا تھا، وہ سب کام میں آچکا اب میرے پاس کوئی گھوڑا یا اونٹ نہیں ہے جو میں تمہاری سواری کے لئے دوں، تو وہ لوگ یہ سن کر غمگین ہوتے ہیں اور اس حال میں واپس آئے کہ پریشانی کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں کہ ہائے افسوس! ہمارے پاس اتنا بھی نہیں کہ سواری خرید سکیں اور جہاد میں شریک ہوسکیں۔

تبوک کی طرف سفر چونکہ ایک دور دراز کا سفر تھا اس میں بغیر سواری شامل ہونا نہایت دشوار تھا؛ اس لئے جن کے پاس سواری نہ تھی اور نہ عام چندے کے مال سے دی جاسکتی تھی، ان کو جہاد میں شامل ہونے سے معذور رکھا گیا، اوران کے دل کے جذبات کو ان کے شامل ہونے کے برابر سمجھا گیا۔

پکڑ کن کی ہے؟

اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَ هُمْ اَغْنِیَآءُ ۚ

بجزاس کے نہیں کہ الزام کا راستہ پر ان لوگوں جو اجازت مانگتے ہیں آپ سے حالانکہ وہ دولت مند ہیں

رَضُوْا بِاَنْ یَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ

راضی ہوئے اس سے کہ رہیں وہ ساتھ رہ جانے والوں میں اور مہر کردی اللہ نے پر دلوں ان کے

فَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

پس وہ نہیں جانتے (۹۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ الزام کی راہ تو ان پر ہے جو آپ سے رخصت مانگتے ہیں حالانکہ وہ مالدار ہیں وہ اس بات سے خوش ہوئے کہ پیچھے رہنے والوں کے ساتھ رہ جائیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی، سو! وہ

نہیں جانتے۔(۹۳)

تفسیر

پیچھے ذکر ہوا کہ مخلص لوگ جو کسی صحیح عذر کی وجہ سے لشکر میں شامل نہیں ہو سکے وہ واقعی معذور ہیں ان پر منافقت کا الزام نہیں، کمزور، بیمار، مفلس لوگ واقعی مجبور ہیں، ان کو ان کی نیت کا ثواب ملے گا، اس آیت میں ان لوگوں کا بیان ہے جنہوں نے جھوٹے بہانے کر کے مسلمانوں سے غداری کی۔

ارشاد ہے کہ: پکڑ تو صرف ان کی ہے جن کے دل مسلمانوں کی خیر خواہی سے خالی ہیں، اور مسلمانوں کی مدد سے اپنے کو دور رکھتے ہیں، ان کی زبانی یہ کہنا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں کسی کام کا نہیں، کیونکہ ان کے دل صحیح جذبے سے خالی ہیں اور وہ مسلمانوں کی فتح کے بجائے ان کو نیچا دکھانے کے پیچھے پڑے ہیں، اور ان کے دشمنوں کی اخلاقی مدد کر رہے ہیں، ایسے موقعہ پر کہ جب سارے مسلمان اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو کر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نکل کھڑے ہوئے، یہ لوگ عورتوں اور اپاہجوں کے ساتھ پیچھے رہنے پر راضی ہیں، ان کے منافقانہ خیالات اور اعمال نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اب وہ صحیح اور درست باتوں کو نہیں جانتے، اب یہ جو بھی سوچتے ہیں وہ ٹیڑھی ہی بات ہوتی ہے، اور سیدھی اور اصلی راہ سے یہ بالکل ہٹ چکے ہیں۔

واپسی پر پھر اپنا رونا روئیں گے

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ الجزء ۱۱

بہانہ کرنے آئیں گے وہ پاس تمہارے جب واپس جاؤ گے تم طرف ان کی کہہ دیجئے آپ نہ عذر کرو ہرگز نہ

نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَ سَيَرَى اللّٰهُ

مانیں گے ہم (کہنا تمہارا) تمہارا تحقیق بتا دیا ہے ہمیں اللہ تعالیٰ نے کچھ حال تمہارا اور عنقریب دیکھیں گے اللہ تعالیٰ

عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ

کام تمہارا اور پیغمبر اس کا پھر لوٹائے جاؤ گے تم طرف جاننے والے پوشیدہ کے اور ظاہر کے

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۹۴ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا

پھر بتائے گا وہ تم کو جو تھے کرتے تم (۹۴) عنقریب قسمیں کھائیں گے وہ اللہ کی آگے تمہارے جب

انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ

واپس آؤ گے تم طرف ان کی تا کہ درگذر کرو سے ان پس درگذر کرو سے ان بے شک وہ

رِجْسٌ ۡ وَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۹۵

پلید ہیں اور ٹھکانہ ان کا دوزخ ہے بدلے میں اس کے جو تھے وہ کماتے (۹۵)

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ

قسمیں کھائیں گے وہ آگے تمہارے تا کہ راضی ہو تم سے ان پس اگر تم راضی ہو سے ان تو تحقیق اللہ تعالیٰ

لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝۹۶

نہیں راضی ہونگے سے لوگوں نافرمان (۹۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بہانے لائیں گے آپ کے پاس، جب آپ ان کی طرف پھر کر جائیں گے، آپ کہہ دیجئے بہانے مت بناؤ، ہم تمہاری بات ہرگز نہ مانیں گے، ہمیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے حالات بتا دیئے ہیں اور ابھی اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر تمہارے کام دیکھیں گے، پھر تم اس چھپے اور کھلے کے جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر وہ تم کو بتائے گا جو تم کر رہے ہو۔ (۹۴) اب جب تم ان کی طرف پھر کر جاؤ گے تو تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھائیں گے تا کہ تم ان سے درگذر کرو سو تم ان سے درگذر کرو بے شک وہ پلید لوگ ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کے کاموں کے بدلے میں۔ (۹۵) تمہارے سامنے وہ لوگ قسمیں کھائیں گے تا کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ سو اگر تم ان سے راضی ہو گئے تو اللہ تعالیٰ ان نافرمان لوگوں سے پھر بھی راضی نہیں ہونگے۔ (۹۶)

تفسیر

پہلی آیتوں میں ان منافقوں کا ذکر تھا جنہوں نے تبوک کی جنگ میں نکلنے سے پہلے جھوٹے حیلے بہانے کر کے جہاد میں جانے سے عذر کر دیا تھا، ان آیتوں میں ان کا ذکر ہے جنہوں نے جہاد سے واپسی کے بعد پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی جہاد سے غیر حاضری کے جھوٹے عذر پیش کئے، یہ آیتیں مدینہ طیبہ واپس آنے سے پہلے اتر چکی تھیں جن میں اس آنے والے واقعہ کی خبر تھی کہ جب آپ مدینہ پہنچیں گے تو منافق لوگ عذر کرنے کے لیے آپ کے پاس آئیں گے چنانچہ اسی طرح واقعہ پیش آیا۔

ان آیتوں میں ان کے متعلق پیغمبر ﷺ کو تین حکم دے گئے، پہلا یہ کہ جب یہ عذر کرنے کے لیے آئیں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ فضول جھوٹے بہانے نہ کرو، ہم تمہاری بات کی تصدیق نہ کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ ہمیں سارے حالات اور خیالات اور تمہاری شرارت اور دلوں میں چھپے ہوئے خفیہ ارادے سب بتلا دیے ہیں، جس سے تمہارا جھوٹا ہونا ہم پر واضح ہو گیا، اس لیے عذر بیان کرنا فضول ہے، اس کے بعد والی آیت میں ان کو مہلت دی گئی کہ اب بھی توبہ کریں نفاق چھوڑ کر سچے مسلمان ہو جائیں، کیونکہ اس میں یہ فرمایا کہ آئندہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر تمہارا عمل دیکھیں گے کہ وہ کیا اور کیسا رہتا ہے؟ اس کے مطابق عمل ہوگا، اگر تم توبہ کر کے سچے مسلمان ہو گئے، تو تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے، ورنہ یہ جھوٹے بہانے تمہیں کوئی فائدہ نہ دیں گے۔

دوسرا حکم دوسری آیت میں بیان ہوا ہے کہ یہ لوگ آپ کی واپسی کے بعد جھوٹی قسمیں کھا کر آپ کو مطمئن کرنا چاہیں گے، اور مقصد اس سے یہ ہوگا کہ آپ ان کی اس غیر حاضری کو نظر انداز کر دیں اس پر ان کو کچھ نہ کہیں، اس پر یہ ارشاد ہوا کہ ان کی یہ خواہش آپ پوری کر دیں یعنی آپ ان کو نہ ملامت کریں اور نہ کچھ کہیں اور نہ ان سے خوشگوار تعلقات رکھیں، کیونکہ ملامت سے تو کوئی فائدہ نہیں، جب ان کے دل میں ایمان ہی نہیں اس کی طلب بھی نہیں تو ملامت کرنے سے کیا ہوگا فضول اپنا وقت ضائع کیوں کیا جائے؟

تیسرا حکم تیسری آیت میں یہ ہے کہ یہ لوگ قسمیں کھا کر آپ کو اور مسلمانوں کو راضی کرنا چاہیں گے اس کے متعلق حق تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمادی کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ کی جائے آپ ان سے راضی نہ ہوں، اور یہ بھی فرمادیا کہ بالفرض اگر آپ راضی بھی ہو گئے تو ان کو کوئی فائدہ اس لیے نہیں پہنچے گا کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی نہیں ہے اور اللہ کیسے راضی ہو جبکہ یہ اپنے کفر و منافقت پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

کافر دیہاتیوں کا حال

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ

دیہاتی لوگ زیادہ سخت ہیں کفر میں اور منافقت میں اور اسی لائق ہیں کہ نہ سیکھیں وہ خاص طریقے

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾

جو اتارے اللہ تعالیٰ نے پر پیغمبر اپنے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے (۹۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہ گنوار کفر اور منافقت میں بہت سخت ہیں اور اسی لائق ہیں کہ وہ قاعدے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر اتارے ہیں نہ سیکھیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔(۹۷)

تفسیر

دیہات کے کافر باشندے سخت مزاج ہوتے ہیں اور دین اور مذہب کی باتوں کو جلدی نہیں سیکھتے، اس لیے کہ وہ بہت ہی زیادہ جاہل اور ضدی ہوتے ہیں، ایک تو کریلا اوپر سے نیم چڑھا یعنی ایک تو کافر دوسرا گنوار۔

ارشاد ہے کہ عام طور پر دیہات کے رہنے والے گنوار جاہلیت کی رسموں پر زیادہ جمے ہوئے ہیں یہ ان عادتوں کو سختی کے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں، ان لوگوں کی طبیعتیں ہی ایسی ہو گئی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے احکام کو جاننے اور ماننے کو تیار ہی نہیں۔

قرآن کریم کے اترنے کے زمانہ میں جس طرح شہروں میں منافق لوگ رہتے تھے اسی طرح وہ دیہات

میں بھی آباد تھے، مدینہ شہر کے منافقوں کا ذکر مختلف انداز سے ہو چکا ہے اور آگے بھی آرہا ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بعض دیہاتی منافقوں کے گندے کارنامے بیان کر کے ان کی مذمت بیان فرمائی ہے۔

دو قسم کے دیہاتی

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ
اور بعض گنوار ہیں ایسے جو سمجھتے ہیں اس کو جو خرچ کریں تاوان اور دیکھ رہے ہیں

بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾
واسطے تمہارے گردشوں کی اوپر ان کے ہے گردش تباہی کی اور اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے (۹۸)

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا
اور بعض دیہاتی ہیں جو ایمان لاتے ہیں پر اللہ اور پر دن آخرت کے اور سمجھتے ہیں جو

يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ
خرچ کرتے ہیں نزدیکیاں پاس اللہ کے اور دعائیں پیغمبر کی سن رکھیں یقیناً وہ نزدیکی ہے

١٢ ع ١٠ ١ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾
واسطے ان کے جلد داخل کریں گے انکو اللہ تعالیٰ میں رحمت اپنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (۹۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور بعض گنوار ایسے ہیں کہ اپنے خرچ کو تاوان شمار کرتے ہیں اور تمہارے لیے زمانے کی گردشوں کا انتظار کرتے ہیں انہی پر آرہی ہے بری گردش اور اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔(۹۸) اور بعض گنوار وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے ہیں اور اپنے خرچ کرنے کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہونے اور پیغمبر کی دعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، سنو! بے شک وہ ان کے نزدیکی کا ذریعہ ہے اللہ تعالیٰ ان کو عنقریب اپنی رحمت میں داخل کرے گا بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔(۹۹)

تفسیر

اس سے پہلی آیت میں گاؤں والوں کی عام کیفیت بیان کی گئی، ان کی تعلیم وتربیت شہریوں سے مختلف طریقے پر ہوتی ہے اوران کے رہنے سہنے کے طریقے ان کو شائستہ اور مہذب نہیں ہونے دیتے، اگر کوئی ان کو کچھ سکھانا چاہے، تو مناسب فضا نہ ہونے کی وجہ سے اس کو موٹی موٹی باتیں سکھانے پر اکتفا کرنا پڑتا ہے، قانونی حدبندیوں کی یہ لوگ کم ہی پرواہ کرتے ہیں، اسلام کے جس ابتدائی زمانے کا ان میں ذکر ہو رہا ہے، اس وقت یہ لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو اہمیت نہ دیتے تھے، اس لیے وہ اپنی رقم خرچ کرتے ہوئے جلتے کڑتے تھے اور کہتے تھے یہ مسلمان کہاں سے پیدا ہو گئے جو ہر وقت ہم لوگوں سے مالی امداد اور چندے وصول کرتے رہتے ہیں یہ نہ ہوں تو کیسی بے فکری سے زندگی بسر ہو، مسلمانوں کو کوستے تھے اور ہر وقت اس انتظار میں رہتے تھے کہ ان پر کوئی مصیبت آن پڑے کہ جس سے ہمیں ان سے رہائی ملے، اور ہم آزادی کے ساتھ جو چاہیں کریں اور ان کی پابندیوں سے چھٹکارا نصیب ہو۔

ارشاد ہے کہ کچھ ان گنواروں میں سے زکوۃ، خیرات میں روپیہ دینے کو جرمانہ، تاوان سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان تباہ ہو جائیں، تو یہ بھی اسلام سے نکل جائیں لیکن مسلمان تو اپنے خلوص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مدد پا کر کامیاب ہوں گے اور یہ لوگ اپنی منافقت کی وجہ سے برباد ہونگے اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کی حالتوں کو جانتے ہیں اور ہر ایک کی رگ رگ سے واقف ہیں ان منافقوں کے عمل اسی قابل ہیں کہ ان پر بڑی بڑی مصیبتیں اتریں۔

دیہاتی منافقوں کے حالات کا ذکر کرنے کے بعد قرآنی اسلوب کے مطابق ان دیہاتیوں کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھا گیا جو سچے اور پکے مسلمان ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ دیہات کے باشندے بھی سب ایک سے نہیں ہوتے، ان میں مخلص مسلمان اور سمجھدار لوگ بھی ہوتے ہیں۔

ان کے مقابلے میں بعض دیہاتی اچھے بھی ہیں وہ اپنی پیدائشی نیک مزاجی کی وجہ سے گاؤں کی خراب فضا سے متاثر نہیں ہوتے، انہیں اس بات کا یقین آجاتا ہے کہ اللہ برحق ہے اور قیامت کا دن برحق ہے، اس میں ہمیں

ہمارے عملوں کی جزا یا سزا ملے گی اس آیت میں ان لوگوں کا بیان ہے۔

ارشاد ہے کہ ان دیہاتیوں میں بعض اچھے لوگ بھی ہیں، ان کی فطری صلاحیت انہیں نیک کاموں اور اچھے خیالوں سے محروم نہیں ہونے دیتی، وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ اور پیغمبر ﷺ کی دعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، چنانچہ جو شخص زکوۃ یا صدقات کا مال پیغمبر ﷺ کی خدمت میں پیش کرتا تو آپ اس کے لیے دعا فرماتے، اسی کو آیت میں صلوات الرسول کہا گیا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب ابی اوفی زکوۃ لے کر پیغمبر کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا کہ: "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اٰلِ أَبِي أَوْفٰى" اے اللہ! ابی اوفی کے خاندان پر رحمت نازل فرما۔

ان سچے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ اپنا قرب عطا فرمائے گا، پیغمبر ﷺ کی دعاؤں سے ان کا بیڑا پار ہوگا اور اللہ تعالیٰ ان کے قصور معاف فرمادیں گے، اور ان پر اپنی رحمت اتاریں گے، وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

پیغمبر ﷺ کی دعاؤں کی امید اس بناء پر ہے کہ قرآن حکیم نے جہاں پیغمبر ﷺ کو مسلمانوں سے زکوۃ کے مال وصول کرنے کا حکم دیا ہے وہیں یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ زکوۃ ادا کرنے والوں کے لیے آپ ﷺ دعا بھی کیا کریں، جیسے: آگے آنے والی آیت میں ارشاد ہے "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ" اس آیت میں پیغمبر ﷺ کو صدقات وصول کرنے کے ساتھ یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ ان کے لیے دعا کیا کریں۔

اسلام لانے میں پہل کرنے والوں کا انعام

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ

اور | سبقت کرنے والے | سب سے پہلے | میں سے | مہاجرین | اور | انصار | اور | وہ جو

اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ
پیروہوئے ان کے ساتھ اچھائی کے راضی ہو گئے اللہ تعالیٰ سے ان اور راضی ہوئے وہ سے ان اور تیار کر رکھے ہیں

لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ
واسطے ان کے ایسے باغ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہیں گے میں اس ہمیشہ یہ

الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۰۰﴾
کامیابی ہے بڑی (۱۰۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور مہاجرین اور انصار میں سے جنہوں نے پہل کی اور اوروں سے پہلے ایمان لائے اور جو نیکی کے ساتھ ان کے پیروکار رہوئے اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے اور تیار کر رکھے ہیں ان کے لیے باغ کہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے یہ بڑی کامیابی ہے۔(۱۰۰)

تفسیر

جن لوگوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو کوئی اہمیت نہ دی، ان لوگوں نے دین تو کھویا ہی تھا دنیا سے بھی تھوڑے دنوں میں ہاتھ دھو بیٹھے، لیکن کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فوراً آگے بڑھے اور آپ کی پیروی کی، اس کے بعد اوروں نے بھی ان کی پیروی کی، اور ایک ایک دو دو کر کے اسلام میں داخل ہوتے گئے، انہوں نے دنیا میں کامیابی حاصل کی، اور آخرت میں بھی انعام و اکرام کے مستحق ہوئے، مخالفوں کے حالات بیان کرنے کے بعد اس آیت میں اسلام کی دعوت قبول کرنے والوں کا حال بیان کیا گیا ہے، ان میں بھی چند طبقے تھے، کچھ تو سننے کے ساتھ ہی فوراً ایمان لے آئے اور کچھ ان کے بعد آہستہ آہستہ اسلام میں داخل ہوتے رہے۔

اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوئے اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے، اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق پر رضا کا معاملہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی خدمات کو قبول فرمایا، دین کے لیے ان

کی کوشش رنگ لائی، اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اجر وثواب بھی عطا کیا، البتہ بندوں کا اپنے اللہ سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے دین کے راستے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور قرآن کریم کے حکموں کو غالب کرنے کے لیے، نیز: اللہ اور پیغمبر کی محبت میں جتنی بھی تکلیفیں اٹھائیں، ان کو اپنے لیے راحت جانا، گویا وہ اللہ تعالیٰ سے ہر حالت میں راضی ہو گئے، چنانچہ احد کی جنگ کے واقعہ میں اس خاتون کا ذکر ملتا ہے جس کا خاوند، باپ، بھائی، اور بیٹے شہید ہو گئے تھے، جب اسے ان کی شہادت کی خبر سنائی گئی، تو کہنے لگی مجھے یہ بتاؤ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ پھر جب اسے بتایا گیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خیر وعافیت سے ہیں تو صحیح روایت کے مطابق اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے "کل مصيبة بعدک جلل" (آپ کے بعد ہر مصیبت بڑی مصیبت ہوتی آپ کے ہوتے ہوئے کوئی مصیبت مصیبت نہیں)، یعنی: اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک صحیح سلامت ہے تو پھر ہمارے لیے ہر مصیبت اور تکلیف کچھ بھی نہیں ہے ہمیں کسی تکلیف کی کوئی پرواہ نہیں "رضوا عنهم" کا یہی مطلب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر راضی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ ان کے لیے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔

احکام و مسائل

رضی اللہ الخ صحابہ کرام کے ساتھ خاص ہے

"رضی اللہ تعالیٰ عنہ" کا جملہ قرآن کریم میں صحابہ کرام کے لیے جملہ خبریہ کے طور پر آیا ہے، لیکن اسلاف نے بعض حضرات کے بارے میں "رضی اللہ تعالیٰ عنہ" کا جملہ دعا کے طور پر استعمال کیا ہے، چونکہ عوام جملہ خبریہ اور دعائیہ میں فرق نہیں جانتے اس لیے برصغیر کے علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ جملہ صحابہ کے ساتھ مخصوص ہے صحابہ کے سوا کسی اور کے نام کے ساتھ یہ جملہ استعمال نہ کیا جائے تاکہ عوام غیر صحابی کو صحابی نہ سمجھ لیں۔

صحابہ کرام کے سوا امت کے باقی نیک لوگوں کے لیے رحمہ اللہ تعالیٰ کے لفظ استعمال کرنے چاہئیں، صحابہ کرام جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کا اعلان کر دیا ہے ان پر نکتہ چینی کرنا، گمراہی کا باعث ہے حتی کہ اگر ان

کے آپس کے جھگڑے تنازعے کو کوئی شخص اچھا سمجھے گا، تو وہ بھی گمراہی سے نہیں بچ سکے گا، رافضی خارجی وغیرہ دین کی اس ابتدائی جماعت سے بغض رکھنے کی وجہ سے گمراہ ہوئے صحابہ کرام کی اتباع کرنا چاہئے اور تعریف ہی کرنی چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوگئے۔

ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے سامنے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے اس سے بڑی کامیابی کوئی نہیں ہوسکتی۔

"السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" (سابقین اولین کون ہیں؟)

السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ: اس جملہ میں اکثر حضرات مفسرین نے حرف "مِنَ" کو تبعیض کے لیے قرار دے کر مہاجرین وانصار، صحابہ کرام کے دو طبقے بیان کئے ہیں، ایک سابقین اولین کا دوسرا دوسرے درجے کے حضرات صحابہ کرام کا۔

پھر اس میں مختلف اقوال ہیں، بعض حضرات نے صحابہ کرام میں سے سابقین اولین ان کو قرار دیا ہے جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی ہے یعنی قبلہ کو بیت المقدس سے خانۂ کعبہ کی طرف پھیرنے کا حکم آنے سے پہلے جو حضرات مسلمان ہو چکے تھے وہ سابقین اولین ہیں، یہ قول سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: سابقین اولین وہ صحابہ ہیں جو بدر کی جنگ میں شریک ہوئے، اور شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جو صحابہ حدیبیہ کی بیعت رضوان میں شریک ہوئے وہ سابقین اولین ہیں اور ہر قول کے مطابق باقی صحابہ کرام مہاجر ہوں یا انصار سابقین اولین کے بعد دوسرے درجے میں ہیں۔

اور "تفسیر مظہری" میں ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ حرف "مِنَ" کو اس آیت میں تبعیض کے لیے نہ لیا جائے بلکہ بیان کے معنی میں ہو تو مفہوم اس جملے کا یہ ہوگا کہ تمام صحابہ کرام بہ نسبت باقی امت کے سابقین اولین ہیں اور "مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ" اس کا بیان ہے۔

پہلی تفسیر کے مطابق صحابہ کرام میں دو طبقے ہو جاتے ہیں، ایک سابقین اولین کا دوسرا ان لوگوں کا جو تحویل

قبلہ یعنی قبلہ کو بیت المقدس سے خانۂ کعبہ کی طرف پھیرنے کا حکم آنے یا بدر کی جنگ یا بیعت رضوان کے بعد مسلمان ہوئے اور آخری تفسیر کا حاصل یہ ہوا کہ صحابہ کرام سب کے سب سابقین اولین ہی ہیں، کیونکہ ان کا ایمان باقی امت سے پہلے ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ: یعنی: جن لوگوں نے اعمال واخلاق میں سابقین اولین کا اتباع مکمل طریقہ پر کیا پہلے جملے کی پہلی تفسیر کے مطابق ان لوگوں میں درجہ اول ان مہاجرین وانصار صحابہ کا ہے جو تحویل قبلہ یا بدر کی جنگ یا حدیبیہ کی بیعت کے بعد مسلمان ہو کر صحابہ کرام میں داخل ہوئے، دوسرا درجہ ان کے بعد کے سب مسلمانوں کا ہے جو قیامت تک ایمان اور نیک اعمال اور اعلیٰ اخلاق میں صحابہ کرام کے طریقے پر چلے اور ان کی مکمل پیروی کی۔

اور دوسری تفسیر کے مطابق ''الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ '' میں صحابہ کرام کے بعد کے حضرات داخل ہیں جن کو اصطلاح میں تابعی کہا جاتا ہے، اور پھر ان اصطلاحی تابعین کے بعد قیامت تک آنے والے وہ سب مسلمان بھی اس میں شامل ہیں جو ایمان اور نیک عمل میں صحابہ کرام کی مکمل پیروی کریں۔

صحابۂ کرام سب کے سب بغیر استثناء جنتی ہیں

محمد بن کعب قرظی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں، انہوں نے کہا کہ صحابۂ کرام سب کے سب جنتی ہیں، اگر چہ ان میں وہ لوگ ہوں جن سے دنیا میں غلطیاں اور گناہ بھی ہوئے ہیں، اس شخص نے پوچھا کہ یہ بات آپ نے کہاں سے کہی، (اس کی کیا دلیل ہے) انہوں نے فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت پڑھو ''وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ '' اس میں تمام صحابہ کرام کے متعلق بغیر کسی شرط کے ''رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ'' ارشاد فرمایا ہے: البتہ تابعین کے معاملہ میں ''اِتِّبَاعٌ بِاِحْسَان '' کی شرط لگائی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام کسی استثناء کے بغیر سب کے سب کامیاب اور جنتی ہیں۔

"تفسیر مظہری" میں یہ قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ میرے نزدیک سب صحابۂ کرام کے جنتی ہونے پر اس سے بھی زیادہ واضح دلیل یہ آیت ہی "لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَّنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ أُولٰٓئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ أَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ" اس آیت میں پوری وضاحت کے ساتھ یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ صحابۂ کرام اولین ہوں یا آخرین سب سے اللہ تعالیٰ نے حسنیٰ یعنی جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

صحابۂ کرام کے جنتی ہونے پر اس سے بھی واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ پاک نے فرمایا کہ "يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ" اَیْ: لَا يُخْزِيهِمْ بِإِدْخَالِ النَّارِ (جلالین) یعنی: اللہ ان کو دوزخ میں داخل نہیں کریں گے، اور حدیث میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: دوزخ کی آگ اس مسلمان کو نہیں چھو سکتی جس نے مجھے ایمان کی حالت میں دیکھا ہے یا ایمان کی حالت میں میرے دیکھنے والوں کو دیکھا ہے۔

تنبیہ!

جو لوگ صحابۂ کرام کے درمیان پیش آنے والے واقعات کی بناء پر بعض صحابۂ کرام کے متعلق ایسی تنقیدات کرتے ہیں جن سے پڑھنے والوں کے دلوں میں صحابہ کرام کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوں وہ اپنے آپ کو ایک خطرناک راستہ پر ڈال رہے ہیں، اللہ پاک ہمیں اس سے بچائے۔

اردگرد کے لوگوں کا حال

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕ وَ مِنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛؔ

اور میں سے ان جو گرد تمہارے ہیں میں سے دیہاتیوں منافق ہیں اور بعض والے مدینے

مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ

اڑے ہوئے ہیں پر نفاق نہیں جانتے آپ ان کو ہم جانتے ہیں انہیں عنقریب عذاب دیں گے ہم انکو

مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

دو مرتبہ پھر وہ لوٹائے جائیں گے طرف عذاب بڑے کی (۱۰۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور بعض تمہارے گرد کے گنوار منافق ہیں اور بعض مدینے کے لوگ منافقت پر اڑے ہوئے ہیں آپ ان کو نہیں جانتے ہم کو وہ معلوم ہیں، عنقریب انہیں ہم عذاب دیں گے دوبار پھر وہ بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ (۱۰۱)

تفسیر

اس آیت میں مدینہ منورہ اور اس کے گرد ونواح کی آبادی کا حال مسلمانوں کے آگے بیان کیا جاتا ہے ارشاد ہے کہ مدینہ کے گرد ونواح کے گاؤں کے بعض لوگ منافق ہیں جو ظاہر میں مسلمان بنے ہوئے ہیں، اور مدینہ میں بھی بہت سے لوگ ہیں جو منافقت پر اڑے ہوئے ہیں ان کی ظاہری حالت اور برتاؤ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ محض دکھاوے کے مسلمان ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کا سارا حال معلوم ہے، ان کو دو دفعہ سزا دی جائیگی، ایک تو ان کو دنیا کی مصیبتوں میں پھنسایا جائے گا، ذلیل وخوار کیا جائے گا پھر قبر کے عذاب میں مبتلا ہوں گے، آخرکار قیامت کے دن ان کو بہت بڑے عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔

اس میں اشارہ ہے کہ کسی دنیاوی غرض کے لیے بظاہر مسلمان بن جانا انجام کار عذاب سے نجات نہیں دلا سکے گا، نجات کے لیے ضروری ہے کہ دل میں ایمان ہو۔

"سورۂ محمد" میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ ان کو چہرے کی علامتوں نشانات اور بات کرنے سے پہچان لیں گے، مگر بعض ایسے گہرے منافق بھی ہیں، جو ان نشانیوں سے بھی نہیں پہچانے جاتے، لہٰذا آپ ان کو نہیں جانتے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے ان کو ظاہر نہ کردیں، یہاں سے پیغمبر ﷺ کے علمِ غیب کی نفی بھی ہوتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ: آپ بعض دیہاتی اور شہری منافقوں کو نہیں جانتے، بلکہ صرف ہم ہی انہیں جانتے ہیں۔

فرمایا کہ ہم عنقریب ان منافقوں کو دو بار سزا دیں گے، اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ منافقوں کو ایک سزا منافقت کی وجہ سے ملے گی، اور دوسری ان کی بدعملیوں کی وجہ سے یا پھر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں ایک سزا اس دنیا میں ذلت ورسوائی کی صورت میں ملے گی اور دوسری سزا عالم برزخ میں، اس دنیا میں بھی منافقوں کو بڑے بڑے حادثے پیش آئیں گے روایتوں میں آتا ہے کہ بعض کے جسموں پر ایسے خطرناک پھوڑے نکلے کہ انہی کی وجہ سے مر گئے یہ ایسے پھوڑے تھے جو سینے پر نکلتے تھے تو ان کی جلن پیٹھ پر محسوس ہوتی تھی، بعض اندھے ہو گئے، اور بعض دوسری مصیبتوں میں مبتلا ہوئے، اور پھر مرنے کے بعد برزخی زندگی میں ان کے لیے دوسری سزا شروع ہو جائے گی جن میں قبر کا عذاب قابل ذکر ہے۔

ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ: فرمایا پھر لے جائے جائیں گے بڑے عذاب کی طرف، اس دنیا اور برزخ کے بعد تیسرا عذاب آخرت کا ہوگا اور یہ سب سے بڑا اور ہمیشہ رہنے والا ہوگا، جس میں یہ منافقل لوگ مبتلا ہوں گے، اسی لیے ایسی جماعت سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔

خطا کار مسلمان

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ؕ

اور کچھ دوسرے لوگ ہیں | کہ اقرار کیا | گناہوں اپنے کا | ملایا انہوں نے | ایک کام | نیک | اور | دوسرا | برا

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

امید ہے | اللہ تعالیٰ سے | کہ | پھر توجہ کرے | اوپر ان کے | بلاشبہ | اللہ تعالیٰ | بخشنے والا | مہربان ہے (۱۰۲)

بامحاورہ ترجمہ: کچھ لوگ ہیں کہ انہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور ایک نیک کام اور دوسرے برے کام کو ملا دیا امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرے، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۱۰۲)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ مسلمانوں میں کچھ دوسرے لوگ ایسے بھی ہیں کہ دل سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور پیغمبر ﷺ کو برحق مان کر ان کے فرمان پر چلتے ہیں، لیکن طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے کوئی گناہ کا کام بھی ان سے ہوجاتا ہے اور جب ہوش میں آتے ہیں تو اپنے گناہ پر شرمندہ ہوتے ہیں اور اپنی غلطی کا اقرار کرتے ہیں اور آئندہ کے لیے توبہ کرتے ہیں لیکن پھر شیطان کا داؤ چل جاتا ہے اور گناہ کر بیٹھتے ہیں تو پھر توبہ کرتے ہیں اسی طرح یہ لوگ بھلے اور برے کام ملے جلے کرتے رہتے ہیں، چونکہ ان کے دل میں صحیح ایمان موجود ہے اس لیے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرمادیں گے اور ان کو اپنی رحمت سے بخش دیں گے، کیونکہ اس کی بخشش اور رحمت بہت وسیع ہے، اکثر مسلمان اسی طبقہ کے اندر داخل نظر آتے ہیں، ان کو چاہئے کہ شرک سے دور رہیں اور انسان ہونے کی حیثیت سے اگر کوئی گناہ ہوجائے تو فوراً اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی چاہیں، سچے دل سے توبہ کریں جان بوجھ کر نافرمانی نہ کریں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرمادیں گے۔

”تبوک“ کی جنگ کے لیے جب پیغمبر ﷺ کی طرف سے عام اعلان اور سب مسلمانوں کو حکم ہوا تو زمانہ سخت گرمی کا تھا، مسافت دور دراز کی تھی، اور ایک باقاعدہ بڑی حکومت کی تربیت یافتہ فوج سے مقابلہ تھا، جو اسلام کی تاریخ میں پہلا ہی واقعہ تھا یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے اس حکم کے متعلق لوگوں کے حالات مختلف ہوگئے اور ان کی جماعتوں کی کئی قسمیں ہوگئیں۔

ایک قسم ان حضرات مخلصین کی تھی جو اول حکم سنتے ہی بلاتردد جہاد کے لیے تیار ہوگئے دوسری قسم کے وہ لوگ تھے جو ابتداء کچھ تردد میں رہے پھر ساتھ ہولئے آیت: ”الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ“ میں انہی حضرات کا ذکر ہے۔

تیسری قسم ان حضرات کی ہے جو واقعی طور پر معذور تھے اس لیے نہ جاسکے ان کا ذکر آیت: ”لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ“ میں آیا ہے، چوتھی قسم ان مخلصین کی ہے جو عذر نہ ہونے کے باوجود سستی کاہلی کے سبب جہاد میں

شریک نہیں ہوئے ان کا ذکر" وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ " میں آیا ہے، پانچویں قسم ان منافقوں کی ہے جو اپنی منافقت کی وجہ سے جہاد سے پیچھے رہ گئے، یہاں اس آیت میں چوتھی قسم کے حضرات کا ذکر ہے جو مؤمن ہونے کے باوجود سستی وکاہلی سے جہاد میں شریک نہیں ہوئے۔

آیت میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے کچھ عمل نیک تھے، کچھ برے، ان کے نیک اعمال تو ان کا ایمان ،نماز روزہ کی پابندی اور اس جنگ سے پہلے کی جنگوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شرکت اور خود اس تبوک کے واقعہ میں اپنے جرم کا اعتراف کر لینا اور شرمندہ ہو کر توبہ کرنا وغیرہ ہیں، اور برے عمل تبوک کی جنگ میں شریک نہ ہونا اور اپنے عمل سے غیر ارادی طور پر منافقوں کی موافقت کرنا ہے۔

"تفسیر قرطبی" میں ہے کہ اگر چہ یہ آیت ایک خاص جماعت کے بارے میں اتری ہے، مگر حکم اس کا قیامت تک عام ہے، ان مسلمانوں کے لیے جن کے اعمال نیک وبد ملے جلے ہوں اگر وہ اپنے گناہوں سے توبہ کر لیں تو ان کے لیے معافی اور بخشش کی امید ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں "بخاری شریف" میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث موجود ہے آپ نے فرمایا رات کو خواب میں میرے پاس دو آنے والے آئے یہ اللہ کے فرشتے تھے، انہوں نے مجھے نیند سے جگایا اور اپنے ساتھ لے چلے، ہم ایک شہر میں پہنچے جس کی تعمیر میں ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی استعمال کی گئی تھی، وہاں ہم نے بعض لوگ دیکھے جن کا آدھا جسم نہایت خوبصورت اور آدھا حصہ بالکل بدصورت تھا، میرے ساتھ والے فرشتوں نے ان لوگوں کو کہا کہ اس نہر میں غوطہ لگاؤ جب وہ نہا کر واپس آئے تو ان کی بدصورتی دور ہو چکی تھی، اور سارا جسم خوبصورت ہو چکا تھا ان دو شخصوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ یہ جنت عدن ہے، اور آپ کا مقام یہیں ہے، فرشتوں نے یہ بھی بتایا کہ جن لوگوں کو نہر میں غسل دیا گیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں اچھے اور برے دونوں قسم کے کام کیے ہیں ان کے نیک کاموں کا اثر یہ ہوا کہ ان کے آدھے جسم نہایت خوبصورت ہو گئے اور برے عملوں کی وجہ سے باقی آدھے جسم نہایت بدصورت ہوئے اب اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا، اور نہر میں نہانے کے بعد وہ پاک ہو گئے ہیں یہ اسی آیت کی تفسیر ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نیکی اور برائی

دونوں قسم کے عمل انجام دینے والوں کو اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی وقت معاف فرمادیگا۔

نیک کاموں کی ترغیب

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ

لے لیں میں سے مالوں ان کے صدقہ کہ پاک کریں آپ ان کو اور بابرکت کریں آپ انکو ذریعے اس کے اور دعا کریں

عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

میں حق ان کے بلاشبہ دعا آپ کی تسکین ہے واسطے ان کے اور اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں(۱۰۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ لے لیں ان کے مال میں سے صدقہ کہ آپ ان کو پاک اور بابرکت کریں اس (زکوۃ لینے) کے ذریعہ اور دعا کریں ان کے لیے بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لیے سکون کا ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔(۱۰۳)

تفسیر

زکوۃ مال کے بڑھنے کا اور اس میں برکت کا باعث ہے پیچھے ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے بندے دل سے ایمان لاتے ہیں لیکن گناہ بھی کر بیٹھتے ہیں، ایسے لوگوں کو چاہئے کہ فوراً توبہ کریں اور نیک کام کریں کیونکہ نیک کام کرنے سے برائیاں معاف ہوتی رہتی ہیں، اس آیت میں ایک خاص نیک کام کا ذکر ہے جس سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور سماج کی حالت سدھرتی ہے، اور عام لوگ فقر وفاقہ کی وجہ سے گناہوں میں مبتلا نہیں ہوتے، ارشاد ہے کہ ان کے مالوں سے محتاجوں کے لیے صدقہ لیا کریں کیونکہ صدقہ ان کو برائیوں سے پاک کرے گا اور لوگ نسبتاً خوش حال ہوں گے لوگوں کو خوشحالی بھلے کاموں کی طرف بلانے کا موقعہ دیتی ہے۔

پھر ان لوگوں کے لیے دعا بھی کریں کیونکہ آپ کی دعا سے ان کے دلوں کو سکون ہوگا، کہ اللہ تعالیٰ اور پیغمبر ﷺ ہمارے حمایتی ہیں، ایک ہم پر رحمت کی بارش کررہا ہے اور ایک ہماری بہتری کی دعائیں مانگ رہا ہے،

ان کے دل میں اچھے کام اور صدقہ اور خیرات کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا، اور آپس کا میل جول بڑھے گا، نیک کام کرنے کو اور جی چاہے گا، آپس میں بھی اچھی باتیں کرنے اور کہنے کا موقعہ ملے گا، اللہ پاک ان سب باتوں کا سننے والا اور دل کے ارادوں کا جاننے والا ہے وہ ان کو نیکی کے راستے پر چلنے کی توفیق دے گا اور ان پر مہربانی فرمائے گا۔

"خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" کا شان نزول

جب ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو معافی مل گئی تو انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے مالوں کی وجہ سے ہم پر آزمائش آئی ہے، ہم اپنا مال صدقہ کرنا چاہتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ کہ مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا، تم اپنے مال اپنے پاس ہی رکھو، اس پر یہ آیت اتری "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیں۔

اس آیت میں اگرچہ شانِ نزول کے اعتبار سے ایک خاص جماعت سے صدقہ وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن وہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے۔

"تفسیر قرطبی، احکام القرآن، جصاص، مظہری" وغیرہ میں اسی کو زیادہ صحیح کہا گیا ہے، اور قرطبی اور جصاص نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اگر اس آیت میں شان نزول اسی خاص واقعہ کو قرار دیا جائے جس کا ذکر اوپر آیا ہے تو پھر بھی قرآنی اصول کی رو سے یہ حکم عام ہی رہے گا، اور قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے ہوگا کیونکہ قرآن کریم کے اکثر احکام خاص خاص واقعات میں اترے، مگر ان کے عمل کا دائرہ کسی کے نزدیک اس خاص واقعہ تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ جب تک کوئی دلیل اس حکم کو اس واقعہ کے ساتھ خاص کرنے کے لیے نہ ہو یہ حکم تمام مسلمانوں کے لیے عام ہی قرار دیا جاتا ہے۔

یہاں تک کہ پوری امت محمدیہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب خاص پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے، مگر یہ حکم نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ تک محدود، بلکہ ہر وہ شخص جو مسلمانوں کا

امیر ہوگا وہ اس حکم کا مخاطب ہوگا اس کی ذمہ داری میں یہ داخل ہے کہ مسلمانوں کی زکوۃ، صدقات کے وصول کرنے اور اس کو صحیح جگہ پر خرچ کرنے کا انتظام کرے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں جو زکوۃ کے انکار کرنے والوں پر جہاد کرنے کا واقعہ پیش آیا اس میں بھی زکوۃ نہ دینے والے کچھ تو وہ لوگ تھے جو کھلم کھلا اسلام سے باغی اور مرتد ہو گئے تھے، اور کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے مگر زکوۃ نہ دینے کا یہ بہانہ کرتے تھے، کہ اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے زکوۃ وصدقات وصول کرنے کا حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات تک تھا، ہم نے اس کی پیروی کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حق نہیں ہے کہ ہم سے زکوۃ وصدقات طلب کریں، اور شروع میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان پر جہاد کرنے سے اسی لیے تردد پیش آیا کہ یہ مسلمان ہیں ایک آیت کا غلط مطلب سمجھ کر زکوۃ سے بچنا چاہتے ہیں اس لیے ان کے ساتھ وہ معاملہ نہ کیا جائے جو عام مرتد لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، مگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مکمل پکے ارادے کے ساتھ فرمایا کہ جو شخص نماز اور زکوۃ میں فرق کرے گا اس کے خلاف جہاد کریں گے۔

اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ جو لوگ زکوۃ کے حکم کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کے ختم ہو جانے کے قائل ہوئے وہ کل کو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نماز بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھی، کیونکہ قرآن کریم میں یہ آیت بھی آئی ہے" اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ" جس میں نماز کو قائم کرنے کے مخاطب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر جس طرح نماز کی آیت کا حکم پوری امت کے لیے عام ہے اور اس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہونے کی غلط تاویل کرنے والوں کو کفر سے نہیں بچا سکتی ہے، اسی طرح آیت "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" میں یہ تاویل ان کو کفر وارتداد سے نہیں بچائے گی، بعد میں اس پر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بھی اطمینان ہو گیا اور صحابہ کرام کے اتفاق سے ان لوگوں کے خلاف جہاد کیا گیا۔

قرآن کریم نے اس آیت میں "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" کے بعد جو ارشاد فرمایا: "صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا" اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ زکوۃ وصدقات کوئی حکومت کا ٹیکس نہیں، جو عام

حکومتیں حکومت کا نظام چلانے کے لیے وصول کرتی ہیں بلکہ اس کا مقصد خود مالداروں کو گناہوں سے پاک صاف کرنا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ صدقہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور بری موت کو مٹاتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ان سے صدقہ قبول کرلیں تاکہ ان کو ظاہری اور باطنی پاکیزگی حاصل ہوجائے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ زکوۃ وصدقات کو وصول کرنے سے درحقیقت دو فائدے حاصل ہوتے ہیں، ایک فائدہ خود مال والے کا ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ گناہوں سے اور مال کی لالچ ومحبت سے پیدا ہونے والی اخلاقی بیماریوں سے پاک وصاف ہوجاتا ہے، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ فقیر اور مسکینوں کی پرورش ہوتی ہے، لیکن قرآن حکیم نے اس جگہ صرف پہلا فائدہ بیان کرکے اس طرف بھی اشارہ کردیا کہ زکوۃ وصدقات کا اصل مقصد پہلا ہی فائدہ ہے، دوسرا فائدہ اس سے ضمنی طور پر حاصل ہوجاتا ہے، اس لیے اگر بالفرض کسی جگہ یا کسی وقت کوئی فقیر، مسکین موجود نہ ہو جب بھی مالداروں سے زکوۃ کا حکم ختم نہ ہوگا۔

اس سے واضح ہوگیا کہ زکوۃ وصدقات کا اصل حکم کسی کی حاجت پوری کرنے کے لیے نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک مالی حق ہے، جیسے نماز روزہ جسمانی عبادات ہیں، یہ اس امت کی خصوصیات میں سے ہے کہ یہ مال جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے نکالا گیا ہے اس امت کے فقیروں اور مسکینوں کے لیے اس کا استعمال جائز کردیا گیا ہے جیسا کے صحیح مسلم کی حدیث میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی وضاحت منقول ہے۔

احکام ومسائل

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ: اس واقعہ میں جب ان حضرات کی توبہ قبول کرلی گئی تو گناہ کی معافی توبہ ہی کے ذریعہ ہوچکی پھر مال لینے کو پاک ہونے کا ذریعہ قرار دینے کے معنی کیا ہوں گے؟

جواب یہ ہے کہ ا: گرچہ توبہ سے گناہ معاف ہوگیا مگر گناہ معاف ہونے کے بعد اس کے کچھ اثرات باقی

رہ سکتے ہیں، جو آئندہ بھی گناہ کرنے کا سبب بن سکتے ہیں، صدقہ کرنے سے گناہوں کی میل کچیل بھی دور ہو کر مکمل صفائی ہو جائے گی۔

صلوٰۃ کے لفظ سے دُعا کا حکم؟

''وَصَلِّ عَلَيْهِم''اس میں لفظ صلوٰۃ سے مراد ان کے لیے رحمت کی دعا کرنا ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول یہی ہے کہ بعض لوگوں کے لیے آپ نے لفظ صلوۃ ہی سے دعا فرمائی جیسے ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اٰلِ اَبِيْ اَوْفٰى'' حدیث میں آیا ہے لیکن بعد میں لفظ صلوۃ پیغمبر علیہم السلام کی مخصوص علامت بن گئی؛ اس لیے اکثر فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کا اتفاق ہے کہ اب کسی شخص یا اشخاص کے لیے انفرادی طور پر لفظ صلوۃ سے دعا نہ کی جائے جیسے ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى زَيْدٍ'' بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع کر کے یوں دعا کی جاسکتی ہے ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَأَصْحَابِ مُحَمَّدٍ۔'' لفظ صلوۃ کو صرف پیغمبر علیہم السلام کے لیے مخصوص رکھا جائے تا کہ جو حضرات پیغمبر نہیں ان کے نام کے ساتھ اس لفظ کے استعمال سے ان کے پیغمبر ہونے کا شبہ نہ ہو جائے۔

یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدقہ دینے والوں کے لیے دعا کرنے کا حکم ہے، اس وجہ سے بعض حضرات فقہاء کرام نے فرمایا کہ امیر المؤمنین (مسلمان حکمران) کو صدقہ ادا کرنے والوں کے لیے دعا کرنا واجب ہے اور بعض حضرات نے اس کو مستحب قرار دیا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ ''صَدَقَةً'' سے زکوۃ مراد ہے کہ ان لوگوں سے زکوۃ وصول کرنے کا حکم ہوا تھا اور کچھ علماء فرماتے ہیں کہ اس سے عام صدقہ خیرات مراد ہے، گویا ہر قسم کا صدقہ واجبی یا نفلی وغیرہ وصول کرنے کی اجازت دیدی گئی تھی، کہ ان سے صدقہ لے لیں، تا کہ اس صدقہ کے ذریعہ ان کو پاک کردیں یعنی ظاہری طور پر بھی وہ پاک ہو جائے اور باطنی طور پر بھی پاک ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ سب کے کام دیکھ رہا ہے

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ

کیا نہ جانا انہوں نے بے شک اللہ تعالیٰ وہ قبول کرتا ہے توبہ سے بندوں اپنے اور لیتا ہے

الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ وَ قُلِ اعْمَلُوْا

صدقے اور بے شک اللہ تعالیٰ وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے (۱۰۴) اور آپ کہہ دیجئے کہ عمل کیے جاؤ

فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى

پس عنقریب دیکھے گا اللہ تعالیٰ کام تمہارے اور پیغمبر اس کا اور ایمان والے اور جلد لوٹائے جاؤ گے تم طرف

عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَ

جاننے والے چھپے اور کھلے کے پس وہ بتا دیگا تمہیں جو کچھ تھے تم کرتے (۱۰۵) اور

اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا يَتُوْبُ

دوسرے اور ہیں جو ٹھہرا دیئے گئے ہیں بوجہ حکم اللہ کے یا تو عذاب دیں آپ ان کو اور یا تو توبہ قبول کریں

عَلَيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

پر ان اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے (۱۰۶)

بامحاورہ ترجمہ: کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور صدقے لیتا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ (۱۰۴) اور کہہ دیجئے کہ عمل کئے جاؤ پھر آگے اللہ تعالیٰ اور اس کا پیغمبر اور مسلمان تمہارے کاموں کو دیکھ لیں گے پھر تم لوٹائے جاؤ گے چھپے اور کھلے کے جاننے والے کی طرف پھر وہ تمہیں بتا دے گا جو تم کرتے تھے۔ (۱۰۵) اور کچھ اور لوگ ہیں جن کا معاملہ رکا ہوا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم آنے تک یا ان کو عذاب دے یا ان کو معاف کر دے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (۱۰۶)

لفظی تحقیق: مُرْجَوْنَ:(جن کا فیصلہ مؤخر رکھا گیا) اسم مفعول کا صیغہ ہے اصل میں ''مُرْجَئُوْنَ'' تھا، پڑھنے میں ہمزہ گرا دیا گیا ہے اس کا مصدر ''اِرْجَاءٌ'' ہے جس کے معنی ہیں: ملتوی کر دینا، اور کسی اور وقت پر ٹال دینا، اس کا مادہ ر، ج، ء ہے ''رَجَاءٌ'' کے معنی امید اور توقع کے ہیں ''اِرْجَاءٌ'' امید رکھنا، انتظار میں رکھنا۔

تفسیر

ایمان والے جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی توبہ اور دعا اور ان کے صدقات اور خیرات خود قبول کرتا ہے اور وہی براہ راست مہربانی فرماتا ہے، اس آیت میں ارشاد ہے کہ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے، کہ ان کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہے، جو کام وہ اس کے لیے کریں گے وہ اسے قبول کرے گا ان سے کہہ دیں کہ نیک کام کیے جاؤ اس کو اللہ تعالیٰ تو دیکھتا ہی ہے، اس کا پیغمبر اور ایمان والے بھی سب دیکھیں گے دنیا میں تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جائے گا جیسے تمہارے عمل امتحان سے ثابت ہونگے، آخر کار ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو گے وہ تمہاری چھپی اور کھلی سب باتوں سے واقف ہے تم کو بتادے گا کہ تمہارے عمل کس قابل ہیں اور ان کا بدلہ کیا ملنا چاہیے۔

حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی آتا ہے کہ اے آدم کے بیٹے! یہ ہیں تیرے عمل ہیں جن کو میں نے شمار کر رکھا ہے، اگر یہ عمل اچھے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر، اور اگر یہ برے ہیں تو اپنے آپ کو ملامت کر، یہ تیرے ہاتھوں کی کمائی ہے، جو مخلص مسلمان تبوک کی جنگ میں اپنی سستی کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے وہ دو طرح کے تھے، ایک وہ جو فوراً شرمندہ ہوئے اور اپنے آپ کو خود سزا دے لی۔

ان میں سے ایک ابولبابہ رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستون کے ساتھ کس کر باندھ دیا، اور کہا کہ اب اس سے مجھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی واپس آکر کھولیں گے، ان کا ذکر ''وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا'' میں گذر چکا ہے باقی تین آدمی ایسے تھے جنہوں نے نہ شرمندگی کا اظہار کیا نہ توبہ کے طور پر اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں کے ساتھ باندھا، اور اس طرح کھلے طور پر اپنی اس غلطی کا اعتراف نہیں کیا جس طرح دوسرے سات صحابہ کرام

نے کیا، اس آیت میں ان تین صحابہ کرام کی توبہ کے مؤخر ہونے کا ذکر ہے، ان کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا حکم آنے تک صحابہ کرام کو ان کا بائیکاٹ کرنے اور بات چیت بند رکھنے کا حکم دیدیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کی طرف سے مکمل بائیکاٹ ہونے کے بعد ان حضرات کی حالت درست ہوگئی اور اخلاص کے ساتھ اپنی اس غلطی کا اعتراف کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی تو پچاس دنوں کے بعد ان کے لیے بھی معافی کے حکم دیدئے گئے۔

دو اور گروہ

وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ
اور وہ لوگ بنائی جنہوں نے مسجد تکلیف پہنچانے کو اور کفر کرنے کو اور پھوٹ ڈالنے کو درمیان

الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ
مسلمانوں کے اور گھات کے لیے واسطے اس شخص کے لڑا جو اللہ تعالیٰ سے اور پیغمبر اس کے سے

قَبْلُ ؕ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ
پہلے ہی اور ضرور قسمیں کھائیں گے وہ نہیں چاہا ہم نے مگر بھلائی اور اللہ تعالیٰ گواہ ہے

اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ
کہ بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں (۱۰۷) نہیں کھڑے ہوں آپ میں اس کبھی

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جنہوں نے (مسلمانوں کو) ضرر پہنچانے کو مسجد بنائی اور کفر اور پھوٹ ڈالنے کے لیے مسلمانوں میں اس شخص کے قیام کا سامان کرنے کے لیے جو پہلے سے ہی اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کا مخالف تھا، اور وہ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی اور اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ (۱۰۷)

تو آپ اس میں کبھی نہ کھڑے ہوں۔

تفسیر

''وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مَسۡجِدًا ضِرَارًا'' حقیقت میں مسجد تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اعتکاف کرنے کے لیے بنائی جاتی ہے مگر ایک عیسائی راہب ابو عامر کے کہنے پر دوسرے منافقوں نے سازش کے تحت ایک مسجد بنائی تھی جس کا اس آیت میں ذکر ہے، اس مسجد کے بنانے کا مقصد مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا، مسجد کی آڑ میں منافق لوگ کفر کو مضبوط اور اسلام کو کمزور کرنا چاہتے تھے، اس کے علاوہ ایک مقصد یہ بھی تھا، کہ مومنوں کے درمیان پھوٹ ڈال دی جائے، یہ مختلف گروہوں میں بٹ جائیں کچھ ایک مسجد میں جائیں، کچھ دوسری میں اور اس طرح ان کا آپس میں رابطہ کٹ جائے اور یہ آسانی سے منافقوں کی سازشوں کا شکار ہو سکیں، ابو عامر راہب کی سازش کے مطابق اس مسجد کو مسلمانوں کے خلاف ایک سازشی اڈے کے طور پر استعمال کرنا تھا۔

وَ اِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ مِنۡ قَبۡلُ: یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پہلے سے لڑتا رہا ہے اس کے لیے یہ مسجد ٹھکانے کا کام دے سکے، وہ خود یا اس کے آلہ کار آدمی یہاں ٹھہر کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بنا سکیں اس سے مراد وہی ابو عامر راہب ہے جو شام کی طرف جاتے وقت یہ ساری اسکیم بنا گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ اس نظریے کے تحت تیار کی گئی مسجد مسجد کہلانے کی لائق ہی نہیں۔

فرمایا کہ: منافقوں نے مسجد تو غلط مقصد کے لیے بنائی ہے مگر پھر بھی یہ قسمیں اٹھائیں گے کہ ہمارا مقصد تو محض بھلائی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ بارش وغیرہ میں لوگوں کو تکلیف نہ ہو اور وہ آسانی سے یہیں نماز ادا کر لیا کریں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ اس بات کی گواہی دیتا ہے، کہ یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں ان کی بات پر یقین نہیں کریں یہ زبان سے کچھ کہہ رہے ہیں اور دل میں کچھ اور ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اس مسجد میں کبھی کھڑے نہ ہوں، یہ منافق لوگ آپ کو وہاں نماز پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں مگر وہاں جانا ہرگز آپ کے شایان شان نہیں ہے، لہٰذا آپ اس مسجد میں ہرگز نماز نہ پڑھیں۔

ان آیتوں کا پس منظر

منافقوں کے حالات اور اسلام کے خلاف ان کی حرکتوں کا ذکر اوپر بہت سی آیتوں میں آچکا ہے ان آیتوں میں بھی ان کی ایک سازش کا ذکر ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک شخص ابو عامر نامی زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہو گیا تھا، پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام پر اعتراض کئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جواب پر بھی اس بدنصیب کو اطمینان نہ ہوا، بلکہ یہ کہا کہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہو وہ مردود اور عزیزوں رشتہ داروں سے دور ہو کر پردیس میں مرے، اور کہا کہ آپ کے مقابلہ میں جو بھی دشمن آئے گا میں اس کی مدد کروں گا، چنانچہ اس نے حنین کی جنگ تک تمام جنگوں میں مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ لڑائیوں میں شرکت کی، جب ہوازن کا بڑا اور طاقتور قبیلہ بھی شکست کھا گیا تو یہ مایوس ہو کر ملک شام بھاگ گیا، کیونکہ یہی ملک نصرانیوں کا مرکز تھا، وہیں جا کر اپنے عزیزوں رشتہ داروں سے دور مر گیا، جو بد دعا اس نے کی تھی وہ اس کے سامنے آگئی،، خود ہی اپنی بد دعا سے ذلیل وخوار ہوا، مگر جب تک زندہ رہا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش میں لگا رہا، چنانچہ قیصر روم کو اس پر تیار کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے لشکر سے مدینہ پر چڑھائی کر دے، اور مسلمانوں کو یہاں سے نکال دے۔

اسی سازش کا ایک معاملہ یہ پیش آیا کہ اس نے مدینہ کے منافقوں کو جن کے ساتھ اس کا ساز باز تھا خط لکھا کہ میں اس کی کوشش کر رہا ہوں کہ قیصر مدینہ پر چڑھائی کر دے، مگر تم لوگوں کی کوئی اجتماعی طاقت ہونی چاہئے، جو اس وقت قیصر کی مدد کرے، اس کی صورت یہ ہے کہ تم مدینہ ہی میں ایک مکان بناؤ، اور یہ ظاہر کرو کہ ہم مسجد بنا رہے ہیں کہ تا کہ مسلمانوں کو شبہ نہ ہو پھر اس مکان میں تم اپنے لوگوں کو جمع کرو، اور جس قدر اسلحہ اور سامان جمع کر سکتے ہو وہ بھی کرو، یہاں مسلمانوں کے خلاف آپس کے مشورہ سے معاملات طے کیا کرو۔

اس کے مشورہ پر بارہ منافقوں نے مدینہ طیبہ کے محلہ قباء میں جہاں پہلی ہجرت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیام فرمایا اور ایک مسجد بنائی تھی وہیں ایک دوسری مسجد کی بنیاد رکھی ان منافقوں کے نام بھی ابن اسحاق وغیرہ نے نقل کئے ہیں، پھر مسلمانوں کو فریب دینے اور دھوکے میں رکھنے کے لیے یہ ارادہ کیا کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک نماز

اس جگہ پڑھوادیں، تاکہ سب مسلمان مطمئن ہو جائیں کہ یہ بھی ایک مسجد ہے جیسا کہ اس سے پہلے ایک مسجد یہاں بن چکی ہے۔

ان کا ایک وفد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ قباء کی موجودہ مسجد بہت سے لوگوں سے دور ہے، ضعیف بیمار آدمیوں کو وہاں تک پہنچنا مشکل ہے۔ اور خود مسجد قباء اتنی بڑی بھی نہیں کہ پوری بستی کے لوگ اس میں سما سکیں اس لیے ہم نے ایک دوسری مسجد اس کام کے لیے بنائی ہے تاکہ بوڑھے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے، آپ اس مسجد میں ایک نماز پڑھ لیں تاکہ برکت ہو جائے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تبوک کی جنگ کی تیاری میں مشغول تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وعدہ کر لیا کہ اس وقت تو ہمیں سفر درپیش ہے، واپسی کے بعد ہم اس میں نماز پڑھ لیں گے، لیکن تبوک کی جنگ سے واپسی کے وقت جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ پر آرام کے لیے اترے تو یہ آیتیں اتریں، جن میں ان منافقوں کی سازش کھول دی گئی تھی، ان آیتوں کے اترنے کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چند صحابہ کرام جن میں عامر بن سکن اور وحشیؓ وغیرہ شریک تھے، ان کو حکم دیا کہ ابھی جا کر اس مسجد کو ڈھادو اور اس میں آگ لگا دو، یہ سب حضرات اسی وقت گئے اور حکم کی تعمیل کر کے اس کی عمارت کو ڈھا کر زمین برابر کر دی یہ تمام واقعہ "تفسیر قرطبی" اور "مظہری" کی بیان کی ہوئی روایتوں سے لیا گیا ہے۔

"تفسیر مظہری" میں محمد بن یوسف صالحی کے حوالہ سے یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم قباء سے مدینہ منورہ پہنچ گئے تو مسجد ضرار کی جگہ خالی پڑی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاصم بن عدی کو اس کی اجازت دی کہ وہ اس جگہ اپنا گھر بنالیں، انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے پیغمبر جس جگہ کے متعلق قرآن کریم کی آیتیں اتر چکی ہیں، میں اس منحوس جگہ میں گھر بنانا پسند نہیں کرتا، البتہ ثابت بن اقرم ضرورت مند ہیں ان کے پاس کوئی گھر نہیں، ان کو اجازت دیدیجئے کہ وہ یہاں مکان بنالیں، ان کے مشورے کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جگہ ثابت بن اقرم کو دیدی، مگر ہوا یہ کہ جب سے ثابت رضی اللہ عنہ اس مکان میں رہے، ان کے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا یا زندہ نہیں رہا، تاریخ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ انسان تو کیا اس جگہ میں کوئی مرغی انڈے بچے دینے کے قابل نہ رہی کوئی کبوتر اور جانور

بھی اس میں پھلا پھولا نہیں، چنانچہ اس کے بعد یہ جگہ آج تک مسجد قباء کے کچھ فاصلہ پر ویران پڑی ہے۔

احکام و مسائل

اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ آج کل اگر کسی مسجد کے مقابلہ میں اس کے قریب کوئی دوسری مسجد کچھ مسلمان بنالیں، اور بنانے کا مقصد یہی مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنا اور پہلی مسجد کی جماعت توڑنا وغیرہ خراب مقاصد ہوں، تو اگر چہ ایسی مسجد بنانے والے کو ثواب تو نہ ملے گا، بلکہ مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی سازش کی وجہ سے گناہ گار ہوگا، لیکن اس کے باوجود اس جگہ کو شرعی حیثیت سے مسجد ہی کہا جائے گا، اور تمام آداب اور احکام مسجد کے اس پر جاری ہوں گے، اس کا ڈھانا آگ لگانا جائز نہیں ہوگا اور جو لوگ اس میں نماز پڑھیں گے ان کی نماز بھی ادا ہو جائے گی، اگر چہ ایسا کرنا فی نفسہ گناہ رہے گا۔

اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس طرح دکھاوے کے لیے یا ضد اور دشمنی کی وجہ سے جو مسلمان کوئی مسجد بنالے اگر چہ بنانے والے کو مسجد بنانے کا ثواب نہ ملے گا بلکہ اس بری نیت کی وجہ سے گناہ ہوگا، مگر اس کو منافقوں والی مسجد ضرار نہیں کہا جائے گا بعض لوگ جو اس طرح کی مسجد کو مسجد ضرار کہہ دیتے ہیں یہ درست نہیں، البتہ اس کو مسجد ضرار کے مشابہ کہہ سکتے ہیں؛ اس لیے اس کے بنانے کو روکا بھی جا سکتا ہے، جیسا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک فرمان جاری فرمایا تھا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ ایک مسجد کے قریب دوسری مسجد نہ بنائی جائے جس سے پہلی مسجد کی جماعت اور رونق متاثر ہو۔

مسئلہ (۱):.....اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی اگر کوئی نئی مسجد پہلی مسجد کے متصل بلا کسی ضرورت کے محض دکھاوے کے لیے یا ضد اور دشمنی کی وجہ سے بنائی جائے تو اس میں نماز پڑھنا بہتر نہیں، اگر چہ نماز ہو جاتی ہے۔

نیک نیتی اصل چیز ہے

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ

بے شک وہ مسجد بنیاد رکھی گئی جس کی پر تقویٰ سے پہلے ہی دن لائق ہے اس کی کہ قیام کریں آپ

فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

میں اس بیچ اس کے لوگ ہیں ایسے پسند کرتے ہیں جو کہ پاک رہنا اور اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے خوب پاک رہنے والوں کو (۱۰۸)

بامحاورہ ترجمہ: البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (۱۰۸)

تفسیر

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ نماز ادا کرنے کے لیے کونسی مسجدیں مناسب ہیں جو مسجدیں اس آیت کے معیار پر پوری نہ اتریں وہ اس قابل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر اور مسلمان اس میں نمازیں ادا کریں۔

ارشاد ہے کہ وہ مسجدیں جو شروع ہی سے خلوص اور نیک نیتی کی بنا پر بنائی گئی ہے یہی اس قابل ہیں کہ ان میں نماز پڑھی جائے، ایسی مسجدیں اس وقت مسجد نبوی اور مسجد قبا تھیں، ان مسجدوں میں ایسے لوگ ہیں جن کے دل کفر اور منافقت اور بدنیتی سے پاک صاف ہیں اور اپنے ظاہر کو بھی وہ قاعدے کے مطابق پاک وصاف رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

آیت کی اگلی اور پچھلی آیت پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مراد اس سے مسجد قباء ہے، جس میں اس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کرتے تھے، اور حدیث کی بعض روایتوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اور بعض روایتوں میں یہ آیا ہے کہ اس سے مراد مسجد نبوی ہے جس کی بنیاد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک

ہاتھوں سے رکھی تھی ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر ہے، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ پاک باز کون ہوسکتا ہے، اس لیے وہ بھی اس کی مراد ہوسکتی ہے۔

احکام ومسائل

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی مسجد کی فضیلت کا اصل مدار تو اس پر ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے بنائی گئی ہو، اس میں کسی دکھاوے یا غلط نیت کا کوئی دخل نہ ہو، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازیوں کے نیک، عالم اور عبادت گذار ہونے سے بھی مسجد کی فضیلت بڑھ جاتی ہے، جس مسجد کے نمازی عام طور پر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے نیک اور عبادت گذار ہوں اس میں نماز ادا کرنے کی فضیلت زیادہ ہے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ مسجد کی تعمیر خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہونی چاہئے۔

تقویٰ مضبوط بنیاد ہے

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ

کیا پس وہ　بنیاد رکھی جس نے　عمارت اپنی کی　پر　تقویٰ　کے　اللہ تعالیٰ　اور　خوشنودی　بہتر ہے

اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ

یا　وہ　بنیاد رکھی جس نے　عمارت اپنی کی　اوپر　کنارے　گڑھے　گرنے والے کے　پس گرا وہ　لے کر اس کو

فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

میں　آگ　دوزخ کی　اور　اللہ تعالیٰ　نہیں　ہدایت کرتا　لوگوں　ظالم کی　(۱۰۹)

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ

ہمیشہ رہے گی　عمارت اس کی　جو　بنائی انہوں نے　شبہ (بن کر)　میں　دلوں ان کے　مگر　یہ کہ

تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

ٹکڑے ہوجائیں　دل ان کے　اور　اللہ تعالیٰ　جاننے والا　حکمت والا ہے (۱۱۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بھلا جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ سے ڈرنے اور اس کی رضامندی پر رکھی وہ بہتر ہے یا جس نے اپنی عمارت کی بنیاد رکھی ایک کھائی کے کنارے پر جو گرنے کو ہے پھر وہ اس کو لے کر گر پڑی دوزخ کی آگ میں اور اللہ تعالیٰ راہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو۔ (۱۰۹) جو عمارت انہوں نے بنائی تھی اس سے ان کے دل میں ہمیشہ شبہ رہے گا مگر جب ان کے دل کے ٹکڑے ہوجائیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (۱۱۰)

تفسیر

ارشاد ہے کہ جو شخص مسجد اس نیت سے بنائے کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے لیے اس کے فرمانبردار لوگ جمع ہوں وہ اس شخص سے کہیں بہتر ہے جس کی نیت ڈانواں ڈول ہے، اور مسجد بنانے سے اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ مختلف دنیاوی مقاصد ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ایک ایسے گڑھے کے کنارے پر ہو جو گرنے کو ہو رہا ہو مکان بنائے یقیناً وہ کسی نہ کسی دن اسے لے کر گڑھے میں گر پڑے گا اس کے بعد وہ اپنی بدنیتی کی وجہ سے اپنے عملوں کے ساتھ دوزخ میں جا پڑے گا۔

اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کو راضی کرنے کی خواہش آدمی کے ہر عمل کی بنیاد ہونی چاہئے اس کے سوا اور سب نیتیں دنیا کی زندگی کے ساتھ ختم ہوجائیں گی، اور ظاہری طور پر اس کے جو عمل نیک تھے لیکن حقیقت میں وہ سارے بدنیتی پر تھے سارے کے سارے برباد ہوجائیں گے۔

اس کے بعد والی آیت میں مسجد ضرار کا جو منافقوں نے مسجد قبا کے مقابلے میں بنائی تھی، ذکر ہے اس مسجد کی بنیاد بدنیتی پر تھی مسلمانوں کو نقصان پہنچانا اس کا مقصد تھا، لیکن چونکہ اس کی بابت وحی کے ذریعہ اطلاع دے دی گئی اس لیے اس کو ڈھایا گیا اور بنانے والوں کو کچھ حاصل نہ ہوا، البتہ اسلام سے ان کا دل اور زیادہ بیٹھ گیا، وہ کچھ کر تو نہ سکے لیکن دل ہی دل میں جلتے اور کڑھتے رہے، یہ غلط جذبات ان کے دل میں بہت گہرے بیٹھ گئے اور اب یہ نکل نہیں سکتے جب تک کہ ان کے دلوں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے نہ کردیا جائے اللہ تعالیٰ کو ان کی بدنیتی کا اچھی طرح سے علم تھا، اس نے مصلحت اور حکمت کی بنا پر ان کا داؤ چلنے نہ دیا اور ان کے سارے منصوبے خاک

میں ملا دیئے اور مسلمانوں کو ان کے ایمان اور نیک نیتی کی وجہ سے ہر طرح سرخ رو کیا اور اپنی رحمت سے عزت ودولت عطا کی اور آئندہ کے لیے ہر مسلمان کو اس واقعہ سے یہ سبق لینا چاہئے کہ کسی معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا کسی دنیاوی فائدے کو مقصد نہ بنائے۔

نفع کا سودا

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ

تحقیق اللہ تعالیٰ نے خرید لیں | سے | ایمان والوں | جان ان کی | اور | مال ان کے | وجہ اس کہ کے

لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۫

واسطے ان کے جنت ہے | لڑتے ہیں | میں | راستے | اللہ تعالیٰ کے پس قتل کرتے ہیں | اور | قتل کئے جاتے ہیں

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ

وعدہ ہے | اس کا | ٹھیک | میں | تورات | اور | انجیل | اور | قرآن | اور | کون

اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ

زیادہ پورا کرنے والا ہے قول اپنے کا | سے | اللہ تعالیٰ | پس خوشیاں مناؤ | ساتھ اس سودے کے | جو | کر لیا تم نے

بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

سے اس | اور | یہ | وہ | کامیابی ہے | زبردست (۱۱۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کے مال خرید لیے اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے وہ لڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں وعدہ ہو چکا اس کے ذمے سچا تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ قول کا پورا کرنے والا کون ہے؟ سو اس معاملے پر جو تم نے کیا ہے خوشیاں مناؤ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔(۱۱۱)

تفسیر

اس آیت میں جہاد کا فائدہ بیان کر دیا گیا ہے کہ جہاد کے ذریعہ آخرت میں جنت کا ملنا یقینی ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دین کے لیے جہاد وہ چیز ہے جس کو سارے پیغمبر سکھاتے چلے آئے ہیں اور ہر پیغمبر کو جو کتاب ملی اس میں اس کو اسی طرح پیش کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا جو بھی پیغمبر آیا اس نے انسانوں سے یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ کا دل سے یقین کرو، یعنی: اس پر ایمان لاؤ، اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تم سے یہ چاہتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ کر کے اس کے حکم کے مطابق زندگی گذارو اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی جان اور مال سے اس کے حکم کو پورا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ جان جائے یا رہے مال رہے یا نہ رہے، دونوں صورتوں میں تمہیں اس کے حکم پورا کرنے کے بدلے میں جنت ملی گی، یہ اللہ تعالیٰ کا پکا وعدہ ہے جو" تورات، انجیل اور قرآن کریم" میں موجود ہے۔

فرمایا: اس عارضی جان و مال کے ذریعے جنت کا سودا کر لینا یہ بہت بڑی کامیابی ہے سابقین اولین مہاجرین اور انصار کے فرمانبرداروں سے یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ خدا کی رضا کے لیے جان و مال کی قربانی پیش کریں گے آگے ان کی صفت بھی بیان کی گئی ہیں۔

احکام ومسائل

پچھلی آیتوں میں جہاد سے کسی مجبوری اور عذر کے بغیر پیچھے رہ جانے کی مذمت کا بیان تھا، ان آیتوں میں مجاہدین کی فضیلت کا بیان ہے۔

شانِ نزول

مفسرین کرام نے فرمایا ہے کہ: یہ آیتیں بیعت عقبہ میں شریک ہونے والے صحابہ کرام کے بارے میں

اتریں، جو ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں مدینہ کے انصار سے لی گئی تھی اسی لیے پوری سورت کے مدنی ہونے کے باوجود ان آیتوں کو مکی کہا گیا ہے۔

عقبہ پہاڑ کے حصہ کو کہا جاتا ہے اس جگہ وہ عقبہ مراد ہے جو منیٰ میں جمرہ عقبہ کے ساتھ پہاڑ کا حصہ ہے آج کل حاجیوں کی کثرت کی وجہ سے پہاڑ کا یہ حصہ صاف کر کے میدان بنا دیا گیا ہے صرف جمرہ رہ گیا ہے، اس عقبہ پر مدینہ والوں سے تین مرتبہ بیعت لی گئی ہے، پہلی بیعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے پیغمبری ملنے کے بعد گیارہویں سال میں ہوئی جس میں چھ حضرات مسلمان ہو کر بیعت کر کے مدینہ واپس ہوئے تو مدینہ کے گھر گھر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا چرچا ہونے لگا اگلے سال حج کے موسم میں بارہ حضرات اسی جگہ جمع ہوئے، جن میں پانچ پہلے اور سات نئے تھے سب نے بیعت کی اب مدینہ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہوگئی، جو چالیس افراد سے زیادہ تھی، انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں قرآن کریم پڑھانے کے لیے کسی کو بھیج دیا جائے، رسول پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجدیا، انہوں نے موجودہ مسلمانوں کو قرآن بھی پڑھایا، اور اسلام کی تبلیغ بھی کی جس کے نتیجہ میں مدینہ کی بڑی جماعتیں اسلام میں داخل ہوگئیں۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبری کے تیرہویں سال میں ستر مرد و عورتیں اسی جگہ جمع ہوئے، یہ تیسری بیعت عقبہ ہے جو آخری ہے، اور عموماً بیعت سے یہی مراد ہوتی ہے، یہ بیعت اسلام کے اصول وعقائد و عمل کے ساتھ خصوصی طور پر کافروں سے جہاد کرنے پر اور جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اور نصرت کرنے پر لی گئی، اس میں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے پیغمبر! اس وقت معاہدہ ہو رہا ہے، آپ جو شرائط اپنے رب کے متعلق یا اپنے متعلق کرنا چاہیں وہ واضح کردی جائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں اللہ تعالیٰ کے لیے تو یہ شرط رکھتا ہوں کہ آپ سب اس کی عبادت کریں گے، اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اور اپنے لیے یہ شرط ہے کہ میری حفاظت اس طرح کریں گے جیسے اپنی جانوں اور اپنے مال اور اپنے بیوی بچوں و اولاد کی حفاظت کرتے ہو۔

ان حضرات نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کیا کہ اگر ہم یہ دونوں شرطیں پوری کردیں تو ہمیں اس کے بدلے

میں کیا ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت ملے گی، ان سب حضرات نے خوش ہو کر کہا کہ ہم اس سودے پر راضی ہیں اور ایسے راضی ہیں کہ اب اس کو نہ خود ختم کرنے کی درخواست کریں گے نہ اس کے ختم کرنے کو پسند کریں گے۔

اس جگہ چونکہ اس بیعت میں ظاہرا صورت...... ایک لین دین کے معاملے کی بن گئی تو اس پر یہ آیت خرید وفروخت کے لفظ کے ساتھ اتری ''اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ'' یہ آیت سن کر سب سے پہلے حضرت براء بن معرور اور ابوالہیثم اور اسعد رضی اللہ عنہم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اس طرح کریں گے جیسے اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر اگر پوری دنیا کے کالے اور گورے سب جمع ہو جائیں تو ہم سب کا مقابلہ کریں گے۔

جہاد کی سب سے پہلی آیت

مکہ معظمہ میں جہاد کے احکام نہیں تھے، یہ سب سے پہلی آیت ہے جو مکہ مکرمہ ہی میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑنے کے بارے میں اتری اور اس کا عمل ہجرت کے بعد شروع ہوا، جب یہ بیعت عقبہ مکے والوں سے خفیہ طور پر مکمل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا حکم دیدیا اور آہستہ آہستہ صحابہ کرام کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملنے کے انتظار میں رہے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے ساتھ روک لیا (یہ واقعہ ''تفسیر مظہری'' میں حوالہ کے ساتھ مذکور ہے)

اس سودے کے نفع بخش ہونے کی خوبصورت تشریح

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ: آیت کے اس جملہ میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ خرید وفروخت کا یہ معاملہ تمہارے لیے نفع اور برکت کا سودا ہے، کیونکہ ایک فنا ہونے والی چیز جان ومال دے کر ہمیشہ باقی رہنے والی

چیز بدلے میں مل گئی اور غور کیا جائے تو خرچ صرف مال ہوا، جان تو ،یعنی: روح تو مرنے کے بعد بھی باقی رہے گی اور ہمیشہ رہے گی، اور مال پر غور کیا جائے تو وہ بھی تو حق تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے، انسان تو اپنی پیدائش کے وقت خالی ہاتھ آتا ہے، اسی نے سب سامان اور مال و دولت کا اس کو مالک بنایا ہے اپنے ہی دئے ہوئے مال کو آخرت کی نعمتوں اور جنت کا معاوضہ بنا کر جنت دیدی، اسی لیے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ عجیب سودا ہے کہ مال اور قیمت دونوں تمہیں ہی دیدیئے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: سنو! یہ کیسی نفع کی تجارت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر مؤمن کے لیے کھول دی ہے اور فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں مال بخشا ہے تم اس میں سے تھوڑا خرچ کر کے جنت خریدلو۔

مسلمانوں کے کام

اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآىِٕحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ
توبہ کرنے والے | عبادت گذار | حمد وثنا کرنے والے | روزے رکھنے والے | رکوع کرنے والے | سجدہ کرنے والے

الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ
حکم کرنے والے | نیک کام کا | اور | روکنے والے | سے | برے کام | اور | خیال رکھنے والے

لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾
حدودوں کا | اللہ تعالیٰ کی | اور | خوشخبری دیجئے | مؤمنوں کو | (۱۱۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور وہ توبہ کرنے والے عبادت کرنے والے شکر کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے نیک بات کا حکم کرنے والے بری بات سے منع کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں اور ایمان والوں کو خوش خبری سنادیجئے۔ (۱۱۲)

تفسیر

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جو یہ سودا اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچے دل سے کر لیتا ہے، اس میں یہ ساری خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں کوئی قصور ہو جائے، تو فوراً توبہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی بندگی میں مشغول رہتا ہے، روزہ رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی سے سر جھکاتا ہے، ماتھا زمین پر ٹیکتا ہے، نیک کام کرنے والے اور ان صفات پر قائم رہنے والے لوگ یقیناً ایمان والے لوگ ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ ان کو خوشخبری سنا دیجئے کہ یہ لوگ دونوں جہاں میں کامیاب ہوں گے۔

ان دو آیتوں میں دین کی حقیقت پورے طور پر واضح کر دی گئی ہے اور دیندار جس طرح اس دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں اس کا پورا نقشہ کھینچ کر سامنے رکھ دیا گیا ہے، جو شخص سمجھنا چاہے وہ ان آیتوں پر غور کرے۔

''السَّآئِحُوْنَ '' کے ایک معنی روزہ دار کے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں ''سَائِحِیْنَ '' کا لفظ آیا ہے اس سے مراد ''صَائِمِیْنَ '' یعنی: روزے دار کے ہیں۔

''الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ '' یعنی: مومن لوگ رکوع سجدہ کرتے ہیں رکوع سجدہ چونکہ نماز کے اہم جزء ہیں، لہٰذا اس سے نماز مراد لی جاتی ہے، تو گویا نمازی ہونا بھی، ایمان دار ہونے کی علامت ہے۔

الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: مومن آدمی نیک بات کا حکم کرتے ہیں اور بری بات سے منع کرتے ہیں جب اور جہاں بھی انہیں موقع ملتا ہے وہ نیکی کی خوبیاں اور برائی کی خرابیاں بیان کرتے ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اچھا برتاؤ، دیانتداری، وعدہ اور عہد کی پابندی، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا اور اس کا شکر بجالانا اور اس پر مکمل بھروسہ کرنا، دین کی تبلیغ کرنا، جہاد کرنا، اور تعلیم وغیرہ کی ترغیب دیتے ہیں اور ہر برائی، کفر، شرک، بدعت، ظلم، زیادتی اپنوں سے قطع تعلقی، بد دیانتی، وعدہ خلافی جھوٹ وغیرہ سے جتنا ان سے ہو سکے منع کرتے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ برائی کو طاقت سے روکو، اگر اس کی ہمت نہیں پاتے تو زبان سے روکو، اور یہ بھی نہیں کر سکتے تو دل سے تو برا جانو کہ یہ ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے اس کے بعد تو رائی کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہتا۔لہٰذا برائی سے روکنا بھی مومن ہونے کی علامت ہے، مگر افسوس کا مقام ہے کہ آج کل اس کا الٹ ہو چکا ہے، اب تو خود مسلمان کہلانے والے اپنے غیر شرعی اور غیر اخلاقی طرز عمل کی وجہ سے دین سے دوری کا سبب بنے ہوئے ہیں۔کبھی وہ وقت تھا کہ مسلمان کا اخلاق، طرز عمل اور شریفانہ برتاؤ دیکھ کر غیر مسلم ایمان لے آتے تھے، مگر آج مسلمانوں کے رویہ کے پیش نظر لوگ اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے آج بھی ہیں جو نیکی کا دامن تھامے ہوئے ہیں مگر اکثریت برائی میں ملوث ہو چکی ہے اب برائی کو کون روکے گا تو فرمایا کہ مومن نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔

وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ: (مومن لوگ اللہ تعالیٰ کی حدود یعنی احکام کی حفاظت کرنے والے ہیں)

اس آیت میں ایمان والوں کی یہ عمدہ علامت بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہر مقررہ حد کی حفاظت کرتے ہیں اور ان میں سے کسی کو توڑتے نہیں اور شریعت کی قائم کی ہوئی حدوں کی حفاظت کرنا ہی تقویٰ ہے حدود، یعنی: احکام کسی بھی معاملہ میں ہوں ان کی پابندی ضروری ہے، مسئلہ حرام حلال کا ہو یا جائز ناجائز کا، شرک، کفر، بدعت یا برائی کا معاملہ ہو، صلح و جنگ، سیاست کی بات ہو یا تجارت اور ملازمت وغیرہ کی کوئی بات ہو، کتاب وسنت میں جو احکام مقرر ہیں ان کو قائم رکھنا ایمان والوں کی صفت ہے، احکام کی حفاظت کرنے والا متقی ہوگا اور ان کو توڑنے والا کافر، فاسق یا ظالم ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑا اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان مخلص مسلمانوں کی خصوصیات اور علامتوں کو بیان کیا ہے جن کے بارے میں اوپر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی جان اور مال کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے اس آیت میں جو مضمون ''اَلتَّآئِبُوْنَ'' سے بیان کیا گیا ہے یہ شرط کے طور پر نہیں، کیونکہ جنت کا وعدہ مطلقاً وعدہ جہاد فی سبیل اللہ پر آیا ہے، ان باتوں کے بیان سے مقصد یہ ہے کہ جو لوگ جنت کے حق دار ہوتے ہیں ان کی خوبیاں اس طرح ہوا

کرتی وہیں جیسا کہ یہاں بیان ہوئیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا: "وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ"، یعنی: جن ایمان والوں میں یہ باتیں پائیں جائیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں ان کو ایسی نعمتوں کی خوش خبری سنا دیجیے جن کو کسی کا وہم وخیال بھی نہیں پاسکتا اور نہ اس کو لفظوں میں سمجھایا جاسکتا ہے اور نہ کسی کے کانوں نے ان کا ذکر سنا ہے، مراد جنت کی نعمتیں ہیں۔

مشرکوں سے دینی بے تعلقی

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ

نہیں ہے واسطے پیغمبر کے اور ان لوگوں کے ایمان لائے جو یہ کہ بخشش مانگیں واسطے مشرکوں کے اگرچہ

كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ

ہوں وہ رشتہ دار بعد اس کے کھل چکا واسطے ان کے کہ وہ والے ہیں

الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾ وَ مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ

دوزخ (۱۱۳) اور نہ تھا بخشش مانگنا ابراہیم کا واسطے باپ اپنے کے مگر بوجہ

مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ

وعدہ ایک کے کیا تھا جو اس سے پس جب کھل گیا واسطے اس کے کہ وہ دشمن ہے اللہ کا بیزار ہو گئے

مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

سے اس تحقیق ابراہیم بہت آہیں بھرنے والے بردبار تھے (۱۱۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پیغمبر کو اور مسلمانوں کو لائق نہیں کہ مشرکوں کی بخشش چاہیں اگر چہ وہ قریبی رشتہ دار ہوں جبکہ ان پر کھل چکا کہ وہ دوزخ والے ہیں۔ (۱۱۳) اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا نہ تھا، مگر ایک وعدہ کے سبب جو اس سے کر چکے تھے پھر جب ابراہیم پر کھل گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے بے شک ابراہیم بڑے نرم دل اور برداشت والے تھے۔ (۱۱۴)

تفسیر

مسلمانوں کو پچھلی آیتوں میں اسلام کا مطلب سمجھا کر اور ان کے طرز عمل پر پوری روشنی ڈال کر اب یہ بتلایا جارہا ہے کہ وہ لوگ جو اسلام میں داخل ہونا نہیں چاہتے، یعنی: یا تو اللہ تعالیٰ کو سرے سے مانتے ہی نہیں بلکہ دوسروں کو اپنا معبود ٹھہرا رکھا ہے یا زبان سے مانتے ہیں اور دل سے اس کے ساتھ عہد و پیمان نہیں کرتے، ان کے ساتھ مسلمانوں کا کیا سلوک ہونا چاہئے پہلے جو کچھ کہا جاچکا ہے اس سے معلوم ہوگیا کہ ان کے ساتھ دنیا میں وہی سلوک کرو جو وہ تمہارے ساتھ کریں اگر مل جل کر رہنا چاہیں اور معاملات میں سیدھے رہیں تو تم بھی مل جل کر رہو بلکہ ان کے ساتھ احسان کرو اور اگر دشمنی کریں اور ستانے پر کمر باندھیں اور لڑائی پر آمادہ ہوجائیں تو تم بھی ان سے لڑو اور فساد ختم کر کے دم لو، اس آیت میں ان کے ساتھ دینی پہلو سے سلوک بتایا ہے، دینی اعتبار سے تم میں اور ان میں بہت بڑا فرق ہے تم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے امیدوار ہو اور وہ اللہ تعالیٰ سے کھلم کھلا پھرے ہوئے ہیں، اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی بخشش کے لائق نہیں ہیں اس لیے تم ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب مت کرو، اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ کچھ رحم دل مسلمان اور خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بے حساب رحمت کو دیکھ کر اپنے مشرک یا منافق رشتہ داروں کے لیے بخشش کی دعائیں کرتے تھے، اور اپنے غیر مسلم زندہ یا فوت شدہ رشتہ داروں کے لیے بخشے جانے کی دعا مانگتے تھے، اس آیت میں مسلمانوں کو اس سے صاف روک دیا گیا ہے۔

اس آیت میں فرمایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا مانگنا ایک وعدہ کی وجہ سے تھا جس کا ذکر "سورۂ مریم" میں بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو بہت اچھی طرح دلیلوں سے سمجھایا کہ بت پرستی چھوڑ دیں، لیکن باپ نے صاف انکار کردیا بلکہ دھمکایا کہ اگر ایسی باتیں کیں تو میں تجھے سخت سزا دوں گا، یہاں تیرا رہنا مجھے گوارا نہیں اس لیے میرا ساتھ چھوڑ دے اور یہاں سے چلا جا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے افسوس کے ساتھ کہا کہ اچھا میں جاتا ہوں اب میرے بس کا یہی ہے کہ تیرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں کہ اسے ہدایت کرتا کہ ایمان لے آئے، اور اسی کی بدولت اس کی پچھلی خطائیں معاف ہوجائیں، اس قصہ کو سن کر بعض مسلمان بھی اپنے مشرک ماں

باپ اور رشتہ داروں کے حق میں بخشش مانگنے لگے پچھلی آیت میں پیغمبر ﷺ کو اور عام مسلمانوں کو اس سے روک دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ جب وہ ایمان نہ لانے کی وجہ سے دوزخ کے حق دار ہیں تو ان کے لیے بخشش کی دعا نہ کرو، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنے مشرک باپ کے لیے دعا کی تھی، اس کی یہ وجہ تھی کہ چلتے وقت انہوں نے باپ سے کہا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ میں اپنے رب سے تیرے گناہوں کی معافی کی درخواست کروں گا لیکن جب باپ کفر کے اندر ہی مر گیا تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس کی قسمت میں ایمان نہ تھا اس کے بعد آپ نے اس کی طرف سے توجہ بالکل ہٹالی اور کبھی اس کے لیے بخشش کی دعا نہ کی۔

آگے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف بیان فرمائی ہے کہ انہوں نے باپ کے حق میں دعا کرنے کا عہد اپنی نرم دلی کی وجہ سے کیا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نرم دل اور حوصلہ والے تھے غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھادی ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے حدود میں سے ہے کہ کسی مشرک کے لیے بخشش کی دعا جائز نہیں خواہ وہ کسی کا باپ ہو یا بیٹا جبکہ اس کا خاتمہ کفر پر ہوا۔

"سورۂ توبہ" پوری کی پوری کافر اور مشرکوں سے بے تعلقی اور علیحدگی کے حکموں پر مشتمل ہے، سورت کا شروع ہی ''بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ'' سے ہوا ہے، اور اسی لیے اس سورت کا ایک نام "سورۂ براءت" بھی مشہور ہے اوپر جس قدر احکام آئے وہ کافروں اور مشرکوں سے لاتعلقی کے متعلق ہیں، مرنے کے بعد کافر و مشرک کے لیے بخشش کی دعاء کرنا بھی جائز نہیں، جیسا کہ اس سے پہلے ایک آیت میں منافقوں کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے پیغمبر ﷺ کو منع کیا گیا ہے۔

شانِ نزول

اس آیت کا شانِ نزول "صحیح بخاری و مسلم" کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ کے چچا ابو طالب اگرچہ مسلمان نہ ہوئے تھے، مگر عمر بھر پیغمبر ﷺ کی مدد و حفاظت کرتے رہے، اور اس معاملہ میں برادری کے کسی فرد کا کہنا نہیں مانا، پیغمبر ﷺ کو بھی اس کا بڑا خیال تھا کہ کسی طرح یہ اسلام کا کلمہ پڑھ لیں اور ایمان لے

آئیں تو شفاعت کا موقع مل جائے گا اور یہ دوزخ کے عذاب سے بچ جائیں گے، وفات کے مرض میں جب ان کا آخری وقت ہوا تو پیغمبر ﷺ کو بڑی فکر تھی کہ اس وقت بھی کلمہ پڑھ لیں تو کام ہوجائے، چنانچہ اس حالت میں آپ ﷺ ان کے پاس پہنچے، مگر ابوجہل، عبداللہ بن امیہ پہلے سے وہاں موجود تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: میرے چچا! "لا الٰہ اللہ" کا کلمہ پڑھ لیں تو میں آپ کی بخشش کے لیے کوشش کروں گا، مگر ابوجہل بول اٹھا کہ کیا آپ عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ دیں گے، پیغمبر ﷺ نے کئی مرتبہ پھر اپنی بات دہرائی، مگر ہر مرتبہ ابوجہل یہی بات کہہ دیتا، یہاں تک کہ آخری کلام میں ابوطالب نے یہی کہا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں، اسی حالت میں وفات ہوگئی تو پیغمبر ﷺ نے قسم کھائی کہ میں آپ کے لیے برابر بخشش کی دعا کرتا رہوں گا، جب تک مجھے اس سے منع نہ کردیا جائے، اس پر یہ آیت اتری، جس میں پیغمبر ﷺ اور سب مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کرنے سے منع فرمادیا، اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہی ہوں۔

اس پر بعض مسلمانوں کو یہ شبہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اپنے کافر باپ کے لیے دعا کی تھی، اس کے جواب میں دوسری آیت اتری "وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ إِيَّاهُ" جس کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنے والد کے لیے دعاء کی تھی اس کا معاملہ یہ ہے کہ شروع میں جب تک ابراہیم علیہ السلام کو یہ معلوم نہ تھا کہ آخر تک کفر ہی پر جما رہے گا، اسی پر مرے گا تو اس کا دوزخی ہونا یقینی نہیں تھا، اس وقت انہوں نے یہ وعدہ کرلیا تھا کہ میں آپ کے لیے بخشش کی دعا کروں گا "سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ" پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے یعنی کفر ہی پر اس کا خاتمہ ہوا ہے تو اس سے بے تعلقی اختیار کرلی اور بخشش کی دعا کرنا چھوڑ دیا۔

قرآن کریم کی مختلف جگہوں میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لیے بخشش کی دعا کرنے کا ذکر ہے ان سب کا یہی مطلب ہے۔

اُحد کی جنگ میں جب پیغمبر ﷺ کے چہرۂ مبارک کو کافروں نے زخمی کردیا تو آپ چہرہ سے خون

صاف کرتے ہوئے یہ دعا فرما رہے تھے،"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ اِنَّهم لَا يَعْلَمُوْنَ" یعنی: اے اللہ میری قوم کی بخشش فرما دیجئے وہ نا سمجھ ہیں"، زندہ کافروں کے لیے اس بخشش کی دعا کا حاصل بھی یہی ہے کہ ان کو ایمان واسلام کی توفیق عطا فرما دیں کہ یہ بخشش کے قابل ہو جائیں۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: اس سے ثابت ہوا کہ زندہ کافر کے لیے اس نیت سے دعا کرنا جائز ہے کہ اس کو ایمان کی توفیق ہو اور بخشش کے حق دار ہو جائے۔

جان کر نہ ماننا گمراہی ہے

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا

اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ گمراہ کرے قوم کسی کو بعد اس کے کہ ہدایت کر دی انہیں یہاں تک کہ کھول دے واسطے انکے جس سے

يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ

بچیں وہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے (۱۱۵) تحقیق اللہ تعالیٰ واسطے اس کے بادشاہت

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

آسمانوں کی اور زمینوں کی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور نہیں ہے واسطے تمہارے سوا اللہ تعالیٰ کے

مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

کوئی ساتھی اور نہ مددگار (۱۱۶)

با محاورہ ترجمہ:۔ اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ کسی قوم کو گمراہ کریں بعد اس کے کہ ان کی رہنمائی کر دی یہاںتک کہ کھول (کر بیان کر) دیں (ان باتوں کو) جس سے ان کو بچنا چاہئے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہیں، اللہ تعالیٰ ہی کی عظمت ہے آسمانوں میں اور زمین میں، جلاتا ہے اور مارتا ہے اور سوا اللہ تعالیٰ کے تمہارا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں۔ (۱۱۶)

تفسیر

آسمانوں کا اور زمین کا بادشاہ اللہ تعالیٰ ہیں سب پر اسی کا حکم چلتا ہے جو اس کے حکم کو نہ مانے گا اسے اس کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں ہے اس لیے اسی کی عبادت کرو وہی تم پر رحم کرے گا۔

پھر جب وہ لوگ غلطی پر اصرار کرتے ہیں تو قوم گمراہ ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ان کو ان کی گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنا پیغمبر اور شریعت بھیجے بغیر اور تمام باتوں کی وضاحت کئے بغیر ان کو گمراہی کی سزا دے بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہیں۔

ایثار کا بدلہ

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ

البتہ تحقیق خاص توجہ کی اللہ تعالیٰ نے اوپر پیغمبر کے اور ہجرت کرنے والوں کے اور مددگاروں کے جو

اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ

ساتھ ہے پیغمبر کے میں گھڑی تنگی کی بعد اس کے کہ قریب تھا پھر جائیں دل

فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٧﴾

فریق ایک کے میں سے ان پھر متوجہ ہوا اوپر ان کے تحقیق وہ پر ان مہربان رحم کرنے والا ہے (۱۱۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ مہربان ہوا پیغمبر پر اور مہاجرین اور انصار پر جو مشکل گھڑیوں میں پیغمبر کے ساتھ رہے بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان میں سے بعضوں کے دل پھر جائیں پھر ان پر مہربان ہوا بے شک وہ ان پر مہربان ہے اور رحم کرنے والا ہے۔(۱۱۷)

تفسیر

سَاعَةِ الْعُسْرَةِ: (سختی کا وقت) "سَاعَةِ" تھوڑا سے زمانہ، یعنی: ایک گھڑی کو کہتے ہیں یہاں اس سے مراد وقت ہے "عُسْر" کے معنی مشکل اور سختی اور تنگی کے ہیں، "سَاعَةِ الْعُسْرَةِ" سے مراد تبوک کی جنگ کی تیاری کا زمانہ ہے اس وقت چاروں طرف مشکل ہی مشکل تھی مسلمانوں کا لشکر جو ایسے وقت میں تیار ہوا وہ بھی "جیشُ الْعُسْر" کہلاتا ہے، اس وقت یہ مشکلیں سامنے تھیں، لوگ تھکے ہوئے تھے کیونکہ ابھی لڑائی سے واپس آئے تھے گرمی بہت سخت تھی، کھجوروں کے پکنے کا موسم تھا، ایسے موسم میں کھجوروں کے مالکوں کی حاضری ضروری ہوتی ہے دور دراز کا سفر تھا ایک بڑے طاقتور دشمن سے مقابلہ تھا، ساز و سامان کچھ نہ تھا لشکر میں کھانے کے لیے روزانہ دو سپاہیوں کو ایک کھجور ملتی تھی بسا اوقات ایک صحابی ایک کھجور کو کھانے کے بجائے چوس کر پانی پی لیتا تھا، سواری بھی نہ تھی دس دس آدمی ایک اونٹ پر باری باری اترتے چڑھتے، ان حالات میں ثابت قدم رہنا ہر ایک کے بس کا نہیں تھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجروں نے اور انصار نے اس وقت جس ہمت اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا وہ اپنی مثال آپ ہے، ایسی قربانی اور وفاداری کی مثال دنیا میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ: اس آیت میں اور آنے والی آیتوں میں مخلص مسلمانوں کی تین قسموں کا ذکر ہے اول وہ لوگ جو جہاد کا حکم پاتے ہی جہاد کے لیے تیار ہو گئے، ان کا بیان اس آیت کے جملہ ''اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ'' میں ہوا ہے، دوسرے وہ لوگ جو شروع میں کچھ تردد میں رہے، مگر پھر سنبھل گئے اور جہاد کے لیے سب کے ساتھ ہو گئے ان کا بیان اسی آیت کے اس جملے میں ہی ''مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ'' تیسرے وہ مؤمنین تھے جو اگرچہ وقتی کاہلی و سستی کی وجہ سے جہاد میں نہ گئے، مگر بعد میں توبہ کی اور بالآخر ان سب کی توبہ قبول ہو گئی، جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

ایمان والوں کو معافی

وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ
اور اوپر ان تین کے جن کو پیچھے رکھا گیا یہاں تک کہ جب تنگ ہوگئی اوپران کے

الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا
زمین باوجود کشادگی کے اور تنگ ہوگئیں اوپران کے جانیں ان کی اور جان گئے کہ نہیں

مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
پناہ سے اللہ تعالیٰ مگر طرف اسی کی پھر توجہ کی اس نے اوپران کے تاکہ متوجہ ہوں وہ تحقیق اللہ تعالیٰ

هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ؑ﴿۱۱۸﴾
وہی توبہ قبول کرنے والے ہیں رحم والے ہیں (۱۱۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اوران تین شخصوں پر جن کا معاملہ پیچھے ڈال دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب ان پر زمین باوجود کشادہ ہونے کے تنگ ہوگئی اور وہ جانوں سے تنگ آ گئے اور سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کہیں پناہ نہیں پھر مہربان ہوا ان پر اللہ تعالیٰ تاکہ وہ پھر آئیں بے شک اللہ تعالیٰ مہربان اور رحم والا ہے۔(۱۱۸)

تفسیر

''وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا'' اس میں ''خُلِّفُوْا'' کے معنی یہ ہے کہ جنکی توبہ کا معاملہ مؤخر کیا گیا، اس آیت میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں وہ تین آدمی بھی شامل ہیں جن کا فیصلہ مؤخر کر دیا گیا تھا اور اسی زمانے میں مسلمانوں کو ان سے بالکل قطع تعلق کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ تین حضرات......حضرت کعب بن مالک شاعر، اور مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں، تینوں انصاری بزرگ تھے، جو اس سے پہلے بیعت عقبہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دوسری جنگوں میں شریک رہ چکے تھے، مگر اس وقت اتفاقی طور سے سستی اور

کوتاہی کا شکار ہو گئے، اور منافق لوگ جو اس جہاد میں اپنی منافقت کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے تھے انہوں نے بھی ان کو ایسے ہی مشورے دیئے جس سے ان کی ہمت ٹوٹ گئی، مگر جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاد سے واپس آئے تو ان سب منافقوں نے حاضر ہو کر جھوٹے عذر پیش کر کے اور جھوٹی قسمیں کھا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنا چاہا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندر کے حال کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا، اور ظاہری قسموں کو قبول کر لیا، یہ لوگ آرام سے رہنے لگے، کچھ لوگوں نے ان تینوں انصاری بزرگوں کو بھی یہی مشورہ دیا کہ تم بھی جھوٹے عذر کر کے اپنی صفائی پیش کر دو، مگر ان کے دلوں نے ملامت کی کہ ایک گناہ تو جہاد سے پیچھے رہنے کا کر چکے ہیں اب دوسرا گناہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹ بولنے کا کریں؟ اس لیے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کر لیا جس کی سزا میں ان سے سلام وکلام کا بائیکاٹ کیا گیا انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان سب کی حقیقت کھول دی جھوٹی قسمیں کھا کر عذر کرنے والوں کا پردہ چاک کر دیا، جس کا ذکر اور ان کے انجام کا حال اس سے پہلے کئی آیتوں میں ''يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ'' سے ''عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ'' تک بیان ہوا ہے اور ان تین بزرگوں نے جو سچ بولا اور اعتراف کیا ان کی توبہ اس آیت میں اتری اور پچاس دن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بے رخی اور صحابہ کرام کے بائیکاٹ کی انتہائی سخت مصیبت جھیلنے کے بعد جب ان کی توبہ قبول ہونے کی آیت اتری تو صحابہ کرام نے ان کو مبارک باد دی اور خوشی کا اظہار کیا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے بائیکاٹ کے بعد ان تینوں صحابہ کرام پر سخت آزمائش آ گئی تھی، جب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو آپ ان کی طرف سے منہ پھیر لیتے اور کوئی بھی ان کے ساتھ نہ بولتا تھا، سب کترا کر نکل جاتے تھے، یہاں تک کہ ان کا جینا دشوار ہو گیا۔

حال یہ تھا یہ حضرات دن رات روتے ہوئے گزارہ کرتے کہ اے اللہ تیرے سوا ہمارا کہیں ٹھکانا نہیں، یہاں تک کہ حضرت کعب بن مالک کو تو غسان کے عیسائی بادشاہ نے یوں ورغلانا چاہا کہ ان کے نام ایک خط بھجوا دیا کہ تم وہاں کیوں تکلیف اٹھا رہے ہو ہمارے پاس آ جاؤ اور آرام سے رہو، لیکن یہ سچے مسلمان تھے انہوں نے کسی کی نہ سنی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر اپنا قصور معاف کئے جانے کی التجا کرتے رہے۔

بہر حال جب اسی حالت میں پچاس دن گذر گئے اور ان لوگوں کی حالت بہت خراب ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری ''وَ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا'' پھر ان تین شخصوں پر بھی اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی جن کا فیصلہ موخر رکھا گیا تھا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری حالت واقعی اس آیت کے مطابق تھی، میرے دل میں سخت گھٹن تھی، مجھے تنگی نظر آ رہی تھی اور میں سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔

ارشاد ہے کہ اور خود ان کی جانیں بھی ان سے تنگ ہوگئیں، انہیں خود اپنی ذات پر بھی تنگی محسوس ہونے لگی، اور انہوں نے یقین کر لیا کہ خدا تعالیٰ کے سوا ان کے لیے کہیں کوئی پناہ کی جگہ نہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مہربانی فرمائی تاکہ یہ لوگ بھی اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں سے توبہ کر لیں، اور آئندہ ایسی غلطی نہ کریں، بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور نہایت مہربان ہے۔

ان تینوں انصاری صحابہ کرام کے واقعہ کی تفصیل

"بخاری و مسلم" اور حدیث کی اکثر کتابوں میں اس واقعہ کے متعلق حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک لمبی حدیث لکھی گئی ہے، جس میں بہت سی کام کی باتیں اور مسئلے بھی شامل ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس کا مفہوم یہاں نقل کر دیا جائے، ان تین بزرگوں میں سے ایک کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تھے انہوں نے اپنے واقعہ کی تفصیل اس طرح بتلائی ہے کہ:

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جتنی جنگوں میں شرکت فرمائی تبوک کی جنگ کے سوا باقی سب میں، میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریک رہا، البتہ بدر کی جنگ کا واقعہ چونکہ اچانک پیش آیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو اس میں شریک ہونے کا حکم بھی نہیں دیا تھا، اور شریک نہ ہونے والوں پر کوئی ناراضگی بھی نہیں فرمائی تھی میں اس میں بھی شریک نہ ہو سکا تھا اور میں ''لیلة العقبه'' کی بیعت میں بھی حاضر تھا، جس میں ہم نے اسلام کی حمایت اور حفاظت کا عہد کیا تھا اور مجھے یہ بیعت عقبہ کی حاضری بدر کی جنگ کی حاضری سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے، اگرچہ بدر کی جنگ لوگوں میں زیادہ مشہور ہے۔

میرا واقعہ تبوک کی جنگ میں غیر حاضری کا یہ ہے کہ میں کسی وقت بھی اس وقت سے زیادہ خوش حال اور مالدار نہ تھا.......... بخدا! میرے پاس کبھی اس سے پہلے دو سواریاں جمع نہیں ہوئی تھیں جو اس وقت موجود تھیں۔

اور جنگوں کے معاملہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ مدینہ سے نکلنے کے وقت اپنے ارادے دشمن کے جاسوسوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے ایسا کرتے تھے، کہ جس سمت میں جا کر جہاد کرنا ہوتا مدینہ سے اس کے خلاف سمت کو نکلتے تھے، تاکہ منافق لوگ مخبری کر کے دشمنوں کو خبر نہ کر دیں، اور فرمایا کرتے تھے، کہ جنگ میں اس طرح کی تدبیر جائز ہے۔

یہاں تک کہ تبوک کی جنگ کا واقعہ پیش آیا (یہ جہاد کئی وجہ سے دوسرے جہاد سے الگ تلگ تھا) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت گرمی اور تنگدستی کی حالت میں اس جہاد کا ارادہ فرمایا، اور سفر بھی بڑی دور کا تھا، مقابلہ پر دشمن کی قوت اور تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جہاد کا کھل کر اعلان کر دیا تاکہ مسلمان اس جہاد کے لیے پوری تیاری کر سکیں۔

اور اس جہاد میں نکلنے والوں کی کوئی فہرست نہیں لکھی گئی تھی اس لیے جو لوگ جہاد میں جانا نہیں چاہتے تھے ان کو یہ موقع مل گیا کہ ہم نہ گئے تو کسی کو خبر بھی نہ ہوگی، جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جہاد کے لیے نکلے تو یہ وہ وقت تھا کہ کھجوریں پک رہی تھیں اور باغات والے ان میں مشغول تھے، اسی حالت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عام مسلمانوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی، اور جمعرات کے روز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سفر کا آغاز کیا اور سفر کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جمعرات کا دن پسند تھا خواہ سفر جہاد کا ہو یا کسی دوسرے مقصد کا۔

میرا حال یہ تھا کہ میں روزانہ صبح کو ارادہ کرتا کہ جہاد کی تیاری کروں مگر بغیر کسی تیاری کے واپس آجاتا، میں دل میں کہتا تھا کہ مجھ میں جہاد کرنے کی طاقت ہے مجھے نکلنا چاہئے، مگر یوں ہی آج کل آج کل کرنے میں میرا ارادہ ٹلتا رہا، یہاں تک کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عام مسلمان جہاد کے لیے روانہ ہو گئے، پھر بھی میرے دل میں یہ آتا رہا کہ میں بھی روانہ ہو جاؤں اور کہیں راستہ میں مل جاؤں، اور کاش! کہ میں ایسا کر لیتا، مگر یہ کام (افسوس ہے کہ) نہ ہو سکا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد جب میں مدینہ میں کہیں جاتا تو یہ بات مجھے غمگین کرتی تھی کہ اس وقت پورے مدینہ میں یا تو وہ لوگ نظر آتے تھے جو منافقت میں ڈوبے ہوئے تھے، یا پھر ایسے بیمار معذور جو قطعاً سفر کے قابل نہ تھے دوسری طرف پورے راستہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میرا خیال کہیں نہیں آیا یہاں تک کہ تبوک پہنچ گئے اس وقت آپ نے ایک مجلس میں ذکر کیا کہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو کیا ہوا (وہ کہاں ہیں)؟

بنو سلمہ کے لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا اے اللہ کے پیغمبر! ان کو جہاد سے ان کے عمدہ لباس اور اس پر نظر کرتے رہنے نے روکا ہے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ تم نے یہ بری بات کہی ہے اے اللہ کے پیغمبر! بخدا میں نے ان میں خیر کے سوا کچھ نہیں پایا، یہ سن کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو گئے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب مجھے یہ خبر ملی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف لا رہے ہیں تو مجھے بڑی فکر ہوئی اور قریب تھا کہ میں اپنی غیر حاضری کا کوئی عذر گھبرا کر تیار کر لیتا اور ایسی باتیں پیش کر دیتا جس کے ذریعہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناراضگی سے نکل جاتا اور اس کے لیے اپنے خاندان اور دوستوں سے مدد لے لیتا (میرے دل میں یہ خیال اور وسوسے گھومتے رہے) یہاں تک کہ جب یہ خبر ملی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے ہیں تو غلط خیالات میرے دل سے مٹ گئے اور میں نے سمجھ لیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناراضگی سے کسی ایسی بنیاد پر نہیں نکل سکتا جس میں جھوٹ شامل ہو اس لیے میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جہاد سے پیچھے رہ جانے کا کوئی جھوٹا بہانہ نہیں بنایا بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ پیچھے رہنے میں میرا کوئی عذر نہیں تھا اس پر مجھے لوگوں نے ملامت کی کہ یہ تم نے کیا بے وقوفی کی کہ اس وقت کوئی عذر پیش کر دیتے جیسا دوسرے پیچھے رہ جانے والوں نے پیش کیا اور تمہارے گناہ کی معافی کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بخشش کی دعا کرنا کافی ہو جاتا، بخدا! یہ لوگ مجھے بار بار ملامت کرتے رہے یہاں تک کہ میرے دل میں یہ خیال آ گیا کہ میں لوٹ جاؤں اور پھر جا کر عرض کروں کہ میں نے جو بات پہلے کہی تھی وہ غلط تھی، میرا صحیح عذر موجود تھا۔

مگر پھر میں نے دل میں کہا کہ میں ایک گناہ کے دو گناہ نہ بناؤں ایک گناہ تو پیچھے رہ جانے کا کر ہی لیا، دوسرا

گناہ جھوٹ بولنے کا کر گذروں؟ پھر میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ جہاد سے پیچھے رہ جانے والوں میں اور بھی کوئی میرے ساتھ ہے، جس نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا ہو، ان لوگوں نے بتلایا کہ دو آدمی اور ہیں جنہوں نے تمہاری طرح جرم کا اقرار کرلیا اور ان کو بھی وہی جواب دیا گیا جو تمہیں کہا گیا ہے (کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کا انتظار کرو) میں نے پوچھا کہ وہ دو کون ہیں انہوں نے بتلایا کہ ایک مرارہ بن ربیع العمری دوسرے ہلال بن امیہ وقفی ہیں۔

ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے کہ ان میں سے پہلے (یعنی: مرارہ رضی اللہ عنہ) کا پیچھے رہ جانے کا تو سبب یہ ہوا کہ ان کا ایک باغ تھا جس کا پھل اس وقت پک رہا تھا تو انہوں نے اپنے دل میں کہا کہ تم نے اس سے پہلے بہت سی جنگوں میں حصہ لیا ہے، اگر اس سال جہاد میں نہ جاؤ تو کیا جرم ہے، اس کے بعد جب انہیں اپنے گناہ پر احساس ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کرلیا کہ یہ باغ میں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کردیا۔

اور دوسرے بزرگ حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ ہوا کہ ان کے خاندان کے لوگ مختلف جگہوں میں بکھرے ہوئے تھے، اس موقع پر سب جمع ہوگئے تو یہ خیال کیا کہ اس سال میں جہاد میں نہ جاؤں اپنے اہل وعیال میں بسر کروں ان کو بھی جب اپنے گناہ کا خیال آیا تو انہوں نے یہ عہد کیا کہ اب میں اپنے اہل وعیال سے علیحدگی اختیار کرلوں گا۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے ایسے دو بزرگوں کا ذکر کیا جو بدر کی جنگ کے مجاہدین میں سے ہیں تو میں نے کہا کہ بس میرے لیے انہی دونوں بزرگوں کی طرح اقرار کرلینا کافی ہے۔ یہ کہہ کر میں اپنے گھر چلا گیا۔

ادھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو ہم تینوں کے ساتھ سلام کلام کرنے سے منع فرمادیا، اس وقت ہم تو سب مسلمانوں سے بدستور محبت کرتے تھے مگر ان سب کا رخ ہم سے پھر گیا تھا۔

ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے حضرت کعب فرماتے ہیں کہ اب ہمارا حال یہ ہوگیا ہے کہ ہم لوگوں کے پاس جاتے تو کوئی ہم سے بات تک نہ کرتا اور نہ سلام کرتا نہ سلام کا جواب دیتا۔

"مسند عبد الرزاق" میں ہے حضرت کعب فرماتے ہیں کہ اس وقت ہماری دنیا بالکل بدل گئی ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ وہ لوگ نہیں جو پہلے تھے نہ ہمارے باغ اور مکان ہیں جو پہلے تھے سب اجنبی نظر آنے لگے، مجھے سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر میں اس حال میں مرگیا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے جنازے کی نماز نہ پڑھیں گے، یا خدانخواستہ اس عرصہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی تو میں عمر بھر اسی طرح سب لوگوں میں ذلیل وخوار رہوں گا، اس کی وجہ سے میرے لیے ساری زمین اجنبی نظر آنے لگی، اسی حال میں ہم پر پچاس راتیں گذر گئیں، اس زمانے میں میرے دونوں ساتھی (مرارہ اور ہلال) تو ہمت ہار کر گھر میں بیٹھ رہے اور رات دن روتے تھے، لیکن میں جو ان آدمی تھا باہر نکلتا اور چلتا پھرتا تھا اور نماز میں سب مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوتا تھا اور بازاروں میں پھرتا تھا مگر نہ کوئی مجھ سے بات کرتا نہ میرے سلام کا جواب دیتا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں نماز کے بعد حاضر ہوتا اور سلام کرتا تو یہ دیکھا کرتا تھا کہ سلام کا جواب دینے کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک ہونٹ ہلے یا نہیں، پھر میں آپ کے قریب ہی نماز پڑھتا تو نظر چرا کر آپ کی طرف دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ جب میں نماز میں مشغول ہوجاتا ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری طرف دیکھتے ہیں، اور میں جب آپ کی طرف دیکھتا ہوں تو چہرہ پھیر لیتے ہیں۔

جب لوگوں کی یہ بے تعلقی طول پکڑ گئی تو ایک دن میں اپنے چچازاد بھائی قتادہ کے پاس گیا جو میرے سب سے زیادہ دوست تھے، میں ان کے باغ میں دیوار پھاند کر داخل ہوا اور ان کو سلام کیا، خدا کی قسم! انہوں نے میرے سلام کا جواب نہ دیا، میں نے پوچھا کہ اے قتادہ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت رکھتا ہوں، اس پر بھی قتادہ خاموش رہا، کوئی جواب نہیں دیا، جب میں نے بار بار یہ سوال دہرایا تو تیسری یا چوتھی مرتبہ میں انہوں نے صرف اتنا کہا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور اس کا پیغمبر، میں رو پڑا اور اسی طرح دیوار پھاند کر باغ سے باہر آگیا، اسی زمانہ میں ایک دن میں مدینہ کے بازار میں چل رہا تھا کہ اچانک ملک شام کا ایک نبطی شخص جو غلہ فروخت کرنے کے لیے شام سے مدینہ میں آیا تھا اس کو دیکھا کہ لوگوں سے پوچھ رہا ہے کہ کیا کوئی مجھے کعب بن مالک کا پتہ بتا سکتا ہے؟ لوگوں نے مجھے دیکھ کر میری طرف اشارہ کیا، وہ آدمی میرے پاس آگیا، اور مجھے غسان کے بادشاہ کا ایک خط دیا جو ریشمی رومال پر لکھا ہوا تھا جس کا مضمون یہ تھا:

''امابعد مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ کے پیغمبر نے آپ سے بے وفائی کی ہے اور آپ کو دور کر رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلت اور ہلاکت کی جگہ میں نہیں رکھا ہے، تم اگر ہمارے یہاں آنا پسند کرو تو آجاؤ ہم تمہاری مدد کریں گے''۔

میں نے جب یہ خط پڑھا تو کہا کہ یہ ایک اور میرا امتحان آگیا کہ کافروں کو مجھ سے یہ توقع اور لالچ ہوگئی (کہ میں ان کے ساتھ مل جاؤں) میں یہ خط لے کر آگے بڑھا ایک دکان پر تنور لگا ہوا تھا اس میں جھونک دیا۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب پچاس میں سے چالیس راتیں گذر چکی تھیں تو اچانک دیکھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک قاصد خزیمہ بن ثابت میرے پاس آرہے ہیں، آکر یہ کہا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اپنی بیوی سے بھی علیحدگی اختیار کرلو، میں نے پوچھا کہ کیا طلاق دیدوں یا کیا کروں، انہوں نے بتلایا کہ نہیں عملاً اس سے الگ رہو، قریب نہ جاؤ، اسی طرح کا حکم میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی پہنچا، میں نے بیوی سے کہہ دیا کہ تم اپنے میکے میں چلی جاؤ اور وہیں رہو جب تک اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ فرمادیں۔

ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ خولہ بنت عاصم یہ حکم سن کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ ایک بوڑھے ضعیف آدمی ہیں اور کوئی ان کی خدمت کرنے والا نہیں، ابن ابی شیبہ رضی اللہ عنہ کی روایت یہ بھی ہے کہ ان کی نظر بھی کمزور ہے کیا آپ یہ پسند فرمائیں گے کہ میں ان کی خدمت کرتی رہوں، فرمایا خدمت کرنے کی ممانعت نہیں البتہ وہ تمہارے پاس نہ جائیں انہوں نے عرض کیا کہ وہ تو بڑھاپے کی وجہ سے ایسے ہوگئے ہیں کہ ان میں کوئی حرکت ہی نہیں اور اللہ کی قسم وہ رات دن روتے رہتے ہیں۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے بھی میرے گھر کے ایک شخص نے مشورہ دیا کہ تم بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیوی کو ساتھ رکھنے کی اجازت لے لو جیسا کہ آپ نے ہلال بن امیہ کو اجازت دیدی، میں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کروں گا، معلوم نہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا جواب دیں، اس کے علاوہ میں جوان آدمی ہوں (بیوی کو ساتھ رکھنا احتیاط کے خلاف ہے)، چنانچہ اسی حال پر میں نے دس راتیں اور گذاریں، یہاں تک کہ پچاس راتیں مکمل ہوگئیں، اس وقت ہماری توبہ قبول ہونے کا حکم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک تہائی رات گذرنے کے وقت اترا، ام المومنین حضرت ام

سلمہ رضی اللہ عنہا جو اس وقت حاضر تھیں، انہوں نے عرض کیا کہ اجازت ہو تو کعب بن مالک کو اسی وقت اس کی خبر کر دی جائے، آپ نے فرمایا کہ ایسا ہوا تو ابھی لوگوں کا ہجوم ہو جائیگا، رات کی نیند مشکل ہو جائے گی۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پچاس رات کے بعد صبح کی نماز پڑھ کر میں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا تھا اور حالت وہ تھی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کیا ہے کہ مجھ پر میری جان اور زمین باوجود کشادہ ہونے کے تنگ ہو چکی تھی، اچانک سلع پہاڑ کے اوپر سے کسی آدمی کی آواز سنی جو چلا کر کہہ رہا تھا، اے کعب بن مالک تمہیں خوشخبری ہو۔

محمد بن عمرو کی روایت میں ہے کہ یہ بلند آواز سے کہنے والے ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے سلع پہاڑ پر چڑھ کر یہ آواز دی کہ اللہ تعالیٰ نے کعب کی توبہ قبول فرمالی اور عُقبہ کی روایت میں یہ ہے کہ یہ خوشخبری حضرت کعب کو سنانے کے لیے دو آدمی دوڑے، ان میں سے ایک آگے بڑھ گیا تو جو پیچھے رہ گیا تھا اس نے یہ کیا کہ سلع پہاڑ پر چڑھ کر آواز دی اور کہا جاتا ہے کہ دوڑنے والے دو بزرگ حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما تھے۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آواز سن کر میں سجدے میں گر گیا اور انتہائی خوشی سے رونے لگا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ اب کشادگی آگئی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبح کی نماز کے بعد صحابہ کرام کو ہماری توبہ قبول ہونے کی خبر دی، اب سب طرف سے لوگ ہم تینوں کو مبارکباد دینے کے لیے دوڑ پڑے، بعض لوگ گھوڑے پر سوار ہو کر میرے پاس پہنچے مگر پہاڑ سے آواز دینے والے کی آواز سب سے پہلے پہنچ گئی۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے نکلا تو لوگوں کے ہجوم کے ہجوم مجھے مبارکباد دینے کے لیے آرہے تھے، کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں داخل ہوا تو دیکھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما ہیں آپ کے چاروں طرف صحابۂ کرام کا مجمع ہے، مجھے دیکھ کر سب سے پہلے طلحہ بن عبید اللہ کھڑے ہو کر میری طرف لپکے اور مجھ سے مصافحہ کر کے توبہ قبول ہونے پر مبارکباد دی، طلحہ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولتا جب میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا تو آپ کا چہرہ انور خوشی کی وجہ سے چمک رہا تھا، آپ نے فرمایا کہ اے کعب ؓ خوشخبری ہو تمہیں ایسے مبارک دن کی جو تمہاری عمر میں پیدائش سے لے کر آج تک سب سے زیادہ

بہتر دن ہے، میں نے عرض کیا اے اللہ کے پیغمبر! یہ حکم آپ کی طرف سے ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ حکم اللہ تعالیٰ کا ہے، تم نے سچ بولا تھا اللہ تعالیٰ نے تمہاری سچائی کو ظاہر فرمادیا۔

جب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھا تو عرض کیا کہ اے اللہ کے پیغمبر میری توبہ یہ ہے کہ میں اپنے سب مال ومتاع سے نکل جاؤں کہ سب کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کردوں، آپ نے فرمایا: کہ نہیں کچھ مال اپنی ضرورت کے لیے رہنے دو یہ بہتر ہے میں نے عرض کیا کہ اچھا آدھا مال صدقہ کردوں آپ نے اس سے بھی انکار فرمایا، میں نے پھر ایک تہائی مال کی اجازت مانگی، تو آپ نے اس کو قبول فرمالیا میں نے عرض کیا اے اللہ کے پیغمبر مجھے اللہ تعالیٰ نے سچ بولنے کی وجہ سے نجات دی ہے اس لیے میں عہد کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ رہوں کبھی سچ کے سوا کوئی بات نہیں کرونگا، پھر فرمایا کہ جب سے میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سچ بولنے کا عہد کیا تھا تو الحمدللہ! اس وقت سے لیکر آج تک کوئی بات جھوٹ کی میری زبان پر نہیں آئی، اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ باقی زندگی میں بھی مجھے جھوٹ سے محفوظ رکھیں گے، کعبؓ فرماتے ہیں کہ: خدا کی قسم! اسلام کے بعد اس سے بڑی نعمت مجھے نہیں ملی، کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سچ بولا، جھوٹ سے بچا، کیونکہ اگر میں جھوٹ بولتا تو اسی طرح ہلاکت میں پڑ جاتا جس طرح دوسرے جھوٹی قسمیں کھانے والے ہلاک ہوئے، جن کے بارے میں قرآن کریم میں یہ اترا ''سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ'' سے لے کر ''فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ'' تک بعض حضرات نے فرمایا کہ ان تینوں حضرات سے بائیکاٹ کا پچاس دن تک جاری رہنے میں شاید اتنی حکمت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے تبوک کی جنگ میں پچاس دن ہی صرف ہوئے تھے (یہ پوری روایت اور تفصیلی واقعہ "تفسیر مظہری" سے لیا گیا ہے)

احکام ومسائل

حضرت کعب رضی اللہ عنہ والی حدیث کے فائدے!

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنے واقعہ کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے، اس میں مسلمانوں کے لیے

بہت سی کام کی باتیں ہیں، اسی لیے اس جگہ اس حدیث کو پورا لکھا گیا ہے وہ باتیں یہ ہیں۔

(۱)....اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت عام جنگوں میں یہ تھی کہ جس طرف جہاد کے لیے جانا ہوتا اس کی مخالف سمت سے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوتے تاکہ دشمنوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس قوم یا قبیلہ سے جہاد کے لیے جارہے ہیں، اسی کو آپ نے فرمایا: ''اَلْحَرْبُ خِدْعَة''، یعنی: جنگ میں دھوکہ دینا جائز ہے، اس سے بعض لوگ غلطی میں پڑ جاتے ہیں کہ جنگ و جہاد میں جھوٹ بول کر مخالف کو دھوکہ دینا جائز ہے یہ صحیح نہیں بلکہ مراد اس دھوکہ سے یہ ہے کہ اپنا عمل ایسا کرے جس سے مخالفین دھوکہ میں پڑ جائیں، جیسے جہاد کے لیے مخالف سمت سے نکلنا، کھلا جھوٹ بول کر دھوکہ دینا مراد نہیں، وہ جنگ میں بھی جائز نہیں اسی طرح یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ یہ عملی دھوکہ جس کو جائز قرار دیا ہے اس کا کوئی تعلق عہد و معاہدہ سے نہیں اور عہد توڑنا صلح میں ہو یا جنگ میں ہو کسی حال میں جائز نہیں۔

(۲)....سفر کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جمعرات کا دن پسند تھا خواہ سفر جہاد کا ہو یا کسی دوسری ضرورت کا۔

(۳)....اپنے کسی بزرگ، مرشد یا استاد یا باپ کو راضی کرنے کے لیے بھی جھوٹ بولنا جائز نہیں اور اس کا انجام بھی اچھا نہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو حقیقت حال کا علم وحی کے ذریعہ ہو جاتا تھا، اس لیے جھوٹ بولنے کا انجام برا تھا جیسا کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور جہاد سے پیچھے رہ جانے والے دوسرے صحابہ کرام کے اس واقعہ سے معلوم ہوا آپ کے بعد دوسرے بزرگوں کو وحی تو ہو ہی نہیں سکتی الہام وکشف سے علم ہو جانا بھی ضروری نہیں لیکن تجربہ شاہد ہے کہ جھوٹ بولنے کی ایک نحوست ہوتی ہے کہ قدرتی طور پر ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں کہ بالآخر یہ بزرگ اس سے ناراض ہو ہی جاتے ہیں۔

(۴)....اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کسی گناہ کی سزا میں مسلمانوں کے امیر کو یہ بھی حق ہے کہ کسی شخص سے سلام وکلام کے بائیکاٹ کا حکم دیدے، جیسے: اس واقعہ میں ان تین بزرگوں کے متعلق پیش آیا۔

(۵)....اس واقعہ سے صحابہ کرام کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت معلوم ہوئی کہ اس سے ناراضگی اور سلام وکلام کے بائیکاٹ کے زمانہ میں بھی انتہائی محبت سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری نہیں چھوڑی

اور کنکھیوں سے دیکھ کر آپ کی توجہ اور تعلق کا حال معلوم کرنے کی فکر رہی۔

(۶)…. حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے گہرے دوست قتادہ کا معاملہ، کہ ان کے سلام کا جواب نہ دیا اور کوئی کلام نہ کیا ظاہر ہے کہ یہ کسی دشمنی یا مخالفت یا بغض کی وجہ سے نہیں بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اتباع کی وجہ سے تھا، اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان صرف لوگوں کے ظاہر پر نافذ نہ ہوتا تھا بلکہ دلوں پر بھی اس کی حکومت ہوتی تھی اور حاضر و غائب کسی حال میں اس کے خلاف نہ کرتے تھے اگرچہ اس میں کسی بڑے سے بڑے دوست کے خلاف ہی ہو۔

(۷)…. حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے پاس غسان کے بادشاہ کا خط آنے اور اس کو تنور میں ڈالنے کے واقعہ سے صحابہ کرام کے ایمان کی انتہائی پختگی معلوم ہوئی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کے بائیکاٹ سے سخت پریشان ہونے کے عالم میں بھی ایک بڑے بادشاہ کے لالچ دلانے سے ان کے دل میں کوئی غلط خیال پیدا نہیں ہوا۔

(۸)…. توبہ قبول ہونے کی آیت اترنے کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو خوشخبری دینے کے لیے دوڑنا اور اس سے پہلے سب کا سلام و کلام تک سے سخت پرہیز کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ بائیکاٹ کے زمانے میں بھی ان سب کے دلوں میں حضرت کعب سے محبت اور تعلق تھا، مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے سامنے سب کچھ چھوڑا ہوا تھا، جب توبہ کی آیت اتری، تو ان کے گہرے تعلق کا اندازہ ہوا۔

(۹)…. صحابہ کرام کا حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو خوشخبری دینے اور مبارکباد کے لیے دوڑ کر جانے سے معلوم ہوا کہ کسی خوشی کے موقع پر اپنے دوست احباب کو مبارکباد دینا سنت سے ثابت ہے۔

(۱۰)…. کسی گناہ سے توبہ کے وقت مال کا صدقہ کرنا گناہ کے اثر کو دور کرنے کے لیے بہتر ہے مگر تمام مال خیرات کر دینا اچھا نہیں ایک تہائی مال سے زیادہ صدقہ کرنا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔

(۱۱)…. محدثین اور مفسرین بیان کرتے ہیں کہ اس واقعہ سے پتہ چلا کہ کسی کا بائیکاٹ کرنا جائز ہے تاکہ وہ توبہ کرے اور آئندہ اس گناہ کو چھوڑنے کا عہد کرلے، البتہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ کسی آدمی سے تین

دن سے زیادہ رنجش رکھنا جائز نہیں بلکہ حرام ہے اگر کریگا تو آدمی گناہ گار ہوگا یہ دنیاوی معاملات کے متعلق ہے، یعنی: کسی دنیاوی معاملہ میں تو بائیکاٹ تین دن سے زیادہ روا نہیں لیکن دینی معاملہ میں بائیکاٹ کی کوئی حد نہیں، یہاں تو یہ بائیکاٹ صرف پچاس دن تک جاری رہا، مگر ضرورت کے مطابق یہ سال، دو سال بلکہ ساری عمر کے لیے بڑھایا جاسکتا ہے، لہٰذا دینی معاملہ میں تین دن والی حدیث لاگو نہیں ہوتی۔

سچائی کی قدر

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اے لوگو جو ایمان لاچکے ہو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور ہوجاؤ ساتھ سچے لوگوں کے (۱۱۹)

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا

نہیں زیب دیتا والوں کو مدینے اور جو گردان کے ہیں سے گنوار ہیں یہ کہ ساتھ چھوڑیں

عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ

سے پیغمبر اللہ کے کا اور یہ کہ زیادہ چاہیں جان اپنی کو سے جان اسکی

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ (۱۱۹) مدینے والوں کو اور ان کے گرد کے دیہاتیوں کو نہ چاہیے کہ اللہ کے پیغمبر کے ساتھ سے پیچھے رہ جائیں اور نہ یہ کہ پیغمبر کی جان سے زیادہ اپنی جان کو چاہیں۔

تفسیر

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے جہاد سے پیچھے رہ جانے والوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ انہوں نے پیچھے رہ کر کوئی اچھا کام نہیں کیا بلکہ مخلص مسلمانوں کے شایان شان ہی نہیں تھا کہ وہ جہاد میں شریک نہ ہوتے۔

ارشاد ہے کہ: ایمان والوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب سے ڈریں اور آئندہ ان لوگوں کی

جماعت میں شامل رہیں جنہوں نے خلوص اور سچائی کو اختیار کیا، یہ لوگ ان صفتوں کی بدولت انعام واکرام کے مستحق ٹھہرے اور جن سے کچھ کوتاہی ہوئی تھی انہیں ان کی سچائی اور نیک نیتی کی بنا پر معاف کر دیا گیا۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ مدینہ اور ارد گرد کے لوگوں کو ہرگز یہ زیبا نہیں کہ آپ راحت اور آرام سے گھروں میں بیٹھے رہیں جب کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے راستے میں گرمی، بھوک اور پیاس کی تکلیفیں جھیل رہے ہوں، ان پر لازم ہے کہ اپنی جانوں سے زیادہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کو عزیز رکھیں۔

ایک صحابی ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ بھی اس جنگ میں پیچھے رہ گئے تھے، وہ خود بیان کرتے ہیں کہ انہیں اس پر سخت ندامت ہوئی ان کا باغ تھا، فصل پکنے کو تیار تھی، حسین وجمیل بیوی نے وہاں پانی کا چھڑکاؤ کیا تا کہ ابوخیثمہ وہاں آرام کریں، جب باغ میں پہنچے تو آرام وسکون کی جگہ کو دیکھ کر انہیں یکدم خیال آیا کہ میں یہاں سائے میں اپنی بیوی کے ہمراہ بیٹھا ہوں مگر اللہ تعالیٰ کا پیغمبر دھوپ اور گرمی کی تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ سوچ کر مجھ پر بجلی سی گری میں نے سب کچھ وہیں چھوڑا، سواری لی اور تنہا ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چل پڑا، قافلہ بہت دور جا چکا تھا راستے میں ایک جگہ پڑاؤ تھا تو میں بھی قریب پہنچ گیا ادھر جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دور سے غبار اڑتا دیکھا تو آپ نے تمنا ظاہر فرمائی کہ کاش! آنے والا ابوخیثمہ ہو اور حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ طبقات ابن سعد میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہے، کہ جب مشرک آپ کو سولی پر لٹکا رہے تھے تو انہوں نے کہا، اے خبیب! اس وقت تو تم ضرور دل میں خیال کرتے ہو گے، کہ کاش کہ اس وقت تمہاری جگہ محمد ہوتے اور تمہاری جان بچ جاتی، حضرت خبیب نے جواب دیا: ظالمو خوب سن لو! اگر میری سو جانیں بھی ہوں اور وہ ایک ایک کر کے اللہ کی راہ میں قربان ہو جائیں تو مجھے کبھی یہ بھی گوارا نہیں ہوگا کہ اس کے بدلے میرے آقا کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے، وجہ ظاہر ہے کہ وہ لوگ پیغمبر کی جان کو اپنی جان پر ترجیح دیتے تھے، اسی طرح حضرت ابودجانہ کا احد والا واقعہ بھی طبری میں موجود ہے کہ جب دشمن کی طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے سامنے اپنی پشت کو ڈھال بنا رکھا تھا، ان کی پشت پر چوراسی تیر لگے، اتنی تکلیف اٹھائی مگر یہ پسند نہ کیا کہ اللہ کے پیغمبر کو کوئی تکلیف پہنچے تو مومن کی شان تو یہ ہے کہ وہ نبی کی جان کو

اپنی جان پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس آیت میں تمام لوگوں کو سچائی کی طرف دعوت دی جارہی ہے جس پر قائم رہ کر یہ تین حضرات کامیاب ہوئے کہ ان لوگوں نے کوئی حیلہ بہانہ نہ بنایا اور نہ کوئی عذر پیش کیا بلکہ سچائی کو اختیار کرتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

مشقت کا اجر

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ

یہ بوجہ اس کے کہ وہ نہیں پہنچتی ان کو پیاس اور نہ مشقت اور نہ بھوک میں راستے

اللّٰهِ وَ لَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَ لَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ

اللہ کے اور نہ چلتے ہیں وہ چال کوئی جس سے جلیں کافر اور نہ حاصل کرتے ہیں سے دشمن

نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ

چھین کر مگر لکھا ہے واسطے ان کے بدلے اس کے ایک کام نیک تحقیق اللہ تعالیٰ نہیں ضائع کرتا

اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۲۰ وَ لَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً

اجر اچھے کام کرنے والوں کا (۱۲۰) اور نہیں خرچ کرتے وہ کچھ چھوٹا اور نہ بڑا

وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ

اور نہ طے کرتے ہیں وہ میدان کوئی مگر لکھ لیا جاتا ہے واسطے ان کے تاکہ بدلہ دے ان کو اللہ تعالیٰ بہتر

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۲۱

اس سے تھے جو کرتے وہ (۱۲۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہ اس لیے بھی کہ حق کے راستے میں انہیں جو بھی کوئی تکلیف بھوک پیاس یا جسمانی تھکاوٹ کی پہنچتی ہے یا جو بھی کوئی ایسا راستہ یہ لوگ چلتے ہیں جس سے کافر غصے کی آگ میں جلتے ہیں یا کسی بھی دشمن

سے یہ کوئی انتقام لیتے ہیں، تو ان میں سے ایک ایک بات پر ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتے۔ (۱۲۰) اور (اسی طرح) یہ لوگ جو بھی کچھ خرچ کرتے ہیں، خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت، اور جو بھی کوئی وادی یہ طے کرتے ہیں (اللہ کی راہ میں) وہ سب ان کے لیے لکھ دیا جاتا ہے، تا کہ اللہ تعالیٰ انہیں بہترین بدلہ دے ان کے ان کاموں کا جو یہ کرتے تھے۔ یعنی: ان کو اللہ کے راستے میں جو بھی بھوک پیاس اور تھکاوٹ پہنچے اور کافروں کا جو علاقہ روندتے ہوئے گذریں جس سے کافر غیظ وغضب میں مبتلا ہوں اور جو کچھ بھی وہ دشمن سے پائیں گے ان سب چیزوں کے بدلے میں ان کے لیے نیک عمل لکھا جائیگا۔ (۱۲۱)

تفسیر

ارشاد ہے کہ یہ مسلمانوں سے اس لیے کہا جارہا ہے کہ اس میں ان کے لیے آخرت میں بڑے درجے ہیں ہر ایک تکلیف کے بدلے ایک نیک عمل ان کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا اور پھر اس کا پھل دنیا اور آخرت میں جنت کی صورت میں ملے گا ان کی بھوک، پیاس، محنت اور سرکش کافروں کے دبانے کے لیے کوئی قدم اٹھانا، ان کو ان کی ڈھٹائی اور سرکشی کی مناسب سزا دینا، چونکہ خلوص کے ساتھ اللہ کے لیے ہے، اس لیے ان میں سے ہر ایک چیز نیک عمل کے تحت لکھی جائے گی، اس کے ہاں اچھے کام کرنے والوں کے لیے اجر اور ثواب مقرر ہے، کسی کا کوئی اچھا کام اس کے ہاں ضائع نہیں جاتا۔

دوسری آیت میں مسلمانوں کے نیک کاموں کا ذکر ہے چونکہ ہر مسلمان کا ہر کام ایمان اور نیک نیتی پر ہوتا ہے اور جو سختیاں جھیلتا ہے وہ اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے جھیلتا ہے اس لیے سختی جھیلنا بھی نیک کام ہی میں شمار ہوگا، یعنی: نیک کام کرنا اور کوئی تکلیف برداشت کرنا دونوں اس کے اچھے عمل کی صورت میں لکھ لئے جائیں گے۔

ارشاد ہے کہ مسلمان جو بھی خرچ کریں تھوڑا ہو یا بہت اور جو چیز بھی اللہ کے واسطے دیں چھوٹی ہو یا بڑی، اور جو راستہ وہ محض اللہ تعالیٰ کے واسطے اور اسلام کی مدد کرنے کے لیے طے کریں، یہ سب کچھ ان کے نامۂ اعمال میں نیک عمل شمار کرکے درج کرلیا جائے گا، اور اس کے بدلے ان کو ایسا اجر ملے گا جو ان کے کام سے کہیں بڑھ چڑھ کر

ہوگا، اس آیت میں مسلمانوں کی ساری جانی، بدنی اور مالی قربانیوں کی بابت بتایا گیا ہے کہ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ قربانیاں رائیگاں جائیں گی، ان میں ہر ایک چھوٹی یا بڑی قربانی کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا بدلہ ملے گا۔

قومی کام کرنے کا طریقہ

وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ

اور نہیں ہیں مسلمان اس لیے کہ نکلیں سب کے سب پس کیوں نہ نکلیں میں سے ہر بڑی جماعت

مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا

میں سے ان کچھ لوگ تا کہ سمجھ پیدا کریں میں دین اور تا کہ خبردار کریں وہ قوم اپنی کو جب

رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

لوٹیں وہ طرف ان کی تا کہ وہ چلیں بچ بچ کر (۱۲۲)

بامحاورہ ترجمہ: مسلمانوں کے لیے لائق نہیں کہ سارے کے سارے نکل کھڑے ہوں سو کیوں نہ نکلے ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت، تا کہ دین میں سمجھ بوجھ پیدا کریں اور جب قوم کی طرف لوٹ کر آئیں تو اس کو خبردار کریں تا کہ لوگ بچتے رہیں۔ (۱۲۲)

تفسیر

اگر ہر کام کو کرنے کے لیے سارے کے سارے آدمی اٹھ کھڑے ہوں تو وہ کام بھی ٹھیک نہ ہوگا، اور دوسرے کام دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اس کے لیے محنت آپس میں بانٹ لینی چاہئے اور ہر کام کے لیے وہی لوگ اٹھنے چاہئیں جو اس کام کے اہل ہوں، چنانچہ مثال دے کر سمجھایا گیا ہے کہ علم حاصل کرنا قومی فرض ہے کیونکہ جب تک شریعت سے واقف لوگ عوام کی رہنمائی کے لیے موجود نہ ہوں گے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا، اب اگر سارے شریعت کا علم حاصل کرنے میں لگ جائیں تو پھر جہاد کون کرے گا اسی طریقے سے

دین کے دوسرے بڑے بڑے کام کون کریگا اس لئے مناسب یہ ہے کہ کچھ لوگ جو ذہنی اعتبار سے علم حاصل کرنے کے اہل ہوں دین کے قانون میں مہارت حاصل کرنے میں لگ جائیں اور ضرورت کے وقت عوام کو ان کے ٹھیک چال چلن کا طریقہ سکھادیں اور جو ضرورت ہو ان سے پوچھے اور مشورہ کرے اسی طریقہ پر چلنے سے یہ امید ہوسکتی ہے کہ لوگ نقصان دینے والا کام چھوڑ کر مفید کاموں میں لگے رہیں گے اس آیت میں صاف صاف تقسیم کار کا طریقہ سکھایا گیا ہے ظاہر ہے کہ تمام لوگوں کی قابلیت ایک جیسی نہیں ہوتی، کوئی ہاتھ پاؤں کا مضبوط ہوتا ہے، وہ محنت کے کام، مثلاً: کاشتکاری اور جنگ وغیرہ کے لیے موزوں ہے کسی کا ذہن تیز ہوتا ہے، وہ مختلف علوم وفنون حاصل کرنے میں لگ سکتا ہے البتہ اگر امیر المؤمنین (مسلمانوں کا حاکم) نے ہر ایک کو لڑائی کے لیے اٹھنے کا اعلان کردیا ہے اس وقت سب کچھ چھوڑ کر ہر ایک کو حاضر ہونا چاہئے اور جو کام اس کو دیا جائے اس کو انجام دینا چاہئے۔

کتابوں میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دوسرے آدمی کے ساتھ شراکتی کاروبار کرتے تھے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "کنا نتناوب" ہم دونوں باری باری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے، فرماتے ہیں کہ ایک دن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا اور میرا شریک بکریوں کو سنبھالتا ان کو پانی پلاتا اور کھیتی باڑی پر توجہ دیتا میں دن بھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں جو کچھ سنتا وہ اپنے ساتھی کو جا کر بتادیتا، پھر اگلے دن میں کام کاج کی نگرانی کرتا اور میرا ساتھی دن بھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتا، جو آیت اترتی یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے حکم جاری ہوتا تو وہ مجھے آکر بتادیتا اس طرح ہم نے باری مقرر کررکھی تھی، کیونکہ اگر دونوں علم حاصل کرنے کے لیے چلے جاتے تو کاروبار ممکن نہیں رہتا تھا۔

اس آیت میں اسی بات کو بیان کیا گیا ہے، ایمان والوں کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ سارے کے سارے ہی نکل جائیں، کیونکہ اس طرح تو پورا زندگی کا نظام ٹھپ ہوکر رہ جائے گا۔

جہاد کے ایک موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ جس گھر میں دو آدمی ہیں ان میں سے ایک جہاد کے لیے چلا جائے اور دوسرا گھر کا کام سنبھال لے، اسی طرح ہر گھر یا بستی یا خاندان میں کچھ لوگ علم حاصل کرنے کے لیے

جائیں اور باقی دنیا کے کام انجام دیتے رہیں، اس کا فائدہ یہ ہوگا۔ کہ دین کا علم حاصل کرنے والے دین میں سمجھ پیدا کر کے جب وہ اپنی قوم کی طرف واپس جائیں گے تو قوم کو اپنے علم کی روشنی میں نیکی اور بدی کی تمیز سکھائیں گے، اور ہر برے عمل کے برے انجام سے آگاہ کریں گے جس سے وہ ڈر جائیں اور برائی کو چھوڑ کر نیکی کی طرف راغب ہو جائیں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ دنیا و آخرت کی ناکامی اور سزا سے بچ جائیں گے جب دین کی تعلیم عام ہوگی تو لوگوں کو اچھے کام کی طرف رغبت ہوگی اور برے کام سے نفرت پیدا ہو جائے گی، تو وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ جائیں گے۔

لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ: میں "تفقہ" سے مراد دین کی سمجھ ہے اور فقہ سے مراد وہ اسلامی قانون ہے جسے اماموں نے قرآن و حدیث سے نکال کر عام امت کے سامنے آسان صورت میں پیش کیا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقاہت (یعنی: دین کی سمجھ) کی تعریف فرمائی ہے کہ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اسے دین میں سمجھ عطا فرماتے ہیں دین کی تعلیم کو ہمیشہ اولیت حاصل ہے جب کہ دنیا کے علوم و فنون کو ثانوی حیثیت حاصل ہے، دنیا کا علم محض روزی کمانے کا ذریعہ ہے جب کہ آخرت کی کامیابی کا دارومدار دین کے علم پر ہے، اگر دین کا علم صحیح نہیں ہوگا، تو گمراہی پیدا ہوگی، فرقے پیدا ہوں گے، لوگ خود گمراہ ہوں گے، اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

بہر حال فقہ ایک قابل تعریف چیز ہے جسے فقہائے کرام نے قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کیا ہے، "ترمذی شریف" میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ: منافق آدمی میں دو باتیں کبھی نہیں پائی جاتیں "حسن خلق والفقه فی الدّین"، خوش اخلاقی اور دین کی سمجھ۔

احکام و مسائل

جہاد کے فرض عین اور فرض کفایہ ہونے کی تفصیل

جہاد عام حالات میں فرض کفایہ ہے جس کا حکم یہ ہے کہ مسلمانوں کی کچھ جماعت جو جہاد کے لیے کافی ہو

جہاد میں مشغول رہے تو باقی مسلمان بھی اس فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔

ہاں! اگر جہاد میں شریک ہونے والی جماعت کافی نہ ہو وہ مغلوب ہونے لگے تو آس پاس کے مسلمانوں پر ان کی مدد کے لیے نکلنا اور جہاد میں شریک ہونا فرض ہو جاتا ہے وہ بھی کافی نہ ہو تو ان کے قریب کے لوگوں پر اور وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان کے متصل جو مسلمان ہیں ان پر، یہاں تک کہ ساری دنیا کے مسلمانوں پر ایسی حالت میں جہاد فرض عین ہو سکتا ہے، جس سے پیچھے رہنا حرام ہے۔

اسی طرح فرض ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا امیر ضرورت سمجھ کر جہاد کے لیے نکلنے کا اعلان عام کرے اور سب مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دے، تو اس وقت بھی جہاد میں شریک ہونا فرض ہے اور جہاد سے پیچھے رہنا حرام ہو جاتا ہے جیسا کہ تبوک کی جنگ میں عام اعلان کی وجہ سے پیش آیا، اس آیت میں اسی حکم کو واضح کیا گیا ہے کہ تبوک کی جنگ میں نفیر عام، یعنی: جہاد کے عام اعلان کی وجہ سے سب مسلمانوں پر جہاد میں جانا فرض ہو گیا تھا۔

جہاد کی طرح اسلام اور مسلمانوں کے اجتماعی مسائل اور اہم کام بھی ہیں جو جہاد ہی کی طرح فرض کفایہ ہیں؛ اس لیے مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو کام تقسیم کر کے کرنا چاہیے۔

دینی تعلیم کی اہمیت وفضیلت

"ترمذی شریف" میں ہے کہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جو شخص کسی راستے پر چلے جس کا مقصد علم حاصل کرنا ہو اللہ تعالیٰ اس پر چلنے کے ثواب میں اس کا راستہ جنت کی طرف کر دیتے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے طالب علم کے احترام میں پر جھکاتے ہیں، اور یہ کہ عالم کے لیے تمام آسمانوں اور زمین کی مخلوقات اور پانی کی مچھلیاں بخشش کی دعاء کرتی ہیں اور یہ کہ عالم کی فضیلت کثرت سے نفلی عبادت کرنے والے پر ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت باقی سب ستاروں پر اور یہ کہ علماء پیغمبر علیہم السلام کے وارث ہیں، اور یہ کہ پیغمبر علیہم السلام نے سونے چاندی کی کوئی میراث نہیں چھوڑی بلکہ علم کی وراثت

چھوڑی ہے تو جس شخص نے علم کی یہ وراثت حاصل کر لی اس نے بڑی دولت حاصل کر لی۔

اور دارمی نے اپنے مسند میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ ''پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ بنی اسرائیل میں دو آدمی تھے، ایک عالم تھا جو صرف نماز پڑھ لیتا اور پھر لوگوں کو دین کی تعلیم دینے میں مشغول ہو جاتا تھا، دوسرا دن بھر روزہ رکھتا اور رات کو عبادت میں کھڑا رہتا تھا ان دونوں میں کون افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ: اس عالم کی فضیلت عبادت کرنے والے پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے ادنی آدمی پر'' (یہ روایت امام عبد البر نے کتاب ''جامع بیان العلم'' میں سند کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے۔

اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ایک فقیہ شیطان کے مقابلہ میں ایک ہزار عبادت گذاروں سے زیادہ بھاری ہے، (''ترمذی'' عن ابن عباس، از ''مظہری'') اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل بند ہو جاتا ہے، مگر تین عمل ایسے ہیں جن کا ثواب انسان کو مرنے کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے ایک صدقۂ جاریہ، جیسے: مسجد یا دینی تعلیم کی عمارت یا رِفاہِ عام کے ادارے، دوسرے وہ علم جس سے اس کے بعد بھی لوگ نفع اٹھاتے رہیں، (مثلاً: شاگرد عالم ہو گئے، ان سے آگے لوگوں کو علمِ دین سکھانے کا سلسلہ چلتا رہا، یا کوئی کتاب تصنیف کی جس سے اس کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھاتے رہے) تیسرے نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے۔

ابن عدی اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: طلب العلم فريضة على كلّ مُسلم (از ''مظہری'')، یعنی: علم حاصل کرنا ہر ایک مسلمان پر فرض ہے، یہ ظاہر ہے کہ اس حدیث اور اس سے پہلے کی حدیثوں میں علم سے مراد دینی علم ہے، دنیوی علوم وفنون عام دنیا کے کاروبار کی طرح انسان کے لیے ضروری سہی، مگر ان کی وہ فضیلتیں نہیں جو ان حدیثوں میں آئی ہیں۔

علم کے فرض عین اور فرض کفایہ ہونے کی تفصیل

فرض عین: ہر مسلمان مرد وعورت پر صحیح دینی عقیدوں کا علم حاصل کرنا فرض ہے، اور پاکی ناپاکی کے مسئلوں کا جاننا، نماز روزہ اور تمام عبادتیں جو شریعت نے فرض وواجب قرار دی ہیں ان کا علم حاصل کرنا، جن چیزوں کو حرام یا

مکروہ قرار دیا ہے ان کا علم حاصل کرنا جس شخص کے پاس نصاب کے برابر مال ہو اس پر زکوۃ کے مسئلے معلوم کرنا، جس کو حج پر جانے کی مالی اور جانی طاقت ہو اس کے لیے حج کے مسئلے معلوم کرنا، جو شخص تجارت، صنعت، ملازمت، یا سونے چاندی کی خرید و فروخت کرتا ہو، اس پر ان کے مسئلے سیکھنا فرض عین ہے تا کہ ان کے مطابق عمل کر سکے، جب نکاح کرے تو میاں بیوی کے حقوق کے مسئلے سیکھے، غرض جو کام شریعت نے ہر انسان کے ذمہ فرض و واجب کئے ہیں، یا جن کاموں سے اس کو اکثر واسطہ پڑتا ہے، ان کے مسئلوں کا علم حاصل کرنا بھی ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے، اسی طرح چونکہ اپنے ظاہر و باطن کی شریعت کے مطابق اصلاح ضروری ہے اس لیے اس کے مسئلوں جاننا بھی ضروری ہے۔

فرض کفایہ: پورے قرآن کریم کے معانی و مسئلوں کو سمجھنا، تمام حدیثوں کو سمجھنا اور ان میں معتبر اور غیر معتبر کی پہچان پیدا کرنا، قرآن و سنت سے جو احکام و مسائل نکلتے ہیں ان سب کا علم حاصل کرنا، اس میں صحابہ و تابعین اور اماموں کے اقوال و آثار سے واقف ہونا یہ اتنا بڑا کام ہے کہ پوری عمر اور سارا وقت اس میں خرچ کر کے بھی پورا حاصل ہونا آسان نہیں اس لیے شریعت نے اس کو فرض عین قرار نہیں دیا بلکہ فرض کفایہ قرار دیا ہے کہ بقدرِ ضرورت کچھ لوگ یہ سب علوم حاصل کر لیں تو باقی مسلمان سبکدوش ہو جائیں گے۔

حفاظت کا طریقہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ

اے — لوگو جو — ایمان لائے ہو — لڑو — ان لوگوں سے جو قریب ہیں تمہارے — سے — کافروں

وَ لْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور — چاہیئے کہ پائیں — اندر تمہارے — سختی — اور — جان لو — تحقیق اللہ تعالیٰ — ساتھ ہے — ڈرنے والوں کے (۱۲۳)

بامحاورہ ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے نزدیک کے کافروں سے لڑتے جاؤ اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر اپنے بارے میں سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (۱۲۳)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا مددگار ہے جو اس کے حکم بردار ہیں اور اس کے غضب سے ڈرتے ہیں اس بات کو سامنے رکھ کر دشمنوں کا مقابلہ کرو، چاہئے کہ مسلمانوں کی ہر بستی اپنے قریب کے دشمنوں پر اپنا رُعب جمائے رکھے، اور ان کے سامنے قوت کا مظاہرہ کرتی رہے، تاکہ وہ شرارت سے باز آجائیں ان کو سمجھ لینا چاہئے، کہ مسلمان امن وامان کے حامی ہیں، لڑنے میں کبھی اپنی طرف سے پہل نہ کریں گے، ہاں اگر کوئی ان کو ظلم اور زبردستی سے دبانے کی کوشش کرے گا، تو اس کو اپنے پروردگار کے حکم سے دبا کر رہیں گے اور جب تک وہ درست نہ ہوجائے گا اس کو نہ چھوڑیں گے۔

پچھلی آیتوں میں جہاد کی ترغیب تھی، اور اس آیت ”یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا“ (الآیۃ)، میں یہ تفصیل بتلائی گئی ہے کہ کافر تو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، ان سے جہاد وقتال میں ترتیب کیا ہونی چاہئے، اس آیت میں ارشاد یہ ہے کہ کافروں میں سے جو لوگ تم سے قریب ہوں پہلے جہاد ان سے کیا جائے قریب ہونا مقام کے اعتبار سے بھی ہوسکتا ہے، کہ جائے سکونت سے جو قریب رہنے والے کافر ہیں وہ جہاد میں مقدم کئے جائیں۔

وحی کے بارے میں منافقوں کا طرزِ عمل

وَ اِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ

اور جب — اتاری جاتی ہے — سورت کوئی — تو میں سے ان — بعض — کہتے ہیں — کونسا ہے تم سے — زیادہ کردیا اس کو اس نے

اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿١٢٤﴾

ایمان میں — سو — جو لوگ — ایمان لائے ہیں اس نے بڑھادیا ان کو ایمان میں — اور — وہ — خوشیاں مناتے ہیں (۱۲۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب کوئی سورت اتاری جاتی ہے تو ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس سورت نے تم میں سے کس کا ایمان زیادہ کردیا سو جو لوگ ایمان لائے ہیں، ان کا ایمان اس سورت نے زیادہ کردیا اور وہ خوش دل ہوتے ہیں۔ (۱۲۴)

تفسیر

اس آیت میں ان لوگوں کا جن کے دل میں ایمان کا نور نہیں ہے ایک اور طرز عمل بیان کیا گیا ہے کہ جب قرآن کریم کی کوئی سورت اترتی ہے، تو منافق لوگ آپس میں یا بعض سیدھے سادے مسلمانوں سے کہتے ہیں، کیوں جی اس سورت سے تمہارا ایمان کتنا بڑھا، اور اس میں کیا اضافہ ہوا؟ مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی ہنسی اڑائیں اور لوگوں کو کسی طرح بتائیں کہ اس میں کچھ نہیں رکھا ان کی اس بے ہودگی کے جواب میں یہاں پر نہایت بردباری کے ساتھ یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جو سچے دل سے ایمان لائے ہیں اور اپنے اللہ سے لو لگائے ہوئے ہیں انہیں ان سورتوں میں دل کی تسکین، جان کا حقیقی آرام اور اللہ کے وعدوں کے پورا ہونے کا سامان کھلم کھلا نظر آتا ہے انہیں اپنی امیدیں جو انہوں نے اللہ اور پیغمبر کے ساتھ لگا رکھی ہیں پوری ہوتی دکھائی دیتی ہیں اور ان کا دل مزید یقین اور اطمینان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرنے میں لگ جاتا ہے۔

فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی آیتوں کی تلاوت، ان میں غور و فکر اور اس کے حکموں پر عمل کرنے سے ایمان میں ترقی اور زیادتی پیدا ہوتی ہے، اور زیادتی یہ ہے کہ ایمان میں مٹھاس محسوس ہوتی ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سچے مسلمان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت آسان نظر آنے لگتی ہے، عبادت میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے، گناہوں سے طبعی نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ایمان جب دل میں آتا ہے تو ایک سفید نورانی نقطہ جیسا ہوتا ہے، پھر جوں جوں ایمان میں ترقی ہوتی ہے، تو یہ سفیدی بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ سارا دل روشن ہو جاتا ہے، اسی طرح کفر شروع میں ایک سیاہ داغ کی طرح دل پر لگتا ہے، پھر جوں جوں گناہوں اور کفر کی زیادتی ہوتی جاتی ہے یہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔

اسی لیے صحابہ کرام ایک دوسرے کو کہا کرتے تھے کہ کچھ مل کر بیٹھو، دین اور آخرت کی باتوں کا ذکر کرو تاکہ ہمارا ایمان بڑھے۔

نفاق کی نحوست

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ

اور جو لوگ میں دلوں ان کے بیماری ہے تو بڑھادی اس نے ان کی پلیدی پر پلیدی ان کی

وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ﴿۱۲۵﴾

اور مرے اس حال میں کہ وہ کفر کرنے والے تھے (۱۲۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جن کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے سو ان کے لیے گندگی پر گندگی بڑھادی اور وہ مرتے دم تک کافر ہی رہے۔ (۱۲۵)

تفسیر

جن لوگوں کے دلوں میں نفاق کی بیماری جم گئی ہے، انہیں ان سورتوں میں کچھ نظر نہیں آتا بلکہ یہ سورتیں ان کی گندگی میں اور اضافہ کردیتی ہیں، یہ منافق لوگ ایمان داروں کو اپنے یقین اور ثابت قدمی میں روز بروز بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں اور ان کے ارادوں کی پختگی کے سامنے ان کے اپنے ارادے انہیں روز بروز کمزور ہوتے نظر آتے ہیں، چنانچہ اس سے ان کے حسد، کینے اور بغض میں اور زیادتی ہوتی ہے، اور یہ وہ روحانی بیماریاں ہیں جن کا واحد علاج صرف اللہ کے مقرر کئے ہوئے حکموں کو ماننے اور اس کے پیغمبر کی ہدایت پر چلنے میں ہیں، جتنا اللہ، پیغمبر اور اس کے قانون، یعنی: قرآن پر بھروسہ اور اعتماد حاصل ہوگا، اتنی ہی انسان کی اندرونی خرابیاں گھٹتی جائے گی، یہ خرابی ہی روحانی بیماری ہے، چنانچہ جوئی سورت قرآن کریم کی اترتی ہے وہ مسلمانوں کے لیے تسلی اور اطمینان کا ذریعہ ہوتی ہے، اور وہی منافقوں کی ضد اور دشمنی میں اور اضافہ کردیتی ہے، بالکل اسی طرح، جیسے: بارش سے اچھی زمین سرسبز ہوجاتی ہے، اور خراب زمین میں سوائے خاردار جھاڑیوں کے کچھ نہیں اگتا۔

آفتوں سے سبق نہیں سیکھتے

اَوَ لَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ

کیا نہیں دیکھتے وہ کہ وہ بلا میں پھنسائے جاتے ہیں اندر ہر سال کے ایک بار یا دو بار پھر بھی

لَا يَتُوْبُوْنَ وَ لَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۱۲۶)

نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ وہ سبق حاصل کرتے ہیں (۱۲۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ کیا دیکھتے نہیں کہ وہ ہر سال آزمائے جاتے ہیں ایک بار یا دو بار پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ وہ نصیحت پکڑتے ہیں۔ (۱۲۶)

تفسیر

يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ: اس میں منافقوں کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اپنی منافقت اور عہد شکنی وغیرہ گناہوں کی وجہ سے ہر سال مختلف قسم کی مصیبتوں میں کبھی ایک بار کبھی دو بار مبتلا ہوتے رہتے ہیں کبھی ان کے دوست مکہ کے کافر مغلوب ہو گئے کبھی ان کی منافقت کی باتیں کھل گئیں اس سے پریشانی میں مبتلا رہے۔

کبھی قحط ہے، کبھی وبا ہے، کبھی زلزلہ ہے، کبھی طوفان ہے، غرض کوئی سال آفتوں سے خالی نہیں جاتا، چاہئے تو یہ تھا کہ ہر مصیبت کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی سے جھکتے اور سمجھ لیتے، کہ ہر چیز اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اسی کے حکم کے آگے سر جھکائے بغیر چارہ نہیں، لیکن یہ اور الٹے سرکش ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کو تو مانتے نہیں، بجائے اس کے اپنی عقل اس میں لڑانے لگتے ہیں کہ ایسی تدبیر کیا ہو کہ ان آفتوں سے نجات ہو اور زندگی چین و آرام سے کٹے۔

یہ نہیں سمجھتے کہ چین اور آرام تو اللہ تعالیٰ کو مان لینے اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہنے سے حاصل ہوتا ہے، کچھ مغرور لوگ اسی دھوکے میں پھنسے رہتے ہیں کہ مجموعی طور پر ہماری قوم ترقی کر رہی

ہے افراد تو مرتے ہی رہتے ہیں ان کا خیال کرنا فضول ہے۔

یہ نہیں جانتے کہ افراد کا مرنا بھی ایک مصیبت ہے جس سے عقلمندوں کو سبق لینا چاہئے کہ اگر ان کو خود کچھ نہیں سوجھتا تو ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اور ان کی کتابیں موجود ہیں ان کی طرف رجوع کرنے سے انسانی ہستی کا راز بخوبی معلوم ہوسکتا ہے۔

منافقوں کی بدنصیبی

وَ اِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ
اور جب اترتی ہے سورت کوئی تو دیکھنے لگتے ہیں بعض ان کے طرف دوسروں کے کہ کیا

يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ
دیکھتا ہے تم کو سے کوئی پھر چل دیتے ہیں پھیر دیئے اللہ تعالیٰ نے دلوں ان کے کو

بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾
کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو نہیں سمجھتے (۱۲۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب کوئی سورت اترتی ہے، تو ان میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں کہ کیا تم کو کوئی مسلمان دیکھتا ہے پھر وہ چپکے سے کھسک جاتے ہیں ان کے دل اللہ تعالیٰ نے پھیر دیئے ہیں اس واسطے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ (۱۲۷)

تفسیر

ارشاد ہے کہ جب یہ لوگ مسلمانوں کی مجلس میں حاضر ہوتے ہیں اور کوئی وحی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اترتی ہے، اور آپ اسے حاضرین کو پڑھ کر سناتے ہیں تو سچے مسلمان تو کان لگا کر سنتے ہیں اور جو ارشاد ہوتا ہے اس کو گرہ میں باندھتے ہیں لیکن ان لوگوں کو اس کا سننا ناگوار ہوتا ہے خاص کر جبکہ وحی میں منافقوں کی بری عادتوں کو بیان کیا گیا ہو، یہ لوگ چپکے سے وہاں سے کھسکنا چاہتے ہیں اور آپس میں اشارے کرتے ہیں کہ جس وقت کوئی دیکھ نہ رہا ہو،

آنکھ بچا کر چل دینا چاہئے، چنانچہ موقعہ تاک کر سارے کے سارے ایک ایک کر کے کھسک جاتے ہیں اور مجلس سے منہ پھیر کر چل دیتے ہیں اللہ کے ہاں کیا پرواہ ہے وہ ان کی ان بری حرکتوں کی وجہ سے ان کے دل کو اچھی باتوں کی طرف سے پھیر دیتا ہے، جب یہ ہدایت کی باتیں سننا ہی نہیں چاہتے ناسمجھی میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو کیا غرض پڑی ہے کہ ان کو سیدھا راستہ زبردستی دکھائے۔

اکثر لوگوں کا اب بھی یہی حال ہے کہ مجلس میں جب تک ہنسی، مذاق، تفریح کی باتیں اور شغل ہوتے ہیں تو بڑے ذوق وشوق سے جم کر بیٹھے رہتے ہیں اور جہاں عمل کی اصلاح اور اخلاق کی درستگی سے متعلق کام کی باتیں شروع ہوئیں تو بددلی ان کے چہروں سے ظاہر ہونے لگتی ہے، اور وہ موقعہ پاتے ہیں آنکھ بچا کر کھسک جاتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ بچائے)

پیغمبر کی نشانیاں

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ

البتہ تحقیق آیا پاس تمہارے پیغمبر میں سے جانوں تمہاری بھاری ہے اوپر اس کے وہ جو ضرر پہنچے تمہیں

حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

دل سے چاہتا ہے بھلائی تمہاری پر ایمان والوں شفیق مہربان ہے (۱۲۸)

بامحاورہ ترجمہ: تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر آیا ہے تمہیں جو تکلیف پہنچے وہ اس پر بھاری ہے اور وہ تمہاری بھلائی پر حریص ہے ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہے۔ (۱۲۸)

تفسیر

اس آیت میں پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا عام انسانوں کے ساتھ اور پھر خاص ایمان والوں کے ساتھ تعلق نہایت صاف اور واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے اور اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ انسان اگر ایسی خوبیوں والے پیغمبر کی قدر نہ پہچانیں تو بڑے تعجب کی بات ہے، یہاں وہ صفتیں گنوائی گئیں ہیں جن کا تعلق دوسروں کے ساتھ ہے اور ان پر ان کا اثر پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو سب انسانوں سے افضل ہیں ہمارے لیے نمونہ بنا کر بھیجا ہے تا کہ ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ زندگی سے سبق حاصل کریں، اور اپنے سارے کام آپ کے طریقہ کے مطابق سرانجام دیں یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے کہ اپنے پیغمبر کو ایسا نہیں بنایا جس کی کوئی انسان پیروی نہ کر سکے۔

فرمایا: اس عظیم پیغمبر کی خوبی یہ ہے کہ اس پر تمہاری تکلیف بھاری گزرتی ہے وہ نہیں چاہتا کہ تم کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاؤ؛ اسی لیے اس پیغمبر کی کوشش یہ ہوتی ہے تم اسلام میں داخل ہو کر ہمیشہ کی تکلیف سے بچ جاؤ۔

فرمایا: اس پیغمبر کی دوسری خوبی یہ ہے وہ تمہاری بہتری کے لیے بہت تمنا رکھتے ہیں تمہاری خیر خواہی کے لیے ان کے دل میں تڑپ ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری اور لوگوں کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے جنگل میں آگ جلائی اور اس پر پتنگے جمع ہو گئے، وہ پروانے آگ میں گر رہے ہیں، وہ آدمی ان کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے مگر وہ زبردستی آگ میں گر رہے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری اور تمہاری مثال بھی ایسی ہے، کہ میں تمہیں دوزخ میں گرنے سے بچانا چاہتا ہوں مگر تم زبردستی دوزخ میں گرنا چاہتے ہو؛ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: تمہارے پاس وہ عظیم پیغمبر آیا جو تمہارے فائدے کی بڑی تمنا رکھتے ہیں۔

فرمایا: اس پیغمبر کی تیسری خوبی یہ ہے کہ وہ ایمان والوں کے متعلق نہایت شفیق مہربان ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفقت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے آپ نرم دل ہیں، اگر آپ سخت مزاج ہوتے تو یہ لوگ آپ کے گرد سے تتر بتر ہو جاتے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغبر کی خوبیاں بیان فرمائی ہیں کہ وہ مومنوں کے لیے نہایت شفیق اور مہربان ہیں، لہٰذا ایمان والوں کو چاہئے کہ ان کی اتباع کریں، وہ انہیں خیر خواہی کی بات ہی بتائیں گے اور اسی میں ان کی بہتری ہوگی، آپ کے حکم سے روگردانی کریں گے تو ناکام ہو جائیں گے۔

پیغمبر کی تسلی

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ

پس اگر منہ موڑیں وہ | پس کہہ دیجئے | کافی ہے مجھے | اللہ تعالیٰ | نہیں معبود کوئی | سوا | اس کے | پر اسی | بھروسا کیا میں نے

۱۶ ع ۵

وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾

اور وہی مالک ہے تخت بڑے کا (۱۲۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر بھی اگر منہ پھیریں تو، کہہ دیجئے! کافی ہے مجھے اللہ تعالیٰ جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔ (۱۲۹)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اے پیغمبر! اگر باوجود ان سب اچھی عادتوں کے لوگ آپ کی طرف توجہ نہ کریں اور پیٹھ موڑ کر چل دیں تو آپ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، اللہ تعالیٰ آپ کی حمایت اور مدد کرنے والے ہیں، اس لیے آپ یہ کہا کریں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کا سہارا کافی ہے وہی میرا مددگار اور حامی ہے میرا بھروسا اسی پر ہے میرا سہارا وہی ہے وہ سارے جہاں کا بادشاہ اور مالک ہے۔

"سورۂ توبہ" کے مضمونوں کا خلاصہ

کافروں کے خلاف آپ جن لڑائیوں میں شریک ہوئے ان میں سے پہلی جنگ بدر کی جنگ ہے اور آخری تبوک کی جنگ ہے، بدر کی جنگ میں مسلمانوں کو بغیر ارادے اور بغیر تیاری کے لڑنا پڑا، تبوک کی جنگ میں ارادتاً تیاری کی گئی لیکن لڑنے کی نوبت نہیں آئی اس آخری لڑائی کا ذکر "سورۂ توبہ" میں تفصیل کے ساتھ گذر گیا ہے۔

اس سورت کے ذیل میں صرف آخری مہم، یعنی: تبوک کی جنگ کے واقعوں پر غور کیا جاسکتا ہے یہ ایک سخت امتحان تھا، مسلمان اس وقت سینکڑوں کی نہیں ہزاروں کی تعداد میں تھے لیکن آہستہ آہستہ سبھی اس مشکل سفر کے لیے تیار ہوئے صرف معذور، اپاہج اور نادار لوگ رہ گئے۔

منافق جو ان میں ملے جلے تھے، وہ اپنی چال بازیوں کی وجہ سے پہچانے گئے اور وحی نے ان کا پردہ بالکل فاش کر دیا اور وہ سب کے سب حیلے بہانے کر کے الگ ہو گئے مخلص مسلمانوں میں صرف تین شخص ایسے

تھے جو رہ گئے اوران کی توبہ ایک کڑی سزا کے بعد قبول ہوئی۔

مشرکوں سے لاتعلقی کا اظہار پہلے ہو چکا ہے، صلح کا قانون بھی بیان ہو گیا کفروشرک کی قباحتوں اور منافقوں کی خرابیوں کو بھی واضح کر دیا گیا پھر اہل ایمان کی خوبیوں کا ذکر ہوا تو فرمایا کہ ان تمام حقیقتوں کو جان لینے کے بعد بھی اگر یہ لوگ آپ سے منہ پھیر لیں تو آپ کہہ دیں کہ میرے لیے تو اللہ تعالیٰ کافی ہے، مجھے کسی دوسرے کا خوف ہے نہ پرواہ، کیونکہ جس کی کفایت اللہ کے ذمے ہو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، چنانچہ سورت کے آخر میں اللہ تعالیٰ پر پورے پورے بھروسے کا ذکر بھی آ گیا، پھر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکرہ بھی آ گیا ہے کہ اس خدا تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہر چیز پر قدرت رکھنے والی اور نفع اور نقصان دینے والی ذات صرف اور صرف اسی کی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ہر قسم کی قولی فعلی اور بدنی عبادتوں کے لائق صرف وہی ہے۔

سورت کے آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسلمانوں پر بے حد مہربان، شفیق اور ہمدرد ہونا بیان فرمایا ہے، اور آخری آیت میں آپ کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ آپ کی ساری کوششوں کے باوجود اگر پھر بھی کچھ لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ صبر کریں اور اللہ تعالیٰ پر بھرسہ کریں۔

آخری دو آیتیں

آخری دو آیتیں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق قرآن کی آخری آیتیں ہیں، ان کے بعد کوئی آیت نہیں اتریں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی، یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے۔

ان دو آیتوں کے بڑے فضائل حدیث میں موجود ہیں، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص صبح وشام یہ آیتیں سات مرتبہ پڑھ لیا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام کام آسان فرما دیتے ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

یہاں پر "سورۂ توبہ" ختم ہوئی اور اسی کے ساتھ دوسری منزل بھی ختم ہوئی اس کے آگے "سورۂ یونس" ہے جس سے تیسری منزل شروع ہوتی ہے۔

۞ ..... تمت بالخیر ..... ۞

دفتر ریسرچ اینڈ رجسٹریشن آفیسر اوقاف

(حکومتِ سندھ)
جامع مسجد آرام باغ۔ کراچی

فون نمبر: 021-9933 2012 | موبائل: 0300-3311811

نشانِ مجاریہ: ۔آر۔آر۔او (اوقاف) A-64/2017 مورخہ 28/9/2017

MUFTI MUNEER AHMED TARIQ
RESEARCH & REGISTRATION OFFICER
AUQAF DEPARTMENT GOVT. OF SINDH

تصدیق نامہ

میں نے مکتبہ ربانیہ کراچی کے مطبوعہ قرآن پاک مترجم بنام: آسان تفسیر القرآن مکمل (۱۰ جلدیں)، تالیف وترتیب حضرت مولانا مفتی اصغر علی ربانی صاحب مدظلہم کے عربی متن کو بغور پڑھا اور اسکے تمام حروف واعراب (زبر، زیر، پیش وغیرہ) کی پروف ریڈنگ اپنی زیر نگرانی کروائی ہے۔

الحمدللہ! بہت معیاری اور صحیح کتابت کرائی گئی ہے۔ تصدیق کی جاتی ہے کہ مذکورہ بالا قرآن پاک (اردو مترجم) آسان تفسیر القرآن (۱۰ جلدیں) تمام اغلاط سے پاک اور مبرا ہے۔ ان شاءاللہ

المصدق

مولانا مفتی منیر احمد طارق

ریسرچ ورجسٹریشن آفیسر اوقاف

حکومت سندھ
مفتی منیر احمد طارق
ریسرچ ورجسٹریشن آفیسر
محکمہ اوقاف سندھ کراچی

وقل رب زدنی علما

مکتبہ ربانیہ کراچی

ISLAMIC STUDIES PUBLISHERS